قیمت
فی پرچہ:- ۷۵ نئے پیسے
سالانہ:- دس روپے

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کر لیا ہے یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب و طباعت کے لحاظ سے بہت اہتمام رکھتی ہیں اور خوبصورت ٹائپ اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام معیار کی ضمانت ہے اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب و تقسیم کا کام وہ صرف خود انجام دیا ہے یا انکی زیر نگرانی ترتیب و اشاعت کے مراحل طے ہوئے ہیں۔

دستور الفصاحت: سید احمد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرہ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے۔ اس میں ۲۵ شعراء کا حال اور منتخب کلام درج ہے مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ اور تذکروں پر کام کرنے والوں کیلیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی میں سارے غیر مطبوعہ تذکروں سے مواد کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سے تذکروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہ کتاب اردو میں اعلیٰ ایڈیٹنگ کا نمونہ ہے جسے ہم کسی بھی زبان کے تحقیق کا ناموں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ قیمت ——— ۶ روپے مجلد

مکاتیب غالب: یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو نوابان رام پور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں جناب عرشی نے ناظم رامپور کے اشعار پر اصلاحیں نیز مولانا حالی، منیر بلگرامی، رسا، میر تقی اور تیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خطوط غالب کی کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شائع نہیں ہوا۔ اردو میں انداز ترتیب و تہذیب کی ایک نمونہ بتانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا ضروری ہے۔ قیمت ——— ۸ روپے مجلد

فرہنگ غالب: اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعے غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو لغات و الفاظ کے معانی جمع کر دیے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندوپاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے جن کے کام کی عظمت کو بیان بھی کیا ہے اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ زبان و لغت کے بارے میں غالب کا رویہ جاننے کے لیے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔ (طباعت لیتھو) قیمت ——— ۶ روپے مجلد

نگار بک ایجنسی رام پور، یوپی

بقلم غالب

یوں تو غالب کی تمام تحریریں ہمیں عزیز ہیں لیکن اگر وہ وہ تحریریں ہوں جو غالب کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی اصل تحریریں ہوں یعنی جن پر "بقلم خود" کا اطلاق ہو سکتا ہو تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی بہت سی تحریریں ادھر ادھر کتاب خانوں میں بکھری پڑی ہیں۔ کچھ تحریریں مختلف اوقات میں اخبارات رسائل اور کتب کے ذریعے سامنے بھی آتے رہے ہیں۔ ایسی تمام تحریروں کے عکس کتابی شکل میں یکجا کیے جا رہے ہیں۔ گویا اس کتاب کی ہر ہر سطر "بقلم غالب" ہوگی جیسے مندرجہ ذیل ایک مکتوب ہے جو غالب نے اپنے شاگرد نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور کو لکھا تھا ——— مرتبہ: اکبر علی خاں

زیر ترتیب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس رہنے دیتا ہوں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جاوے تو میں پھر اوسکو صاف کر کر بھیجدوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھکو کیا یاد رہیگا میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم اور نام اور تخلص رہے ناظم خاں اور شوکت خیال انہیں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیں مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک زیادہ حد ادب تم سلامت رہو قیامت تک عنایت کا طالب غالب روز پنجشنبہ ۱۵ فروری [illegible]

عکس خط میرزا اسد اللہ خان غالب دهلوی

ادارۂ یادگار غالب

پھلواری رام پور (یو پی)

آئندہ شمارے میں غالب سے متعلق اہم مضامین شایع ہوں گے

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین جنوری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۱

ملاحظات

چینی جارحیت اور پاکستان چینی جارحیت نے ہندوستان جیسے صلح پسند ملک کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے لائق نفرین ہے۔ چین کا یہ جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان نے بین الاقوامی سیاسی محاذ پر پورے مغربی گروپ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چین کی مسلسل حمایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے تعلقات روسی گروپ اور امریکی گروپ دونوں کے ساتھ ہیں اس لیے اس کا اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھتے ہوئے اتنا اہم اقدام بیحد قابل ستایش اور لائق شکر گزاری تھا۔ مگر چین کے موجودہ ارباب سیاست کا یہ رویہ بیحد افسوسناک تھا کہ انھوں نے ہندوستان جیسے بے غرض دوست کو دھوکا دیا۔ اور جھوٹے بہانے تراش کر اچانک حملہ آور ہو گیا۔

اس موقع پر بجا تھا اگر ہندوستان اپنے ہمسایہ ملکوں سے ہمدردی اور بھرپور حمایت کی توقع رکھتا خصوصاً ان ملکوں سے جو نسلی، ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ ہر کے ملکوں میں ظاہر ہے کہ ان میں قریب ترین ہمسایہ ملک پاکستان ہے۔ چین کے حملے سے پہلے وہاں کے سربراہوں نے ہندوستان کے سامنے مشترکہ ڈیفنس کی پیشکش کی تھی جو بہت امید افزا رویہ تھا مگر جب سچ مچ ان کی حمایت اور ہمدردی کا وقت آیا تو انھوں نے کشمیر کے مسئلے کو اٹھا دیا جو حقیقت میں کتنا گمبھیر مسئلہ اور رنگ برنگ مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے حل کے لیے پہلا قدم یہ ہوتا کہ دونوں ملکوں کے خواص و عوام میں ناقابل شکست دوستانہ فضا پیدا کرنے کی جان توڑ کوشش کی جاتی۔ اس کوشش کا نقطۂ آغاز یہی ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان غیر مشروط طور پر چین کے مقابلے میں ہندوستان کی حمایت کے لیے میدان میں آ جاتا اور دونوں ملک کشمیر جیسے مسئلے سے خالی الذہن ہو کر اس ایک دشمن کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہو جاتے جو صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کے لیے بھی ایک زبردست خطرہ ہے ــــــــــــ مگر پاکستان کے ارباب سیاست و حکومت کو کون سمجھائے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔

نگار اور اس کے منصوبے نگار لکھنؤ سے دام پورا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ اردو کا اہم ترین ماہنامہ ہے جس استقامت کا ثبوت اس نے دیا ہے اس کا دوسری اردو کے گنے چنے رسائل ہی کر سکے ہیں اس کی اشاعت جس پابندی کے ساتھ ہوتی رہی ہے وہ سب جانتے

[illegible] کی کمی [illegible] باست [illegible] اُن کی اشاعت ممکن نہیں۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ پاکیزہ و لولے اور نئے [illegible] علم و ادب کی خدمات انجام دیگا۔

نگار نے بڑے معرکے کے سالنامے نکالے ہیں۔ اب بھی اس نے ایک پروگرام بنایا ہے جس کے تحت بڑی اہم شخصیتوں اور موضوعات پر خاص نمبر ترتیب دیئے جائیں گے۔ یہ مناسب سمجھا گیا کہ اُن کا اعلان ابھی سے کر دیا جائے تاکہ اس ذیل میں جو حضرات ضروری اور مناسب مشورے دے سکیں انکو علم ہو جائے۔

نگار نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ جلد از جلد مندرجہ ذیل عنوانات پر وقیع و ضخیم خاص نمبر شایع کرے:

● ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر ● رشید احمد صدیقی نمبر ● خواجہ حسن نظامی نمبر ● اختر شیرانی نمبر ● خود نوشت سوانح نمبر ● مطبوعہ مکاتیب نمبر۔ اور ● غالب نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت اُن کی ذات سے ملی ہے اور اُس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ ذاکر صاحب ہی کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر اُن کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور اُن میں سے بھی کئی ترجمے ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر، خطبات، پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے اس نمبر میں یہی کوشش کی جائے گی کہ ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے ایک بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

رشید صاحب کے بارے میں کسی نمبر کا اعلان کرنا اپنی عافیت کو خطرے میں ڈالنا ہے اس لیے کہ وہ اپنے انداز تحریر کے اعتبار سے اردو کی نمایاں پُرعظمت پیچ در پیچ پہلودار شخصیت ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نگار جس کے وہ مستقل لکھنے والے آغاز ہی سے رہے ہیں اگر یہ خدمت انجام نہ دے تو اس پر ایک احساس جرم طاری رہیگا یہ اقدام فریضے کی شکل اس لیے بھی اختیار کر لیتا ہے کہ نگار کا موجودہ مرتب علی گڑھ کا طالب علم ہے۔ اُس علی گڑھ کا جس کی محبت رشید صاحب کے نزدیک اول و آخر سب کچھ ہے۔ اس نمبر میں رشید صاحب کی شخصیت و فن پر مضامین کے علاوہ اُن کے سارے بکھرے ہوئے مضامین اور خطوط شامل ہوں گے۔

خود نوشت سوانح اردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور چند گنی چنی تحریروں کو چھوڑ کر اس صنف سے ہم محروم ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں نگار نے اُس دور کے شعراء کو خود نوشت سوانح لکھنے کی دعوت دی تھی اُس نمبر میں شایع شدہ خود نوشت حالات کے علاوہ اور جو کچھ ادھر اُدھر بکھرا ہوا مل جائے گا اُس سب کو سمیٹ کر ایک نمبر شایع کرنیکا ارادہ ہے تاکہ ایک انداز کی چیزیں یکجا ہو کر زیادہ مفید اور کارآمد بن جائیں۔

مطبوعہ مکاتیب نمبر میں ایسے سارے مکتوبات جمع کرنے کی سعی کی جائیگی جو پرانے اخبارات و رسائل نیز مختلف کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں بہت سے خطوط ایسے ہیں جن کے دوبارہ چھپ جانے سے ہماری بہت سی ادبی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ زبان و بیان کے بہت سے معرکے زندہ ہو جائیں کہ اس کا ادراک دور میں اُن کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ کام بھی بہت جانفشانی کا ہے اور نہ معلوم کتنا وقت لے اس لیے کہ لاتعداد کتابوں رسالوں اور اخباروں کی ورق گردانی کوئی سہل کام تو نہیں

غالب نمبر میں جو کچھ ہوگا وہ خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے ہوگا اور اس کیفیت و کمیت کا ہوگا کہ باطمینان حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ اس کی تفصیلات کو شایع کرنا ابھی مناسب نہیں جانتے۔ مگر اتنا یقین دلانا ضروری ہے کہ وہ نگار سے وابستہ توقعات کو بدرجہ اتم پورا کرے گا۔

خواجہ حسن نظامی اور اختر شیرانی اردو نثر و نظم کے دو موڑ ہیں۔ ہماری موجودہ نسل نہ ان کی اہمیت کو جانتی ہے اور نہ اُس ارتقائے ادب سے واقف جس کے یہ دونوں محرک ہیں۔ دونوں کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ عام سطحی ذہن کے لیے باعث کشش ہیں۔ ان جملوں میں کہنے والے کے نزدیک سراسر اپنی ذہنی برتری کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اب غالب فیشن ہے اور اس کے علاوہ نظروں میں سماتا ہی کون ہے۔

آخر میں ذاکر صاحب اور رشید صاحب کے احباب، تلامذہ، خصوصاً جامعہ اور علی گڑھ کے ادب دوست حلقوں سے یہ درخواست ہے کہ وہ ان بزرگوں سے متعلقہ نمبروں کے لیے نگار کو ضروری مواد کی فراہمی میں مدد اور مشوروں سے نوازیں۔

مدیر نگار کو اپنے کرمفرما دوستوں جناب رشید حسن خاں، جناب نثار احمد فاروقی، جناب گوپی چند نارنگ، جناب خلیق انجم، جناب تنویر علوی کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے نگار کیلئے اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ لکھنے والوں کی یہ نئی نسل جو علمی کام کر رہی ہے وہ اپنی سنجیدہ روش کی بنا پر قابل قدر ہے اور نگار کے صفحات پر یکجا فنا [illegible]

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نائب صدر جمہوریہ ہند)

سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی ضرورت ہوتی ہے: ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہادِ فکر کا ایک کم سے کم مرتبہ، حسِ جمالی کی ایک کم سے کم ذکاوت، اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائداری۔ ان چاروں کے متعلق کچھ کچھ عرض کر دوں تو شاید بے سود نہ ہو۔

آدمی کے ارادے میں اس کی انفرادیت کی چار صفتیں بروئے کار آتی ہیں، دو ارادے سے پہلے، دو ارادے کے بعد۔ ارادے سے پہلے تو اس کی خود مختاری اور اس کی قوت فیصلہ آشکار ہوتی ہیں، ارادے کے بعد میں اس کی مضبوطی اور اس کا ثبات۔ خود مختاری حسب ظاہر ہوتی ہے کہ ارادہ خود کیا ہو، دوسرے نے کر کے ہمارے سر نہ تھوپ دیا ہو۔ جن طبائع میں خود اپنے بل پر ارادہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جو ہمیشہ کسی اور ہی کا منہ تکتے ہوں، ان میں بھلا سیرت کی یکسوئی کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ قوت فیصلہ سے ارادہ بروقت بن جاتا ہے، ورنہ اگر فیصلہ میں برابر لیت و لعل ہی ہوتی رہے تو ارادے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نیک منشی تسویف کے چکر سے نکل کے میدان میں نہیں آ سکتی اور سیرت کی تعمیر میں یہ تسویف بہت حائل ہوتی ہے۔

دوسری دو صفتیں جن کا ذکر ہوا ارادہ کر چکنے کے بعد اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مضبوطی سے یہ ہوتا ہے کہ فیصلے کے بعد ارادہ کرنے والا اندرونی کشاکش سے مامون ہو جاتا ہے، ورنہ ہر فیصلے کے بعد نظر ثانی و نظر ثالث کا سلسلہ جاری رہے تو عمل کی نوبت ہی نہیں آتی اور قوت ارادہ بے عملی سے مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسری صفت، یعنی ثبات قدم ارادے کو خارجی رکاوٹوں اور مخالف قوتوں کے اثر سے بچاتی ہے، ورنہ کتنے نیک ارادے ہیں کہ حالات کے ناساعد ہونے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتے اور عمل کا جامہ پہننے سے پہلے بدل دیے جاتے یا بالکل ترک کر دیے جاتے ہیں۔

قوت ارادی کی مضبوطی کے کچھ اسباب تو قدرتی ہوتے ہیں جن میں تغیر کسی کے بس کی بات نہیں، لیکن بعض پر مشق اور بصیرت سے اثر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار معلم اپنے بچوں سے ایسے کام کراتے ہیں جن میں خاطر خواہ نتیجہ نکلنے سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ یعنی ارادہ کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور جوش و شوق سے دوسرے مشکل کاموں کا عزم کر سکتا ہے۔ ارادے کی قوت کے اندازے میں ایک بات نوجوانوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیے۔ وہ یہ کہ ارادے کی قوت اس کی ابتدائی شدت سے عبارت نہیں، اس لیے کہ کتنے کام ہیں جو ایک ہی کوشش میں پورے ہو سکیں اور کون سی سرسوں ہے جو ہتھیلی پر جم جاتی ہو۔ مضبوط ارادہ دراصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہماری قومی زندگی کے تعمیری کام تقریباً سب کے سب بہت دیر طلب اور صبر آزما کام ہیں اور ہماری قومی زندگی کے روگ اکثر و بیشتر ایسے ہیں کہ ان کو دور کرنے میں سالہا سال پتہ مار کر مصروف ہونا ضروری ہے۔ قومی خدمت کا ارادہ کرنے والے نوجوان اگر اپنے جوش میں ان میں سے کسی کو دور کرنے کا قصد کریں اور اس گمان میں ہوں کہ بس ایک ہلے میں قلعہ سر ہو جائے گا تو انھیں بڑا دھوکا ہوگا اور عجب نہیں مایوسی قوائے عمل کو شل کر دے اور آئندہ عزم کی راہ میں ایک بڑا سنگ گراں حائل ہو جائے۔

سیرت کی تعمیر کے لیے دوسری شے اجتہادِ فکر ہے۔ منطقی طور پر سوچ سکنے کی صلاحیت، صحیح نتیجے پر پہنچ سکنے، نتائج کو پرکھ سکنے کی استعداد۔ جس کا ذہن صاف نہ ہو اور ٹھیک ٹھیک سوچ بچار نہ کر سکے وہ بھلا عمل میں یکسوئی کیسے پیدا کرے؟ بس اتفاقی تجربی معلومات اور عادت کی لکڑی کے سہارے چند قدم چل سکتا ہے جیسے اندھا ٹٹول کر چلے، لیکن اس ہر لحظہ متغیر دنیا میں قدم قدم پر غیر متوقع حالات اور غیر معمولی کیفیات سے سابقہ پڑتا ہے جسے عقل فیصلہ کرنے میں مدد نہ دے سکے وہ فیصلہ ہی نہیں کرتا اور دعوتِ عمل کو اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتا ہے یا [illegible]

[illegible] دوسرے عمل میں مطابقت نہیں ہوتی، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو دوسرا پیچھے پڑتا ہے [illegible] [illegible] نہیں ہوتا، اس کے لیے شعوری مشق کرنی ہوتی ہے، ارادہ کرکے اس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے کہ ہر تجربہ [illegible] جائے پرکھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ کوشش کرکے ان فطری موانع کو دور کیا جائے جو منطقی فکر کی عادت میں قدم قدم پر حائل ہوتے ہیں۔ جذبات کے طوفان، تخیل کی پھسلن، نفس کے وسوسے، خودغرضی کے فریب، غیر عقلی وابستگیوں کی خیرگی، تعصبات کے اندھیرے، اس فکر منطقی کی راہ میں کیا کچھ حائل نہیں! پھر اگر راستے کی ان رکاوٹوں کو پیہم کوششوں سے دور بھی کردیا تو یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ منطقی فکر کی کوئی ایسی عام صلاحیت نہیں کہ اسے نشوونما دے لی تو زندگی کے ہر شعبے میں صحیح منطقی نتائج پر پہنچنے کی ضمانت ہوگی، بس ہر قضیے پر شبہ کرنے اور اسے پرکھنے کی عادت راسخ کی جاسکتی ہے۔ مجرد علمی مسائل پر غور کرنے کی کوشش عملی سوالوں کے حل میں معتبر نہیں رہتی، نظری ورزش ذہنی اخلاق کے میدان میں کام نہیں آتی۔ اخلاقی مسائل میں منطقی استدلال کی ضرورت ہو تو کچھ اخلاقی تصورات اور اخلاقی اصول بھی تو پہلے سے موجود ہونے چاہئیں اور اصول ہی کافی نہیں ان پر عمل کرنے کا موقع بھی ہونا ضروری ہے۔ اخلاقیات کی دنیا میں یہ معلوم ہونے سے کہ نیکی کیا ہے آدمی نیک تو نہیں ہوجاتا، نیک بننے کے لیے نیکی کرنا بھی لازم ہے۔

آپ جس زندگی میں قدم رکھ رہے ہیں اس میں منطقی فکر کو فریب دینے والے ہر ہر قدم پر ملیں گے۔ سیاسی اور مذہبی نجات فروشوں کی صدائیں، وقت کی سہانی راگنیاں، مرغوب عام، مقبول عام سطحی دلیلیں، ناممکن مطالبے، ضدیں، ہٹ دھرمیاں، جماعتی خودغرضیاں، یہ سب اور نہ جانے کیا کیا اور کون کون آپ کو صحیح نتیجوں پر پہنچنے سے روکیں گے، ان کو رد کرنے میں جو ذہنی کوفت ہوگی اسے اپنے لئے گوارا بنائیں گے۔ اپنے فکر کی نگرانی اسی طرح کریں گے جیسے چوروں اور ڈاکوؤں سے کسی کے متاع عزیز کی، اور سیرت سازی کی۔ اسی شرط دوم کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ورنہ شاید آپ اس مشقت سے تو بچ جائیں۔ جو منطقی فکر کی تربیت میں ضروری ہے۔ شاید آپ بہتوں کو خوش بھی رکھ سکیں۔ لیکن آپ آپ نہ بن پائیں گے دوسروں کا عکس رہیں گے اور انفرادیت سے سیرت، سیرت سے شخصیت کا سفر منزل سے بہت پہلے ختم ہوجائے گا۔

سیرت کی تربیت کے لیے تیسری شرط اشیاء اور اشخاص سے دوچار ہونے میں ذکاوت حس کا ایک کم سے کم درجہ ہے۔ یہ نہ ہو تو سیرت کی تربیت بہت دشوار ہوتی ہے حواس ظاہری کے فعل میں معروف بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کوئی وہ سب سنتا ہے جس کے لئے دوسروں کے کان بہرے ہوتے ہیں، کوئی رنگ کے وہ فرق دیکھتا ہے جو دوسروں کی آنکھیں نہیں دیکھتیں، وہ سونگھتا ہے جو دوسرے نہیں سونگھ سکتے، مزے چکھ لیتا ہے جو دوسرے نہیں چکھ سکتے، چھو کر وہ محسوس کرلیتا ہے جو دوسرے محسوس نہیں کرتے۔ مصور ماہر موسیقی۔ موتی پرکھنے والے جواہرات کے بیوپاری، چاک پہ کمہار، معمل میں سائنس کے کہنہ مشق محقق، یہ سب اپنی ذکاوت حس سے دوسرے بنی نوع کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفس تعلقات انسانی میں بھی ایسی ذکاوت حس کا ثبوت دیتا ہے کہ دوسرے ششدر رہ جاتے ہیں۔ کچھ انسان حساس ہوتے ہیں کچھ بے حس ہے۔ کچھ بہت تیز کچھ بہت کند، کچھ ذکی، کچھ غبی۔ بعض بہت جلد دوسروں کو سمجھ لیتے ہیں۔ آسانی سے ہمدردی کرتے ہیں۔ جبلی طور پر دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اشاروں میں مطلب بھانپ جاتے ہیں۔ دوسروں کے مافی الضمیر تک آن کی آن میں پہنچ جاتے ہیں، بعض اس کے برعکس انسانوں اور چیزوں کے برتنے کا موقع ملتا ہے تو یہ صفت آسانی سے نشوونما پاتی ہے، کتاب کے کیڑے اور خبری علم کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگ بسا اوقات اس سے محروم رہتے ہیں زندگی کی ناکامیاں بچپن میں دل شکستگی، آرام دہ زندگی کا بوجھ آدمی کو اکثر اس ذکاوت سے محروم کردیتے ہیں خودغرضی کی شدت خودپرستی کی عادت رفتہ رفتہ آدمی کو اس ملکۂ لطیف سے عاری کردیتی ہے بے غرض خدمت بے لاگ میل جول اس کو جلا دیتے ہیں آدمیوں سے سابقہ میں، عمل کے متنوع تجربہ میں، طرح طرح کی صحبتوں میں، زندگی کی ریل پیل میں یہ ترقی کرتی ہے۔ خلوت میں اکثر ٹھٹھر جاتی ہے، جلوت میں نکھرتی ہے، تنہائی اسے دباتی ہے، انجمن اسے ابھارتی ہے۔ سیرت کی نشوونما میں اس کا بڑا حصہ ہے جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ زندگی میں کچھ اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں اور سیرت کی تعمیر کے ایک اہم عنصر سے کام نہیں لے سکتے۔

سیرت کی تعمیر میں چوتھی چیز جو مدد دیتی ہے وہ طبیعت کی ہیجان پذیری ہے، یعنی یہ کہ نفس مشاہدات و افکار و تصورات سے کتنا اثر لیتا ہے اور اسے کتنی دیر تک قائم رکھتا ہے ان سے جذبات کی جو لہریں شعور کے دھارے میں اٹھتی ہیں وہ کتنی گہری ہوتی ہیں، اور کتنی مدت تک چلتی ہیں۔

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا، یا بہت کم ہوتا ہے۔ پھر کوئی آدمی کیسے جانے، اور کیونکر جانے کہ فلاں انسان کے دل کی طرح کیسے دھڑکے گی؟ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں آسانی سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہوا کا ذرا سا جھونکا یہاں حرکت پیدا کر دیتا ہے لیکن اتنی ہی آسانی سے یہ حرکت سکون میں بدل بھی جاتی ہے۔ ان کی سیرت میں یکسوئی پیدا ہونا دشوار بات ہے۔ ان پر ہر رنگ چڑھ جاتا ہے، یہ ہر نئے مرد کے پیچھے چلتے ہیں، مگر بس تھوڑی دور، یہ ہر تحریک کا علمبردار بن جاتے ہیں مگر بس چند دن کو، بہت جلد عاشق ہو جاتے ہیں مگر معشوق کو لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں کئی بار مذہب بدلتے ہیں، کئے دن ایک سیاسی جماعت کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہوتے ہیں، سماج کو روز ایک نئے ڈھنگ پر چلانے کے درپے ہوتے ہیں۔ ہر اخبار کی دوا کو آزمانا چاہتے ہیں! بڑے دلچسپ ہوتے ہیں یہ نیک دل، بھلے بھلے لوگ، مگر سیرت کی یکسوئی انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ بہت بڑی ہے ان کی جن کے ذہن میں اگر کوئی نیا خیال جگہ پا لیتا ہے تو گویا ہمیشہ کو اس میں جا بستا ہے۔ ان کے وجود کے ریشے ریشے میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ پھر تو یہ سب نئے خیالوں کو اس خیال کا تابع کر دیتے، اس کو سب نئے تجربات و واردات کا محور بناتے ہیں، پھر زندگی کی ہر ہوا کھا کیا اس بادبان میں بھر کر اپنی سیرت کی کشتی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ خیال ان کا اوڑھنا بچھونا ہو جاتا ہے اور یہ وابستگی فکر و ضمیر اگر اقدار متعلقہ سے ہو جائے تو پھر یہ نہایت صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سونا، جاگنا، مرنا جینا سب کچھ اسی کے لیے ہے۔ جن طبیعتوں کی ہیجان پذیری کے ساتھ گہرائی اور احساس کی پائداری ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے یکسو سیرت بن جاتی ہیں۔

آئندہ شمارے کے متوقع مضامین

کچھ فن کے بارے میں

ڈاکٹر عبدالعلیم

فن انسان کے جذبات اور احساسات کی تصویر ہے۔ اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرقع ہے۔ اس کے ارتقا اس کی تہذیب، اور اس کے تمدن کا آئینہ دار ہے۔ فن افراد کی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ سماج کے اجتماعی واردات کی ترجمانی کرتا ہے۔ سماج کے تصور سے الگ فن کا تصور ناممکن ہے۔ اگر افراد سماجی رشتوں میں منسلک نہ ہوتے اور ان سماجی رشتوں کو مرتب اور مضبوط کرنے کے لئے انھیں ہمکلامی، ہمدردی، ہمرنگی اور ہم آہنگی کی ضرورت نہ ہوتی تو نہ زبان و ادب کا وجود ہوتا نہ نقاشی اور مصوری کا ظہور ہوتا اور نہ رقص و موسیقی نمودار ہوتی۔ ضروریات زندگی کی پیدائش اور فن کی تخلیق میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

جب سے انسان نے فن کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس کی تحصیل بھی شروع کی اسی وقت سے یہ خیال عام ہے کہ جس طرح فن سماجی زندگی کا آئینہ دار ہے اسی طرح وہ سماج کو بہتر بنانے کا ذریعہ بھی ہے اور اسی وقت سے انسان نے اس کو شعوری طور پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ غیر شعوری طور پر وہ ہمیشہ سے ایسا کرتا آیا ہے۔ ادیان و مذاہب کی تبلیغ میں فن کا جو نمایاں کارنامہ ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ نظم اور نثر، مصوری، نقاشی، رقص اور موسیقی غرض یہ کہ فن کی ہر صنف کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اسی طرح سماج کے دوسرے مسائل کو بھی فن کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان نے ہمیشہ فن کو سماجی عمل کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے اور اس کے تقاضوں سے ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ فن برائے فن کے نظریہ کو انسان نے بحیثیت مجموعی کبھی تسلیم نہیں کیا۔ صرف موجودہ دور میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس نظریہ کی علمبرداری کی ہے، مگر اس زمانے میں بھی اگر ساری دنیا کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس نظریہ کو قبول عام کی سند حاصل نہیں ہوتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پرانے زمانے میں ایسا فن تخلیق نہیں ہوا جو سماجی اور اخلاقی اقدار کے منافی ہو۔ ہوا اور اکثر ہوا۔ لیکن کسی نے نظری اعتبار سے ایسے فن کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا۔ جاگیردارانہ سماج میں فن کو امرا کی تفریح کا سامان بنایا گیا اور بے شمار جوہر دار فن کار درباروں کی خدمت میں اپنے فنی فرائض سے بے نیاز ہو گئے۔ لیکن اس قسم کے فنکاروں کو کبھی سراہا نہیں گیا اور نہ خود ایسے فن کاروں نے کبھی اس کا دعویٰ کیا کہ محض تفریحی فن کی تخلیق کوئی عظیم کارنامہ ہے۔ یہ افتخار صرف موجودہ دور کے ایک محدود گروہ کو حاصل ہے کہ وہ فن کو سماج سے الگ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے عجیب و غریب نظریے تراشتا ہے۔

فن برائے فن کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ فن مقصود بالذات ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ان لوگوں کا مطالبہ ہے جو انفرادیت پسندی کی شدت کی وجہ سے سماج سے اپنا رشتہ توڑنا چاہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر اس بے نیازی کو اس کی منطقی حد تک پہنچایا جائے تو زندگی سے بھی رشتہ توڑنا پڑے گا۔ بود و باش، کھانے پینے اور زندگی کی دوسری ضروریات کے لیے تو وہ سماج کا سہارا بڑی خوشی سے لیتے ہیں لیکن جب سماجی ذمہ داریوں کا ذکر آتا ہے تو آزادیٔ فکر و فن کی آڑ لے کر ان سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فن کے کچھ تقاضے ہیں جن سے فنکار کو بے نیاز نہیں ہونا چاہیے۔ تبلیغ کے جوش میں جمالیات کو نظر انداز کر دینا فن کار کے لئے سم قاتل ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ صرف یہ کہ فن کا اچھا نمونہ نہیں پیش کر سکتا بلکہ اپنے تبلیغی مقصد میں بھی ناکام ہوگا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے اور مقصدی فن کے حامیوں کو اس کی خصوصیت پر برابر نظر رکھنی چاہیے۔ فن کے مقصد اور منہاج کے بارے میں عمومی اتفاق کے باوجود اس سے متعلق بنیادی اختلافات بھی ہیں مثلاً ایک گروہ

حیثیت پسندوں کا ہے جو فن کو ابدی قدروں کا حامل بنانا چاہتا ہے، اور دوسری جماعت حقیقت پسندوں کی ہے جو زمانے اور ماحول کی بدلتی ہوئی حقیقتوں اور مستقبل کے امکانات کی عکاسی کرنے کو بنیادی فرائض میں شمار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں جن ابدی قدروں کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سچائی، نیکی اور حسن۔ یہ قدریں اس معنی تو ضرور ابدی ہیں کہ ان کا مجرد یا بسیط تصور ہمیشہ انسانوں کے لئے کشش کا باعث رہا ہے۔ لیکن اگر ان قدروں کے اجزاء ترکیبی کی تحلیل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عہد بہ عہد انسانوں نے ان تصورات کی شرح و تفسیر کس طرح کی ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدریں بھی زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد نہیں ہیں۔ فن اور اخلاق کے باہمی ربط کو ہر دور کے ارباب فکر نے موضوع بنایا ہے اور اس کے بارے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے ہیں۔ فن کی طرح اخلاق سے متعلق بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کی ابدی قدریں اور اخلاق کی ابدی قدریں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فن کو اگر اخلاق کا پابند کیا گیا تو یہ بے رنگ اور بے جان ہو جائے گا۔ اخلاق کے باب میں بھی یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو تو ہر دور اور ہر قسم کے سماج میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کی ہیئت ترکیبی اور اس کے بنیادی اصول میں بھی وقتاً فوقتاً تغیر اور تبدل رونما ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف اخلاق کی ابدیت پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کی اضافیت پر اصرار ہے۔ سماجی رشتوں میں جب بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اخلاق کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ مذہبی اخلاق کا تصور ایک مفروضہ ہے جس کے سانچے میں انسانی عمل کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انسانی سماج کے ارتقا کے تقاضے اس سانچے کو اکثر غیر محسوس طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ فن ہر دور کی اخلاقی قدروں سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اس تاثر کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ نہ تو فن کار معلم اخلاق ہے اور نہ اس کا فن پارہ تہذیب اخلاق کی درسی کوشش۔ اگر فن کو شعوری طور پر پند و نصائح دینے بیٹھے گا تو یہ خطرہ غالب ہے کہ اس میں تخیل اور احساس کی وہ کیفیت باقی نہ رہ سکے گی جو فنی شاہکار کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو فن کو اخلاق سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور فن کے ذریعہ اخلاقی مزاج قائم کرنا چاہتے ہیں میری ناچیز رائے میں سماج کے دشمن ہیں۔

اس مختصر بحث میں ایک اور پہلو کی طرف صرف اشارہ ہی ممکن ہے اور وہ ہے جمالیات کی بحث۔ اس کے بارے میں بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے لیکن سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقیات سے بھی زیادہ جمالیات کے اصول بدلتے ہوئے سماجی احوال سے متاثر ہوتے ہیں پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہر دور کی چند جمالیاتی قدریں ہوتی ہیں اور ہر سماج میں حسن کو پرکھنے کا ایک حد تک مشترک معیار رہتا ہے۔ ہر فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس معیار کو مدنظر رکھتا ہے اور ہر کامیاب فنکار روایت اور اس میدان میں تقلید اور اجتہاد کا توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ فنی اسلوب میں اگر ایک طرف جامد تقلید اکتا دینے والی چیز ہے تو دوسری طرف بے پناہ جدت پسندی بھی بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔ فن کا بنیادی مقصد یہی تو ہے کہ فن کار اپنے جمالی احساسات کو اپنے ناظرین یا سامعین تک پہنچا سکے اور ان کے احساسات میں حرکت پیدا کر سکے۔ کبھی کبھی یہ کام چونکا دینے والی جدت سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جدت میں روایت بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو فنکار کوئی قابل قدر مقام نہیں حاصل کر سکتا اور اس کی جدت کی حیثیت وقتی ہوتی ہے جو ستارے کی طرح جاب کی فن میں جمالیات کا یہ مقام متعین کرنا بھی ضروری ہے اس میں عام طور پر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ فن کی بنیاد جمالیات پر ہے اور جو فن کار جمالیات کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا وہ بڑا فن کار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جمالیات کو مطلق یا مقصود بالذات سمجھنا اور اس کو سماجی ماحول یا انسانی فلاح کے مقصد سے بے نیاز تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔

حالی کی وطن دوستی

پروفیسر ہارون خاں شروانی

۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب آمیز موڑ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو انگریزوں نے ۱۷۵۷ء ہی سے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے تھے اور ملک کا سیاسی و سماجی مرکز، یعنی مغل تاجدار، ان کا وظیفہ خوار بن گیا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا جہاں انھوں نے اور ان کی ملکہ زینت محل بیگم نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں گزارے۔ اب انگریز تمام ملک پر چھا گئے، اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے لگے۔ سر سید احمد خاں نے ہندوستان کی تعلیمی اور سیاسی بدحالی دیکھی تو انھوں نے اس کا مداوا یہ قرار دیا کہ ہندی مسلمان اگر تعلیم سے بہرہ ور ہو جائیں تو وہ ملک کی ترقی میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ مولانا حالی اس نتیجے پر پہنچے کہ عالمی مسلمان عموماً اور ہندی مسلمان خصوصاً جس ابتذال اور پستی کی طرف جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدریں فنا ہو گئی ہیں جن کے سبب سے وہ کسی زمانہ میں معزز و سربلند ہوئے تھے۔ وہ ہندی مسلمانوں کو ہندوستان کی آبادی کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور ان کی اخلاقی ترقی کو وہ پورے دیس کی اخلاقی ترقی سے منسوب کرتے تھے۔

ساٹھ باسٹھ برس کی بات ہے۔ مسدس حالی کا شمالی ہندوستان میں بڑا چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا اس مسدس مدوجزر اسلام کو شوق سے پڑھتا اور اس مناجات کو جو اس مسدس کے تتمے کی طور پر چھپی ہوئی ہے گنگناتا تھا۔ میرے والد حاجی موسیٰ خاں صاحب مرحوم نے مجھے اسکول میں داخل کرنے سے پہلے تھوڑی بہت اردو، فارسی، عربی، گھر پر ہی پڑھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میرے لیے جو گھریلو نصاب بنایا گیا تھا اس میں مسدس حالی بھی شامل تھی، اور میرے استاد مولوی امان الرحمٰن صاحب دہلوی نے مجھے یہ مسدس کم و بیش حفظ کرا دی تھی۔ اسکول فائنل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میرے والد صاحب نے مجھے اوائل عمری میں انگلستان بھیج دیا۔ ۱۹۰۹ء میں بڑی چھٹیاں گذارنے کے لئے ڈھائی مہینے کے لئے گھر آیا۔ اس زمانہ میں علیگڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک مرحوم تھے جن سے والد مرحوم کے گہرے روابط تھے۔ مولانا حالی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم نے انھیں ظہرانے پر مدعو کیا اور والد مرحوم کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر مجھے مولانا کی بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور بچپن میں مسدس حالی کے جو اثرات میرے دل و دماغ پر پڑے تھے وہ اس وقت تک قائم تھے۔ میرے اوپر مولانا کی ہم نشینی کا بہت اثر ہوا۔ آج بھی ان کا نورانی چہرہ، سفید گول داڑھی، کالی ٹوپی، کالی اچکن، گلے میں رومال بندھا ہوا، گٹھا ہوا بدن، دل پر نقش کئے ہوئے ہیں اور ان مٹ ہیں۔ یہ میری پہلی اور آخری ملاقات مولانا حالی سے تھی۔ میرے ولایت سے واپس آنے کے چند مہینے بعد حالی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اردو ادیبوں کے حلقوں میں عام طور پر اور علیگڑھ کے حلقوں میں خاص طور پر ان کی وفات کا کس قدر اثر ہوا تھا۔ میں یہاں اس نظم کے دو بند پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں جو اس زمانے کی مشہور شاعرہ اور شروانی خاندان کی ایک نامور خاتون [illegible] مرحومہ نے حالی کی موت پر لکھا تھا وہ کہتی ہیں:

سوکھنے پائی نہ تھی چشمِ گہربار ابھی — اور تھی سیرابیِ صد کشت کو طیار ابھی
بھرنے پایا تھا نہ زخمِ دلِ افگار ابھی — گھٹنے پایا تھا نہ رنج و غمِ بسیار ابھی
ہم نہ بھولے تھے غمِ شبلی غمخوار ابھی — مٹنے پائے تھے نہ اس سوگ کے آثار ابھی
کر دیئے زخم ہرے پھر فلکِ اخضر نے — پھر کیا خون دل سے سرخی چشمِ تر نے

ہیئت پسندوں کا ہے جو فن کو ابدی قدروں کا حامل بنانا چاہتا ہے، اور دوسری جماعت حقیقت پسندوں کی ہے جو [illegible] حقیقتوں اور مسئلوں کے احساسات کی عکاسی کو فن کی بنیادی فرائض میں شمار کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جن ابدی قدروں کا عام طور پر ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

سچائی، نیکی اور حسن۔ یہ قدریں جس حد تک آمیز اور ابدی ہیں کہ ان کا مجرد یا بسیط تصور ہمیشہ انسانوں کے لئے کشش کا باعث رہا ہے۔ لیکن اگر ان قدروں کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ عہد بہ عہد انسانوں نے ان تصورات کی شرح و تفسیر کس طرح کی ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدریں بھی زمان و مکان کی پابندیوں سے یکسر آزاد نہیں ہیں۔ فن اور اخلاق کے باہمی ربط کو ہر دور کے ارباب فکر نے موضوع بنایا ہے اور اس کے بارے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے ہیں۔ فن کی طرح اخلاق سے متعلق بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فن کی ابدی قدریں اور اخلاق کی ابدی قدریں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فن کو اگر اخلاق کا پابند کیا گیا تو اس کا رنگ اڑ جائے گا اور بے جان ہو جائے گا۔ اخلاق کے باب میں بھی یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس کی اہمیت اور ضرورت کو تو ہر دور اور ہر قسم کے سماج میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کی ہیئت ترکیبی اور اس کے بنیادی اصول میں بھی وقتاً فوقتاً تغیر اور تبدل رونما ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف اخلاق کی ابدیت پر زور دیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کی اضافیت پر اصرار ہے۔ سماجی رشتوں میں جب بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو اخلاق کا معیار بھی بدل جاتا ہے۔ غیر متبدل اخلاق کا تصور ایک مفروضہ ہے جس کے سانچے میں انسانی عمل کو ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انسانی سماج کے ارتقاء کے تقاضے اس سانچے کو اکثر بیشتر توڑتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ فن ہر دور کی اخلاقی قدروں سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ قدریں بدلتی رہتی ہیں اس لیے اس تاثر کی حیثیت بھی بدلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ نہ تو فن کار معلم اخلاق ہے اور نہ اس کا فن پارہ تہذیب اخلاق کی درسی کتاب۔ اگر فن کار شعوری طور پر پند و نصائح دینے بیٹھے گا تو یہ خطرہ غالب ہے کہ اس میں تخیل اور احساس کی وہ کیفیت باقی نہ رہ سکے گی جو فنی شاہکار کی تخلیق کی محرک ہوتی ہے لیکن وہ لوگ جو فن کو اخلاق سے بے نیاز سمجھتے ہیں اور فن کے ذریعہ بداخلاقی مزاج قائم کرنا چاہتے ہیں میری ناچیز رائے میں سماج کے دشمن ہیں۔

اس مختصر بحث میں ایک اور پہلو کی طرف صرف اشارہ ممکن ہے اور وہ ہے جمالیات کی بحث۔ اس کے بارے میں بھی ابدی قدروں کا سوال اٹھایا جاتا ہے لیکن سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقیات سے بھی زیادہ جمالیات کے اصول بدلتے ہوئے سماجی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دور کی چند جمالیاتی قدریں ہوتی ہیں اور ہر سماج میں حسن کو پرکھنے کا ایک حد تک مشترک معیار رہتا ہے۔ ہر فن کار شعوری یا غیر شعوری طور پر اس معیار کو مدنظر رکھتا ہے اور ہر کامیاب فنکار وہی ہے جو اس میدان میں تقلید اور اجتہاد کا توازن قائم رکھ سکتا ہے۔ فنی اسلوب میں اگر ایک طرف جامد تقلید اکتا دینے والی چیز ہے تو دوسری طرف بے پناہ جدت پسندی بھی بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔ فن کا بنیادی مقصد یہی تو ہے کہ فن کار اپنے جمالی احساسات کو اپنے ناظرین یا سامعین تک پہنچا سکے اور ان کے احساسات میں حرکت پیدا کر سکے۔ کبھی کبھی یہ کام چونکا دینے والی جدت سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جدت میں روایت بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو فنکار کوئی قابل قدر مقام نہیں حاصل کر سکتا اور اس کی جدت کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو [illegible] کی۔ فن میں جمالیات کا یہ مقام متعین کرنا بھی ضروری ہے اس میں عام طور پر افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ فن کی بنیاد جمالیات پر ہے اور جو فن کار جمالیات کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا وہ بڑا فن کار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جمالیات کو مطلق یا مقصود بالذات سمجھنا اور اس کو سماجی ماحول یا انسانی فلاح کے مقصد سے بے نیاز تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔

حالی کی وطن دوستی

بقلم ہارون خاں شروانی

۱۸۵۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلاب آمیز موڑ سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو انگریزوں نے ۱۷۶۵ء ہی سے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے تھے، اور ملک کا سیاسی و سماجی مرکز، یعنی مغل تاجدار، ان کا وظیفہ خوار بن گیا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغلوں کے آخری نام لیوا بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا جہاں انھوں نے اور ان کی ملکہ زینت محل بیگم نے اپنی زندگی کے آخری دن نہایت افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں گذارے۔ اب انگریز تمام ملک پر چھا گئے، اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے لگے۔ سر سید احمد خاں نے ہندوستان کی نکبت اور سیاسی بدحالی دیکھی تو انھوں نے اس کا مداوا یہ قرار دیا کہ ہندی مسلمان اگر تعلیم سے بہرہ ور ہو جائیں، تو وہ ملک کی ترقی میں برابر کے شریک ہو جائیں گے۔ مولانا حالی اس نتیجے پر پہنچے کہ عالمی مسلمان عموماً اور ہندی مسلمان خصوصاً جس ابتذال اور پستی کی طرف جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی قدریں فنا ہو گئی ہیں جن کے سبب سے وہ کسی زمانہ میں معزز و سربلند ہوئے تھے۔ وہ ہندی مسلمانوں کو ہندوستان کی آبادی کا جزو لاینفک سمجھتے تھے اور ان کی اخلاقی ترقی کو وہ پورے دیس کی اخلاقی ترقی سے منسوب کرتے تھے۔

ساٹھ باسٹھ برس کی بات ہے، مسدس حالی کا شمالی ہندوستان میں بڑا چرچا تھا۔ ہر پڑھا لکھا اس مسدس مد و جزر اسلام کو شوق سے پڑھتا اور اس مناجات کو جو اس مسدس کے تتمے کی طور پر چھپی ہوئی ہے گنگناتا تھا۔ میرے والد حاجی موسیٰ خاں صاحب مرحوم نے مجھے اسکول میں داخل کرنے سے پہلے تھوڑی بہت اردو، فارسی، عربی، گھر پر ہی پڑھنے کا انتظام کر دیا تھا۔ میرے لیے جو گھریلو نصاب بنایا گیا تھا اس میں مسدس حالی بھی شامل تھی، اور میرے استاد مولوی امان الرحمٰن صاحب دہلوی نے مجھے یہ مسدس کم و بیش حفظ کرا دی تھی۔ اسکول فائنل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میرے والد ماجد نے مجھے اوائل عمری میں انگلستان بھیج دیا۔ ۱۹۰۹ء میں بڑی چھٹیاں گذارنے کے لئے ڈھائی مہینے کے لئے گھر آیا۔ اس زمانہ میں علیگڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک مرحوم تھے جن سے والد مرحوم کے گہرے روابط تھے۔ مولانا حالی علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ نواب صاحب مرحوم نے انھیں ظہرانے پر مدعو کیا اور والد مرحوم کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر مجھے مولانا کی بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں میری عمر اٹھارہ برس کی تھی اور بچپن میں مسدس حالی کے جو اثرات میرے دل و دماغ پر پڑے تھے وہ اس وقت تک قائم تھے۔ میرے اوپر حالی کی ہم نشینی کا بہت اثر ہوا۔ آج بھی ان کا نورانی چہرہ، سفید گول داڑھی، کالی ٹوپی، کالی اچکن، گلے میں رومال بندھا ہوا، گٹھا ہوا بدن، دل پر نقش کئے ہوئے ہیں اور انمٹ ہیں۔ یہ میری پہلی اور آخری ملاقات مولانا حالی سے تھی۔ میرے ولایت سے واپس آنے کے چند مہینے بعد حالی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اردو ادیبوں کے حلقوں میں عام طور پر اور علیگڑھ کے حلقوں میں خاص طور پر اس حادثہ فاجعہ کا کس قدر چرچا تھا۔ میں یہاں اس نظم کے دو بند پڑھنے کی اجازت چاہتا ہوں جو اس زمانے کی مشہور شاعرہ اور شروانی خاندان کی مایہ ناز خاتون [illegible] مرحومہ نے حالی کی موت پر لکھا تھا، وہ کہتی ہیں:

سوکھنے پائی نہ تھی چشم گہربار ابھی — اور تھی سیرابیٔ صد کشت کو ملیار ابھی
بھرنے پایا تھا نہ زخم دل افگار ابھی — گھٹنے پایا تھا نہ رنج و غم بسیار ابھی
ہم نہ بھولے تھے غم شبلی غمخوار ابھی — مٹنے پائے تھے نہ اس سوگ کے آثار ابھی
کر دیئے زخم ہرے پھر فلک اخضر نے — پھر کیا خون دل اے سرخیٔ چشم تر نے

[illegible] کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
[illegible] دیکھنا ایسے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
[illegible] دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خواب   دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو   اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ   ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ رلانا ہرگز
کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی   ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر   اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی   یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز [1]

یہ نظم پہلی کی پوری قنوطیت میں ڈوبا ہوا ایک مرثیہ ہے، دل سے نکلی ہوئی ایک آہ ہے۔ جیسے کوئی مرجائے تو پس ماندوں کے لئے نالہ و بکا کے علاوہ کوئی دوسری کیفیت نہیں ہوتی، اسی طرح حالی کے نزدیک دلی مرچکی تھی اور دوبارہ اس کا جنم لینا ناممکن تھا۔ انھوں نے یہ دیکھا تھا کہ انگریزوں نے آزادی کے متوالوں کو کس بے دردی اور بے رحمی سے ختم کیا تھا اور اب حالی کسی قسم کی بہتری سے نا امید ہو چکے تھے۔ گویا گنگنانے لگتے ہیں :-

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے   اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے [2]

سرسید کے اثر نے اس قنوطی رجحان کو اس یاس کو آس سے تبدیل کر دیا۔ سرسید ایک عملی انسان تھے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کی خونچکاں داستان اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی مگر ابتدا ہی سے وہ اس فکر میں تھے کہ ملک کی حالت میں جو عظیم تبدیلی ہوئی ہے اور ملک پر تاریکی کی جو گھنگھور گھٹا امنڈ آئی ہے اس کا مداوا کیا ہے، اور یہی وہ محرک تھا جس نے حالی کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ملک پستی کے جس گڑھے میں گر گیا ہے اس پر صرف رونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ بلکہ ان تدبیروں کو سوچنا ہے جن کو اختیار کرنے سے شاید وہ از سر نو ابھر آئے۔ حالی ۱۸۷۱ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بنیاد اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک ہے اور جس کی حقیقت نہ ملنے سے سلطنت کی بڑی خوبی آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی اگر سچ پوچھیے تو اس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں .... مگر مسلمانوں نے اب بھی بے پروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے کچھ پروا نہ کی تو ان کی وہی مثل ہوگی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے ......" [3]

ایک اور مضمون میں جو ۱۸۷۹ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپا وہ علی گڑھ کا حال لکھتے ہیں :-

" اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی، مگر جس قدر مدرسے کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالس وعظ میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم نے اونچے اونچے ممبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں ہم حال

---

[1] نوائے آزادی، ادبی پبلشرز، بمبئی ۱۹۵۷ء "مرثیہ دہلی" ص ۱۸
[2] مدوجزر اسلام، دیباچہ ۱۲۹۶ ہجری۔
[3] حالی: سید احمد خاں اور ان کے کام، مقالات حالی، ص ۳

مقالات [illegible] ... [illegible]
جانشیں [illegible] ... اس مدرسہ کو [illegible] ... جوش [illegible]
کا اب [illegible] ہو گا ...... ہم مدرسۃ العلوم کے اس وسیع میدان میں [illegible] کے وقت ایک [illegible]
اور مال جان اور دل کی بازی لگا کر سرسید اور قوم کے ہمدرد کے نہایت ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ دوڑ دھوپ کرتے ہوئے دیکھا ہے
جیسا اس کے سوا سے راحت اور دل اس کو اسی دھن میں سرگرم پایا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو اس شخص سے
یہ عظیم الشان کام لینا ہے۔ نہ رئیسوں اور تعلقہ داروں کی بے پروائی اس کے ارادوں کو روک سکتی ہے اور نہ زید و عمر کی مخالفت
اس کی ہمت توڑ سکتی ہے ...... [1]

جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا ۔۔۔ ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی [2]

انھوں نے غزل کی بجائے نظم کو اپنا شیوہ بنایا اور مبالغہ پسندی کی بجائے حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے، تو حسن اتفاق سے انھیں اس میدان کا ایک ہمسفر مل گیا۔ انھیں سات آٹھ برس تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ساتھ ان کی جاگیر جہانگیر آباد ضلع بلند شہر رہنے کا موقع ملا۔ نواب صاحب بھی مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اسی کو منتہائے شاعری سمجھتے تھے۔ [3]

ایک طرف آسان زبان میں نظم لکھنے کی طرف میلان دوسری طرف سرسید کی ترغیب، یہ دونوں مسدس اور بعض دوسری نظموں اور مثنویوں کے لکھنے کے محرک ہوئے اور یہ سب نظمیں اور مثنویاں ایسی ہیں کہ ان میں سماج کی برائیوں اور ان کی اصلاح کا طریقہ دکھایا گیا ہے۔

مسدس کے اصل میں دو حصے ہیں ایک کو تنزل کہنا چاہیے اور دوسرے کو جسے حالی نے ضمیمہ کا لقب دیا ہے۔ رجائی۔ دونوں حصے ایک اعتبار سے ایک دوسرے کا تتمہ ہیں۔ پہلے حصے میں اسلام کے سچے اور اچھے اصول، ان اصول کی باعث مسلمانوں کا دنیا میں پھیلنا اور تہذیب و تمدن علم و عمل کی تکمیل کا [illegible] کے بعد کا زوال، تہذیب کے اصولوں کی بھول، دوسروں سے تعصب، آپس کی نفرتیں، بد اخلاقی، غیبت، حسد، تکبر، کم ہمتی، کذب و مبالغہ [illegible] وغیرہ علاوہ ان سے ایک عظیم الشان قوم کیسے تنزل ہوا۔ یہ سب بیان کیا گیا ہے مسدس کے پہلے حصے کے آخر میں وہ حسرت و یاس سے کہتے ہیں۔ [4]

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے ۔۔۔ سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا سے زمانہ کی عادت یہی ہے ۔۔۔ طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے
بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر
کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی ۔۔۔ کہاں ہیں وہ گردان زابلستانی
گئے پیشدادی کدھر اور کیانی ۔۔۔ مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
نکالو کہیں کھوج کلدانیوں کا
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کا

---

[1] حالی، مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ، مقالات حالی، صفحہ ۱۴۱
[2] مدوجزر اسلام، دیباچہ ۱۲۹۶ ہجری
[3] ترجمہ حالی، مقالات حالی صفحہ ۲۶۷
[4] مدوجزر اسلام خاتمہ

[illegible]

[illegible] ناامیدی کی جگہ امید کا [illegible]

[illegible] امید کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے۔[2]

> نہیں اے ناامیدی ہونے دل بجھا تو — جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
> خدا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو — شکستہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو
>
> ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
> جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں!

> یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے — عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
> جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے — تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے
>
> مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
> کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا[2]

اس حصے میں وہ ان عادتوں اور خصلتوں کا جائزہ لیتے ہیں جنہیں اختیار کرنے سے قومیں بگڑ کر بن سکتی ہیں۔ یہ عادتیں محنت پسندی، خود داری یعنی توقیر انسان، علوم و فنون سے رغبت، جدید علوم کا اکتساب، علم والوں کی قدر افزائی، یہ سب مولانا حالی کے نزدیک ایسی خصلتیں ہیں جن سے گری ہوئی قومیں ابھر سکتی ہیں۔

مسدس میں زیادہ تر ہندی مسلمان مخاطب ہیں مگر جو خصلتیں کسی قوم کو بناتی ہیں اور جو عادتیں انھیں بگاڑتی ہیں وہ کچھ اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ ان کا اطلاق کسی قوم پر بھی ہو سکتا ہے۔ حالی نے نہ صرف اپنی مسدس میں تعصب کو جہنم سے تعبیر کیا ہے[3] بلکہ اس بد خصلت پر ۱۸۷۴ء میں ایک مستقل نظم بھی لکھی ہے، جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ انسان سمجھے کہ وہ خود کمالات کا پتلا ہے اور اسے اپنی خامیاں اور دوسروں کی اچھائیوں سے بہتر نظر آئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تعصب ایک دھوکا ہی دھوکا ہے اور اگر کوئی قوم اپنی بری چیز کو بھی اچھی چیز سمجھتی ہے تو جان لینا چاہیے کہ اس کے برے دن قریب ہیں۔

> دیکھا جب عالم انصاف کا رنگ — ہم کو خود آنے لگا آپ پہ ننگ
> خوبیاں اپنی جو تھیں ذہن نشیں — ان پہ ہم کرنے لگے خود نفریں
> عیب سب اپنے نظر آنے لگے — آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
> جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا — اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا
> قصر و ایواں کا گماں تھا جن پر — نکلے وہ خردہ گھروندے اور کھنڈر
> جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا — ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا

---

[1] افتخار عالم، تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ صفحہ ۱۳۵۔ مکمل جدول کو راقم الحروف نے اپنے مضمون "سید احمد خاں اور ہندو مسلم اتحاد" میں نقل کیا ہے جو کتاب "علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز" صفحہ ۱۹۳ تا صفحہ ۲۱۵ پر چھپا ہے۔

[2] مد و جزر اسلام، ضمیمہ، ۱۳۰۳ ہجری

[3] "تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم / جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم"

سب پہ الفت ہے ... سب ہیں خیالات اپنے

تعصب کی بجائے ایک قدم آگے بڑھ کر حالی کو حب وطن کے گیت گاتے پائیں گے اس موضوع پر ان کی ایک مستقل مثنوی ... لکھی گئی تھی اس کے آغاز میں حالی کائنات کی خوبصورتی پر مچلتے ہیں اور ناز کرتے ہیں یہ کہتے ہیں[2]

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے مورد آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

....

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشق زار
کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
ہے نباتات کا نمو تجھ سے — روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

....

وہ کہتے ہیں کہ حب وطن ہر دوسرے جذبے سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ وہ پوچھتے ہیں :-

نام ہے کیا اسی کا حب وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار — پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

وہ اب بیان کرتے ہیں کہ اصلی حب وطن کونسا جذبہ ہے :-

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد
قوم پہ کوئی زد نہ دیکھ سکے — قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو — قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

مثنوی کے آخری بندوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی سماجی مساوات کے کس حد تک قائل تھے۔ فرماتے ہیں

جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ — دل کو دکھ بھائیوں کا یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک — کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ — ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
مقبلوں مدبروں کو یاد کرو — خوش دلو غمزدوں کو یاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

اس کے بعد وہ سچی وطن دوستی کی تعریف کرتے ہیں اور اپنی وسیع مشربی کا پورا ثبوت دیتے ہیں۔

---

[1] حالی: تعصب و انصاف، مجموعہ نظم حالی، صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۶۶

[2] حالی: حب وطن، مجموعہ نظم حالی صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۳۱

[illegible] | [illegible]

[illegible] | ہو مذہب ہو اس میں یا برہمو
جعفری ہو یا کہ ہو حنفی | جین مت ہووے یا کہ ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو | سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

اب ملاحظہ کیجیے :-

ملک ہیں اتفاق سے آزاد | شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں ہوتا اتفاق اگر | کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی | اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ | لگی غیروں کی تم پہ پڑنی نگاہ

حالی بھی سرسید کی طرح دل سے وطن دوست تھے۔ مگر جس نکبت اور افلاس کی حالت میں وطن عزیز کی آبادی کا ایک حصہ نے اپنی قابل رشک اور اعلیٰ مرتبہ کھو دیا تھا۔ اس پر وہ سوچتے ہیں اور اس نکبت و افلاس کا تجزیہ کرنے کے ساتھ وہ بعض عالمگیر حقیقتوں اور اصولوں تک پہنچ جاتے ہیں جو قوموں کے عروج و زوال کا باعث ہوتے ہیں۔ سرسید کی طرح انھیں بھی اس کا یقین ہے کہ جب تک گاڑی کا ہر پہیہ اپنا اپنا کام ٹھیک انجام نہ دے جائے گا اس وقت تک گاڑی کا چلنا محال ہے۔

یہاں ایک دلچسپ بات یہ کہنی ہے کہ جس طرح سرسید کا حالی پر اثر تھا اسی طرح سرسید بھی حالی سے متاثر تھے اور مسدس حالی کا تو اُن پر خاص اثر پڑا تھا۔ ۱۰ جون ۱۸۷۹ء کو وہ شملے سے مولانا حالی کو لکھتے ہیں :-

" جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ وہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے .... اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف انہی الفاظ میں ہے جس میں میری طرف اشارہ ہے۔ بیشک میں اس کا محرک ہوا ہوں اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں .... مسجد کے اماموں کو چاہیئے کہ خطبوں میں اس کے بند پڑھا کریں .... لڑکے ڈنڈوں پر بانسے پھریں ...... قوال درگاہوں میں گائیں حال لانے والے اس پہ حال پر حال لا دیں ...... " [1]

....

جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف حالی میں حب وطن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا تو دوسری جانب وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ حیثیت ایک مسلمان کے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے سامنے ان کو آشکارا کریں جن کی وجہ سے جاہل وحشی اور خونخوار عرب ایک عظیم الشان اور فاتح ملک پر حکمرانی کر کے تہذیب و شائستگی، دیانت اور انسان دوستی میں دنیا بھر کے معلم بن گئے۔ جب تک وہ سرسید سے نہ ملے تھے اس وقت تک انھیں دنیوی جاہ کی طرف راستہ نظر آیا تھا۔ لیکن سرسید سے ملنے کے بعد کا یکا یک ان میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا اور ان کے دماغ نے ایک نئی روشنی محسوس کی انھیں اس کا اندازہ ہونے لگا کہ ہندی مسلمانوں کے مرض کا ایک اور صرف ایک نسخہ ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے اخلاق اور اپنے کردار کو درست کریں، اپنے وطن سے محبت کریں، اسلاف نے جو نمونے چھوڑے ہیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور جدید علوم سے استفادہ کریں۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ اگر ان کے ہم وطن مسلمان نے چیتی کیا تو وہ قعر ذلت سے نکل سکیں گے اور پہلے سے بھی زیادہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

---

[1] خطوط سرسید، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۴ء، صفحہ ۱۶۹

باری تعالیٰ قرآنی دلائل کی روشنی میں

محمد عبدالسلام خاں

کائنات کی علت

کائنات کی علت، وہ مادہ ہو یا اس کی کوئی بدلی ہوئی صورت یا کچھ کوئی زیادہ انجانی نامعلوم حقیقت ـــــ عقل کا وہ ماندگی، تجسس کی نارسائی اور جستجو کی ناکامی سے بچنے، اتفاق یا حادثہ کہہ کر گزر جائے ـــــ یہ بہرحال ایسی حقیقت ہے جس کو مانے بغیر انسانی عقل ایک قدم آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ کائنات ہی کوئی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

انسانی شعور کی پوری معلوم تاریخ ـــــ چٹانوں پر ہو یا ستونوں اور کھنڈروں میں، زمین دوز مقبروں میں ہو یا مندروں اور محلوں کے کتبوں میں، دریائی کہانیوں، گیتوں میں ہو یا پتوں، چھالوں، تختیوں اور کاغذوں میں ـــــ یہ تسلسل و تواتر گواہ ہے کہ بالادست اور ماوراء قوت کی ہستی کا احساس انسان کا فطری ہے۔ اگر ہستی خارجی واقعہ ہے تو انسانی شعور کے لئے ایک بالادست طاقت بھی حقیقت اور خارجی واقعہ ہے۔

اس بالادست قوت سے تغافل برتا جائے، مبالغہ آمیز دلائل اور نارسا تشابہات کے بوجھ سے اس فطری احساس کو دبا دیا جائے لیکن اس کو بالکل مٹا دینا بس کی بات نہیں۔ کائنات ہو یا انسانی شعور ایک ماورائی حقیقت دونوں میں رچی بسی ہے۔ نہ کائنات اس سے آزاد ہو کر رہ سکتی ہے اور نہ انسانی شعور اس کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ کائنات کی یہ فطرت ہے، انسانی شعور کی یہ ساخت ہے۔

کائنات کی علت کے اوصاف اولیہ

انفس ہوں یا آفاق اس ماورائی مقتدر اور بالادست طاقت کے کھلے اور واضح علامات میں نمایاں ہیں جو پکار رہے ہیں کہ وہ حق ہے: "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ" اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جائیں تو خود کائنات کی ہستی تاریک ہو جائے گی۔ عالم کی مشاہدہ اور احساس کا اولین حقیقت ہے۔ ہستی کی اصل گواہی اور عملی شہادت یہی ہے: "أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝" موجودات میں یہی سب سے عظیم و کبیر سب سے برتر اور علی و متعال اور اولیٰ حقیقت ہے جو ہستی کے سلسلے کو تھامے ہوئے اور قائم رکھے ہوئے قیوم ہے۔ خود ہر شے کی نگران اور رقیب، حفیظ، مقیت اور مہیمن ہے۔ قرآن نے اس ظاہر اور کھلی ہوئی حقیقت کو مسلم اور ناقابل انکار واقعیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کو خود کسی ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ چیزیں اس کی شہادت کی محتاج ہیں۔ وہ خود بے نیاز اور صمد ہے۔ عالم اس کا محتاج ہے وہ عالم سے بے پرواہ اور غنی ہے۔ یہ حقیقت ذات، علت ـــــ جو بھی نام رکھو ـــــ پوری کائنات کو محیط ہے اتنی وسیع ہے کہ اس کی وسعت اور سمائی سے کوئی شے باہر نہیں۔ روزمرہ کے مسلسل اور متواتر تغیرات، تحولات اور شئون کی در پردہ اور باطنی علت کے طور پر وہ خود غیر متغیر اور متعین ہے۔ یہ سب سے پہلی اور اول ہے، یہ سب سے پچھلی اور آخر ہے یہی وہ یکتا اور احد ہے جو کائنات سے قریں اور قریب ہے۔ اور یہ کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ اس کو اس کی حقیقی حیثیت میں نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ سب پر فوق اور سب پر غالب ہے۔ عزیز اور سب میں گراں اور گراں مایہ، یہ سلسلہ کی سب سے اونچی کڑی اور تمام کڑیوں کی ہستی کی آخری کفیل ہے۔

حیات و ارادہ اور ان کے متعلقات، شعور وغیرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے جہاں تک مذکورہ قرآنی اوصاف کا تعلق ہے اس حقیقت کو ماننے کے لئے لازم ہیں بلکہ اس حقیقت کا انسانی تصور و تعقل کم و بیش یہی اوصاف ہیں۔ انسانی عقل نے جہاں وہ کمک کرتے ہی اور شک ہیں محتاج ہے وہ اس حقیقت کی حیاتی خصوصیات شعور، ارادہ اور اختیار یا کائنات سے اس کے تعلق کی نوعیت اور اس تعلق کی بنیاد پر اس کا

[illegible] ہیں ...... فضا جہاں میں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں
[illegible] اور حیات آفریں اور باشعور اور شعور رسا۔ انسان کی آفرینش کی ابتداء بے جان اور بے شعور مادے سے
[illegible] کی شکل کو حقیر پانی (یا مرطوب رطوبت) میں سے خلاصے [1] (یا تخم) سے بنایا پھر اس کو برابر (اور درست) کیا اور اس میں
[illegible] پھونکا: (۳۲: ۹-۷، ۱۵: ۲۹) یہ انسانی ہمواری اور تسویہ یک بارگی اور دفعتاً نہیں ہوا بلکہ متعدد مستقل صورتوں کے مراحل سے گزر کے
انسان نے یہ مناسب اور متوازن صورت اختیار کی ہے پھر یہ ارتقا کھلی اور روشن فضا میں نہیں ہوا ہے بلکہ شکم مادر کی اندھیری کوٹھری میں [illegible]
جو جھلی کے اندر، پہلے بیضہ مادری کی جھلی میں اور پھر دیوار رحم کے اندر سوراخ میں اور آخر میں مشیمے اور جرثومی جھلی کی اندھیاری میں۔ سلالہ نطفہ
کے ہر مرحلے اور ہر ظرف و مقام کے مناسب خلق کے انداز بدلے: "تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے تین تاریکیوں میں ایک کے بعد دیگرے
(اطوار) آفرینش سے" (۳۹-۶: ۲۳-۱) چنانچہ نطفے [2] (یا باردار بیضہ مادری) کے اندر سے ضروری تغیروں کی تکمیل کے اثنا میں یہ جنینی مادہ بہتا ہوا
اور آخر میں اس بیضوی جھلی کو توڑتا ہوا دیوار رحم کی جھلی کو کاٹ کر تدریجاً اس سے متعلق اور اس میں جم جاتا ہے اب علقے [3] یا جنین (Embryo)
کی صورت میں مناسب نشوونما پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ارتقا کے ایک خاص اور اہم مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور پہلے غیر تمیز اور انسانی
مضغے یا جسد اور پیکر (Foetus) کی شکل لے لیتا ہے۔ اول اول خاص خاص اعضاء کی علامتیں ظاہر ہونی شروع ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ
تمام اعضاء صورت پذیر ہو جاتے ہیں [6]۔ اور یہ انسانی پیکر بچہ اور طفل ہو کر سات قمری مہینوں میں ہی یا پھر مزید قوت و کمال حاصل کر کے
کم و بیش دس قمری مہینوں میں انسانی برادری کے اضافے کا باعث ہو جاتا ہے: "ہم نے تو تمہیں مٹی (اور بے جان مادے) سے پیدا
کیا تھا۔ پھر نطفے سے پھر علقے سے پھر تام اور نا تمام لوتھڑے سے تاکہ (ان عجیب و غریب مراحل آفرینش سے) تمہارے لیے (اپنے آپ کی طرح)
کھول دیں اور ہم تمہیں ارحام (مادر) میں جب تک چاہتے ہیں (تاہم) معین مدت کے لیے رکھتے ہیں۔ پھر بچے کی حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر بچے کی
حیثیت میں تمہیں نکالتے ہیں پھر (یہ نشوونما جاری رہتی ہے) کہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ" [7] (۲۲-۱۷: ۱-۲۲) اب کی موجودہ شکل و صورت پہ

---

[1] لسان العرب میں ہے۔ السل انتزاع الشیء واخراجه فی رفق ...... سلالة الشیء ما استل منه۔ من سلالة من ماء میں دوسری "من" غالباً ابتدا کے لیے ہے۔ واللہ اعلم

[2] تقریباً دس گیارہ دن میں مادہ تولید یا نطفہ بیضہ مادری کی جھلی میں بند بہتا ہوا دیوار رحم تک پہنچ جاتا ہے اور پھر جھلی توڑ کر دیوار رحم میں تدریجاً سرایت کر کے علقہ کی صورت میں استقرار پا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ مشیمے (Chorion) کے اندر جرثومی جھلی (Amnion) پھیل کر اس کو لپیٹ لیتی ہے۔ اس طرح شکم مادر کے اندر رحم، مشیمہ اور جرثومی جھلی کی تین تاریکیوں میں جنین جسدی انداز (پہلے غیر مخلقہ یا نا تمام مضغے اور پھر تام اور مخلقہ مضغے کی شکل میں) اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

[3] لسان العرب میں ہے۔ النطف الصب ...... ونطفان الماء سیلانه۔ گویا باردار بیضے پر نطفے کا اطلاق اس کی اس بہاؤ اور سیلان کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔

[4] علق بالشیء علقا وعلقة: نشب فیه وعلق الشیء علقا وعلقا وعلق به علاقة وعلوقا لزمه
لسان العرب کی اس تعریف کے بموجب علقے میں تعلق، سرایت کر جانے اور استقرار پا جانے کا مفہوم شامل ہے۔

[5] اذا صارت العلقة التی خلق منها الانسان لحمة فهی مضغة (لسان العرب)

[6] یہاں پہلے مضغۂ غیر مخلقہ اور پھر مخلقہ یا تمام اور نا تمام لوتھڑے کی شکلیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں۔ مخلقہ کو مقدم کرنے میں اس کی مثبت حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہے تاکہ منفی غیر مخلقہ کا مفہوم واضح ہو جائے۔ ترتیب کو سامع کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

[7] ایک دوسرے مرحلے پر مضغے یا جسد اور پیکر (Foetus) کے دوسرے اندرونی تغیرات کو بیان کیا ہے کہ مضغے میں پہلے ابتدائی ہنو

[illegible] سے متفاوت کرو تو تم اس کی قدرت کی صناعی کا کوئی [illegible]
[illegible] ہے، اس کے تناسب اور توازن کو دیکھو، اس کے محاسن و محاسنات [illegible]
پر نظر ڈالو تو اس کو اس کی ساخت اور ترکیب کے اعتبار سے کرۂ ارضی کی سب سے برتر مخلوق پاؤ گے اور باور کرو گے کہ "ہم نے انسان کو ساخت اور تقویم کے اعتبار سے بہترین بنایا ہے"۔ (۳۰-۹۵-۱)

انسان یوں تو اپنی مجموعی حیثیت میں ارتقا کا آخری نشان ہے ہی تاہم جن لوگوں نے جدید انکشافات کو سامنے رکھ کر انسانی ساخت، جسامت اور اس کی قوتوں پر غور کیا ہے، ان کی پیچیدہ و نازک صنعت انسان کے عجیب و غریب اعمال اور خارجی آثار کے وصول، اختیار اور پھر ان کی تقسیم اور درجہ بندی پھر ان کے اعمال اور تاثیر پر غور کیا ہے، ان کو فطرت کا غیر معمولی کمال اور قدرت کا نادر عمل قرار دیا ہے۔ قرآن نے بھی خاص طور سے ان آلات کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ہے: "اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور افئدہ (یا دل و دماغ) بنائے"۔ (۲۱-۱۰-۴) عام مشینی اور خالص طبیعاتی آلات کی طرح یہ آلات ابتدا سے ہی مکمل نہ تھے بلکہ ایک متواتر تدریج سے خامی سے پختگی کی طرف، ایک مسلسل ارتقا سے ضعف سے قوت کی طرف: "اور اللہ نے تمہیں شکم مادر سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل (یا دماغ) بنائے"۔ (۱۴-۶-۱۱)

انسان کے اس کمال کی بلندی پر پہنچنے میں اس کے معلومات، محسوسات، جذبات اور محاسن کے نہایت صحیح طور پر منتقل ہونے کو بہت بڑا دخل ہے جس کا سب سے کامل اور بڑا ذریعہ قوت بیانیہ ہے۔ اگر آدمی اپنے معلومات دوسروں تک ٹھیک ٹھیک نہ پہنچا سکتا ہوتا، اپنے محسوسات سے دوسروں کو باخبر نہ کر سکتا ہوتا، اپنی خواہشیں دوسروں پر نہ پیش کر سکتا ہوتا تو کیا انسانی معاشرہ ایسا ہی ہوتا جیسا اب ہے۔ اظہار مافی الضمیر کی یہ انسانی قوت اس کی عجیب و غریب ساخت کا قابل لحاظ حصہ ہے چنانچہ قرآن نے اس کی اس قوت کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے: "اس نے پیدا کیا انسان کو اور اس کو (اپنے مافی الضمیر کو) واضح کر دینا سکھایا"۔ (۲۷-۵۵-۱) چنانچہ بحیثیت مجموعی انسان کے اس عجیب و غریب ظہور کو، اس کے ان غیر معمولی تطورات کو، اس کے ان پیچیدہ آلات حس و ادراک و اظہار کو، اس پیکر حسن و جمال کے تناسب اور توازن کو، اس کی نادرہ کار صلاحیتوں، اس کی بے مثال فعلیتوں کو محض بے شعور طبیعی عوامل کی تاثیر کا اتفاقی کارنامہ کہنا آسان ہے یا ایک باشعور، با اقتدار اور بامقصد خلق کا شاہکار قرار دینا۔

انسانی ارتقا اور معاشرتی ارتفاع کے وسائل

انسانی حسن و صورت اور حسن ساخت پر ہی اکتفا نہیں کر دیا بلکہ اس میں جو عقلی اور عملی قوتیں ودیعت ہیں ان سے کام لینے کے لیے ایک میدان بھی مہیا کیا ہے اور اس طرح نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کرنے کے لیے اس کو ایک کھلی فضا فراہم کر دی گئی۔ اس کو عمل اور تجربے کی کامل آزادی ہے۔ ان گھروں اور نظام سماوی بھرپور [illegible] ہے۔ ساری کائنات اس کا عمل اور تجربہ گاہ ہے۔ "کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ سب مسخر کر دیا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتوں کی تم پر تکمیل کر دی ہے"۔ (۲۱-۳۱-۳) زمین کی ہر شے اس کے عمل اور تجربے کے لیے آلہ اور وسیلہ ہے۔ وہ جس طرح چاہے اس سے کام لے اور کائنات کی ملکوتی نا آہنگیوں میں آہنگ پیدا کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داری بجا لائے۔ "اور وہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے ان سب کو پیدا کر دیا ہے جو زمین میں ہے"۔ (۱-۲-۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اگر ان ڈھانچ متمیز اور ظاہر ہونے لگتا ہے اور اس تمیز اور ظہور کے بالکل عقب میں اس ڈھانچ پر گوشت کا چڑھاؤ اور پیٹ نمایاں ہونی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ ہڈیاں ڈھک جاتی ہیں اور ہم نے تو انسان کو پیدا کیا ہے (ماقصدوا) گارے کے جوہر سے، پھر اس کو قائم رہنے والے ٹھکانے میں نطفہ بنا دیا پھر نطفے کو علقہ بنایا اب علقے کو مضغہ بنایا پھر مضغے کو ہڈیاں بنایا اب ہڈیوں کو گوشت پہنایا پھر اس کو دوسری ہی شکل، دوسرا اور نیا انداز، پیدائش دیکھا تو برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر خالق (۱۸-۲۳-۱)

[illegible] ضرورت ہے [illegible] کہ ہر [illegible] کے لیے جو جدوجہد کوشش
[illegible] ہے: "[illegible] اور شفقت پیدا کی" (۲۱-۳۰) ساتھ ساتھ اس کی انفرادی راحت
[illegible] سکون [illegible] کے جو سامان تھے ان کو بھی پوری فراخی سے مہیا کیا۔ "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری
جنس سے جوڑے پیدا کیے کہ تم ان سے سکون حاصل کر سکو" (۲۱-۳۰) "اور ہم نے تمہیں جوڑے پیدا کیا، تمہاری نیند کو راحت بنایا اور رات کو ستر
اور دن کو گزر بسر کے لیے بنایا" (۳-۸-۱۰) "کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی میں سے ہم نے ان کے لیے چوپائے پیدا
کیے۔ اب وہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے ان کو ان کا مطیع کر دیا ہے۔ ان سے ان کی سواریاں ہیں اور ان سے کھاتے (بھی) ہیں اور ان کے لیے ان میں
منفعتیں ہیں اور (دودھ) پینے کے موقعے ہیں" (۳۶-۲۳-۵) غرض یہ کہ ہر طرح سے انسانی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جو قدرتی خدمات
اور مادی وسائل مناسب اور ضروری تھے وہ سب موجود ہیں۔

چنانچہ یہ انسانی صلاحیتیں اور قابلیتیں پھر ماحول کی ان کے ساتھ یہ قدرتی سازگاری کیا مقصدیت کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں؟ کیا محض
بخت و اتفاق انسانی تکوین کی مکمل توجیہ ہے؟ کیا حادثے مقصدیت کی تعلیل کے لیے کافی ثابت ہو سکتے ہیں؟ پھر ان توجیہوں سے عقل سلیم کیا
طمانیت اور تسکین حاصل کر سکتی ہے؟

کائنات کی علت کا حیات و شعور اور ان کے لوازم و مناسبات سے موصوف ہونا

کائنات کے حقیقی ہونے، کمال اور نظم و ضبط کے اعتبار سے محکم ہونے سے، اس کے مظاہر کی طبیعیاتی تاریخ اور ان کے مواد، ان کی اوضاع اور ان کی حرکات کی ٹھیک ٹھیک مقررہ تقدیروں، اندازوں اور ان کے آہنگ سے اور ان سب کے ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ سے بالخصوص انسان کی طبیعی تاریخ اور اس کے ترقی یافتہ آلات حس و ادراک سے، اس کے لئے وسائل حیات کی حیات کی فراہمی سے، اس کی صلاحیتوں اور ان صلاحیتوں کے لیے میدان عمل کی بہم رسانی سے اور دوسری قدرتی سہولتوں سے قرآن نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ کائنات کے سبب اور علت کا نہ صرف یہ کہ خالق ، باری، مصور ہونا کافی ہے بلکہ اس کو حی اور زندہ حقیقت کے تمام اعلیٰ اوصاف مثلاً علیم، خبیر، سمیع، بصیر، حکیم اور مدبر سے موصوف ہونا چاہیے۔ کائنات کا ایک خاص رخ کی طرف جھکاؤ اس کے بغیر قابل فہم نہیں کہ اس کا خالق اس کا رخ متعین کرنے والا اور ہادی ہے۔ انسان کے ساتھ کائنات کا یہ تدریجی آہنگ اور ساز کیسے ہو سکتا ہے اگر قوی مظاہر پر قاھر اور قہار ذات کا رویہ رحیم، رؤف بلکہ ودود کا سا نہ ہو۔

کیا انسانی شرف و مجد، اس کے میدان عمل کی وسعت، اس کے اقتدار کے پھیلاؤ کا یہ تقاضا نہیں کہ کائنات کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر شے کی طرف اس کا زاویہ نظر بجائے انفعالی ہونے کے فعلی ہو اور حیرت سے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بدلے ان سے کام لینے کی کوشش کرے طبیعی قوتوں کو اپنا خادم سمجھے اور تنہا اسی ذات کو جو قدیر اور فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ہے، اپنا مولیٰ، رب، ولی، نصیر اور رزاق محسوس کرے۔ اس کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے اور اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے جس استغنار، بے باکی، آزادی، اعتماد نفس، تحمل، تنافس اور مساوات وغیرہ اوصاف کی ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے میں اس کا یہ احساس ممد و معاون ثابت ہوگا۔

اس مسبب الاسباب اور علۃ العلل کا قدوس ہونا، سلام ہونا، کریم ہونا، حسیب اور مالك يوم الدين ہونا، غفار و تواب ہونا، پھر ان صفات کمالیہ کے اتصاف کے لوازم مثلاً حمید و مجید ہونا، رشید ہونا، انتہائی طور پر خود بندے کو جس کا کام اپنے آقا کے اسمائے حسنیٰ سے متاثر ہونا اور آپ میں ان کو منعکس کرنے کی کوشش کرنا ہے کتنا بلند اور برتر بنا دیتا ہے۔

اگر قرآن مجید کی ان واضح تنبیہوں کو، عقل سلیم کے کھلے تقاضوں کو، فطرت انسانی کے مسلسل اور متواتر باطنی احساسات کو، پھر انسان کی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی ارتقاء میں اللہ کے برتر اور معیاری تصور کی افادیت کو نظر انداز کر دیا جائے اور عقل نظری کے بے سر و پا احتمالات اور مابعد الطبیعیاتی کھوکھلے امکانات کو اہمیت دی جائے تو پھر یا د رکھنا پڑے گا کہ بے شعوری نے شعور کا روپ دھارن کیا ہے اور بے مقصدی نے مقصد کو جنم دیا ہے

بالآخر نظم پیدا کیا ہے۔ مادہ ضرور بند ہو جاتا ہے اور اس مادہ کی
باہمی تعامل جاری ہے اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کہ ان کائنات کے حرکت
عناصر کے طبیعاتی اور کیمیائی خصوصیات مادہ ہی کا ہے سبب اتفاقات
بھی ہے علت۔ کیونکہ ان تماشا پر استنباطات اور غیر تجربی قیاسات کے
بجائے اگر مشاہدہ ہے تو صرف مادہ کے تغیر کا۔ اگر تجربہ ہے تو
محض اس کی تبدیلیوں کا اور علم ہے تو بس اس کی خصوصیات کا۔ اس
کے مقابلہ میں اگر ازلی ابدی باشعور اقتدار اعلیٰ کا قیاس زیادہ غیر
عقلی ہے تو پھر کہ بندر کو ٹائپ کی مشین پر انگلی مارتے دیکھ کر یہ باور
کر لیا جائے کہ اس مشین پر ٹائپ کیا ہوا غالب کا قصیدہ اس بندر کی
انگلیوں کی اتفاقی تصنیف و کتابت ہے۔ زیادہ قرین قیاس ہے
اس یقین سے کہ کوئی شخص اس قصیدہ کو ٹائپ کر کے مشین پر چھوڑ گیا ہے۔

بقیہ حسرت موہانی

یاد آیا۔ آزادی کا نہ تازہ اپنا گسترہ لیا اور کانگریس کے نقار خانے میں جا کر بجانا شروع کر دیا۔ چند سے یہ حالت رہی کہ گوکھلے اور فیروز شاہ مہتہ کی ہیڈ ماسٹری سے انحراف کا وہم و گمان بھی نہ گزرتا تھا مگر آخر کار یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اپنی آوازوں میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اتنا معلوم ہوتا تھا کہ فیروز شاہ اور گوکھلے بھی دشمنان ملک نظر آنے لگے۔ پال اور تلک۔ نیتان آزادی کے شیروں کی چنگھاڑنے دل اور دماغ پر کشش کی ایسا نشہ کر گیا جس سے گزر کر وادی نیل بھی حکومت برطانیہ کو برا کر اٹھی۔ تقریرات ہند نے ان کو بھی وہیں پہنچا دیا جہاں نیتان آزادی کے شیر کو؟

کہ لوگ ایسے ہوں گے جو اس ذہین اور طباع۔ نیک دل اور وطن پرست شخص کی موجودہ مصیبت پر افسوس نہ کرتے ہوں۔ جب تک آزاد تھا پورے طور سے آزاد تھا اب قید میں ہے مگر اس کا دل اور دماغ اور روح ویسی ہی آزاد ہے ڈھائی برس کی قید شدید سے ڈیڑھ برس کی قید سخت رہ گئی ہے۔ یہ بھی بہت ہے۔ لیکن خدا چاہے تو یہ مصیبت بھی اس پر آسان کر سکتا ہے۔

زمانہ دسمبر ۱۹۰۸ء

حسرت موہانی

ایک قدرداں کی نظر سے

غانی خاں

انیسویں صدی کے آخری برس دو ایک سال پیشتر جو لوگ علی گڑھ میں تھے ان کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نوواردوں میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل وشباہت وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دل چسپ نہ تھا جس قدر۔ نو وارد لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے "خالہ اماں" نام دیا تھا۔

چھوٹا قد، لاغر بدن۔ گندمی رنگ چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا خیال کرتے ہوئے ڈاڑھی کسی قدر نیچی فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ تیار کرنا ارادہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کالا ترکی ٹوپی۔ پرانی وضع کے چار خانے کا انگرکھا۔ شرعی کا تنگ پاجامہ جس کے پائنچے ٹخنوں سے اونچے۔ عینک۔ اور پھر اضافہ کیجئے تو خالہ اماں یا دوسرے لفظوں میں۔ فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور کے سامنے پھرنے لگے گی جو تیز چلتے تھے۔ مگر سید علی صاحب مصنف کے والد مرحوم آہستہ خرام تھے مگر ضرورت کے وقت تیز بھی چل سکتے تھے۔ اسی طرح فضل الحسن آہستہ بھی چل سکتے تھے اور دونا حیوانات کی اس عام صفت سے محروم نہ تھے۔

علی گڑھ کالج میں اپنی ہستی کا مشاہدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہاں ہمیشہ چند تیز فہم حقیقت شناس ایسے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کسی کیریکٹر کو خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو ایک لفظ یا ایک نام سے ظاہر کر سکتے ہیں اس طرح کہ وہ نام موت تک اس صاحب نام کے گلے کا ہار ہو جائے۔ بہت سے شوخ اور مسخرے لوگ ہیں کہ جو 'بوم' یا 'ضیا' ان کے ناموں پر اضافہ کیے ہوئے ان کے عزیز ترین دوست بھی صاحب نام کو پہچان نہیں سکتے۔ مگر اس قسم کے ناموں پر کہاں تک 'الاسماء تنزل من السماء' کی نسبت صادق آتا ہے ایک نام خالہ اماں بھی تھا۔ ہمارے دوست کی ہیئت ظاہری تو اس نام کی مستحق تھی ہی مگر جس چیز نے اس نام کو برخلاف دوسرے ناموں کے محض ظرافت و مذاق ہی کا ذریعہ نہیں بنا دیا تھا بلکہ اس سے ایک لطیف اخلاقی اور روحانی کا اظہار بھی مقصود ہوا تھا وہ فضل الحسن کی مرنجان مرنج طبیعت۔ خندہ روئی۔ عالم دوستی اور حسن پرستی تھی۔

ان اوصاف کے ساتھ ہی فضل الحسن ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ ایسا کہ پرانی وضع کے مسلمان اس کے کسی قول و فعل پر گرفت نہ کر سکتے تھے صوم و صلوٰۃ کی پابندی اس کی زندگی کا جزو لاینفک تھی مگر برخلاف عوام کے اس سے اس کی شیریں طبیعت میں فتور نہیں آنے پایا۔ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت ہو جانے سے مہمان کی طرح آ پہنچا، فضل الحسن مسکراتے ہوئے اٹھے۔ معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر پھر آ بیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد جلد پڑھتے تھے کیونکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کام چھوٹی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھا کرتے تھے۔ بزرگان دین کے مزاروں کی ان کو ایسی ہی جستجو رہتی تھی جیسی اردو اور فارسی اساتذۂ قدیم کے دیوانوں کی۔ دہلی اور آگرہ میں کم مزار ایسے ہوں گے جن کی جالیوں میں فضل الحسن نے دھاگے نہ باندھے ہوں۔

غرض ان اوصاف کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ خالہ اماں نے مدرسہ کو ہلا دیا اور اس کے بجائے "مولانا" بچے سے لے کر بڑے تک کی زبان پر جاری ہو گیا۔ کالج کی تاریخ القاب میں یہ ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں۔

مگر یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ فضل کے لیے حصول عزت و محبت کا باعث ہو سکتے تھے مگر حصول شہرت؟ اس کے لیے فطرت نے کچھ اور بہت کچھ عطا ہوا تھا۔ وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ دور کی کوئی انگریزی کتاب شاید الفنسٹن نے دوسری بار تاریخ نہیں پڑھی اعمال ناموں میں کافی

انگریزی کی معمولی ابتدائی کتابوں کی طالب علمی میں جب وہ پڑھتے تھے اگر کبھی جب کبھی صیغہ فرہنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کبھی انگریزی پڑھنا گوارا نہ ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو ہٹا سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہو کر انھوں نے بی اے میں ریاضی پڑھی مگر یہ واضح ہے اگر اس کا ستنا نفاست پسند طبیعتوں کو ناگوار گذرے کہ ان موزی اور مسلمان کش مضمون کو انھوں نے محض خانے سے باہر کبھی برضا و رغبت نہیں پڑھا۔ اس پر بھی وہ امتحان میں ناکام نہیں رہے۔

غرض اردو فارسی اور خاص کر ادب اردو سے اس شخص کو عشق تھا جس زمانے میں عام طالب علم دار الاقامت اور بیت الطعام کے مناصب انیٹری کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں رہتے ہیں اس زمانے میں فضلا اساتذہ قدیم کے دیوان جمع کرتے اور اُن کی خشک ہڈیوں پر تم اذنی پڑھنے کے عادی تھے۔ چنانچہ کئی مشہور اور بہت سے بھولے بھٹکے شعرائے اردو کے کلام کا اتنا بڑا مجموعہ اس قدامت پرست نے جمع کر لیا کہ شاید پرانے کتب خانوں کے سوا کہیں نہ ہو۔

اسی زمانے میں سید سجاد حیدر کی جدت پسند طبیعت نے انجمن اردوئے معلیٰ کی بنیاد ڈالی۔ کالج کی نفسانی زندگی میں فقط یہ ایک مجلس تھی جس میں علم دوست طبیعتیں عام ہوا و ہوس کی خراب اوقات کشاکش سے پناہ لیتی تھیں ہفتے میں ایک مرتبہ۔ شاید اتوار کی شب کو۔ ایک مقام مقررہ فرش و فروش سے آراستہ کیا جاتا تھا اراکین مجلس اور دوسرے مشتاقان سخن خوش وضع انگرکھے۔ اچکنیں اور شیروانیاں۔ دو پلی ٹوپیاں سر پر دیئے ہوئے قرینے سے بیٹھ جاتے۔ شمع ایک ایک کے سامنے آتی اور وہ نظم و نثر تازہ کے پھول نذر کرتا۔ داد تحسین اور آداب و تسلیمات کا انداز فنون لطیفہ کی سرحد تک پہنچ جاتا تھا۔ ایسی انجمن کی ترقی کے لئے مولانا سے بہتر رکن کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اردوئے معلیٰ اور مولانا ایسے لازم ملزوم ہو گئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین مناظرے کی رُوح و رواں خیال کیے جانے لگے۔ چنانچہ متروک الفاظ پر ایک سلسلۂ مضامین جو عرصہ تک مخزن میں چھپا کیا اپنی جدت اور انداز تحریر کی دلنشینی کی وجہ سے مقبول خاص و عام ہوا۔

انھیں ایام میں چودھری خوشی محمد نے علیگڈھ منتھلی میں قدیم اردو شاعری پر ایک قبیح حملہ کیا اس مضمون کا انداز تحریر اور پیرایہ استدلال اس قسم تھا کہ حسرت سے جس کا دل اردو مانند میر و سودا اور مصحفی اور انشا کے کلام سے سرشار تھا۔ ضبط نہ ہو سکا چنانچہ۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

اردو شاعری کی خوبیوں کی داد دینے کے بعد لیف کے ذرامے کے جواب میں تصوف کو پیش کیا اور نئی شاعری جس کو چودھری صاحب نیچرل شاعری بتاتے تھے اس کی اور مولانا حالی کی بھونڈی تقلید کی ایسی خبر لی کہ جنگ ادبی کا پورا لطف آ گیا۔

جب حسرت کا زمانہ تعلیم ختم ہونے کو آیا تو سید سجاد حیدر بیچلرز لاج یعنی دکنوار آشرم) میں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ گویا اردوئے معلیٰ کے چراغ جماعت کے لئے سحر قریب تھی مگر فینکس کی طرح اردوئے معلیٰ نے بھی مرتے مرتے ایک ایسی راگنی گائی جس کی آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ ایک عالیشان مشاعرے کی تجویز قرار پائی۔ تمام ہندوستان کے شعرائے اردو کی خدمت میں شرکت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ اکثر اساتذہ عالی قدر نے دعوت قبول فرمائی اور اسٹریچی ہال میں ہوا کیہ یہ صدی سے نثر سنتے سنتے تھک گیا تھا ایسا شاندار مشاعرہ ہوا کہ اب تک اس کی یاد دلوں میں گدگدی کرتی ہے۔ سپہر نظم کے آفتاب و مہتاب یعنی حضرات محمود و تسلیم کے علاوہ بہت سے چھوٹے بڑے ستاروں نے اپنا کمال دکھایا مگر چھوٹے ستارے اپنی حرکت میں کہیں کہیں تہذیب۔ یا مغربی تہذیب کے دائرے سے باہر بھی ہو گئے۔

اگلی صبح خاتمۂ سبق پر تھیوڈور ماریسن تھے اور فضل کا دامن۔ جناب جیسے کسی مکڑ ے پڑیا کو پکڑ کر ان واحد میں آسمان کی بلندی میں جا چھپتا ہے، طرح ماریسن صاحب چہرے پر غصے کی وہ صاف بناؤ معلوم ہوتا تھا) کیفیت پیدا کیے ہوئے غریب فضل الحسن کو پکڑے ہوئے دوالی دوال دفتر کی طرف لے گئے یاں سب اُن سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھا کیے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔

... نے یہ شعر پڑھا ۔ "کیا اخلاق کے دو معیار بھی ہوتے ہیں؟"
مولانا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب ملا "جی ہاں۔ ہم لوگوں کا معیار آپ سے قطعاً مختلف ہے"؟
... اختیار کر رہے یہ سراسر بُرا ہے۔ کئی پرانے طالب علم خلاف تہذیب اشعار پڑھے جانے کی مجھ سے اکثر شکایت کر چکے ہیں۔
تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ اردوئے معلی نے بار دگر ترک وطن کیا۔ مولانا کو اب تک یقین ہے کہ پرانے طالب علموں سے عارسین صاحب کی مراد "مجہول شاعر" تھے۔

مگر اس علمی زندگی کے ساتھ ساتھ حسرت کے عادات میں ایک ایسا وصف نشو و نما پا رہا تھا کہ جس کا آخری نتیجہ علی گڑھ کے سیشن جج کی عدالت میں ملا گیا۔ اور جس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ شخص کہ جو مذہب اور ادب میں ایسا قدامت پرست تھا پالٹکس میں کانگریس کے مقدمۃ الجیش میں کیونکر شریک ہوا۔ یہ وصف وہ تھا جسے انگریزی محاورے کے مطابق صدائے بلند ترین کا ہم آہنگ ہو جانا کہتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ وصف نقشا ظاہر ہوا اور ہر مرتبہ مولانا کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ شملے میں علیگڑھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڑھ کالج کے بنی اسرائیل اس پر آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک گھنٹہ کا تمام آلات موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے یعنی تالیاں، لوٹے، گلاس، کھانے کی سینیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شور محشر برپا کر تا تھا جلوس تھے اپنی خرمستی میں بیٹھ ہوا تھا نہ گیند پھینکا تھا۔ یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالۂ خاک کر کے سب سے آگے آگے اپنا کورس بجاتے ہوئے پروفیسروں سے گزر کر نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے ان کا نام لکھ لیا گیا۔

برسات کا پہلا پانی جیسا معنی خیز ہے وہ کچھ علی گڑھ ہی کے لڑکے خوب جانتے ہیں۔ اس روز پاس عقل عین حماقت ہے۔ مگر جماعت سے باہر کا دن حسب دستور قدیم جا بجا لڑکے جل کھیل رہے تھے۔ پکڑو، دیکھو، جانے نہ پائیں، نکالو، نکالو۔ دروازے توڑ کر نکالو۔ پھر کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گھڑوں کے ہونے چھپل چھپل کر دھم سے گرنے کی آوازوں قہقہوں کے شور و غل سے آسمان پر بجلی اور زمین پر مینڈکوں کے زہرے پانی ہوئے جاتے تھے۔ مگر ہنوز بعض جماعتیں کالج کی باقی تھیں۔ مولانا میں تاب ضبط کہاں۔ دونوں ہاتھوں میں کیچڑ کے لوندے لیے ہوئے وہاں پہنچے اور ڈاکٹر عربی کے پروفیسر بر ملا [illegible] ڈشا لدے تو عبا اور عمامے پر بھی دو چار چھینٹے پڑ ہی جاتے۔ فرد سیاہ گھات میں لگی ہی تھی کھلی اور مولانا کا نام درج ہو گیا۔

جون کی دوپہر تھی، اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ مولانا شاید ستاپا استراحت پر تھے کہ ظہور وارڈ[ل] کی طرف سے کچھ شور سنائی دیا۔ گھبرا کر ننگے پاؤں ننگے سر کمرے سے نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ اسکول کے کسی لڑکے کو ایک مالی نے آم توڑنے کے شبہ میں مارا ہے اور کچھ لڑکے اس گستاخی کی تنبیہ کو نکلے ہیں۔ مولانا اس ہیئت سے "پکڑو بدمعاش کو۔ مارو بدمعاش کو" کا شور کرتے ہوئے اس یورش میں شریک ہو گئے۔ مالی تو خیر پٹا یا نہ پٹا مگر ادھر اس مہم کا واپس آنا تھا کہ ادھر اس جیا زمال نے بیسوں درخت لنگڑے اور بمبئی کے تاراج کر دیے اور کئی سو روپے کا بطور تاوانی نقصان کالج سے طالب ہوا۔ اس ملتا سپہ سالار بے چارے مولانا کو گردانا گیا محض اس لیے کہ ان کا پہچاننا اوروں کی نسبت آسان تر تھا۔ فرد سیاہ ایک مرتبہ پھر کھلی اور مولانا کچھ عرصے کے لیے کالج سے رخصت کر دیے گئے۔ سر آدم جی [?] گویان جناب میر عباس حسین صاحب پروفیسر نے کہ مہتمم باغات بھی تھے باغ لوٹنے پر فضل الحسن کو بلا دیا اور فرمایا کہ "میاں مالی کی بد اعمالی پر اس کی گوشمالی بیشک ضروری تھی مگر مالی نقصان تو بیچارہ برداشت نہیں کر سکتا"؟

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

اور تقریر کا ملکہ مولانا میں بہت اچھا تھا۔ یونین کلب کے بااصول جتنے ان کی نگاہ میں بے وقعت تھے اور آزادہ روی مسلک تھا۔ ایک مرتبہ آ کے موقع پر سطوہ امیدوار آزادی کوشاں ہوئے مگر کامیاب ہوتے ہوتے رہ گئے۔ دوسری مرتبہ دونوں فریق ان سے طالب استمداد ہوئے اور وہ صدا بلند ترین کے اصول پر کاربند ہو کر ایک فریق کی شرکت سے سکریٹری منتخب ہو گئے۔ مگر یہ جوڑ نبھ نہ سکا۔ جس فریق سے مولانا نے شرکت کی تھی اس کے ا

له بورڈنگ ہاؤس کا نام ہے۔ (اب اس عمارت میں ادارۂ علوم اسلامیہ ہے۔ نگار)

کے خیالات ... میں ... لازمی تھا ... پیدا ہوا ... تعاق اور نفاق سے منافرت ۔ اسی حالت میں سکریٹری صاحب سے ایک نامبارک فعل سرزد ہوگیا۔ حریف تو تاک میں لگے ہی تھے ۔ مجلس معتمدہ کا پورا اجلاس جس میں مسٹر تھیوڈر ماریسن مسٹر ٹیگ اور مسٹر براؤن وغیرہ شریک تھے منعقد کرکر مولانا کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

غرضکہ یہ وسعت جسے ایک قسم کی غلطی کہنا چاہیے گاہے بگاہے مولانا کے زمانہ تعلیم میں ظاہر ہوا کیا۔ زمانہ تعلیم ختم ہوا تو وظیفہ قانونی کے لئے مولانا نے درخواست کی جسے ماریسن نے رد دیا۔ بورڈنگ ہوس میں بدستور رہنے کی اجازت چاہی۔ اجازت نہیں ملی۔

مایوسی اور افسردگی کا اس کے سوا کیا علاج تھا کہ شہر میں سکونت اختیار کرکے برسوں کی آرزو یعنی زبان اردو کی خدمت میں زندگی وقف کر دی جائے اور برائے نام قانون کے سبقوں میں بھی حاضر ہو جایا کریں۔

رسالہ اردوئے معلی جاری ہوا اور آب و تاب سے جاری ہوا۔ دنیائے ادب نے حیرت اور استعجاب سے دیکھا کہ ایک کم عمر نوجوان نے جو ابھی کل کالج سے نکلا تھا صحائف اُردو کے لئے کیسے نئے نئے راستے کھول دیئے ہیں۔ اپنے ذاتی رسالے کے ذریعہ سے جدید شاعری اور اس کے قدر دانوں کو نے ڈالنا کون مشکل تھا۔ اکثر لحاظ سے پنجاب اس مفروضہ نیچرل شاعری کا مرکز تھا۔ مولانا حالی مدظلہ العالی کا وطن ایک حیثیت سے پنجاب ہی تھا۔ چودھری خوشی محمد ناظر کے پہاڑوں سے قدیم شاعری پر پتھر برسایا کرتے تھے، چٹانیں، جھاڑ، وادی اور لنگوٹی بردوش کے اخباروں میں طبع آزمائیاں ہوتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نیا ستارہ " اقبال " کی صورت میں طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں تسخیر کامل تھا۔ علیگڈھ منتھلی میں ایک مضمون اردو زبان پنجاب میں کا چھپنا مولانا کے لئے بہانہ ہو گیا۔ مہینوں تک کوئی پرچہ نہ نکلا تھا جس میں فسانۂ آزاد کے خوجی کی طرح حسرت اور ان کے تابعین کی سرو ہی اور کٹار مولانا حالی اور اقبال پر نہ چلاکی۔ ان شیران میدان سخن پر تو خیر یہ کیا اثر کر سکتی تھی تاہم چھوٹے مقلدوں کے سراسیمہ اور حواس باختہ کرنے کو یہی کافی بلکہ اس سے بڑھ کر تھے مگر میرا مقصد اس بیان سے کیریکٹر کے غلبے کی ایک خوبصورت مثال پیش کرنا ہے

کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت دو دوستوں کو ساتھ لئے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرت کو دیکھا۔ ان مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلی کے دو تین پرچے اٹھا لائے۔ حسرت اور ان کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کرکے حسرت اور اردوئے معلی کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور داد ۔ خوب لکھا، کہہ کر داد دیتے تھے۔ حالی بھی ہوں۔ ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرت کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ دہشت کا اظہار کرکے بولے، " ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے" اور کچھ اس قسم کے الفاظ کہنا شروع کیے " سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا۔ اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا اچھا ہے " فرشتہ منش حالی ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ " نکتہ چینی اصلاح زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں "۔

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا کہ حالی کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے مگر ابھی " ہم آشتی صلائے ترین " کے لئے ایک ایسا وسیع میدان باقی تھا جس کے لئے حسرت کے پاس ' دل ' اور زبان کے سوا کوئی قابلیت نہ تھی۔ یہ میدان میدان پالٹکس تھا۔

حسرت نے نگاہِ غور سے دیکھا تو ایک طرف ۸ کروڑ مسلمانوں کو آیہ " اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم " کے اثر سے صمٌ بکمٌ پایا۔ وفاداری کا گوسالہ جو علیگڈھ کے سامری کے ہاتھوں نے تیار کیا تھا ان کی توجہ کو کسی دوسری طرف ہٹنے بھی نہ دیا۔ ادھر ۲۱ کروڑ ہندوؤں کو دیکھا کہ نجر سوات کی تاکم میں ... کانگریس کے شور کے سامنے صور اسرافیل کا شور طفلی کی صدا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مخالفین زرد سیاہ کا ملک

غالبیہ

یعنی

غالب نام آور انیسویں
صدی کے آئینے میں

ترتیب و تحشیہ

اکبر علی خاں
اسسٹنٹ لائبریرین
رامپور رضا لائبریری

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسداللہم و ہم اسداللہیم

تعارف

غالب ہمارا محبوب موضوع ہے۔ اس پر تنقیدی اور تحقیقی دونوں انداز سے بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ہماری دلچسپی اس موضوع کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے نئے نئے گوشے بھی سامنے آتے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی غالب کے بارے میں بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب اس معنی میں اردو کی سب سے زیادہ خوش نصیب شخصیت ہے کہ اس سے متعلق جتنی بھی تفصیلی معلومات ہمارے پاس موجود ہیں کسی بھی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں۔ اس کے معاصرین میں سے ذوق اور مومن ہی کو لیجیے ہم ان دونوں کے بارے میں مقابلتہً کتنا کم جانتے ہیں حد یہ ہے کہ غالب کے معاصرین میں سے کسی کی بھی عکسی تصویر نہیں ملتی بہرحال غالب ایک استثنا ہے۔

اب کہ غالب اتنا محبوب ہو چکا ہے اور اس پر بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اسے اس کے عہد کے آئینے میں بھی دیکھیں اور یہ جانیں کہ اس کے معاصرین اسے باعتبار ایک انسان اور باعتبار ایک فنکار کے کیسا جانتے تھے۔ یقیناً یہ مطالعہ ہماری معلومات میں دلچسپ اضافہ کرے گا اور اس کے نتائج ہمارے سامنے غالب کو سمجھنے کی بہت سی راہیں کھول دیں گے۔ اس خیال کے پیش نظر میں نے ایسی سب تحریریں جمع کر ڈالی ہیں جو انیسویں صدی کے اندر سامنے آئی ہیں۔ اس صدی میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنہوں نے غالب کو دیکھا تھا، برتا تھا یا اس کے بارے میں معتبر روایات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ایسی ایک ایک سطر جو غالب کو اس کے عہد میں جاننے کے لیے ضروری ہے ایک رشتے میں منسلک کر دوں۔ بلا جھجک میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تحریروں میں غالب کے متعلق جو بیش قیمت مواد ہے وہ یکجا کسی کتاب میں نہیں مل سکتا۔ مطالعہ میں سہولت پیدا کرنے کے خیال سے میں نے اس کام کو چند ابواب پر تقسیم کر دیا ہے۔

ان عبارتوں پر ضروری اور مفید حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جن کے ذریعہ ہر تحریر اور صاحب تحریر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ماخذ پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ سارا اہم بالاقساط قارئین نگار کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ پہلے اصل عبارتیں اور اس کے بعد حواشی۔

اس بار پہلا باب جس میں تذکروں کے اقتباسات ہیں، شائع کیا جا رہا ہے۔ عیار الشعرا اور عمدۂ منتخبہ کے علاوہ تمام تذکروں سے انتخاب اشعار کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ استثنا اس لیے ضروری تھا کہ ان دونوں میں غالب کے کچھ قلمزد اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس کی بالکل ابتدائی مشق کا نمونہ ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس تفریق کو روا رکھا جائے۔

یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ آب حیات کی عبارت کو صرف نگار کے صفحات کی حد تک اس کی طوالت اور کتاب کے سہل الحصول ہونے کے باعث ترک کر دیا گیا ہے۔ اور چند ابتدائی سطور ہی نقل کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا نام **غالبیہ** رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر نام جو اس کتاب کی بہتر نمائندگی کرتا ہے پسند کیا جائے گا۔ جلد ہی برصغیر کا ایک نامور دار الاشاعت اسے خوبصورت ٹائپ میں بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے لیکن میرا جی نہیں مانا کہ نگار دوستوں کو یہ تحفہ دیر سے پہنچے اس لیے ان اوراق پر یہ مکمل کتاب کم سے کم قسطوں میں منتقل کر دی جائے گی۔

توقع ہے کہ اس سلسلے میں غالب پسندوں کی جانب سے مجھے مفید مشورے بھی ملیں گے تاکہ اس کو زیادہ سے زیادہ مکمل شکل دی جا سکے۔

اکبر علی خاں

عیار الشعرا —— خوب چند ذکا

مرزا اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، المتخلص بہ غالب، ولد مرزا عبد اللہ خان، عرف مرزا دولہ، نبیرۂ مرزا غلام حسین خان کمیدان، ساکن بلدۂ اکبرآباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعر فارسی و ہندی است ساز درست:

نہ ہوا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشہ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

باغ تجھ بن گل نرگس سے ڈراتا ہے مجھے
چاہوں گر سیر چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچہ گل سوئے آشیاں پھر جائے

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ ایسا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

ص ۵۴۱ — ۵۴۲

عمدۂ منتخبہ —— نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور

اسد تخلص، اسد اللہ خان، عرف میرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافۂ اکبرآباد۔ جوان قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ بہ خوش معاشی سر کردہ۔ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن .... تخم ہای عشق مجاز، تربیت یافتہ عمکدۂ نیاز۔ در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا عبد القادر ل علیہ الرحمۃ در ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند، بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش از زمین سنگلاخ مضامین نازک موزوں گشتہ۔ نادرۂ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد از نتائج طبع اوست:

شمشیر صاف یار جو زہر آب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بہ رخسار سادہ ہو

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں
ایسا عنان گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولے مے فروش
اب شکست توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

مجلس شعلہ عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے ہیں یک رو کہ دیتے ہیں دم ۔۔۔ کہ یک جنبش لب قتل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے ۔۔۔ رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد ۔۔۔ ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا ۔۔۔ دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا ۔۔۔ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

تمازِ عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر ۔۔۔ جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط ۔۔۔ کی تصور نے بہ صحرا ہوس راہ غلط

گلشن میں بندوبست بہ ضبط دگر ہے آج ۔۔۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد ۔۔۔ خون زاہد کو مباح اور مال صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوز دل ۔۔۔ درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے ۔۔۔ فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے ۔۔۔ ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے ۔۔۔ عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے ۔۔۔ سینہ جویای زخم کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن ۔۔۔ آمد فصل لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصد نگاہ نیاز ۔۔۔ پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلال جنس رسوائی ۔۔۔ دل خریدار ذوق خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی ۔۔۔ وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرام ناز سے پھر ۔۔۔ محشرستان بے قراری ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے ۔۔۔ روز بازار جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں ۔۔۔ پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنے ہے وہ کہانی میری ۔۔۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ ۔۔۔ دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار ۔۔۔ مگر آشفتہ بیانی میری

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد ۔۔۔ تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۔۔۔ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال ۔۔۔ ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے در عدالت ناز ۔۔۔ گرم بازار فوجداری ہے

پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر ۔۔۔ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ۔۔۔ ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے [illegible] طلب ... [illegible] کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ... آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب ... کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ... ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ... گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(ورق ۴۷ الف ــــ ۴۸ الف)

گلشن بیخار ــــــ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان، المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندان فخیم است و از روسای قدیم۔ سابقاً مستقر الخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبروناز بود اکنون دارالخلافہ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزای صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پرواز چمن معانی است و بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی۔ پیش بلندیٔ خیالش اوج فلک پستیٔ زمین است و در جنب تہ نشینی غورش، سرفرازی قارون، کرسی نشین شاہین فکرش۔ جز بشکار عنقا نہ پر دانو و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی، جز بدکانش در نیابی۔ سالہا است کہ پا بدائرہ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضای طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن میگفت و وقت آفرینیہا میکرد آخرالامر ازاں طریقہ اعراض کردہ اندازی مطبوع ابداع نمودہ، دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگر نگریست فراوان ابیات ازاں حذف ساختہ کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ۔ مدتہا است کہ بنظم ریختہ سری ندارد۔ در زبان فارسی نیز دستگاہ بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ۔ پایہ اش از قول استادانہ کم نیست۔ غزلش چوں غزل نظیری بی نظیر و قصیدہ اش چو قصیدۂ عرفی دلپذیر۔ مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطایف پی می برد، و این فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ میرسی۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شرف یافتہ و حظی ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔ دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد، اما پیوند معنی مستحکم است دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید۔ (ص ۱۸۵ ــــ ۱۸۷)

گلدستۂ نازنیناں ــــــ منشی کریم الدین

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور روسای قدیم اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہجہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ ادیب بے عیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی اُن کی کے حضیض جہل کا تم مشہور، سخن فہم و سخن داں اس پایے پر کہ متنبی و کعب باوجود دعویٰ اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنیوں چلنے والوں کے اُن کے حضور۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین از اوّلہٗ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری، مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری۔ خوان یغما ابن کے اور ایک ادنیٰ زلہ ربا، خاقانی بجا رعب کشی مستعد بسر دیا۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اُس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں، مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی ہیں غالب تخلص لکھتے ہیں چنانکہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاہ ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے اس لئے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے۔

ص ۲۱۵ ــــ ۲۱۶

سر پہ مجھ سے یک رو کہ دینے سے ہو
کر بیک جنبش لب مثل صبا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیازِ عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

گلشن میں بند و بست بہ ضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

اس جفا شرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خون زاہد کو مباح اور مال صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصد نگاہ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بیقراری ہے

جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
روز بازار جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

کب سنتا ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلش غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے

پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب — [illegible] کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

(ورق ۴۷ الف — ۴۸ الف)

گلشن بیخار ——— نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ

غالب تخلص، اسم شریفش اسد اللہ خان، المشتہر بمرزا نوشہ، از خاندان فخیم است و از روسای قدیم۔ سابقاً مستقر الخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود اکنون دار الخلافہ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزای صفاہان و شیراز۔ طوطی بلند پرواز چمن معانی است و بلبل نغز پرداز گلشن شیوا بیانی۔ پیش بلندی خیالش اوج فلک پستی زمین است و در جنب تہ نشینی غورش، سرفرازی قارون، کرسی نشین شاہین فکرش۔ جز بشکار عنقا نہ پردازد و اشہب طبعش جز بعرصۂ فلک نتازد۔ اگر امروز بتلاش متاع نفیس شتابی، جز بدکانش در نیابی۔ سالہا است کہ پا بدائرہ شاعری نہادہ، در اوائل حال بتقاضای طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبد القادر بیدل سخن میگفت و وقت آفرینی ہا میکرد آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ انداز مطبوع ابداع نمودہ، دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگر نگریست فراوان ابیات ازان حذف و ساقط کردہ قلم تغلیظ انتخاب زدہ۔ مدتہا است کہ بنظم ریختہ سری ندارد۔ در زبان فارسی نیز دستگاہ بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ۔ پایہ اش از نزول استعلا ایمن نیست۔ غزلش چوں غزل نظیری بی نظیر و قصیدہ اش چو قصیدۂ عرفی دلپذیر۔ مضامین شعری را کما ہو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطایف پی می برد، و این فضیلتی است کہ مخصوص بعض اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ میرسی۔ چہ خوش فکر اگرچہ کمیاب است اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شربی یافتہ و حظی ربودہ۔ بالجملہ چنین نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔ دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد، اما پیوند معنوی مستحکم است دیوانش بنظر رسید و این ابیات ازان منتخب گردید۔ (ص ۱۸۵ — ۱۸۷)

گلدستۂ نازنیناں ——— منشی کریم الدین

اسد تخلص، اسم شریف اُن کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندان فخیم اور روسای قدیم اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہجہاں آباد خجستہ بنیاد کے ہیں۔ ادیب بے عیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی اُن کی کے حضیض جہل کا قعر مشہور، سخن فہم و سخن داں اس پایہ پر کہ متنبی و کعب باوجود دعویٰ اور بلند پایگی کے مانند بچوں گھٹنیوں چلنے والوں کے اُن کے حضور۔ اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ اس کے خجلت دہ دیوان نظیری۔ مرجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارات ظہوری۔ خوان یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا، خاقانی بجا رعب کشی مستعد بسر و پا۔ فیضی سے کیونکر لوگ فیض کو نہ پہنچیں جب کہ وہ اُس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں، مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے نقد نواب ممدوح سے نظر حاجت سے گزرا۔ اُسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی ہیں غالب تخلص لکھتے ہیں چنانچہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاہ ممدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے اس لئے اب فکر اشعار اردو کا نہیں کرتے۔

ص ۲۱۵ — ۲۱۶

طبقات الشعرا ——— منشی کریم الدین

غالب تخلص، اسد اللہ خاں مشہور مرزا نوشہ، خاندان قدیم اور روسائے قدیم سے۔ اجداد ان کے درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہجہان آباد
میں ۱۲۵۰ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہجہان آباد میں ان کے شاگرد ہیں فارسی شعر کی
ان کو بہت اچھا مزہ ہے۔ ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف سے منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے بہت
بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۳ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷
کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے وہ بھی مطبع سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۰ھ کے چھپا تھا۔ حال اس کا
یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جزو کا بنا لیا۔ وہ دیوان نما
کے پاس بھی ہے۔ میں نے ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن اس مقولہ کا مؤید صاحب تذکرۂ گلشن بے خار کا بھی ہے معلوم
یہ ہوتا ہے کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت اچھا۔ اردو میں
صرف غزلیں ہیں۔ اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان سنہ ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے برا پڑا۔
جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر ان کی اس سال قریب ساٹھ برس کی ہوگی۔ یہ اشعار انہی کے ہیں۔

ص ۳۹۵ - ۳۹۶

...... جس سال کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی ٹامسین صاحب جو کہ عالم کامل اور قدرشناس اہل علم کے ہیں شاہجہان آباد میں واسطے
بندوبست مدرسہ کے تشریف لائے سب مدرسوں کا مع طلبہ کے امتحان لیکر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسہ کے واسطے اچھا مستعد مقرر
کرنا چاہیے۔ شاہجہان آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہان آباد کے
صدر الصدور ہیں جناب ٹامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی اس شہر میں اچھے فارسی دان تین شخص منتخب روزگار ہیں: ایک مرزا نوشہ صاحب
دوسرے مولوی امام بخش صاحب تیسرے حکیم محمد مومن خاں لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ ان کو نوکری کرنے
سے استغنا تھی انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی۔ مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا
وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہ رکھتے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی۔ چالیس روپیہ ماہواری انکے واسطے مقرر ہوا۔ مدرس
اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے، ۱۸۴۰ء میں درس و تدریس کرنے لگے ان کے روزگار کے بلبالیں اور لوگوں نے بھی بہت سعی کی تھی کیونکہ وہ شخص
اس عہدے کے قابل تھا۔ بعد ایک برس کے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہو گئی۔ ہنوز یہی تنخواہ پاتے ہیں۔ شاہجہان آباد کے مدرسے میں پڑھاتے ہیں...

ص ۴۳۸ — ۴۳۹

... غالب، مرزا نوشہ، غالب اردو شعر بھی جو کہتے ہیں موتی پروتے ہیں۔ جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو
میں بھی جلیل القدر استاد ہے:

ص ۵۴۱

آثار الصنادید ——— سرسید احمد خاں

ہمای اوج مفاخر و معالی، جاگزین سدرۃ المنتہی مراتب بلند و مدارج عالی، مؤسس اساس شیوا بیانی، بانی بنای الفاظ و معانی، عندلیب
بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری و والا تباری، مہر سپہر بلند اختری و گردون اقتداری، شاگرد رحمٰن استاد
سحبان، المعی زمان، لوذعی بیان، فرزدق دہر، لبید اوان، نکو وصی رسول اللہ، جناب مستطاب مرزا اسد اللہ، غالب تخلص دیوان حافظ
انکا لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ارجمند کے زمانے میں خاموش۔ چراغ انوری انھیں کے شعلۂ فکر سے

... سخن بھی ان کے ... سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصر آتش سے مشکون ہوا تھا اور ... ایسا ... کہ گویا اس کی بنیاد چشمہ فقط عنصر آب سے بنی تھی۔ زلالی ان کے چشمۂ سخن کا تشنہ لب اور انوری ان کی اطعمہ ان کے خوان استعداد سے نعمت طلب۔ خاقانی اس خسرو معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت۔ ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ ان کی نعمت مقال سے روزینہ دار۔ رنگینی معنی سے صفحے کو گلزار رنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو رشک ارژنگ کرتا، خامہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفۂ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ، کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو مقابل من، اور مہر مہر سے بگڑے نہ ہلے۔ قلم ان کا معنی روشن کی شمع وش سے فوارہ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطافت کیفیت سے شراب انگور۔ اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو طرف حصر و شمار سے افزوں ہے خامۂ تعذ باں بیان کرے، اول چاہیے کہ کلک عقل فعال سے ماہیت نکالے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں مندرج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہرگاہ میں نے اس تقدیس جوہر اور امداد مبدا فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنان بارگاہ ازل سے کمی استعداد کا طعنہ شنا اور شوخی بے ادب کی سرزنش حاصل کی، تو باایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر تنگ لگاں اپنے تئیں جادۂ مقصود میں ڈالدیا تو ہوس حق الاسمی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی۔ اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابان انصاف طینت سے کہ حصول صلۂ آفرین تو کیا خجلت نارسائی اور طعنۂ نا عاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے:

"یکسی کہ از عہدہ ثنای کسی بیرون نیاید چہ اولی بعجز اعتراف نہ نماید"

بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشۂ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے۔ بیت:

پاسی است بعد بلند و پستی ہان پای نہ لغزدت زمستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے جد اعلیٰ پہنچتے فرماں روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا ان کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جد امجد اپنے پدر مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے۔ اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں اور سلسلۂ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبرآباد اختیار کی۔ اور حضرت ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جنات نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے۔ آپ کی پرورش اور تربیت میں معروف ہوئے جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا نصر اللہ بیگ خاں، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی باد پیما کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کار نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافات اکبرآباد سے اُن کی عین حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر ان کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا وہ جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہو گئی۔ پھر وہاں سے بسبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔ ہر دائرۂ الفاظ دہن شکر اور ہر مد حرف زبان سپاس ہے، ان کی نعمت تربیت کا۔ راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اُس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ "دلہا ما بہ دلہا راہ باشد" ان حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو

[illegible] مضمون پر غلبہ ہے اس کا شعر [illegible]
دیوان [illegible] مقدم ہے سادہ [illegible] گلستان کا فذ میں ذکر آتا ہے اور باوہ مضامین کو نازک جان سے
مانتا ہے۔ ص ۱۷۱ — ۱۷۳

سراپا سخن ——— میر محسن علی محسن

مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب ولد عبد اللہ بیگ خاں، قوم ترک، اولاد میں گستاسپ کی، مولد اکبر آباد، مسکن دہلی۔ دیوان فارسی و ریختہ اور پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی ہیں۔ مولف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فاتحین خدا کا قصبہ دیبائی سے بھیجی تھی۔ (ص ۴۴)

یادگار شعرا ——— اشپرنگر

اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ۔ ان کے بزرگ سمرقند کے تھے اور یہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ سرور ان کا تذکرہ غالب کے تخلص کے ذیل میں کیا ہے۔ سنہ ۱۸۵۰ میں یہ تقریباً ۶۰ سال کے ہیں۔ ان کا دیوان چھپ گیا ہے۔ اس وقت یہ صرف فارسی میں اشعار کہتے ہیں۔ انھوں نے انشا فارسی اور حضرت علی کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی۔
غالب اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ بڑے عالی خاندان ہیں۔ پہلے آگرے میں رہتے تھے۔ اب دہلی میں ہیں۔ یہ ایک پرانے شاعر ہیں۔ بیدل کا تتبع کرتے تھے، لیکن اب ایک طرز پیدا کیا ہے جو انھیں کا حصہ ہے۔ (گلشن بے خار) ص ۱۲۵

گلشن ہمیشہ بہار ——— مولوی عبد العلیم محمد نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی

غالب تخلص، مرزا نوشہ کنام ساییش اسد اللہ خان است، تازہ وردِ دار الخلافہ شاہجہان آباد و نکتہ سنجی مزاج او ست و عندلیبِ کلام از جوہر طبع وہاج او۔ شاعری است کہ مانند ش دریں عہد زماں معدوم و عالی طبعی است کہ ندش تا قطع دور دراں غیر معلوم نکیری در تعزل پیش او بعلو نظرش از شعرای عامی است در پی بہ تشبیب بعرفان مضامین عالیہ و چند الکلامی غیر نای در فکر سخن نام بر آورده و از عرصہ گوی سبقت از ہمسران بردہ صاحب دیوان منیف است و این اشعار از ان و ستاد شریف است بیت: ص ۸۰ — ۱۲

گلستان سخن ——— میرزا قادر بخش صابر

غالب تخلص، شیر نیستان سخنوری، ببر بیشۂ معنی پروری، یکہ تاز عرصۂ کمال، یکہ تازِ کشورِ افضال، سیاح زمین سخن، دانائی نواد فنون، کلاہ جہان، مرزا اسد اللہ خاں المعروف بمرزا نوشہ سلمہ الرحمٰن، سخن سنج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دلپذیر ہے۔ خامۂ گوہر بار سے اُس نے سخن میں لوای جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا فشان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدر مقدما کی ذات پر تکیہ نہ کرتے، فضیلت نہ رکھتے۔ اور کمالات اگر اس زبدہ کملا سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ سیاہی رقوم اس کی رنگینی معنی سے ہم شکل طاؤس، صفحۂ قرطاس، اس کے فروغ مضامین سے ہم رنگ فانوس۔ بقا طور اگر اس کی تجلی معنی کے مقابل ہوتی سرمہ ہو جاتا شمع ایمن اگر اس کے شعلۂ فکر کے سامنے آتی فروغ نہ پاتی۔ ایوان سخن اس کی فکر کی معماری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت، بنای کلام اس کی طبیعت کی سے قامت کے ساتھ ہمہ متانت۔ وصف بزم میں رفتار قلم رقص ناہید کے برابر، بیان رزم میں صریر خامہ نعرۂ شیر سے ہمسر۔ فکر اگر حملۂ ہمت سے ایسا جھپکرے فضای امکان مرحلۂ مقصود کے روبرو دیدۂ مور سے تنگ نظر آوے۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جا دے غبار کو اس جایگاہ رفیع سے گنج قارون سے پست تر پاوے۔ سخن کی نزاکت اور بجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شگفتگی اور چستی عبارات، گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دیا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و

ن شعرا ——— عبدالغفور نساخ

غالب تخلص، مخدوم و معظم، نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، معروف بہ میرزا نوشہ خلف عبد اللہ بیگ خاں، اولاد میں
سیاب کی ہیں۔ مولد ان کا اکبر آباد، مسکن دہلی، طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے۔ اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری و اثر شیری و میرزا عبد القادر
کے ہم پہلو ہوتے ہیں۔ اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے۔ اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے۔ بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتے میں بھی آئے
راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ کلیات ان کا نظر سے گزرا۔ ۱۲۸۵ بارہ سو پچاسی ہجری میں انتقال کیا۔

(ص ۳۴۲)

کرہ فرح بخش ——— نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

فردوسی رزم، خسرو بزم، کلیم کلام، نظامی نظام، جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب دہلوی علیہ الرحمہ مشاہیر
ے نامی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے اور دیوان اردو اور کلیات فارسی جناب ممدوح مشہور آفاق ہیں، اس لیے صرف
شعر تبرکاً لکھتا ہوں۔

ہے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

آخر ۱۲۸۵ ہجری شہر شاہ جہاں آباد میں جناب ممدوح کا انتقال ہوا۔ تواریخ انتقال اکثر شعرائے نازک خیال نے لکھی ہیں۔ ازاں جملہ
ریخ جناب مولانا محمد عباس رفعت کی مجکو یاد ہے، قابل تحسین و داد ہے،

جانِ اربابِ سخن غالب عالی ہمت	ناظم سحر بیان نا ثر والا فطرت
رشکِ فردوسی و خاقانی و عالی و کمال	ثانی خسرو و سعدی و حزین و شوکت
ابرِ مدرارِ کمالات و فرات دانش	ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوی ریاضِ رضواں	گفت عباس کہ شایان سریر جنت

۱۲۸۵

(ص ۶۶ - ۶۹)

ہنگ مجموعہ سخن

غالب تخلص، نام ان کا اسد اللہ خاں اور شاہ دہلی کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب ہے۔ ۱۷۹۵ء عیسوی میں خاص شہر دہلی میں متولد
ے۔ ان کے والد کا نام عبد اللہ بیگ خاں، قوم اتراک سے ہیں۔ مرزا غالب کے دادا کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہو کر ہند میں آئے اور لاہور میں معین الملک
نوکر ہوئے۔ بعدہ دہلی میں آکر بادشاہی ملازمت اختیار کی۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ مرزا غالب کا
پانچ برس کا تھا جب اُن کے باپ نے قضا کی تب نصر اللہ بیگ خاں اُن کے چچا نے ان کو پرورش کیا۔ وہ از جانب مرہٹا اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔
ایک صاحب بہادر گورنر جنرل کی طرف سے چار سو سوار کے رسالہ دار ہو کر دو پرگنوں کے جاگیردار ہوئے۔ آخر کو وہ جاگیر ۱۸۰۶ عیسوی میں ضبط ہو گئی اور
کے عوض تنخواہ ملنے لگی جب تو مرزا غالب شاہ جہاں آباد میں آکر آباد ہوئے اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ فارسی میں ایک آتش پرست کے شاگرد تھے
بان اردو میں فقط میر کے معتقد تھے۔ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری مطابق ۱۸۶۹ عیسوی کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور دیوان قصائد فارسی و
نثر کا اور نثر فارسی میں تاریخ مہر نیم روز اور انشا کا پنج آہنگ و قاطع برہان و تاریخ دستنبو اور اردو میں ایک دیوان غزلیات مختصر موجود ہے۔

(ص ۱۱۱ — ۱۱۲)

افشائے نور چشم —— نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی

نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ دہلوی المتخلص بہ غالب۔ تصنیف: ۱۔ مہر نیمروز ۲۔ ماہ نیم ماہ ۳۔ پنج آہنگ ۴۔ دستنبو ۵۔ دیوان فارسی ۶۔ دیوان اردو ۷۔ قاطع برہان ۸۔ تیغ تیز ۹۔ عود ہندی ۱۰۔ درفش کاویانی ۱۱۔ گوہر افشاں ۱۲۔ قادر نامہ ۱۳۔ سبد چین ۱۴۔ لطائف غیبی ۱۵۔ اردوئے معلّیٰ۔

ثانی ظہیر و ظہوری تھے۔ دوم ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ دہلی میں راہی ملک بقا ہوئے۔ جناب ممدوح کے صدہا شاگرد رشید میں سے ایک کمترین راقم آثم ہے۔ جناب ممدوح نے ایک قصیدہ جو دیوان فارسی میں مرقوم ہے وزیر الدولہ امیر الملک نواب وزیر محمد خاں صاحب بہادر مرحوم رئیس ٹونک کی مدح میں لکھ کر ممدوح کے پاس بھیجا۔ نواب موصوف نے ارسال صلۂ قصیدہ میں عمداً یا سہواً دیر کی۔ میرزا صاحب نے ایک خط منظوم لکھ بھیجا۔ نواب صاحب نے بعد ملاحظہ ہزار روپیہ بطریق جائزہ روانہ کیے۔

چند سال وفات سے پہلے میرزا صاحب نے خطوط اردو میں لکھنا اختیار کیا تھا۔ مولانا محمد عباس رفعت نے بھوپال سے میرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامہ کا مشتاق ہوں۔ جناب مرحوم نے اُن کو خط فارسی تحریر فرمایا مع کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گزرے اور وہ میرے پاس موجود تھے۔ برائے اشاعت کلام استاد و استفادہ ادبائے نقاد احقر العباد نے تبرکاً اس اپنی انشا میں رقم کیے۔

منظوم

گفتم بخرد بخلوت انس — کای شمع و چراغ ہفت ایوان

آیا ز چہ رو بود کہ نواب — ننوشت جواب نامہ ام ہان

آنگونہ صحیفہ کہ دادی — درویش نوشتہ سوی سلطان

آنگونہ قصیدہ کہ گوئی — از صفحہ دمید سنبلستان

اینک ہر دو رسید فرصت پیدا — زان نو اثری بہیچ عنوان

رنجیدہ مگر ز مدح نواب — ای کاش نگشتمی ثنا خوان

ہیہات چہ گفتہ ام کہ باشم — از گفتۂ خویشتن پشیمان

عقلم بجواب گفت غالب — زنہار مخور فریب شیطان

نواب بفکر ارمغان است — تا نامہ فرستدت بسامان

وانہا کہ بخاطرش گذشت است — زود آن ہمہ جمع کرد نتوان

ز آن دست کہ جمع نیز گردد — دیر است کہ دادہ است فرمان

تا راہ روان بحر و بر گرد — آرند بکوشش فراوان

دیبا ز دمشق و مخمل از روم — الماس ز معدن و زر از کان

نیل از دکن و زمرد از کوہ — توسن ز عراق و دُر ز عمان

فیروزۂ نغز از نشاپور — یاقوت گزیدہ از بدخشان

تیغ زدہ تیز رو ز بغداد — شمشیر برندہ از صفاہان

پشمینۂ نیک ز کشمیر — زربفت گران بہا ز ایران

با این ہمہ رنگ چون ازین دست — بر رنج و ملال نیست برہان

چون پیر خرد بدل فرو ریخت — گفت این ہمہ بارہای پنہان

گفتم چو بہم امید داری — مرہم نہ زخم یاس و حرمان
گفتم مگر چو با من ای کرم کرد — آن قبلہ و قبلہ گاہ امیان
ناچار زراہ حق گزاری — تا کردہ شود تلافی آن
من نیز طلب کنم برایش — این مشکل اگرچہ نیست آسان
آئینہ و تاج از سکندر — انگشتر و تخت از سلیمان
از عالم غیب جام جمشید — از چشمۂ خضر آب حیوان
عمر ابد و نشاط دائم — نیروی دل و ثبات ایمان
توفیق جواب نامۂ خویش — تعجیل عطا و بذل و احسان

منثور

والا یزدان ہست و بود آفرین را کہ گماشتن دخشور و فرستادن منشور از آلای اوست بے مر نیایش و آدرندۂ گرامی منشور رہنما ہا ایلک دخشور را کہ پس از وی از ان دہ نہ دو پیرۂ دخشور کہ باز پسین آن جمع با خداوند در نام انبازی دارد۔ ہر یکی بہر ہنگام بجای اوست۔ بی اندازہ ستایش غالب سخن گزار ہیچ منگار۔ اگر دین مردہ دلی سوی کلک و کاغذ گرایش دارد نامہ نگار را بسا دوستانند کہ سواد مردم چشم گزرگاہ آنان نشدہ و در سیہ خیمۂ سویدائی دل می مانند۔ نیرنگ روزگار دود تنگ نگرستنی ست پست پایگی بدان پایہ کہ از فرد ماندگی خاک نشین کیستم دلبند نامی بدان اندازہ کہ بیپایگی گری خامہ و نامہ سدشناس اعیان دہر ہم حاشا کہ این چنین پست پایۂ بلند نام جز من در دہر توان یافت۔

از دیر باز بہ نظم و نثر فی گرایم۔ نظم خواہی پارسی و خواہی اردو خوابی ست فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین تا منماہر چہ نوشتہ می شود کیم در اردو سعد۔ انیک خواجہ حق پرست حق شناس بلندپا۔ یہ ملا نا جاس کہ ہم از ان گروہ پر شکوہ ست کہ با من بزبان قلم راہ سخن کشودہ اند از ہمہ فرمان فرستاد کہ غالب فرسودہ روان بنام آن ہمہ دان نامہ در پارسی زبان نویسد۔ یارب فرمان چون بجا آورم و در نامہ چہ نویسم۔ باری از توانا بنان بلکہ از اشمد دائی آن فرمان جنبش خامہ نقلی چند کہ نخواندن نیرزد بر روی ورق فرو ریخت تا آن ورق بہم پیچیدہ سوی کار فرما روان داشتہ آمد۔ چشمداشت آنکہ برگ سبز از درویش بہ تحفگی پزیرفتہ آید۔

نگاشتہ سہ شنبہ و چہارم ربیع الاول سال رستاخیز (ص ۴۶ — ۵۲)۔

انتخاب یادگار — منشی امیر احمد امیر مینائی

غالب، اسد اللہ خاں، عرف مرزا نوشہ، خلف مرزا عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا، قوم ان کی ایک ہے اقوام ترک سے، جد اعلیٰ ان کا ماوراء النہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہوئی ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی۔ مرزا عبد اللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد خواجہ غلام حسین خاں کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے۔ ابتدا میں شیخ معظم نام ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی۔ پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے جس کا نام آتش پرستی میں ہرمزد اور بعد قبول اسلام عبد الصمد تھا تلمذ ہوا دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی جب سن تمیز کو پہنچے مرزا الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعۃ النہار آشکار ہے، نظم و نثر اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں۔

فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں۔

قادر نامہ، جو خالق باری کی طرز پر مدون کیا ہے۔
مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ، یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ دوم میں جلال الدین اکبر بادشاہ کے عہد کا حال لکھا گیا ہے۔
دستنبو، جس میں غدر کے واقعات ہیں۔
قاطع برہان، جس میں برہان قاطع کے بعض لغات پر خدشات ہیں۔
پنج آہنگ، اس میں فارسی زبان کے منشآت ہیں۔
اردو میں ایک دیوان
اور اردوئے معلیٰ
اور عود ہندی
ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔
الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت اُن کے نتائج فکر سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے اس سرکار فیض آثار (ریاست رامپور) کے نمک خوار قدیم ہیں۔ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکاں طاب ثراہ ان سے تلمذ ہے۔ اس عہد میں بھی وظیفہ خوار رہے۔ بندگان ولی نعمت ادام اللہ ظلال اجلالہم نواب کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں جانشین فردوس مکاں کے عہد دولت میں بھی جب تک زندہ رہے مورد پرورش بے شمار رہے۔ چوہتر برس کی عمر پائی۔ بارہ سو پچاسی ہجری ماہ ذیقعدہ کی دوسری تاریخ کو وفات پائی۔ سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ العزیز کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ دیوان کے کلام کا انتخاب ہے جس کا ہر حرف لاجواب ہے۔
(ص ۲۴۰ — ۲۴۱)

شمع انجمن —— نواب سید محمد صدیق حسن خاں

غالب، میرزا اسد اللہ خاں دہلوی مخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر، از سخنوران نامی شاہ جہان آباد و صاحب قوت فکر خداداد است۔ موجد مبانی خوش و مخترع معانی دلکش، شیر بیشۂ سخن پروری، شہریار مصر معنی گستری، در نثر و نظم طرز خاص دارد و تراکیب دلنشین اختراع می نماید۔ بسیاری از معاصرانش قائل بکمال او و نثاری رنگینی اند، و جمعی از اقران بر طرز و ادای کلام او اعتراضات کردہ، انچنانچہ از قاطع برہان و ساطع برہان پیدا (؟) چون صبح، روشن می شود۔ اما شک نیست کہ قدرت او بر اصناف سخن از نثر و نظم بیش از دیگران است۔ قصاید خمریات و غزلیات و رباعیات وی اما مخلص قصاید خوب واقع نشدہ و قصیدہ بہتر از غزل می سراید۔ غالب قصاید او در مدح حکام فرنگ و روسا و اکابر ہندوستان ست۔ از وظیفہ خواران بہادر شاہ پادشاہ دہلی ست۔ مذہب شیعی داشت، چنانکہ خود ہم سرودہ:

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

و ہیچ وقت خود را از شرب مدام و گردش جام معاف نمی گذاشت۔ زبان فارسی نیک تر می داند و از ایراد الفاظ عربی حتی الامکان گریز می نماید۔ مہر نیمروز و دستنبو و منشآت و جز آن از کتب فارسیہ یادگار اوست۔
محرر سطور در ایام اقامت شاہجہان آباد مکرر او را دیدہ و تقریر جادو تاثیرش گوش کردہ و غزلہا از زبان او شنیدہ۔ قصیدہ بسر عت تمام می گفت و طرز خود را در سخن گاہی از دست نمی داد۔ احیاناً شعر ریختہ اردو ہم می گفت۔ دیوان مختصری در ریختہ دارد۔ دیوان فارسی او بر بہ طبع دائر و سائر ست۔ مجموعۂ ابیاتش دہ ہزار و چہار صد و بست و چہار بیت است و ہر یک از مدی خوشی تاثیر و خوبی تقریر گلوی بلبل و آویزۂ گوش دل ست۔

[illegible] ولادت اوست و وفاتش در ۱۲۸۵ھ بود، تتبع کلام ظہوری کا و عرفی شیوۂ مرضیۂ اوست و استفادہ از سخن طالب و حزین راہ مدعم [illegible] بنابر التزام چند گوہر شاہوار از صدف طبع او درین جا بسلک بیان کشیدہ می آید .... (ص ۳۴۷ — ۳۴۸)

آب حیات ——— محمد حسین آزاد دہلوی

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا۔ اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرائے ہند در سلسلے اکبرآباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں۔ اسی طرح اردوئے معلّٰی کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جاوے .... الخ

طور کلیم ——— سید نور الحسن خاں

غالب فخر عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان الملقب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر افراسیابی دودمان اکبرآبادی مولد دہلوی مسکن لفظ غریب تاریخ ولادت اوست۔ وفاتش در ۱۲۸۵ھ واقع شدہ از تالیفات اوست پنج آہنگ، دستنبو، و مہر نیمروز و قاطع برہان در پارسی زبان دیوانی دار و مجموع ابیاتش دہ ہزار و چار صد و بست و چہار است۔ در اوائل بروش میرزا بیدل حرف می زد آخرالامر از دیگر مطبوع ابداع نمودہ و دیوانی کہ در ریختہ است فراواں ابیات از آن ساقط کردہ قدر قلیلی انتخاب زدہ است۔ اولاً اسد تخلص می کرد چنانچہ در بعضی مقاطع غزلیات ہنوز موجود است۔ مدت مشق وی پنجاہ سال است۔ در پارسی پایۂ اش از فحول اساتذہ کم نیست و در ریختہ ہم تبۂ اش بجا ماگر کسی ست۔ اگر در ریختہ نظم ما نو بہار است در عرصۂ نثر نیز مرد کار است۔ قدرتی کہ بر جمیع اصناف سخن او راست نتوان گفت۔ زنہی کرد چہ بعضی سخنوران ہمہ بغزل مطعوف است و چرب غزل نغمۂ دیگری تراستند سرودن، در راس المال برخی ہمہ قصیدہ است و جز قصیدہ ترانۂ دیگر از ایشان نتوان شنودن و علی ہذا القیاس۔ غالب سخنوریست کہ اگر زمین غزل است باسمان بردۂ اوست و اگر عرصۂ مثنوی ست پامال کردہ او، و جگامہاش بقصیدہ عرفی ہمپایہ است و چامہ اش چون غزل نظیری گرانمایہ و شگرف ترانہ وی بہر وادی کہ قدم می کشود بسرعت تمام می پیمود و با اینہمہ فروغ معنامین و چستی تراکیب و شوکت الفاظ و رنگینی معانی و متانت بیان و شستگی زبان کہ از شعرا کمتر کسی را بالقوۃ میسر بود و بالفعل نصیب او بود۔ آنچہ بر نسبت دیگراں حبا لغہاش نامند و بنا بنفس الامر شمرا خوانند۔ انصاف بالای طاعت اگر بہ پیشینیان ہمسرش نگوئیم کہ الفضل للمتقدمین دیوانہ نیم کہ پسترش از ایشان پنداریم و با کمال سخنوری کمال سخن فہمی داشت و چنانکہ می شاید لطف شعری بر داشت۔ حضرت شیفتہ می نگارد وی معامین شعری راکما حقہ می فہمد و جمیع نکات و لطائف پی می برد و این فضیلتی ست کہ مخصوص اہل سخن ست۔ اگر طبع سخن شناس داری باین نکتہ بر سی چہ خوش فکرا گر چہ کمیاب ست اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال شخصی کہ از ہر دو شرف یافتہ و حظی ربودہ انتہی

بنا بر ضابطۂ شعری چند ثبت می شود ورنہ دیوانش ہمہ نقطۂ انتخاب است۔ (۴۲ — ۴۳)

بزم سخن ——— سید علی حسن خاں

غالب میرزا نوشہ اسد اللہ خاں الملقب بہ نجم الدولہ دبیر الملک خلف الرشید عبد اللہ بیگ خاں اکبرآبادی، مولد و دہلوی منشا۔ حق انیست کہ زبان ریختہ از و کار با گرفت و گفتار پارسی پایۂ والا اگر اورا مجدد سخن گوئیم بجا است و اگر مجتہد فن خوانم روا فروز شکر دہان فصاحت است و شمع شبستان بلاغت۔ ستایش او محتاج بیان نیست۔ ہر کہ بہرۂ از ادراک داشتہ باشد داند کہ او کیست و گفتارش چیست۔ در پارسی تصانیف متعددہ دارد۔ و در ریختہ دیوانی گزاشتہ۔ در ۱۲۸۵ھ درگزشت۔ او راست .... (ص ۸۸)

جامع الاشعار ——— پروفیسر نذیر احمد ورد

۱۷۹۵ء میں خاص شہر دہلی میں متولد ہوئے۔ والد ماجد ان کے یہیں پیدا ہوئے اور دہلی سے اجڑ کر اکبر آباد میں جا بسے۔ مرزا غالب کا سن پانچ برس کا تھا جب ان کے باپ نے قضا کی...... وہ جاگیر ۱۸۰۶ء میں ضبط ہو گئی اور اس کے عوض تنخواہ ملنے لگی۔۔ ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ میں مطابق ۱۸۶۹ء کو اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ (ص ۳۰)

محبوب الالباب فی تعریف الکتب و الکتاب ——— مولوی خدا بخش خاں

کلیات غالب چھاپہ دہلی، محتوی است بر قصائد و غزلیات۔

مرزا اسد اللہ المعروف بہ مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ابن عبد اللہ بیگ خان۔ اصل وی اتراک است۔ بعد ازین کہ زمانہ سلجوقیان سپری شد اجداد او تمام عمر در سمرقند اقامت گزیدند جد امجد حضرت ایشان از پدر بزرگوار خود (رنجیدہ) رخت بجانب ہندستان کشید و در لاہور با معین الملک ملاقی شد و در سلک رفقای وی منسلک گردید۔ بعد ازین کہ کار معین الملک خراب گشت وی بملازمت شاہی درآمد۔ والد مرزا نوشہ در دہلی متولد شد و در آنجا نشو و نما یافت، باعث بعضے وجوہات توطن اکبر آباد گزید۔ مولد مرزا نوشہ اکبر آباد است۔ چون بعمر پنج سالگی رسید پدر میرزا جہان فانی را پدرود کرد۔ نصر اللہ بیگ خان عم مرزا در آن زمان من قبل مرہٹہ صوبہ دار اکبر آباد بود۔ مرزا را بہ آغوش شفقت خود گرفتہ تربیت وے می ساخت۔ چونکہ میرزا نصر اللہ بیگ بموافقت جنرل لیک کارہای نمایان کردہ بود بصلہ در خدمت مرزا مشار الیہ را دو پرگنہ در مضافات اکبر آباد از دولت انگلشیہ جاگیر تا حیات شد۔ در سنہ ۱۸۰۶ء مرزا نصر اللہ بیگ مغفور فوت شد۔ موافق قرارداد جاگیر علیہ ضبط گردید وظیفہ نقدی برای صاحب ترجمہ معین شد۔ و ہم برین نمط سپری شدہ بود کہ مرزا از اکبر آباد بدہلی شتافت ہمان جا سکونت شدہ بر وظیفہ معینہ قناعت کرد۔ یکبار بغرض سیاحت رخت بجانب بنگالہ کشید و چندی در کلکتہ ہم قیام داشت۔ روزی در یک مشاعرہ عزیزی اعتراضی بر شعر مرزا وارد کرد۔ مثنوی باد مخالف در جواب ہمان اعتراض است۔ باین کہ بجدای کارہای دنیا تعلق نداشت مگر با غایت عزت و مکنت می زیست در شعر فارسی در عصر وی دیگری مثل وی نبودہ۔ دیوان بزبان اردو ہم دارد و در شعر اردو ہم ردیف فارسی نگذاشتہ۔ بہر حال ہر چہ از مرزا ست خیلی خوب است۔ در ایام غدر دہلی در آنجا بود باعث بعضی ارباب ریاست کہ با فوج انگلشیہ داخل شاہجہان آباد بودند مرزا از مہلکہ آن رستخیز قیامت نجات یافت و حالات خود را در رسالہ حوالہ قلم نمودہ آن را دستنبو نام کردہ۔ این رسالہ را محض بزبان فارسی بلا آمیزش کدامی لفظ عربی نگاشتہ۔ باین ہمہ این رسالہ ہم خوب نوشتہ۔ مرزا محض بروش شعرا می زیست و اقدام با قدح راح می کرد و در آخر عمر ثقل سماعت ہم داشت۔ مجموعہ نثر و نظم وی ہم فارسی و ہم اردو مجلد ضخیم می شود۔ عمر طویل کرد۔ در سنہ ۱۲۸۵ در دہلی وفات یافت۔

مطلع قصیدہ اول سے: اے ز وہم غیرت خود نام جہان اندوختہ — گفتہ خود را دعوی خود دادہ گمان اندوختہ

مطلع دیوان: اے بخلا و بملا خوی تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا — ۶۲۹ — ۶۳۱

...... لیکن کلام وی عجب مذاقی دارد کہ کم تر در کلام دیگر شعرا بہم می رسد اسد اللہ خان غالب کہ در عصر خود در شاعری نظیر خود نداشت فرمودہ،

قطعہ

میر کے شعر کا کیا حال کہوں میں غالب — اس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں
ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

...... و شیخ امام بخش ناسخ کہ بقول غالب "طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہمواریوں کے ناسخ تھے" معروف شاعری بود و او را در شعر اردو رسالہ شمردہ ...

(ص ۶۳۱ — ۶۳۲)

یادگارِ دہلی ——— مولوی سید احمد ولی اللّٰہی

حضرت محبوب الٰہی کے روضۂ مبارک کے قریب ..... شروع بازار کے متصل

چونسٹھ کھنبہ سنگ مرمر کی ایک عمارت ہے نہایت عجیب سنہ ۱۰۲۴ ہجری کے بعد بنی ہے اس میں سنگ مرمر کے چونسٹھ ستون لگے ہیں۔ اس سبب سے اس کو چونسٹھ کھنبہ کہتے ہیں۔ اس میں مرزا عزیز الدین کوکلتاش خاں کی قبر ہے جو شمس الدین اتگہ خاں کے بیٹے ہیں۔ سنہ ۱۰۲۴ ہجری مطابق سنہ ۹ جلوس جہانگیری موافق ۱۱۲۴ء احمد آباد گجرات میں انتقال کیا اور یہاں لاکر دفن کیے گئے۔ ان کو جہانگیر کے دربار سے خان اعظم کا خطاب حاصل تھا یہ نہایت خوش تقریر بر تحریر اور نستعلیق کے استاد تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اس عمارت کے شمال کی جانب ایک احاطہ میں

مرزا نوشہ غالب دہلوی

کا مزار ہے۔ عجیب پائے کا شاعر گزرا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دہلی میں شاعری کو ختم کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے عجیب و غریب دل و دماغ ان کا بنایا تھا۔ جس طرح فردوسی فارسی نظم میں عربی الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا اسی طرح مرزا نوشہ بھی اپنی نظم و نثر میں عربی الفاظ بہت کم استعمال کرتے تھے۔ فارسی تحریر میں تو مسلم الثبوت مانے ہوئے استاد ہیں مگر اردو میں بھی جو انھوں نے ڈھنگ اختیار کیا ہے وہ بھی بالکل ایک نیا رنگ ہے۔ اگر ان کے دیوان کے ان اشعار کو چھوڑ کر صرف صاف ستھری اردو کے اشعار پڑھے جائیں تو آدمی کو متحیر کر دیتے ہیں مثلاً دو ایک شعر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

~~~~~~~~

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی — یہ سمجھو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

~~~~~~~~

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

جس دماغ سے یہ اشعار نکلے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

مرزا نوشہ غالب، ابراہیم ذوق، مومن خاں یہ تینوں اپنے وقت میں فرد تھے۔ آپس میں بہت بڑی محبت اور اتحاد رکھتے تھے مگر ہر ایک کی طرز تحریر و وضع جدا جدا تھی۔

مومن خاں (ان کا مزار درگاہ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے احاطے کے باہر جانب غرب واقع ہے) ذوق اور غالب سے بڑے اور عجیب وضع قطع سے رہتے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں ہاتھ پیروں میں مہندی لگی ہوئی، پور پور چھلے انگوٹھیاں، پیر میں گھیتلی جوتیاں، سر پر زری ٹوپی غرض ان کی یہاں بان تھی، مگر ابراہیم ذوق کی مولویانہ بالکل وضع تھی۔ صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ بہت بڑے عالم تھے۔ اکثر ان کے ہاں عربی کتب کا درس ہوا کرتا تھا۔ اول ہی دن سے نہایت متقی پرہیزگار، رندوں اور آزادوں کی صحبت سے متنفر تھے۔ اسی سبب سے آپ کے اشعار بالکل سادے ستھرے اور رنگ آمیزی سے خالی ہیں اگرچہ کہیں کہیں اشعار میں شراب نوشی اور ہجر اور مصیبت کا ذکر آ گیا ہے لیکن اس ذکر میں نہ شراب نوشی کی پائی جاتی ہے اور نہ فراق یار میں درد ٹپکتا ہے۔ آپ کی تمام عمر نہایت عیش کے ساتھ گزری۔ بہادر شاہ بادشاہ کے استاد تھے (ان کا مزار کلو کے تکیے میں متصل قدم شریف ہے)

مرزا غالب نرالی وضع رکھتے تھے۔ سر پر جوگیا اونچی باڑ کی ٹوپی اور ایک لمبی قبا اور اس پر ایک جامہ اور گھیتلا جوتی پہنتے تھے ضعیفی میں آپ کی کمر بھی جھک گئی تھی۔

... میں انتقال ہوا۔ ... تاریخ کہہ دی ہے

یا حی یا قیوم

رشک عرفی و فخر طالب مُرد — اسد اللہ خان غالب مُرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں — تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

(ص ۲۰۶ — ۲۰۷)

ناظم برقی پریس میں چھپوا کر دفتر نگار کمیٹی رام پور یو۔ پی سے شائع کیا۔

THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R. N. NO. 2136/57

قیمت | فی پرچہ : ۷۵ نئے پیسے
| سالانہ : دس روپے

زبانِ خلق

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد)

مضامین اچھے ترتیب بھی قابلِ تعریف، خدا مبارک کرے اور رسالے کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ)

کل نگار نظر نواز ہوا۔ یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ایک طرف آپ نے نگار کی روایات کا لحاظ رکھا ہے اور دوسری طرف اس میں کچھ شگفتہ افسانے بھی ہیں۔ مستقبل کے لیے پروگرام بھی شاندار ہے۔

یوں تو مضامین بھی قابلِ قدر ہیں لیکن غالبیہ کا عنوان مجھے بہت پسند آیا۔ یہ بہت مفید سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اور اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

آپ نے بڑی ذمہ داری اٹھائی ہے لیکن آپ کی صلاحیت اور انہماک سے توقع ہوتی ہے کہ اس کا حق ادا کریں گے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم (علی گڑھ)

غالبیہ کا سلسلہ اچھا ہے۔ یوں تو میرا خیال ہے کہ اگر ہم لوگ ایک عرصے کے لیے غالب کو اپنی قبر میں آرام کرنے دیں تو غالبا یہ ان کے لیے بہتر ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ میری رائے کوئی مانے گا نہیں اور جیسا کہ صفحہ ۵ کے اشتہار میں کہا گیا ہے غالب سے چھیڑ چلتی رہے گی۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی (بمبئی)

نئے سال کا نیا عہد دلکش وحسین نگار کی شکل میں جلوہ گر ہوا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس میں آپ کو ایک ہی رکھے۔

میکش اکبر آبادی (آگرہ)

خوشی کی بات ہے کہ آپ نے نگار کا معیار قائم رکھا، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالبیہ کے اضافے سے اس کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی۔ تاباں کی غزل بہت ہی بہتر ہے۔ ابھی میں بستر پر جستہ جستہ ہی مطالعہ کر سکا ہوں مگر اپنے ذہن میں ایک قسم کی حرکت محسوس کر رہا ہوں امید ہے کہ ان شاء اللہ کبھی کوئی خدمت ضرور کر سکوں گا۔

غلام ربانی تاباں (دہلی)

آپ نے بہت محنت سے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ واقعی بہت پسند آیا۔

مختارالدین احمد آرزو (علی گڑھ)

نگار ملا شکریہ۔ پاکستانی ایڈیشن بھی آج دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصل ہے اور وہ نقل۔ معلوم ہوتا ہے آپ نگار کے دفتر سے وہی کاغذ اٹھا لائے اور وہی کاتب۔ طباعت اور کتابت بہت اچھی ہے اس کی داد اس لیے دے رہا ہوں کہ اچھی طباعت کی رامپور میں امید نہ تھی۔

مضامین سب اچھے ہیں آپ نے اچھا کیا کہ باری تعالیٰ پر سنجیدہ اور بھاری بھر کم مضمون کے فوراً بعد بہت موافق پر ایک ہلکا پھلکا خاکہ شائع کر دیا تاکہ رسالہ متوازن ہو۔

محمد عتیق صدیقی (علی گڑھ)

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے نگار کی سابقہ روایات کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ شکل وصورت کتابت اور مواد نگار کے ماضی کا آئینہ دار ہے۔ خدا آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ اس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

غالبیہ دیکھا بہت اچھا ہے

آپ نے آئندہ کا جو پروگرام پیش کیا ہے وہ بھی خاصا شاندار ہے اور آپ کی اہلیتوں سے توقع ہے کہ آپ کامیابی کے ساتھ اس کو پورا بھی کر سکیں گے۔

مرتضیٰ حسین فاضل (لاہور)

نگار ملا تماشائی کش کرشمہ دامن دل کھینچنے لگا۔ جو صفحہ الٹا وہ عنوان لطف و ذوق افزا سے آراستہ تھا۔ خدا اس نگار بسیار شیوہ کو آپ کے ہاتھوں تابندہ و پائندہ رکھے۔

ظفر قریشی (ریڈیو، کراچی)

غالبیہ والی تجویز اور اس کی ابتدا بہت اچھی ہے آپ لوگ یہ کام خوب کر سکتے ہیں غالب کو آج تک اور ایسے قدردان نہیں ملے جتنے اب ملے ہیں اور رامپور والوں نے تو کبھی اس کی ہر طرح عزت افزائی کی اور سرپرستی کی۔

فاضل زیدی (چک ضلع سکھر)

بخدا آپ نے خوب رسالہ نکالا ہے اور غالبیہ تو بہت ہی خوب مرتب کیا ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس موضوع میں دلکشی باقی نہیں رہ گئی۔ لیکن آپ نے اس میں بھی جدت و ندرت پیدا کر دی۔ میرے خیال میں غالب کے متعلق اتنا مواد اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اسے آپ کا کارنامہ کہنا چاہیے۔

کھیل کھیل میں چوٹ لگ گئی

کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ درد بہت دن آپ کو پریشان کرے۔

— آپ تفریح سے محروم الگ رہیں اور کام کاج میں علیحدہ نقصان ہو۔

چوٹ زخم اور درد کی لاثانی دوا ہے۔

اس پر بھروسہ کیجیے۔

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین فروری ۱۹۶۳ء | شمارہ ۲

ملاحظات

انا للہ راز چاند پوری صاحب کا ۲۶ جنوری کو اچانک انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ میرے لیے متوقع ہوتے ہوئے بھی سخت تھا۔ متوقع اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دل کے مریض تھے اور اس بہانے بیماری کی طرف سے بے پروا بھی۔ ویسے بھی دل کی بیماری سے کون جانبر ہوا ہے۔

جب میں نے نگار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ دراصل میں نے یہ کام اسی لیے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کہ مجھے ان سے بہت کچھ توقعات تھیں اور وہ بے جا بھی نہیں تھیں۔ میں نے ان سے مضمون کے لیے کہا اور وہ انھوں نے تیار کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو مضمون ان سے جنوری کے شمارے کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی کتابت تک ہو چکی تھی وہ اس بار بھی نہیں آ سکا۔ فروری کے شمارے کے لیے انھوں نے غالب کے ان سہل ممتنع کا موضوع انتخاب کیا تھا۔ اور یہی ان کا آخری مضمون تھا جو نامکمل رہ گیا۔

راز صاحب میں کام کرنے کی جیسی لگن تھی وہ بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ اس پر طرز زبان کی گرفت تھی۔ وہ بہت جلد اپنے موضوع کا احاطہ کر لیا کرتے تھے۔ احساس سے بھی کم وقت انھیں مواد کو ترتیب دینے میں لگتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خان آرزو پر اپنا مضمون دو چار روز میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ مضمون نقوش کے تازہ غالب نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لیے میں مطمئن تھا کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئی تو وہ زود نویسی سے کام دے جائیں گے۔ لیکن آج یہ سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ اور میں ان کی یاد میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

راز صاحب نے ساری عمر شاعری اور صحافت میں گزاری۔ وہ دہلی میں وہ عرشی صاحب کے ترغیب دلانے پر مضمون نگاری کی طرف مائل ہوئے اور دو اہم موضوعات پر دل لگا کر کام کیا۔ ان میں سے ایک تھا امیر پور کا ماحول شعر و ادب اور دوسرا اُردو کی داستانیں۔ ان میں سے آخری کو انھوں نے میرے اصرار پر کتابی شکل میں مرتب کر کے میرے ہی حوالے کر دیا تھا۔ یہ کتاب انشاء اللہ جلد شائع ہو جائے گی۔

آج کل وہ مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے جو مولانا عرشی پر تحقیق و علوم کے نام سے موسوم تھا۔ جب اُن کے ذہن میں یہ اسکیم آئی تو شاید انھوں نے سب سے پہلے مجھ ہی سے اس کا ذکر کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہی کام مالک رام صاحب بھی کرنا چاہتے ہیں اور وہ مجھے لکھ بھی چکے ہیں

اس لیے بھی کہ یہ موزوں نہیں۔ مرحوم نے کہا نہیں انھیں بھی لکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں" یہ جملہ اس لیے بڑا اہم ہے کہ اس سے ان کی منکسر المزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے۔

وہ خود بھی بڑے جذباتی آدمی تھے۔ مظفر علی سید نے اردو تحقیق پر نقوش میں ایک مضمون لکھا اس میں عرشی صاحب کا بھی ذکر کیا۔ راز صاحب سید صاحب کی رائے سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے یہ کہا وہ انھیں بھی کتاب کے مرتبین میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے کہنے لگے تم انھیں لکھو۔ میں نے جواب دیا کہ میرا لکھنا موزوں نہیں آپ ایک کام کر رہے ہیں تو آپ ہی لکھیے بولے آغاز تم کردو میں بعد کو لے سنبھالوں گا چنانچہ یہی ہوا میں نے سید صاحب کو خط لکھا انھوں نے تائیدی جواب دیا اور پھر راز صاحب کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ انھوں نے کتاب کے سلسلے میں بہت سے لوگوں کو لکھا۔ مجھ سے اکثر مشورہ ہوتا رہا۔ مگر یہ سخت تاکید ہوتی تھی کہ عرشی صاحب کو نہ معلوم ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ بات زیادہ نہیں چھپ سکتی تھی۔ عرشی صاحب کو معلوم ہو گئی اور انھوں نے مرحوم کو روکنا چاہا، اس پر میرے پاس بہت افسردہ آئے اور کہنے لگے کہ میں مالک رام صاحب کو اور عندلیب شادانی صاحب کو (عرشی نامہ کے ایک مرتب شادانی صاحب بھی ہیں) لکھتا ہوں کہ اب آپ ہی عرشی صاحب کو لکھ کر اجازت لیں۔ ابھی اُدھر سے جواب نہ آنے پائے تھے کہ خود ہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے" یہ کام اس حد تک ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا کہ مرنے سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ایک شاگرد پر شدید تقاضا کیا کہ وہ پریس سے طباعت کا تخمینہ بنوا لائیں جو مالک رام صاحب نے ان سے طلب کیا تھا۔

اس سلسلے میں جب کسی کا خط آتا تھا بے حد مسرور ہوتے تھے۔ سارے ہی اہم لوگوں کو دعوت دی تھی، ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب، ڈاکٹر علیم صاحب، علامہ نیاز فتح پوری صاحب، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر آل احمد سرور صاحب، ڈاکٹر نظام الدین صاحب، ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب، ڈاکٹر باقر صاحب، شیخ محمد اکرام صاحب، پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب، مسعود حسن رضوی صاحب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، پرنسپل عبدالسلام خاں صاحب ـــــ ان میں سے کچھ کے مقالے انھیں مل گئے تھے۔ باقی سب کے وعدے تھے۔

کئی بار ذکر کیا کہ اگر میں یہ مکمل نہ کر سکوں تو مواد ضایع نہ ہو۔ میں بات کو ٹال دیتا تھا۔ اس لیے کہ اقرار کے معنی یہ تھے کہ میں خود بھی ان کی زندگی سے مایوس ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان پر برا اثر ہی مرتب کرتی۔ اب اُن کا جمع کیا ہوا یہ مسالہ ان کی وصیت کے مطابق مالک رام صاحب کو بھیج دیا جائے گا۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ جو اس کام کا مجوزہے وہی تنہا اسے انجام بھی دے۔

راز صاحب کا ایک مجموعہ کلام حرب و ضرب کے نام سے کبھی شایع ہوا تھا اب وہ بھی نایاب ہے اس کے بعد بھی بیس بائیس سال انھوں نے جو کہا وہ مدون نہ ہو سکا۔ نگار کے ایک نمبر میں اس کلام کا نمائندہ انتخاب اور راز صاحب کے اہم متفرق مضامین شایع کرنے کا ارادہ ہے جو یقیناً اردو ادب کو رام پور کا ایک یادگار تحفہ ہوگا۔

موجودہ شمارہ زیر نظر شمارے میں غالب اور اس سے متعلق عنوانات پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ارادہ ہے کہ یہ بدعت برابر جاری رہے یعنی ہر سال فروری کے شمارے میں غالب پر مضامین شایع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

یہاں ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں میری رائے میں غالب پر لکھنے والوں کو یہ التزام کرنا چاہیے کہ وہ اپنے مضامین ماہ نو، اسکیل اور اس طرح کے ایک دو اور رسائل ـــــ نگار ان ہی میں اشاعت کے لیے بھیجیں۔ اس طرح آئندہ کام کرنے والوں کو در بدر مارا مارا پھرنا نہیں پڑے گا۔ آئندہ خود میں بھی یہ کوشش کروں گا کہ غالب پر سال کے مختلف حصوں میں ادھر ادھر شایع ہونے والے مضامین میں سے اہم نگار میں نقل کرتا رہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ سہولت ہو سکے۔

اس بار وعدے کے باوجود مسلسل شایع ہونے والے کتاب غالبیہ کا دوسرا باب صفحات کی کمی کی بنا پر نہیں دیا جا سکا۔ اگرچہ ہم اسی کتاب کے ایک اور باب سے غالب سے متعلق دو خط شایع کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ قطعاً وعدہ خلافی کا جرم بھی سرزد نہ ہو۔ ان خطوں سے متعلق اکثر حواشی نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ ابتدا میں صرف تعارفی سطریں درج کی گئی ہیں۔

غالب اور صہبائی

مالک رام

غالب کی خود بینی اور خود ستائی اب اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ اس پر کسی تفصیل سے لکھنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں۔ وہ ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر اور ادیب کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خطوں میں تقریباً تمام ہندوستانی شاعروں اور نثر نگاروں کے نام آئے ہیں اور انھوں نے ان میں سے ایک حضرت امیر خسروؒ کے سوا کسی کو نہیں بخشا۔

اس کے باوجود انھوں نے اپنے ہمعصروں سے متعلق ایک قطعے میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:-

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم ۔۔۔ چہ بما منتِ بسیار نہی از کم شاں

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود ۔۔۔ باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دم شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاہ ۔۔۔ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالبِ سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار

ہست در بزمِ سخن ہم نفس و ہمدم شاں

یہاں انھوں نے اپنے چھ معاصروں کا نام لیا ہے اور اپنے آپ کو انکسار سے ان کا محض ہم نفس اور ہمدم کہنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان میں سے ایک صہبائی ہیں۔

صہبائی، جن کا اصلی نام امام بخش تھا، نجیب الطرفین تھے۔ سلسلۂ نسب والد کی طرف سے حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی پر اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کا خاندان تھانیسر کا رہنے والا تھا، لیکن یہ دلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے میں فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ یہ عبد اللہ خاں علوی کے شاگرد تھے، جن کا نام غالب کے مندرجہ صدر قطعے میں بھی آیا ہے۔ ان کا کلیات فارسی ان کے ایک ہندو شاگرد اوجین دیال میر منشی ایجنسی بھوپال نے جمع کر کے چھپوایا تھا۔ اردو میں بھی ان کی بعض نثری چیزیں ملتی ہیں۔ قدیم دلی کالج کے پرنسپل فیلکس بوترو کی فرمایش پر انھوں نے ۱۸۴۳ء میں شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا تھا، لیکن اس میں ترجمے سے زیادہ ترجمانی کی ہے۔ بعض عبارت میں اتنا ردو بدل اور حذف و اضافہ کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی مستقل تالیف ہو گئی ہے۔ اصل کتاب میں مثالیں فارسی میں تھیں، ان کی جگہ انھوں نے اردو کی مثالیں مہیا کی ہیں۔ بعض جگہ مثالوں میں اپنے چند اردو شعر بھی درج کیے ہیں، ورنہ یوں وہ اردو میں شعر نہیں کہتے تھے۔ اس کتاب کے علاوہ اسی کالج کی ترجمہ سوسائٹی کے لیے انھوں نے اردو شاعروں کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا تھا۔ ہر ایک انتخاب سے پہلے انھوں نے شاعر کے مختصر حالات اردو نثر میں لکھے ہیں۔ یہ انتخاب بھی اسی سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔ سرسید کی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں بھی وہ برابر کے شریک رہے تھے، بلکہ ایک پورے کا پورا باب انہی کا لکھا ہوا تھا۔ جب ۱۸۴۴ء میں دلی کالج میں عربی کی طرح فارسی کے لیے بھی ایک جدا استعداد مدرس رکھنے کی تجویز ہوئی، تو اس جگہ پر صہبائی ہی کا تقرر ہوا تھا۔ ان بیچاروں کا انجام بہت حسرت ناک ہوا۔ اپنے دو جوان بیٹوں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزی گولی کا نشانہ ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالب کے اس قطعے سے خیال ہوگا کہ وہ صہبائی کی شاعری کے قائل و معترف ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ خدا معلوم، وہ کس تاثر کے تحت یہ کہہ گئے، ورنہ انھوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائی کا ذکر کیا ہے، حقارت اور ذمت کے لہجے میں ہے۔ بانِ قاطع کے مباحثے میں صہبائی کے

ز متن اور نسخۂ شیفتہ سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں
ماق سے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصلی ہدف تو میرزا رحیم بیگ
، صہبائی بیچارے اُن کے استاد بھی لپیٹے میں آ گئے۔ اگر اور کوئی
ادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہ کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن
ہوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال
، ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے،
ایں چند قصیدے قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر
بارون وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب
کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے ولی عہد ظفر، میرزا فتح الملک بہادر
، مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے
ں کا مطلع ہے:-

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زمزمہ رعناں، زمزمہ از تار بر آمد

س کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفِ زلب کافر و دیندار بر آمد
آں از نَعَم آوازۂ انکار در افگند
ویں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:-

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی
پیشِ معتقدانِ خویش کہ غرکرۂ چند بودند، گفت :
افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از نعم معنیِ انکار افادہ می کند؛
حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آل نبی
یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ ملّا کہ رفعِ ایں وسوسہ
می کرد، بوے نمود و گفت، غالب حق گفتہ است و
تو غلط فہمیدہ۔ سوال و جواب ہمیں است: اَلَسْتُ
بِرَبِّکُمْ؟ — آیا نیستم پروردگارِ شما؟ و ایں کلمہ
استفہامیہ است۔ کفار گفتند، ہاں، نیستی خدائے
ما؛ مومناں گفتند: ہاں، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم
انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خر در
گِل فرو ماند۔"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ۔ غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی محورخِ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب

ہے یہاں موسم برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے روکشِ باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی۔ نصیب اس کا۔ زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوفِ عدو دن رات ہم پہلوئے دوست
طالب خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوز فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ
طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیا جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے
جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔
طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں
ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گہر لا ولد مرے
ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو
کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے لہٰذا ہر ان کے ملنے کی کوئی امکانا
نہیں میں پھر بھی سعی و کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔

منزلِ صحن اور تصرف و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں اتفاق سے کمیوں کے ساتھ کہیں بھی پس کہنا اصل ہوتے تو میرزا رحیم بیگ تھے صہبائی بیچارے ان کے استاد بھی لپیٹے میں آگئے۔ اگر اور کوئی شہادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہ کسی حد تک قابل قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے۔ اس میں چند قصیدے، قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر اخباروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے دلی عہد ظفر، میرزا فتح الملک بہادر کی مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۳۴ پر ہے اس کا مطلع ہے:

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زمزمہ ریحان، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روزِ الست از رہِ مستی
حرفِ زلب کافر دیندار بر آمد
آں از نغم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلی معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی پیشِ معتقدانِ خویش کہ غرکرۂ چند بودند، گفت: افسوس کہ غالب عربی نمی داند و از فہم معنی انکار افادہ می کند۔ حال آنکہ نعم و بلی مرادف بالمعنی است۔ مولوی آلِ نبی یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ ملا کہ در رفعِ ایں وسوسہ می کرد، بہ بسے عود و گفت: غالب حق گفتہ است و تو غلط فہمیدہ۔ سوال از جانبِ حق این است: اَلَستُ بِرَبِّکُم؟ — آیا نیستم پروردگارِ شما؟ وایں کلمہ استفہامیہ است۔ کفار گفتند: ہاں، نیستی خدائے ما! مومناں گفتند: بلی، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خود در گل فرو ماند۔"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ۔ غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی تو رخِ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب
ہے یہاں موسم برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے رو کش باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی، نصیب اس کا، زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوفِ عدو دن رات ہم پہلوئے دوست
طالبِ خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوز فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ
طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیں جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔ طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گہر لاولد مرے۔ ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے بظاہر ان کے ملنے کی کوئی امکان نہیں میں پھر بھی سعی و کوشش کرتا ہی رہوں گا۔

[illegible] کے جواب میں ایک کتاب ساطع برہان لکھی تھی۔ یہاں [illegible] غالب [illegible]
[illegible] دو ایک باتیں لکھتے ہیں۔

"وہ جو [illegible] صاحب نے [illegible] ذکر کیا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے جاہل مکتب دار کا خط ہے، رحیم بیگ اس کا نام [illegible] کا رہنے والا [illegible] اندھا ہو گیا ہے، یا ہو جانا بتاتا ہے [illegible]۔ اس کی تحریر ہم نے دیکھی، [illegible] پڑھنے کی [illegible] بیشتر وہ باتیں ہیں جو [illegible] میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر کیا؟"[1]

اگر ہم یہاں انھیں سے [illegible] کو [illegible] ساطع برہان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں، لیکن بعد کو انھوں نے خود ایک طویل خط میرزا رحیم بیگ کے نام لکھ کر اسے نامۂ غالب کے عنوان سے شائع کیا۔ میرزا رحیم بیگ نے ساطع برہان میں اپنے استاد کے نام (امام بخش) کی رعایت سے ایک مقام پر ان کے اسم گرامی سے پہلے "امام المحققین" لکھا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرزا نامۂ غالب میں ایک جگہ میرزا رحیم بیگ سے پوچھتے ہیں:[2]

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو 'امام المحققین' خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک تا جمیع محققین کا [illegible] ہو، یہ خطاب بہ اجماع اہل عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔ وہ فرماں روائے [illegible] شہنشاہ کہلائے گا، کئی بادشاہ جس کے فرمان پذیر ہو جائیں گے۔ ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا، یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہجہان و جہانگیر ہو جائیں گے؟ اگر حضرت بطریق [illegible] تخفیف امام المحققین کہیے، تو ایک ماموم آپ ہوتے اور [illegible] تنبولی دوسرا ہوتا۔"

میرزا نے نامۂ غالب اپنے خرچ پر طبع کروایا تھا اور [illegible] نزدیک اس کے نسخے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایک صاحب مولوی عبد الرزاق شاکر [illegible] شہری تھے۔ معلوم ہوتا ہے، میرزا نے انھیں بھی اس کا نسخہ بھیجا تھا۔[3] اس پر شاکر نے مکتوب الیہ (رحیم بیگ) سے متعلق پوچھا اور چاہا کہ اگر ہو سکے تو ساطع برہان کا نسخہ بھی مہیا کیا جائے۔ اس پر انھیں لکھتے ہیں:[4]

"نامۂ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے، اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واللہ اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو۔ رسالہ اس کا ساطع برہان دلی پہنچ کر ڈھونڈوں گا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔"

معلوم نہیں، اہل دلی نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ بے شک انھوں نے اپنے کلام پر تو صہبائی سے اصلاح نہیں لی تھی، لیکن گلستانِ سخن (ص ۲۴۱) میں صاف لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے چند رسائل نثر اصلاح کے لیے صہبائی کو بھیجے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے سے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیا تلمذ کے لیے یہ کافی تصور نہیں کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں گلستانِ سخن سے زیادہ اور کوئی بیان قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔

لیکن غالب نے رحیم اور شاکر کے نام صہبائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی رائے ان سے متعلق کیا تھی۔ جگہ جگہ ایک ایک لفظ سے ان کی توہین اور علمی بے وقری کا اظہار مقصود ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ برہان قاطع کی بحث میں میرزا [illegible] تھے اور اس معرکے میں جو بھی ان کے مقابل ہوا، انھوں نے اسے نیچا دکھانے کے لیے جائز و ناجائز تمام حربے استعمال کیے۔ علمی ہلاکت سے گز

---

[1] اردوئے معلی، ص ۳۰۱ (مطبع کریمی، لاہور) [2] عود ہندی، ص ۱۲۸ تا ۱۲۹ (مطبع کریمی، لاہور) [3] عود ہندی، ص ۱۵۱ [illegible]
[4] یہ خط رامپور سے لکھا گیا تھا۔

رلبن اور حسن و تشنیع سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا۔ یہاں
ا ق سے گھبون کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ اصل ہدف تو میرزا رحیم بیگ
، صہبائی بجا سے اُن کے استاد بھی لپیٹے میں آ گئے۔ اگر اور کوئی
ادت موجود نہ ہوتی، تو یہ توجیہ کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔ لیکن
نوں نے ایک اور جگہ بھی صہبائی کے لیے اسی طرح کے الفاظ استعمال
ہیں۔

میرے اپنے پاس غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر قلمی مجموعہ ہے۔
میں چند قصیدے قطعات اور رباعیاں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام معاصر
باروں وغیرہ سے جمع کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیوں میں کہیں کہیں غالب
کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ہیں۔

اس مجموعے میں منجملہ اور چیزوں کے ولی عہدِ ظفر، میرزا فتح الملک بہادر
ن مدح کا وہ قصیدہ بھی ہے، جو اس وقت مطبوعہ کلیات میں نمبر ۴۸ پر ہے
س کا مطلع ہے:۔

بازم نفس از سینہ بہنجار بر آمد
شد زخمہ رعاں، زمزمہ از تار بر آمد

اس کے بعد دوسرا اور تیسرا شعر ہے:

گویند کہ در روز الست از رہِ مستی
حرفے زلبِ کافر و دیندار بر آمد
آں از قسم آوازۂ انکار در افگند
ایں راز بلیٰ معنیِ اقرار بر آمد

یہاں غالب حاشیے میں لکھتے ہیں:۔

"چوں ایں قصیدہ شہرت یافت، مولوی امام بخش صہبائی
پیشِ معتقدانِ خویش کر خرکرۂ چند بودند، گفت :
افسوس کہ غالب عربی نمی داند، از قسم معنیِ انکار افادہ می کند،
حال آنکہ نعم و بلیٰ مرادف بالمعنیٰ است۔ مولوی آلِ نبی
یکے از یارانِ غالب عبارتِ شرحِ ملا کہ رفعِ ایں وسوسہ
می کرد، بدیں نمود گفت، غالب حق گفتہ است و
تو غلط فہمیدہ۔ سوال و جواب حق ایں است: اَلَستُ
بِرَبِّکُم ؟ — آیا نیستم پروردگارِ شما ؟ و ایں کلمہ
استفہامیہ است۔ کفار گفتند: ہاں، نیستی خدائے
ما ! مومناں گفتند: ہاں، ہستی خدائے ما۔ آں تسلیم

انکار است و ایں تسلیم اقرار۔ مولوی چوں خر در
گِل فرو ماند"

اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔

بقیہ غالب کا ایک گمنام شاگرد

آنکھ جس دن سے کھلی محو رخ دوست ہوں میں
میری آنکھیں نہیں واقف، کسے کہتے ہیں خواب
ہے یہاں موسم برسات ہمیشہ طالب
دیدۂ تر میں مرے رو کش باراں سیماب

ہے حسن و تخیل میں اک فرق بہر صورت
واں زلف پریشاں ہے یاں فکر پریشاں ہے

زندگی اس کی۔ نصیب اس کا۔ زمانہ اس کا ہے
جو ہے بے خوف عدو دن رات ہم پہلوئے دوست
طالب خلد بریں طالب ہو کس کے واسطے
دل تمنائے جہاں رکھتا نہیں جز کوئے دوست

کس آتشیں نگار کے سوز فراق میں
سرگرم نالہ ہوں شرر افشانیوں کے ساتھ
طالب کیا ہے آہ نے اپنی اثر ضرور
وہ ہیں جو عذر خواہ پشیمانیوں کے ساتھ

یہ سرسری انتخاب ان شکستہ اور کرم خوردہ اوراق کا ہے
جس کی ترتیب و تدوین کے لیے اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔
طالب کے نام غالب کا کوئی خط مجھے ابھی تک دستیاب نہیں
ہو سکا۔ طالب کے اکلوتے فرزند مفتی سید احمد شریف گہرا ولد ہے
ان کی وفات کے بعد اس خاندان کا نسلی چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
بجھ گیا۔ خاندانی جائداد کے تنازعے شروع ہوئے اور جس کے ہاتھ جو
کاغذات لگے اس نے اپنے قبضے میں کر لیے بظاہر ان کے ملنے کے کوئی امکانا
نہیں ہیں پھر بھی سعی و کوشش تو کرتا ہی رہوں گا۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں خط موافق و مخالف انداز فکر کی آخری حدوں کو چھوتے ہیں۔ علائی نے غالب کے سلسلے میں جس عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے ذکاء اللہ کے یہاں اس کے برعکس جذبہ نظر آتا ہے اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

ان خطوں کے ساتھ آب حیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم کر لینا دشوار نہیں کہ آزاد نے منفی کے مقابلے میں مثبت اطلاعات کو ترجیح دی ہے اور غالب کے بارے میں ان تاثرات اور واقعات کا اندراج پسند کیا ہے جو علائی نے لکھے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ذکاء اللہ کے بیانات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

دراصل یہ طرز عمل آزاد کے مرنجاں مرنج مزاج کا تقاضہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گل کبھی نہ کھلا سکتے جو انھوں نے کاغذ پر بکھیر دیئے ہیں اور جو کاغذ کے ہوتے ہوئے بھی بے رنگ و بو نہیں۔ وہ اگر چاہتے تو جانب داری سے کام لیتے ہوئے مخالف مواد کو بآسانی پیش کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے ہمیں سارے مشکوک مواقع پر جہاں ہم آزاد کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتے ایک بار پھر سوچنا چاہیے کہ ہم مصنف کو کتنی چھوٹ دے سکتے ہیں۔

یہ خطوط اگر ایک طرف آزاد کو سنگین الزام سے بری کرتے ہیں تو دوسری طرف غالب کے بارے میں دلچسپ معلومات کے حامل بھی ہیں اور دو قطعاً مخالف سمتوں کی وجہ سے بے حد لائق توجہ بھی۔ ڈاکٹر محمد صادق کے شکریہ کے ساتھ انھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مکتوب نواب علاء الدین احمد خاں علائی

ادیب شفیق، حبیب لوذعی و امعی مولوی محمد حسین صاحب عربی پروفیسر کالج لاہور

السلام علیکم: آپ کا مہربانی نامہ ۲۲ جون کا اس دورافتادہ کو ملا۔ اس کا ورود میرے لیے فتح الباب مسرت ہوا۔ آپ کا ارادہ نسبت تالیف تذکرہ مشاہیر شعرا اور اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس تذکرے میں ہر شاعر کے تاریخی حالات اور اس کی سوانح عمری کے واقعات لطائف اور تلامذہ رحمانی کا آپ نے التزام فرمایا ہے اور عنایت الٰہی اس کا تکمیل بہ پہنچنا دریافت ہو کر نہایت درجہ مسرت حاصل ہوئی۔ اگرچہ میں سرمایہ علمی بہت کم رکھتا ہوں اما ایسے امور کا نہایت شائق ہوں اور افسوس ہے کہ وقت لکھنے اس تذکرے کے میں آپ سے دور تھا۔ ورنہ آپ کو تاریخی حالات شعرا کی نسبت سوائے حالات مرزا اسد اللہ خاں غالب کے زیادہ تر امداد دی جاتی، کیونکہ میں نے اپنے والد ماجد سے بہت کچھ سنا ہے۔ میں ایک خاکستر ہوں اس خرمن کا جسے آتش غدر، ھنے جلا دیا۔ اب آپ نے مخدومی مکرمی مرزا غالب کا حال دریافت کیا ہے۔ اگرچہ اس کا منصب عمومی مکرمی جناب ضیاء الدین خاں صاحب کو حاصل ہے وہ بالاستیعاب ان کے حال سے آپ کو اطلاع دیتے۔ بدیں وجہ کہ وہ مجھ سے زیادہ کہن سال بھی ہیں اور ان کی معلومات اقوام اوہام کے نزدیک معتمد علیہ اور معتبر تر ہے تاہم جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ حوالہ قلم ہے۔

آپ کو واضح ہو کہ جناب مرحوم سے مجھے تلمذ بھی تھا۔ اور غایت درجہ مہر و شفقت اُن کی میری نسبت تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم میرے والد کے اور ان کے زیادہ محبت اور مودت تھی۔ اور چونکہ وہ صاحب اولاد نہ تھے مثل فرزند مجھے تربیت کیا۔ میرے علم میں جو کچھ ہے اسے بے تکلف لکھے دیتا ہوں۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اور راویان صادق کی تحقیق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

آپ کا سوال نسبت تبدیلی تخلص؟

جواب — مجھ کو یاد ہے فرماتے تھے کہ ۱۸۲۸ء میں ۲۹ کے قریب انھوں نے تخلص تبدیل کیا۔ اور واقعی اسد اللہ خاں کے نام کے واسطے غالب ہی تخلص زیبا تھا۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ لقب قرار پا لیا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ کوئی اسد نامی ایک فرومایہ لونگا کوڑ جیا جمہر کا شعر کہتا تھا اس کے ایک مقطع میں لفظ اسد اللہ کی نظر سے گزرا۔ وہ مقطع یہ تھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب　　　ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

ہم کلمہ چوتھا معاملہ مرحوم کرایسے فن سے جو تہمت اوام میں نہایت مجھے معلوم ہوا ان روبہ سے استاد شاہ دہلی کے ساتھ غالب کا ذکر کیا۔

دوسرا سوال بابت مذہب مرزا صاحب و آبائے مرزا صاحب ؟

جواب ـــــ اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب اولاد سلجوق اور تورے ہیں اور ترکمان کہلاتے ہیں۔ اجداد ان کے شیعہ مذہب نہ تھے مگر اس ملک کا [illegible] ترکمان لوگ اکثر تفضیلی ہیں۔ اور مرزا صاحب کو تفکر سیر اور تاریخ پر تھی۔ ان کے نزدیک حقیقت خلافت امامت کی ثابت ہوئی۔ ما سوا اس کے کثرت صحبت ایران کے ساتھ اور خصوصاً نواب حسام الدین معروف کے ساتھ اور کچھ محمود رضا خاں کے ساتھ اس امر کی بابت ہوئی کہ وہ عالی پست ہوگئے۔ اور غلو ان کا ہنگام مباحثہ تھا نہ یہ کہ وہ تبرائی ہوں۔ بزرگوں میں مرزا صاحب کے کسی کو ہم کیش مرزا نہ سنا۔

تیسرا سوال کہ کس سنہ میں شعر کہنے شروع کیے ؟

جواب ـــــ سنہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر عنفوان جوانی سے طبیعت نے راہ دی اور یہی مشغلہ رہا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔

چوتھا سوال ہرمزد عبد الصمد کا معاملہ ؟

جواب ـــــ آپ کی زبان سے میں نے اکثر سنا تھا کہ وہ ان کا استاد تھا۔ وہ تاجر تھا۔ ذخائر کے لیے آگرے کو اس نے ہیگاہ بنایا تھا۔ پس اگر مرزا صاحب جھوٹے تصور کیے جائیں تو یہ روایت بھی بے اصل محض ہے۔ اور جب یہ روایت بے اصل ہے تو پھر القا اور الہام کو ماننا پڑے گا۔ ایسا معلم سوائے سروش غیبی کے کیسے فیض پذیر ہو سکتا ہے۔

پانچواں سوال کتب مصنفہ کی تدوین ؟

جواب ـــــ دیوان فارسی ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں ترتیب ہو گیا۔ انطباع کا زمانہ مجھے یاد نہیں وہ الواح طبع سے مل سکتا ہے دیوان اردو ۱۸۴۸ء کے بعد ترتیب پذیر ہوا۔ مہر نیم روز شاید ۱۸۵۱ء میں شروع ہوئی۔ اور اس کی ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۴ء میں شرف بار پائی۔ اور کسی [illegible] اور حکیم احسن اللہ خاں کے تقاضے سے تاریخ نگاری شروع کی ورنہ بادشاہ ایسے اشتیاق و اشتغال سے مبرا تھے۔

چھٹے سوال کا جواب بھی اسی پانچویں میں آگیا۔

ساتواں سوال۔ کلکتے میں طرح باد مخالف اور اس کی وجہ ؟

جواب ـــــ اہل پورب اور بنگالہ بوجہ بے ذاقی کے قتیل پرست اور مادھو رام ستائی ہیں اور مرزا صاحب کو اہل ہند کی نسبت کلام رہا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اس شعر سے مستفاد ہے۔ شعر :

لیک نالیدہ زمن کہ در گفتار مدحت لالہ سور داس کنم

اور باعث اس تفضیح کے چند بے تمیزان کلکتہ ہوئے، کہ وہ لوگ آداب مہمان نوازی اور مہر شناسی سے عاطل ہیں۔ بجائے تکریم ضیف تسویم و تضحیم ضیف کی گئی۔ اس تقریب کے باعث مولوی عبد القادر صاحب نام اور مفتی کریم احمد صاحب نام دو بزرگ کلکتہ تھے اور یہ دونوں آدمی کالج کورنمنٹ میں معلم اور مشاہیر سے تھے۔ ترزمکان صاحب نے شاہنامے کی تصحیح کر کر یا جس کو تفضیح کہنا چاہیے ان دونوں صاحبوں کے واسطے کی تھی۔ پھر اس بنا پر یاد مخالفت چلی گئی۔

آٹھواں سوال۔ نواب مصطفیٰ خاں کو ہدایت غیبی ؟

جواب : حالت غیبی رفیق حال ہوئی مگر حالت شیشی سے پہلے رنگ جما ہوا تھا۔ اگر یہ جو منہیات میں داخل نہیں ہے تو نسبت [illegible] سے مضائقہ کیجیے۔ شعر :

ہو گئی چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتے تھے روز ابر و شب ماہتاب میں

مگر ہاں میاں انصاف کر میاں عبد الغنی صاحب سے خانقاہ میں جب تجدید بیعت کی اور خود بھی کسی قابل حد سے تو پکا حاصل ہوئی

... شاہا پاس وحشت حدیث خوانی ... خاطر اسلام شکوہ رہا ہو۔

نواں سوال۔ مولوی الطاف حسین حالی کی روایت؟

جواب ـــــ واقعی مرزا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ وقتِ اشارات و معنی و غرابتِ ترکیب ہم اردو میں نہ کرتے اگر طباع افہام کو ایسا ناقص جانتے۔

محبا! میں احباب کی خدمت گذاری کو ہمیشہ حاضر ہوں، اور آپ کی اس مہر پرستی کا شاکر۔ جب کام ہو تو آپ اہتمام فرمائیں اس کا سر انجام میرے لیے سرمایہ مسرت ہے۔ مگر اس معاملہ خاص میں باہمہ بے بضاعتی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں اور یہ امر بے ممکن نہیں۔ اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید آپ کو اس میں جائے انکار۔ ریواڑی سے نوہاروتک میرے ہاں کی سواریاں حاضر ہو سکتی ہیں۔ اور لاہور سے ریواڑی تک ریل کی سبیل ہے زیادہ والسلام والاکرام میں ناتندرست ہوں۔ ورنہ اپنے ہاتھ سے لکھتا۔

المعذور معاف علاءالدین

مکتوب شمس العلما منشی ذکاء اللہ دہلوی

جناب من!

جب مجھے آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شایع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب یہ سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو منہ سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت سے شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ ہتک عزت کی نالش کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے ایک عذاب جان بن جائیں گے۔

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے اور کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بند وں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مرگیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مرگیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ "صہبائی شعر کہنا کیا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھ سے جوتیاں کھائیں نہ جیل خانے میں پڑا۔" طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔ اس لیے قصاید میں یہ نہیں لکھا کہ کس کی تعریف میں ہے۔ بلکہ ان پر نمبر لگائے ہیں سینز دہم۔ دہم۔ نہم۔

میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ فضائل و اخلاق سے بحث نہ ہو۔ میاں غلام امام شہید فارسی کے شاعر مرزا قتیل کے شاگرد ہیں۔ وہ مرزا کو یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں وہ اور مشرق میں میں۔ غالب کا خود قول تھا کہ جب سے ہندوستان میں فارسی کا چرچا ہوا دو شاعر ہوئے ایک غالب اور دوسرا خسرو۔

ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا۔ اس نے ایک دفعہ دیکھ کر واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ "دریں خرافات اوقات ضایع نکنیم، ما نمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است!"

آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شیرازی سید باقر علی جو صہبائی ہو گیا تھا۔ جان مرد نام رکھتا تھا۔ وہ ذوق مرحوم کے پاس جاتا تھا وہ اس سے مشکل شعر مرزا کے پوچھتے تھے۔ وہ فوراً معنی بتا دیتا اور محاورہ کی ایک دو غلطی۔ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا لیکن اردو کی نظم و نثر اس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یا فتوں کو بیجا ہے اور منشی اور دہریہ جو پہلے زمانے کے ہیں وہ خود بھی نہیں جانتے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غالب کی مثنوی بے نام کا نام

سید مرتضیٰ حسین فاضل

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے تصانیف کے نام لکھے، مگر رضا نے وہی نام نقل کر دیے گئے۔ مولانا حالی نے سب سے پہلے غالب کی تصنیفات و تالیفات کا ضمنی و سرسری جائزہ لیا، مگر ان کا موضوع سوانح تھا نہ تاریخ، اس لیے تالیفات کی تحقیق اور ان کے بارے میں تفصیلات بھی بنیادی طور پر پیش نظر نہ رہیں لیکن ان معلومات کے ماخذ وہی ہیں، ہاں اور بہت سی کام کی باتیں ہیں: ہاں دو ایسی کتابوں کے بارے میں اشارے بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو مولانا کا یہ کہنا:

"چند اجزا اور ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا:"

(ص ۷۵، یادگار غالب)

دوسرے یہ تحریر کہ:

"بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا، اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خان نے جمع کیے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا: (یادگار غالب ص ۷۰)

ابھی تک ناتمام قصے کے تصنیف تو معلوم نہیں ہو سکے، مذکورہ بالا مثنوی پر تحقیق کی منزل تک پہنچ گئی۔

حالی کے بعد جناب مہر صاحب نے سوانح و سیرت غالب کی طرف پوری توجہ کی، لیکن "غالب" طبع اول (نیز بعد) میں "مثنوی دمغ الباطل" کی طرح اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، جناب اکرام صاحب نے غالب نامہ طبع دوم ص … حاشیے میں اس مثنوی کے دو شعر لکھے مگر نام نہ لکھا، پھر ص ۶۲ پر لکھا:

"اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ، مرزا سے دمغ الباطل (کذا) کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا۔"

پھر چوتھے ایڈیشن میں غلطی طباعت کی اصلاح فرمائی گئی اور ص ۱۲۱ پر "دمغ الباطل" لکھا۔ مالک رام صاحب اس سلسلے میں خاموش ہیں اور کوئی نام نہیں بتاتے۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے "متفرقات غالب" میں یہ مثنوی شائع کی تو ان کے سامنے رسالہ "علم و عقائد سلاطین تیموری" تھا، اور نام کی تحقیق، حالی کی غلط فہمی پر بحث بھی فرمائی لیکن اسے "بے نام مثنوی" ہی قرار دیا۔

میں نے ۱۹۴۷ء میں رسالہ علم حیدری اور مثنوی شوکت حیدری "صفی دارالمطالعہ لکھنؤ" میں دیکھی اور مثنوی تو پوری نقل کی لیکن نثر کے رسالے کو نقل کرنے اور نوٹس لینے کی باری نہ آ سکی، مگر زیر بحث مثنوی کا نام لکھ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ اس پر کچھ لکھوں مگر ماخذ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہمت نہ پڑی، بعض احباب کو ضرور بتا دیا تھا۔ حبیب محترم جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے چند رقیع کتابیں عاریت دیں جن میں رسالہ علم حیدری، مثنوی شوکت حیدری، مثنوی خیابان علی بھی ہیں۔ اس دوران جناب اکبر علی خاں نے فرمائش مضمون فرمائی۔ ہم نے اس مضمون میں ان تینوں کتابوں کے پہلے مطبوعہ لکھنوی نسخوں … ھ کو سامنے رکھا ہے۔

جناب مسعود حسن صاحب نے مثنوی کے بارے میں بڑی کارآمد بحث فرما کر اس سلسلے کی اکثر مثنویوں کے نام اور صحیح تفصیلات لکھ

میں جناب امداد صابری نے ”شاہ کے بحار شعرا“ میں ایک اور ہی قصہ لکھا ”غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی“ کے عنوان سے فرماتے ہیں:

”۱۸۵۱ء میں مرزا حیدر شکوہ .... اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے، جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا، اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی، اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ہندستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لیے واجد علی شاہ سے یک جہتی اور رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقت ور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں ان سے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں۔

بہادر شاہ کو یہ طریقہ پسند آیا، اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا اختیار کیا جائے، مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائے گا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائیگا۔“

انگریزوں کی مخالفت کے لیے شیعہ بننے کا اعلان

بہادر شاہ ظفر، انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے۔ انھوں نے بغض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھ کر مرزا حیدر کو دے دیا، کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے، مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جاکر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دلی والوں میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلے میں کیوں اہمیت دی بالآخر بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب ”حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت“ مرتب کی اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس اتہام سے بچانے کے لیے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً ”دمغ الباطل“ رکھا گیا تھا۔“
(کتاب مذکور طبع دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۷، بعدہ)

مجھے اس عبارت سے بحث نہیں، اگرچہ امداد صابری نے ”مقدمہ بہادر شاہ ظفر“ اور مولانا حالی کی یادگار غالب کا حوالہ دے کر یہ سب کچھ لکھا ہے مگر یہ عرض کرنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں۔ بلکہ یہ ہنگامہ دسمبر ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۵۴ء کے درمیان میں شروع ہوا، اور حالی نے اتفاق سے سب سے پہلے اس کی صحیح وجہ بادشاہ کی بیماری و صحت یابی ہی بتایا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت آنے والے معاصر بیانات و دستاویزات کی بنا پر مشتبہ، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غلط ہو جائے گی تو شاید بے جا نہ ہو۔

مثنوی ”دمغ الباطل“ نہیں ”کلمات طیبات“ ہے جس کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ بادشاہ ۸ جولائی ۱۸۵۳ء (۱ ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ) (غالباً) میں بیمار ہوئے، دوران علالت میں مرزا ملازمت دربار کی وجہ سے قلعے جانے اور مزاج پرسی کے لیے بھی حاضر ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کو علالت کے تفصیلات سے براہ راست علم تھا، مگر انھوں نے زیادہ تاثر کا اظہار نہیں کیا صرف منشی نبی بخش حقیر کے نام جو خطوط ہیں، ان میں ذرا مفصل حال ملتا ہے، اور وہ بھی کسی تاثر کی نشان دہی نہیں کرتا مثلاً ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں:

”بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو، اور اگر تم نے پوچھا ہے تو میں کیا لکھوں دست موقوف ہو گئے، مگر کبھی کبھی آ جاتے ہیں، تپ جاتی رہی، مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے، ہچکی اس شدت کی نہیں رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکار سی آتی ہے۔ ہوادار پلنگ کے برابر لگا دیتے ہیں، اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں، اس ہیئت سے برآمد ہوتے ہیں، قلعے ہی قلعے میں پھر کر پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے۔ بہ ہر حال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔“ (۱۶ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، بروز یکشنبہ)

۶ ذی الحجہ، ۲ اکتوبر کو لکھتے ہیں:

”اب سنتا ہوں کہ حضور بعد محرم غسل صحت کریں گے۔“

۲ محرم، ۶ اکتوبر کو لکھا:

غالب کی مثنوی بے نام کا نام

سید مرتضیٰ حسین فاضل

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں غالب کا تذکرہ کرتے ہوئے تو کتابوں کے نام لکھے، گل رعنا میں بھی نام نقل کر دیے گئے۔ مولانا حالی نے سب سے پہلے غالب کی تصنیفات و تالیفات کا ضمنی و سرسری جائزہ لیا، مگر ان کا موضوع سوانح تھا نہ تاریخ، اس لیے تالیفات کی تحقیق اور ان کے بارے میں تفصیلات بھی بنیادی طور پر پیش نظر نہ رہے لیکن ان معلومات کے ماخذ وہی ہیں جہاں اور بہت سی کام کی باتیں ہیں؛ ہاں وہ ایسی کتابوں کے بارے میں اشارے بھی ہیں جن کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ایک تو مولانا کا یہ کہنا:

”چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں، جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا“

(ص ۱۵۷، یادگار غالب)

دوسرے یہ تحریر کہ:

”بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام ”دَمغ الباطل“ رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا، اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی، بلکہ جو مضامین حکیم آغا جان عیش نے بتلائے تھے ان کو فارسی میں نظم کر دیا تھا“ (یادگار غالب ص ۷۰)

ابھی تک ناتمام قصے کے متعلق تو معلوم نہیں؛ لیکن گزشتہ برسوں مثنوی پر گفتگو کی منزل تحقیق تک پہنچ گئی۔

حالی کے بعد جناب مہر صاحب نے سوانح و سیرت غالب کی طرف پوری توجہ کی، لیکن ”غالب“ طبع اول (و نیز بعد) میں ”مثنوی دعائے صباح“ کی طرح اس مثنوی کا ذکر نہیں کیا، جناب اکرام صاحب نے غالب نامہ طبع دوم ص ۷۰ حاشیے میں اس مثنوی کے دو شعر لکھے مگر نام نہ لکھا، پھر ص ۶۲ پر لکھا:

”اور ایک مرتبہ جب واجد علی شاہ، مرزا سے دفع الباطل (کذا) کی تصنیف کی وجہ سے ناخوش تھا“

پھر دوسرے ایڈیشن میں غلطی طباعت کی اصلاح فرمائی گئی اور ص ۱۲۱ پر ”دمغ الباطل“ لکھا۔ مالک رام صاحب اس سلسلے میں خاموش ہیں اور کوئی نام نہیں بتلاتے۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے ”متفرقات غالب“ میں یہ مثنوی شائع کی تو ان کے سامنے رسالہ علم جیسا کا ”رد عقائد سلاطین تیموری“ تھا، اور نام کی تحقیق، حالی کی غلط فہمی پر بحث بھی فرمائی لیکن اسے ”بے نام مثنوی“ ہی قرار دیا۔

میں نے ۱۹۴۲ء میں ”رسالہ علم حیدری اور مثنوی شوکت حیدری“ صفی دار المطالعہ لکھنؤ میں دیکھی اور مثنوی تو پوری نقل کی لیکن نثر کے رسالے کو نقل کرنے اور نوٹس لینے کی باری نہ آ سکی، مگر زیر بحث مثنوی کا نام لکھ لیا۔ پاکستان آنے کے بعد بارہا ارادہ کیا کہ اس سلسلے میں کچھ لکھوں مگر ماخذ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہمت نہ پڑی، بعض احباب کو ضرور بتا دیا تھا۔ حبیب محترم جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی نے چند ورقی کتابیں عاریتاً دیں جن میں ”رسالہ علم حیدری، مثنوی شوکت حیدری، مثنوی آشیان علی“ بھی ہیں۔ اس دوران جناب اکبر علی خاں صاحب نے فرمائش مضمون فرمائی۔ ہم نے اس مضمون میں ان تینوں کتابوں کے پہلے مطبوعہ لکھنوی نسخوں ۱۲۷۰ھ کو سامنے رکھا ہے۔

جناب مسعود حسن صاحب نے مثنوی کے بارے میں بڑی کارآمد بحث فرما کر اس سلسلے کی اکثر مثنویوں کے نام اور کچھ تفصیلات لکھی

یہ سنگ میاب امداد صابری نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا" میں "ایک اور ہی قصہ لکھا" "غیر ملک سے انگریزوں کے خلاف مدد لینے کی سعی" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

"۱۸۵۰ء میں مرزا حیدر شکوہ .... اور واجد علی کے قابل اعتماد مانے جاتے تھے، جن کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ ملتا تھا، اور واجد علی شاہ کے ہم مذہب یعنی شیعہ بھی تھے۔ ان سے بہادر شاہ کی گفتگو ہوئی، اور جو حرکتیں بہادر شاہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی اس کو سامنے رکھتے ہوئے مرزا حیدر نے بادشاہ کو مشورہ دیا، کہ ہندوستان میں اپنی طاقت و اقتدار بڑھانے کے لیے واجد علی شاہ سے یک جہتی اور رابطہ قائم کیا جائے تاکہ دونوں متحد ہو کر اور طاقت ور بن کر شاہ ایران کو اپنا ہمنوا بنا کر انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور بقول حکیم احسن اللہ خاں ان سے مل کر اپنا ملک فتح کر لیں۔

بہادر شاہ کو یہ طریقہ پسند آیا، اس پر غور کیا گیا کہ اتحاد کا طریقہ کیا اختیار کیا جائے، مرزا حیدر کی رائے ہوئی کہ شیعہ مذہب اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جائے گا تو واجد علی شاہ اور شاہ ایران پر بھی اثر پڑے گا اور آسانی کے ساتھ مقصد پورا ہو جائیگا۔"

انگریزوں کی مخالفت کے لیے شیعہ بننے کا اعلان

بہادر شاہ ظفر، انگریزوں سے انتہائی برگشتہ اور نالاں تھے۔ انھوں نے بعض معاویہ کے جذبہ میں آکر اعلان لکھ کر مرزا حیدر کو دے دیا، کہ میں نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے، مرزا حیدر نے اس کو لکھنؤ میں جا کر مجتہد العصر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ خبر لکھنؤ کے ہر محلے اور ہر بازار میں پھیل گئی۔ لکھنؤ والے بہت خوش ہوئے لیکن دلی والوں میں کھلبلی مچ گئی کہ انھوں نے اس مصلحت وقت کو مذہب کے مقابلے میں کیوں اہمیت دی بالآخر بادشاہ نے اپنے انکار کی تصدیق میں ایک کتاب "حقیقت مذہب اہل سنت و جماعت" مرتب کی اس پر مرزا غالب نے بادشاہ کو اس اتہام سے بچانے کے لیے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً "دمغ الباطل" رکھا گیا تھا۔"

(کتاب مذکور طبع دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۰۷ بعد)

مجھے اس عبارت سے بحث نہیں، اگرچہ امداد صابری نے "مقدمہ بہادر شاہ ظفر" اور مولانا حالی کی یادگار غالب کا حوالہ دے کر یہ سب کچھ لکھا ہے مگر یہ عرض کرنا ہے کہ واقعہ یوں نہیں۔ بلکہ یہ ہنگامہ دسمبر ۱۸۵۳ء سے جنوری ۱۸۵۴ء کے درمیان میں شروع ہوا، اور حالی سے آفاق تک سب نے اس کی صحیح وجہ بادشاہ کی بیماری و صحت یابی ہی بتایا ہے۔ اس کی سیاسی حیثیت آنے والے معاصر بیانات و دستاویزات کی بنا پر مشتبہ، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غلط ہو جائے گی تو شاید بے جا نہ ہو۔

مثنوی "دمغ الباطل" نہیں "کلمات طیبات" ہے جس کی تالیف کا پس منظر یہ ہے کہ بادشاہ ۸ جولائی ۱۸۵۳ء جیسے ۱۲۶۹ھ (غالباً) میں بیمار ہوئے، دوران علالت میں مرزا ملازمت دربار کی وجہ سے قلعے جانے اور مزاج پرسی کے لیے بھی حاضر ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ ان کو علالت کے تفصیلات سے براہ راست علم تھا، مگر انھوں نے زیادہ تاثر کا اظہار نہیں کیا صرف منشی نبی بخش حقیر کے نام جو خطوط ہیں، ان میں ذرا مفصل حال ملتا ہے، اور وہ بھی کسی گہرے تاثر کی نشان دہی نہیں کرتا مثلاً ۱۲ اگست ۱۸۵۳ء کو لکھتے ہیں:

"بادشاہ کا حال کیا پوچھتے ہو، اور اگر تم نے پوچھا تو میں کیا لکھوں دست موقوف ہو گئے، مگر کبھی کبھی آ جاتے ہیں، تپ جاتی رہی، مگر گاہ گاہ حرارت ہو آتی ہے، ہچکی اس شدت کی نہیں رہی، گاہ گاہ چھاتی جلتی رہتی ہے اور ڈکاریں آتی ہیں۔ ہوادار پلنگ کے باہر لگا دیتے ہیں، اور حضرت کو پلنگ پر سے ہوادار پر بٹھا دیتے ہیں، اس ہیئت سے برآمد ہوتے ہیں: قلعے ہی قلعے میں پھر کر پھر محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یوں تصور کیجیے اور مشہور بھی یوں ہی ہے کہ مرض جاتا رہا اور ضعف باقی ہے، بہرحال جب تک سلامت رہیں غنیمت ہے۔" (۱۲ ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ، پنجشنبہ)

۱۲ ذی الحجہ، ۲۰ اکتوبر کو لکھتے ہیں:

"اب سنتا ہوں کہ حضور بعد ماہ جشن غسل صحت کریں گے۔"

۲ محرم، ۱۶ اکتوبر کو لکھا:

"... روا داشتہ نگاردیں چشمی با ماز بانہ ہیں بیدہ ہم راہ سخن بر من فرو بستی و ورنہ پیکر مرا خود و دم ہم شکستی پہ از روی مہر و آزرم است، چرا نہ گویم، و اگر گویم ہم از من برمن ستم رود، و در هم انجمن گفته شود، که — فلانی در گناه دلیر است و در چرش نا پروا — زبان سخن سرای آذر گہر سفتن است، نه ساز آہنگ ناسزا گفتن۔ نمی گویم که بد گفتن گناه نیست و یا گویم که گناه من جز بپذیرفتن فرمان شاه نیست۔ تا دریا نا خوش ہنگام و تا رد اہنگامہ دیگر چہ فرماں رود

راست می گویم و یزداں نہ پسند و جز راست حرف نا راست سرودن روش اہرمن است

در نگارش مثنوی، مضمون از خسرو است و لفظ از من' چنانکہ در رباعی زمزمہ از مغنی و صدا از تار۔ و نگفتہ' کہ این ہمہ از زبان من بود و دیگران مصرعی چند افزوده باشند[1]"

قطع نظر اس سے کہ خط کس قدر دلکش عبارت اور کیسے پیارے اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ یہاں مرزا کے نفسیات، بادشاہ سے مرزا کا قلبی تعلق، سلطان العلماء کی تحقیق و تفتیش کے علاوہ ایک بالکل نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ "کلیات طیبات" میں کوئی اور شخص بھی ساجھے دار ہے۔

---

[1] نگار کو فاضل صاحب سے اختلاف ہے اس لیے کہ غالب نے "مصرعے چند افزودہ باشند" کہا ہے جس میں احتمال پایا جاتا ہے یقینی طور پر کہنے کی جرأت انھیں بھی نہ ہوئی ممکن ہے مختلف مصالح سے انھوں نے یہ جملہ لکھا ہو اور حقیقت حال اس کے قطعاً خلاف ہو جو غالب کے مزاج کے پیش نظر قرین قیاس ہے۔

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

ڈاکٹر عبادت بریلوی

انگلستان کے کتب خانوں میں راقم کو غالب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط درج ذیل ہے۔ یہ خط مولوی نعمان احمد صاحب تعلقہ دار میسوا پرگنہ مہولی سیتاپور کے نام لکھا گیا ہے۔ اور اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اس میں ان کا مخصوص انداز بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

مولانا و بالفضل اولانا! فقیر میں جہاں اور عیب ہیں ایک عیب یہ بھی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بہ سبب ریاست خاندانی کے ملاقات اکثر اتفاقات رہتی ہے ——— کبھی خوشامد کسی کی نہیں کی بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا۔ ایسا عاصی بھی نہیں واللہ باللہ کو کیکام جانتا ہوں۔ موعدہ کو اور داؤد کو قسمیہ جان کر ان شعروں سے قسم لکھا تھا، اور اب بھی از روئے قسم لکھتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاص میں اور دعووں سے آپ بہتر ہیں۔ آپ کو اپنا ہم فن اور ہم زبان سمجھ کر، بنا و عدد دل آپ کے سامنے کہا تھا۔ آپ نے گزاری نہ کی۔ بلکہ اور الٹا آپ مجھ سے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کی برگشتگی تھی کہ حضرت کے ذہن نے میرے خلافِ مقصود سے جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی کا میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب شہزادہ بشیر الدین بہادر نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھتا اور وہ بھی موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع۔ بہتر برس کی عمر، حواس مسلوب، قویٰ مضمحل، بصارت میں ضعف، ہاتھ میں رعشہ، نسیان مستولی — آپ کا خط آیا، پڑھا، جواب اس وقت پر حوالہ کرنے کو خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا ——— آج جو جواب لکھنے بیٹھا، خط نہیں ملتا۔ نہ مجھ میں ذکا، نہ وہ مذاق ہیں۔ حیران ہوں کہ اب کیا کروں۔ جو کچھ یاد آ گیا اس کا جواب لکھا ——— قِران کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زہرہ مشتری کا ایک برج اور ایک درجہ و دقیقہ میں یکجا ہونا قران السعدین ہے۔ اور یہ قرانات جزئیہ میں سے ہے۔ اور اکثر واقع ہوتا ہے اور یہ خبر ——— ؟ حسب سلطنت موجود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران پڑا ہو گا۔ بشرطیکہ اس کے برج طالع میں یا وتد ثالث یا وتد زمین واقع ہو کر لفظ اس کے طالع موجود ہو۔ تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس ——— وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک قران تھا کہ زحل و مریخ میں فراہم ہوئے تھے۔ سراسر ہندوستان کی خاک اڑا دی ——— تمہ مختصر جو بادشاہ صاحب قران کہلاتا ہے، باعتبار افراط جاہ و جلال و قوت حال کہلاتا ہے۔ طالع ولادت میں قران السعدین کا واقع ہونا ضرور نہیں ——— صاحب قران مرادف شاہنشاہ ہے۔ سو بھی صرف سلاطین تیموریہ میں دو شخص صاحب قران کہلائے ہیں۔ امیر تیمور اور شاہجہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوا کہ خاقانی نے اپنے آپ کو صاحب قران لکھا ہے۔ اسی طرح فقیر نے بھی لکھا ہے۔ ع

سزد گر ز نیسند صاحب قرانم

اور یہاں صرف ترقیع ذلیلی علت نہیں ہے۔ صاحب قراں کہلانے کی فقط

اسد اللہ

شنبہ ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء

از رہِ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔

میسوا پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور ۶ اکتوبر سنہ ۶۶ء بیرنگ ضروری
جواب طلب۔ بخدمت مخدوم و مکرم مولوی نعمان احمد صاحب دام مجدہٗ
از اسد
مقبول باد

(نگار کراچی)

غالب کا ایک گمنام شاگرد

نادم سیتاپوری

غالب کے فن اور ارشاد کی پرکھ کے ساتھ ساتھ غالبیات کے جن پہلوؤں سے ارباب ادب کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں "تلامذۂ غالب" ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ غالب کی اس معنوی نسل میں کہیں کہیں غالب کے فن اور ارشاد کی اچھی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ جس طرح غالب وسیع الاحباب تھے اسی طرح ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا جو کم و بیش ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ جناب مالک رام نے شیرازہ بندی کر کے "تلامذۂ غالب" میں بہت کچھ یکجا کر دیا ہے پھر بھی اس تصویر میں کچھ ایسے رنگ باقی رہ گئے ہیں جو ابھی تک ابھر نہیں سکے۔

حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری بھی غالب کے ایسے ہی گمنام اور غیر معروف شاگردوں میں ایک ہیں جن کے ذکر سے عام طور پر تذکرے خالی نظر آتے ہیں اور شاید ارباب نظر انہیں جدید تحقیق کی اس کسوٹی پر ابھی تک پرکھ نہ سکے جس میں روایات در روایات کے اصولوں کی دیکھ ریکھ کچھ ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مگر تحقیق کی اس محدود و مقید فضا میں ظاہر ہے طالب جیسے گمنام عاشق غالب کے بارے میں مستند تحریری ثبوت کو فراہم کرنا صرف دشوار نہیں بلکہ بہت کچھ محال ہی ہے اور تحقیق کی تنگیٔ داماں کا مداوا سوائے ان مقامی روایات کے دوسرا ممکن ہی نہیں ہے جنہیں میں بہرحال قابل اعتماد و مستند سمجھتا ہوں۔

طالب میرے شعور سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کچھ دور کی قرابت داری تھی مجھ سے! ان کا مکان بھی میرے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ مجھے ان بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضری کے مواقع حاصل رہے جنہوں نے طالب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں زیادہ تر اٹھ چکے ہیں اور جو بچے پھر بھی سیتاپور ان کے دیکھنے والوں سے خالی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اپنی نجی اور ذاتی یادداشتوں میں بھی طالب کا ذکر کیا ہے اور کافی تفصیل کے ساتھ! مثلاً قاضی ایاس حسین جعفری سیتاپوری اپنی خود نوشت سوانح عمری "اپنی کہانی، اپنی زبانی"[1] (غیر مطبوعہ) میں طالب کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> "یوم پنجشنبہ۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کو حکیم سید محمد شریف صاحب طالب ساکن سیتاپور محلہ [illegible] ملک عدم کو روانہ ہو گئے ـــــ یہ طبابت میں اپنے باپ حکیم منشی سید امداد علی صاحب (حکیم) کے شاگرد تھے اور شاعری میں غالب دہلوی کے تلامذہ سے تھے [illegible] اور ماہر تھی اور مولانا کے اشعار و خواص انہیں از بر تھے اور تشخیص بھی [illegible] تھی ـــــ اور دل کی نظر بھی گہری تھی اور علم ـــــ یہ بھی اپنا یہ کمال اپنے ساتھ لے گئے۔"

قاضی ایاس حسین (۱ اکتوبر ۱۸۸۵ء ـــــ مئی ۱۹۵۸ء) مجلس سیتاپور کی زندہ تاریخ تھے۔ طالب کے ہم عصر اور ہم وطن [illegible] ان کا سلسلہ نسب چند پشتوں کے بعد ہی طالب سے ملتا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنی خود نوشت حالات زندگی (اپنی کہانی اپنی زبانی) پر سینکڑوں صفحات پر تحریر فرمائے ہیں جس میں اپنے خاندانی اور ذاتی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ تقریباً پچاس سال کے مقامی، سوشل، ملکی اور ادبی کوائف کو بھی یکجا کر دیا ہے۔ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ [illegible] تخلص فرماتے تھے۔ لیکن شعری شعور کچھ زیادہ جاندار نہ تھا۔ یہ صفحوں میں [illegible] لیکن [illegible] ان کی تحریر پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ طالب سے جو قرابت قریبی تھی

---

[1] اصل مخطوطہ قاضی ایاس حسین کے پوتے [illegible] جعفری [illegible] سیتاپور کے پاس محفوظ ہے۔ (نادم)

... صاحب کی مسلمہ شعر و سخن قابل احترام ہیں۔ قاضی صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب حسرت ناک سانحہ سے دوچار ہوئے وہ آج تک معمہ بنا ہوا ہے۔ ۱۹ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک عزیز کی تقریب میں "باڑی" ضلع سیتاپور گئے۔ لیکن واپسی کے بعد پھر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ "باڑی" سے ریلوے اسٹیشن "سدھولی" کی طرف آتے ہوئے اس طرح غائب ہوئے کہ تلاش و تجسس انگشت بدنداں ہے! جانے زمین کھا گئی یا آسمان!۔ غالب سے طالب کا سلسلۂ تلمذ اور والہانہ وابستگی کی داستانیں ہمیشہ سیتاپور میں زبان زد خاص و عام رہیں ـــــ اور ان مناظر کو دیکھنے والے تو اب بھی موجود ہیں۔ جب طالب اپنے استاد غالب کا کلام والہانہ طور پر پڑھ کر بے اختیارانہ رویا کرتے تھے۔ میرے محترم اور معمر بزرگ خان بہادر سید محمود ذکی صاحب رضوی ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یو۔ پی اپنے ایک نجی خط مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۱ء میں تحریر فرماتے ہیں:

"تم نے جو کچھ سنا ہے وہ ٹھیک ہے: حکیم محمد شریف صاحب مرحوم یقیناً جناب غالب مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا تھا کہ آپ نے اپنا تخلص طالب کس لحاظ سے رکھا؟ تو مرحوم (طالب) نے فرمایا کہ میرے استاد (غالب) کے تخلص کے ہم وزن کوئی اور لفظ اس سے اچھا نہیں ملا۔ وہ ایک بار اپنے استاد مرحوم سے ملنے دہلی گئے تھے۔ اس زمانے میں سیتاپور سے دہلی جانا بہت دشوار تھا۔ دہلی سے واپسی پر جناب قاضی سید محمد صاحب اعلی اللہ مقامہ نے جو اس وقت رجسٹرار تھے ان کو ظاہر پور ضلع سیتاپور میں سب رجسٹرار کی جگہ دے دی اور شاید اسی وجہ سے وہ دہلی نہ جا سکے! میں نے مرحوم کی دو غزلیں دیکھی تھیں جن پر غالب مرحوم نے اپنے قلم سے اصلاح دی تھی! اور ان کے ساتھ غالب مرحوم کے خط بھی تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے صاحبزادے شاہ محمد [illegible] کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے غالباً محمد شریف صاحب مرحوم (طالب) کے تمام کاغذات تلف ہو گئے!

ایک بار میں اپنی ملازمت کے کام سے دورہ پر حکیم صاحب مرحوم (طالب) سے اُن کے موضع "کورکی" میں ملا تھا۔ آموں کی فصل تھی اور حکیم صاحب ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں اس درخت سے ایک پختہ آم گرا۔ حکیم صاحب نے اسے پانی سے دھو کر مجھے مرحمت فرمایا۔ اور جناب غالب مرحوم کا وہ قطعہ پڑھا جس میں آموں کا کچھ بیان ہو گیا!

....

انگبیں کے بحکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

جب اس شعر پر پہنچے تو فرمایا ـــــ دیکھو "سر بمہر" کی تشبیہ کتنی مناسب ہے اور تم کھا کر دیکھو اس کا رس "انگبیں" ہے یا نہیں؟"

سیتاپور کے معمر ترین بزرگوں میں خان بہادر صاحب بڑی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسّی سال سے کچھ زیادہ ہی عمر ہے۔ ہوش و حواس میں اب بھی کسی قسم کی کمی نہیں۔ آپ کے والد ماجد میر کاظم حسین وفا سیتاپوری طالب کے ہم سن معاصرین میں تھے ـــــ اور خود خان بہادر صاحب نے طالب کی زندگی کے کھلے اوراق کا مطالعہ کیا ہے۔

ہندوستان بھر میں "اودھ" غالباً وہ منفرد علاقہ تھا جہاں غالب اپنی زندگی میں بہت ہی کم مقبول ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ "اودھ" میں غالب کے شاگردوں کا حلقہ اتنا محدود تھا کہ جناب مالک رام "تلامذۂ غالب" میں صرف مندرجہ ذیل شاگردوں کا ذکر کر سکے۔

۱۔ شاہ ولایت علی خاں عزیز صفی پوری
۲۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی
۳۔ شیخ لطیف احمد خلق کیف بلگرامی
۴۔ مولوی مقصود عالم مقصود پھانوی
۵۔ سید ناصر الدین حیدر خاں ناصر لکھنوی (عرف یوسف مرزا)
۶۔ حکیم محب علی نیر کاکوروی۔

بھی اخبار ... کو بھی ہوا لیکن یہی حقیقت ہے کہ جب مرزا حاتم علی مہر اکبر آبادی کے پوتے مرزا قاسم علی قزلباش بسلسلہ ملازمت سیتاپور پہنچے تو آغا
منشی وکیل و مولوی کے اشتراک سے انھوں نے غالب ہی کی نسبت اسی سے "غالب الاخبار" جاری کیا مگر اس کا پہلا شمارہ یکم مارچ ۱۹۱۹ء کو نکلا تو
ب کی وفات کو دس بارہ دن گزر چکے تھے!

طالب اسی سیتاپور اودھ کے رہنے والے تھے۔ سن ولادت کا صحیح پتہ تو چل نہیں سکا البتہ قدیم خاندانی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے آخری عہد حکومت (۱۸۱۴ء — ۱۸۲۷ء) میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے اور ۲۷ دسمبر ۱۹۱۰ء میں کم و بیش ... سال کی عمر میں وفات پائی۔ تکیہ ملا شاہ "محلہ قضیارہ (سیتاپور) میں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کے والد مفتی سید اولاد علی جرجیؔ اپنے دور کے ایک ... ل شاعر گزرے ہیں۔ تمام عمر مداحی اہلبیت اطہار میں بسر کی۔ ان کے فارسی قصائد کا ایک نامکمل قلمی مجموعہ میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

نسبی حیثیت سے طالب سیتاپور کے ممتاز جعفری نیشاپوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلہ نسب تیئیس[۲] واسطوں سے صادق آل حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ مورث اعلیٰ حضرت سید شاہ اسمٰعیل نیشاپور سے ترک سکونت کر کے ہندوستان تشریف لائے ... اور قصبہ کہرام (مضافات انبالہ) میں سکونت گزین ہوئے تھے۔ ان کے پوتے سید عبدالملک کہرامی کہرام سے جونپور اور پھر مخدوم سید عادل ... ک بہ عہد سلطان ابراہیم شرقی جونپور کو خیرباد کہہ کر رائے بریلی چلے گئے۔ ابوالفتح سید فتح اللہ (عرف شیخ فتن) انھیں بزرگ کی نسل سے تھے۔ عہد شاہجہانی میں سیتاپور آ بسے تھے جن کی یادگار سیتاپور میں ایک محلہ "فتن سرائے" آج بھی موجود ہے۔

نیشاپوری سادات میں بڑے بڑے صاحبان شریعت و طریقت بزرگ گزرے ہیں۔ مخدوم عادل الملک کا مزار آج بھی رائے بریلی میں مرجع خاص و عام ہے۔ مخدوم عادل الملک کی چھٹی پشت میں سید ظہیر الدین کہرامی مصنف "فتاوائے ظہیری" کا شمار ان ارباب علم و فضل میں ہے جن کے اذکار سے اسلامی تاریخ کے صفحات معمور ہیں۔ میر گلزار حسین ارمؔ، مولوی نیاز احمد ناظؔ سیتاپوری اور ہندوپاک کے مشہور ادیب و صحافی سید رئیس احمد جعفری ندوی تو ... صدی کے اہل کمال ہیں جنھیں شاید بہت دنوں تک دنیا نہ بھلا سکے گی۔

طالب کے والد مفتی سید اولاد علی جرجیؔ کا انتقال غدر ۱۸۵۷ء سے آٹھ نو سال قبل (تخمیناً ۱۸۴۸ء یا ۱۸۴۹ء) میں سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے ابتدائی عہد حکومت میں ہوا۔ ان کے قبضہ میں سیتاپور کے قریب ہی کئی مواضعات کے حقوق مستاجری تھے۔ تمول، فراغ البالی امارت کے چونچلے سے جرجیؔ کے مرتے ہی ایکا یک حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ بوہرے" مہاجن کا ... دس ہزار قرض ہوا اور طالب حالات سے کچھ ایسے گھبرا گئے کہ ہا کہے بنے سیتاپور کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچے۔ طبابت اس خاندان کا موروثی پیشہ ... طالب نے فن طب کی تکمیل اپنے باپ سے کی تھی اور وہ بھی اس طلب و ذوق کے ساتھ کہ ابتدا ہی سے ان کا شمار حاذق اطبا میں ہونے ... تھا۔ خدا نے دست شفا ایسا دیا تھا کہ کوئی مریض ان کے مطب سے ناکام و مایوس نہیں جاتا تھا۔ لکھنؤ پہنچتے ہی انھیں خوش قسمتی سے شاہی خاندان کے ایک بیمار کے علاج کا موقع مل گیا۔ مریض شفایاب ہوا اسی کے ساتھ ہی ان کی شہرت کی دھوم لکھنؤ بھر میں مچ گئی۔ نواب سلیمان قدر بہادر نے قدر افزائی فرمائی اور یہ ان کی سرکار میں بزمرۂ طبیب خاص ملازم ہو گئے۔

نواب سلیمان قدر بہادر آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ بہادر کے مختلف البطن بھائی تھے ان کی سرکار میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ناسخؔ کی اس غزل کی اس زمانے میں بڑی شہرت تھی جس کا مطلع ہے۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

لکھنؤ بھر میں اسی طرح پر مشاعرے ہو رہے تھے۔ نواب سلیمان قدر بہادر کے یہاں بھی اسی طرح میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لکھنؤ کے تمام اساتذہ فن موجود تھے۔ لیکن طالب نے جب اپنی غزل پڑھی تو ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ اس غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

---

۲ صفحہ ۲۲۰۰ ۔ سلسلہ ۹۵ ۔ "شجرات طیبات" مطبوعہ مطبع عامر المطابع سیتاپور ۱۹۱۰ء

مفتی صاحب (طالب) میرے والد مرحوم مولوی نعمان احمد (تعلقدار مہیوہ ضلع سیتاپور) کے گہرے دوستوں میں تھے ہر مہینے
ایک کا دوسرے سے ملنا اتنا ضروری تھا جیسے مشرق سے آفتاب کا نکلنا۔ مفتی صاحب چونکہ فارسی کے ایک مشاق اور نکتہ سنج شاعر
تھے۔ اس لیے انھیں غالب کے کلام سے والہانہ وابستگی پیدا ہو گئی۔ خود میرے والد (مولوی نعمان احمد) فارسی کے ایک باکمال
انشا پرداز تھے اور کسی حد تک غالب کی فارسی نثر نگاری کے قایل بھی تھے لیکن غالب کے شعری فن سے انھیں کوئی خاص دلچسپی
نہ تھی وہ لکھنؤ کے رنگ کو زیادہ پسند فرماتے تھے چنانچہ اسی بات پر ان دونوں دوستوں (طالب اور نعمان احمد) کے درمیان
اکثر چوٹیں چلا کرتی تھیں ــــــ اور والد مرحوم اکثر مفتی صاحب سے طنزاً کہا کرتے تھے کہ جب آپ کو غالب کا رنگ اتنا پسند
ہے تو آپ ان کی شاگردی کیوں نہیں کر لیتے ــــ! انھیں باتوں کا نتیجہ نکلا کہ مفتی صاحب بہ نفس نفیس دلی تشریف لے گئے
اور غالب کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان سلسلہ مراسلت بھی قایم تھا میں نے بھی دو ایک خطوط دیکھے ہیں۔
طالب کو اپنے استاد (غالب) سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ وہ غالب کا فارسی اور اردو کلام پڑھ کر
بے اختیارانہ رو دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سیتاپور کی فضا غالب کے لیے سازگار نہیں تھی چنانچہ اس دور کے بعض شوخ و طرار
نوجوان طالب کے اس جذبہ عقیدت کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کب وہ نماز شروع کریں ــــ اور یہ لوگ انھیں ستانے
پہنچ جائیں ادھر وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے پہلی رکعت شروع کی کہ دو چار لڑکے پہنچ گئے ــــ ایک نے غالب کا شعر پڑھا۔

درد منت کش "دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دوسرے نے شعر کی تعریف شروع کی اور ساتھ ہی ساتھ اس شعر کی شرح بھی ــــ! "منت کش" ایران میں ایک بہت بڑا دواخانہ
تھا ...... اور ...... اور ...... ؟

طالب پہلے تو لڑکوں کو مخاطب کرنے کے لیے زور زور سے نماز پڑھنے لگے اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو نماز توڑ کر ان کے پیچھے
دوڑتے ــــ!

مگر یہ کہاں ماننے والے۔ دوبارہ نماز شروع کی! پھر شیطان بن کر موجود! اب غالب کے اس مقطع کی شرح بیان کی جا رہی تھی ــــ

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ "سر" یاد آیا

ایک نے مقطع پڑھا ــــ دوسرے نے شرح بیان کرنا شروع کر دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) انشا پرداز تھے۔ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کے اصرار پر انھوں نے غالب کو فارسی میں خط لکھا۔ لیکن غالب نے اس کا جواب اردو میں دیا
کیونکہ قدر بلگرامی کے علاوہ عام طور سے اردو ہی میں خط لکھا کرتے تھے۔ مولوی نعمان احمد کو غالب کی یہ ادا پسند نہیں آئی چنانچہ یہ سلسلہ مراسلت زیادہ دنوں
تک قایم نہ رہ سکا۔ پروفیسر سید احتشام حسین رضوی نے غالب کے یہ چاروں خطوط ماہنامہ آجکل دلی میں شایع کر دیے ہیں جو انھوں نے مولوی نعمان احمد کو
لکھے تھے۔ غالب کے آخری خط میں جواب نہ دینے کا شکوہ بھی ہے۔

حکیم سید احمد صاحب وجنشا ...... کو بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کی عمر ایک سو بارہ برس کی تھی مگر ہوش و حواس ایسے اچھے تھے
کہ انتقال سے چند ماہ پیشتر جب میں ملنے گیا تو تقریباً دو تین گھنٹے تک برابر باتیں کرتے رہے۔ قدیم سیتاپور کے ادبی اذکار، اپنے انگلستان کے سفر کی روداد
...... خاندانی حالات! شاید ہی کوئی موضوع ہو جس پر کچھ نہ کچھ بات چیت نہ ہوئی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حالات مجھے لکھوا دیجیے۔ فرمایا صاحب جی
چاہے تو چار دن ٹھہر کر قلم بند کر لو ــــ لیکن یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی ایک دن معلوم ہوا کہ ان کی لاش لکھنؤ سے سیتاپور آئی ہے اور
...... قبرستان میں سپرد خاک کی جا رہی ہے۔ (مرتب)

[illegible] ہے وہ لکھتے ہیں کہ اتنا [illegible]

جملہ باپ [illegible] آیا ....

غرض کہ اسی طرح غالب مرحوم کا یا [illegible] اپنے اشعار کے [illegible] سکتے۔

چونکہ غالب کے دس بارہ اولادیں ہوئیں مگر سوائے ایک صاحبزادے شفیق سید احمد شریف اور ایک صاحبزادی کے تمام اولادیں کم عمری میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ صاحبزادی میرے رشتہ کے چچا سید حیدر حسین حیدری سے منسوب تھیں جن کے بطن سے صرف ایک دختر [illegible] النسا بیگم ہوئیں جو بقید حیات ہیں۔

شفیق سید احمد شریف بڑے پاکیزہ مزاج اور متقی بزرگ تھے تقریباً ۱۹۳۲ء تک یوپی کے مختلف اضلاع میں سب رجسٹرار رہے۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں بمقام سیتاپور وفات پائی۔ شعر و سخن سے بھی کچھ دل چسپی تھی۔ "گوہر" تخلص فرماتے تھے۔ کلام میں سلاست اور سادگی تھی روزمرہ اچھا کہتے تھے۔ ایک غزل سنائی تھی جس کے صرف دو شعر اس وقت یاد ہیں:-

اب دلوں میں باقی الفت نہ یاری رہ گئی — تو تو۔ میں میں۔ آئے دن میری تمہاری رہ گئی

تم شب وعدہ نہ آئے۔ اپنا عالم کیا کہیں — جس طرح گذری گذاری۔ ضد تمہاری رہ گئی

غالب کے مکمل دیوان میں جو غزلیں ہیں انہیں دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ابتدائی دور جب وہ شریف تخلص کرتے تھے۔ دوسرا دور غالب کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرے پاس ان کا نامکمل قلمی دیوان ہے اس میں فارسی کا ایک قصیدہ اور ایک حمد بھی ہے۔ یہ حمد اگرچہ نامکمل ہے لیکن اسے پڑھ کر اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہیں فارسی کے ادب عالیہ پر اچھا خاصا عبور تھا اور غالباً یہی چیز تھی جس نے انہیں غالب کے پرستاروں میں شامل کر دیا تھا۔ حمد کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ثنا باد ایزد پاک را — کہ در گنج او حسرت ادراک را

دو رنگ آفرینندۂ روز و شب — ثریا علا ساز تاک عنب

فرازندۂ کاخ گردان سپہر — فروزندۂ گوہر ماہ و مہر

دہ نطق و ہم فہم و سمع و بصر — کنی تاک ادراک نفع و ضرر

سفید و سیاہ و بہ نقش و کبود — بے رنگہائے گزین و نمود

عطا سکند انچہ می شایدت — کہ ہر یک بہ ہر لحظہ کار آیدت

معین مددگار ہر مستمند — رہا شدہ عاجزاں از گزند

ادا کے شود شکر احسان او — خوش آن کہ بود بہ فرمان او

غالب کا جو اردو کلام اب تک میں فراہم کر سکا ہوں اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی شاعری میں جو کچھ پیام تھا وہ غالب کے فیض تلمذ کا رہین منت ہے البتہ ایک مقطع سے اس حقیقت پر ایک ہلکی سی روشنی ضرور پڑتی ہے۔

بہت چالاک ہیں بے کوششیں کیں طرز غالب میں — نہ ممکن ہے [illegible] وہ انداز بیاں پھر بھی

غالب اپنے استاد میں کتنا محو و مستغرق تھے اس کا اندازہ ان کی اسی غزل کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے؟

تمہاری دوستی کا اپنی بربادی کو کافی ہے — غرض کیا ہم کو دشمن بنے یہ آسماں پھر بھی

اسے نہ تو غالب کا سرقہ کہا جا سکتا ہے نہ توارد — میں تو اسے "استغراق عقیدت" کہا کرتا ہوں۔ ممکن ہے [illegible] کہ غالب کا یہ شعر ان کے سامنے رہا ہو ——

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے! — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

[illegible] پر میں یا کسی تبصرہ کے طالب کی انھیں غزلوں کا سرسری انتخاب پیش کر رہا ہوں جو کسی حد تک غالب کے رنگ میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس میں وہ اشعار بھی شامل ہوں جن پر غالب نے اصلاح دی تھی۔

ثابت قدمی کر دل شیدا ابھی کچھ اور — واں ہیں ستم حوصلہ فرسا ابھی کچھ اور

کروبیوں نے بند کیے آسماں کے در — آہنگ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

بسمل بخون طپیدہ کہ رنگ پریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں
موج صبا یہ بوئے گل نو دمیدہ ہوں — اک آہ سرد و نالۂ درد آرمیدہ ہوں
بے تابی اپنی غالب دل خستہ کیا کہوں — نالے سے رعد آہ سے برق طپیدہ ہوں

تیرے دیوانے کو ہے صحرا کا یوں دامن عزیز — جس طرح یعقوب کو یوسف کا پیراہن عزیز
پاکدامانی پہ گو معصوم کی شاہد ہوا — لیکن اپنے دل میں یوسف سے رہا بدظن عزیز
یوں رقیب روسیہ سے اوہم سے ربط ہے — خار کو رکھتا ہے جیسے دامن گلشن عزیز

کبھی دل آپ کو رسوا نہ کرتا — مگر مجبور مرتا کیا نہ کرتا؟
جو بھولے سے بھی ہوتی پرسش حال — دل شوریدہ گھبرایا نہ کرتا
وفائے قیس میں ترک ادب تھا — بہ تعظیم سگ لیلا نہ کرتا

پہلے حیات خضر مہیا کرے کوئی — پھر انتظار وعدۂ فردا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت شمع تجلی کا دے فروغ — شوق دل کلیم تو پیدا کرے کوئی

طالب جیسے عیب کو چاہے صفت کرے — داغ سفید کو ید بیضا بنا دیا

جامہ کیسا نہ رہا رشتۂ جاں بھی تن میں — رہ گیا دست جنوں سر بہ گریباں ہو کر
نابلد ہوں میں رہ دشت جنوں سے بالکل — لے چلی اے وحشت دل خضر بیاباں ہو کر

ظاہر ہے دل کا حال مرے گو چھپے ہے کیا — بسمل تری ادا نے کیا پوچھتا ہے کیا
واقف ستا رہا ہے جو دوزخ کی گرمیاں — کچھ اس میں خوئے ہا سے گرمی سوا ہے کیا!
جیل وقت خندۂ گل نا درکش نہ ہو — اتنا تو دیکھ لے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

عرض نیاز بھی سبب ناز ہو گیا — میں اپنے حق میں آپ دراندازہوگیا

دیوان کامل و شاداں

رشید حسن خاں

زین العابدین خاں عارف، غالب کی بیوی امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے تھے۔ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بنیادی بیگم اور امراؤ بیگم۔ بنیادی بیگم بڑی تھیں ان کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی تھی جن سے دو صاحبزادے ہوئے، زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔ زین العابدین خاں عارف، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۴ برس کی تھی۔ بقول مالک رام صاحب 'عارف کی موت پر غالب نے وہ دردناک نوحہ لکھا تھا جو اردو نظم کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔' اس کا پہلا شعر یہ ہے:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

عارف نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کیے۔ دوسری بیوی (دستی بیگم عرف نواب دلہن، دختر میرزا احمد علی بیگ بخارائی) سے دو لڑکے ہوئے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال سے چند ماہ پہلے اُن کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ عارف کے انتقال کے وقت، باقر علی خاں ۵ سال کے تھے اور حسین علی خاں دو سال کے۔ غالب نے ان دونوں بچوں کو متبنّیٰ کر لیا۔ عارف کی رحلت کے بعد حسین علی خاں کو غالب اپنے یہاں لے آئے۔ باقر علی خاں کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے پھر وہ بھی غالب کے پاس چلے گئے۔

دونوں بھائی شاعر تھے اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کا اردو میں کامل تخلص تھا فارسی میں باقر۔ یہ مرزا قربان علی بیگ سالک سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ (مکاتیب غالب مرتبہ عرشی صاحب)

مالک رام صاحب نے بھی ان کو شاگرد سالک لکھا ہے اور تلمذ غالب سے انکار کیا ہے۔ البتہ صاحب بزم سخن شعرا نے ان کو تلمیذ غالب لکھا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۸۷۶ء کو یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ (اکتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مکاتیب) سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کی پائنتی، اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ چھوٹے بھائی حسین علی خاں شاداں کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ وفات لوح مزار پر کندہ ہے۔

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد — سوئے باغ جناں باقر علی خاں
بسال رحلتش تحریر گردید — بود مینو مکان باقر علی خاں (ذکر غالب)
۱۲۹۳

سالک نے بھی قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔

" قطعہ تاریخ وفات مرزا باقر علی خاں کامل خلف زین العابدین خاں عارف۔ فرزند نسبتی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر درخشاں۔

یادگار عارف مرحوم تھا — کس کو مارا تو نے دو دل حیف ہے!
کیوں دکھایا تو نے اس کو روز مرگ — جس سے روشن تھی شبستاں حیف ہے!
اس کے وابستوں کے دل ہی ہو گئے — دیکھو کیسے کیسے ارماں حیف ہے!
حسن اس کا اور کمال ... — چھپ گیا مہرِ درخشاں حیف ہے!
سب یہ کہہ دو، ہے یہی تاریخ سن — نوجواں باقر علی خاں حیف ہے!" (کلیات سالک ص ۲۹۳)
۱۲۹۳

ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ایک غزل اور ایک مسدس شہر آشوب 'فغان دہلی' میں محفوظ ہے، اور دو شعر 'بزم سخن شعرا' میں۔ باقی کلام خدا جانے کیا ہوا! عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کا تخلص شاداں تھا۔ فارسی میں خیالی تخلص کرتے تھے۔ فغان دہلی میں ان کا تخلص راقم لکھا ہوا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ پہلا راقم تخلص تھا، بعد کو شاداں اختیار کیا۔ صاحب عالم [illegible] سے متعلق تھے۔ امراؤ بیگم کے ایک مکتوب بنام نواب کلب علی خاں مورخہ ۲ اگست ۱۸۶۹ء [illegible] سے معلوم ہوتا ہے کہ شاداں اس وقت صاحب عالم [illegible] کے متوسلین میں شامل ہو چکے تھے [illegible] (مکاتیب) صاحب [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ در مدحِ جناب نواب محمد کلب علیخاں صاحب بہادر، دام اقبالہٗ

سبز و شاداب چمن میں ہیں امیدوں کے نہال
تجھ سے ہے کلب علی خاں چمن دہر نہال

سعدِ اکبر کو ملا تیری قلمرو میں شرف
نظر آتے نہیں شادی کے سوا سالِ وبال

تو وہ ہے جو کہ بس اک دم میں لٹادے سب کو
تیری نظروں میں ہے قاروں کا خزانہ کیا مال

تیرے ہی لطف سے رہتی ہے رعایا خرسند
ورنہ چلتا ہے فلک تو وہی اک ظلم کی چال

فی المثل وہ ہے اگر ذرہ تو، تو ہے خورشید
عدلِ کسریٰ کو ترے عدل سے کیا دیجے مثال

بس کہ مشہور ہوئی دادرسی ہی تیری
اب کوئی ظلم کسی پر کرے کیا پائے مجال

ظلمت و ظلم کہاں تیرے قلمرو میں رہیں
تجھ سا جب مسندِ اقبال پہ ہو مہر جمال

عندلیبانِ خوش الحان ہیں چمن میں خوش خوش
ڈر خزاں کا ہے، نہ صیاد کا کچھ دل میں خیال

گرگ کو کہتے ہیں چوپائے کہ جاتا ہے کہاں؟
شیر کو دیکھ کے، پاس اپنے بلاتے ہیں غزال

جلوہ گر شام میں ہے، صورتِ صبحِ امید
اس زمانے میں نہیں مہر کو آسیبِ زوال

تو وہ بزمی ہے کہ ہمسر نہیں پرویز ترا
تو وہ رزمی ہے کہ رستم کو نہیں تابِ جدال

بحرِ زخار، ترے علم کی تشبیہ ہے تام
بارِ احساں ہے، ترے حلم کی گویا اثقال

جو تری رائے ہو، اس میں غلطی کیوں کر ہو
تجھ پہ کھل جاتا ہے آغاز میں ہر شے کا مآل

فخر کیوں کر نہ ارسطو کو ہو یکتائی کا
تجھ کو دانش میں ارسطو سے اگر دیجے مثال

کیا بیاں اسپِ سبک بار کی تیرے رفتار
گرد کے ساتھ پہنچتا نہیں صرصر کا خیال

کیا کہے فیل کے اوصاف ترے، وہ [illegible]
کہ بلندی میں ہے کیواں، تو وہ پیکر میں جبال

عرض کرتا ہوں غزل شوقِ غزل سنجی میں
گو کہ مانع ہے مجھے، میری پریشانی سال

غزل

فتنۂ حشر سے بڑھ کر ہے اگر یار کی چال
اپنے نالے بھی کچھ اچھا نہیں رکھتے ہیں مآل

غم تو کیا، شوق بھی بے تاب کیا کرتا ہے
اپنے نزدیک تو ہے ایک فراق اور وصال

کہتی ہے لذتِ سوزِ غمِ پنہاں مجھ سے
ہاتھ آجائے تو فردوس کو دوزخ ہی میں ڈال

وصلِ دلدار میسر ہو، کہ موت آجائے
اے فلک کوئی تو ارمان ہمارا بھی نکال

نگہِ شرم کہے دیتی ہے سارے اسرار
آپ ہم بزمیِ دشمن کا نہ کیجے اقبال

جب اسے دیکھ کے ہی رہ گئے اہلِ محشر
جرمِ الفت کا کسی نے نہ کیا ہم سے سوال

خاک ہونا تھا ہمیں کوئے بتاں میں آ کے
قیس و فرہاد کو الفت نے دیے دشت و جبال

مدح سنجی میں ان اشعار سے کیا مطلب تھا
لیکن اس پردے میں منظور ہے عرضِ احوال

تو کہ ہے ذرہ نوازی کو شرف حاصل ہو
دورِ زماں کو کب امید کو حاصل ہے وبال

ہیں اہلِ بزم ہاتھ جگر پر دھرے ہوئے
کچھ ذکر آگیا ہے وہاں میرے حال کا

کس ناتواں کا سایہ پڑا روزِ ہجر پر
سو حشر ہو کے وقت نہ پہنچا زوال کا

خاموشی اک بیاں ہے مرے رازِ عشق کو
رنگِ شکستہ آئنہ ہے میرے حال کا

صد خامشی نہ ایک مرا حرفِ مدعا دکھا)
قائل ہوں آپ اپنی میں طرزِ مقال کا

اب تک قبے خودی سے نہیں مجھ پہ کچھ کھلا
مشتاق گو ازل سے ہوں میں اپنے حال کا

اُٹھا میں سُن کے غلغلۂ حشر کو عبث
دھوکا ہوا مجھے اُسی کافر کی چال کا

پرتو فگن ہے حسن کسی کا جو سینے میں
کچھ رنگ اور ہی ہے ہمارے خیال کا

اے اہلِ بزم! خاک کو میری نہ پھینکنا
پروانہ ہوں کسی کے فروغِ جمال کا

بیمارِ رنجِ ہجر ہے، بچنا محال ہے
یہ ماجرا ہے آپ کے شادؔاں کے حال کا

عالم نہ مجھ سے پوچھیے میرے خیال کا
آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا

کیا پوچھتے ہو حالِ دلِ پائمال کا
مشتاق پھر ہے ایک قیامت کی چال کا

ہم تو شبِ فراق ہی میں ہو گئے تمام
دینا پڑا حساب نہ کچھ ماہ و سال کا

سب انقلاب انھی کی نگہ کے (ہیں) دہر میں
پابند ہے فلک تو وہی ایک حال کا

میں کہہ رہا ہوں اپنی سیہ بختیِ فراق
چہرہ سفید کیوں نہیں شامِ وصال کا

نورِ نظر تلاش میں یوسف کی کھو دیا
اللہ رے شوق دیدۂ عاشق جمال کا

واں خامشی نے قفل دہن پر لگا دیا
یاں شوق سے ہجوم ہے لب پر سوال کا

کثرت سے حسرتوں کی ملا اور تازہ غم
دل میں مرے گزر نہیں اس کے خیال کا

میں نالہ کرتے کرتے جہاں سے گزر گیا
واں ذکر بھی ہوا نہ کبھی میرے حال کا

ہاں زلفِ یار! تو نے رکھا دل کو میہماں
احساں ہے میرے سر پہ ترے بال بال کا

سنتے بھی جاؤ، آئے جو فرصت کے بعد تم
قصہ ہے مختصر سا مری عرضِ حال کا

بجھ کے اگر چراغ تو ہستی تمام ہو
ہر چیز کا کمال ہے باعث زوال کا

اس بے کسی سے جان نہ کیوں کر لبوں پہ آئے
رونا پڑا ہے آپ مجھے اپنے حال کا

شادؔاں کو کچھ گرا ہوا سمجھو نہ اہلِ بزم
یہ شخص بھی جہان میں ہے اب کمال کا

مشکور جب سے یار کا وصفِ دہن ہوا
عنقا مثال گم مرے منہ میں سخن ہوا

مجھ کو بھی چارہ گر نہ آئی فقط ہنسی
زخمِ جگر بھی دیکھ کے کچھ خندہ زن ہوا

تم اور شرکتِ محفلِ اعدا! غلط غلط
میں اور یہ خیال! یہ کیا تم کو ظن ہوا؟

میرا کہا لاغری سے نہ پایا نشاں کہ
کیا کیا نہ تنگ میرے لیے پیرہن ہوا

ہوں وہ گرفتہ دل کہ کبھی میرے حال پر
زخمِ جگر بھی تو نہ ذرا خندہ زن ہوا

جنبش زباں کو سامنے اُن کے نہ ہو سکی
سمجھا ستم پہ ہجر مجھے اک سخن ہوا

مطلب یہ بے خودی سے ہے ہم کو، اگر کوئی شخص
پوچھے لئے، تو ہم سے بتایا نہ جائے گا

قاصد کے آتے آتے، ہم اتنے ہوئے ضعیف
اک حرف اُس کے خط کا اُٹھایا نہ جائے گا

ذوقِ نظارہ سے نہیں باقی ادب کا نام خ
سر مجھ سے زیرِ تیغ جھکایا نہ جائے گا

شاداں نے دل لگا کے بتوں سے بُرا کیا خ
اُس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

جب تک نہ آیا سامنے، کھولی نہ اپنی آنکھ
یعقوب کو یہ شوق تھا یوسف کی دید کا

ہاں اضطرابِ شوق! خدا قسم، کہ بے طرح
دامن چھٹا ہے ہاتھ سے صبر و امید کا

جو رُخ نقاب میں نظر سوزِ وہم ہو (کذا)
کیا حوصلہ نگاہ کو ہو اُس کی دید کا

کیا سارے ظلم ہو چکے اے چرخ؟ دیر سے
میں منتظر ہوں آج جفائے جدید کا

اے شیخ! دیر و کعبہ میں کیا امتیاز ہے؟
کچھ فرق ان میں ہے تو قریب و بعید کا

میں روزِ وعدہ کو بھی شبِ غم گنا کیا
چھایا یہ دودِ آہِ دلِ ناامید کا

دیکھوں کبھی جو صورتِ شامِ وصالِ یار
پھر دیکھنا نصیب نہ ہو صبحِ عید کا

پوچھے ہزار داورِ روزِ جزا، مگر
میں اور شکوہ اُن کی جفائے شدید کا!

خط پرزے پرزے، اور ہوا قتلِ نامہ بر
عنوان یہ ہوا مرے خط کی رسید کا

تھا شرمِ سخت جانی سے ایسا عرق عرق
خنجر سے گر رہا ہے پسینہ شہید کا

وہ خفتہ بخت ہوں کہ شبِ ہجر کے سوا
دیکھا کبھی نہ خواب میں منہ صبحِ عید کا

پوچھا نہ بعدِ غش کے کسی نے کلیم سے
باقی ہے حوصلہ ابھی کچھ اُس کی دید کا

کچھ بھی تو اُن کے قول کو دیکھا نہیں ثبات
اے دل ہو خاک ہم کو بھروسا امید کا

خیر اور ایک تازہ خوشی لحظہ لحظہ، ہائے!
میں اور ایک رنجِ زمانِ مدید کا!

آیا ہے آج میری طرح وہ بھی بدحواس
قاصد سے خاک لطف ہے گفت و شنید کا

ہے مژدۂ وصل اب مجھے پیغام قضا کا[1]
عادی ہوں غم و رنج کا، خوگر ہوں جفا کا

خلوت میں زلیخا سے چھٹا دامنِ یوسف
ادھیا جو ذرا ہاتھ پڑا بختِ رسا کا

چھوٹے نہ غم و رنج سے ہم بعدِ فنا بھی
ہے تجربۂ عشق، تو ماتم ہے وفا کا

نازک ہے وہ کتنا کہ تصور میں بھی میرے
آنکھوں سے اٹھایا نہ گیا پردہ حیا کا

یاں ضعف سے رنگ اڑ نہ سکا، اور وہاں دیکھا
ہے رنگ کچھ اچھا ہدفِ تیرِ قضا کا

ہے فتح ہزیمت بھی تنول کی، کہ جہاں کو
پھر تا صفِ مژگاں کا ہے پیغام قضا کا

محشر کو سنے گا نہ کوئی صور کی آواز
ہے شور جو یہ ہی مرے نالوں کی صدا کا

پایا نہ فروغ آگے شبِ ہجر کے ہرگز
چمکا نہ ستارہ سحرِ روزِ جزا کا

اُس گل کا تصور تھا جو آنکھوں میں دمِ نزع
گویا دمِ آخر مرا، جھونکا تھا صبا کا

---

[1] یہاں سے، آخر دیوان تک جملہ اشعار نسخۂ حمیدیہ سے ماخوذ ہیں۔

نکلے ہے اس سنگدلی کے سوز تپش سے تاب　　آئینہ بن جائے گر سدِّ سکندر کا جواب
جس کے نقشِ پا پہ شاداں ہوتے ہیں فتنے نثار[1]　　ہو کہاں سکتا ہے محشر اس کی ٹھوکر کا جواب
بھول جاؤ گے سب خوشی شاداں (رخ)　　کسی غمگیں سے جب ملیں گے آپ

کس جائے ہوا میرے تصور کا گزر آج!　　آتی نہیں جو اپنی حقیقت بھی نظر آج
بے کس کوئی دنیا سے ہے سرگرمِ سفر آج　　اے بے خبری! تجھ کو کسی کی ہے خبر آج؟
ہیں شامِ شبِ وصل میں آثار سحر کے　　ملتا ہے شبِ غم کی دعاؤں کا اثر آج
آتے ہیں وہ بے پردہ قیامت ہیں یہ جوبن　　بن جائے نہ موسیٰ کی نظر میری نظر آج
پیدا ہوا کیا اور کوئی روزِ مصیبت　　آتی ہے نظر کیوں شبِ ہجراں کی سحر آج
اس موت پہ قربان کروں زندگیِ خضر　　اس کوچے میں پہنچی ہے مرنے کی خبر آج
کل ہو کے دوچار اس نگہِ شوخ سے یارب　　آنکھوں میں ٹھہرتی ہی نہیں میری نظر آج
وہ دیکھنے آتے ہیں مرے حالِ زبوں کو　　اچھا ہے جو بڑھ جائے مرا دردِ جگر آج
رخصت ہوئے جاتے ہیں مرے ہوش و خرد کیوں　　اے بے خودیِ شوق! ارادہ ہے کدھر آج!
برسوں میں نظر آئی ہے شامِ شبِ عشرت　　یارب ہے یہ کچھ دور گماں سے بھی سحر آج
روتا ہے مرے حال پہ کیوں چارہ گر اتنا　　اشکوں سے نہ بھر جائے مرا زخمِ جگر آج
دیکھا ہے مری بے خودیِ شوق کو تو نے　　قاصد نہ رہے گی تجھے اپنی بھی خبر آج
گو جاتے ہیں آہستہ نزاکت سے وہ لیکن　　دوڑی ہی ہوئی جاتی ہے خوشی غیر کے گھر آج
برسوں میں ہوا سامنا کس شب جو مجھ سے　　منہ دامنِ خجلت سے چھپاتی ہے سحر آج
یاں جنبشِ لب کی بھی نہیں ضعف سے طاقت (رخ)　　مشتاق ہے گو میری دعاؤں کا اثر آج
پڑ جائے اگر سروِ قدِ یار کا سایہ (د)　　آ جائے مرے نخلِ تمنا میں ثمر آج
وہ خوگرِ غم ہوں کہ بھر آئے وہیں آنسو (د)　　مجھ پر جو تبسم ہوا زخمِ جگر آج
کل تک بھی مجھے تاب تھی کچھ کہنے کی شاداں (د)　　کہتے نہیں وہ سننے کو مرا دردِ جگر آج

اپنی کاکل کی تو تصویر کھینچ　　گرد میرے حلقۂ زنجیر کھینچ
آرزو کوئی نکل جائے نہ ساتھ　　میرے سینے سے نہ قاتل تیر کھینچ
ہم نشیں دیکھی مری دیوانگی　　اور پاؤں سے مرے زنجیر کھینچ
بد دعا عشاق کی اچھی نہیں　　دور اپنے کو ذرا تاثیر کھینچ

---

[1] مصرعِ اول مطابقِ قلمِ شاداں ہے۔ مخطوطے میں یہ اس طرح ہے ؎ اس کے نقشِ پا پہ فتنے ہوتے ہیں شاداں نثار۔

کیسے گنواؤں گناہوں کو قیامت میں خدا — اتنی وسعت نظر آئی مرے داماں میں نہیں
ہاتھ میرا جو گریباں پہ بڑھا جاتا ہے — غیر کا منہ تو کہیں اپنے گریباں میں نہیں

پھر لحظ سترِ راہ جو میری فغاں کے ہیں — سینے میں یہ بھرے ہوئے ارماں کہاں کے ہیں
بنا گئی اُس کی کمی مرے دودِ آہ نے — پردے میں اب تو مجھ پہ ستم آسماں کے ہیں
جاگا ہے پاسبانِ درِ یار رات بھر — اُلٹے اثر نصیب میں میری فغاں کے ہیں
رنج ایک دل میں میرے زمانے کے بھر گئے — دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
میں ناتواں ہوں اور وہ نازک شبِ وصال — پردے کبھی نہ اٹھیں گے جو درمیاں کے ہیں
اے ضعف! دیکھو بھال کے مجھ کو گرائیو — نزدیک دشمنوں کے بھی گھر اس مکاں کے ہیں
کیا اُن سے اُٹھ سکیں گی وہ باتیں رقیب کی؟ — میں بھی تو دیکھوں ایسے وہ نازک گماں کے ہیں
میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا — وہ پوچھتے ہیں مجھ سے یہ قصے کہاں کے ہیں
گھر سے گئے ہیں یا کہیں باہر سے آئے ہیں — کچھ ہوش آج بگڑے ہوئے پاسباں کے ہیں
کس نازکی سے آتے ہیں میری خبر کو وہ — گویا قدم یہ مجھ سے کسی ناتواں کے ہیں
روتے ہیں آکے قبر پہ غیروں کے ساتھ وہ — کیا کیا مٹانے والے ہمارے نشاں کے ہیں
کافی ہے نیند بھر لے کو میری شبِ فراق — گو خواب میرے بخت کو سارے جہاں کے ہیں
دیکھا ہے میں نے خوب مریدوں کو شیخ کے (رخ، اچھے وہی ہیں یار جو پیرِ مغاں کے ہیں
پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب (۰) آثارِ عشق، رخ پہ مرے راز داں کے ہیں
غم ایک میرے دل میں زمانے کے بھر گئے (۰) دل ایک زلف میں تری سارے جہاں کے ہیں
اے برق وہ جلائے گی کیا آہِ آتشیں (۰) تنکے بچے ہوئے جو مرے آشیاں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ، پہ چھپتے بھی ہیں کہیں (۰) آثار اُس کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

آفت کا تو ڑ ہے ترے تیرِ نگاہ میں — پیدا اثر کہاں سے ہو عاشق کی آہ میں
آ درجائے تازہ کی اتنی ہے چرپائے — جاتا ہے میرا نالہ، تو رُکتا ہے راہ میں
یہ ناتواں ہوا جل کباب کرے یا رنگ — میری نظر بھی جائے تو رہ جائے راہ میں
شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار — کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں
دیکھی ہوئی ہے تیری درازی شبِ فراق! — کیوں کٹے روزِ حشر ہماری نگاہ میں
کیا بھید ہے کہ روز وہ آکر یہ کہتے ہیں — بتلا تو کچھ اثر بھی ہوا تیری آہ میں؟
سایہ ہوا ہے غیر کی محفل کا دودِ آہ — لکھا ہوا تھا یہ مرے بختِ سیاہ میں
تعزیر اپنے ہاتھ سے دیتے ہیں بار بار (رخ، ملتی ہیں راحتیں مجھے کیسی گناہ میں

ش رخ: بنا گئی اس کی کمی کا مرے صدِ آہ نے ۔ ش رخ: وہ پوچھتے ہیں مجھ سے وہ نازک کہاں کے ہیں۔

[illegible] گماں [illegible] الٰہی [illegible]

میں ان جنوں کے عشق میں یاں تک بہکتا (٥) اب خود نہیں سماتا ہوں اپنی نگاہ میں

ہوں ناتواں ہوا ہوں کہ طلب کرے یا نگ (٥) نالہ بھی میرا جائے تو سو جائے راہ میں

ہے کس بھروسے پر تمہیں شاداں امید وصل (٥) ہے نالے میں اثر، نہ ہے تاثیر آہ میں

رشک کی بھی ہمیں تو تاب نہیں
شکر ہے، غیر پر عتاب نہیں

لطفِ دیرینہ، خاک یاد رہے!
ستمِ تازہ کا حساب نہیں

ابھی لب پہ ہے حالِ دل میرا
ہم نشینوں کو میرے تاب نہیں

کیا تغافل کہا تھا کوئی مضموں
یاد قاصد کو کچھ جواب نہیں

ہے ترقی حسن ہی پردہ
کچھ اسے حاجتِ نقاب نہیں

اس کی شوخی سے کم نہیں شبِ وصل
گو یہ پہلا سا اضطراب نہیں

بے خودی کام آ گئی آخر
کہ انہیں مجھ سے کچھ حجاب نہیں

اس نے پوچھا تو کیا بتاؤں گا!
حسرتوں کا مری حساب نہیں

چپ ہوں سن کر یہ الٹی بات اس کی
کہ مجھے طاقتِ جواب نہیں

پھرتی ہے کوئی چیز آنکھوں میں (٥) یہ مرے بخت کا تو خواب نہیں

غیر ہو آج بزم کی شاداں (٥) کہ وہ آتے ہیں اور نقاب نہیں

ستم سہنے کی جب تاب و تواں ہو
یہی کیوں ہو، کوئی امتحاں ہو

قدم رکھیں نہ ہم تو آسماں پر
جو سر رکھنے کو تیرا آستاں ہو

جو وہ پہلو میں میرے ہو تو کیونکر
نہ میری بے خودی سے بدگماں ہو

نہ دنیا میں نہ عقبیٰ میں ہو یا رب
شبِ عشرت مگر ایسی نہاں ہو

تمہیں آئینے سے ہے بدگمانی
ہمارا حالِ دل کیونکر عیاں ہو

شبِ غم کی مصیبت کا بیاں ہے
ہماری عمر کیوں کر داستاں ہو

نزاکت سے زیادہ ہے تجمل
وگرنہ تم تو نظروں سے نہاں ہو؟

ہماری ناتوانی دیکھ کر
وہ اکثر پوچھتے ہیں تم کہاں ہو

الٰہی نازکی بڑھ جائے اتنی
کہ ان کو ناز کرنا بھی گراں ہو

خیالِ آئینہ رہتا ہے ہردم
کہیں ہو تم، مگر رہتے کہاں ہو

نگاہِ شوق تم کو دیکھ لے گی
اگر تم لاکھ پردوں میں نہاں ہو

ہوا ہو پیر پیر شاداں
ابھی فضلِ خدا سے تم جواں ہو

کہتے ہیں عہد شکن ہے جو کیا تم کو
وعدے کے ساتھ جو آتا ہے تبسم تم کو

کوئی جاتا ہے یا گھر سے وہ گھر میں
اے قلق ہے فکرِ کثرتِ مردم مجھ کو

آزمائشِ ہر دم سے نہ ہو جو سے جفسرصت — شاداں کی پریشانی پہ کبھی اُس کی نظر جائے

بے تابیٔ مشتاق سے کب تجھ کو خبر ہے — ہاں اپنے ہی کچھ حسن و نزاکت پہ نظر ہے
کیا روشنیٔ بخت کا یا رب یہ اثر ہے؟ — شامِ شبِ فرقت مری، ہم شکل سحر ہے
پردے میں جب بیٹھے ہو تم رخ کو چھپائے — دیکھے کوئی تم کو، یہ کیسے تابِ نظر ہے
ہر صبح مجھے شامِ غریبی سے ہے بدتر — ہر شام مجھے ایک قیامت کی سحر ہے
کچھ دیکھیے تو وہ ہی کمر یار کو دیکھے — جس کو دکی) مرے شعر دکے معنی پہ نظر ہے
کیوں آئینہ دیکھا کہ جبیں پر عرق آیا — اپنا سا ستم گار مگر مدِ نظر ہے
شاداں نہ سہو رنج و الم عشقِ بتاں کے — اُس بات کو چھوڑ دو کہ تمہیں جس میں ضرر ہے

زلف کی بو ادھر نہیں آتی — کیا صبا میرے گھر نہیں آتی؟
نیند اُس بت کے ہجر میں ہم کو — شام سے تا سحر نہیں آتی
جب کہ وہ ہی نظر نہیں آتا — زندگی بھی نظر نہیں آتی

غیر بیٹھا رہے وہاں برسے — اور یاں چشم سے لہو برسے
آئینے میں نظر پڑا ہے کیا — نظر آتے ہو کچھ کدر سے
دور کر دو نقاب رخ پر سے — [illegible]
چال اُن کی نہ دیکھیے شاداں — خوف کیجیے ذرا تو محشر سے

اُس کے جلوے کے تحیّر نے، تڑپنے نہ دیا — خاک ارمان ہمارے دمِ بسمل نکلے
آئنہ دیکھتے ہیں وہ تو بگڑ جاتے ہیں — چاہتے ہیں کہ نہ کوئی بھی مقابل نکلے
کیا زیادہ پیے ہر روز سے دو چار سبو — آج مے خانے سے شاداں جو نکل نکلے

چال ہی اس کی نظر میں ہے، تو آفت کیا ہے — اُس کے قامت ہی کو دیکھا تو قیامت کیا ہے
ہائے بے تابیٔ شوق اپنی شبِ وصل میں آہ — اُن کا اک ناز سے کہنا کہ مصیبت کیا ہے

یہ بار بار جو پیکاں کو دیکھتے ہو تم — (رخ) نکل گئی کوئی کیا آرزو مرے دل کی

مر جاؤں گا اک روز فغاں کرتے ہی کرتے (رخ) حالِ دلِ بے تاب بیاں کرتے ہی کرتے
یہ یاد کہا جائے گا حالِ تپِ ہجراں (ہ) گزرے گی شبِ وصل بیاں کرتے ہی کرتے

محبت نے مجھے کھینچا کہاں سے دلی کہ ہم آئے زمیں پر آسماں سے
سنو! پُر سوز ہے حالِ دلِ زار (") مزہ پاؤ گے تم اس داستاں سے
بس اب خاموش کیا کیا کہہ چکے ہو (") نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
تم اچھا رنگ آئینے میں دیکھو (") تمہیں کیا کام رنگِ عاشقاں سے
نشانہ دل ہے، بسم اللہ کیجے (") اگر کچھ شوق ہے تیر و کماں سے
بہت سی خاک چھانی تم نے دل (") قدم باہر نہ رکھو اب مکاں سے

دل کسی شخص پہ آجائے، تو کچھ حال کھلے (") آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

مٹ گیا خوب ہمہ نام و نشانِ دہلی (") کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

آغوشِ گور تنگ شد از بیقراریم ای دل! ز پہلو کہ جدا گشتہ ایم ما؟

شرم می آید خیالی را بجنگِ آسماں کاین جوانی ہست و او یک پیرِ بی بال است

چو استیاج جہاں بجہد دولت او کہ پاسبانِ جہاں است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم، تا دکش خطا نہ کند رہا کند سوی منتا اگر بجرم شکار

غم نیز دہ خوشی است کہ فارغ شدہ نگار بر جای خود بہ بستر خواب آرمیدہ است

قطعۂ تاریخ باقر علیخاں کامل

چو زیں عنخانۂ دنیا سفر کرد سوی باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

کلام باقر علی خاں کامل

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز کہ پیرِ مغاں آشنا ہو گیا

یاد آتا کسی کے کاکل کا تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

مٹ گیا، پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی لب پہ دہلی ہے، تو ٹکڑوں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں پر نہ سوگن ملتا ہے اب حقیقت میں پڑھے ہیں جو گمانِ دہلی

محبت نے مجھے [illegible] کہاں سے [illegible] کر میں آیا زمیں پر آسماں سے
سنو! یہ سب ہے حالِ دلِ زار (۲) مزہ پاؤ گے تم اِس داستاں سے
بس اب خاموش کیا کیا کہتے ہو (۲) نکل جائے نہ کچھ میری زباں سے
تم اچانک آئینے میں دیکھو (۲) تمہیں کیا کام رنگِ عاشقاں سے
نشانہ دل ہے، بسم اللہ کیجے (۲) اگر کچھ شوق ہے تیر و کماں سے
بہت سی خاک چھانی تم نے شاداں (۲) قدم باہر نہ رکھو اب مکاں سے

دل کسی شخص پہ آجائے، تو کچھ حال کھلے (غ)، آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی (ت)، کس کی پاپوشش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

آخر دل گو تنگ شد از بیقراریم ای دل! ز پہلو کہ جدا گشتہ ایم ما؟

شرم می آید خیالی را بجنگ آسماں کاین جوانی ہست داد یک پیر دیرینہ [illegible]

چہ اعتبار جہاں بعہد دولت او کہ پاسبان جہاں است طالعِ بیدار
اگر غلط نہ کنم، ناوکش خطا نہ کند رہا کند سوی منتہا اگر بجرم شکار

غم تیز دو خوشی است کہ فارغ شدہ نگار بر جای خود بہ بستر خواب آرمیدہ است

قطعۂ تاریخ باقر علیخاں کامل

چو زیں منجانۂ دنیا سفر کرد سوی باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش عقل ریز گردید بود مینو مکاں باقر علی خاں
۱۲۹۳ھ

کلام باقر علی خاں کامل

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز کہ پیرِ مغاں آشنا ہو گیا

یاد آنا کسی کے کاکل کا تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

مٹ گیا، پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی اب یہ دلی ہے، تذکروں میں ہے شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کبھی چرخ عوض لیتا ہے اب مصیبت میں پڑے رہتے ہیں جو کسانِ دہلی

منہ کو آتا ہے کلیجہ، ہے ہے!! — ہم نشیں کیوں کے بھلا کیجیے بیانِ دہلی
تھی بہارِ چمنِ دہر یہ کیوں کر دھریے — کہ نظر آتی ہے افسوس خزانِ دہلی
غم دیے، رنج دیے، اپنی گرہ سے ظالم — چرخ! کیا تو نے لیا، کرکے زیانِ دہلی
اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں — تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی؟
ضبطِ گریہ کو یہ دلی نے کیا ہے، گویا — نہیں پانی گھٹی یہ نہرِ روانِ دہلی
سیل کے گولے پڑے، چرخ سے فتنے برسے — منہدم کیوں کہ نہ ہو جائیں مکانِ دہلی
خانۂ کعبہ کو اب حضرت کا آل چلیے — رہنے کا اب نہ رہا لطف، میانِ دہلی

مسدس شہر آشوب

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی — تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشیدِ نور تھی دہلی — تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات نمایاں کا ہر ایک فردِ بشر — بڑا بھی یاں کا، زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا ذوقِ خاصِ دنیا پر — یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہوکر
یہ فوجِ باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا، غضب آیا، اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں — جو روز عیش میں گزرا، تو شب بسر تھی
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں — پھنسے ہیں ظلم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں! اور وہ بادشاہ کہاں!
رہا جو کوئی، تو وہ مرتبہ، وہ جاہ کہاں!

یہ قلعہ، رشکِ وہ گلستانِ رضواں تھا — یہ قلعہ خلد تھا، اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا، کہ خدایا! کوئی پرستاں تھا — یہ قلعہ، پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی، تو ہاں! صورتِ دلِ بلبل کیجیے — صدائے طائرِ گم گشتہ آشیانہ کیجے
حیات بخش کا، گر ماجرا بیاں کیجیے — تو چاہیے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے
یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ محل جو وہ کہ تھا جس کا احتشام عیاں — خوشی سے خسرو پرویز ہے جہاں دہاں
عوام کو وہاں جانے کی مجال کہاں — گناہ گار بھی جاتے تھے کس ادب سے وہاں

نگار دوستوں سے :

اپنے شہر کے بڑے اخبار فروشوں

لائبریریوں ، اسکولوں ، کالجوں اور

صاحبِ ذوق دوستوں کے پتے ایک کارڈ پر لکھ کر بھیج دیں

شرط یہ ہے کہ

یہ سارے پتے وہ ہوں جن کی ایمان داری دلچسپی

اور

خوش ذوقی پر آپ کو بھرپور اعتماد ہو

نگار

کی خریداری کے لئے ان سے براہِ راست ہم بھی کہیں گے

اور آپ بھی کہیں

REGD. NO. A—
42 YEAR OF PUBLICATION
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
FEBRUARY 196
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے، رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب و طباعت کے لحاظ سے ہندوپاک میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اور خوبصورت اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام ان کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب و تصحیح کا کام موصوف نے خود انجام دیا ہے ان کی زیر نگرانی ترتیب و اشاعت کے مراحل طے ہوئے ہیں۔

دستور الفصاحت: یہ احمد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرہ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے اس میں ۲۵ اساتذہ اردو کا حال و منتخب کلام درج ہے۔ مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ اردو کے کلاسکی شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی م سا سے غیر مطبوعہ تذکروں سے احوال شعراء کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس لیے بہت سے تذکروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہ کتاب اردو میں اعلیٰ ایڈیٹنگ کا نمونہ ہے جسے بغیر جھجک ہم کسی بھی زبان کے تحقیقی کارناموں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ قیمت — ۶ روپے مجلد

مکاتیب غالب: یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو فرمانروایان رامپور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں حباب رامپوری اور ناظم رامپوری کے اشعار پر اصلاحیں نیز مولانا حالی، صفیر بلگرامی، رنج میرٹھی اور نیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں۔ یہ متفقہ امر ہے کہ خطوط پر مشتمل کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شایع نہیں ہوا۔ اردو میں انداز ترتیب و تہذیب کی ایک متعین راہ بتانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا ضروری ہے۔ قیمت — ۸ روپے

فرہنگ غالب: اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعے غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو وغیرہ زبانوں کے الفاظ و معانی جمع کر دیے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندوپاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے۔ جن کے مرہون منت خود ایرانی بھی ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ زبان و لغت کے بارے میں غالب کا ر[ائے] جاننے کے لیے یہ کتاب بیحد ضروری ہے (طباعت لیتھو) قیمت — ۶ روپے مجلد

نگار بک ایجنسی رامپور، یوپی

زبانِ خلق

مولانا عبدالماجد دریابادی

نگار ہندوستان پہلی بار دیکھنے میں آیا۔ یہ فروری کا نمبر آپ کا
بھیجا ہوا ہے۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ نگار پاکستان کا مثنیٰ ہوگا مگر یہ تو
اصل

لیکن تو چیزے دیگری

نکلا۔ اس سے قبل کا کوئی نمبر میری نظر سے نہیں گزرا اس میں ذکر جا بجا
غالب کا ہے۔ مجھے تو غالبیہ بدخواہی نظر آیا۔ کیا غالبیت اس کے سوا کچھ
اور ہے۔

غالب میرے محبوب شاعروں میں ہے لیکن غزلگوئی کی حد تک کہنا چاہیے
کہ محبوب ترین۔ بشری کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں ان کمزوریوں کو
زیادہ اچھالنے اور انھیں مزے لے لے کر بیان کرنے کی ذہنیت میری سمجھ
سے باہر ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی)

میں نے نگار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا اس کے مضامین عام طور
پر اور آپ کی تحریر خاص طور پر جو غالبیہ کے نام سے مسلسل شائع ہو رہی
ہے بہت پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نوخیز نگار بوڑھے نگار سے زیادہ
معقول اور مقبول ثابت ہو۔

پروفیسر سید احتشام حسین (الہ آباد یونیورسٹی)

نگار (جنوری) نظر نواز ہوا۔ آپ نے جس حد تک اس کی روایتوں
کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ مجھے یقین ہے
کہ اس نئے دور میں نگار اس سے زیادہ علمی اور ادبی خدمات انجام دیگا
جو پہلے دے چکا ہے کیونکہ اس وقت علم و ادب دونوں نئی منزلوں
اور نئے افق کی جستجو میں ہیں۔

اس نمبر میں یوں تو سبھی مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن غالبیہ کے
سلسلے میں آپ نے جو جز شامل کیے ہیں وہ خاصہ کی چیز ہیں۔
میں بھی اس کی جو خدمت کر سکوں گا کروں گا۔

مالک رام (برسلز بیلجیم)

نگار کا جنوری کا شمارہ ملا تھا شکریہ ماشاءاللہ خوب نکلا ہے خدا
کرے یہ خوب سے خوب تر ہوتا جائے۔

آپ نے غالبیہ کا جو سلسلہ شروع کیا ہے بہت خوب ہے اگرچہ
بہتر ہوتا اگر آپ اسے مکمل غالب نمبر میں ایک ہی مرتبہ شائع کر دیتے
اس سے ایک تو کتاب ایک اشاعت میں پوری ہو جاتی دوسرے نگار
کو انتظار کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑتی۔

عبدالمجید حیرت (پرانا سکھر)

غالب پر نقادان وقت لکھتے رہے ہیں کہ خدا کی پناہ مگر اس
تو کرم فرمائیں ایک ہی مضمون سنتے سنتے کان پک گئے عزیزو۔

پروفیسر حمید احمد خاں (لاہور)

میں نے نگار کے غالب نواز اوراق کو دلچسپی سے پڑھا
اور آپ کے حسن ترتیب اور ذوق سلیم کی داد دی۔ ہندوستان کی تحقیق
غالب کے لیے ابھی بے حساب مواد موجود ہے امید ہے آپ کی توجہ
بتدریج اس سرمایہ کا انکشاف ہوتا رہے گا۔

اعجاز عسکری (علی گڑھ)

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سرورق کی پشت پر تعریفی رائیں
چھاپنا نہیں زیب نہیں دیتا۔ ایڈیٹر اپنی شان میں تو تعریفی خط
چھاپتے ہی رہتے ہیں اور اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کی بھی کو
کمی نہیں۔ بہرحال افسوس ہوتا ہے جب کوئی تم سا شخص اس قسم
کے Temptations کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی (گورکھپور یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو)

نگار ملا۔ ایں کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب
آپ نے یقیناً معیار بلند کیا ہے .... میں خود
نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے اگر ہم
بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا ....

آئندہ شمارے میں اقبال سے متعلق اہم مضامین شائع ہو رہے ہیں

نگار

ایڈیٹر اکبر علی خاں

ضروری اعلان
پاکستانی خریدارانِ نگار کا سالانہ چندہ
اس پتہ پر بھیجیں رسالہ جاری کر دیا جائیگا
نمائندہ نگار ۱۷/۹۱ اے کشن آباد لاہور

جلد ۴۲ | فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۶۳ء | شمارہ ۳

ملاحظات

ہندوستان میں اردو کے مستقبل کی طرف سے ہر اردو دوست پریشان اور متفکر نظر آتا ہے۔ مایوسی اور دل شکستگی کی یہ فضا ہماری صلاحیتوں کو ماؤف کر رہی ہے اور سب کے سب اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کرتے ہیں۔ اس انداز فکر سے ہم اپنے راستے خود ہی مسدود کرتے چلے جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ سہل پسندی کے ساتھ طبیعت بہانہ جو بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نالہ و فریاد کے سوا اب کوئی نسخہ استعمال کرنے کے لیے باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اردو کی موجودہ کسمپرسی بیان کرتے وقت ہم الزام تراشی سے کام لیا جاتا ہے اور یہ الزام ایک ہی فرقہ پرور کے سر جاتا ہے جسے ہم متعصب کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سب مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

ہم سب کی سمجھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا اور کوئی ذریعہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ اس کو سرکاری مدارس میں منظور کرا لیا جائے۔ اس بات سے شاید ہی کوئی ذی ہوش انکار کرے کہ مدارس میں اردو تعلیم کا انتظام ہماری بہت سی مشکلوں کو آسان کر دے گا۔ مگر سب سے زیادہ جو ذہنیت اس مطالبہ کی پشت پناہی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں خود کچھ کرنا نہیں پڑے گا سوائے چند نعروں اور وقتی ہنگاموں کے

اردو ہندوستان میں اپنے نام نہاد دعوے داروں کے ہاتھوں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی اب اُن لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جو اس کی مقبولیت سے واقف ہیں اور جنہیں یہ احساس ہے کہ نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اردو کا کیا رول ہو سکتا ہے۔ اس کے فراموش کر دینے سے ملک کے کتنے بڑے حصے سے بے تعلقی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

اردو کے چاہنے والے خالص تجارتی ذہن کے لوگوں میں بھی ملیں گے۔ چنانچہ پاکٹ بکس کی روز افزوں کثیر اشاعت اس کا ایک زندہ ثبوت ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے گوشے گوشے میں بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ اردو میں نشر و اشاعت کا کام اب وہ ادارے اپنا رہے ہیں جنھوں نے کبھی اردو کو اپنی مادری زبان نہیں بتایا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ زبان آزاد ہندوستان کی زبانوں میں بلند ترین مقام رکھتی ہے اور اس کے حلقۂ اثر اپنانے کے معنی اپنی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ ہندی کے مشہور ماہنامے سریتا نے بڑی آب و تاب کے ساتھ اپنا اردو ایڈیشن نکالا جو یقیناً اردو صحافت کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے اور ان کا یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے انگریزی ہفت روزہ اخبار بلٹز نے بھی یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنا اردو ایڈیشن شایع کرنے والے ہیں۔ ادارۂ نگار اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے اس لیے نہیں کہ ہمیں اُن کی پالیسی اور طریق کار سے اتفاق ہے بلکہ اس لیے کہ جہاں اس ایڈیشن سے بلٹز اپنے سیاسی مقاصد کی ترویج و اشاعت کا کام لے گا وہیں اردو کو بھی ایک ایسا ہفت روزہ ملے گا جو بہرحال ہندوستان کی موجودہ صحافت کا نمایندہ ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ تجربہ سریتا سے بھی زیادہ کامیاب رہے گا۔

عراق میں ایک بار پھر انقلاب آگیا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عراقیوں کو قتل و غارت کا قمار کھیلنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ موجودہ انقلاب کے رہنما عبدالسلام عارف نے سزائے موت دینے سے پہلے عبدالکریم قاسم سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ پچھلا انقلاب لانے کا ذمہ دار کون تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک انقلاب اتنی اہم بات نہیں تھی جتنی یہ بات کہ انقلاب لانے والا کون ہے۔ اس ایک جملے نے خود پسندی کے کتنے دردتہ جذبات کو عریاں کر دیا۔ بات کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ قاسم نے جو جمہورانہ سلوک عارف کے ساتھ کیا تھا وہ سیاسی انقلاب کی دنیا میں دانشمندانہ نہیں تھا اور اسی کا خمیازہ انھیں اپنی زندگی سے بھگتنا پڑا ۔۔۔ ہماری تمنا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے چھوٹی ہندوستان کی امن پسند طبیعت سے کچھ سیکھیں اور اپنے مزاج میں استقلال و ثبات پیدا کر سکیں کیوں کہ ؎
برسنگ گرداں نروید نبات

کچھ پیروڈی کے بارے میں

رشید احمد صدیقی

فن کی حیثیت سے پیروڈی مغرب کی دین ہے۔ لیکن شغل کے اعتبار سے ہمارے شعر و ادب میں اجنبی نہیں ہے۔ اردو میں اس کی ابتدائی مثال غالباً شاہ حاتم کی "جہاں تہاں" سے پیروڈی میں ملتی ہے۔ جو رنگ کی [illegible] زیادہ ہے۔ پیروڈی کا ہے، عربی، فارسی، کلاسیکی اور مذہبی کتابوں کے تحت اللفظ اور ترجمے کی بھی پیروڈی کی گئی ہے۔ جس کے نمونے ملا رموزی کی "گلابی اردو" میں ملتے ہیں۔ غالب۔ حالی۔ انیس اور اقبال کے کلام پر کچھ میں کیا گیا ہے۔ کسی شاعر یا مصنف کی پیروڈی اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے کلام کا خاصہ معمولی طور پر ہو چکا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کلام یا اس کا مصنف کس پائے کا ہے۔

کچھ دنوں ترقی پسند شاعری بالخصوص بے قافیہ نظموں کی کثرت سے پیروڈی کی گئی ہے۔ یہ در اصل کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سنجیدہ اور معروف اسلوب یا نظم و نثر کو مضحک رنگ میں پیش کرتا ہوتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ مضحک جذبات نہ ہونے پائے۔ بالفاظ دیگر پیروڈی ادبی رنگ کی حامل ہو۔ شگفتگی آپ یا حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو مزاح لطیف سے معتدل کرنے اور رکھنے کا کام پیروڈی سے لیا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں بور اور بورنا کچھ دنوں سے بڑی مقبول اصطلاحیں ہیں جن کو خود بور بڑی معصومیت سے کام میں لاتے ہیں۔ پیروڈی ان معصوموں کے حضور میں ان کے ستم زدوں کی طرف سے نذر عقیدت ہے یا یوں سمجھیے کہ بور کو بور ہی کے حربے سے کیفر کردار کو پہنچانے کی مستحسن کوشش پیروڈی ہے۔

پیروڈی میں صحت اور جودت کا ہونا ضروری ہے۔ اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا کہ تھوڑی دیر کے لیے نقاب یا پیوند کی تفریح کی حیثیت اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے۔ پیروڈی ظریفانہ پیوندکاری یا حرامیہ تعریف ہی کو کہتے ہیں۔ اعلیٰ پایہ کی پیروڈی اتنی ہی قابل قدر ہوتی ہے جتنی کہ وہ عبارت یا شعر جس کی پیروڈی کی گئی ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیروڈی کا فن کس ذہانت اور ذکاوت کا طلب گار ہوتا ہے۔

پیروڈی نگاروں میں میرے نزدیک اکبر کا درجہ سب سے بلند ہے۔ ایک زمانے میں سید محمد داؤد عباسی (علیگ) کی پیروڈی نگاری کی علیگڑھ میں بڑی شہرت تھی۔ جو مولوی محمد خاں ناظر اور علامہ شبلی کے کلام پر طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ موجودہ دور میں سید محمد جعفری (پاکستان) کو بڑی شہرت ہے۔

آپ نے سرکس میں مسخرے کو دیکھا ہوگا جو اپنے ساتھی بازیگر یا نٹ کی نقل کرتا ہے۔ وہ اپنے طور پر وہی سب کر دکھاتا ہے جو بازیگر دکھاتا ہے دونوں کے دکھانے میں صرف تکنیک کا فرق ہے۔ ایک کے کرتب پر ہم مبہوت رہ جاتے ہیں۔ دوسرے کی نقل پر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مسخرا فن کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بازیگر کا ہمسر ہوتا ہے بلکہ بازیگر پر اس کو یہ فوقیت حاصل ہوتی ہے کہ کرتب جو بازیگر جان کو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرا محض [illegible] دکھا دیتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم بازیگر کے کرتب کا اسی شوق سے مشاہدہ کرتے ہیں

ل۔ رشید صاحب نے جسے مسخرا کہا ہے اس کو رام پور کی زبان میں ہیلاد ([illegible]) بھنت نیلا کہتے ہیں۔ یہ خاص رامپوری زبان کا لفظ ہے اور کہیں دوسری جگہ سننے میں نہیں آتا [illegible]

اس سے کسی طرح کم شوق سے مسخرے کی قلا بازیوں کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ یہاں غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس کرتب کو بازی گر اپنی جان خطرے میں ڈال کو دکھاتا ہے اسی کو مسخرہ اپنی آبرو خطرے میں ڈال کر دکھاتا ہے۔ مسخرے کی آبرو کسی غیر مسخرے کی آبرو سے کم نہیں ہوتی۔

قلا بازی تو ہم آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ لیکن تماشائیوں کے ڈر سے شاید ایسا نہ کریں۔ دراصل قلا بازی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا۔ سب کچھ مسخرے ذکاں میں ہوتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسخرا بننے سے پہلے قلا بازی لگانے میں احتیاط برتیں اور مسخرا بننے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط سے کام لیں۔

پیروڈی اور کارٹون میں مماثلت ہے۔ کارٹون بھی کسی شخص یا شے یا واقعے کی سب سے نمایاں شناخت یا پہلو کو مضحکہ خیز حد تک نمایاں کر دیتا ہے۔ چسٹرٹن کے نزدیک طنز یا تضحیک کا تصور یہ ہے کہ سؤر کا نقشہ اس طرح کھینچا جائے کہ وہ سور سے بھی زیادہ سور نظر آنے لگے۔ یہ تعریف کارٹون پر بھی چسپاں ہوتی ہے اس طور پر پیروڈی کارٹون طنز و ظرافت بقول غالب ؎

"وہی ایک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے"!

نثر کی پیروڈی نظم کی پیروڈی سے مشکل ہے۔ اس سے غالباً سب کو اتفاق ہوگا اس لیے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔

آل احمد سرور

پیروڈی ظرافت کی ایک خاص صنف ہے۔ پیروڈی کے لیے ضروری ہے کہ جس کی پیروڈی کی جائے اس میں کچھ فکری یا فنی محور موجود ہوں۔ رشید صاحب کی اصطلاح میں انھیں کو بڑ کہہ لیجیے۔ مثلاً ایک صاف ستھرے میچو اور ہموار شعر کی پیروڈی نہیں کی جا سکتی۔ جب تاؤ نہ ہوگا تو اسے تیز کیسے کیا جائے گا۔ اگر شاعر کے یہاں کچھ مضامین اصطلاحات، تشبیہات تراکیب اور علامات کی تکرار ہے اور یہ سب چیزیں ہی اس کی امتیازی صفت ہیں تو ان کی پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح اگر نثر نگار کے یہاں کچھ مخصوص خیالات کا اعادہ ہوتا ہے چند خاص خاص فقرے یا ترکیبیں بار بار ملتی ہیں وانعہ کچھ ہو تاثرات ایک ہی سے رکھتا ہے تو وہ پیروڈی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ پیروڈی انفرادیت کو آسیب بنا کر پیش کرتی ہے۔ اس ستم ظریفی میں محض یہ دیوتا کے مٹی کے پاؤں دیکھنے کا جذبہ ہی نہیں ذہنی صحت کے معیار قائم کرنے کا بھی احساس شامل ہے۔ ہر نشیب و فراز کو ہموار کرنے کا عزم ہی نئے نشیب و فراز کی داغ بیل ڈالنے کا بھی۔ یہ وہ آئینہ ہے جو محبوب کی جھریاں ہی دکھاتا ہے مگر جھریوں کے باوجود ادائے محبوبی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جس طرح ظرافت میں طنز کو گوارا اور اسلوب کو ادبی ہونا چاہیے اسی طرح پیروڈی میں مذہبی کی گنجائش نہیں۔ اگر کسی کے نقطۂ نظر یا اسلوب بیان کی اس طرح پیروڈی کی گئی کہ پیروڈی کرنے والے کا ذاتی عناد نمایاں ہو گیا تو پیروڈی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ پیروڈی تو صرف آئینہ دکھاتی ہے قد دل کا پرچار نہیں کرتی۔ یہ چارہ رہ گیا ہے۔ پولس کی سرچ لائٹ نہیں۔

پیروڈی ایک شعوری کوشش ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر کوئی تصویر کارٹون اور کوئی تخلیق ایک ایسی بھدی نقل بن جائے جس پر پیروڈی کا گمان ہو۔ اردو میں پیروڈی کی شعوری کوشش سب سے پہلے پطرس نے کی اور مولوی اسمٰعیل کی ریڈروں کے مانے ہوئے حسن کو اپنے آئینے سے اور محبوب بنا دیا۔ ان کے مضمون کتے میں بھی مشاعروں کی ایک پیروڈی ملتی ہے۔ مگر مضمون نگار نے وہاں پیروڈی ضمناً کی ہے۔ اپنے بنیادی مقصد کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جہاں کسی رومان یا نصاب' عورت یا انقلاب کی لے بہت تیز ہو گئی ہے۔ پیروڈی کے ذریعے سے صحت و اعتدال کی علمبرداری کی گئی ہے۔ جہاں فنکار نے ہنر کے نشے میں اپنے قلم کو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔ پیروڈی کرنے والوں کو اس کی بے لگامی واضح کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پیروڈی جہاد نہیں ہے ایک سنجیدہ تفریح ہے اور اس کا تہذیبی مقام مسلم ہے۔

سید احتشام حسین

انسانی اعمال حیات اور عام لیا سنجیدہ مصروفیات سے ہٹنے کے لیے تفریح کے سیکڑوں ذرایع اور خوش باشی کے لا تعداد پہلو پیدا کر لیتا ہے

وہ ہنسنے کی بات پر تیوری چڑھا لیتے ہیں۔ یہ روش ٹھیک نہیں بعض لوگوں کی طرح ہنسنے سے اس کی صحت نہ خراب ہوتی ہو۔ سنجیدہ باتوں کو بھی تو ظریف ذہن مضحک پہلو نکال لیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیروڈی بھی ان لوگوں کی ایک کوشش ہے۔ میں خود کو اس بات کے ماننے پر آمادہ نہیں کر سکتا ہوں کہ پیروڈی کو اعلیٰ محفلوں میں بھی جگہ دی جائے۔ ——— ہو سکتا ہے کہ کوئی پیروڈی نگار میری اس بد ذوقی پر مجھ سے بھی کہہ لے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے وقتی تفریح تک محدود رکھنا چاہیے۔ ایسا ایک ادبی صنف قرار دے کر اعلیٰ ظرافت اور شگفتہ دلی کا مد مقابل نہیں بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمٰن

اردو ادب میں پیروڈی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ لیکن یا تو ہم لوگ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں اور یا انگریزی کے اس خیال سے متاثر کوئی نئی تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں پیروڈی کی وہ آؤ بھگت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔

پیروڈی بڑی پرانی چیز ہے۔ زمانہ قبل از مسیح میں بھی لوگ پیروڈی کیا کرتے تھے۔ یونان میں کسی ٹھوس نظم یا سنجیدہ ڈرامے کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا جاتا تو اس عمل کو پیروڈیا (یا پیروڈو) کہتے تھے۔ ارسطو نے لکھا ہے کہ جب ایتھنز کی فوجیں سسلی میں تباہ ہو گئیں تو ایک یونانی نے اس جنگ پر اتنی اچھی پیروڈیا (یا پیروڈو) لکھی کہ اسے پڑھ کر ایتھنز والے اپنی شکست کو بھول گئے۔

اس زمانے سے اب تک دنیا کی ہر زبان میں ہر موضوع پر پیروڈیاں لکھی گئیں۔ Don Quixote شائع ہوئی تو ساری دنیا پیٹ پکڑ کے ہنسی۔ ... سپاہیوں اور شوالری پر ہنسی اور یہ کردار دنیا کے ادب میں ہمیشہ کے لیے شامل ہو گیا۔ جان ملٹن نے ملٹن کی فردوس گمشدہ کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا تو لوگوں نے اسے ملٹن ثانی کا خطاب دیا جو آج تک اس کے کتبے پر لکھا ہوا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیروڈی نہ تو محض تمسخر ہوتی ہے اور نہ نری تضحیک۔ یہ ایسی خوشگوار سی تنقید ہوتی ہے جو بری معلوم نہیں ہوتی۔ (خصوصاً اسے جس کی پیروڈی لکھی گئی ہو) پچھلی صدی میں لندن کے تھیٹروں میں نامور شعراء کے کلام پر پیروڈی کی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ متعلقہ شعراء بطور تماشائی موجود تھے لیکن انھوں نے برا نہیں مانا۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سنجیدہ اور سبق آموز چیزیں پڑھتے وقت قاری چوکنا سا رہتا ہے اور بار بار سوچتا ہے کہ یہ باتیں تو میں پہلے سے جانتا ہوں ——— اسے شک رہتا ہے کہ مصنف کہیں پروپیگنڈہ تو نہیں کر رہا ہے لیکن کامیاب پیروڈی پڑھتے وقت اسے شبہ تک نہیں ہوتا کہ مصنف کسی ادب کی آڑ لے کر طرز معاشرت، رسوم، اخلاقی قدروں اور دیگر اہم مسائل پر تنقید کر رہا ہے۔ چند چیدہ چیدہ فقرے، عبارت کے کچھ دلچسپ حصے اس کے ذہن میں رہ جاتے ہیں اور ساتھ ہی چند کارآمد نصیحتیں بھی یاد رہ جاتی ہیں۔ صحیح پیروڈی ادب کی نہایت دلکش صنف ہے جہاں تک نقلی پیروڈی کا تعلق ہے۔ سو جیسے تشبیہ کو تیر تلوار سیکل کو کھانا بنا کر اپنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر پیروڈی کو برائے پیروڈی بنا دیا جائے تو غالباً ہم اس سے فوراً مانوس ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد حسن

پیروڈی سنجیدہ فن پاروں میں مضحک پہلوؤں کی تلاش ہے۔ یہ غلط پندار، گمراہ خودی اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت میں تناسب اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے بہت سے گروہوں، قوموں یا ادبی نسلوں کی مسیحائی ظریفانہ مزاج کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اور پیروڈی بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ ملا رموزی نے اس میدان کے بیشتر صاحب طرز شہسوار پیدا کیے ہیں۔ اور آج جب خود ستائی اپنی بات پر اڑنا اور دوسروں کی بات نہ سننا ہماری قومی کمزوری بنتا جا رہا ہے۔ طنز و مزاح کی شدید ضرورت ہے جو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا سکے۔

خوش مزاجی کا یہ معیار نہیں ہے کہ دوسروں پر ہنسا جائے۔ صحیح معیار یہ ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی اس آئینے میں دیکھا جائے اور ماتھے پر شکن نہ آنے پائے۔

شوکت تھانوی

ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ حالات ہی در اصل ان حالات کی پیروڈی ہیں جن سے کبھی ہم گذر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی جتنی بسر کرنا تھی وہ تو بسر کر چکے اب زندگی کی پیروڈی کر رہے ہیں۔ ان حالات میں جب انسان خود اپنا کارٹون بن گیا ہو اور جب اس کا اسلوب زندگی بجائے خود پیروڈی ہو اس کے پیچھے اسلوب زندگی کی اس سے کسی پیروڈی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ پیروڈی کرنا وہ فن ہے جس کا فنکار اگر جیل اور موت دونوں سے بچ گیا۔ تو خود اپنے ہی فن کا شاہکار بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی کسی کاوش پر نہیں بلکہ خود اسی پر دنیا ہنسنے لگتی ہے۔

کنھیالال کپور

میری دانست میں اردو ادب میں پیروڈی کی بہتات ہے قریب قریب ہر غزل، ہر مضمون، اچھی غزل، نظم، مضمون پر لکھی ہوئی پیروڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ پیروڈی مزاحیہ تنقید کی سب سے مشکل صنعت ہے۔ اچھی پیروڈی لکھنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے، نثر میں ڈاکٹر شفیق الرحمٰن شوکت تھانوی، کرشن چندر، منٹو اور فرقت نے چند اچھی پیروڈیاں لکھی ہیں نظم میں جعفری، مجید لاہوری نے پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کیے ہیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب ہمارے ادبا پیروڈی کی اہمیت محسوس کریں گے اور سلیقے سے پیروڈی لکھا کریں گے۔

فکر تونسوی

میری تھیوری یہ ہے کہ اچھا طنز نگار صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی شکل و صورت (بہ صورت پیروڈی) ۵ فیصدی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز ہو۔ جیسے برناڈ شا، چارلی چیپلن، شوکت تھانوی، کنھیالال کپور، فکر تونسوی اور .... اور بالکل یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات سوسائٹی کی بھونڈی، بھدی اور مضحکہ خیز چیزوں پر کراری طنز کر لیتے ہیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خدا نے کسی طنز نگار کو یوسف ثانی نہیں بنایا ورنہ یہ سوائے اپنی اپنی زلیخا کے اور کسی کام کے نہ رہتے آپ کا کیا خیال ہے[1]۔

ڈاکٹر قمر رئیس

ظرافت اور طنز کی ہیئت، ان کے محرکات اور تخلیقی عمل میں اتنے اوصاف مشترک ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک چیز ہے جو دونوں کے مابین ہمیشہ وجہ امتیاز رہتی ہے۔ اور وہ ان کا مقصد۔ ایک کا مقصد تضحیک ہے اور دوسرے کا تنقید۔ ظرافت ہمیں ہنسی یا لطف اندوزی کی ایک عارضی کیفیت دے کر اپنی تخلیق کا مقصد کھو بیٹھتی ہے۔ طنز اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار کر ہمیں زندگی کے کچھ حقائق کا ادراک بخشتا ہے پیروڈی کا سلسلۂ نسب طنز سے ملتا ہے۔ دونوں میں اگر کوئی بنیادی فرق ہے تو یہ کہ طنز اپنا موضوع اور مواد براہ راست (اور بالعموم) زندگی سے لیتا ہے۔ پیروڈی ادب اور فنون لطیفہ سے۔ ایک اہم وصف جو ظرافت، طنز اور پیروڈی تینوں میں برسرِ کار رہتا ہے۔ مزاح کا مقصد۔ یعنی ایک ایسا فنی اظہار جو قاری کے دل میں ہنسی کی کیفیت پیدا کر دے۔ میں یہاں مزاح کی فلسفیانہ تاویلوں میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ارسطو نے اسے جس طرح دریافت کیا ہے وہ اپنی لفظیت کے باوجود آج بھی ناقابل تردید ہے۔ اس کا یہ قول کہ وہی چیز ہنسی کی محرک ہو سکتی ہے۔ جو بدصورتی کا ایک ایسا جزو ہو جس کی کجی یا ناہمواری کسی طرح کی اذیت یا جراحت کا خاصہ نہ رکھتی ہو مزاح کے بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔

---

[1] شاید اس موقع پر ڈاکٹر شفیق الرحمٰن فکر تونسوی کی نظر میں نہیں ہے۔

۱۔ مزاح کا محرک کوئی ایسا بے تکا پن ہوتا ہے جس سے ہماری متانت اور جمالیات کو صدمہ پہنچتا ہے۔
۲۔ لیکن وہ بے تکا پن جس سے مزاح کی تخلیق اور ہنسی کی احساساتی کیفیت حرکت اور عمل میں آتی ہے ایسا ہرگز نہ ہو جو کسی انسان یا جاندار کے لیے جسمانی یا ذہنی اذیت کا باعث ہو رہا ہے۔

اس طرح ارسطو نے مزاح کو بظاہر اپنے اخلاقی آدرش کا لیکن فی الاصل ایک وسیع تر معنی میں اس کو انسان دوستی یا انسانی ہمدردی کے تابع کر دیا۔ پیروڈی کا خالق بھی اپنی مزاحیہ کیفیت میں اسی انسانی ہمدردی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور چونکہ طنز کی طرح اس کا مقصد بھی تنقید ہے اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ عنصر اس کے تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ موضوع کے اعتبار سے پیروڈی کا میدان طنز سے محدود اور مختصر ہے صحیح نہ ہوگا۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے مزاح جو دونوں میں ... اور مشترک حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری متانت کے احساس اور جمالیاتی تصور کی شکست و ریخت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ شعر و ادب جمالیاتی قدروں کا بہترین مظہر ہیں اس لیے اس محدود دائرے میں بھی قدم قدم پر سیکڑوں موضوعات پیروڈی لکھنے والے کی نگاہ کرم کے منتظر رہتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کا تنقیدی عمل طنز کی بہ نسبت کچھ پیچیدہ اور دشوار ہوتا ہے۔

طنز نگار زندگی کے ان بے شمار مظاہر میں سے کچھ ایسی بے تکی صورتیں اخذ کرتے جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں، اپنے مزاحیہ اسلوب میں ڈھالتا ہے اور اس طرح اس میں نشتر کی سی تیزی پیدا کر دیتا ہے۔ پیروڈی کا موضوع شعر و ادب کا کوئی خاص اسلوب، خاص میلان فکری یا فنی یا کوئی اہم ادبی شہپارہ ہوتا ہے۔ اور اس کی تنقید کا ہدف اس خاص اسلوب، میلان یا تخلیق کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اس لیے پیروڈی لکھنے والے کو طنز نگار کی ژرف نگاہی اور ہمدردی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا گہرا شعور اور فنی اسالیب کی واضح بصیرت بھی درکار ہوتی ہے۔ وہ پیروڈی کی فنی تکمیل میں جن دشوار راہوں سے گزرتا ہے اور جس طرح کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے اس کا اجمالی تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے:

۱۔ سب سے پہلے ان نمایاں کمزوریوں کی دریافت ـــــ یا ان کمزوریوں کا واضح ادراک جو نمایاں نہیں ہیں۔ لیکن جن کو وہ نمایاں کر کے پیش کرنا چاہتا ہے۔
۲۔ اپنے تخیل کو اس خاص اسلوب کے دائرے میں اسیر کر کے اس طرح مہمیز کرنا کہ اس کی تمام کمزوریاں ایک مضحک ہیئت میں سامنے آجائیں۔
۳۔ اور اس طرز عمل میں اس کا زاویہ نظر ہمدردانہ ہو۔ وہ تنقید کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتا ہو۔ بالفاظ دیگر اس کا مقصد اس مروجہ اسلوب کی اصلاح ہو اور اس کے نقائص کو ادب کے قارئین سے روشناس کرانا کہ وہ اسلوب اسی مرتبہ کا مستحق سمجھا جائے جس کا وہ اہل ہے۔

اس تجزیے سے پیروڈی کے کئی اوصاف واضح ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ پیروڈی لکھنے والا کسی خاص اسلوب یا فن پارہ کی خارجی ہیئت (Form) کی تقلید کرتے ہوئے اس کے مواد کو حسب ضرورت ایسی مبالغہ آرائی اور ایسے ظریفانہ پینترے سے پیش کرے کہ اس کا اصل جوہر مسخ ہو کر بھی پہچانا جا سکے۔ ایک مغربی نقاد نے بہت پتے کی بات کہی ہے اس کا قول ہے: "بہترین پیروڈی (اور یہ واقعہ ہے کہ بہترین پیروڈی خال خال ہی لکھی جاتی ہے) جو ہیئت کے ساتھ وفاداری لیکن مواد کے ساتھ عیاری کا سلوک اختیار کرتی ہے۔" مواد کے ساتھ یہی عیاری پیروڈی لکھنے والے کے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کے فکر و شعور کو بھی کچھ آزادی دیتی ہے۔ اور اس آزادی سے اگر وہ چاہے تو اپنے عہد کی بدلتی ہوئی قدروں اور معاشرتی حالات کو بھی تنقید و طنز کا موضوع بنا سکتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس خاص اسلوب یا فن پارہ کی ہیئت (Form) اور اس کے موڈ کے ساتھ پوری پوری وفاداری برتتا ہو گی جسے اس نے سامنے رکھا ہے۔ اس لیے کامیاب پیروڈی کا معیار قرار دیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر قاری خود پتہ لگائے کہ اس کے آئینے میں کس اسلوب یا کس فنکار کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ پیروڈی کا تنقیدی عمل ہر اعتبار سے ایک تخلیقی عمل ہوتا ہے۔ ایک نقاد نے اس پر بڑا زور دیا ہے وہ کہتا ہے:

"پیروڈی لکھنے والے کی تنقید کو تخلیق کا ہم مرتبہ ہونا چاہیے اس کا تخلیقی عمل ایک طرح کی تخیلی باز آفرینی ہو"

کہ پیروڈی بھی دوسرے فنون لطیفہ کی طرح فن وفکر اور جذبے کی توازن ہم آہنگی کا لطیفہ بنکر ہو۔

یہاں مناسب ہوگا کہ پیروڈی کی نشو و ساخت پر غور کرتے ہوئے محل و حدود پر بھی ایک نظر ڈال لیں لفظ پیروڈی دراصل ایک یونانی لفظ پیروڈیا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں Counter Song یا نغمۂ معکوس۔ پیروڈیا، قدیم یونان میں ایک ایسا گیت ہوتا تھا جو کسی گائے ہوئے سنجیدہ نغمے کی مقدس فضا اور اس کے سحر و اثر کے طلسم کو توڑنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ گویا یہ اس نغمہ کی اہمیت اور متانت کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ اس کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں۔ لیکن قیاس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا مقصد ان ہنگامی جذبات کی شورید گی اور جوش میں ایک توازن پیدا کرنا تھا جو کسی نغمے کی الاپوں سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں یا یہ کہیے کہ اس جذباتی شدت اور ہیجان میں ضبط و تنظیم پیدا کرنے کے لیے گایا جاتا تھا۔ اس کی یہ اصلاحی روح آج بھی برقرار رہے۔ اگرچہ موسیقی سے رزمیہ، پھر ڈرامہ اور پھر ادب کی دوسری اصناف تک آتے آتے اس کی نوعیت میں تغیر ہو گیا ہے۔ کیسلس کی ادبی قاموس میں پیروڈی کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ

" پیروڈی انتہا پسندی اور جارحانہ یورش کے خلاف ایک طرح کا اقدام تحفظ ہے اور سب سے بڑا تحفظ یہ ہماری حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کے سنگین بھرم کے خلاف ہے "

شاید اسی مطمح نظر کو سامنے رکھ کر بائرن اور سوئنبرن جیسے ممتاز اور صاحب طرز شاعروں نے خود اپنے فن کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ جو اپنے زمانے میں بے حد مقبول ہوئیں۔

یونان میں فنی حیثیت سے اس صنف کا موجد ارسطو نے Hagenon of Thegos کو مانا ہے اگرچہ (Marton) بھی اس کی اولیت کا دعویدار کہا جاتا ہے جس نے ہزاروں اشعار میں ہومر کی رزمیہ شاعری کی پیروڈی لکھی تھی۔ اس کے بعد (Hipponax) نے ایلیڈ کو ایک کامیاب پیروڈی کے آئینے میں پیش کیا۔ اس ابتدائی دور کی پیروڈی میں طنز نگارش کے ساتھ ساتھ تصانیف کی فکر نوعیت اور ان کے داخلی موڈ کو بھی تنقید و تضحیک کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اردو میں اس صنف کا تعارف براہ راست انگریزی کے اثر سے ہوا اور اگرچہ انگریزی میں اس کی روایت اور اس کے فن کا تصور وہی ہے جس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن وہاں بعض ذہین شاعروں اور ادیبوں نے اپنے بلند تر مقاصد کے حصول کے لیے ایسی اصناف کو بھی رواج دیا ہے جو اگرچہ پیروڈی کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لیکن کچھ اوصاف میں اس صنف سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں مثال کے طور پر Mock Epic یا ظریفانہ رزمیہ۔ اس میں شاعر کلاسیکی رزمیہ شاعری کی فنی نزاکتوں اس کی مخصوص بحر پر شکوہ انداز بیان مصنوعی مناعی اور اشخاص کے کارناموں کا مبالغہ آمیز بیان تمام اوصاف کی تقلید کرتا ہے۔ لیکن اس کا مواد وہ روزمرہ کی عام زندگی سے لیتا ہے۔ اس طرح عام انسانوں اور اونیٰ واقعات کو رزمیہ انداز کے اہتمام شان و شکوہ اور عظمت کے آئینے میں دکھا کر وہ قدم قدم پر ایک پر مزاح تضاد اور ظریفانہ صورت حال پیدا کرتا ہے۔ اس نوع کے ظریفانہ رزمیوں کے نقوش ہمیں پوپ کی زلفوں کی عصمت دری سے لیکر ایلیٹ کی " ویرانہ " تک ملتے ہیں۔ (یہ تسلیم کہ " ویرانہ " مزاح سے عاری ہے) دراصل ان نظموں کا مقصد رزمیہ کی تنقید نہیں بلکہ طنز کے پیرائے میں اپنے عہد کی زندگی کی تنقید ہے۔ اس لیے ان کا فن پیروڈی کے فن سے مشابہت کے باوجود بہت مختلف ہے۔

انگریزی ادب میں Isaac Hawkins Brown کو پیروڈی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے پوپ اور تھامپسن وغیرہ کے طرز نگارش کی پیروڈیاں لکھی تھیں۔ انیسویں صدی میں اس صنف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور سے نظم کی پیروڈی کو اس عہد کا شاید ہی کوئی صاحب طرز شاعر ہو جس کے اسلوب کا خاکہ نہ اڑایا گیا ہو یا جس نے اپنے ہم عصر شعراء کے بارے میں پیروڈی کے انداز کی نظمیں لکھی ہوں۔ شیلی نے ورڈس ورتھ کی مشہور نظم Peter Bell کی پیروڈی لکھ کر فطرت کے اس پجاری کے فن اور دلکشی کو ہلا کر رکھ دیا۔ سوئنبرن نے ٹینی سن کی شاہکار نظم In Memorium کی جو پیروڈی لکھی تھی اسے اپنے زمانے میں ٹینی سن کی نظم سے کم شہرت حاصل نہ تھی۔ اگر آپ کے ذہن میں ٹینی سن کے طرز خاص اور اس

نظم کا ایسا خاکہ بھی ہے تو آپ سوئنبرن کی پیروڈی کے ان مصرعوں سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

God whom we see not is.
And God who is not we see.
Fiddle, we know is diddle,
And diddle we take it, is dee

یہاں پیروڈی لکھنے والے نے الفاظ اور خیالات میں ایک خاص لوچ اور نکھار پیدا کر کے بائرن کی معنوی نزاکت اور بلندی کو جس طرح پستی دکھائی ہے اور ایک متوازن تخمینی مبالغہ آرائی سے جس طرح بائرن کے شاہکار کا خاکہ اڑایا ہے وہ اسی فن کا کمال ہے۔
انگریزی کے نثری ادب میں بھی پیروڈی کے بہت کامیاب نمونے ملتے ہیں۔ اس صدی میں جیمس جوائس نے اگر مبتذل انداز کے اخباری قصوں کو جو اس زمانے میں بہت مقبول تھے، پیروڈی کا موضوع بنایا تو اسٹیفن لیکاک نے جاسوسی قصوں کی ہیجان خیزی تجسس آفرینی اور مجرمانہ خوف و ہراس کی فضا کو اپنی پیروڈیوں کا ہدف بنایا۔ جیمس جوائس نے انگریزی نثر کے نمائندہ اسالیب کو بھی بڑی کامیابی سے پیروڈی کے قالب میں پیش کیا ہے اور اگر بغور دیکھا جائے تو ایک طرح جیمس جوائس کا عظیم ناول یولیسس بھی پیروڈی ہی ہے جس میں ایک طرف اس نے حقیقت نگاری کی روایت اور دوسری طرف رزمیہ قصوں کے کرداروں کی رفعت و عظمت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس ناول کے پیروڈی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت اس کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین نے اسے اس صدی کا سب سے بڑا پیروڈی نویس مانا ہے۔
بہر حال یہاں ہمارا مقصد انگریزی یا اردو پیروڈی کی تاریخ کا جائزہ لینا نہیں بلکہ اس صنف کے چند فنی پہلوؤں اس کی وسعت اور امکانات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ انگریزی میں اس ادبی روایت کی تعمیر و ترقی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہاں کے مشاہیر اور چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس طرح ان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری سے اس روایت کا نشو و نما ہوا۔
پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ معیاری پیروڈی کی تخلیق صرف اس فنکار کے بس کی بات ہے جو اپنی صلاحیتوں اور ذہن و ملک کے اعتبار سے اس ادیب سے کمتر نہ ہو جس کے فن یا اسلوب کو وہ پیروڈی کا موضوع بنا رہا ہو۔
اردو میں اس روایت کی بے مائیگی کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ہمارے مشاہیر نے اسے ہاتھ لگانا کسر شان سمجھا۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے ادیبوں نے اگر کبھی تفنن کے طور پر طبع آزمائی کی ہے تو اس کا فنی معیار ان کی ذہنی سطح سے بلند نہ ہو سکا یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب کا دامن اس روایت کے گلہائے گراں مایہ سے خالی نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں اس کی کوئی روایت نہ رہی ہو۔ غالب کی طرز بیدل والی غزلوں کی معاصر پیروڈیوں سے لیکر تہذیب الاخلاق کے اسالیب کی نقالی، اودھ پنچ کی پھکڑ فاکہ بازی، داستانوں کے قالب میں نئی زندگی کی مضمون طرازی ۔۔۔ پھر ظریفانہ اور ترقی پسند شعر و ادب کی پیروڈیوں تک اگر تلاش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اس صنف کا قابل قدر خزانہ مل سکتا ہے۔ لیکن بقول غالب ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ؟

(اسکالر)

دیوان افسر

قاضی عبدالودود

مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں ہے: "افسر غلام اشرف ولد غلام رسول کہ در مرثیہ و سلام اشرف تخلص میکند و در شعر افسر قرار دادہ۔ قوم شیخ، بزرگانش چودھری کارخانۂ بادشاہی بودہ اند۔ مشارٌ الیہ.. زیک دو سال فکر مرثیہ و سلام.. کردہ و میکند۔ در ایامیکہ مولف طرح مشاعرۂ افگندہ، دراں روز ہا بتر عنیب فقیر مجموعہ پنج غزل طرحی مشاعرہ گفتہ از نظر فقیر گذرانیدہ۔ طبعش مناسبت تمام بدرستی کلام دارد"۔ تذکرۂ مذکور کا زمانۂ آغاز او اخر ماہ دوازدہم ہے اور یہ ۱۲۰۹ھ میں انجام کو پہنچا؛ یہ فیصلہ کہ افسر کا ترجمہ کس سال حوالۂ قلم ہوا، مشکل ہے۔ افسر نے اپنے دیوان میں دو جگہ مصحفی کو یاد کیا ہے۔

جہاں میں مصحفی بائیس مدتیں کرکے رحلت کی	اے افسر مصحفی شاعر بڑا استاد کامل تھا

ردیف وکس کے غزل اپنی پڑھوں اے افسر	مصحفی سا کوئی محفل میں جو استاد نہ ہو

دیوان افسر میں مصحفی کی ایک غزل (مصرع ۱ "برق گلشن میں جو چمکی ترے رخساروں سے") کا مخمس ہے، اور ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ (مادۂ "مصحفی نے سجا مقام بہشت" ۱۲۴۰) افسر کا سال رحلت معلوم نہیں، لیکن، روشن الدولہ کی وزارت کے زمانے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہے۔ کتب خانۂ خدا بخش کا نسخۂ دیوان فی الحال ۱۰۹ اوراق (سطر ۱۵ اسطری، بعض صفحات سادہ) پر مشتمل ہے؛ ورق ا کے بعد کے بعض اوراق غائب ہیں۔ کاتب کا نام اور زمانۂ کتابت اس نسخہ میں درج نہیں، لیکن قرینہ ہے کہ افسر کے دوران حیات میں لکھا گیا تھا۔ دیوان کے کل مصرعوں کی مجموعی تعداد ۳۰۴۷۵ ہے۔ اس کا امکان ہے کہ اس میں دس پانچ کی غلطی ہو؛ مثنوی ۶۴۶، قصیدہ ۶۷۸، غزل ۳۵۹۲، ترکیب بند ۱۸۲، مخمس ۲۲۵، قطعہ ۲۴، رباعی دوبیتی قطعات جو دیوان میں زیر عنوان رباعی درج ہیں ۲۶۔ مثنویاں ۸ ہیں، پہلی میں ایک مہم انجام واقعہ نظم ہوا ہے، اس کی تاریخ تصنیف افسر نے "گشتۂ معشوق" ۱۲۴۱ھ سے نکالی ہے جو بیت ۹۳ میں ہے۔ ورق اب میں جو اس کے ۶ ابیات ہیں ان میں سے ۳ اور مثنوی کی بیت آخر حسب ذیل ہیں:

عطا کر یعنی سے اپنے الٰہی	مجھے ملک سخن کی بادشاہی
سکندر کا علم میرا علم کر	قلمرو سب ہے زیر قلم کر
وہ دے علم و ہنر کا تاج مجھ کو	کہ کیکاؤس بھیجے باج مجھ کو
بفیض روح مولانائے جامی	ملے اس مثنوی کو خوش کلامی

اس کے موجودہ ابیات کی تعداد ۴۰ ہے، اور اس کے ساتھ ایک رنگین تصویر بھی ہے۔ مثنوی دوم مناجات ہے (ابیات ۴۵)، بیت اول آخر

الٰہی ترا جز ہے ہر اک بسیط	تری ذات ہے کل شئی محیط
بس افسر سمند مناجات تھام	اجابت کا مالک ہے رب انام

اس مثنوی کا شعر ذیل ان کے شیعہ ہونے پر مشعر ہے:

بحق دو و چار معصوم پاک	مرا جسم کر گوہر تابناک

مثنوی سوم (ابیات ۴۴) کا عنوان "ڈھیلا و تیر" ڈکنا ہے اس میں ڈھیلے اور تیر کا مکالمہ ہے، بیت اول و آخر:

نہ ہے صنعت خاک آباد خلق	کیا جس نے ڈھیلے پہ ایجاد خلق
دلا ختم بس اب یہ تقریر کر	نہ اہل سماعت کو دلگیر کر

بلبل کی طرح آنسو ہر چشم سے رواں ہیں
گوروں نے ملکِ دل کا غارت کیا جزیرہ

دار فانی میں اگر شاہ زمن ہوں تو کیا
ایک دن چھوڑ کے میں رنگ محل جاؤں گا

خفتگانِ خواب مضطر ہی نظر آئے بخواب
مر مٹے پر بھی گیا ہرگز نہ دل کا اضطراب[1]

خالی نہیں فساد سے یہ ساتوں آسماں
اک اک کی ہیں بغل میں بھری فطرتیں ہزار

شاید صبا تری بو لائی چمن کے اندر
پھولے نہیں سماتے گل پیرہن کے اندر

باتیں کرے ہے غیر سے ایہام میں تو کیا
آگاہ سیمبر ہیں تری زرگری سے ہم

شام جدا تا صبح کریں ہم آہ تڑپ کر اور کہیں
بزم طرب میں جلوہ کناں وہ شوخ ستمگر اور کہیں

طرفہ چلن اے ساقی مہوش تو نے ہم سے نکالا ہے
شیشہ ہمیں خالی دکھلانا بھر کر ساغر اور کہیں

وعدہ وصل تو کرتے ہو ہم سے جان فدا ہے اور کہیں
زلفیں یاں سلجھاتے ہو بیٹھے دل الجھا ہے اور کہیں

خاکساروں سے ہو کیونکر اس ہر اطوار کو ربط
سخت مشکل ہے زمیں سے آسماں ملتا نہیں

رخصت چمن کی جب نہ ملے نو بہار میں
کیا دل لگے پھر اپنا بھلا اس دیار میں

فصل خزاں میں دیکھا نقشہ عجب چمن کا
نہ گل پہ بلبلوں کی شیریں مقالیاں ہیں

شور جنوں جہاں سے گم ہے برنگ عنقا
ویراں ہیں قید خانے زنجیر خالیاں ہیں

سوگند ہے صبا مجھے بلبل سے بات کی
کب میں نے اس چمن میں کسی گل سے بات کی

لکھنؤ سے اٹھ گیا وہ آصف الدولہ کہ لوگ
نام پر آتے تھے جس کی ہفت کشور سے چلے

جن کی خدمت میں بسر کرتے تھے اوقات کبھی
ان سے ہوتی نہیں اب اپنی ملاقات کبھی

کہتے تھے ہم کہ دل نہ لگا ایسے شخص سے
رکھتا ہے کوئی چشم وفا ایسے شخص سے

داغ رہتا نہ دو کوئی مہ کے مجھے جو لگنے سے
کلبۂ غم میں روشنی ہے مرے دل کے داغ سے

سبزۂ گلشن کیوں آنکھوں میں نشتر خار کا ہوتا ہے
ہجر میں کس گلرو کے اپنی بلبل زار کی ہوتا ہے

کوٹھیاں دل کی لٹیں دیکھیے اب کس کس کی
آج نیلام میں اک ماہ فرنگ آتا ہے

لوٹ لیتا ہے ملک استنبول
پان جب وہ صنم چباتا ہے

تڑپ کر شام سے بیمار تیرا صبح کرتا ہے
نہ پوچھا تو نے کیا صدمہ ترے دل پر گزرتا ہے

ترکیب بند عنوان "ہفت بند" مدح حضرت علی میں ہے، بیت اول جو افسر کے شیعہ غالی ہونے پر دال ہے:

السلام اے از ازل ہمنام رب العالمیں
دے امام اول و ہمتائے ختم المرسلیں

مخمس ۸ ہیں توسین میں بندوں کی تعداد اور مخمس کا مصرع سوم درج ہے۔ ۱۔ غزل افسر (۹ "ملک آفاق میں کوئی ایسا کئی") ۲۔ ایضاً (۱۵ "کچھ ہمارے درد سے آگاہ بطلیموس ہے") ۳۔ غزل مصحفی اس کا ذکر ہو چکا ہے، بند ۔ ۴۔ غزل سودا (۸ "ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے") ۵۔ ایضاً (۶ "بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا") ۶۔ ایضاً ("بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور" ۵) ۷۔ غزل میر (۱۰ "تا بمقدور انتظار کیا") ۸۔ ("خانۂ حسرت و غم ہو وطن غیبت کو" ۸)

مکاں اس نے نہ آقا ہی کے نوکر سے
باپ سے بیٹے لڑیں بیٹی لڑے مادر سے

تفرقے ایسے کیے فلک زن و شوہر سے
رام نے جس گھڑی سیتا کو نکالا گھر سے

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

[1] دیوان میں مرقوم ہے کہ یہ مصرع سعادت علی خاں کا ہے۔

مصطفیٰ زیدی
(اردو کا ایک بیباک نڈر اور طناز شاعر)

ڈاکٹر محمد باقر

آپ بھی ناراض ہوں گے اور شاید مصطفیٰ زیدی بھی کیوں کہ ان سطور (جنہیں لکھتے لکھتے میں ایک مضمون بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں) میں آپ کو ایک بھی تو ملکی اور غیر ملکی بڑا نام نظر نہیں آئے گا جس کی شاعری کا مقابلہ میں نے زیدی کے اشعار سے کیا ہو۔ حالانکہ زیدی کو پڑھتے ہوئے میرے صفحۂ ذہن پر معاصر شعراء کے ایسے درجنوں بت ابھرے جو زیدی کے اشعار سے ٹکر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے قلب و نظر کا تقاضا تھا کہ لذت کے اس احساس فراواں کو محفوظ رکھا جائے جو زیدی کے شعر پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جب زیدی کے اشعار کی لذیذ حکایت بیان ہو تو بات اس کے اشعار تک ہی محدود رہے لہٰذا آپ کو اس قسم کی تنقید و تحسین سے اگر پہلے سابقہ نہیں پڑا تو اب ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کی تنقید میرے علم میں اضافہ کرے گی۔

بات یوں ہوئی کہ مئی کی ایک سہانی شام کو غالباً ۱۹۵۹ء میں ہماری لٹریری یونین نے میونسپل لائبریری ہال میں حسب معمول ایک مشاعرہ کیا۔ میں بھی سامعین کی حیثیت سے مدعو تھا۔ ہال میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک میانہ قد وضع کا خوش پوش نوجوان چشمہ لگائے صدارت کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مقامی سب ڈویژن کے ہیڈ ہیں اور نام مصطفیٰ زیدی ہے۔ ابھی چند شاعروں نے اپنا کلام سنایا ہی تھا کہ صدر کسی اور مصروفیت کی وجہ سے جلسے سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے۔ لوگوں نے اصرار کیا۔ اپنا کلام سنائیے۔ مصطفیٰ زیدی صاحب نے اپنی ایک نظم کا حصہ پڑھ دیا۔ میں حیران ہو کر سن رہا تھا کہ اردو میں اس قسم کی نظم بھی لکھی جا رہی ہے! اسے میری ناواقفیت پر محمول کیجیے لیکن یہ حقیقت تھی کہ فارسی سے مستعار لئے گل و بلبل کے قصے سننے سنانے والی زبان میں پہلی دفعہ میں نے ایسے شعر سنے جن کی مثال مجھے پہلے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ لوگوں نے ہل من مزید کے نعرے تو بہت لگائے لیکن صدر یہ جا وہ جا کرسی خالی چھوڑ کر چل دیئے۔ اور میں ابھی اپنے تاثرات کو سمیٹ بھی نہ کر پایا تھا کہ ہجوم نے جو مشاعروں میں اکثر ہجوم ہی ہوتا ہے اس خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ مشاعرہ ہوتا رہا اور شاعر اور سامعین بے مزگی کا شکار ہوتے رہے۔ لیکن میں سارا وقت یہ سوچتا رہا کہ کاش مصطفیٰ زیدی صاحب کچھ دیر اور پڑھتے بلکہ صرف وہی پڑھتے رہتے تو محفل کتنی پر لطف ہوتی۔ اور پھر یہ کہہ کر دل کو تسکین دے لی کہ کبھی موقع ملا تو صرف مصطفیٰ زیدی کو سنیں گے۔ اس طرح کاش کاش ایک آرزو بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

زیدی صاحب کو سننے کی آرزو تو کئی سال تک پوری نہ ہوئی لیکن اب وقتاً فوقتاً ان کے اشعار مختلف جرائد میں نظر آنے لگے تو میں خاص انہماک سے ان کا مطالعہ کرتا۔ بلکہ بعض چیزوں کو بار بار پڑھتا کہ اس سے تفہیم و تحصیل لطف میں ہر بار کے مطالعہ سے اضافہ ہوتا۔ اور پھر ایک دن مجھے "روشنی" "شہر آذر" اور "موج مری صدف صدف" یعنی زیدی صاحب کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ یہ زیدی صاحب کا عطیہ تھا۔ جو ایک خط کے جواب میں مجھے ملا۔ پھر میری درخواست پر آپ نے زیر چاپ مجموعہ اشعار "گریبان" بھی مجھے بھجوا دیا۔ کہاں تو زیدی صاحب سے چند شعر سننے کی آرزو تھی اور کہاں کا کل زیدی کا ادب میرے سامنے تھا۔

معلوم ہوا کہ مصطفیٰ زیدی ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے خود اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ زیدی صاحب نے الٰہ آباد سے انگریزی کا ایم اے کیا۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔ پہلے اسلامیہ کالج کراچی اور پھر کچھ مدت پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان سول سروس میں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اب تک مختلف اداری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انہوں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کا طویل سفر کیا۔ یہ بتانا اس لیے ضروری ہے کیونکہ آپ کے اشعار کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر پیش خدمت ہوگا۔ مجھے اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے زیدی کا پہلا مجموعہ شعر "روشنی" کا دوسرا ایڈیشن میرے سامنے ہے جو غالباً ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں الٰہ آباد سے شائع

تھا۔ تازہ اشاعت میں کچھ ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب اس میں ۵۴ غزلیں اور نظمیں ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب ۴۵ء اور ۵۰ء کے درمیان کی تخلیق ہیں۔ زیدی کا اپنا خیال ہے کہ یہ طالب علمی کا زمانہ تھا جب محض تجربے کے لیے آدمی بڑی بڑی تحریکوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب متوقع باتیں غیر متوقع طور پر ہوتی رہتی ہیں اور جب نئے جذبات کی آہٹ سے سارا وجود سنسناتا رہتا ہے:

اک سرکش امنگ سینے میں	اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نرم عارضوں کے سائے میں	اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی	(روشنی ص - ۳۸)

یا یہ کہ :

دلِ ناداں نے چمکتی ہوئی تاریکی کو	اپنے معیار کی ظلمت کا اجالا سمجھا
ہائے وہ تشنگیٔ ذہن و تمنا جس نے	جب بھی صحرا پہ نظر کی اسے دریا سمجھا	(روشنی ص - ۵۷)

لیکن اس تشنگیٔ ذہن کے باوجود زیدی نے کبھی کبھی قلب و نظر میں وہ ہم آہنگی محسوس کی ہے کہ اسے اپنے محبوب شہکار کی بات کہتے ہی بنی ہے۔ اور اس کی تجسیم اس نے یوں کی ہے:

تیری نظروں میں روایات کی سلائیں ہیں	جیسے بچوں کی بتائی ہوئی بازار کی بات
جیسے پربت کی بلندی سے زمیں کے مینار	جیسے اک حلقۂ الحاد میں اوتار کی بات
تیرے لہجے کی کھنک تیری اداسی آنکھیں	جیسے اک ناؤ پہ اس دیس کی اس پار کی بات
جو نکتی صبح کی چہرے پہ خمار یک شب	چاندنی رات میں خیام کے اشعار کی بات
یوں ٹپکتی ہوئی چہرے پہ حیا کی تنویر	جیسے اقرار زدہ ہونٹوں پہ انکار کی بات
جیسے بکھرے ہوئے اشعار کی تخلیق کے وقت	ذہن شاعر میں خیالات کی رفتار کی بات
جس کو چھو بھی نہ سکے کوئی سمجھ بھی نہ سکے	اتنی نازک ہے ترے روپ ترے پیار کی بات

لکھ سکا کون سا ہومر ترے شہکار کی بات	(روشنی ص - ۳۰)

شیلے اور ہومر کو شہکار کی بات نہ لکھ سکنے کے قابل ہا کر بھی زیدی خود اس کی نہایت حسین و جمیل تفسیر پیش کر گیا ہے۔ اور یہی اس کی فنکاری کا کمال ہے۔ حسن کی بنیاد، روشنی سے لے کر گریبان، تک صرف خلوص پر رکھی گئی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے نہایت دیانتداری سے شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے جذبات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان جذبات کو قرطاس پر منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ باور نہ ہو تو اس نظم کو سن لیجیے۔ بات معمولی سی ہے۔ ہر محب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کہ محبوب التفات فراوان کے بعد کبھی کبھی بے اعتنائی اختیار کرتا ہے جیسے وہ محب کو جانتا ہی نہ تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ قدیم شعرا کے ہاں دن کو گریہ زاری اور رات کو اختر شماری ہوا کرتا تھا۔ اور قاری اس حادثے کی غم انگیز تفاصیل سنتے سنتے اکتا جاتا تھا لیکن زیدی کے ہاں یہ سانحہ صرف اس قسم کی حیرت اور تعجب پیدا کرتا ہے جو بالکل طبعی ہے۔ یہاں ان میں کبھی کبھی بیتے ہوئے دنوں کے التفات فراواں کی یاد کی کسک ضرور شامل ہو جاتی ہے اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اٹھتا ہے۔

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی	ورنہ اس راہ پہ ذرات ہیں پامال جمال
اس کی آنکھوں میں تھی انجان ستاروں کی تلاش	کھیلتے گھومتے گنگناتے بہاروں کی تلاش
بھرتے ڈوبتے خاموش اشاروں کی تلاش	آج آنکھوں میں تڑپ تھی نہ اشارا ساقی
اب تو یہ فکر بھی بیکار ہے یہ غم بھی فضول	کہ اسے مجھ سے بہر حد محبت بھی نہ تھی
کہ اس الجھن کا سبب کوئی رقابت بھی نہ تھی	آج تو اس کی نگاہوں میں حقارت بھی نہ تھی

آج تو مڑ کے بھی اس نے نہیں دیکھا ساقی	(روشنی ص ۸۱، ۸۳)

لیکن یہ انداز شکیب تو صرف اپنا دل بہلانے کے لیے تھا۔ اور اس عہد اور تہذیب پر تازیانے کے لیے جو اس سانحے پر بنیاد رکھتا ہے وہ نہ رقیب کے جو روانہ داری کا اٹل زیدی دہر عہد سے غافل نہیں بلکہ اس کی بڑا تفصیل رقیب کی زبان سے کہلواتا ہے۔

سنا تم نے زیدی کا کردار کیا ہے — ثنا خوانِ ابلیس و بد خواہ یزداں
وہ غمازِ پر دوشِ زنانہ جو دوشاں — وہ آوارہ گردِ رہِ زاہداں
وہ معروفِ طاعت گزاری لغزش — وہ محوِ سجودِ نگاراں رقصاں
وہ جس کا تکلم وہ جس کا ترنم — صدی خوانیِ کاروانِ حسیناں
سلگتا ہوا خود فریبی کا بادل — گرجتا ہوا ابرِ وحشت کا طوفاں
شاذوں میں دیکھا وہ مغلوب دیکھا — وہ جس کو حسیناں دو راتوں کو گریاں
کبھی انقلاب اور بغاوت کا شعلہ — کبھی دودِ گرمِ دلِ نازنیناں
نہ اندازِ حکمت نہ آثارِ دانش — فقط عکسِ رہواریِ مہ جبیناں
دلیری ہی ساکن نہ نغمہ ہی مدھم — فقط برق و آتش فقط ابرِ باراں
اسے کیا ثواب و اطاعت سے مطلب — وہ فخرِ صبوحی شہنشاہِ رنداں
یہی ہے تمہارے بخاری کا چیتا؟ — یہی ہے وہ سرکردۂ خوش جبیناں
یہی ہے وہ شہ پارۂ آلِ سید؟ — یہی ہے وہ تفسیرِ خونِ شہیداں

یہی ہے وہ پروردۂ ابرِ باراں؟

زیدی کے دوسرے مجموعے "شہر آذر" میں ۴۹ نظمیں اور ۲۰ غزلیں ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ گو زیدی کے بقول اس مجموعے میں جتنی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، میری نہیں ہیں بلکہ تیغ الہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے لیکن آخر انھیں علیحدہ ہونا پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا لیکن اس تخلص کے بغیر بھی گذر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں۔ آپ کو تو شاید اور بھی دقت ہو گی" (شہر آذر ص ۱۹)۔ اس مجموعے کی نظموں پر شاعر نے خود یہ تبصرہ کیا ہے کہ "ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔" اور یہ تبصرہ نہایت درست ہے۔ سوچ اور حس کرنے کا کامیاب تجربہ "تہذیب" کی مختصر سی نظم میں کیا گیا ہے۔

تہذیب

شہر میں غل تھا کہ بنگال کا ساحر آیا
مصر و یونان کے اہرام کا سیاحِ عظیم
چین و جاپان کے افکار کا ماہر آیا
ایک ٹیلے پہ مروّت کا نمونہ دیکھا
میں نے بھی دل کے تقاضوں سے پریشاں ہو کر
آخر اس ساحرِ طنّاز کا چہرہ دیکھا
کتنا مغرور تھا اس شخص کا مضبوط بدن
کتنا چالاک تبسم تھا جواں ہونٹوں پر
کیسے رہ رہ کے لپک جاتی تھی آنکھوں کی کرن

کتنا مرعوب تھا ہر فرد مری ملت کا
ڈرتے ڈرتے جو چھوا میں نے تو یہ راز کھلا
وہ فقط موم کا ایک خوف زدہ پتلا تھا

• نظم کے آخری تین مصرعوں میں وہ سب کچھ سما گیا ہے جو فکر شاعر نے تخلیق کیا ہے اور جسے چھونے کے بعد آپ اس تمثیل کی تمام تفاصیل کو محسوس کرنے لگتے ہیں اور شاعر کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سوچ تو ہم بھی یہی رہے تھے لیکن کہنے کی جرأت صرف تمہیں نصیب ہوئی ہے۔ مہذب آدمی تہذیب کی باتیں اسی انداز سے کیا کرتے ہیں جیسے زیدی نے اس نظم میں کی ہیں لیکن حوادث فکر کبھی کبھی شاعر کو اس ڈگر پر بھی لے آتی ہے جہاں وہ برملا کہنا شروع کر دیتا ہے :

آج کل رنگ و صباحت کی بہت قیمت ہے ۔۔۔ آج کل بشن و مسرت کی بہت قیمت ہے
مفلسی دھات کے سکون کو جنم دیتی ہے ۔۔۔ زندگی موت کے چکلوں کو جنم دیتی ہے
ردمیں تہذیب کے شعلوں سے جھلس جاتی ہیں ۔۔۔ کونپلیں ریل کے پہیوں میں کچل جاتی ہیں
قہقہے جلتے ہوئے گوشت کی بو دیتے ہیں ۔۔۔ اسپتالوں کو جراثیم نمو دیتے ہیں
خون بھی ملتا ہے ہوٹل میں رگ تاک کے ساتھ ۔۔۔ عمداً زہر دیا جاتا ہے خوراک کے ساتھ
اسی منڈی میں جہاں صاف کفن بکتا ہے ۔۔۔ جسم بکتے ہیں ادب بکتا ہے فن بکتا ہے
عشق پیسوں کی ترازو میں تلا کرتا ہے ۔۔۔ حسن تیزاب کی بوتل سے ڈھلا کرتا ہے (شہر آذر ص ۴۲)

زیدی کی یہ نظم ایک طویل آس انگیز شکوائیہ ہے لیکن انہی چند اشعار کو دیکھیے کہ ان میں کتنی تفاصیل آگئی ہیں اور ان تفاصیل کا کینوس کس قدر وسیع ہے۔ پھر اس کینوس پر آپ کو ہر طرف طنز و تنقید کے تیر و نشتر بھی چلتے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن میں نے اس نظم کو آس انگیز شکوائیہ کہا ہے۔ حزنیہ نہیں کہا کیونکہ خون انگیزی کی بجائے بات اس امید افزا ترغیب پر ختم ہوتی ہے :

آؤ ہم لوگ بھی ایک عزم سے اک ہمت سے ۔۔۔ اپنے بیتے ہوئے حالات کو ٹھکرا کے چلیں
اپنی فرسودہ روایات کو ٹھکرا کے چلیں ۔۔۔ وقت کی ریت پہ وہ نقش قدم چھوڑ چلیں
جن کی آنے والی نسلوں کو ضرورت ہوگی (شہر آذر ص ۴۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے حقیقت پسندی اور برملا گوئی زیدی کا خاصہ ہے۔ امن پسندی اور ان کی ترغیب دلانے والے : منظوم آپ نے کئی سنے ہوں گے، لیکن زیدی نے امن شکستگی کی جو بےمثال بھیانک تصویر کھینچی ہے اس کو سننے کے بعد آپ کے رونگٹے اگر کھڑے نہیں ہوتے تو جنگ سے نفرت ضرور پیدا ہوتی ہے۔

اگر کہیں پھر یہ آگ بھڑکی
تو اس کی زد سے ہماری تہذیب کی بہاریں نہ بچ سکیں گی
تمہیں تو یہ بات یاد ہوگی۔
کہ دوسری جنگ ہی میں پانی کے بدلے کیچڑ پیا گیا ہے
غذا کے بدلے سپاہیوں کو نجاستیں پھانکنی پڑی ہیں
ہزاروں مائیں جوان بچوں کے واسطے خون رو چکی ہیں
شکستگی بےبسی میں جوڑے کی پٹیاں چاٹنی پڑی ہیں
ضعیف باپوں کے تھرتھراتے ہوئے قدم سرد پڑ چکے ہیں

سہاگنوں کی نگاہ پر وہ بلا کی مایوسی کو ترس بچھا ہے
سسکتی بہنوں نے بھائیوں کو کفن پہنا کے جدا کیا ہے۔ (شہر آذر ص ۹۵)

یہ پچھلی جنگ کی داستان تھی۔ آئندہ کیا ہوگا۔ وہ بھی سن لیں:

اگر پھر اس بار جنگ ہوگی
تو آدمیت پچھلے بوٹوں کی ٹھوکروں سے لرز اٹھے گی
تمہارے گھر کے برآمدے میں جھلستی اینٹوں کے ڈھیر ہوں گے
تمہارے شوہر کا جسم بیسیوں گولیوں سے فگار ہوگا
تمہارے چہرے پہ دانتوں کے نیل ہوں گے لبوں پہ خراش ہوگی
تمہارے چولہے میں لکڑیوں کے عوض تمہارا بدن جلے گا
تمہاری اپنی زمیں جلے گی تمہارا اپنا وطن جلے گا (شہر آذر ص ۹۹)

اور پھر

یہ بات تم تک نہیں رہے گی
یہ زہر دھرتی کی ایک اک نس میں گھس کے ہر جڑ کو کاٹ دے گا
یہ زہر رگ رگ کو چاٹ لے گا
زمیں گیہوں نہیں جنے گی
کہ اس کے ہونٹوں پہ راکھ کے بھسے پپڑی جمی ہوئی ہے
ملوں میں کپڑا نہیں بنے گا
کہ ملیں گھمانے والوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں
ادب کا نام و نشاں نہ ہوگا
کہ درس گاہوں میں گدھ مدرس کی لاش سے خون پی رہے ہیں
کبھی تقدس نہیں رہے گا
کہ شاہراہوں پہ فوج کے روسیاہ کتے زنا کریں گے (شہر آذر ص ۹۹)

۱۹۸۰ء کا ذکر ہے میں حکومت پاکستان کی طرف سے دسمبر میں لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی نمائش کے لیے ایران اور ترکیہ سے نوادر مستعار لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میونک (جرمنی) میں کانگرۂ مستشرقین میں شرکت کروں۔ اگست ۸۰ کی ایک شام کو میں اور جمیل رضوی صاحب (جو اب مسٹر جسٹس جمیل حسین رضوی ہیں) میجر جنرل رضا صاحب سفیر کبیر پاکستان در ایران کے مکان پر تہران میں کھانے پر مدعو تھے کہ خبر ملی کہ ایک پاکستانی مجتبیٰ زیدی خراسان میں مشہد کے قریب موٹر کار کے حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ یہ انگلستان سے اپنی کار میں وطن واپس آ رہے تھے۔ ان کا سارا گھر ایک سبب سے ہو گیا۔ اس خبر سے ہمیں اور ہمارے میزبان کو بہت رنج ہوا اور تہران کے پاکستانی حلقوں میں کئی دن تک اس پر غم کا اظہار ہوتا رہا لیکن مصطفیٰ زیدی نے جب مجھے اپنے اشعار کا مجموعہ "موج مری صدف صدف" بھیجا جس کا انتساب انہوں نے اسی حادثے میں ہلاک ہونے والے بڑے بھائی کے نام سے کیا ہے تو اسے پڑھ کر پھر ایک دفعہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ نظم خلوص و صداقت کا ایک تابندہ نمونہ ہے۔

تم کہاں رہتے ہو اے ہم سے بچھڑنے والو
ہم تمہیں ڈھونڈنے جائیں تو ملو گے کہ نہیں
ماں کی ویران نگاہوں کی طرف دیکھو گے
بھائی آواز اگر دے تو سنو گے کہ نہیں

دشتِ غربت کے اجالے دن سے بھی جی ڈرتا ہے — کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے — تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا
ہم تو جس وقت بھی جس دن بھی پریشان ہوئے — تم نے آ کر ہمیں محفوظ کیا راہ دکھائی
اور جب تم پہ برا وقت پڑا اب ہم لوگ — جانے کس گھر میں کہاں سوئے ہوئے تھے بھائی

(۳)

ہم تری لاش کو کاندھا بھی نہ دینے آئے — ہم نے غربت میں تجھے زیرِ زمیں چھوڑ دیا
ہم نے اس ذیست میں بس ایک نگیں پایا تھا — کسی تربت میں وہی ایک نگیں چھوڑ دیا

رقت انگیزی صرف نالہ و شیون اور آہ و بکا سے سرانجام نہیں پاتی۔ اور انفرادی غم کو عالمگیر وسعت دینا ہر غمزدہ کے بس کی بات نہیں لیکن جب آپ ان سطور کو پڑھتے ہیں:

دشتِ غربت کے اجالے دن سے بھی جی ڈرتا ہے — کہ وہاں کوئی نہ مونس نہ سہارا ہوگا
ہم کہاں جشن میں شامل تھے جو کچھ سن نہ سکے — تم نے ان زخموں میں کس کس کو پکارا ہوگا

تو بھائی کے تلملاتے ہوئے دل کی تمام کیفیات آپ کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔

یہ ایک تعارفی جملہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ زیدی کا تیسرا مجموعہ کلام "موج مری صدف صدف" پہلی دفعہ فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اس مجموعے کی اکثر نظمیں قیامِ انگلستان یا سفرِ یورپ کے زمانے کی ہیں۔ یہ چند خاکے جن سے شاعر کے بقول ذہن کی ایک خاص فضا مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ فضا اس معصوم زندگی کی ہے جو ایک چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد کبھی اس پر تنقید کرتا ہے اور کبھی اس سے محظوظ ہوتا ہے لیکن اس میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا۔ یہ سب نظمیں وہ تاثرات ہیں جن کو ایک مخصوص جذبے کے ساتھ جذباتیت سے اوپر اٹھ کر نظم کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے کسی یورپی شہر کے ہنگامی کیف اکثر کو دیکھا ہے اور انھیں دیکھتے رہنے کے بعد ایک خاص قسم کے ذہنی دنیا میں بسایا ہے کچھ وہی لوگ "چیئرنگ کراس" کے ایک منظر پر ہنر اور ایک جذباتی بند کے تاثرات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ تاثرات ان کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں جن کا اثر تو غالباً ہر چشمِ ناظر قبول کرتی ہے۔ لیکن صفحۂ قرطاس پر تاثر کی حقیقی شدت کے ساتھ منتقل نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف شاعر، ادیب اور آرٹسٹ ہی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں اور زیدی اس نظم میں بیک وقت ان تمام فرائض سے عہدہ برآ ہوا ہے:

کوئی تم سے پوچھے —
ستاروں کی رونق، چراغوں کی قربت، شبستاں کے اسرار
کافی نہیں تھے
جو تم نے کسی طاقِ دل سے لرزتی ہوئی موم بتی کی لو
بھی چرا لی؟

کوئی ہم کو دیکھے —
سرِ رہگزر ایسے بیٹھے ہیں جیسے
کسی نے خدا بھی جو پوچھا تو اس سے بگڑ کر کہیں گے
یہ دیر و حرم تو نہیں، کعبہ و آستاں تو نہیں ہے
خدا کی زمیں ہے، رہِ عام ہے کوچۂ یار نامہرباں تو
نہیں ہے ——

یورپ کی پہلی سیاحت (در اصل آپ موز میں سفر کر رہے تھے) میں زیدی نے بعض ملکوں اور شہروں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جیسا کہ ہر سیاح کرتا ہے۔ لیکن اس مطالعہ سے زیدی کے جذبات میں جو ہیجان پیدا ہوا ہے وہ فلسفہ، نغمہ اور آرزو کا ایک سیلِ رواں بن کر بہہ نکلا ہے۔ جرمنی کی بات سنیے:

کتنے خوابوں کے طلسمات کی جنت ہے یہاں　　کون سا خواب ابھی پردۂ تقدیر میں ہے
خواب اس وقت کا جو وقت نہیں آ سکتا　　خواب اس وقت کا جس وقت کو آنا ہو گا
گیت جس میں لب و رخسار کے افسانے ہیں　　گیت جو خود بھی کبھی ایک فسانا ہو گا
جس کو چھیڑیں گے مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب　　جس کو بعد وقت کے آہنگ پہ گانا ہو گا

آگ کے دشت پڑے خون کے صحرا آئے　　اب بھی لیکن وہی رفتار رواں ہے کہ جو تھی
میونخ اب بھی ہر اک عہد کا روشن وارث　　ہائیڈل برگ وہ حکمت کی دکاں ہے کہ جو تھی

فرض کرتے ہیں تری مرگ ہی لوگ جنھیں　　خود نہ جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا شعور
تیرے ماتھے پہ نئے عہد نئے دن کی امنگ　　تیری آنکھوں میں چمکتے ہوئے مہتاب کا نور
وگنر کا یہ سنگ ساز یہ نزاد کے گیت　　تیرے سینے کی امنگیں تیرے بازو کا غرور

ہم پیمبر تو نہیں ہیں ترے دیوانے ہیں　　اک ذرا آگ ہمیں بھی ملے اے شعلۂ طور

جرمنی کا مقابلہ روضۂ شاہ شہیداں سے کیجیے۔ جس کے حضور میں شاعر کامل خشوع و خضوع کے ساتھ پہنچا ہے اور یہ دیکھ کر حیران ہے کہ ان قبروں کے مجاور اور یہاں کے منبر کے خطیب بھی ایران کے سلطانوں میں آنے والے زائرین سے فلس و دینار کا بھیک مانگنے کے سوا کار زارِ حیات میں اور کوئی مہم سر نہ کر سکے۔ اس کی حیرت ایک نوحے کی شکل اختیار کر لیتی ہے:

خیر تو رہ حرم کون و مکاں تک پہنچے　　کربلا تیرے یہ مجاور کہاں تک پہنچے
تیرے دیوانوں کو لے شاہِ شہیداں کی قسم　　اپنے مالک کی زمیں میں کیا ملتا ہے　　(موج مری صدف صدف ص ۹)

یورپ کی سیاحت کے بیان کے علاوہ اس مجموعے میں جو رومانی اور علامتی نظمیں شامل ہیں ان میں ایک وہ تصویر جلتی ہوئی دکھائی گئی ہے جسے چاہنے والے نے ایک عرصے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس تصویر کو دیا سلائی دکھا دینے سے لے کر راکھ ہوتے ہوتے دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے دل میں جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں ان کو بڑی چابکدستی سے رومانی انداز میں نظم کیا گیا ہے:

آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی　　جس سے بے نور خیالوں پہ چمک آتی تھی

اس جھنجلاہٹ کی جو حسین ترجمانی کی گئی ہے وہ بھی سن لیجیے:

الوداع اے مرے اس آخری پیکر کا طلسم　　نقشۂ رفتہ بنا زیست کی باتوں سے ہوا
دور اک کھیت پہ بادل کا ذرا سا ٹکڑا　　دھوپ کا ڈھیر ہوا دھوپ کی بالکی ہوا
اس کا پیار اس کا بدن اس کا مہکتا ہوا آنچل　　آگ کی تند ہوا اور ہانپی اک تصور سے ہوا　　(موج مری صدف صدف ص ۴۷)

اس مجموعے میں دو پر تاثیر علامتی منظومے "گواہی" اور "ایک سہرا" کے عنوانات سے شامل ہیں جن کا مطالعہ مفید ہو گا۔

زیدی کا پہلا مجموعۂ کلام "گریباں" کے نام سے زیرِ چاپ ہے، جس میں آپ کو تازہ ترین زیدی نظر آئے گا۔ اس کا خیال ہے "کہ ادب عالیہ اس طرح تو جنم نہیں لیتا کہ خواہ مخواہ رزمیہ لکھا جائے یا عشق و عاشقی کے ذکر سے ارادی گریز کے راستے اختیار کیے جائیں۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موضوع نکالنا اور تلاش عظیم کے بعد علامتیں وضع کرنا کوئی ایسی صحیح الدماغی کی بات نہیں" اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں اس نے وارداتِ قلب کو سیدھے سادے رومانی انداز میں بیان کردیا ہے۔

تو مری شمع دل و دیدہ

وہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کا بول — میرے دل میں تری آواز ابھر آتی ہے
تیرے ہی بال بکھر جاتے ہیں دیواروں پر — تیری ہی شکل کتابوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیار کا پرہول طلسم — تو ہے یا شہر طلسمات کی ننھی سی پری
ہر طرف سیل رواں، بس کا دھواں، ریل کا شور — ہر طرف تیرا خنک گام تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لیے چشم براہ — جیسے تو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پرچھائیں ہے یا تو ہے مرے کمرے میں — بلب کی تیز چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹھیک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے — دن گزرتا ہے ترا سایۂ ابرد لے کر
فلسفے تند حقایق کی شعاعیں ڈالیں — شام آتی ہے تری آنکھ کا جادو لے کر

لنگر انداز ہوں ساحل پہ مشینوں کے جہاز — رات ڈھل جاتی ہے مہکے ہوئے گیسو لے کر
میں اسی گیس کی دنیا میں تعفن کے قریب — شعر کہتا ہوں ترے جسم کی خوشبو لے کر

اور اس عشق و عاشقی کی بات کے ساتھ ساتھ شاعر خودنگری اور فلسفہ گری میں بھی مصروف ہے۔

مجھ کو محصور کیا ہے مری آگاہی نے — میں نہ آفاق کا پابند نہ دیواروں کا

میں نہ شبنم کا پرستار نہ انگاروں کا — نہ خلاؤں کا طلبگار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی بیٹھی ہے

اپنا سایہ بھی گریزاں ترا داماں بھی خفا — رات کا روپ بھی بیزار چراغاں بھی خفا
صبح یاراں بھی خفا شام غریباں بھی خفا — دزدایاں بھی خفا اور نگہباں بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے

ایک مبہم سی صدا گنبد افلاک میں ہے — تارے مایہ کسی دامن صد چاک میں ہے
ایک چھوٹی سی کرن مہر کے ادراک میں ہے — جاگ اے روح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے (گریباں کا قلمی نسخہ)

آخر میں ایک حسین منظر ملاحظہ ہو جس میں ہمہ فشار و احساسات کی تمام تفاصیل خوشگوار رومانی انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

ایز مہوش

شہر کی روشنیاں کہ مکمل آمادہ ہیں
نہ وہ ہوٹل کے دریچے نہ وہ بجلی کے ستون
نہ وہ اطراف نہ رفتار نہ گم نام سکون
ہر گھڑی ساعت پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے رینگ رہی ہوگی زمیں
کہیں پیڑوں کے مرکز کہیں سڑکوں کا غبار
تا کسے آہنی کھمبوں کی طرح راہ گزار
مختلف لوگوں کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
گرمشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے
اے مرے دل کے دھڑکنے سے بنا ہر فاصل
تیری صورت تری آواز بنی جاتی ہے
ہم سفر انجنیں گرم کیے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی جاتی ہے

زیدی کا قلم ابھی جوان ہے۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے لیکن اس کے اپنے بقول "گریباں" میں اس کی محبت کے پیچھے جو عورت ہے وہ نہ تو "شہر آذر" کی آسیا گردان بتول ہے اور نہ "موج مری صدف صدف" کی مریم تنہا نشین۔ اس موقع پر زیدی کی شاعری کے متعلق قطعی حکم لگانا درست نہ ہوگا صرف ایک امید ظاہر کی جا سکتی ہے کہ خلوص و سادہ نگاری جذبے کے ساتھ اور بڑھے گی اور پختہ ہوتی شاعری کی اس ہر کو مزید تابانی بخشے گی۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ یہ مضمون تحسین و تنقید و جمال کے پیمانے پر مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ صرف اس لذت فراواں کو مجتمع کرنے کے لیے جو زیدی کے کلام کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔

باغ و بہار کا ماخذ ـــ نوطرزِ مرصّع

سید ابوالخیر کشفی

نوطرز مرصع باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ باغ و بہار کا سر ورق اس حقیقت کا ثبوت ہے:

"باغ و بہار ــــ تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے۔ فارسی قصہ چہار درویش سے۔"

ہندوستان میں باغ و بہار کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ان میں اس عبارت کی غیر موجودگی نے بڑا ستم ڈھایا اور غلط فہمیوں کو میر امن کے مقدمے نے زیادہ مضبوط بنایا۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعے سے بجا طور پر اسی نتیجے پر پہنچے:

"باغ و بہار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصہ کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔ بعض مقامات پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی رکھ دیئے ہیں۔ جو نوطرزِ مرصع میں ہیں"

مولوی صاحب مرحوم نے ان دونوں کتابوں کے مشترک مقامات پر بڑی فاضلانہ بحث کی ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ میر امن نے نوطرز مرصع کو اپنے سامنے رکھا نہ کہ اصل فارسی کو۔ مولوی صاحب کا مقدمہ باغ و بہار کے مطالعہ کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس بحث کو دہرانا نہیں چاہتا۔

میں اس بحث میں بھی پڑنا نہیں چاہتا کہ اس فارسی کتاب کس کی تصنیف ہے۔ میرا تعلق تو باغ و بہار اور نوطرز مرصع کے باہمی تعلق سے ہے اور مجھے بیچارے تحسین سے ممتاز حسین صاحب کا یہ جملہ پڑھ کر خاصی ہمدردی ہو گئی ہے کہ "میر امن اور نوطرز مرصع کو اپنا ماخذ ٹھہرائیں۔ اردوے معلّٰی اس کا ایک جملہ تو درست ہے ہی نہیں۔"

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ نوطرز مرصع شمالی ہند کی پہلی اہم اور مکمل اردو تصنیف ہے۔ نوطرزِ مرصع میں وہ اسلوب کلبلاتا ہوا نظر آتا ہے جس نے میر امن کی باغ و بہار کے صفحات پر آنکھیں کھولیں اور صفحہ صفحہ ان کے ذہن اور زبان کی فضاؤں میں پرورش پاتا ہوا بالغ ہو گیا۔ اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" کے جذبہ کے تحت۔

دوستی میں ایک بات ممتاز صاحب سے بھی کہتا چلوں کہ حضرت! تحسین جیسے تھے سو تھے مگر ایسا بھی کیا کہ وہ مجھ سے اور آپ سے بھی بری نثر لکھتے۔

حاشیہ میں ممتاز صاحب نے تحسین کا ایک جملہ نقل کیا ہے سوچتا ہوں کہ میں بھی ممتاز صاحب کے مقدمۂ باغ و بہار کا ایک آدھ جملہ یہ کہتے ہوئے پیش کر دوں کہ ملاحظہ ہو:

"...... اس لیے صوفیانہ شاعری اور آمد جس میں داستان گوئی بھی شامل ہے۔ سبھالک ہوتا ہے، یعنی ایک ہی معنی میں تخصیص و تعمیم کے دونوں پہلو رکھتا ہے وہ اینگلو انڈین بیان تمیز خصوص سے باہر ہوتا ہے......"

اب تحسین ملاحظہ ہوں ...... "یہ قصہ محمد شاہی عہد میں موضوع یا مخترع نہیں ہوا" "نیرنگی روزگار کہ عنایت و بدائع پروردگار" کہاں تک نمونے پیش کروں۔ ممتاز صاحب "علمیت" اور "علمی موضوع" کی بنا پر ایسی اردو لکھنے پر مجبور تھے اور تحسین بھی ایسے ہی دوسرے علّت کے اسیر تھے۔

اس طویل جواب [illegible] کے لیے معافی چاہتا ہوں آپ سے بھی اور ممتاز صاحب سے بھی۔
فارسی قصے کے بارے میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میرے خیال میں قصہ چہار درویش نہ تو امیر خسرو کی تصنیف ہے اور نہ عہد محمد شاہی کی تخلیق۔

چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے اس موضوع پر مرحوم پروفیسر شیرانی بڑی تفصیل سے داد تحقیق دے چکے ہیں۔ لیکن انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی درست نہیں۔ چہار درویش حکیم محمد علی (مخاطب بہ معصوم علی خاں) کی تصنیف بھی نہیں ہے۔ خسرو کی تصنیف تو اس لیے نہیں ہے کہ اس میں دوربین کا تذکرہ ہے جو خسرو کے عہد میں ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں فارسی قصہ میں نظیری و عرفی کے اشعار بھی ہیں اور یہ شاعر خسرو کے بعد ہوئے۔ فارسی قصہ میں جن منصب داروں کے عہدے اور خطاب موجود ہیں وہ خطاب بھی عہد مغلیہ میں وضع ہوئے اور حکیم محمد علی کا دعویٰ یوں درست نہیں ہے کہ ان کے مخطوطے سے پہلے کا ایک نسخہ ۱۱۲۲ھ کا لکھا ہوا دستیاب ہو گیا ہے۔ حکیم محمد علی کا نسخہ ۱۱۳۲ھ میں مکمل ہوا فارسی قصہ چہار درویش عہد محمد شاہی سے پہلے لکھا گیا۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

ان چند باتوں کے بعد اب میں نوطرز مرصع کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے اس کا سال تصنیف ۱۱۹۵ھ بتایا اور بعد والے لوگ اسی سنہ کو دہراتے رہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نوطرز مرصع اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے نوطرز مرصع کے دیباچے میں ڈاکٹر گیان چند کے حوالے سے لکھا ہے کہ تحسین کی نوطرز مرصع کا ذکر سب سے پہلے مہر چند کھتری مہر کے "قصہ ملک محمد و گیتی افروز" میں ملتا ہے۔ یہ قصہ ۱۱۸۸ھ میں لکھا گیا تھا۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع ۱۱۹۵ھ سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ "انھیں دنوں میں عطا حسین خاں نے چہار درویش کا قصہ فارسی سے ہندی میں تضمین کرکے "نوطرز مرصع" نام رکھا۔ مولف نوطرز مرصع نے بطرز ریختہ زبان میں الفاظ دقیق اور عبارات رنگین موزوں کیا ہے۔ اس سبب سے مطبوع انگریزوں کے نہیں ہوا۔"

یہ اقتباس اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے نوطرز مرصع کے سبب تالیف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ نوطرز مرصع کے دیباچہ میں تحسین نے اپنے بارے میں اور اس کتاب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ جرنیل اسمتھ اس قصے کے محرک اول کا درجہ رکھتے ہیں۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کی پسندیدگی نے کتاب کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی۔ تحسین کی زندگی کا بڑا حصہ انگریزوں کے ساتھ اور ان کی نوکری میں گزرا۔ اس فسانہ کی ابتدا الہ آباد سے کلکتہ تک جرنیل اسمتھ کی معیت میں کشتی کے سفر میں ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس سفر کا سنہ اور تاریخ معلوم ہو جائے تو اس فسانہ کی ابتدا کی تاریخ کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" جلد ۴ (پنجاب یونیورسٹی) میں عماد السعادت کے حوالے سے اس سفر کی تاریخ دی گئی ہے۔

"والد کے انتقال کے بعد تحسین نے ۱۱۷۲ھ میں جنرل رچرڈ اسمتھ کی معیت میں الہ آباد سے کلکتہ تک دریائے گنگا کا سفر کیا۔
...... ۱۱۸۲ھ میں وہ فیض آباد کے ریذیڈنٹ کپتان ہارپر کی ملازمت میں تھے (عماد السعادت)"

ڈاکٹر سید سجاد مرحوم نے جنرل رچرڈ اسمتھ کے حالات کے متعلق بڑی تحقیقی کاوش کا ثبوت دیا ہے ان کی تحقیقات کے مطابق وہ دسمبر ۱۷۶۷ء میں جنرل بنایا گیا تھا اور ۱۷۷۰ء سے پہلے انگلستان واپس چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر سجاد مرحوم کی تحقیقات کے مطابق یہ کتاب ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ مکمل ہو چکی تھی۔ دائرۂ معارف اسلامیہ جلد ۴ کے مطابق اس کا سال تکمیل ۱۱۸۲ھ (۱۷۶۹ء) کے لگ بھگ ہے (قاموس الاعلام میں تحسین کا سال وفات ۱۲۳۲ھ دیا گیا ہے)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ڈاکٹر گل کرسٹ کے مقدمہ اور باغ و بہار کے سرورق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوطرز مرصع اس کا ماخذ و وسیلہ ہے۔ Lewis F. Smith نے ۱۸۱۳ء میں باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ شایع کیا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

" The Bagho-Bahar compiled by Meer Umman of Dhailvi from

Bantars Nerassa which was translated by Uta Hossain Khan

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ میر امن اور نوطرز مرصع کو اپنا ماخذ بنائیں۔ اے معاذ اللہ "فنی طور پر کوئی ناقص یا ناتمام نقش ایک بڑے فن کار کے لیے چیلنج ہوتا ہے۔ وہ اس زمین کو آسمان بنا دیتا ہے۔ نوطرز مرصع غالباً انگریزوں کو زبان اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی یہ اس مقصد کو پورا نہ کرتی تھی۔ میر امن نے اسے نئے قالب میں ڈھالا اور اس طرح کہ باغ و بہار جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ یہ بات میں سادگی و سلاست کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ سادہ اسلوب کا آغاز میر امن سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سید سبط حسن نے "ہم قلم" ستمبر یا اکتوبر ۶۲ء میں جدید اردو نثر کی پہلی کتاب پر تفصیل سے لکھا ہے۔

میں اس ضمن میں یہ عرض کروں گا کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش خود نوطرز مرصع میں موجود ہیں (اس کی تفصیل آگے آئے گی) میر امن کا کمال توازن کا آہنگ اور اسلوب میں نثر کے نئے امکانات کو اجاگر کرنا ہے۔ نثر کی شہزادی مدتوں سے تصنع کے بلوری صندوق میں بند تھی اور زندگی سے محروم ——— میر امن نے اس صندوق کے ڈھکنے کو اٹھایا نثر کی شہزادی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور وہ جاگ اٹھی۔ مدتوں کا طلسم بکھر گیا۔ یہ ہے باغ و بہار کی اہمیت۔

ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ سادگی و سلاست کے اولین نقوش نوطرز مرصع میں موجود ہیں۔ اور ان نقوش کی دھیمی روشنی نے میر امن کو ایک جہان نو کی تخلیق میں یقیناً مدد دی تھی۔ نورالحسن ہاشمی صاحب کی یہ رائے مجموعی طور پر درست نہیں ہے کہ "نوطرز مرصع میں یہی سطحی اور مصنوعی مرصع کاری ہر جگہ ملتی ہے۔ یہ سطحی اور مصنوعی مرصع کاری نوطرز مرصع کے ابتدائی صفحات میں جنس ارزاں کی طرح موجود ہے۔ مگر اس کتاب کے اختتامی حصوں کا انداز بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی حصے میں تحسین اور میر امن کے اسالیب کے درمیان دو دنیاؤں کا فرق ہے ملاحظہ ہو۔

"نوطرز مرصع"

اتفاقاً اس عرصہ میں نظر مبارک بادشاہ کی طرف ایک آئینہ کے مقابل مکان نشست گاہ کے نصب کیا تھا جا پڑی۔ جو سن شریف اس کا قریب پچاس سال کے پہنچا تھا وقت خشاوہ جمال مہر تمثال او معاینہ صورت حال اپنے کے دیکھتا کیا ہے کہ ایک دو سرے سفید درمیان داڑھی سیاہ کے مانند سہیل ستارے کے بیچ آخر شب تاریک کے کہ واقعی اس نشان کے تئیں ختم عمر کا کہتے ہیں۔ نمودار ہوا۔

"باغ و بہار"

ایک شیش محل میں نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ ایک بارگی آئینہ کی طرف جو خیال کرتے ہیں تو ایک سفید بال مونچھوں میں نظر آیا کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ شاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے

اس اقتباس سے تحسین کے روایتی اسلوب اور میر امن کی نثر تازہ کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کی افتاد طبع بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

میر امن "قصہ زمین بر سر زمین" کے قائل تھے۔ سفید بال ان کے یہاں تار مقیش کی طرح چمک رہا ہے اور تحسین کے ہاں سہیل ستارے کی طرح ——— پھر اپنے اختصار کے باوجود میر امن نے "نماز ادا کر کر وظیفہ پڑھتے" کے ٹکڑے سے آزاد بخت کے کردار کے ایک پہلو کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

تحسین کی اس سطحی اور مصنوعی مرصع کاری کے مزید نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلوب کے اس پہلو کو یاران طریقت مدتوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

"الفاظ دقیق ...... مہر چند کثری ہم"

"اس کی زبان فارسی ترکیبوں اور محاورات کی بہتات کی وجہ سے قابل اعتراض تھی جل کر سے لیکر متاز حسین صاحب کے

اسے معاذ اللہ ملکہ کہہ لیجیے۔ اب نوطرز مرصع میں اردو نثر کے تین دوسرے اقتباسات دیکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ اس میں کوئی جملہ درست ہے کہ نہیں:

(۱) "یہ سن کر زیر لب خندہ کیا اور کہا کہ اے دائی شاید تجھ کو نیند آتی ہے۔ اس نے از راہ عقل دریافت کر کے کہا کہ واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہنا چاہیے۔ وہ ملوث تاکہ کر اٹھی اور محل خواب گاہ میں جا کر سو رہی۔ ملکہ نے بعد ایک گھڑی کے پیالہ مانگا۔ میں نے بھر کر کے دیا جس وقت شراب پی کر پیالہ میرے تئیں دینے لگی میں نے بوسہ اوپر دست مبارک کے دیا اور پیروں پر پڑا۔ نازنین خشم سے ہاتھ جھاڑ کر کہا کہ اے جاہل! بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے"

(۲) "ایک مدت پیچھے سوداگروں نے ارادہ دریا اور ارادہ وطن کا کیا۔ اس وقت کو مجھ کو کہا کہ تو بھی تیاری کا اپنی کر۔ میں نے واسطے رفع تہمت کے کہا مگر کس سرمایہ پر ارادہ کروں۔ بقول آنکہ ادمی اوچی ہی کھانے۔ تب انھوں نے کہا کہ اس کفرستان میں کب تلک رہے گا؟ میں نے کہا خوب اگر تم ایسا ہی کہتے ہو تو ایک ہے اور ایک لونڈی اور ایک کتا اور ایک صندوقچہ ...... یہ کچھ بساط ہے میرے لائق جہاز میں جگہ مقرر کیجیو۔ میں شہر میں جا کے اور اسباب لا کے تمہارے ساتھ ہوتا ہوں"

(۳) "کہا کہ جب دختر وکیل مطلق بادشاہ کی ہوں۔ شب زفاف جب شوہر میرے کو درد قولنج نے ہلاک جان بحق ہوا۔ تو اپنی حقیقت کہ میں نے سرگزشت اپنی بیان کی اور اس ماہ روشن کے ساتھ ہم بستر ہوا اور خوش رہنے لگا۔ الغرض ہمراہ میں ایک مردہ آتا اور میں آمدہ پر متصرف ہوتا تھا۔ تا آنکہ وہ سرو جوبار خوبی کی حاملہ ہوئی اور ایک طفل تولد ہوا۔ کئی ماہ اور گزرے۔ فرح محبت و مودت کی ایسی پڑی کہ باہم بہ لہو لعب خوش رہتے تھے۔ ایک روز میں نے ہم خوابہ سے کہا کہ کوئی طرح گزاری کی اس قید فرنگ سے کیا چاہیے"

ان تینوں اقتباسات کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کو میر امن سے ہیٹا نہ پائیے گا۔ ملکہ کے کہنے پر کہ "شاید تجھے نیند آتی ہے" نوطرز مرصع میں دائی کس سلیقے سے کہتی ہے کہ "واقعی ملکہ کو صاحب کرامات کہا جائے" اور باغ و بہار میں دائی کا جواب یہ ہے کہ "ہاں مجھ پر خواب نے غلبہ کیا ہے" تحسین کا جملہ ہے: "اے جاہل بت بزرگ سے کیا بدی دیکھی کہ پرستش خدائے نادیدہ کی کرتا ہے" —— میر امن اسی بات کو یوں کہتے ہیں: "اے جاہل ہمارے بڑے بت میں کیا برائی دیکھی جو غائب خدا کی پرستش کرنے لگا؟"

دوسرے اقتباس کا مقابلہ باغ و بہار سے کیجیے تو تحسین کا اثر اسلوب اور بیان پر صاف صاف نظر آئے گا — "میرے پاس کیا ہے جو اپنے وطن کو جاؤں؟ یہی ایک لونڈی، ایک کتا، ایک صندوق بساط میں رکھتا ہوں۔ اگر تھوڑی سی جگہ بیٹھ رہنے کو دو اور اس کا قول مقرر کرو تو میری خاطر جمع ہو۔ میں بھی سوار ہوں"

میر امن کے یہاں ایک بیٹے کا تذکرہ نہیں ہے اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ اس ٹکڑے نے تحسین کے یہاں مخاطب کی بضاعتی کو کیسی دردمندی کی فضا دی گئی ہے۔

تیسرے اقتباس میں ہم خوابہ کیسی خوبصورت اور برمحل و مناسب ترکیب ہے۔ مردہ گھر میں تحسین نے دونوں کے تعلقات کو فطری تقاضوں کے تحت پیش کیا ہے۔

ان مضر خصوصات کی بنا پر میں یہ عرض کروں گا کہ نوطرز مرصع یقینی طور پر باغ و بہار کا ماخذ ہے۔ صرف کہانی کی حد تک نہیں بلکہ تحسین کے اسلوب بیان نے بھی میر امن کو راستہ دکھایا ہے اور جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میر امن نے اس زمین کو آسمان کر دیا۔ ویسے باغ و بہار، نوطرز مرصع، اور فارسی قصہ چہار درویش کے مطالعے سے یہ بات بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ میر امن نے فارسی قصہ کو بھی اپنے سامنے رکھا تھا اور کہیں کہیں ان کی ترتیب نوطرز مرصع سے مختلف اور اصل کے مطابق ہے۔ باغ و بہار میں آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کی کہانی دوسرے درویش کے قصے کے بعد ہے اور تحسین کے یہاں تیسرے درویش کی سیر کے بعد۔

باغ و بہار کا ادبی مرتبہ تو طرز مرصع سے کہیں بلند ہے باغ و بہار
یک زندہ کتاب ہے اور اس کتاب کی زندگی و پائندگی نے ہمیں تو طرز
رصع کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اکثر ادبی کارناموں کے ماخذ کم مرتبہ ہوتے
یں مگر ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ وہ ادبی شہ کاروں کی بنیاد بنتے
یں۔ حسرت کی شاعری میں رنگ کا جو احساس ہے وہ شاید مصحفی کے
ہرے مطالعہ کے بغیر یوں نہ ابھرتا۔ حسرت نے رنگ مصحفی کی تکمیل
ردی۔ شکسپیر کے بیشتر ڈرامے طبع زاد نہیں ہیں مگر وہ پرانی کہانیوں
کے اینٹ پتھر خاک و خون اور خام مواد سے ایک نئی دنیا کی تعمیر
رتا ہے۔ مثال کے طور پر ———

رومیو جولیٹ ———

ی کہانی بروس اتھیس کی کہانی کی ترقی یافتہ شکل ہے[1]۔ اس کے علاوہ
رومیو جیولیٹ کی رگوں میں قرون وسطیٰ کے ناکامی محبت کے کتنے
ہی افسانے خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔

طرز مرصع اور باغ و بہار کے سلسلے میں کہیں کہیں میرے
لہجے میں قدرے تیزی آگئی ہے۔ جسے میں زندگی کی علامت جانتا
ہوں۔ لیکن اگر آپ کہیں تو اس کے لیے میں معذرت بھی کر سکتا ہوں

---

[1] بحوالہ عزیز احمد — مقدمہ رومیو جیولیٹ

واجد علی شاہ کے زمانہ قیام کلکتہ کے بعض اہم حالات

امیر حسن نورانی

اودھ کے حکمراں نواب واجد علی شاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۶ء میں تخت و تاج سے محروم کر دیا تھا، وسط ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء کو شاہ موصوف اپنے متوسلین کے ساتھ کلکتہ پہنچے اور راجہ بردوان کے محل میں قیام کیا جسے پہلے ہی مولوی مسیح الزماں کے ذریعہ کرایہ پر حاصل کر لیا تھا۔ بعد میں مٹیا برج کے علاقہ میں بڑے بڑے محل، مکانات بنوائے، باغات لگوائے۔ بیس ہزار سے زیادہ ملازمین و متوسلین شاہ موصوف کے ساتھ رہتے تھے، یہ علاقہ لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا نمونہ نظر آتا تھا۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو واجد علی شاہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ کلکتہ کے اس طویل زمانہ قیام میں جو حالات و واقعات مٹیا برج میں پیش آئے ان کو ہندوستانی اور انگریز اہل قلم نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے تحریر کیا ہے۔ واجد علی شاہ کے حالات زندگی پر متعدد کتب موجود ہیں اور ان میں قیام کلکتہ کے حالات بھی درج ہیں۔ لیکن کچھ حالات و واقعات اس زمانہ کے اخبارات میں بھی نظر آتے ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے شائع ہوتے تھے۔ اودھ کے باشندوں کو خاص طور سے شاہ معزول کے حالات سے گہری دلچسپی تھی۔ اس لیے ان کے متعلق اہم اور غیر اہم خبریں شائع کرنے میں ہفتہ وار "اودھ اخبار" پیش پیش تھا۔ اور اس مقصد کے لیے منشی نولکشور مالک اخبار مذکور نے مٹیا برج کلکتہ میں اپنا ایک نامہ نگار مقرر کیا تھا۔ اسی لیے ہر ہفتہ واجد علی شاہ کے متعلق کوئی خبر شائع ہوتی تھی۔

اس وقت میرے پیش نظر "اودھ اخبار" مطبوعہ ۱۸۶۲ء کی مکمل فائل ہے اس کے مختلف نمبروں میں جو خاص خاص خبریں شائع ہوئی ہیں ان کو بجنسہ پیش کر رہا ہوں۔ ان خبروں کا تجزیہ کرنے سے شاہ اودھ کے سوانح نگاروں اور ان کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذوق کو کچھ نہ کچھ مواد مل سکتا ہے۔

"اودھ اخبار" کے ایڈیٹر کو شاہ اودھ سے ہمدردی ہو یا نہ ہو لیکن اخبار کا نقطہ نظر حکومت کی خوشنودی تھا اسی لیے کہیں کہیں اخبار کا لب و لہجہ اور انداز بیان طنزیہ نظر آتا ہے۔ میں نے جنوری ۱۸۶۲ء سے نومبر ۱۸۶۲ء تک شائع ہونے والی خبروں کو ترتیب وار نقل کیا ہے۔ ہر خبر کے سلسلہ میں وہی سرخی درج کی ہے جو ایڈیٹر "اودھ اخبار" نے قائم کی تھی۔ بعض الفاظ کا املا اس طرز سے مختلف ہے جو ابھی رائج ہے۔ جیسے روپیہ کو روپیا لکھا ہے۔ اس کو ناظرین کاتب کی غلطی نہ تصور کریں اخبار میں جس طرح تھا بجنسہ نقل کر دیا گیا ہے۔

شاہ معزول اودھ

معتمد ہمارے ناظرین اخبار کو شاہ اودھ کے حالات معلوم ہونے سے شاید خیالات گوناگوں گذرتے ہوں گے۔ اب اخبار حیدری مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۲ء میں انگلشمین سے لکھا ہے کہ شاہ معزول اودھ نے بہت سے مکانات مع زمین [illegible] متصل مٹیا برج باغ کے خریدے ہیں اور دس ہزار آدمی سوائے اپنے ملازموں کے وہاں بسائے یہ لوگ اکثر [illegible] تماشائی ہیں جواری [illegible] وغیرہ ہیں۔ جب یہ تمام کو کہیں جانے سے [illegible] یہاں [illegible] رات شب و روز استعمال عیوب کا [illegible] ہے [illegible] ان میں کتنے ہیں کہ کسی طرح سیاست کریں [illegible] سوائے ملامت کے [illegible] اس جگہ پناہ گیر ہو گئے ہیں [illegible] روپیہ قرض شاہ معزول پر ہو گیا ہے۔ اور خرچ اس قدر زیادہ کہ آئندہ کو قرض ملنا ممکن نہیں [illegible] صاحب پنشن کو [illegible] کرتے ہیں [illegible]۔ صاحب کمشنر کی تجویز ہے کہ ایک چوکی پولیس کی مٹیا برج باغ میں مقرر کی جاوے اور اس کا خرچ وہاں کے باشندوں سے وصول ہو۔ بالفعل دو سپاہی [illegible] وہاں رہتے ہیں مگر وہ حفاظت [illegible] نہیں کر سکتے ہیں ما حفاظ

ے بالکل نہیں لفٹنٹ گورنر نے نواب گورنر جنرل کو لکھا ہے کہ وہ شاہ مذکور کو ہدایت کریں کہ بدچلن اور بدوضع آدمیوں کو اپنے مکان
یں یہ بھی سنا گیا کہ ایک جماعت مفسدوں کی جو فسادِ ایام گزشتہ اودھ میں شامل اور ممد و معاون تھی اور معافی نامے کی رو سے
ہو گئی تھی سب آ کر اب پھر بادشاہ کے نوکر ہوئے ہیں ۔ فقط

احب اخبار حیدری نے جو کچھ کہ شاہ معزول اودھ کی نسبت تحریر فرمایا یہ تو ہزاروں میں سے ایک شمہ بھی نہیں ۔ اندنوں بضرورت بعض امور کے
اخبار کا کلکتہ گیا تھا جو کچھ لکھنؤ کے باہر سن سن کر خیال کرتا تھا کہ ع باطل است انچہ مدعی گوید ۔ وہ سب آنکھوں دیکھا متواتر سنا اور اُن
کے لاکھوں تعریفے حضرات رفقائے شاہ معزول اودھ اور خود حضرت شاہ کے دیکھے کہ ایسے امور لغو نالائق حرکات کا درج صحیفہ کرنا عار معلوم
ایک شمہ یہ ہے کہ حضرات رفقا نے حضرت اودھ کو ایک کٹھ پتلا بنا رکھا ہے جس طرف چاہا پھیر دیا ۔ صدہا فاحشہ عورات رذیل قوم کو پیشکش
بادسوخ ظاہر کرتے ہیں اور روز دس بیس محل کی شنع اور نکاح سے بھی بھرتی ہے ہوتی کھولے کے مقام گاہ میں حضرت کی وجہ سے روز زندانہ جلسے
حضرت شاہ کی مٹی کو خراب کرتے ہیں کسی نے کوتاہی نہیں کی لاکھوں روپیہ کھاگئے شاہ کے سر پر قرض اس قدر ہو گیا ہے کہ عمر بھر
نہیں وہاں کے سرخیل نالایقان ایک حضرت نے بادشاہ کو اس طرف اپنا مطیع کیا ہے کہ خود شاہ اودھ ہو رہا ہے وہاں کے بنگالیوں اور
موجی کھولے سے مکانات کرایہ لے کر بادشاہ کو دھوکا دیتے ہیں کہ حضرت سلامت یہ مکان مول لیا گیا اس قدر بیعہ چاہیے اسی طرح مکانات
وصول کر کے صرف کرایہ پر مالکوں سے اس مکان کو لیتے ہیں ۔ سوا اس کے عجیب عجیب حرکات نالایق ایسے مشہور ہیں کہ ہماری تحریر کی بنیاد
۔ راقم کلکتہ ہی میں تھا سنا کہ ۳ دسمبر کو ایک فہمائش نامہ جناب گورنر جنرل بہادر کشور ہند سے معرفت جناب میجر ربرٹ صاحب کے
معزول اودھ میں ارسال ہوا اس کے مضمون کا انتخاب یہ سنا گیا کہ خواب غفلت سے جاگیے ورنہ آپ کے ہاتھ پکڑ کر قید حرام کی جائیگی
جنرل بہادر کشور ہند تیری حرکات سے مطلع ہوئے ہیں ۔ تمہاری نالایق شکایتوں کو سن سن کر کانوں میں درد پیدا ہوا ۔ دل میں جگہ نہ تھی
تمہارے نالایق مصاحب جنہوں کی راہ بتانے والے ایک دن ستائیں گے ۔ اور نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند ایسا بھی فرماتے ہیں
یہ نالایق حضرات جو اکثر حضرت ہیں ان کو نواب لفٹنٹ ایسے کے ملازمان درگاہ خوب جانتے ہیں فقط ۔ اسی طرح بہت کچھ تاکید
کے شیاطین طینت جو حضرت کو راہ راست سے کوسوں دور رکھتے ہیں اُنکی روش کو خراب کرنے ہیں اکثر حضرات نے مشہور
کہ بہت روپیہ خرچ کر کے ایسا بندوبست کر لیا کہ بیشتر حالات گورنمنٹ کی منشا کے جلد ہو جاتے ہیں اور ہم اس کا تدارک
کر سکتے ہیں اس پہلے سے بھی لاکھوں روپیہ بنام نہاد رشوت کہ فلاں صاحب کو دیں گے ۔ فلاں صاحب نے وعدہ کیا ہے
خود لقمہ پر ہاتھ نہیں آتا قاسم قرضی پر تسک لکھوا کر جھوٹا قرض اپنا اپنا ٹھیرا لیا ہے اور شاہ کو اس قرضے سے دبائے ہوئے ہیں
خوف سے نہایت مضطرب رہتے ہیں ۔ ہمارے ایک عنایت فرمانے وعدہ کیا ہے کہ ہفتہ وار حضرت کے حالات سے مطلع کرتے رہینگے

(اودھ اخبار مطبوعہ ۸ جنوری ۱۸۶۱ء صفحہ ۲۶،۲۵)

شاہ اودھ

ودہ گزٹ سے معلوم ہوا کہ واجد علی شاہ شہر کلکتہ مقام مٹیا برج میں ایک بڑا مکان تعمیر کراتے ہیں اور کے وہاں مکان بنوانے سے
لہ رعایا کو بڑی تکلیف ہوئی ہے ۔ اور دوسرے کی تکلیف یہ ہوئی کہ کاشی پور میں جو بیعہ بیادہ نے مکان بنوایا وہاں کی رعایا کو بھی
یت ہوئی سرکار اس کو خیال فرمائے ۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۲۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۴۴)

شاہ اودھ

شاہ اودھ نے درخواست اپنی پنشن اور ضبطی ملک اودھ ۱۸۵۹ء تک دی صاحب آن اسٹیٹ انڈیا نے منظور نہ کی اور لکھا کہ

آج تک شاہ اودھ نے جو یل ملک انہیں تیس روپے کے مستحق نہیں۔ فقط (اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفحہ ۹)

شاہ اودھ

چونکہ حضرات والا جاہ شوکت کا جشن ہوچکی کلکتہ قیام گاہ حضرت شاہ اودھ میں جاؤ تھا اور اس وجہ سے اکثر حکام متعلقان سے شکایت بد وضعی کا حضور نواب گورنر جنرل بہادر پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ واسطے اصلاح بعض بعض خرابیوں کے میجر بہت صاحب ایجنٹ گورنر جنرل کا اجلاس ہوچکی کلکتہ میں ہوا کہ سکالہ اسی جگہ پر صاحب ممدوح تشریف رکھیں گے۔ ایک دارو غہ پولیس بھی مقرر ہو گئے ہیں چوری کثرت سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ اودھ کے دل افروز محل کے بطن مبارک سے دختر زہرہ جبین تولد ہوئی دایہ ہرکارہ وغیرہ خدمتگار کو خلعت عطا ہوئے۔ شاہ اودھ کو کمال ملال ہوا۔ کیونکہ حضرت نے جو تاج تولد فرزند اور اقبال سلطنت کے ہزار ہا روپے کا سامان مہیا فرمایا تھا مگر قسمت۔ (اودھ اخبار مطبوعہ ۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء صفحہ ۱۴۴)

"انتخابات اخبارات"

شاہ اودھ

چونکہ حضرات رفقاء وندما کی خیانت سے حضرت محتشم الیہ کا خزانہ ہر حال تباہ ہو چلا تھا ہر ایک شخص نے جو ذرہ بھی دخیل ہو گیا بادشاہ کو دھوکا دے کر لاکھوں کے قرض تمسک شہادت لکھوا لئے۔ اور پھر بادشاہ کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ غرض ایسی ایسی حرکات سے شاہ ششدر ہو گئے۔ اور بیشتر عدالت کے منہ لگانے ایک امر کی نگہداشت حفاظت تعظیم شاہ محتشم الیہ میں چنداں لحاظ نہ رہا۔ اگرچہ ان حضرات رفقاء وندما کی بے احتیاطیوں سے اس طبقہ بھر میں حمیت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اور یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سے مقدمات خفیفہ کے واسطے شاہ محتشم الیہ کے دستخطی مختار نامے کہ جن کے عنوان کی عبارت میں جیسی دیکھا ملکہ واجد علی سابق شاہ اودھ ہوا لخ) پھر ہمارے ناظرین اخبار ملاحظہ فرماویں کہ کہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی۔ ہر چند اکثر دل جلے یا صاحب دانش و فرہنگ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ جب تخت و بخت جاتا رہا تو پھر کونسی عزت باقی رہی۔ مگر نہیں یہ شاہ محتشم الیہ کے رفقاء و ندما کے حسن لیاقت کا اظہار ہے ورنہ قرنہا تک خاندان تیموریہ کے مراتب کی نگہداشت کیسی رہی اور کس داب سے زمانے کے اتفاق تک اتفاق کیا مگر چونکہ سرکار انگریزی کی ہر ایک امور میں جہاں بلند نظری کام کرتی ہے اس جگہ کچھ بھی ضرور نہیں ہے کہ کوئی درخواست ہی دے تو یاد امر جو جملہ سلطنت شاہنشاہی کہاں جاتا ہے۔ اندنوں بنظر حفاظت منزلت و مراتب شاہ اودھ کے ایک خاص قانون اجرا ہوا جس سے ہر عنوان سے شاہ محتشم الیہ کی حفاظت کی گویا ایک بڑی کا سایش اس ایکٹ کے جاری ہونے سے ہوئی اور وہ یہ ہے کہ اب کوئی قرضہ شاہ موصوف کو نہ دے گا۔ کیا معنی کہ جب قرض خواہ کا نہ عدالت جاتا رہا۔ تو پھر قرضے کے وصول کی تدبیر غیر بہتال مقام فکر کا ہے کہ جب کوئی قرضہ نہ دے گا تو پادشاہ اسراف بھی نہ کر سکیں گے۔ قیاس صورت میں یہ نتیجہ نکلا کہ اپنی زندگی بھر آسایش پائیں۔

ایکٹ نمبر ۸ سنہ ۱۸۶۲ء

ایکٹ برائے نگہداشت منزلت ذاتی شاہ اودھ

ہرگاہ بموجب اس اقرار کے جو کہ بجانب سرکار انگریزی شاہ اودھ سے کیا گیا تھا واسطے قایم رکھنے شاہ موصوف کی منزلت ذاتی کے یہ قرین مصلحت ہے کہ شاہ موصوف عدالت ہائے دیوانی اور محکمہ جات مال اور فوجداری کے اعلا اختیارات کسی قدر مستثنے ہوں لہذا حسب ذیل حکم ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۔ اندرونے دفعہ ہذا کے شاہ اودھ اختیار عدالتہائے فوجداری سے باہر قرار دیئے گئے ہیں۔ اور باہر ہیں مگر بجز ان جرموں کے جن کے واسطے بموجب مجموعہ تعزیرات ہند سزائے موت مقرر ہے اور لائق ہو کہ جرائم مذکورہ کے سوا کوئی عدالت جاری یا مجسٹریٹ اختیار کسی نالش کی تحقیقات کا بنام شاہ موصوف کے یا صدور کسی حکمنامے کا بنام انکے نہ رکھے گا۔

دفعہ ۲۔ کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر بلا اذن خاص کے شاہ موصوف کی گرفتاری کا اختیار نہ رکھے گا۔ اور کوئی افسر پولیس یا شخص دیگر عام اس سے کہ کسی وقت

کے اجرا کے واسطے مامور ہو یا نہ ہو مجاز نہ ہوگا کہ بغرض گرفتاری کسی شخص یا تلاشی کسی شئے کے ایسے مکان کے اندر جو کہ اس وقت مسکن شاہ موصوف ہو بغیر موجودگی اور اجازت اس عہدہ دار کے جو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے شاہ موصوف کے پاس بطور ایجنٹ مقرر کیا جاوے داخل ہو یا اس مسکن میں ٹھہرے۔

دفعہ ۳- اگر کوئی نالش یا اطلاع نسبت شاہ موصوف بابت کسی ایسے جرم کے جو جرائم متذکرہ دفعہ اول ایکٹ ہذا سے خارج ہو گذرے تو جو عہدہ دار کہ شاہ موصوف کے پاس بعہدہ ایجنٹ متعین ہو اُسے اجازت ہے کہ مقدمے کی تحقیقات کر کے کیفیت اس کی نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجے اور نواب محتشم الیہم با اجلاس کونسل بروقت پہنچنے اس کیفیت کے اس جرم کے تجویز کے واسطے کمیشن مقرر فرماویں اور اس کمیشن کو کوئی اختیار منجملہ اُن اختیارات کے جو کہ از روئے مجموعہ ضابطہ فوجداری کسی عدالت کو حاصل ہیں۔ اس باب میں عطا کریں۔ مگر ملحوظ رہے کہ در صورت ثبوت کے اہل کمیشن مذکور کو اختیار صدور حکم سزا کا نہ ہوگا۔ لیکن اپنی رائے سے نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کو مطلع کرنا چاہیے۔ کہ نواب محتشم الیہ درباب حراست ذات یا نیلام جائداد شاہ موصوف کے یعنی جیسا کہ بسبب صورت مقدمہ ضروری متصور ہو حکم صادر کریں گے۔

دفعہ ۴- کوئی رٹ یا حکمنامہ نسبت ذات یا مال یا جائداد شاہ موصوف کے کسی عدالت دیوانی یا محکمہ مال و فوجداری سے کسی وقت صادر اور عمل پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ الا اس صورت میں کہ اسکی بابت پیشتر منظوری نواب گورنر جنرل بہادر اجلاس کونسل کی حاصل کر کے منگائی گئی ہو اور وہ منظوری مصدق بدستخط سکرٹری گورنمنٹ مند ہو۔ اور جو رٹ یا حکمنامہ بلا حصول ایسی منظوری کے شاہ موصوف کی ذات یا مال یا جائداد پر کسی وقت صادر یا عمل پذیر ہو وہ بالکل باطل اور ناجائز ہوگا۔

دفعہ ۵- شاہ موصوف کسی عدالت میں یا روبرو کسی اہل کمیشن کے جو کسی عدالت سے مقرر ہو واسطے دینے اظہار یا اظہار حلفی کے جب کہ وہ کسی مقدمے یا کارروائی مرجوعہ عدالت دیوانی یا محکمۂ مال فوجداری میں مطلوب ہو اصالتاً بطور گواہ حاضر نہ کرائے جاویں گے۔

دفعہ ۶- درصورتیکہ شہادت شاہ موصوف کی ایسے مقدمے یا کارروائی میں مطلوب ہو تو عدالت یا وہ شخص جو چاہتا ہو سوالات تحریری واسطے اظہار شاہ موصوف کے مرتب کرے اور جو مقدمہ یا کارروائی اس قسم کی ہو کہ کوئی فریق ثانی قانوناً مستحق سوالات تردیدی کا ہو تو وہ بھی مجاز طیار کرنے سوالات تردیدی کا ہوگا۔ اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی ایجنٹ حاضر باش شاہ موصوف کے پاس بھیجے جاویں گے اور وہ اُنہیں شاہ موصوف کو دکھلائے گا۔ اور اُن کے جوابات باقرار صالح قلمبند کرے گا۔ بعد ازاں سوالات مذکور اور اگر سوالات تردیدی ہوں تو وہ بھی مع جوابات کے اُسی عدالت میں واپس بھیجے جائیں گے کہ جس میں مقدمہ یا کارروائی مذکور دائر ہو اور اس کے ساتھ ایجنٹ مذکور اپنا سارٹیفکٹ بایں مضمون کہ جوابات حسب ضابطہ لیے گئے ہیں معطوف کرے گا۔

دفعہ ۷- جس وقت کہ نسبت اظہار حلفی کے شاہ موصوف کا حلف کسی مقدمے یا کارروائی میں لینا مطلوب ہو تو وہ اظہار اور حلف روبرو ایجنٹ مذکور کے لیا جائے گا۔ اور ایجنٹ مذکور اس اظہار کو مع سارٹیفکٹ اس امر کے کہ اس کی نسبت حلف حسب ضابطہ کیا گیا اس عدالت یا حاکم کے پاس جس کے روبرو مستغیث ہونے والا ہو گا بھیج دے گا۔

دفعہ ۸- جس وقت شاہ موصوف سے سوالات کے جواب یا حلف نسبت کسی اظہار کے حسب احکام ایکٹ ہذا لیا جاتا ہو کوئی دوسرا شخص بجز ایجنٹ مذکور الصدر کے سوائے اس صورت کے کہ خود شاہ موصوف اجازت دیں مجاز حاضر ہونے کا نہ ہوگا۔

دفعہ ۹- جواب سوالات کے یا اظہار حلفی شاہ موصوف کا جو کہ بموجب احکام ایکٹ ہذا قلمبند ہوئے ہوں یا جس کی نسبت حلف کیا گیا ہو بطور شہادت منظور ہوں گے۔ مگر جو اعتراضات کہ جوابات یا حلف مذکور کی نسبت سر اجلاس عدالت یا معرفت کمیشن کے ہو سکتے صورت میں ہوتے وہی صورت متذکرہ بالا میں بھی ہو سکیں گے۔

دفعہ ۱۰- ایکٹ ہذا بحیات شاہ موصوف کے نافذ رہے گا۔ فقط۔		(اودھ اخبار مطبوعہ، مئی ۱۸۶۶ء صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴)

ملازم شاہی میں کئی بڑے آدمی ایسے ہیں جنکا حکم سرکار سے اخراج کا ہے مگر حیلہ حوالے سے ابتک شاہ کا پیچھا نہیں چھوڑتے دہی بر باد اور بنام کرتے ہیں اونکی بد وضعی بد معاملگی اور باشی ننگ حرامی زمین سے آسمان تک روشن ہے وہ بھی مردود و مخروج ہوں غرض شاہ کو ایک ایسا مسہل دیا جائے جس سے یہ سب سدے دور ہو جاویں جب تو مرض کہنہ کو شفا ہو گی ورنہ نیم حکیم خطرۂ جان ہے۔

ساتھ اس کے علاوہ باہر کے قرضخواہوں کے شاہ کا حساب لاکھوں روپیہ کے مال خانے اور توشہ خانے اور نقد و جنس وغیرہ کا جو اونکی اہالی سے متعلق ہے بحضور کمپنی، صاحب ایجنٹ وغیرہ اونسے سمجھا جاوے (بیماری کا جو ہاجب ٹھنڈا اور خوش مزا شفاف پارہ دیکھ کر پی جاتا ہے پھر اس سے ہلا نہیں جاتا) غرض مال مست لوگ کھا کھا کر ایسے بھاری ہو گئے ہیں کہ مثل قارون کے زمین کے میخ ہو گئے۔ نکالے سے بھی نہیں نکلتے شاید نیچے سے سرنگ لگے تو اوڑ جاویں مگر کھایا پیا سب خاک میں مل جاوے گا۔ چاہیئے کہ پہلے اونکا حال قال ہو یا بدنما سنبھال لیا جاوے ہند کے باشندوں کا تو خیریت سے کہیں زمین کے پردے پر کھوج بھی مل جاویگا۔ اور جو حال کے مچھلی ہے وہ اگر کہیں کشمیر کے ڈل میں غوطہ لگا کر سوت کھینچ گئی تو ہزار ہا مانجھی جال ڈالیں اور نہایو اور دہیان سو پکاریں مگر خبر بھی نہ ملے گی خبر شرط ہے۔

(تنبیہ) اب ایک اندیشہ باقی رہا کہیں گیہوں کے ساتھ گھن نہ پس جاوے یا قلیے کے ساتھ کوئی گوشت کا ٹکڑا اجان کر شلغم نہ کھا جاوے اس واسطے ہم سب اصحاب کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس حساب کتاب اور تغلب اور مدد میں کہیں بیچارے منشی صفدر صاحب کا کچھ روپیا یا حساب کتاب جو قریب ۲۰ لاکھ وہ انجاز مرشام کے بتاتے ہیں نہ مارا جاوے راے صاحب اودھ اخبار میں ایک سوال کے جواب میں بڑے ششش پنج میں ہوں یعنی ایک بزرگ مجھ سے صیافت خزانہ پر کرلا معلوم تو بے زبان ہیں۔ یہ منشی صفدر صاحب لسان السلطان کہاں سے ہو گئے آپ بڑے زبان آور ہیں اور سائل زبان دراز اب براہ زبان دانی ضرور ایک جواب دندان شکن ایسا دیجیے کہ زبان بند ہو جائے اور پھر سوال سائل زبان پر نہ آئے جراحات السنان لہا التیام ! ولا یلتیام ما جرح اللسان تا لوگ آپ کو مجیب کہیں اور جواب کو عجیب آمین یا مجیب الدعوات آمین !

چند اصحاب یہ بھی متفسر ہیں کہ منشی صاحب بے نشان لا مکان تھے صرف سہرے کے نواب منور الدولہ کے نوکر سے اونکی بدولت دربار شاہ تک راہ پائی اور کوئی کارندہ نہ تھا ذو الفقار الدولہ کی ناکاروائی اور کاہلی نے انکو محیط اور مختار یا نتہ کر دیا وہ بیگ بنے وہ کون تھے یہ حساب لاکھوں کے آدمی کہاں سے ہو گئے۔ جن کا ۲۰ لاکھ بادشاہ پر فاضل ہے جس کے وہ شاہ سے دعو یدار ہیں اور جنکو کٹھی اور نوٹ شاہی اپنے نام سے ہے اور عدالت میں آپ کو سوداگر لکھاتے ہیں نام ملازمت شاہی سے یہ مایہ ہے انکے پاس یہ دولت کہاں سے آئی کشمیر کے سوداگر اعلیٰ تو پشمینے کے ہیں اور اونی پشمینہ بات اور سب پوستفروش یا کاتب یا ماہیگیر یا قلی اس سرد ملک سے اگر ایک وقت کھانے کو ملے تب بھی باہر نہیں آتے۔ منشی صاحب یا انکے بزرگ کس چیز کے سوداگر تھے ایک سوداگر کا اور فرد بھی ہے جو کابل ایران لاہور شملہ کلکتہ تک ہوتی ہے۔ سبحان اللہ دولت حسن ایک کیا چیز ہے ہم اس کے جواب سے بھی قاصر ہیں۔ عقل کام نہیں کرتی مگر ہم اس قدر رائے دیتے کہ منشی صاحب یہ کہدیں کہ ہم نے منور الدولہ سے نیک صرف کیا تھا اور پھر چیک سے نوکر بیٹھ رہیا ورنہ کشمیر سے گئے تو دہاں علداری جیسی بیدار مغز کی ہے ظاہر ہے وہ نہ ہو کر کے زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔

پھر ایسے لاؤں تہ لکھے کا صفات کشا ہوگی وفاداری اور شرافت اور خوبیوں کی ایک کتاب منشی صاحب نے تالیف کی ہے خدا وہ صحیفہ ہم پر نازل کر دے تو ہم بے نقط تفسیر اس کی لکھیں جس سے سب کو عبرت ہو اور حیرت کہ من غضب مے نفعنا ہم الیس بے وفا ما فقد

راقم کلمۃ الخیر　　(اودھ اخبار مطبوعہ ۲۳ جون ۱۸۶۳ء صفحہ ۳۷۵ تا ۳۷۶)

کوائف شاہ اودھ

نامہ نگاران اخبار نامہ اودھ کا ئیز مقام مٹیا برج کلکتہ سے ایسا لکھتے ہیں کہ یہ سراپا نیاز عرصہ دراز ہوا کہ آپ کی طرف سے اس بات کا مجاز ہے کہ گاہ گاہ بارگاہ سلطانی کے اخبار کہ سلطان الاخبار ہے آپ کی خدمت میں لکھا کروں مگر کثرت کار و ہجوم افکار سے فقط

دشوار ہے اور جھگڑا برابر جاری رہتا ہے یہ سلسلہ مسلسل جاری ہیں امید کہ شرف قبول پائے اور آپ کے پرچہ اخبار میں چھپ جائے۔ کئی سال سے یہ کلکتہ والے یہاں کا حال بھی منوال دیکھتا ہے کہ بہت سے دولت جمع ہو کر کچھ یہاں کچھ تو لے کر بسے ہیں اور دولت خانہ سلطانی کو خالی کر کر اپنا گھر بھرتے ہیں۔ انھیں کارندوں کے کرواسے یہ سرکار عالی وقار گورنمنٹ انگلشیہ کے دربار میں غیر منتظم اور غفلت شعار ٹھہرائی گئی اور ایک عالم میں اس سلطان عالم کی بدنامی ہوئی خلق نے ناحق اس شاہ بیگناہ کو بدنام کیا اور ان کو جھوٹا ان کو الزام دیا ان پر الزام اس وقت لاکلام ہوتا کہ ان کا کوئی حکم باعث خلل انتظام ہوتا سو حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر کام کا انتظام اس کارخانہ کے مدار المہام کے ید اقتدار میں دیا ہے اور اپنے کو اس کے غیر و شر سے بری کیا ہے کسی طرح کا دیا لینا اپنے ذمہ نہیں لیا ہے اور کسی تمسک اقرارنامے یا حسابات کارخانجات پر دستخط نہیں کرتے ہم ان کو غافل تب کہتے کہ قبالجات بغیر دیکھے اور پر امیسری نوٹوں کا معاملہ بے تصفیہ بھی چھوڑ دیتے اس کا تصریح یوں ہے کہ بادشاہ نے کئی ملکہ دو چھلے لینے کارندوں کو حوالے فرمائے۔ کہ کئی قطعہ مکان بنام جنگان عالیشان سلطان مول لیے ہیں اور قبالجات داخل خزانہ سلطانی کر دیں یہ مکان کارندگان خوش اطوار کے کردار سلیقے کہ چند کوٹھیاں تو خرید بھی ہو قبالجات اور بکو دے کے نام لکھوا لیے اور بادشاہ سے یہ کہہ دیا کہ پیر و مرشد قاسم زادے حسب فرمان واجب الاذعان مکان مول لیا اور فلان شاہی کا اس پر تصفیہ کر دیا باقی رہا قبالجات سو بعض ضروریات کے سبب جنس کے ہاتھ میں ہیں۔ اب یہاں ہوشیاری و دانش شعاری اس بادشاہ خجستہ اختر مروت پیکر کی سنئے کہ اس وقت کثرت مروت اور شدت [illegible] سے چپ رہ گئے اور بے بنکر درگزر فرمایا اور ایک عرصہ دراز تک خاموش رہ کر رنگ دیکھا کئے آخر جب دیکھا کہ یہ لوگ تمام ہضم ہی کرنے کی فکر میں ہیں تب کئی بار بطور [illegible] ان قبالجات کو پوچھا [illegible] کا ذکر کیا مگر انہوں نے ٹال مٹول [illegible] کے طریقے سے سمجھا دیا اور ایک پرزہ نہ دیا تب تو بادشاہ نے تنگ ہو کر [illegible] قبالجات کو جو اپنے نام کر لیے اور نوٹ جو موجود تھے وہ لے لیے جو مدت [illegible] سلطان عالم کے بک گئے وہ واپس ملنے والے ہیں اب دیکھیے کہ یہ ہوشیاری ہے یا غفلت شعاری بیدار مغزی ہے یا ناتجربہ کاری۔ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے بمقتضائے اتحاد اور اسی وجہ بیدار مغزی سے بادشاہ کو مواخذہ دیوانی و فوجداری سے بری الذمہ کیا کہ جی کھول کے ایسے معاملات کارندوں سے سمجھ لیں لیکن مفصل معلوم نہیں کہ اصلاح ان امور میں کون کارندہ فدویہ خیر خواہی ہوا۔ آئندہ جو دریافت ہو گا عرض کریں گے فقط

دور بیں

(اردو اخبار مطبوعہ ۲۵ جون سنہ ۱۲۶۳ء صفحہ ۴۲۵)

دیوان افسر — بقیہ صفحہ ۱۳

جوگی ابلیس نے آکر ذوق غیبت گو

قطعات ۶ ہیں: ۱۔ نعت و منقبت۔ ۲۔ تہنیت جلوس فتح الدولہ (غازی الدین حیدر) ۳۔ تاریخ غسل صحت سعادت علی خاں (مادہ "نہایا بتائید سبحان پاک وزیر الممالک میاں دو میں" ۱۲۱۸) ۴۔ تاریخ وفات مفتی غلام حضرت (مادہ "روح نے خلد میں کیا ہے مقام" ۱۲۴۵) ۵۔ تاریخ شاکردوارا اللہ فتح چند دیمن رام "فیض مجسم شاکر دوارا" (۱۸۷۱ سمبت) ۶۔ قطعہ تاریخ وفات مصحفی۔ رباعیاں جن میں ایسے دو بیتی قطعے بھی شامل ہیں جن کی بیت اول مصرعے ہے ۱۲ ہیں۔ دو رباعیاں یہ ہیں:

افسر غم عشق دل سے کھونا معلوم
جی وصل صنم سے شاد ہونا معلوم
مثل شب ہجر عمر رقت میں کٹی
آرام سے جیز مرگ سونا معلوم

ہمبزم کی تیرے بات ہم نے کاٹی
یا خیمے کی شب قنات ہم نے کاٹی
بدبو ہوا اس قدر کہ پھر بات نہ کی
رو رو کے تمام رات ہم نے کاٹی

دیوان کی بیت آخر یہ ہے:

ہو علی حیدر بعطائے علی
گلشن عالم میں بعشرت مقیم

دیوان میں ورق ۱۳ الف سے (۹) تک حاشیے میں نثر جس کے آغاز کی عبارت یہ ہے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ جشن نو [illegible] ہے کہ [illegible] اس کا اصل مطلب بیان سنایا گیا ہے"

غالبیہ ———— دوسرا باب

اکبر علی خاں

اس بار غالبیہ کا دوسرا باب شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایسے حضرات کی ملاقات کو نقل کیا گیا ہے جو غالب سے ملاقات کے مدعی ہیں۔

غالب بڑے وسیع تعلقات والے تھے۔ ان کی شہرت بھی کم نہ تھی۔ اطراف و جوانب سے جو لوگ دہلی آتے تھے اُن میں سے نہ معلوم کتنوں کے لیے غالب کی ذات باعث کشش ہوتی ہوگی۔ خود دہلی بھی مجمع صاحبان تصانیف و تالیف تھی اور اُن میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو غالب کو نہ جانتا ہو مگر غالب کے اس وسیع حلقے میں سے صرف چند اشخاص ہی ایسے نکلے جنھوں نے اپنی ملاقات کو قلم بند کیا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تاسف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض کی حیثیت صحیح معلومات کے پیش نظر مشکوک ہے۔ مثال کے طور پر امجد علی اشہری کا بیان سراسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نہ صرف غالب کا الہ آباد جانا کسی اور ذریعے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ آخر عمر میں کوئی بھی سفر قرین قیاس نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اشہری نے اپنی کم عمری کی بنا پر کسی دوسرے صاحب کو غالب سمجھ لیا ہو۔

اسی طرح صفیر بلگرامی کے بیان کے بعض حصے بھی غور طلب ہیں جنھیں بغیر پوری جانچ پڑتال کے قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں غوث علی شاہ قلندر اور ریاض الدین امجد کی تحریریں اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہم ہیں اور ان کی صداقت پر بھی کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی صحبت میں ان سب تحریروں کو پیش کیا جا رہا ہے، یقین ہے کہ ان کے ذریعے غالب کی تصویر کو کچھ ایسے رنگ ملیں گے جو ان کی شخصیت کو نمایاں کرنے اور ان کی تعارفی ملاقات کو زیادہ یقینی اور منضبط بنانے میں مدد دیتے ہیں،

تذکرہ غوثیہ ——— سید غوث علی شاہ قلندر

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ سب فرش تک آ کر لے گئے۔ اور ہمارا حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے علی الخصوص یہ شعر

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو　　　تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔

غزل مرزا نوشہ

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام　　　دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں　　　نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف　　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　　بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد　　　گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجے مگر وہ کب مانتے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں بیخوار رو سیاہ گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اوش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ ان کے مزاج میں کمال کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔ کہا: چار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے۔ مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے: اجی لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو: پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے۔ اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری کا اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری [illegible] سخت ہے اور در حقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا: کہ ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو؟ ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو مغل بچے ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے۔
(۱۰۰-۱۰۲)

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کسی شخص نے مرزا تفتہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کہاں دھونتی رہ گیو اور ترِ بجھ گئے انگار　　اہرن کو ٹھمکو مٹو اور اٹھ گئے میت لوہار
سدا نہ پھولیں توریاں اور سدا نہ ساون ہوئے　　سدا نہ جوبن تھر رہے اور سدا نہ جیوے کوئے

شنیدم کہ در روزگار کہن　　شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو او تنگ از عنصری شد تہی　　بفردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی از دار فانی گذشت　　نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید　　بسر چتر اشعار سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار　　سخن گشت بر فرق خسرو نثار
وزاں پس چو نوبت بجامی رسید　　جہان سخن را تمامی رسید

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے　　چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

نہایت خوب آدمی تھے عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجۂ غایت اور خلیق از حد تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انھوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

قطعہ

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار　　ساقی و مغنی و شرابی و سرودی
زنہار از آن قوم مباش کہ فریبند　　حق را بسجودی و نبی را بدرودی

قطعہ

بروز حشر الٰہی چو نامۂ عملم　　کند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن را ز سرنوشت ازل　　اگر زیادہ و کم باشد آن گناہ من است

رند مشرب صاحب شعر، رحم دل تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

ندی ناؤ سا بیٹھنا پلک ایک کی بریت　　پل میں بچھڑے جات ہیں یہی جگت کی ریت
ہم دیکھیں جگت جات ہے جگ دیکھے ہم جائیں　　ہم تو بیٹھے راہ پر کس کس کو پچھتائیں　　(۳۵۵-۳۵۶)

سرورِ ریاض ——— شیخ محمد ریاض الدین امجد

بیان قلعہ معلّیٰ میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالہم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا:

چھبیسویں جولائی (۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ) کو صبح کو اٹھا۔ دہلی کے قلعے میں اکبر آبادی دروازے سے پہنچا۔ یہاں پہلے چھوٹے چھوٹے کچے پکے مکان ہندوستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بنائے تھے۔ ہر طرح کا تکلف تھا، خوب سجائے تھے لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار اید اقتدار نے مسمار کر دیا۔ میدان ہموار کر دیا۔ دیوان عام میں خاص گوروں کا مقام ہے۔ اور دیوان خاص میں عام صاحب لوگوں کا قیام ہے۔ دیوان عام آگرے کے دیوان عام سے چھوٹا ہے اور دیوان خاص آگرے کے دیوان خاص سے بڑا ہے۔ اور سامنے مہتاب باغ ویران پڑا ہے۔ لیکن بادشاہی چھپر کھٹ ویسا ہی بنا ہے۔ یہ نہیں ٹوٹا ہے۔ پہلے یہاں دکانیں تھیں بازار لگا

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے دل کو سینے کو جگر کو تھام کے
لائے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے
ہاتھ اٹھاؤ سرہان قافلہ اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے
عشق جس کو ہے وہی انسان ہے ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے
یہ صدائے قیس تھی اور جاب شوق ناقہ لیلیٰ کو ٹھہرا تھام کے
تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں ولولے ہیں اگلے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا شعر اپنا ملا کر چار مصرعوں کا ایک قطعہ بنایا تھا۔ خیر وہ بھی سنایا تھا۔

قطعہ

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم رات کے دن کے نہ صبح و شام کے
عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ اے بھئی چپ رہو یوں کہو کہ ضعف نے غالب نکما کر دیا یا دہر نے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔ پھر ارشاد کیا کہ رمیتی زبان ہے، اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو۔ الحاصل دلی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات ہند و مسلمان پیر و جوان بلکہ ایک لڑکا بھی خیرآباد کا سینہ بالا آفت کا پرکالہ مولوی فضل حق کا نواسہ سن میں ذرا سا قطبی میر پڑھتا تھا بات بات میں لڑتا جھگڑتا تھا حاشیہ نشینان بساط ادب تھے، اہل کمال سب کے سب تھے بعدہ مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ رونے پیٹنے چلاّتے۔ وہ بند میں نے طلب کیے مرزا نے اپنے دست خاص سے لکھ دیے۔

مرثیہ

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو اے ماتمیان شہ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا ہوگا دل بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہ وہ برق نہیں ہے

مرزا نے وعدہ فرمایا تھا کہ پھر کہیں گے۔ مگر مرثیہ گوئی میں وقت لے گیا ہے ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔ ... (ص ۲۱–۲۷)

اس دن شہادت کی رات تھی۔ لیکن تعزیہ داری کا کیا ذکر یہ عجیب بات تھی۔ اول تو وہاں پہلے ہی تعزیہ داری نہیں ہوتی تھی دوسرے فدوی کے

سبب سے کسی میں وسعت قدرے زیادہ تر کم ہو گئی۔ سچ ہے جو تو یہاں ہر راہ محرم ہے۔ ہر دم تازہ ظلم ظالم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں عظمتیں ہوتی ہیں۔ جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں۔ سو وہاں بے سروسامانی ہے بڑی پریشانی ہے۔ جہاں بڑی طیاریاں کے علم تھے۔ اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا ہے سلام بادشاہ دیکھا نہیں جاتا ہے۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں گو انسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے کی ہوتی ہے۔ وہی القول جناب انیس آب اسد اللہ خاں غالب نے کہ اے بھی مرثیہ لکھتے تھا کیسا لکھیے تو ہم کیجیے تو دو کا کیجیے جب تمام شہر برباد ہو کر گڑ جائے دیکھا خاک بیان کرے
(ص ۴۳-۴۴)

دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں اور دیکھنا ایک مجذوب کا اور جانا اکثر بڑے بڑے کوچوں میں اور معائنہ کرنا عمارات خوش اسلوب کا

یکم اگست ۱۸۶۰ء دوبارہ ہر ماہ محرم ۱۲۷۷ ہجری صبح کو جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر گیا۔ انھوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دکھایا اور میر طالب علی اور میر خیرالدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کو تو ال اور دیگر عمال کے جلسوں کا جو آگرے میں گزرے ہیں جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے زمانہ کبھی جو ہر سے خالی نہیں رہتا اور ہر بار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں افسوس کہ قدر دان نابود ہیں زمان ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل شاعر بے بدل اسی شہر دہلی میں ہوتے تھے۔ خلوت کدہ عدم میں سو نے گئے۔ علی الخصوص ۱۲۰۹ ہجری میں خواجہ میر درد صاحب کیسے صاحب کمال اہل قال باحال ہوئے جن کا کلام معجز نظام دردمندان عشق کو تریاق مجرب کا اثر دکھاتا ہے اور بیماران محبت پر کار مسیحائی کرتا ہے۔ مردہ دلوں کو زندگی کا مزہ آتا ہے۔ ان بعد ۱۲۲۵ھ میں جناب میر تقی میر صاحب ریختہ گوئی میں صاحب ایجاد ہوئے اور شعرا کے استاد ہوئے۔ اقلیم سخن ان کے قبضہ قدرت میں آئی انھوں نے معاملے کو لمن الملک بلند فرمائی۔ پھر میر سوز صاحب کی آتش بیانی نے حاسدوں کو جلایا۔ وہ تحریر فرمایا کہ آج تک رونق بزم سخن انھی کا ہے۔ سچ پوچھیے تو انھیں لوگوں سے ایجاد شاعری ہے۔ اور وہ جو میاں نصیر تھے تو یہ بھی اس فن میں بے نظیر تھے۔ بعد و مسرتی اور ممنون اور شیفتہ ہوئے۔ لوگ ان کے کلاموں پر بھی فریفتہ ہوئے۔ ان بعد خان معروف اور عارف اور احسان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس فن میں کمال بہم پہنچایا۔ بلکہ شاعری کو خوب چمکایا۔ اور ذوق تو ملک الشعرا تھے۔ اپنے عہد میں یکتا تھے۔ اور مومن خاں یہ شخص جادو بیان عجیب طرح کا انسان تھا۔ اس کی معجز بیانی سے بت بھی سرہلاتے تھے اور آدمی حق شناس اس قدر چپ ہوتے تھے کہ بت بن جاتے تھے۔ لیکن سب کی الگ ہی چال تھی ہمیشہ طرز عاشقانہ میں منہ کھولتے بجلا تاسخ و آتش کہ یہ بزرگ دو استاد تھے۔ سب گھر لوٹتے تھے موتی رولتے تھے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے اس شہر میں دائم رکھے۔ غرض مرزا سے رخصت ہو کر بازار میں آیا۔ ...... (ص ۵۶-۵۷)

غلام غوث بے خبر

آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع میں دورے کو جانے والا تھا۔ خیال ہوا کہ دہلی پہنچ لوں، حضرت غالب سے مل لوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔

اس کی حقیقت یوں ہے کہ میں نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا، رڑکی میں لشکر سے جاملا۔ جب وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جائیں گے میرٹھ پہنچ کر موقع ملا جی نہ مانا، دو روز کی رخصت لے کر دہلی گیا۔ احباب سے ملنا، شہر کا دیکھنا، مزارات کی زیارت کرنی دو دن میں کیا کرتا۔ بہر حال اور دوں سے ایک بار، حضرت غالب سے دو بار ملا۔ اور انھیں دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں، اور بڑی بے لطفی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، لکھ کر باتیں ہوتی ہیں، مدت دراز کے بعد ملاقات ہوئی۔ جی چاہے کہ بہت سی باتیں کیجیے، لکھنے میں بھلا کہاں تک لکھیے۔ مگر ہوش و حواس بہت درست شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم، برخلاف مولوی صدر عالم صاحب کہ ان کے حواس میں بھی فتور آگیا ہے......

(مکتوب بنام عبدالرزاق شاکر مجموعہ احوال غالب ۳۷)

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی

ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے، اتفاق سے کچھ دیر کے لیے دہلی اُتر پڑے، سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لیے ایک گاڑی بھی منگوا لی۔ ابھی گاڑی آئی بھی نہ تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسنِ اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے، فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے چلنے کو مستعد ہو گئے، کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا، اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلیے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا، ایک بڑا پھاٹک تھا جس کے بغل میں ایک کمرا اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسّی یا نوّے برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا، ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے ہوئے، آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے، یہ مرزا غالب دہلوی ہیں۔ بہ گمانِ غالب دیوانِ قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی، آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا، ہم نے سلام کیا، بہ مشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے، ہم کو اپنے پاس بٹھایا، قلم دان اور کاغذ سامنے رکھ دیا، اور کہا: آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا، جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب لکھ کر دو، نام و نشان پوچھا، ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے ہر چند انھوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بے سود ہوئی، جب ہم نے نام و پتا لکھا تو کہا: مجھ سے ملنے کو آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے، کچھ اپنا کلام بھی سناؤ؟ ہم نے کہا ہم تو آپ کا کلام زبانِ مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے، بہت دیر تک اپنا کلام سنایا کیے، پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سناؤ، ہم نے یہ مطلع سنایا:

زلیخا کور شد از حسرت خوابی کہ من دارم ـ مہ مصر است داغ از رشک مہتابی کہ من دارم

غالب کو مہِ مصر کی ترکیب میں تامل ہوا، کہا، ماہِ کنعاں سنا ہے، مہ مصر نئی ترکیب ہے، صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے[1] بہت لطف اٹھاتے رہے، اس مطلع کو دہرایا، حد سے زیادہ تعریف کی، پھر آدمی سے کہا کھانا لاؤ، ہم سمجھے بہ خیال مہمان نوازی تکلف کر رہے ہیں، کہہ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے دہلی اتر پڑے تھے، ریل کا وقت بالکل قریب ہے، اور گاڑی سرائے میں کھڑی ہے اسباب بندھا ہوا رکھا ہے، پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں، کہنے لگے، آپ کی غایت اس تعجیل فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں، ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی، غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سنا، اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے، اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ شوربا بھی پڑا ہوا تھا، پھلکے کا باریک بہت ٹکڑا دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا اٹھوا دیا، تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار غذا پر کیوں کر بسر کرتے ہیں۔ (اردوئے معلیٰ طبع لاہور)

صفیر بلگرامی

مؤلف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

سنہ ۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا، اور بعد شادی کے اپنے نانا صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا، رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ذبیح کلب حسین خاں صاحب بہادر نادر سے ملاقات کا لطف اٹھایا، جب

---

[1] ترسیم کی عبارت تذکرہ کلیاتِ حزیں سے ماخوذ ہے۔

امروہے پہنچا اور نانا صاحب ____ سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا بہت چرچا سنا، ان کا ذکر بہت پایا، نانا صاحب سے ان سے ایک ربط خاص تھا، معلوم ہوا کہ ان کی بہت شہرت ہے۔ میں نے خواہش کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں، اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی کا اور دو غزل ہندی کے ان کے پاس روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گہربار، اور جواب اپنے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر، بفرمائش افضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) لکھا تھا اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر رام پور آیا اور وہاں سے امروہے پہنچا۔ حضرت غالب نے اس مخمس پر ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے بوستان خیال کا اردو ترجمہ کر کے اس کی پہلی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے امروہے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے نشان و گمان امروہے سے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا، دس بجے شب کو دہلی پہنچا، شب بھر بازار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے، دیکھ کر بشاش ہو گئے، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا۔ پوچھا یہ کون ہیں، عرض کیا صغیر، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا، بولے خدا عمر دراز کرے، یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے، اور بغل گیر ہوئے، اور بہت دعا کر کے بیٹھے۔ گرمی کے دن تھے صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا، پاجامہ سیاہ اٹنگے دار، روسیں کا کلی دار، نیمہ سرخ لال کا، بدن میں بہت دبلا، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر ڈاڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بسبب کثرت شراب کے سیاہ ہو کر اینٹھ گئی تھیں، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

الغرض اندر آکر بیٹھے، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کر دوں، اتنے میں صاحب ضیاء الدین صاحب بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے اُن سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پہنے، کرتا پہنے، خلطہ دار پاجامہ، سر پر ٹوپی چوب ... ہیں، بعد اُس کے حضرت نے اُن سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو امروہے سے آئے ہیں، اس کے بعد مجھے ان سے سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا، ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے اور یہ فلاں کام کے لیے۔ آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رخ پر بنا ہوا تھا۔

لطیفہ: فرمایا بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے، یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے، میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن میں دیواروں کی گرمی اور تمازت آفتاب سے دیواریں اس قدر جلتی ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے سے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھلانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں، اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے، گو تھوڑا سا دور ہے، مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی کہ مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا، اس مکان میں پہنچے وہ مکان عالی شان تھا ایک بڑا پھاٹک سہ منزلہ جس پر ایک بنگلہ خوش نما بنا ہوا، اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ، سجا سجایا اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بنگلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان تھا، ہم سب جا اترے، اس مکان کے ایک کمرے میں سامان رکھا۔ الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان مع سرخوان پوش خوش نما پڑے ہوئے انھیں رفیق کے ساتھ آئے، معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوش بو تخمی آم تھے، میں خیال کیا کہ جب یہ آم خود لیتے ہیں پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں، الغرض کھانا کھایا بہت مزے دار اور خوش گوار تھا، قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، مرغ، کباب، پراٹھا، سب کچھ تھا، لطف کھانے کا ہم جو کھانے

لیجیا، صد ہا تہامن نظر آئے بالکل کھٹے تھے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی، اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے، اس سے کہیں بہتر پائے، پھر تو نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا، وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ اسے کہ یہ پرائے ہیں آم

اور سب آم منگا لیے، آم کا شوق حضرت کو بہت تھا، الغرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی، قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا، صبح کو نسخہ صغیر رسالہ تذکیر و تانیث نذر کر گیا، حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا اور دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا، اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے، ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کنویں سے پانی لے آؤ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا، فرمایا برف ہی کا ہے، غرض پانی آیا، پیا واقعی سرد تھا، فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا میرے ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "منہم" اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا "منا"

ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا فرمانے لگے میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو واسوخت ہو گیا وہ بند یہ ہیں[1]۔ پھر فرمایا کہ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال، وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ آج میرا کھانا دیکھیے، الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا، ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور تانبے کی رکابی میں تین پھلکے رکھ دیے گئے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی، پھر وہ رفیق آکر بیٹھے انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے اور خالی رکابی میں رکھے، پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر ملیدے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا، اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے، پہلے وہ دو دو لقمے نوش جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے، البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا بعد اس کے پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے، شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی، بہت تکلف کا کھانا کھلایا، میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں،

ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے، ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

ایک دن پنکھے کے میلے میں دس دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا، وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دلی کا میلہ کیا کہنا ہے، میں نے دلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی، جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے ..... تبرکات کی زیارت کی جناب امیر اور حسنین علیہما السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے، چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا، مگر دلی عجیب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو، کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو، خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان خمخانہ

---

[1] یہ تین بند بعینہٖ وہی ہیں جو یاض الدین احمد کی سیر دہلی میں مندرج ہیں اس لیے یہاں حذف کر دیے گئے ہیں۔

شعر پڑھے، میں نے عرض کی کہ حضور یہ سب بجا فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جائے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے، نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق، ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہو بہو ہو جاتا ہے۔

ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں، میں چھپرے میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے، دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے، مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے، من جملہ ان کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں　　لو تھوڑی سی کہ بخشش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے آپس میں کہنے لگے، بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے، جناب پھر پڑھیے گا، میں نے پھر پڑھا، ان لوگوں نے اس شعر کو لکھ لیا، اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے حضور مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آ جائے اس کو باندھ دینا چاہیے، کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا، ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے، کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا، معشوق من است آن کہ بہ نزدیک تو زشت است کا حال ہے

یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے، وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودکی اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے، ان حضرات کا کلام تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے، پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہیں، سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد ہیں، فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا — خیالہائے نازک اور معانی بلند کا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ غالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بہ اس کے صاحبان طبع نے سلاست کا پردہ دیا، صائب کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں متروک ہوا، اور سعدی کی تحریریں بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہو گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں، خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا، جس کو بہ ظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر، اور حقیقی کا زینۂ اول کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پوچھنا اور جو مجازی میں پورے نکلے وہ بھی قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے کچے عمدے والے سب حقیقی میں ہیں:

اگرچہ شاعران نغز گفتار　　زیک جام اند در بزم سخن مست

ولے با بادۂ بعضے حریفاں　　خمار چشم ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیزے دگر، جسے میں پارسیوں کے آئی ہے، اس اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میر:

بدنام ہوگے جانے بھی دو امتحان کو　　رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار　　خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں　　ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے یہاں بیشتر، یہ نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی ان کا شعر اس وقت یاد نہیں۔ میں نے التماس کیا کہ میں ان کو

کے شعر عرض کروں، فرمایا ہاں پڑھو۔

ناسخ

یہ بھی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا ——— کہ اک ذات خدا ہے اور میں ہوں

جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم ——— وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں

کسی طرح تو سرکار، مہرباں ——— کرتے رہو جفا ہی وفا گر نہ ہو سکے

مر چلا ہوں امیدواری میں ——— ایسے اس سے وہ کرتے کاش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا، ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں، پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے:

ہم نے بھی لوگ بیٹھے بھی، اٹھے بھی کھڑے ہوئے ——— میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے ——— رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر بنے ——— دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

سجدۂ شکرِ خدا یا میں کیے رکھتا ہوں ——— قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا، ان میں بھی بعض[1]

مختار علی شہرت

میں نے دیکھا کہ حضور جہاں پناہ، (بہادر شاہ ظفر) گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام میں ہیں اور سامنے چند شعرا موجود ہیں غرضکہ مجکو بھی ان کے عقب میں کھڑا کر دیا گیا۔ اول غالب صاحب نے غزل پڑھی جنھوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی سے پڑھا کہ سننے والوں کو نقش تصویر بنا دیا......

(آئینۂ داغ ص ۱۰)

ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے[2]۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا آپ تاڑ گئے اور فرمانے کیا ہیں؛

"ہاں! آپ مولوی آگئے ہیں"

میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اُس میں کچھ بتانے لگے، غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی،

"جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں؟" تو فرمانے لگے۔

"اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں اور شستہ الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں"

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی،

"آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے:

"وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت! بعض شعر تو ایسے اوق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا،" پھر فرمانے لگے؛

"دلی والوں کی زبان وہ ہے جس کو مشک و عبیر کہنا چاہیے، اس کو ہی اشعار میں کہنا چاہیے، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے"

[1] جلوۂ خضر جلد اول: ۲۴۰ ذکر مومن ——— [2] کھانا کیا تھا سامنے ایک چھوٹے سے کٹورے میں مار اللحم رکھا ہوا تھا۔

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی! "داغ کی اردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے:

"ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔"

(آئینۂ داغ ۳۴ ــ ۳۵)

میر حیدر حسین سہیل

اسد اللہ خاں غالب کو میں نے دیکھا ہے یہ والد کی ملاقات کو فراش خانے آئے تھے میں بہت کم سن تھا، اتنا یاد ہے کہ رنگ گورا تھا داڑھی کتروان تھی، بال ترشوائے تھے، کشیدہ قامت قوی الجثہ تھے۔ (صلائے عام جنوری ۱۹۱۱ء)

سید امجد علی اشہری

غالب : مجھ کو دلی کی آبادی اور شاعری میں ایک مرزا اسد اللہ خاں غالب کا دیکھ لینا ولی و سودا سب کو دیکھ لینے کے برابر ہے ۱۸۵۹ء میں میں نے حضرت میرزا صاحب کو الہ آباد میں بابو جمنی پرشاد صاحب وکیل ہائی کورٹ کے دیوان خانے میں دیکھا تھا ان کی شیوا بیانی سے بھی مستفیض ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں بھوپال میں ملازم تھا۔ جناب نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین والی سابق ریاست بھوپال نے بہت چاہا کہ حضرت میرزا صاحب بھوپال تشریف لائیں اور یہیں قیام فرمائیں مگر میرزا سے دلی چھٹنا مشکل تھا

میرزا غالب کا اردو دیوان شاعری کی جان ہے۔ ــــــــــــ اگر اردو میں شاعری کی صورت نظر آسکتی ہے تو میرزا غالب کے دیوان میں۔ مگر اس کا سمجھنا معمولی بات نہیں۔ اس لیے مولانا شوکت کے حل غالب سے مشکل کشائی کا کام لینا چاہیے۔ میرزا غالبؔ فارسی کے شاعر ہیں اور ان کا فارسی کلام نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں استادانہ درجہ رکھتا ہے۔ مگر دلی کی بود و باش اور شاعری کے حقیقی مذاق نے ان کی اردو شاعری پر جو اثر کیا وہ میرزا غالب اور صرف میرزا غالب کا حصہ ہے۔ وہ اردو شاعری میں اپنی وضع کے آپ موجد ہیں اور آپ خاتم۔ حکیم مومن خاں اور استاد ذوق ان کے مشہور اور مستند ہم عصر ہیں لیکن میرزا غالب کا کمال فن اور چیز ہے۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزی دیگری (ایشیائی شاعری)

خاندان کے ہر فرد کے تحفظ کیلئے ۔ خاندان کے ہر فرد کے تحفظ کیلئے ۔ خاندان کے ہر فرد کے تحفظ کیلئے

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نادراتِ شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو، اور ہندی کلام جو تاریخ زبان کے مدونین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ مغل بادشاہوں کی خدمت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت اور اُس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ قیمت ـــ ۸ روپے (مجلد)

وقائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس میں شاہ عالم کے عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی ایک اہم تاریخ ہے۔ مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندستان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ قیمت ـــ ۸ روپے (مجلد)

سلکِ گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو خود انشا کی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو ایک اہم مقام حاصل ہے اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی ہی کے قلم سے ہے اور اسے بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح ظاہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ قیمت ـــ ۳ روپے مجلد

متفرقاتِ غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کر دی ہیں جو اس سے پہلے کبھی اور شایع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہے گا۔

قیمت ـــ ۵ روپے (مجلد)

اوراقِ گل: مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، ریاست رامپور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے شاعر کی تصویر عکس تحریر اور حالات زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں جوش، جگر، دانش، اختر شیرانی جیسے دو سو سے زیادہ شعرا اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرہ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت ـــ ۱۵ روپے مجلد

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے چیپ مین نے ترتیب دیا ہے۔ حافظ، سعدی، غالب، خیام اور عرشی کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ کہیں بھی نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت ـــ دس روپے مجلد

نگار بک ایجنسی رامپور، یو پی

REGD NO. A — 466
NIGAR, Urdu Monthly, Rampur U.P.
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 3196/57
42ND YEAR OF PUBLICATI
MARCH 19

ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

پیام اقبال بہ

لارنس رشید اور تارو کے توسط سے ہندوستان کی نئی نسل کے نام

چنان بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

LIVE SO BEAUTIFULLY THAT IF DEATH IS THE END OF ALL
GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME FOR HAVING END D THY CAREER

Per Copy 75 n.P.
Annual Rs. 10

نگار

ایڈیٹر ڈاکٹر فرمان فتح پوری

جلد ۴۲ — شمارہ ۴

فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۳ء

ملاحظات

[illegible]

[illegible] ذہنی کی مہر ثبت کی۔

[illegible] شاعری کا ان ترجمان ہے۔ معاملے کے معاملے میں اقبال کہہ سکتے ہیں کہ تنہا زہر گوش کی ہر [illegible] خیال یا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں خیالات کو ثقی رد نہیں تھے بلکہ اقبال [illegible] کی تدریس سے گزر کر زندگی کے بنیادی مسائل سے علاقہ رکھتے تھے۔ ان کا ذہنی نیز کلام میں [illegible] زبان و بیان پر وہ خود افزا انداز ہوتے تھے اور اس معاملے میں وہ بہر منفرد ہیں۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی اقبال کی زبان میں کچھ اور ہیں۔ قلندر، فقیر، مومن، خودی جیسے الفاظ کے مفاہیم کو جو وسعت اقبال نے دی اُس کا ہلکا سا بھی تصور کسی دوسرے کے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فقیر اور قلندر سا خلاق علم اور عمل کے لحاظ سے جس بلندی کا نمونہ ہے وہ ہمارے عام عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ایک معمولی کرشمہ ہی اقبال کی زبان کا بہرحال ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد ایسا ہے جسے تاریخی نقشے کے طور پر تو ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں لیکن اقبال کے خلاف کوئی فردِ جرم مرتب نہیں کر سکتے۔ وہ کون شخص ہے جس کے یہاں فکری ارتقا نہیں ہوتا۔ حق کی تلاش و جستجو میں سالک کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سفر کا کوئی خاص پروگرام مرتب ہو۔ یہ سب تو راستے کی باتیں ہیں۔ منزل پہ پہنچ کر اس نے کیا کہا اصل بات تو یہ ہے۔

اقبال کو زمان و مکان کی قیود میں رکھ کر نہ ہم ان کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ۔ اس کی آفاقیت کے اپنے تقاضے ہیں۔ حق کو کسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ حق سب کا ہے اور سب کے لیے ہے۔ اسے جغرافیائی حد بندیوں میں بھی نہیں جکڑا جا سکتا۔ اور نگ و نسل سے بننے والی دیواریں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اقبال کا کلام بھی فراوانی ہے کہ اسے کسی مصنوعی قید و بند میں نہ رکھا جائے۔ اس کا خطاب اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پہ تعصب کی عینک لگا کر [illegible] حق کا مطالبہ رہا ہے۔ اگر کبھی حق پر ان حد بندیوں کو جائز کیا گیا تو وہ ان بندشوں کے خالقوں کے لیے بھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حق کو اپنانے کے لیے جس وسعتِ قلب و نگاہ کی ضرورت ہے اگر حق کی ملکیت کے دعوے دار کے پاس ہوتی تو اس تفریق کا امکان ہی کہاں تھا۔

آپ ہی بتائیے کہ اقبال کے مندرجہ ذیل چند اشعار میں وہ کونسی بات ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کا خطاب ہندوستان کے تمام شہریوں سے نہیں کسی مخصوص فرقے سے ہے۔ یا اس کا مطالعہ صرف ایک فرقے کی قوتِ فکر و عمل میں بیداری اور جوش و خروش کا باعث ہو سکتا ہے باقی میں نہیں۔

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں ۔۔۔ پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں ۔۔۔ سو بار ہوئی حضرتِ آدم کی قبا چاک
تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے ۔۔۔ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات ۔۔۔ فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔۔۔ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے ۔۔۔ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے ۔۔۔ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو! آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی۔ اسے میں ذاتی منزلت کے ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد اسکالر اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ میں ممکن ہے پرانے ہو چکے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم اے ہیں ان کا مقالہ آپ سب ابھی سن چکیں گے۔ یہ ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں۔ تیسرے مسٹر [illegible] ہیں جنھوں نے اردو میں ایم اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ ان کا تبحر ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رامپور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے۔ مجھے ان کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علی گڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا جھٹکوں کے نشان ڈھونڈنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت کو خوب خوب کرتے تھے۔ حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ و ردیف میں بلند سے بلند معیار کی تخلیق کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہو سکتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے دریا کی تند و تیز لہریں ہیں، وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی حوادث کا اثر نہ ہوتا تھا۔ البتہ وہ ان حوادث کو بیعت عشق سمجھ کے صابر رہتے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دعوت عمل دریافت کی ہے لیکن میں اس [illegible] زیادہ قائل نہیں ہوں جس طرح سے ہم نے جان اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یا ایک کیا! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تحریک [illegible] سے اجتناب کیا ہے۔ شاید یہ کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کا یہ رنگ نہیں ہے۔ محض چند ایک سے قطع نظر بیشتر نے زندگی کا ماتم غلط کرنے کو شاعری کی اور زندگی سے فرار کا ہی حصے میں شاعری رہی۔

صاحبو! میں اتنا کہنے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کوئی شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے ان کی پہلی مثال اکبر کی ملتی ہے۔ لیکن میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیس اور انیس کے

دلوں میں [illegible] شاعروں کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہیں ۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے [illegible] اور عام ذہن کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے سے بچے رہے ۔

سیاسی لیڈر قوم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستے پر رہنمائی کرنے والا ہم میں عرصے سے نہیں پیدا ہوا تھا ۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے ۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے ۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی ۔ اقبال نے زندگی اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دل کش اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب ہوتا ہے تو کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلے سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں ۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت و دولت ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آ موجود ہوئی تھی ۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلہ پر کیسا عظیم الشان اثر ہے ۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیرووں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی ۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سراسیمہ یا متحیر کر سکتا ۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر ذلت میں جا پڑے اور اس تصور سے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچا ، یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں ہم نے ہر قسم کے جتن کیے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے ۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے ۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور بیشتر ادارے اس پر گواہ ہیں اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خنک ہوتے ہوئے ، اور سکتے ہوئے جیسے ساز نغمہ سرا ہو گئے ، ہندی مسلمانوں میں جو ہمہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہے دے لیجیے ، یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لیے زمین و غالب ، حالی و اکبر ، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی ۔

صاحبو! اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا بھی اور دوسروں کو [illegible] سمجھتا تھا ۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا ۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور و نظریہ مردود تھا ۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی کیسر قلب ماہیت کر دی اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے بعض نئی باتوں سے قطع نظر اقبال نے جو چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا ۔ اقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن و حدیث ، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے ، اور اس طور پر محترم ہونے کے دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیغمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ حد تک ایک ساتھ ہو گئی ہیں ۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو منکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں ۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے ۔ یہی نہیں بلکہ

نہ کل [illegible] کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے مختلف ہے یا ان کا نوشتہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کہی
جاتی ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ منفعلانہ پالیسی اختیار کرنی اور اپنی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں یہ اعتراضات
منکرین اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں، تکذیب۔ واقعات یہ ہیں جو ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کو کہیں اور کبھی دعویٰ
کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و تسلسل سے یکسر منقطع رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا وہ بلکہ دوسرے ادیان کا نا
سخ ہے اور تصدیق کرنے والا ہے۔ تاریخ ادیان یہ کہ اسلام دین کا لفظ دیا گیا اس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اس طاقت نے ا
کا لفظ اور دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آ سکتی اور تصدیق کرنے والوں کو وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات
تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ ا
اسلام کا معجزہ ہی کیوں کرتا ہے؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ میں تو
سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبال نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور ا
نے مفکرین یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (یقیناً ہیں نہیں) تو کیا قباحت ل
آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامی
تصرفات میں جو براہ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طولانی ہے ا
سبب میں یہ حدیث اقبال کو مدنظر رکھنا چاہتا ہوں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفہ مغرب کا کافی اثر تھا۔ لیکن اس کے سا
اقبال نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو
پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال مغربی مفکرین ـ
متاثر ہی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی سے
جاتے ہیں جس کا ایک سرا میلاد آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا مستقبل کے فردا میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن وقت میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں ا
اپنے ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطا
کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات
دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک کے
تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کچھ تعجب نہیں آئندہ سال
اقبال کے موقع پر سرور صاحب کی معرفت آپ اس طالب علم کے اس مقالے سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور رضائے الٰہی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ
اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارے یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور اسی قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امو
ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آ سکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت
سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ
زندگی کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اجل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی صفات شعور ہوتی اور ظاہر ہو کر ختم ہو جاتی ہے انسانی
کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ فنا خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ فنا ہو جائے بلکہ خدا کی
سے قریب تر ہو کر مرتفع تر و محکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کا کوئی خیر نہیں ہے اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا

مقاصد میں تھونپی ہے۔ اس کا مفہوم خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ختم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی
کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو! یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ
ہے۔ در اصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا دار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل پر ہے۔ بذاتہٖ خود میں سمجھتا
ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں۔ عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹفک ہونا یا عقلی ہونا ضروری
نہیں ہے۔ فلسفہ در اصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر
اسلام مذہب عقل ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ
کا نمونہ اسلام میں ہی موجود ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر برے سے برا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہیں ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب
کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درس خودی میں اقبال اسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں محبت فاتح عالم بھی شامل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے ندا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی
مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر برسرکار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "فولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ ضرب کاری بھی اور خوئے دلنوازی
بھی۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشے سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام پڑھا ہے۔ بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے، دوسری صدی صاحب سے کم پڑھا ہے، مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا
ہے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی، برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو
کبھی یکساں نہیں ہوتے جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور
آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پر اسرار اڑانے والی، تسکین دینے والی حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے
ہم با من و بہر لحظہ گریزاں از من مجلہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان بن کر جب دیکھیے، جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی نظر محسوس
ہو جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا: میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی ہر گوشے میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے
مسلمانان ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔
ان کے فلسفے سے نئے علم کلام کا دروازہ کھلا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی
ہیں۔ ہمارے اسپیکر پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں،
ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی اشراف ہندی میں اقبال کی تعلیم سے وہ کام کیا جو ابتک
ہوا نہ ہوا تھا، اقبال ہی کے تصور سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشوونما ہوئی۔ اقبال کے کلام و
پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از سر نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اقبال جامع حیثیات شاعر ابتک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی
تحریک و رہنمائی اور اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی! خدا آپ کی مدد کرے۔

اقبال کا فکری ارتقاء

محمد عبدالسلام خاں

ظروف اور ذہنی فعالی

واردات انسانی فکر کی صورت میں ہوں یا وجدان کی شکل میں۔ ان میں ماضی کے تجربے، مستقبل کی توقعات اور موجودہ ظروف و احوال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کے فلسفیانہ نظام، سائنسی انکشافات اور جمالیاتی اظہار ہزار دو ہزار سال پہلے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے اور ہمارے حصے میں بزرگوں کے ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ نہ آتا۔ تاہم یہ سب کچھ نہیں ہے۔ فرد کا شخصی تاثر اور اس کی ذہنی صلاحیت، شخصیت کی ذاتی فعالی اور تاثیر ناگزیر عوامل ہیں ان واردات کی آمد، صورت پذیری اور ظہور میں۔ ورنہ یکساں ظروف میں ہر شخص افلاطون و ارسطو ہوتا، ہر فرد ڈائنسٹین اور اسٹیفنسن بنتا، غالب اور اقبال میں کوئی ندرت نہ ہوتی۔

اقبال کی حکیمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایان مغرب اور حکمائے مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے۔ مغرب کے ذہنی ارتقا کو بھی دخل ہے اور مشرق کی زوال آمادہ ثقافت سے اثر پذیری کو بھی۔ ان کی فکر میں اسلامی دنیا کے ہر جہتی انحطاط کا عموماً اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً ایک مقام ہے۔ احیائے ملت کی رفعت کی عام آرزو خود بھی ایک محرک ہے۔

فکر اقبال کے ظروف

اقبال کا گھریلو صوفیانہ مذہبی ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، انگریزی اور مشرقی مضامین اور اساتذہ کی صحبتیں ان کی فکر کو ایک خاص سمت میں ڈالنے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صحت مند آب و ہوا، جسمانی [illegible] ان کو بھانے کے وسائل سے دلچسپی، قدرت کے مناظر اور اقبال کی ان سے عملی دلچسپی ان سب کا ایک طرح سے اثر ہے ان کے خیالات کے میلان میں۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کا ہندوستان پر کامل استیلا، اور اس کے افکار و تصورات کی قوت قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور ان کی دینی روایات کو بھی متزلزل کیے ہوئے تھے۔ سر سید مرحوم کے اعتذاری مباحث اور اجتہادی استفادوں نے بڑی حد تک اس تزلزل پر فکری طور سے قابو پانے کی کوشش کی۔ سر سید کی ان بحثوں اور تنقیدوں کا علمی فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحث کی تحقیقات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور تجدید نظر و بحث کے لیے نئے رستے کھل گئے۔ شبلی اسکول نے ان ادبی بحثوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی اور ان کے رفقاء اور شاگردوں کے علم و فضل، اعتدال پسندی، عمق اور ثقاہت نے اس اعتذاری رنگ کو بہت ہلکا کر دیا اور بے روک ٹوک اجتہاد کی بندش کی۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو اور مسلم کردہ [illegible] کو عملی ماحول میں خطیبانہ انداز میں پیش کیا، اس نے ان میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی فضا کی ایک عظیم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

یہ احوال و ظروف کتنے ہی موثر سہی لیکن ان سے اقبال کی فکر کی کامل توجیہ نہیں ہوتی۔ ایک خاص رخ سے معلومات و محسوسات کا انتخاب، جائزہ، ترتیب اور استنباط کسی خاص جذبے یا جذبات کے رہین منت ہو سکتے ہیں لیکن خود اقبال کی اپنی ذہنی ساخت اور اس کی فعالی ان کے تمام فکر کی تشکیل میں سب سے اہم عامل ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت محرکات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کا نشو و نما اور تعلیم و تربیت

اقبال جو اس عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ کے ایک

لیے حضرت اقبال ہمیشہ درد مند ہیں گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں صوفیانہ خیالات اور بزرگوں کی کشف و کرامات کا خاصا چرچا تھا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے دلچسپی تھی۔

اقبال نے مکتبی تعلیم جس میں فارسی ادبیات کے اوسط اور عربی کے ابتدائی مروجہ نصاب تک کی کتابیں شامل تھیں، کسی ٹھیٹ ملائے مکتبی کے بجائے قصبے کے روشن خیال، صوفی منش، جدید تعلیم کے ہمدرد اور سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھنے والی اثر انداز شخصیت مولوی میر حسن شاہ کے پاس پائی۔ ان بزرگ کی نگرانی اور تعلیم و تربیت میں رہتے ہوئے ان کی ہدایت پر ہی اقبال اسکاچ مشن ہائی اسکول میں (جو بعد میں اسکاچ مشن کالج ہو گیا تھا) داخل ہو گئے اور وہیں سے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ اسی زمانے میں اقبال کی پہلی شادی ہوئی لیکن باہم خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہو سکے اور شادی کے باب میں اقبال کی جو خوش آیند توقعات ہونگی وہ برنہ آسکیں۔ بہرحال ان ازدواجی علائق کے ساتھ ہی ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسی کالج سے ایف اے کر لیا۔

مکتب و مدرسہ کی قید و بند کے باوجود اقبال لڑکپن کے عام شوقوں میں آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی ان کے مرغوب شغل تھے پنجاب کے متوسط گھرانوں کے نوعمروں کی طرح ڈنڈ پیلنا، مگدر ہلانا اور اکھاڑوں میں زور کرنا اقبال کے دلچسپ مشاغل تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ فطری تھا طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں جو چھوٹے موٹے مشاعرے ہوتے ان میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ داغ کو استادی کے لیے اقبال نے اسی زمانے میں انتخاب کیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور گئے اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی ادب اور فلسفہ لے کر امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے مشہور استاد، پریچنگ آف اسلام کے مصنف اور شبلی کے دوست اور استاد پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد خاص کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج سے ہی فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور میں رہ کر اقبال کا ذوق شاعری خوب نکھر گیا۔ غالباً ۱۸۹۵ء کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوئے اور غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

> تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے یہ صدقے ہوگی میرے سوال وصال کے

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی تھا جس پر مرزا ارشد گورگانی عش عش کر گئے تھے:

> موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس زمانے کی شاعری میں اگر ایک طرف مجازی عشق سے دل بہلایا ہے تو دوسری طرف صوفیانہ واردات کو بھی نظم کیا ہے عشق حقیقی کی چاشنی بھی ہے۔ تاہم مذہبی کرداروں سے شیفتگی، دینی روایات سے محبت اور ملت اسلامیہ سے گہری وابستگی ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔

انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندوستانی قومیت میں اختلاف و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی۔ جمہوری خطوط پر قومی حقوق طلبی کی جد و جہد اور حکومت کے نظم و نسق اور اس کی حکمت عملی پر عوامی نقطہ نگاہ سے تنقید و نظر کو مسلمانوں کا سربرآوردہ طبقہ اپنے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف سمجھتا تھا خاص طور سے یوپی اور بہار کے مسلمان وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں تھے یا اپنی ایک گونہ اکثریت کی وجہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کا انداز نظر بٹا ہوا تھا۔ عام مسلمان کشمکش میں مبتلا تھے۔ جذبات کی رو میں کبھی قومیت کے خلاف صف آرا ہو جاتے کبھی شانہ بشانہ برادران وطن کے ساتھ تعاون کرتے۔ مسلمانوں کی کوئی مستقل مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی علی گڑھ قیادت سے آزاد جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس افتراق و اختلاف سے متنفر تھا اور چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان ایک جان اور دو قالب ہو کر عام وطنی بنیاد پر اپنی سیاسی جد و جہد کو استوار کریں اور نفرت و اختلاف کو قومیت متحدہ کے وسیع مفاد میں محو کر دیں۔

اقبال کا اس زمانے میں یہی رجحان تھا۔ چنانچہ ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے پوری شیفتگی اور ملی کرداروں سے پوری عقیدت رکھنے کے باوجود انھوں نے قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں جن میں ملکی روایتوں، قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار اور وطنیت و قومیت کو نقطہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی طرف دعوت دی گئی۔ آفتاب۔ ایک آرزو۔ ترانۂ ہندی۔ نیا

ہندوستان کی محبت اور عظمت ... نظمیں وطنیت و قومیت کے جذبات سے معمور دل کی پکار ہیں۔ نانک، رام، گوتم کو خطاب، خواجہ
... نظام الدین اولیاء۔ بلال، عید اور سپاس جناب امیر وغیرہ نظمیں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں مذہبی تعلیمات کے
ساتھ ان روایات سے عشق، اسلامی کرداروں سے وابستہ تعلق پوری شدت سے موجود ہے۔

ایم اے کر چکنے کے بعد اقبال سب سے پہلے اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد ہو گئے اور غالباً عربی درسیات کے مضامین تاریخ فلسفہ وغیرہ کا درس ان سے متعلق ہو گیا اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کی درسیات کے اساتذہ کی رفاقت میں انھوں نے تعلیم کا اہتمام دینا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں آرنلڈ تھے اقبال بھی فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۵ء تک وہ اسی اسامی پر رہے۔

اقبال کا مذہبی تصور اور وطنیت

اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کے ہر حیثیتی اصول زندگی ہونے اور اجتماعی و انفرادی تمام شعبہائے حیات کے لیے اس کے شیرازہ بند ہونے کے تصور تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ ہے جس سے انسانی جذبات میں لطافت اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے عالم سے یگانگی اور دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عام خلوص، ہمدردی اور محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ بھی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ 'التجائے مسافر' میں التجا ہے:

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے | کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ 'سپاس امیر' میں 'انا مدینۃ العلم و علی بابھا' کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کو اصل اصول قرار دے کر حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہیں:

اے بابِ مدینۂ محبت | اے نوحِ سفینۂ محبت
اے مذہبِ عشق را نمازے | اے سینۂ تو امینِ رازے

'فریادِ امت' میں اسلام کی حقیقت کی اس طرح توضیح کرتے ہیں:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے | لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں ان میں باطنی تضاد یا تصادم نہیں۔

اصل محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی | ایک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تصویریں بھی

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری | ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

اقبال کی اس متصوفانہ مذہبیت کا تقاضا ہے صلح کل اور عام دعوتِ اتحاد۔ افتراق و اختلاف سے نفرت:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے | وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے | اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو برا کہوں توبہ | ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

'فریادِ امت' میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

منبر پہ ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا | پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفے اور باطنی مقدس حرارت کا کوئی متعین عملی تقاضا نہیں، کوئی خاص سیاسی ثقافت نہیں، خاص حدود اور خاص رسوم میں محدود نہیں، اس کے اپنے نئے مطالبے نہیں اس لیے اس کا کسی قومیت سے تصادم ہے نہ کسی نظام سے:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی — کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوہر نکھرتا ہے اسی تدبیر سے — آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں — خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں

چنانچہ اقبال ترانۂ ہندی میں اعلان کرتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نیا شوالہ میں اختلاف و افتراق کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو — آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے ایک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو — دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاق طبع کا آئینہ دار ہے جو خاص طور سے اس کے عملی تقاضوں اور شعائر و رسوم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ایک بہت نجی معاملہ سمجھ کر اس کی باطنیت اور روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دل آویز اور روحانی تصور ماخوذ ہوتا ہے اس کی سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہر شے میں ایک ہی ازلی ابدی حسن کی جھلک ہے۔ بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی مہک ہے۔ غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسان کا سخن ہے۔ جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوشنوا کا نغمہ ساز تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہ ہو۔ اذان ناقوس ہی کی صدا کیسے نہ ہو۔ حقیقت کا یہ شاعرانہ تخیل، وجود کا یہ جمالیاتی تصور، تہذیبوں کی آویزشوں اور تعصب العقیل کے تصادموں کے لیے جس طرح کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا اسی طرح مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں مہیا کرتا۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو — ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال اور جستجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کی عام مذہبی توجیہیں اقبال کے دل و دماغ کو مطمئن نہ کر سکیں چنانچہ آغوش مذہب میں پرورش پایا ہوا اور بزرگوں کی عقیدت مندیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، ذوق و وجدان کی وسعتوں سے روشناس، مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم جب کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا استفسار و جستجو بن جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ آیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت محض عناصر کا کھیل ہے؟ کبھی ہمالہ سے پوچھتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے — دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

---

[۱] حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

پروانے اور جگنو کا مکالمہ ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

بھی گل رنگین سے [illegible] ہوتا ہے [illegible] وہ کہتا ہے [illegible] عالم [illegible]
ہے تو پھر یہ [illegible] ہم آہنگی [illegible] نہیں۔ اس رزمگاہ اضداد کی [illegible] ہے۔ اگر اس عالم سے ماورا بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا
ہے اور کیسا ہے اور کیا وہاں بھی ناہمواری کا احساس اور اضداد کی آماجگاہ ہے؟ وہ "خفتگان خاک سے" استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرشارو کہاں رہتے ہو تم — کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی — اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا — اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا — اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا
رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں — اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں
اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے — روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے — قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

پھر اس تضاد اور ناہمواری کے دور ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ "آفتاب صبح" میں اپنی اس آرزو کو بیان کیا ہے:

دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں — ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے — حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پھر کائنات کی سب سے دل چسپ اور دل آویز مخلوق انسان کی کہاں سے ابتدا ہے اور کونسی اس کی منزل ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں — کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا شہکار ہے کیا واقعی اس کی قسمت نیستی ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے — موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اگر موت عدم محض نہیں ہے فقط انتقال مکانی ہے تو یہ انتقال تدریجی کے بجائے دفعتاً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے — موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و دوزخ کے حوالے کا مفہوم کیا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے، کیا توجیہہ ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے — یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

اگر یہاں ہمارا علم حقیقتوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد عالم میں اس کی یہ محدودیت ختم ہو جائیگی اور ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری تقدیر ہے؟

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے — علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی — لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا — واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

اقبال کے سلسلے میں یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی یا وقتی لطیف احساسات نہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے منطقی فکر ہے، مستقل دل لگی کر رہی ہے۔ دماغ کی مسلسل الجھن ہے۔ تصوف اور فلسفے کی آویزش ہے۔ عقیدے اور استدلال کی کشمکش ہے اور مادیت اور روحانیت کا تصادم ہے۔ چنانچہ ان کے پورے کلام پر نظر ڈالی جائے۔ ان کے فکر پر ان کے فلسفے کا جائزہ لیا جائے تو ان ہی سوالوں کے گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ ان کی پختہ فکر اور فلسفیانہ نظر مذہبی معتقدات اور صوفیانہ شعور کے سہارے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب دیتی

ہوتی نظر آتی ہے۔ ایک خاص میلان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لیے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی ہی میں تشکل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وسائل علم اور ذرائع معرفت کی تنقیح اور انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

خود اصل کائنات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے اس کی ہستی کے راز کو اسی زمانے میں ان پر بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب و علل زیادہ سے زیادہ اتفاق اور مصاحبت تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو دائمی مان لو لیکن یہ کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس کا جواب عقل کے پاس کہاں تھا۔ عقل مشاہدات و محسوسات سے تجرید و تقسیم کے ذریعے کلیات کا استخراج کر لے لیکن وہ محسوسات تک ہی تو محدود ہوں گے۔ محسوسات سے ماورا اور ان کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو اس کی اصل حقیقت اور پھر اس حقیقت کے ذاتی لوازم اور بلا واسطہ اوصاف اگر کچھ ہوں تو وہ عقل و فکر کی گرفت میں کیسے آتے۔ عقل و فکر کا خام مواد وہ احساسات اور ارتسامات ہیں جنھیں حواس معروض کی ظہوری حیثیت سے اخذ کرتے ہیں۔ عقل اپنے اصول و ضوابط کے تحت انھیں مرتب و منظم کرتی ہے۔ لیکن کسی معین معروض کے عقلی تصور کے لیے صرف انھیں احساسات اور ارتسامات کی ترتیب و تنظیم کافی نہیں جو حواس نے کسی خاص وقت میں اس معین معروض کے کسی خاص رخ اور خاص مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہیں بلکہ دوسرے گزشتہ اوقات کے اور دوسرے رخوں اور دوسری مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہوئے احساسات اور ارتسامات سب اس خاص زمانی اور خاص مکانی ارتسام کے ساتھ شامل ہو کر عقل کا خام مواد ہیں جن کو عقل مرتب اور منظم کر کے کسی معین معروض کا تصور مکمل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ کسی معروض کے عقلی تصور کے لیے کوئی خاص متعین زمانی اور مکانی ارتسام کافی نہیں بلکہ گزشتہ زمانی اور مکانی تجربات کے تحت معروض کو مجموعی طور سے جیسا ہونا چاہیے ویسا اس کو ٹھیک ٹھیک لیا ہونا چاہیے۔

غرض یہ کہ عقل کا عمل ظواہر پر ہوتا ہے، اصل حقیقت جو ظواہر کی تہہ میں ہے، وہ اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے اس لیے عرفان حقیقت اس کے حدود کار سے بہت بلند ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود کے تحت فکر کرتی ہے جن کا اصل حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا محض ان اصول کے پیش نظر کہ ہر اثر کے لیے اثر آفریں اور معلول کے لیے علت درکار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے لیکن خود حقیقت یا حقائق اپنی اندرونی حیثیت میں اس اصول کے تحت ہیں یا اس اصول کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا، اس پر عقل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ تو صرف ظواہر کا یا دوسرے لفظوں میں معروضات کا اپنے طریقوں اور اپنے شروط کے ساتھ جائزہ لے سکتی ہے مگر خود حقیقت کو اس کی واقعی نوعیت کو، اس کے حقیقی لوازم و اوصاف کو، ظواہر کے ساتھ اس کے تعلق کو اگر کچھ ہو تو، پھر اس تعلق کی نوعیت کو کسی طرح نہیں محسوس کر سکتی ہے[1]

حقیقت کو دریافت کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو براہ راست محسوس کیا جائے۔ جب حقیقت خود محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات سے متعلق "کیا ہے"، "کیوں ہے"، اس کے تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے، اور کب سے اور کہاں ہے، جیسے سوالات کا جواب خود بخود ہی واضح ہو جائے گا۔ لیکن کیا اس کو براہ راست محسوس کرنا ممکن بھی ہے۔ اقبال کا جواب غالباً صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ہے کہ ممکن ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اقبال دل کو براہ راست احساس حقیقت کا منصب دیتے ہیں۔ دل سے اقبال کی مراد غالباً وہ مقدس الہٰی لطیفہ ہے جو انسانی ظواہر میں بحیثیت باطن ذات یا حقیقت انسانیہ کے پوشیدہ ہے اور یہی محل ہے تجلیات الہٰیہ کا۔ دل کے براہ راست محسوس کرنے کی یہ دوسری تعبیر وجدان ہے۔ اقبال عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق اور عقل کے حدود اور قیود اور

[1] عقل کے دائرہ عمل اور طریق کار کی تشریح میں کانٹ کے زاویۂ نظر کو پس منظر کے طور پر بالقصد سامنے رکھا گیا ہے۔ مجھے ہر گمانی انداز فکر کی تائید میں اقبال کے اس عہد کے کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔

...سراپا اسیر ہونا، راز حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت سے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یاد وطن فسردگی بے سبب بنی — شوق نظر کبھی کبھی ذوق طلب بنی

...من و آنکا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تخصیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا یہ سچ مچ واقعہ ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ ...ہیں؟ عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے ...گھڑ لیا ہے:

چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے — عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماورا، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایازی" جہالت کا اختراع ہے

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے — کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

شعور غفلت آفریں اور آگہی غلط نگر کا یہ کائناتی سلسلہ، زمان پر دوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت ...مطلقہ صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بام حرم میں جدا جدا محصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ حقیقتاً ایک حقیقت ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے — طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں — اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ — بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس شعور و آگہی کا سبب جس کی غلط نگاہی سے حقیقت جدا جدا تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت کے بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ — پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور انا کا مطمح نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ — اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا خالص ماحصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید، بے امتیاز؛ اس کی یہ معنی ذات اپنی خواہش عرفان کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ ظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اور ذات کا ہے اور صرف ذات کے لیے ہے۔ مظہری صورت اپنی وحدت کو جدا جدا اور زمانی مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور باطنی واقعیت نہیں ہے اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں۔ یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے آئی تو پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے، بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر واقعی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی ہے، ذات ہی ذات رہ جاتی ہے اور سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ — میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر یہاں اثر تھا: وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے نہ ان کے

[illegible] کائنات یا عالم کہا جاتا ہے ہمارے اپنے شعور اور آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ "من" ہے نہ "تو" ہے نہ کوئی [illegible]
نہ کہیں ہستی ۔

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے — گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگہی

اگر یہ شعور و آگہی فنا ہو جائے تو یہ تمام تعینات ختم ہو جائیں اور وہی ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جس میں من و تو کا کوئی فرق نہیں:

آزاد دست برد بقا و فنا ہوں میں — کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

یہ مجمل الکہ حقیقت جو وحدت صرف ہے بے جہتی اور اطلاق محض ہے بے تعین، عرفان ذات کی خواہاں اور نمود کی متقاضی ہے۔ ذات کا یہ تقاضائے نمود، حقیقت کی یہ خواہش عرفان علت ہے کثرت کی اور سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تقاضائے نمود یا عشق نظارگی دعوت بے حجابی دیتی ہے۔ اور تعینات اور امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں: وحدت کثرت نظر آنے لگتی ہے اور دعوت بے حجابی کو مہمیز کرتی ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق — آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

استغراق میں بد یہہ پیدا ہو گئی، چشم شعور وا ہونے لگی:

یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ — ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

فاسئلہ [illegible] اطلاق و ابہام وجود سے بر آمد شعور و آگہی سے ہوا ہے۔ ہستی ہی حیدر شعور و آگہی ہے۔ ہستی وہ کائنات کی جو حقیقت مطلقہ کی بنیاد ہے تعین و امتیاز کی، اساس ہے تعلق اور وابستگی کی تقیید کی۔ ہستی سے جہان ذات متعین اور متمیز ہوتی ہے۔ وہیں اشیاء یا کثرت اور کائنات باہم دگر بھی اور خود اصل حقیقت سے بھی متمیز ہو جاتی ہے اور متعین و محدود ظہور پذیر ہو جاتی ہیں؛ موج قوم میں غرق ہو جاتا ہے بلندی اور پستی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گل میں مہک اور شراب میں مستی صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ حسن و عشق کے الگ الگ موضوع دکھنے لگتے ہیں۔ ہستی کا یہ پردہ سب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ الگ الگ قیدی اور الگ الگ قفس۔ حقیقت سے دور ہر ایک اپنے اپنے غمکدے میں غربت کے دن گزارتا رہتا ہے:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی — شام فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معنی یہ ہیں کہ زید ایک ایسے انداز اور ایسی وضع میں موجود ہے کہ دیکھنے والا اس کو کھڑا، بیٹھا یا لکھتا ہوا، پڑھتا ہوا محسوس کرے۔ کھڑے ہونے بیٹھے ہونے، یا لکھنے پڑھنے کی نہ تو کوئی الگ ہستی ہے اور نہ ان کی کوئی الگ حقیقت ہے۔ چنانچہ یہ ہیولیٰ یا استعداد محض [illegible] اختیار کرتی ہے اور ذات حق کی شہودی تجلی کا محل بن جاتی ہے تو کائنات یا کثرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ گویا کائنات ذات باری کا اپنا ایک خاص انداز وجود ہے اور نیز ابن عربی کے نزدیک کائنات اپنی ازلی حیثیت میں قدیم ہے۔ ذات حق ازلی اور ابدی موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لیے کوئی نہ کوئی انداز وجود ضروری ہے۔ اس کا یہ انداز وجود اس کے کسی نہ کسی امکان کا ظہور ہے اور ہر امکان کا ظہور کسی نہ کسی خصلیت کی نمود ہے۔ یہ خصلیت کوئی نہ کوئی شے ہے۔ اور یہ سلسلہ ازل سے ابد تک برابر جاری ہے۔

ابن عربی کے تصور کے مطابق اگرچہ کائنات کی اپنی الگ کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا کوئی اپنا الگ وجود ہے تاہم وہ حقیقی اور واقعی ہے نہ کہ [illegible] ہے نہ کوئی [illegible] احساس اور فریب نظر بلکہ اس کی کثرت باہم ہی ممتاز، ایک دوسرے سے الگ، ہر شے خود ایک شے ہے نہ کہ دوسری۔

اسراپا جستجو ہونا، راز حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت سے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یادِ وطن فسردگی بے سبب بنی — شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

من و تو کا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تخصیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا سچ مچ واقعی ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ
عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے
ہے:

عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے — چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماورا، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایازی" جہالت کا اختراع ہے:

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے — کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے

شعورِ غفلت آفریں اور آگہی غلط نگر کا یہ کاشانی سلسلہ، زمان بردوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت
صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بام حرم میں جدا جدا محصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں، تنہا ایک
ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے — طوقِ گلوئے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں — اے شمع! میں اسیر فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ — بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس شعور و آگہی کا سبب، جس کی غلط نگاہی سے حقیقت جدا جدا تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت
بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ — پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور "انا" کا مطمح نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ — اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا غالباً حاصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید بے امتیاز؛ اس کی اندرونی ذات اپنی خواہش
کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ مظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اندر ذات کا ہے اور صرف ذات کے
ہے۔ مظہری صورت میں وحدت کو جدا جدا اور زمانی مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور
واقعیت نہیں، اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں۔ یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے
پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر واقعی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی
فنا ہو جاتا ہے اور حق ہی حق رہ جاتا ہے۔

دریا ہوں، منتظر نہیں ہوں، نہ مستی ہوں نہ پیمانہ — میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر خاص اثر نہ تھا؛ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے زمان کے

یہاں [illegible] سے گریز [illegible] ہے وہ [illegible] سے بچ کر گزر جانا چاہتے ہیں [illegible]
[illegible] کا احساس ہوتا ہے شکیب آرزو میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی سے خود عزلت گزینی کا جذبہ [illegible]
[illegible] نمایاں ہے

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا	ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری	دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں	دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں	چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا	ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

لیکن اس کے لہجے میں سنجیدگی اور طمانیت نہیں، آرزو میں خلوص اور طلب میں سچی تڑپ نہیں ہے بلکہ جھنجلاہٹ ہے [illegible] ہے
[illegible] ہے۔ اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے دوسرے بند کے اشعار ہیں:

شمشاد و گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن	ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر	میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت	ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

اہل وطن کا یہی [illegible] اور افتراق تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں بلکہ شاعر اقبال کا دل بجھ گیا اور وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا گیا:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب	کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دلچسپی نہیں رہی:

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن	میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں	روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

لیکن اس پر بھی ان کے دل کی تمنا یہی ہے کہ،

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے	بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کا میلان طبع | اس ابتدائی دور میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری، عالی حوصلگی اور احساس خودی کی [illegible] ان کے کلام سے انتخاب کر لینا مشکل نہیں۔ ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے ان کے آئندہ فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا۔

ہم صفیرو تم مری عالی نگاہی دیکھنا	شاخ نخل طور تاڑی آشیانے کے لیے
ایک دانے پہ ہے نظر تیری	اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن	دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

سادہ سادہ شاعرانہ واردات کی ہی صورت میں سہی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر [illegible]
[illegible] کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

انسان کی اہمیت | اقبال نے گوناگوں طریقوں اور مختلف اسالیب سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ [illegible]

حیات کا اتنا مختصر وقفہ اور ہمیشہ کے لیے فنا کے بے پایاں اور گہرے سمندر میں ڈوب جانا ان کی فلسفیانہ ... [illegible]
بخش نہیں ہوا۔ ان کا تخیل فنا کو زندگی کا منتہا اور غایت تسلیم کرنے کو کبھی آمادہ نہ ہوا۔ وہ زندگی کہتے ہیں ... [illegible]
جگنو کے ستارے " کی زبان سے کہا ہے:

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل ۔۔۔ کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

لیکن حیات کا ایک نہایت مختصر مدت کے بعد زوال روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ... "کنار راوی" میں کشتی کو دور
افق میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ کر اقبال کا شاعرانہ تخیل انسانی حیات کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی توجیہ پیدا کر لیتا ہے:

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں ۔۔۔ ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا ۔۔۔ نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

چنانچہ ان کے نزدیک موت زندگی کی فنا نہیں بلکہ وہ خود ایک خاص طرح کی زندگی ہے جس کو عام نظریں محسوس نہیں کر پاتیں۔

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شراب زندگی ۔۔۔ مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۵ء تک کا فکری تجزیہ

یورپ روانہ ہونے سے پہلے تک کی اس مختصر مدت کے کلام کے اس تجزیے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نظر کے سامنے اکثر وہ بنیادی سوال آ چکے تھے جو آخر تک ان کی فکر کا محور رہے۔ ان سوالوں کو جہاں تک حل کرنے کا تعلق ہے اس زمانے کے کلام میں اس کی کوششیں صاف نمایاں ہیں لیکن ان میں فکر کی پختگی سے کہیں زیادہ شاعرانہ تخیل ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کا رخ گو پوری پوری طرح نہ سہی مگر ایک بڑی حد تک متعین ہو چکا تھا۔

اقبال یورپ کے تعلیمی اور معاشرتی ماحول میں

۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اقبال یورپ روانہ ہو گئے اور ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا اور اسی کو کیمرج یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ یہاں انھیں مشہور استاد فلسفہ ڈاکٹر میکٹیگرٹ اور جان سورلے جیسے سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے شاگرد ڈاکٹر نکلسن سے تعلقات نے مشرقیات کے ذوق کو پھر تازہ کر دیا چنانچہ ڈاکٹریٹ کے لیے اقبال نے "ایرانی مابعد الطبیعیات" کا موضوع منتخب کیا اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اس تقریب سے برلن، میونک اور ہائیڈل برگ کے اساتذۂ فلسفہ سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی مناسبت سے اسلام کے بنیادی عقائد اور ان کے اثرات، مسلم خصوصاً ایرانی اثرات سے متاثر تصوف اور اس کے اثرات کی تحقیق کا بھی ان کو موقع ملا اور اس موضوع کے خصوصی ماہرین کے مشورے اور رائیں بھی انھیں ملتی رہیں اور بحث و تنقید کی سہولتیں بھی میسر آئیں۔ مغربی فلسفہ تو ان کا ہندوستان سے ہی اضافی مضمون تھا، کیمرج میں اس پر زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق نظر ڈالنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

یورپ میں قیام کے دوران حمایت اسلام کا فریضہ انجام دینے والے مشہور اسلامی مصنف جسٹس امیر علی اور بہت سے دوسرے اکابر علم سے ... پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک کی اہم اور نمایاں شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگوؤں کے وقتاً فوقتاً اتفاقات رہے۔ متعدد بار اسلامی ممالک کے اکابر اور طلبہ سے بھی بات چیت رہی ہوگی۔ ان روابط اور گفتگوؤں سے انھوں نے بین الاسلامی رشتے اور وطنی تعلق دونوں کے فرقوں کو محسوس کیا ہوگا۔

ہندوستان کی جامد اور بے کیف زندگی کے مقابلے میں انھیں یورپ کی فعالی اور متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے کے، سمجھنے کے، اس کے عوامل اور محرکات کو جاننے اور مختلف پہلوؤں سے اس کو جانچنے کے اور اس کے اثرات کی ناپ تول کے پورے مواقع حاصل ہوئے جن سے ان کی فلسفیانہ طبیعت نے فائدہ اٹھایا۔ مغربی ممالک کے قومی شعور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر کا اور ان کے بنیادی اسباب و محرکات کا مطالعہ ان کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج اور امکانات پر نظر ڈالی اور مختلف نظری اور عملی فلسفوں سے روشناس ہوئے۔ غرض یہ کہ اقبال نے یورپ میں بہت کچھ دیکھا، سیکھا بھی، سراہا اور اثر لیا۔ ناپسند کیا اور بغاوت کی۔

یورپ کی فعالی کا اقبال پر اثر

یورپ کی قوت عمل اور فعالی کا جہاں تک تعلق ہے اقبال اس سے خاص طور سے متاثر ہوئے

حتیٰ کہ ایک زمانے میں [illegible] کے پیش نظر انھوں نے شعر گوئی کو بھی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے   جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

لیکن بعض احباب کی فہمائش اور اپنے استاد مسٹر آرنلڈ کے فیصلے کے سامنے انھیں اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند اور مظاہر پرست نہ تھے لیکن یورپ کی فضا میں ان کے مادی زاویہ نظر اور خالص کاروباری نقطۂ نظر کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہ اقبال کی فلسفیانہ افتادِ طبع تھی کہ انھوں نے یورپ کی فضا کو تو گرہ میں باندھا لیکن اس کی مادیت اور مظاہر پرستی سے انھوں نے کوئی رشتہ نہیں جوڑا بلکہ اس کی ہلاکت و بربادی کی پیشگوئی کی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے   کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

چنانچہ اس زمانے میں اقبال نے مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پہلوؤں سے حرکت و عمل، جدوجہد اور زندگی کے لیے تصادم اور پیکار کی ضرورت کی خاص طور سے دعوت دی ہے۔ پہلے عمل کی حیثیت ان کے یہاں خیال و ارادہ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب وہ مستقل پیام بن گیا ہے:

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے   کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی   یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے   پوشیدہ قرار میں اجل ہے

حرکت اور عمل کے مقابلے میں کوئی عظمت عظمت نہیں، گویا یہ وسیلہ نہیں مقصد ہے، محرک نہیں خود زندگی ہے:

آئی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں   کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

حرکت اور عمل کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ شاید کسی وقتی جذبے کے تحت یہ بھی کہنے لگتے ہیں:

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری   گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامانِ آبرو کا

مگر یہ غالباً شاعرانہ واردات ہے۔

آرزوئے نو اور طلب

ہندوستان میں جو مبہم آرزو تھی اب وہ مستقل طلب کی صورت میں نمایاں ہوگئی ہے گویا آرزو اور طلب لازم اور ملزوم بن گئے ہیں۔ آرزو محض خلش نہیں، "آرزوئے نو" ہے "تخلیقِ مقاصد" کا مقدمہ ہے:

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار   قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بھاگ دوڑ کے لیے مقصد ہے، جدوجہد کا مطلوب ہے، تڑپ کا مدعا ہے:

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا   جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو، ادا مثالِ نماز ہو جا

کوئی شے [illegible] نہیں۔ مال و منال کچھ پڑا ہے، فراہمی اجارہ داری نہیں، نہ آئینہ سازی سکندر پر موقوف ہے:

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے   تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

طلب کو کسی مرحلے پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ مطلوب کو ہمیشہ حاصل سے آگے رہنا چاہیے اور کسی بھی حاصل پر اکتفا نہ ہونا چاہیے:

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری   وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اس لیے کہ زندگی کا دوسرا نام طلب ہے، طلب نہ ہو تو پھر زندگی زندگی نہیں موت ہے۔

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو   گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

لاموجود الا اللہ

عمل اور جدوجہد کی اہمیت کو فکری طور پر محسوس کر لینے اور اس کو ایک مستقل پیغام بنا لینے کے ساتھ ساتھ اقبال وحدت [illegible] وجود کے حامی نظر آتے ہیں اور کثرت کو اصل حقیقت کی ہی جلوہ گری اور اس کا کنٹرول سمجھتے ہیں، سب ایک ہی کا مظہر

حقیقت کے تعینات ہیں۔ اگر ان تعینات کے بطن کو محسوس کر لیا جائے تو صرف ایک ہی حقیقت ہے جو موجود ہے باقی سب معدوم۔

راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن اب وہ اس کثرت کو غالباً محض آگہی کا زائیدہ نہیں خیال کرتے اور نہ اصل ہستی کو پردہ مان کر اس کو اٹھا دینے کی فکر میں رہتے ہیں وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کثرت کے بطن میں جو وحدت پنہاں ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حسن ازلی کا سب کو مظہر جان کر سب سے عملی دلچسپی لی جائے اور چیزوں میں امتیاز و غیریت کی ناقابل شکست دیواریں نہ حائل کر لی جائیں۔ علاوہ ازیں نظر کو بدل جانا ہونا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ سب مختلف مظاہر ہیں اور ہر مظہر اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ چشم نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ان مظاہر کے عقب میں صرف ایک ہی حقیقت جو قائم و دائم ہے اور وہی ان مظاہر کا وجود ہے، اس وجود کے علاوہ مظاہر کا کوئی الگ وجود نہیں:

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مظاہر اس وجود برتر کے فقط اطوار و اعتبار ہیں۔ یہ محض تجرد وجود کی موجب ہیں اور حقیقت کی اپنی ترتیب ہیں:

چشم نا بینا سے مخفی معنیِ انجام ہے تھم گئی جس دم تڑپ، سیماب سیم خام ہے

مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل حقیقت کا عشق اور اس سے تعلق کا شدید احساس ان اطوار وجود اور اعتبارات حقیقت کو باطل کر دیتا ہے تاہم یہ ایک حال ہے۔ یہ عشق کی سرمستی ہے جو اس بت اعتبار کو توڑ دیتی ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیم عشق

وحدت وجود کا یہ تصور اب محض شاعرانہ نہیں۔ بلکہ ابن عربی کے مستند نظریے سے کچھ زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تعینات کے واقعی ہونے میں اور باہم امتیازات کے حقیقی ہونے میں ان کا کلام واضح اور قطعی نہیں ہے۔ تاہم اس کی تشریح ابن عربی کے مذاق پر بھی کی جا سکتی ہے[1]

نقاضائے نمود | ظہور کا تقاضا یا نمود کی خواہش جو پہلے صرف ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر چھا گئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر وحدت شعور کا تقاضا رکھتی ہے۔ ہر شے میں نمود کی خواہش ہے۔ دریائے ہستی کا ہر قطرہ نمود کی لذت سے آشنا ہے۔

لذت گیر وجود ہر شے سرمست مئے نمود ہر شے

وجود سے یہ لذت گیری اور نمود کی یہ اندرونی خواہش مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہے اقبال کی دعوت حرکت و عمل کی اور خاص عنصر ہے ان کے آئندہ فلسفے کا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہستی کی نفی ہی حقیقت ہے، حقیقی کمال فنا ہے اور فطرت کا مطالبہ سکون محض ہے تو پھر حرکت و عمل جو اہم ہے ہستی کا اور خروش ہے بحر وجود کا، حقیقت سے بغاوت ہے اور مقابلہ ہے فطرت کا۔

تغیر اور نمود | اقبال کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات کی صورت میں برابر جمع ہوتا جا رہا تھا اس میں شاید خالص شاعرانہ توجیہ کے ضمن میں "تغیر" کا اضافہ اسی زمانے میں ہوا ہے۔

---

[1] خاص طور سے اقبال کا یہ غزل کا شعر تو صریح ہے کہ وہ تعینات کو فریب نظر ہی سمجھتے تھے لیکن چوں کہ غزل کا شعر ہے اس لیے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کا حقیقتاً یہی نقطۂ نظر ہے تو عمل سے اس کا پیوند بہت دشوار ہو گا۔

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا

«حقیقت حسن» میں حسن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟" اس شکایت کا جواب دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے یا دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازمی ہے۔ جو شے حرکت نہیں کر رہی ہے تو اس کی فعلیتوں کا بھی اظہار نہیں ہو رہا ہے اور ایسی حالت میں اس کے ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں۔ کامل سکون اور مطلق جمود ہستی نہیں محض عقلی تجرید ہے۔ نمود یا وجود بار بار بدلتے رہنے یا محض امکانات کے فعلیتوں میں ظاہر ہونے کا نام ہے اس لیے کسی ہستی کے لازوال ہونے کا مفہوم اس کی نیستی یا مکمل خفا ہے۔ مسلسل بدلتے رہنے کا ہی نام شے ہے۔ ایک فعلیت دوسری فعلیت کو جنم دیتی جا رہی ہے اور دوسری تیسری کو، فقط ثبات تغیر کو ہے زمانے میں!

وطنیت کے بجائے ملیت

وطن کے خالص جذباتی ماحول سے علیحدگی، مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں سے تعلقات اور ان سے یگانگی کا احساس، "ایرانی مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور مختلف وطنوں کی شخصیتوں میں عمومی وحدتِ خیال، جذبۂ وطنیت کے مظاہر اور اس کے دور رس نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کی اس سے دلچسپی اور تحریک وحدت اسلامی ان سب کے ملے جلے اثرات نے غالباً اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا اور ان کے جذبات میں کھلا انقلاب آگیا۔ ایک «ضرب العیر» کی صورت میں وطنیت سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملت اسلامی کو سماجی وحدت کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سیاسی وحدت بھی سمجھنے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل تھا، یہ ایک بڑی موڑ تھی جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اگر وہ ملت کی انفرادیت اور وحدت کو مطمح نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی مستقل رخ نہ اختیار کرتی اور وہ دنیا کو ایک نیا خیال نہ دے سکتے۔ خود ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کر پاتی جس نے ان کو شعرا کی صف میں مستقل اور قابل رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا اور شاید ان کی شخصیت بھی اتنی پرکشش اور محبوب نہ رہتی، نہ ملکی حیثیت میں اور نہ بین الاسلامی بلکہ اب تو بین الاقوامی حیثیت میں بھی۔

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا بنانے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم قومیت خود مستقل وحدت ہے جو کسی وطنیت اور کسی قومیت میں محدود نہیں۔ یہ ایک نیا سماجی منظر ہے جس کے تحفظ کے طریقے بھی سنئے ہیں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

کیوں کہ اس نئے سماجی منظر کا کوئی اپنا وطن ہی نہیں ہے دنیا تو دنیا اور مذاہب کے برخلاف اس کا نصب العین عقبیٰ بھی نہیں ہے:

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ — نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصول حیات ہیں جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری قوم کے لیے جاذب ہے:

جاذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

محدود وطنیت اور ملکی قومیت افتراق کے بت ہیں جن سے ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنے دامن کو ان بتوں سے بچائے جانے کی یہی تدبیر ہے کہ ملی وحدت کے شعار میں جذب ہو جائیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا — بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

«عبدالقادر کے نام پیغام» میں اسلامی قومیت کے اصول کو جو اس غوغائے وطنیت میں نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ان کا حسن و جمال دکھا کر ملت میں ان کے لیے نئی تڑپ پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

اور یہ غلط خیال جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں اس کی عملی تردید کا سامان بہم پہنچائیں:

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بند کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

فرد اور ملت

اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ابھی ارتکاز و تفوق کے شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف پھر جرمنی کا فلسفیانہ ماحول نمادہ) ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل حیثیت سے صرف نظر کر لی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزو کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی اولین ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزو ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزو کی ہستی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور سب افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور انکا فکری نشو و نما

اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی۔ اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشو و نما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظام فکر کے بہت سے اجزاء کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ ہلکے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہاں تک کہ اسلامی الٰہیات کی تعمیر نو میں ان کی فکر نے ایک مستقل اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کر لی۔

(باقی)

اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدرآباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں، ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرِفہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے، پھر وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضوان اور مرآۃ ا... کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت سے قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکرگزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خط دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی مفقود ہے۔

بہاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدرداں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب مجلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدرداں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب مجلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی منسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام   محمد اقبال لاہور

(۲)

جناب من السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ ابھی اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے۔ آئندہ دس روز تک وہ بیت اللہ کو جانے والے ہیں ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۰ر جنوری ۱۹۳۵ء

(۳)

بھوپال ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء

جناب قاضی صاحب السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔

اس وقت بہاول پور کی ریاست ہندو مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے۔ موقع موزوں نہیں تاہم اگر آپ مراۃ المثنوی وہاں بھیجنا چاہیں تو عرضداشت کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں منسلک ہے۔ خط بھی عرضداشت کے ہمراہ بھیج دیجیے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴)

جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے میری صحت عام طور پر اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۰ر جولائی ۱۹۳۶ء

علامہ اقبال بحیثیت استاد

صالحۃ الکبریٰ عرشی

یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج و اشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھرمار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے ــــ جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں۔ لوگ بے پروا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوت سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پر زور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرائع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دل چسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہیے اور درج گزٹ ہر وہ بات ہونا چاہیے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقع پر حضرت یزداں میں چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود اسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے متعلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دل چسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمٰن کی پیش کی جاتی ہے جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے یوم اقبال کی ایک نشست منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کی تھی۔ اس جلسے کی دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلق تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور دیا ما کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے محفوظ رہنے میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمٰن۔

دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کچھ اور پر کشش ہو گی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمٰن مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کر دوں کہ وہ سالہا سال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج زندہ دل اور پر خلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شائع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ واپس لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجیے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے:

مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گرد و نواح کی فضا کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ جب آتش جواں تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شائع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کیے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔ اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہنواز بیرسٹر ایٹ لاء مرحوم سے ہمیشہ ان کے خاص تعلقات رہے۔ ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہنواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دلوں کی بے تکلفانہ محفل ہوا کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ اقبال ان دنوں محفل کے روح رواں تھے۔ اور ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے زندہ دل ہیں۔ ان کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لیے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے اور چوں کہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا تھا۔ ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعراء، جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی عینک لگائے رکھے کا ٹن کا کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔ اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا رہا کرتا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے، داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھٹکے برداشت کیے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعرانہ نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہر حال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آتا تھا جو شاید

کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولوی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہلے میں نے وہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام سامعین سن سکتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور مسودہ اقبال کو دے دیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔ اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور کئی سال تک سوائے اس کے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے دکھانا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا سامنا نہ ہو سکا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں فرق آ گیا اور اس میں کم از کم اس وقت تک وہ رندانہ کیف نہ رہا جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اس کی   کہیں سر رہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا

اقبال کے ولایت سے واپس آ جانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول سے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ تھا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑائی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لیے اور ابھی پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا، عین ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا تو لے۔ خصوصاً ایسے۔ ایک جلسے میں جس میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔ رضاکاروں اور حفظ امن کے چوکیدار آئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن ہم بھی "لا زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" والا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی سے مذاق کی باتیں، کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی بہت کھسر پسر کے بعد وہ نئی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے۔ اقبال پہلا بند پڑھنے لگے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں   فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم   قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم   نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پرور شان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو۔

جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شائع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں دو درجنوں پمفلٹ شائع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو برا بھلا کہا۔ لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا اس لیے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا اس پر ہر طرف امید پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں "زمیندار" والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہو گئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے پہل مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گزشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا، اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔ چند بند سن لیجیے تاکہ اقبال کے درد قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھیے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا — اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنیے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

عقل جو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا ۔۔۔ رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا ۔۔۔ نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دلچسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے ان دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے لڑکے خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لیے چین ہیں وہ موجود ہیں اور سنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن چندے کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے پانچسو اور دلوایے تو نظم شروع ہو گی۔ اور جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اور رقم پوری کر دی جاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہو گا۔ تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دینا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع یاد ہے کہ اقبال مسکرا اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مذاحیہ شان میں پڑھی، ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں۔ کچھ اس طرح تھے، ملیندہ باقی۔ بہت سے چندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوتے۔ لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی، یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی Lycidas اور Penseroso, L'Allegro اور کیٹس کی Isabella ڈرائڈن کی Mac. Flecknoe اور غالباً کولرج کی Ancient Mariner شامل تھیں Gray's Elegy کے علاوہ شیلی کی Adonais جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعرا کی طرح گہرا اور پُر معنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعرا ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لیے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے۔ لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (Keats) کے مرثیے کے طور پر لکھی تھی جس کا عنفوانِ شباب ہی میں نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراض کرنے کے صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں رنج و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرعے میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدتِ غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا۔ شیلے کی اپنی موت کا جو ایسا

نظم لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو تطابق موجود ہے گویا یہ ایک قسم کی پیشنگوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا ادا
تو لکھنے والا شیلے دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی۔ اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود شہرۂ تخیل کا بادشاہ
اس مجموعے نے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہوسکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں تو، نو مصرعے کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اس
سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی
سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی
کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔ علامہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں۔ اور ہم
پھر خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔ کالج کا ایک گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لیے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لیے ہوئے آتا ہے۔ اس گھنٹہ
کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اور با دل ناخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کردوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ
ہوسکے۔ اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت
انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔
کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ انسانی
لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دل فریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں
اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نمو نے مٹی کے باہر ظاہر کردیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے۔ اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لیے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف
کو کاف ہی کہتے تھے۔ اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتح پوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی صورت و شکل اور طرز گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ
بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے
ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بند ہی بندھا ہوا ٹو جیکا ہوا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے۔ پیچھے کو
کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کرلی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو سنٹرل
ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لیے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً برتے تلفظ والے پروفیسر کا ناک میں دم کردیا کرتی تھی۔ ان
گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی
کو کسی قصور پر سزا دی ہو۔ بلکہ دھمکی تک بھی کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ سب کو علم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان کے
قریب بیٹھا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ اقبال کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا
گو سنا ہے کہ حقے کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لیے۔ سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ
لیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی بزم سخن کے نام سے تھی جس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن
زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے
تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات طرح مقرر کی

جاتی تھی جس پر سب مشق سخن کرتے تھے۔ اور جیسا کہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ طالب علم تھے، وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعرا میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعروں میں باندھ دیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی دوبالا ہو جاتی تھی۔ خدا جانے اب تک وہ بزم قائم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ (COLLEGE DAY) کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لیے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقابلے میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے تھے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلے کے لیے انھیں کے پاس بھیجدی جایا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم، اور سوم درجہ پر رہتیں کالج ڈے پر تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ اقبال، نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔ فرمایا کہ بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو یہ مشغلہ اچھا نہیں۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پر کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان سے عند الطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مضمونوں ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرعے کے یہ معنی تھے کہ شاعر کے لیے زبان کے الفاظ اظہار خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور ف
آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہو
تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح امڈے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لیے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اس کے ایک شعر بنتا ہے۔ اس وقت تک درجنوں اپنے خیالات بھوا
ضائع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آجاتے تو اس مخصوص شعر سے ش
بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا
کہ اظہار خیال کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خیا
یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا

(اقبال ریویو سہ ماہی

اکبر اور اقبال

نور محمد ایم' اے

کمال اور زوال، بلندی اور پستی، سرفرازی اور تنزلی، ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں پردیسیوں کی نظرِ بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور بسرعت تمام شیب میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ آخر کار وہ حادثہ رونما ہوا، ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ نے ایک سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا اور وہ یا بری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک جلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعۂ ۱۸۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بجا" تھا۔ ۱۸۵۷ء نے جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگزیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا کب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، سیاسی۔ تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں اختلاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے۔ قوموں کا زوال ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی، سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگ جاتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے۔ مذہب سے مسلمانوں کا اکھڑنا اور بچھڑنا ہے روگرانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیل کر دیے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھارن نہ کر سکا تو مسلمانوں کے ہوش مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست۔ جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا انھیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ ان کی بدحواسی، بےچینی اور اضطراب نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کچھ فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے۔ یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوتی ہیں۔

"کل کی نوخیز چھوکری" سلطنت کا سایۂ عاطفت اٹھ جانے کے بعد مبہوت ہو کر رہ گئی۔ یتیمی کے صدمے نے اس سے پہلے اندیشہ میں امتیاز کرنے کی قوت سلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں میں تمیز نہ کر سکی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگم اور شاہوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے، جس وقت قلعہ سے نکالی گئی نادان تھی، عوام کے نرغہ میں جا پھنسی، جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں، ان سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرض اس طرح ادب میں اختلاط رونما ہوا

ایمان میں تزلزل سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں اختلاط ان تینوں نے مل کر مسلم قوم کے لیے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیے بلکہ اسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لیے کسی مردِ کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھے

والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انھیں اپنی بقا کے لیے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کا
سیاستداں کی۔ ان کی کشتیٔ حیات بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد
خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بوتے کا کام نہ تھا، مولوی ابو القاسم
مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سرسید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس
گر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لیے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علی گڑھ
میں ایک مرکزی دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور پایا جاتا ہے۔ حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں
کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لیے وقف تھا انھوں نے ادب
کو پہلی مرتبہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ حالی کے
نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حتی کہ غزل کی سی صنف ادب کو بھی وہ وسیلہ کے طور پر ہی کا
میں لاتے ہیں" حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر نیر بہائے، حالی مغرب سے مرعوب ت
وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے ان کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سرسید کی صحبت اور قربت کا نتیجہ
حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سرسید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیروی
مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں۔ ماضی کی رونق اور حالی
خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیروی مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورا
تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لیے ہم قعر مذلت میں گر پڑے۔ یہ آواز اکبر کی تھی۔ اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشنودی اسی
دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی جب کشمکش اور
الجھن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتش نمرود" میں "بے خطر" کود پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے
قایل نہیں قدامت پسندی ان کا مذہب اور شرقیت ان کا ایمان ہے" غیرت قومی" اکبر کے مزاج کا جزو لاینفک ہے خواہ وہ تعلیم
یا سیاست ہو یا مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرت قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے۔ اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن ج
کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشینوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی
لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انھیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے
منہ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں ـــــ اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کو وہ ندا
آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہے گا کہ
ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی
وضاحت کے لیے یہ ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں؛

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے ۔۔۔ بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی ۔۔۔ یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو　　　باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر　　　اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

خدا جانے کہا کس نے یہ کسی دن عقل سے　　　کہ شرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
عنصر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی　　　مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے　　　کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے منقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے　　　کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار　　　ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں　　　گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں　　　سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار　　　دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے　　　ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں کو کھولی　　　ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے　　　بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں　　　آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد　　　ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح　　　اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ　　　دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ　　　سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں　　　نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو　　　ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں　　　امتی باعثِ رسوائیٔ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں　　　تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے　　　حرمِ کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　　تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے　　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے   مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق   کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں:

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے   خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر   شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی   یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں   حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں   میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیم نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر   خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیمِ زناں خوب نہیں   ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم   قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلے میں اکبر کی ایک طویل نظم "تعلیم نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادی نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا   گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش   مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ   آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اسی سلسلے میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی   نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت   ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن   کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن   ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں:

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے — خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب
نظر ان کی رہی کالج ہی میں علمی فوائد پر — گرائیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا — ذہن کو تپ آئی اور مذہب کو فالج ہو گیا
کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب — دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ
تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمہیں — عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
پرے ہے افکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر — خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی — کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشوں کی
مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں — حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر — اگر فیشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے
خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق — ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن — ہے لطف بحرِ ہستی فیشن کے ساتھ بہنا
انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا — اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار
معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر — تبدیلیِ صورت کے رہے گر یہی اطوار
حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا — شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار
آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے — انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کون ہے تارک آئین رسول مختار — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار — ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغام محبت کا تمہیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظر غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور ہوتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رہنا اپنے آپ کو

نفس انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے (اکبر)
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبال)

قرآن کریم مسلمانوں کے لیے آئین حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی ترقی و سروری کے مدارج طے کیے تو یہ سب اسی آئین حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اکبر کہتے ہیں:

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں:

از یک آئین مسلمان زندہ است — پیکر ملت ز قرآن زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے میں اقبال کیوں زیادہ کامیاب ہے اس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اس کے عقائد پر منحصر ہے۔ اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک دو پیکر ہے تو دوسرا تنہا، ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا، ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ، ایک فلسفی تو دوسرا صوفی لیکن میں اور ظریف پہلے، اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے شاعرانہ

اعجاز سے نہیں ہے کیوں کہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے، کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے۔ اکبر کی شخصیت نہ اتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی، برجستگی، سلاست، طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آ سکتی۔ اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے۔

اکبر کے یہاں شوخی تھی اور ملا کی سوجھ میں بوجھ کو بہت کم دخل تھا۔ اکبر ہر چیز کے مضحک پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اسی کو اس کا پہلو قرار دے کر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و ثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے چشمک زنی کی، وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے، اسی چشمک، کھیل اور ٹکر سے وہ شرارہ وجود میں آیا جس نے ان کے کلام کو زیادہ موثر، زیادہ بلند اور وقیع بنا دیا بر خلاف اس کے اکبر ان چیزوں کو عجوبہ یا بابائی سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اسی لیے وہ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لیے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیز پر زور دیتے ہیں ان کا وار ہمیشہ کوٹ، پتلون، اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن و قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی ناکامی کا سبب ان کے مطالعے کی سطحیت اور فکر و دانش کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہو جاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کر سکتی اقبال کے الفاظ میں:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر ۔۔۔ کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقاؤں کا ہر فعل غلاموں کے نزدیک قابل تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہو گئے تھے اور نظر یں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی یلغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو روک نہ سکتے میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے۔ اکبر کی تاریخی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے انھوں نے اپنے بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتے مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علی گڑھ اور برطانوی سامراج دونوں کا بڑھتا ہوا اثر ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علی گڑھ نے برطانوی قدروں کی حمایت کی تھی اور انھیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر اس ڈھول کا پول کھول دیا اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو نقاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے ان سیاسی تحریکات کے علاوہ سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے اکبر کا یہ کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لیے زمین ہموار کر دی اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا حشر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت

لطیف نازک اور پرمعنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لیے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اڑا دیا گیا اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اکبر نے ہنسا کر رلانا چاہا وہ تبسم میں آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہے میں کتنا کرب کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور برفبار ہواؤں میں شاہد معنی کے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی۔ طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی عمل مسلسل نہ ہو اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہین منت ہے اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے　　دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے خودی کا ہتھیار اس وقت استعمال کیا جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔ اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو شعروں سے معلوم کر سکتے ہیں:

اس میں برائی کیا تھی جو میں　　احیائے رسم دیرینہ رہا

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اسے قبول کر ہی لیا۔

جلوۂ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں　　شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ ان کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ:

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقص دخترانِ بے حجاب

محکمی او نہ از لادینی است　　نے فروغش از خط لاطینی است

قوتِ افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا وہ پیرو ہے وہ تو گنویں کا مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعت ایک لفظ مہمل ہے اکبر نے جو شعر شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ　　گو تقدس مآب بیشک ہیں

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے　　چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاق اور روحانی اعتبار سے اس قدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے ندرت فکر و عمل

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب　　ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی　　ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی کارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ ان کی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انھوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن بتا سکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اکبر نے انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو بھی سے زیادہ نا ننگ سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا مرجھا گیا شاید وہ ارتقا کے قایل نہ تھے:

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد - وہ سماج ہی کیا جس میں لچک نہ ہو بڑے سے درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ زندہ اور قائم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہوتا۔ جس طرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسی طرح اس نے ترقی بھی ہیں کے بل بوتے پر کی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور جدلیاتی تصور کیا۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان کلیوں کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی"

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساس شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سرسید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے۔ ان میں توازن کی ضرورت تھی، چناں چہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سرسید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے پھر دیکھیے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے وہی سرسید، حالی، اور اکبر کے خیالات کی صدائے بازگشت، وہی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کر لو:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

شاعرِ مشرق

سعادت نظیر

یاد ہیں ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا — ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ ق
شاعری نام تھا الفاظ کی صناعی کا — عام فقدان تھا مضمون کی رعنائی ک
نقشِ بے رنگ تھی ارباب سخن کی محفل — لیلیٰ حکمت و معنی سے تھا خالی محم
عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری — بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بے دا
تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال! — جس کے ہر سُر میں ہے فطرت کا جمال و جلا
تیری آواز سے اقوام و ملل جاگ اُٹھے — اک نئی شان سے جذباتِ عمل جاگ ا
تیرے نغمات پہ اربابِ وطن جھوم اُٹھے — جھوم اٹھے اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم ا
گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کیساتھ — نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے سا
تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا — درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری
اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار! — نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہا
دردِ دل تھا جو تری سعیٔ خوش انجام کیساتھ — جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کیسا
تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی — روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائ
تیری پرواز کی رفعت سے فلک ہیں پامال — پایۂ عرش کو چھوتے ہیں ترے فکر و خیا
فکر سے تیرے ملا شعر کو کچھ ایسا مقام — شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغا
جس کے ہر شعر میں جادو ہے، وہ شاعر تو ہے — فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکر تو ہ
تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں — حوصلے عشق کے کچھ اور ابھر آتے ہیں
تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں — تیرا احساسِ خودی اور ترا ذوقِ جنو
تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا — جو نہ اوروں کو نظر آیا وہ جلوا دیکھ
زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں — اور عرفان کے نکتے تری گفتار میں
تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیاروں کی — تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے چمن زاروں

جو درخشاں نہیں گردوں پہ، وہ خورشید نہیں
تو وہ شاعر نہیں، جو زندۂ جاوید نہیں

نورانی تیل

- آپ کے خاندان بھر کے تحفظ کے لیے
- حادثوں کے موقع پر نورانی تیل سب سے اہم ساتھی ہے

اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیے۔ اور درد، چوٹ، زخم
ورم سے نجات پانے کے لیے اسے استعمال کیجیے

ساختہ: انڈین کیمیکل کمپنی مئوناتھ بھنجن یوپی

ایڈیٹر پبلشر نے [illegible] سے چھپوا کر دفتر نگار کھیر کی رام پور یوپی سے شائع کیا

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

نسخۂ عرشی: غالب کے اردو دیوان کا یہ ایڈیشن اپنی تاریخی ترتیب مقدمے اور حواشی کے لحاظ سے ایک اہم بالشان کارنامہ ہے۔ [اس] نے تحقیق و ترتیب کے فن میں اردو کا سر بلند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساہتیہ اکیڈیمی نے اسے ۱۹۶۰ء کی اہم ترین اردو کتاب قرار دیتے ہوئے ایوارڈ دیا۔ (طباعت ٹائپ۔ قیمت ــــ ۲۰ روپے (مجلد)

نادرات شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو اور ہندی کلام جو تاریخ زبان کے مدونین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ مغل بادشاہوں کی [شاہزادگی کی] بت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت اور اس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ [اند]از میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۸ روپے (مجلد)

وقائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس میں شاہ عالم کے عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی [ایک] اہم تاریخ ہے۔ مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندوستان کا [مط]العہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۸ روپے (مجلد)

سلک گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو خود انشا کی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو [ایک] اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی ہی کے قلم سے ہے اور اسے بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح [ظا]ہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۳ روپے (مجلد)

متفرقات غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کر دی [ہیں ج]و اس سے پہلے کبھی اور شایع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہیگا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــ ۵ روپے (مجلد)

اوراق گل: مرتبہ ضمیر احمد ہاشمی، ریاست رامپور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ شاعر کی تصویر [ان کی] تحریر اور حالات زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جوش، جگر، دانش، اختر شیرانی جیسے دو درجن سے [زائ]د شعرا اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرۂ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت ــــ ۱۵ روپے (مجلد)

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے چیپ مین نے ترتیب [دیا ہ]ے۔ حافظ، سعدی، غالب، خیام اور عرشی کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ [اس م]یں نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت ــ دس روپے (مجلد)

[illegible] ایجنسی رامپور [illegible]

Urdu Monthly Rampur U.P. — 42ND YEAR OF PUBLICATION — April
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 21[illegible].57

قیمت { فی پرچہ - ۵۷ نئے پیسے
سالانہ - دس روپے }

بغیر عنوان کے

احمد جمال پاشا (لکھنؤ)

نگار کے لیے پانچ خریداروں کے چندے جلد ہی بھجوا رہا ہوں۔

ذکیہ جیلانی (علیگڑھ)

کچھ پتے لکھ رہی ہوں ان کو میرے حوالے سے ایک سال کے چندے میں نگار وی۔پی سے بھیج دیں۔ خود میرا چندہ یقینی ہے۔

شفقت فاطمہ (سیتاپور)

دو سالانہ خریداروں کے پتے بھیجے جاتے ہیں۔ ان کو وی پی کر دیجیے۔ میں نے پہلے گفتگو میں طے کر لیا ہے۔ اطمینان رکھیں۔

عطا محمد شعلہ (بنارس)

اپنا چندہ مبلغ دس روپے حاضر ہے۔ دو خریداروں کے پتے علیحدہ ایک خط کے ذریعے بھیج رہا ہوں، ان کے نام وی پی نمبر مادیں سلسلہ جلد۔ آئندہ بھی کوشش جاری رکھوں گا۔

(منی آرڈر کوپن سے)

ڈاکٹر محمود الٰہی (گورکھپور)

........میں خود بھی نگار کا چندہ جلد ہی بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔ اگر ہم لوگ بھی خریدار نہ بنیں گے تو کون بنے گا۔

نقی احمد ارشاد (ڈمکا سنتھال)

اس پہاڑی اور قبائلی علاقے میں بھی مقامی ایجنٹ اس نادر ادبی رسالے کو پہنچا دیتا ہے۔ یہاں اردو لکھنے والے تو درکنار بولنے والے بھی بہت کم ہیں۔

آئندہ سے میں نگار کا مستقل خریدار بن جاؤں گا۔

رزاق فاروقی (حیدرآباد دکن)

حسب وعدہ آپ کے نگار کی میں خریدار دے رہا ہوں۔ چھٹیاں ختم ہو جائیں تو کالج کا چندہ بھی پہنچ جائے گا۔ جن خریداروں کے پتے دیتے ہیں ان سے بھی توسیع اشاعت کے لیے کہا ہے اور یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بھی اگلا کوئی نئے خریدار دلائیں گے۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے تو بہت خوب ہو

چھیڑ غالب سے چلی جائے

مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف بتایا ہے۔ غالب کے خطوط میں خصوصیت سے جگہ جگہ یہ وصف نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا غالب کو عام لوگوں تک پہنچانے میں ان کی زندگی کی رنگارنگی اور بوقلمونی بڑا سہارا بن سکتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے غالب کی زندگی کو ان کے کلام اور خطوط کی مدد سے ڈرامائی اور مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ غالب کے بارے میں بہت سے ریڈیو فیچر بھی ملتے ہیں۔ ایسے ڈراموں، فیچروں اور مزاحیہ مضامین کا ایک انتخاب اس کتاب کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کی ہفت پہلو شخصیت کو جتنی عمدگی کے ساتھ ان تحریروں میں سمویا گیا ہے وہ پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تحریروں کے مصنف ہی خود اعلیٰ معیار کے ضامن ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کرنے والی یہ اردو زبان کی اکلوتی کتاب ہے۔

چند لکھنے والے:

ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حمید احمد خاں، پروفیسر آل احمد سرور، سید وقار عظیم، شوکت تھانوی، ڈاکٹر محمد اشرف، ہری چند اختر، حمیدہ سلطان، سراج احمد علوی، کنھیا لال کپور، فیاض عالم، حاجی لق لق۔ اور دوسرے

قیمت ——— ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علی خاں

ضروری اعلان:
...انی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں
رسالہ جاری کر دیا جائیگا
...ندہ نگار ۶۱۷ این سمن آباد لاہور

جلد ۲۴ | فہرست مضامین مئی ۱۹۶۳ء | شمارہ ۵

ملاحظات

خدا مغفرت کرے، شوکت تھانوی چل بسے۔ خبر بڑی اچانک سی تھی۔ وہ دن قاضی جی کی حیثیت سے ان کی حاضری کا تھا کہ ریڈیو نے قاضی عبد الغفور
...نفس بہ نفس کے مدفون ہونے کی خبر سنائی۔ دل کو ایک دھچکا لگا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ جس کا کام ہنسنا ہنسانا تھا وہ رلا دے گا۔ کم لوگوں کو اتنی مقبولیت حاصل
...ئی ہے۔ قلم کے ساتھ ساتھ آواز اور حرکات و سکنات پر جس بے پناہ قدرت کے وہ مالک تھے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی فنکار تھے اور ظاہر ہے کہ
...کاری کا یہ درجہ کتنا ممتاز ہے۔

دو ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی بار طفیل صاحب کے یہاں دفتر "نقوش" میں۔ تانگے سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا اور بغیر کسی دقت کے
...پہچان لیا۔ جیسے وہ خود بول رہے ہوں کہ میں شوکت تھانوی ہوں۔ بڑے مضطرب سے معلوم ہو رہے تھے۔ طفیل صاحب سے اپنی کتابوں کی ایک ایک
...جلد شاید انگلستان کسی ادبی وفد کے ساتھ جا رہے تھے اور جلدی میں تھے مگر لطیفوں سے غافل نہ تھے۔ پھر ایک بار لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ان سے
...ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملے اور اپنی دو کتابیں دیں۔ باخاطر اور قاعدہ بے قاعدہ آخری کتاب دیتے ہوئے کہنے لگے کہ میں خود ہی
بے قاعدہ ہوں کہ آپ جیسے باقاعدہ نوجوان کو قاعدہ پڑھا رہا ہوں۔ وہ حضرت لفظوں کے بازی گر نہیں تھے۔ لفظوں سے اپنا الگ ماحول
...تخلیق کرتے تھے۔ اپنے نمایاں کرداروں کے ساتھ لکھنوی تہذیب کی اتنی پر لطف نمائندگی اب کسی سے کاہے کو ہوگی۔
ان کی بہت سی تحریریں اخباروں میں چھپ کر رہ جائیں گی۔ طفیل صاحب ہی یہ کام کر سکتے ہیں کہ اخباروں کے اوراق سے نکال کر

ان سب کو ایک اچھے انتخاب کی شکل میں شایع کر دیں۔ اُن کے ورثہ کو بھی اس سے یک گونہ مگر بروقت تسکین کا سامان بہم پہنچے گا۔
اگر آج ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تو شوکت تھانوی جیسے کتنے ہی ہندوستانی پاکستانی مصنفوں کے حقوق محفوظ رہتے اور ان کے اہل و عیال پر آئی ہوئی مصیبت اتنی سخت نہ رہتی جتنی موجودہ صورت میں بن جاتی ہے۔ سنا تھا کہ انجمن مصنفین پاکستان سلسلہ جنبانی کر رہی ہے مگر شاید وہ بھی سپرانداز ہو گئی۔ اور یہ اہم ترین معاملہ جو کتنی ہی بدعاملگیوں کا سدباب ہو سکتا تھا لیت و لعل میں پڑا ہوا ہے ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ بھی اس حق کے لیے آواز اٹھائیں۔ اس ملک کا تو قدیر اعظم بھی مصنف ہے۔ اس سے زیادہ اس "امت" کے حقوق کو کون جانے اور سمجھے گا۔ شوکت تھانوی کی موت نے مصنفوں کے جائز حقوق کی یاد دلائی ہے تو انھیں یہ حق ملنے بھی چاہئیں۔ کیا کتابوں اور رسالوں کی تجارت سے زیادہ بے ضرر تجارت ان دونوں ملکوں کے درمیان کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس تجارت سے زیادہ مبارک کوئی اور تجارت بھی ہے جس سے عقل و علم کی دنیا میں روشنی اور عمل کی دنیا میں ہما ہمی آئے۔

کشمیر کے مذاکرات ختم ہو گئے بغیر کسی نتیجے تک پہنچے ہوئے۔ یہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھتا تو دو قریبی ملکوں کے تعلقات شستہ اور شائستہ ہو جاتے۔ لاکھوں انسان اِدھر اور اُدھر دونوں طرف آنے جانے کی پابندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اعزا و اقارب کہاں ہیں اور خود کہاں، کتنے دوست چھوٹے کتنے اپنے دیکھتے دیکھتے اس حد بندی نے پرائے سے کر دیئے۔ ایسے قریب کے پڑوسی کب تک الگ تھلگ رہیں گے یا رہ سکیں گے۔
وصل و فراق کی یہ کیفیت اور امید و بیم کا یہ طلسم دیکھیے کب ٹوٹتا ہے۔ اور دو بھائی کب گلے ملتے ہیں، ایسے کہ فرط مسرت سے ان کی آنکھیں اشک بار گلے رندھے ہوئے اور دل کی دھڑکنوں میں انبساط فراواں کے نغمے مچلتے ہوں۔ دو بھائی ——— ہند و پاک۔

جنوری میں نگار کے خاص نمبروں کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ سب سے پہلے ذاکر حسین نمبر کی تیاری کرنا ہے یوں تو ادارہ نگار فرداً فرداً بھی تعاون کی درخواست کرے گا مگر ضروری نہیں کہ سارے متعلقین تک پہنچ ہو سکے اس میں بہت سی دشواریاں ہوتی ہیں بعض اوقات صحیح پتے نہیں معلوم ہوتے اس لیے مدیر نگار درخواست کرتے ہیں کہ اس نمبر کی تیاری میں کوئی بھی مدد دے سکتے ہوں وہ اس سے گریز نہ فرمائیں اور اس بات کا بھی انتظار نہ کریں کہ براہ راست انہیں لکھا ہی جائے۔ اس اندازے کے کاموں میں گزشتہ شمارہ رسوم و قیود نہیں رہنا چاہیے۔
جامعہ ملیہ دہلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور حیدرآباد میں ذاکر صاحب کے دوستوں عقیدت مندوں اور شاگردوں کے حلقے آباد ہیں۔ یہ حضرات توجہ کریں اور ذاکر صاحب کی شخصیت ان کے تعلیمی کارناموں پر لکھیں۔ ذاکر صاحب کے خطبات و پیغامات اور خطوط وغیرہ کو روداوں اور رسائل و اخبارات کے صفحوں سے جمع کریں۔ ذاتی خوردہ ان میں سے جو کچھ بھی جس کسی کے پاس ہو وہ اسے ملک و قوم کی امانت جانتے ہوئے ادارہ نگار تک پہنچائے تو یہ نمبر ایک اہم دستاویز بن جائے گا اور اس طرح ادب و انشا کے شہ پاروں کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم و تعلم کے ایک اہم تجرباتی دور کی تاریخ بھی سمٹ آئے گی ———

جذبات نادر کے ترقی اردو بورڈ ایڈیشن پر برادرم رشید حسن خاں نے حسب عادت بڑی محنت سے تبصرہ کیا ہے۔ ترتیب کا کام جتنا آسان سمجھا جاتا ہے در اصل اتنا آسان نہیں۔ اس کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو نولکشوری عہد کی کتابوں اور موجودہ دور کی مطبوعات میں کیا فرق ہوگا۔ یہ تقاضے اس صورت میں اور بھی سخت ہو جاتے ہیں جبکہ کتاب پہلے سے مطبوعہ شکل میں موجود ہو اور پیش کرنے والے کا یہ دعویٰ بھی ہو کہ اس نے ایڈیٹنگ کے ذریعے زیادہ مکمل شکل دینے کی کوشش کی ہے ——— اردو میں ایڈیٹنگ کا معیار کیوں بلند نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے۔ اس کے وجوہ بہت سے ہیں جب میں مرتب نو ناشر اور ان دونوں کے ساتھ اہل علم کا تساہل بھی کچھ شامل ہے آئندہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

اردو ڈراما — حال اور مستقبل

ڈاکٹر عبد العلیم نامی

اردو ڈراما عہد جدید کی پیداوار ہے اور اس کے لیے ہم پرتگیز کا جس قدر احسان مانیں کم ہے۔ مغربی اقوام میں پرتگیز ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ من حیثیت القوم سب سے پہلے لوگ ہیں جو نامعلوم راستوں کو عبور کرتے ہوئے ساحل ہند تک پہنچے اور صرف بارہ سال کی کوشش سے نہ صرف گوا پر قابض ہو گئے بلکہ اس کے ذریعے ایک وسیع علاقے کے حاکم بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں بہمنی حکومت کے زوال پر احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اردو اپنی ابتدائی منزلیں طے کر کے عدالتی زبان بنتی جا رہی تھی۔ سلاطین دکن نہ صرف علم و ادب کے سرپرست ہی تھے بلکہ خود بھی سخن سنجی اور سخن فہمی کا خاصا ذوق رکھتے تھے۔

یہ روضۃ الکبریٰ کے بھی عروج کا زمانہ تھا۔ اسپین کی عظمت ایک کیتھولک ملک کی حیثیت سے مسلمہ تھی اس لیے اسقف اعظم کے اشاروں پر چلنے والی حکومتیں فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ مبلغین کے دستے بھی روانہ کرتی تھیں جو "جاہل اور بت پرستوں" کو "خداوند یسوع مسیح" کا درس دیتی اور "آسمانی روشنی" سے ان کے دلوں کو منور کرتی تھیں۔

گوا کو مرکزی حیثیت ملتے ہی مبلغین تثلیث نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ چونکہ اردو عوامی زبان بن چکی تھی اس لیے پرتگیز نے اسی کو تبلیغ تثلیث کا ذریعہ بنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھر کر نہ صرف تقریروں کے ذریعے حضرت عیسیٰ کے پیغام کو پہنچایا بلکہ ان کی زندگی کے حالات بھی اسٹیج پر پیش کیے۔ یہیں سے اردو ڈرامے کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگرچہ اب تک اردو کے ابتدائی دور پر تحقیق کرنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے اور یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ پرتگالیوں نے اپنے دور میں کس قدر مدارس اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے قائم کیے۔ نصاب کس قسم کا تھا۔ درسی کتابیں کس نے لکھیں اور کب لکھی گئیں اور آیا مابعد زمانہ میں وہ شائع ہو گئیں یا نہیں۔ پرتگیز مدارس کے مدرسین ہندوستانی تھے یا سب غیر ملکی، اردو اور فارسی کے علاوہ دکن کی اور کونسی زبانیں ان مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اگر ان سوالات کا جواب ہم کو مل جائے تو نہ صرف اردو ڈراموں کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چل جاتا ہے بلکہ تاریخ ادب اردو کے ابتدائی دور کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں گی۔ ہمیں امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جب اردو ادب کے محققین اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں گے۔

پرتگالیوں کی خوش قسمتی سے مغلیہ حکومت کا آفتاب طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اکبر نے فتوحات دکن کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس لیے مبلغین تثلیث کے سامنے ایک نیا میدان آیا اور انھوں نے دہلی اور آگرہ میں بھی تثلیث کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اکبر اور جہانگیر کی سرپرستی اور مسلم اراکین دولت مغلیہ کی ہمت افزائی نے ان کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اور وہ پنجاب اور کشمیر سے آگے بڑھ کر تبت تک جا پہنچے۔ پرتگیز مبلغین کو اس داد و دہش سے کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ ہم کو البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ تبت میں بھی اردو سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ تبلیغی سلسلہ کم و بیش ایک صدی تک جاری رہا۔ بعدہٗ انقلاب زمانہ نے پرتگالیوں کو بیک بینی و دوگوش ہندوستان سے رخصت کر دیا۔ ان کی جگہ پہلے ڈچ۔ پھر فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے لی۔

ابھی تک ہم یہ نہیں معلوم کر سکے ہیں کہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی لہٰذا ہم اس عبوری دور سے گزرتے ہوئے ۱۷۵ پہنچتے ہیں جب کہ انگریزی کا پہلا اسٹیج ہندوستان میں قائم ہوتا ہے۔ اس کا نام "بمبئی تھیٹر" تھا اور بمبئی گرین "بمبئی" میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ اسٹیج ۱۸۳۶ء تک قائم رہا۔ بعد کو قرض خواہوں کی نذر ہو گیا۔ دس سال کی کوشش اور جد و جہد کے بعد ایک دوسرا انگریزی اسٹیج ۱۸۴۶ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا سرکاری نام اگرچہ "بمبئی تھیٹر" تھا لیکن وہ "گرانٹ روڈ تھیٹر"، "راتی کا تھیٹر" اور "شنکر سیٹھ کا تھیٹر" بھی کہلاتا تھا۔ اس میں ۱۸۵۳ء تک صرف انگریزی ڈرامے دکھلائے جاتے تھے۔ سال مذکور میں

بی تھیٹر کی مجلس منتظمہ کے ایک اہم رکن جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے کمیٹی کی اجازت سے اس میں مرہٹی ڈرامے دکھلائے کیوں کہ مرہٹی شنکر سیٹھ کی مادری زبان تھی لیکن مرہٹے نکہ اوسطاً غریب تھے اس لیے مسلسل نقصانات کے پیش نظر مرہٹی کے بجائے ہندوستانی یا اردو میں ڈرامے دکھلانے شروع کیے۔ چونکہ انگریز اردو زبان سے واقف ہے جو ان کو بطور زبان خاص الیسٹ انڈیا کالج لندن اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سکھلائی گئی تھی اس لئے انھوں نے اردو ڈراموں کو خوش آمدید کہا اور پہلا ڈراما "راجہ گوپی چند اور جلندھر" ۲۶ نومبر کو دکھلایا گیا تھا دیکھنے کیلئے گورنر بمبئی، کونسل کا نڈرانچیف اور دوسرے سول اور ملٹری عہدیداران سرکاری شریف لائے۔

یاد رہے کہ "راجہ گوپی چند اور جلندھر" ۱۸۵۳ء میں دکھلایا گیا۔ گورنر اور کمانڈرانچیف کی موجودگی میں پیش کیا گیا۔ ایک ایسے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو لندن کے رائل تھیٹر ڈرری لین کے نمونے پر تیار کیا گیا تھا اور انگریز جسے "آدرش ڈرری" کہتے تھے اور جس کا مکمل ریکارڈ اب بھی حکومت مہاراشٹر کے آرکیوز میں محفوظ ہے۔ پھر بھی بعض لوگ "رہس" کو "ڈرامہ" سمجھ کر جلسے میں پیش کرکے "اندر سبھا" کو اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی شواہد کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے عہد تک لکھنؤ میں کوئی اسٹیج ہی نہ تھا۔ نہ پرتگیزوں نے تعمیر کیا تھا۔ نہ ڈچ اور فرانسیسیوں نے اور نہ کبھی انگریزوں نے اس کی تعمیر کا خیال ظاہر کیا تھا اس لیے اگر "ٹھمری"، "رہس"، "بیلا" اور "رہس" وغیرہ کو ناٹک کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جب اسٹیج ہی موجود نہ ہو — واجد علی شاہ جیسے اعلیٰ قدر حکمراں نے ماڈرن اسٹیج ہی نہ دیکھا ہو اور امانت جیسے مصنف کو خواب میں بھی کبھی نظر نہ آیا ہو تو واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کا رہس کس طرح ڈرامے کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

اردو ڈرامہ کا مقدمہ کچھ طویل ہو گیا۔ آئیے اب ہم اردو ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اردو ڈرامہ پانچ ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور ڈاکٹر بھاؤ دجی لاڈ سے شروع ہو کر نربدا شنکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والے تقریباً سب پارسی تھے الا سوکر بابوجی ٹھلو گیکر کے جو ایک مرہٹہ تھا اور نربدا شنکر کے جو گجرات کا باشندہ تھا۔ پارسی ڈراما نویسوں میں افضلیت کا شرف خان صاحب شروان مہروان جی آرام کو حاصل ہے جنھوں نے گل بکاؤلی، گل باصنوبر، بے نظیر بدر منیر، ہیرا، چندراولی، حاتم طائی، باغ و بہار، لیلیٰ مجنوں، عالمگیر، گوپی چند، جوان بخت، گل بکاؤلی، نورجہاں، بہرام اور شیریں نامی ڈرامے اور ایک درجن کے قریب اوپرا یعنی منظوم ڈرامے لکھے۔ اس کے بعد ایدل جی جالی، بندہ خدا۔ ڈاکٹر پارکھ، سرانڈ صیلیا۔ فرامرز۔ کابراجی کھودی اور جہانگیر پٹیل کا نمبر آتا ہے۔ جنھوں نے نوشیروان، پاکدامن گلنار، بھولی گل، دورنگی دنیا، رستم و سہراب، جمشید، شاہزادہ شیاوکس، خدا بخش، ظالم نورور، ستمگر، عالمگیر، پاکدامت بردین وغیرہ لکھے۔ اس دور کے ڈرامے عموماً گجراتی زبان میں لکھے اور اردو میں ترجمہ کیے جاتے تھے۔ آرام کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ اردو فارسی سے واقف تھے اور براہ راست اردو میں لکھا کرتے تھے۔

دوسرا دور احمد حسین خاں سے شروع ہو کر بابو ہرش چند پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے بیشتر ڈرامہ نویسوں نے اپنے ڈراموں کی زبان کے لیے اردو کا استعمال کیا ہے جہاں سے واضح طور پر اردو کی مقبولیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لکھنے والوں میں افسوس مرادآبادی، امراؤ علی لکھنوی، بابو بانیشور پرشاد۔ بزرگ لاہوری۔ جیرت خاں مبتلا، وصیت رائے ملیں، فقیر محمد تیغ، سید سجاد حسین جوہر بنارسی، میاں چراغ الدین چراغ، لالہ چندن لال، محمد الف خاں حباب فتح پوری، درگا پرشاد، دینا ناتھ فتح آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ان کے ڈراموں میں خورشید حسینا، نازاں، رزم بزم، طلسم عشق، جعد جابر، ساحر سبھا، سحر سامری، عشرت سبھا، طلسمات سلیمانی، اکسیر اعظم، دلبر دلسیر، انجام الفت، ہما مانند العصمت کا ڈاکو، شرارہ عشق، جشن کنور سین، مارآستین وغیرہ قابل ستائش ہیں۔ اسی دور کے دیگر ڈراما نویسوں میں صدیق بنارسی، سجاد حسین، کیدار ناتھ صورت، ونائک پرشاد، غلام حسین ظریف، بیدیر عباس علی، حافظ محمد عبداللہ، عبدالوحید قیس، پنڈت بنواری لعل، شعلہ شمس آبادی، غلام قادر فصیح، مراد بریلوی، نظیر اکبرآبادی اور نظامی جبلپوری نے کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا تیسرا دور احسن لکھنوی سے شروع ہو کر یعقوب علی پر ختم ہوتا ہے۔ چونکہ یہ دور اردو ادب کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس لیے ڈراما نویسوں اور ان کی تصانیف کی تشریح ضروری سمجھی گئی ہے۔

احسن لکھنوی ۱ کے بیس ڈراموں میں چندراولی، خون ناحق، بزم فانی، الفرڈس، بھول بھلیاں، چلتا پرزہ، شریف بدمعاش کافی مشہور ہوئے۔

آرزو لکھنوی :- کے دس ڈراموں میں متوالی جوگن اور حسن کی چنگاری سے شہرت پائی۔

بیتاب دہلوی :- کے ۱۲ ڈراموں میں کرشن اوتار۔ کسوٹی۔ میٹھا زہر۔ زہری سانپ۔ امرت۔ مہابھارت۔ رامائن۔ اور کرشن سداما اسٹیج پر مقبول ہوئے

حشر کاشمیری :- کے ۳۲ ڈراموں میں اسیر حرص۔ شہید ناز۔ صید ہوس۔ خواب ہستی۔ خوبصورت بلا۔ یہودی کی لڑکی۔ بلوا منگل بھگیرت گنگا۔ ہندوستان ترکی حور۔ سیتا بن باس۔ دھرمی بالک۔ بھارتی بالک۔ دل کی پیاس اور رستم و سہراب نے نام پیدا کیا۔

دیوانہ امرتسری :- کے کئی درجن ڈراموں میں تائید یزدانی۔ مہاراجہ۔ آفتاب۔ اجودھیا۔ سیر پرستان کافی مقبول ہوئے۔

ذاتی لکھنوی :- کے ۱۴ ڈراموں میں نور عرب۔ تاج نوران　ستی ساوتری۔ زہر کی انگوٹھی۔ فخر عرب۔ دھرم یوگی۔ کٹھورہ بھر خون نے شہرت پائی۔

رحمت علی :- کے نصف درجن ڈراموں میں درد جگر۔ باوفا قاتل۔ جلاد عاشق مشہور ہوئے۔

عباس علی :- کے ۱۳ ڈراموں میں۔ نیرنگ ستمگر۔ جہاں آرا۔ جان نثار۔ نور اسلام۔ پنجاب میل۔ شریمتی منجری، موہنی بی اے۔ لیڈی لاجونتی پورن مل۔ ستی سندری نے عزت پائی۔

محشر انبالوی :- کے ۱۹ ڈراموں میں دشمن ایمان۔ جوش توحید۔ دوزخی حور۔ خون جگر۔ سنہری خنجر شکنتلا۔ خود پرست کافی مشہور ہوئے۔

مراد لکھنوی اشتر لکھنوی اور مراد لکھنوی کے ڈراموں نے بھی کافی شہرت پائی۔

اردو ڈرامہ کا چوتھا دور آرزو بدایونی سے شروع ہوکر بیتاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں آرزو بدایونی۔ آصف مدراسی۔ اعظم حیدرآبادی۔ افسوس شاہجہانپوری۔ دل لکھنوی۔ راحت مرادآبادی۔ رادھے شیام۔ رند صبر۔ شمس گیاوی۔ اور شمس لکھنوی نے نام پیدا کیا۔

اس کے بعد جب اردو ڈرامہ اپنے پانچویں دور میں داخل ہوتا ہے تو کم از کم اپنی ٹکنک ختم کر چکتا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو صرف مطالعہ کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔

اگرچہ اردو ڈرامہ آج ختم ہو چکا ہے اور اسٹیج کم و بیش مردہ تصور کیا جاتا ہے لیکن حالات بتلاتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں ہے جب اردو اسٹیج دوبارہ اپنی سابقہ عظمت حاصل کرے گا۔

آج ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ عوام کو ڈرامے کے صحیح فن سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ اپنے ڈراما نویسوں اور ان کے پیش کردہ ادب کو پہچان سکیں۔ آج دنیا کا ہر ملک اپنے ڈراما نویسوں پر فخر کرتا اور نظم میں ڈرامے کو سب سے بلند مقام دیتا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ معلوم کرکے تعجب نہ ہوگا کہ شکسپیئر۔ شاد۔ ابسن۔ گوئٹے۔ شلر اور گالسوردی کا درجہ اپنے ملک کے دوسرے ادیبوں پر بھاری ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو اسٹیج اور ڈرامہ کا مستقبل شاندار ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ اس میں دلچسپی لے کر اس کو اس کے صحیح مقام پر جلد یا بدیر پہنچا دے گا۔

حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم۔ اے

انسانی نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا اتھاہ سمندر ہے جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقتی بے وقتی ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں، جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے، انہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک ممتاز کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی تجسس حسن، مرکز گریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خود کفالتی، ولولہ، ہم جوئی اور انقلاب حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے تو صحت و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح کے زیادہ موسیقیت اشاریت اور معنی و مفہوم کی نہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں، غرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتی ہے جس کی تسکین کے لئے فطری طور پر خارجی ماحول میں دل بستگی و دل آویزی کی جستجو، جاذب نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیال کا تجسس، کھلی ایک جہتی، اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقینی سامانی کے ساتھ حسینوں کے ارتباط یا تذکرۂ حسن میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ دھار لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ نفسیات پر چھا جاتی ہے، رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعر کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر نہ صرف حسن کے جلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے احساس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے۔ احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، عملی صلاحیت، عہد گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشاراتی انداز قابل لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے مدد و معاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کر کے مسحور کر لیتا ہے۔ اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں جن کے احساسات کی شعاعوں نے غم حیات کے طوفان باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوس قزح کی تشکیل کی ان میں ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں جنھوں نے چکی کی مشقت کے دوران میں بھی رومانی غزل نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی، نشاط کی کیفیت، ساماں کی آسودگی اور احساس جمال کی شدت پائی جاتی ہے، ان کے یہاں ایک صحت مند باذوق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار ہیں مگر چونکہ بہار و باغ کائنات "صنف نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اسی بت ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکز دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور دسیسہ کار بھی نہیں، پاک باز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی اے حسن حیا پرور! شوخی بھی شرارت بھی

حسرت اپنی بے قراری دل کا اظہار کرتے ہیں مگر زبان سے نہیں، آنکھوں سے کیوں کہ محبوب کے خاطر نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؎

گراں گزرے گا شکوہ ز رواں طبع نازک پر نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعب حسن اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرت اظہار دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دور آتا ہیں عہد ہوس کا ایک واقعہ جو عاشقان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے

ا ہی سادگی سے بے جھجک جرأتِ رندانہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار اُن کی مشتاق نگاہیں، ختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں، وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے، اس سے کبھی وہ مل کر دفورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں شرم و حیا کی ماری دانتوں میں انگلی دبا لیتی ہے، کبھی درازدستی سے پردہ گرا دیتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منہ چھپا لیتی ہے، سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوخی سے کر مسکرا دیتی ہے، ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور جستہ جستہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ چوری چھپے رات غیروں کی نظریں بچا کر آجایا کرتی تھی اور دورانِ ملاقات بھی ذکرِ فراق آجاتا تھا تو رُوتی تھی اور رُلاتی بھی تھی، دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی، اس کی بھولوں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو طبلۂ عطار تیں اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دست و پا رنگینی کا نظر میں جنچنے والا معیار پیش کرتے تھے، چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے ذکر کو باتوں میں اڑا دیا تی، مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی، انھیں برگشتگی پر سو سو ناز سے منایا جاتا اور وہ جب مان جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی، وہ چھیڑتے، گدگداتے، وہ بڑ کر منتی اور من کر بگڑ جاتی ؎

اے شوق کی بے باکی! وہ کیا تری خواہش تھی؟		جس پر اُنھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

اس ناز میں سے لڑائی بھی ہوتی ہے اور صفائی بھی، تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و دلی کا خوف عناں گیر، حضرت کی اس ابتدائی سادگی و سیر دگی کی جگہ آخر میں ر لودگی و سنجیدگی لے لیتی ہے جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی لے سے ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ باتوں سے وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے تقدیر پھرتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغاز لک ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر سچ نہیں ہوا کرتی، قیدیٔ غم ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جنابی اور گردوں رکابی پر ناز کرنے ہیں عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے بیش بہا سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیش بافراغت اور بیگانہ رسم محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تا دمِ مرگ اُن کی حیاتِ عشق کا آسرا بنی رہی :

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے		اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں		یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
اک بار کی تھی سو وہ ۔۔۔ دل میں ہے موجود		اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دز دیدہ نگاہی		پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالانکہ جیسا ان کے کلام سے پتا چلتا ہے، محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ ز و نیاز منقطع ہو چکا ہے، نہ وہ ہمنشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی، بایں ہمہ قنوطیت، جو منجملۂ لوازماتِ فراق ہے، حسرت کے دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکی وہ کبھی ناامید و مایوس نظر نہیں آتے، اور انہیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بساتے اور متکیف ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ روداد ن کا شبہ گزرتا ہے :

اے یادِ یار! دیکھ! کہ باوصفِ رنجِ ہجر		مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم
شب وہی شب ہے، دن وہی دن ہے		جو تری یاد میں گزر جائیں
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر		ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد		وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دیار محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے، جدائی کے عالم میں وہ کبھی رو رُو کے دل آزار کے سرت کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر بلستے بھی ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہو گئی تو انھیں کشمکشِ انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پہ شکوۂ بے اعتنائی ہوگا اور نہ خلشِ فرقت ہی سے کہ دل لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا سخت ترین مرحلہ ہے ؎

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی　　حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اصل میں بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین زمانے کو ایک خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھالیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائل آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارمان ہو نہ کوئی حسرت ملکہ بے نیازئ معاملہ، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے ؟

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر　　اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا　　مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے ناز بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسنِ کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

فنکارانہ رمز کاری شعر کو دلکش بنا دیتی ہے تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں، ان سے معمولی اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا نوع بہ نوع رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں حسن و خوبی سے برتے گا، شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات، استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیرہن اس کا ہے سادہ رنگیں　　یا عکس مے سے شیشہ گلابی

دو تن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

چمن جاں میں نسیم ہوس انگیز چلی　　کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

اسی سے پھیلتے ہیں، ہو نہ ہو جب یہ ان کی نظر　　اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روزمرہ کی ہوئی پیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہمنشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے　　شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں　　شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت　　نگہِ شوق نے کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرتِ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہونچاتا ہے کہ ہر ایک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات کو

ہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے
ا اپنا تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا بیخ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی
ل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرت کمال ہے، ان باتوں کا دارومدار
یت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی
سے ماحول معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت
یت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے،
کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت سموئی ہوئی سی محسوس
جس سے ان کی شاعری میں ایک دل کشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول
ن ہے:

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
لایا ہے دل پہ کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی
حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے، مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا
جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساسِ جمال، صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق
ت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت و بے باکی مثالی
ن کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات
کہیں اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی:

بلطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں؟ — شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی — یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت موہانی فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب
کے رسولی قید و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام
رومانیت ہے، گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پرکشش
ن کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں، لب و لہجہ خوش گوار
ہو جاتا ہے، اضطراب و حشر سامانی بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ نہیں
رمزیت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے
ہو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آفریں رومانیت کی جلوہ گری

کرتے ہیں:

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں
دام گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

بقیہ سن انیس سو ساٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، بھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا، بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، لیل و نہار، قومی آواز، پیج، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر لینے نظر آتے ہیں۔

اردو کارٹون کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون "آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات" قومی آواز میں پرکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار" کوہستان میں حمید کا "میر صاحب" پیج کا "چلتی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی" سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں دہاب جبار کی "سنی سنائی"، ملاپ میں پران کی "آج کی بات"، شمع میں سدھیر کے مٹتے گیت، پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے تجربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادیبوں میں خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور پر بچوں کے رسائل کارٹون کے بغیر ادھورے رہتے ہیں اور اخبارات کا یہ روز بروز لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے اچھی کتابیں اچھے مضامین اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، ہر چند کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتار ادب حوصلہ شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی ۔ حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل میں آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں اور سب بے وفا ہو جائیں، عشق کے حسین فسانے کو خوابِ فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھالیں، کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائلِ آرام ہوں اور مشتاقِ شفا بھی، انھیں کوئی ارماں ہو نہ کوئی [حسر]ت بلکہ بے نیازئ مدعا ہو، عہدِ وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اُس حسنِ ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس [کی با]ت ہے؟

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر ۔ اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

کوئی عشق بازی کا مشغلہ نہیں کھیل! اے دلِ مبتلا ۔ مگر اب کیا ہے جو حوصلہ تو خوشی سے نازِ بتاں اٹھا

حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ کہیں [انھو]ں نے ابتذال اور فحاشی کی بھی پروا نہیں کی، ان کے یہاں مذاقِ سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں، لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں [جو ا]ن کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں، جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ذوق جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی ۔ مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

[ا]یک سحر آگیں شعر غزل میں ایک شاہ پارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسنِ کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام "جنوں" پڑ گیا جنوں کا "خرد" ۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

[فنک]ارانہ پُرکاری شعر کو دلکش بنا دیتی ہے تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں، ان سے مبتذل اور [پاما]ل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہو جاتا ہے، اگرچہ ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کیوں کہ وہ اپنی صلاحیتوں [س]ے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے، ان کی تشبیہات، استعار[ے او]ر کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں:

پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں ۔ یا عکس مے سے شیشہ گلابی

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام ۔ دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

چمنِ جاں میں نسیمِ ہوس انگیز چلی ۔ کشتِ امید پر ابرِ طرب آثار آیا

اسی سے بچتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ اُن کی نظر ۔ اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

نفسیات کی یہ بالکل روزمرہ کی پیش پا افتادہ بات ہے کہ بات پر بات یاد آتی ہے، چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے:

نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے ۔ شرابِ بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت دیا ہے:

نگہِ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں ۔ شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوبِ اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے:

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت ۔ نگہِ شوق نے، کیا جانیے! کیا دیکھا ہے؟

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگا رنگ پہلوؤں سے کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی، نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے، مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے کے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہ شاعر ہی کا حصہ ہے کہ بقدرِ قدرتِ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہونچا سکتا ہے کہ ہر ایک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے اور مزہ لیتا ہے، شاعر اپنے جذبات کی

بانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے
ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا چیخ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی
رے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کمال ہے، ان باتوں کا دارومدار
خلی زعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی
نیت سے ماحول معاملات و تجربات کی اثر اندازی پر ۔ جس شاعر میں رومانیت
ں شدت کی ہوگی، اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ، موثر اور پسندیدہ ہوں گے،
رت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت سموئی سموئی سی محسوس
ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دل کشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول
ضامن ہے :

اللہ رے! جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے دل پر کتنی خرابی!
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

حسنِ جاناں سے یہ کہتا ہے، مرا شہرۂ عشق
دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا

جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے؟
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے؟

حسرت کے کلام میں احساسِ جمال صحت مندیٔ ذوق، معاملاتِ حسن و عشق
کی بصیرت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی، شگفتگی اور لطافت و بے باکی نمایاں
ہے، ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات
میں تندی نہیں، اعتدال ہے، اور احساسات میں کیف آگینی و نشاط انگیزی :

تجدیدِ لطفِ یار کی لذت میں کیا کہوں
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی دل ہم نے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت ہوائی فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب
تمدن کے اصولی قیود و بند سے آزاد ہو کر انبساطِ احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام
رومانیت ہے، گامزن ہوتے ہیں۔ جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پرکشش
نقوش کہیں ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں، لب و لہجہ خوش گوار
ہو جاتا ہے، اضطراب و حشر سامانی بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ لو نہیں
اشاریت جھلکنے لگتی ہے اور وہ اپنے اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے
میں سمو کر لطیف پیرایۂ بیان میں اپنی طرب آفریں رومانیت کی جلوہ گری
کرتے ہیں :

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
جلد، اے حوصلۂ دید! مجھے تھام کہیں

دامِ گیسو میں ترے اک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

بقیہ سن انیس سو باسٹھ کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

نمکدان، پاک پنچ، پھلجھڑی، بھوپال پنچ، بیسویں صدی، شمع، بانو، کھلونا، بھائی جان، امروز، جنگ، کوہستان، داستان گو، نصرت، لیل و نہار، قومی آواز، پنچ، انجام، سیاست، انقلاب اور ملاپ میں خبر لیتے نظر آتے ہیں۔

اردو کارٹون کی تاریخ اودھ پنچ کی طرح نمکدان کے سیاسی اور سماجی کارٹونوں کا ایک الگ باب تیار کرے گی۔ نجمی اور جمیل کے قلم میں اودھ پنچ والی تیزی اور شوخی ہے۔ جنگ میں نجمی کا مستقل کارٹون "آپ سے ملیے" امروز کے لیے "بڑے میاں" اور "وقت کی بات" قومی آواز میں پرکاش کی "ایک ہی" اور "زمانے کی رفتار"، کوہستان میں حمید کا "میر صاحب" "پنچ کا چلتی دنیا" انجام میں محمود بٹ کے "منشی جی" سیاست حیدرآباد میں احمد کے مستقل کارٹون، انقلاب میں دہلا حبیب رکی "سنی سنائی"، ملاپ میں پران کی "آج کی بات"، شمع میں سدھیر کے "ملتے گیت"، پاک پنچ میں عزیز کے کارٹون، پھلجھڑی میں شہاب کے کارٹون اور ان کے علاوہ داستان گو، نصرت اور اردو کے بیشتر رسائل و اخبارات میں شنکر اور دوسری زبانوں کے کارٹونوں کے چربے اس بات کے ضامن ہیں کہ کارٹون کے فن پر ہمارے ادب میں خاطر خواہ توجہ دی جا رہی ہے۔ اور اس فن کا مستقبل خاصہ روشن ہے۔ خاص طور پر بچوں کے رسائل کارٹونوں کے بغیر ادھورے رہتے ہیں اور اخبارات کا یہ روز بروز لازمی جزو بنتے جا رہے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی طنزیہ و مزاحیہ ادب خاصہ آگے بڑھا ہے اچھی کتابیں اچھے مضامین اور اچھے لکھنے والے اچھے مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، ہر چند کہ بہترین ادب معیار و مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں پیدا ہوا مگر پھر بھی رفتار ادب حوصلہ شکن نہیں بلکہ خاصی حوصلہ افزا رہی، اور مستقبل میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی نئی وسعتوں اور بلندیوں کے امکانات زیادہ واضح اور روشن

ذوق — ایک مطالعہ

محمد انصار اللہ نظر

تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ عہد آفریں صرف وہی شخصیتیں ہوتی ہیں جو ماضی کی روایات کو اچھی طرح جانتی سمجھتی اور برت سکتی ہوں ساتھ ہی ان میں یہ صلاحیت بھی ہونی لازم ہے کہ وہ ماضی سے مستقبل کے لیے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکیں، ہر زمانے کے لیے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور یہ تقاضے ہر حال میں پورے ہو کر رہتے ہیں البتہ کچھ ذہین اور با استعداد اشخاص ان تقاضوں کو سمجھ کر ان کے لیے مناسب ذرائع پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں ایک انقلاب پیدا ہوا، زبان و ادب کو بھی ایک نیا انداز اختیار کرنا تھا۔ سرسید اور حالی، شبلی اور آزاد نے زمانے کے ان تقاضوں کو سمجھ کر مناسب اقدامات کیے اور اس طرح زبان و ادب بہت جلد صحیح رخ پر لگ گئے اگر ہمارے یہ بزرگ اس وقت نہ ہوتے تو بھی یہ کچھ ہو کر رہتا البتہ ممکن تھا کہ اس تبدیلی میں کچھ عرصہ اور لگ جاتا، سائنسی اصطلاح میں ان عہد آفریں شخصیتوں کی حیثیت (CATELYTIC AGENT) کی ہوتی ہے جو عمل کو تیز تر بنا دیتا ہے۔ وہ اس عمل میں خود کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے عمل کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جدید طرز کے مشاعرے کی بنیاد رکھی یہ اس وقت کا تقاضا تھا۔ آزاد کے ذریعہ یہ کام ہوا، آزاد نہ ہوتے تو بھی یہ ہو کر رہتا دیر یا جلد، لیکن یہی کام ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے ممکن نہ تھا۔ آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ذوق کی تربیت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا لیکن آزاد کے اس کارنامے کو صرف ذوق کی تربیت کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ ان کے ایک شاگرد سید ممتاز علی نے لکھا ہے:

"میں نے ابتدا سے ان میں یہی دھن پائی کہ وہ نظم اردو کے دوسرے ڈھنگ پر ڈال دیں اور اس میں ایسا انقلاب پیدا کر دیں کہ یہ زبان بھی روئے زمین کی اور معزز زبانوں کی طرح تمام مطالب علمی کے لیے کارآمد ہو سکے اور جس کے الفاظ اور بندشوں میں ہمارا دل اپنی پوری حسرتیں اور ارمان نکال سکے۔ اس منصوبے کا ظہور اگرچہ ۱۸۷۴ء میں ہوا لیکن یہ وہ منصوبہ تھا جس نے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے دامن تربیت میں نشو و نما حاصل کیا تھا۔"

(مجموعۂ نظم آزاد۔ دیباچہ صفحہ ۳)

کچھ شک نہیں کہ ذوق کی شخصیت نہایت اہم تھی، ان کا علم و فضل، ان کی قادر الکلامی، تلامذہ کو اصلاح دینے کا انداز، مسلم ہے اس میں شک نہیں کہ ذوق اپنے دور کے شاعرانہ ماحول کے صحیح نمائندہ تھے، ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ان کے دور میں پسندیدہ تھیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے دور میں نہایت مقبول اور ہر دل عزیز رہے، تمام تذکرہ نویس ان کی خوبی کلام کے قائل اور معترف ہیں۔ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے افراد ان کے دامن تلمذ سے فیض اٹھانا فخر سمجھتے تھے، حالت یہاں تک پہنچی کہ:

"صبح سے شام تک تربیت طلاب کمال اور رحمک در صلاح سخن سے خواب و خور کی مہلت نصیب اعدا تھی۔" (گلستان سخن)

قبول عام کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب انتقال ہوا تو سیکڑوں تاریخیں کہی گئی تھیں۔

"مسموع ہوا کہ ایک خوش مذاق نے سعی اور تجسس کو کام فرما کر ان قطعات سے کچھ کچھ بہم پہنچائے بعد شمار کے دریافت ہوا کہ تین سو سے زیادہ فراہم ہو گئے تھے۔"

(گلستان سخن)

شیخ ذوق ایک صاحب علم ذہین شخص تھے انھوں نے اپنے زمانے کا بغور مطالعہ کیا تھا اور بدلتے ہوئے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا چنانچہ کہتے ہیں:

ذوقؔ گل اور کوئی تازہ کھلایا چاہیے　　کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

غزل کا مقطع ہے اور یہ غزل بقول آزاد "ابتدائے شباب کی ہے اور نظر ثانی نہیں ہوئی۔" (دیوان ذوق صفحہ ۱۹۹) لیکن اس کو سنتے ہی یہ [illegible]

پیدا ہوجاتا ہے کہ شاعر نے کس آنے والے انقلاب کو محسوس کر لیا ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے اپنے عہد کی روایات کو بڑی خوش اسلوبی اور مستقل مزاجی سے نباہا۔ لیکن یہاں ابھی دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا اگر ساتھ دیا تو کس طرح ؟ کیونکہ یہیں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

ذوق سترہ سال کی عمر سے پہلے ہی شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد ہو چکے تھے (محبوبہ نغز) شاہ نصیر استاد وقت تھے کچھ عرصہ کے لیے شاہزادہ مرزا ابوظفر کو درس دینے پر بھی مامور ہوئے تھے، یہ بڑے قادر الکلام، بلکہ زور آور استاد تھے "تیلیاں" کی ردیف میں مشہور معرکہ ہوا:

"شاہ نصیر کی تلاش پر ہزار آفریں ہے کہ ہر بار دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتا تھا اور یہ شاگرد کی غزل انیس بیس سے کم نہ ہوتی تھی طرفہ یہ کہ وہ سب غزلیں بھی اسی بکہ تازہ عرصہ سخن کی طبع زاد ہوتی تھیں۔" (گلستان سخن)

اور یہ مشاعرہ "کئی مہینے تک" جاری رہا۔ ایسے زور آور اور کہنہ سال اور کہنہ مشق استاد کی شاگردی کا اثر یہ ہوا کہ خود ذوق بھی سنگلاخ زمینوں میں کہنے لگے۔ اس دور کی بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ کو دیکھیے:

اب/غضب ہے کہ نہیں　　آب/حساب تو دے　　اب/سب آوے کہ نہ آوے　　گردن/پرفن کو لگے

ذوق نے ابتداءً اپنے عہد کے انداز غزل خوانی کو اپنایا اور اس میں خوب کامیاب رہے، سرکار شاہی سے خطاب پایا، بادشاہ اور ولی عہد کے استاد مقرر ہوئے، اپنے منصب کی خاطر روایات کو برابر آخر عمر تک نباہتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء کے ایک مشاعرے میں یہ غزل پڑھی جس کا یہ شعر مشہور ہے:

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　دنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے　　(چراغ دہلی از حیرت)

آزاد نے بھی اس سلسلہ میں جا بجا استاد کے اقوال لکھے ہیں بعض یہ ہیں:

"۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا...... فرمایا ہم لمبی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں زمین ٹھنڈی ہو تو کلام بے اصول نہ ہو۔" (دیوان ذوق صفحہ ۱۰۵)

"۱۸۵۰ء میں .... مشاعرہ کیا..... میں نے کہا حضرت ضرور کہنی چاہیے لوگ یہی کہیں گے انھیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا، استاد کا ارادہ پھر مستقل ہو گیا اور غزل تمام کی۔" (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

یہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ ذوق آخر عمر میں بھی مشاعرہ کی سخت سے سخت زمین میں شعر کہنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن اگر ان کی غزلوں کا بغور مطالعہ کریں اور آخر عمر کی وہ غزلیں الگ کر لیں جو انھوں نے اپنے شوق سے لکھیں تو معلوم ہوگا کہ اب وہ عام بحروں، مختصر ردیفوں اور سہل قافیوں میں غزلیں کہنے لگے تھے، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ غزلوں کے ردیف و قوافی درج ہیں:

مرجھا/دکھلا گئے　　رفو/وضو کرتے　　خدا/جفا سمجھے

سہل زمینوں کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر اب یہ سمجھ چکا ہے کہ محض سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے میں کوئی افادیت نہیں چنانچہ اس نے اس سلسلہ کو خود ترک کر دیا۔

"شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے، ان دنوں کی غزلوں میں (ذوق) نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔" (دیوان ذوق)

ایک موقع پر آزاد نے ان قطعوں کو "شاگردی کا تمغہ" بھی کہا ہے۔

شاہ نصیر کے بعض مقطعوں میں "گرمی" کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

نصیر اور بھی ایسی کوئی غزل پڑھ گرم

ذوق کی ابتدائی غزلوں میں بالکل اسی مضمون کے مقطع مل سکتے ہیں:

عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

ہ نصیر مرحوم نے انشا اور مصحفی کے ساتھ بھی بزم شعر میں شرکت کی تھی، ان کے اثر سے ذوق بھی اپنا دامن بچا نہ سکتے تھے۔ چنانچہ مصحفی اور شاہ نصیر کی مشہور معرکہ کی زمین میں ن سے بھی ایک غزل منسوب کی جاتی ہے:

مثل خورشید ہے سیب ذقن سرخ ترا   معدن لعل و گہر ہے دہن سرخ ترا   (نگارستان سخن)

سید انشا نے دو غزلہ اور سہ غزلہ بہت لکھے اور ان میں درمیانی مقطع لکھنے کا ایک نیا انداز اختیار کیا، شاہ نصیر نے بھی اس طرز کو اختیار کیا اور ذوق کے یہاں بھی یہ انداز ملتا ہے۔ مثلاً:

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل   بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس پر غم کے ساتھ   (دیوان مرتبہ آزاد)

ن آخر دور میں ذوق کے یہاں نہ دو غزلہ سہ غزلہ کا شوق ملتا ہے نہ اس انداز کے مقطعے ہیں اور نہ غزلوں میں قطعات ہیں، اب شاعر کا رجحان معنویت کی طرف ہے اور ظاہر ہے ایسے اشعار ایک زمین میں بہت زیادہ نہیں کہے جاتے، ذوق کی آخر عمر کی غزلیں بہ لحاظ تعداد اشعار مختصر بھی ہیں، طویل ردیفوں کی بجائے مختصر ردیفوں کا استعمال ہ گریہ اور گرمی کے روایتی مضامین کا ترک۔ گویا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے بعد ہی وہ دور آئے گا جب ردیف اور قافیہ بلکہ وزن کے خلاف بھی ایک احتجاج ہوگا، رسمی مضامین کو نہ صرف واجب الترک سمجھا جائے گا بلکہ ان کو شاعری کا عیب جانیں گے۔

(۲)

مصحفی اور انشا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی دھوم تھی، آتش نے اپنے نظریہ کا اظہار ایک مقطع میں کر دیا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں   شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے انداز میں جو اختلافات ملتے ہیں ان کے باوجود "تلاش الفاظ" پر زور دینا دونوں کے یہاں مشترک ہے۔ اس موقع پر ناسخ کے ایک شاگرد نواب کلب حسین خاں نادر کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ نادر نے اپنی تصنیف تلخیص معلیٰ میں ناسخ اور رشک کے ان اصولوں کو بھی بیان کیا ہے جو بالخصوص شعرا کے لیے اہم ہیں، یہ کتاب زبان کی صحت کے متعلق لکھی گئی ہے مگر اس کے موضوعات یہ ہیں:

"مقدمہ سبب تالیف کتاب میں
پہلی فصل امور واجب الترک و مستحسن الترک محاورات اردوئے قدیم و جدید میں
دوسری فصل ہدایات تذکیر و تانیث اور بعض قواعد جمع بنانے کے با دیگر فوائد و زوائد میں
تیسری فصل اختلاف روزمرہ گفتگوئے ساکنان مغرب و مشرق لکھنؤ میں
چوتھی فصل بعض مصطلحات و مرکبات علم عروض و قوافی میں
خاتمہ بعض فوائد و زوائد و امور قابل ترک و اختیار و محاورات و الفاظ وغیرہ"   (تلخیص معلیٰ دیباچہ)

ناسخ کے تلامذہ میں شعر کہنے کا جو طریقہ رائج معلوم ہوتا ہے یہ ہے:

"جس طرح پر شعر کہنا منظور ہو اس کے سب قوافی پہلے لکھ ان میں سے غور کر لے کہ کتنے قوافی خاص لائق گنجایش مضامین ہیں انھیں کو سہل زمینوں میں موزوں کرے اول مصرع ثانی لکھے بعد اس کے مصرع لگاوے" (تلخیص معلیٰ)

اس عہد کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ان سے ہمیں زبان، قواعد عروض کے اصولوں کی اس دور میں اہمیت معلوم ہوگی۔ لیکن معنی، مطالب اور مضمون کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو، اس کو ہمیشہ ضمنی اور ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

ذوق نے ناسخ سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، انھوں نے ناسخ کی کئی غزلوں پر غزلیں کہیں، اور زبان کے اصول و قواعد کی سختی سے پابند ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دو مقطع پیش کرنا مناسب ہوگا۔

بجز شہ و نصیر شاہ کون جانے ذوق   ترے زبان کا مزہ تیری شعر خوانی میں
بے تمیزوں کو ہو نقصان لطف ذوق   لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق اپنے اشعار میں لطف زبان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس پر داد نہ ملنے کی شکایت بھی کرتے ہیں، ان کو بچوں کا ادھورا
لینا بھی اس حد تک ناگوار تھا کہ اسے بھی بے تمیزوں کا شعار سمجھتے تھے، یہ سب صحیح ہے لیکن انسان کی ذاتی افتادِ طبع بھی بڑی چیز ہے، اس دور میں جب بندش الفاظ
وہ اہمیت ہو جو بیان ہوئی ذوق نے ایک مقطع کہا (سترہ سال سے بھی کم عمر میں)

ٹک دیکھ اب تو چشمِ حقیقت سے اے ذوق ہر طرف جلوہ گر ہے اسی کا ظہورِ حسن (مجموعہ نغز)

اس مقطع کے مضمون سے قطع نظر ایک پہلو یہ بھی اہم ہے کہ لفظ "طرف" جو متحرک الاوسط ہے ساکن الاوسط نظم ہوا ہے۔ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے یہاں اس
مثالیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ میر تقی میر کے متعلق آزاد نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ لکھنؤ میں چند عمائد نے میر صاحب سے شعر کی فرمائش کی میر صاحب نے یہ مطلع پڑھا۔

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور فرمایا "آپ کہیں گے خیال کی "ی" ظاہر کرو مگر جواب یہ ہے کہ محاورہ یہی ہے؟ (آبِ حیات) ـــــ ذوق کے بچپن میں میر صاحب زندہ تھے
اگرچہ لکھنؤ میں تھے) ان کے واقعات ذوق نے بچپن میں سنے ہوں گے، میر کے سودا اور قائم کے کلام میں بھی متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک نظم کرنے کی مثالیں
مل جاتی ہیں، ذوق نے بھی اپنے لئے دہلوی شعرا کی روایات کو زیادہ قابل عمل پایا، چنانچہ وہ حسب ضرورت اصول و ضوابط سے انحراف بھی جائز رکھتے ہیں
اس سلسلہ میں وہ ناسخ کے مقلد بالکل نہیں ہیں، چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر

اور: دوپہر ہے سایہ بھی بیٹھے ہے دب کر زیرِ پا

ایک ہی لفظ "پہر" کو ایک موقع پر ساکن الاوسط اور دوسرے پر متحرک الاوسط نظم کیا۔

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو

فراق گورکھپوری صاحب کو بھی ذوق کی یہ ترکیب کھٹکی ہے لیکن انھوں یہ کہہ کر کہ شاید ذوق کے زمانے میں ایسا ہی بولتے ہوں اسے اہمیت نہیں دی
ہے، اصول کے مطابق "تنگیٔ زمانہ" بھی صحیح ہے۔ لیکن شاعر نے قافیہ کی رعایت برتی، اسے ضرورت شعری کہہ سکتے ہیں۔

ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

یہاں بھی "آل کی" ہونا چاہیے تھا مگر ردیف یہی تھی ـــــ اس موقع پر تلخیص معلی کا ایک اقتباس اہم ہے۔

"از انجملہ ہے کہ اکثر اشعار میں مصرعہ اول اس طرح موزوں کرتے ہیں کہ جب تک دوسرا ایک لفظ مصرعہ ثانی میں شامل کر کے نہ پڑھے جائیں
تب تک مطلب واضح نہیں ہوتا اور یہ بے لطف محض ہے چاہیے کہ ہر مصرعہ کا مطلب جداگانہ ہو۔ (ذوق)
بند آنکھیں کیجے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا"

اسی طرح ایک اور موقع پر نادر لکھتے ہیں:

"اور یہ دو حرف بڑے چھپے ہوئے دشمن ہیں ایک تو عین اور دوسرے ہائے ہوز کہ یہ اکثر وقت موزونی دھوکہ دے کر وزن سے خارج ہو کر
شاعر کو ذلیل کرتے ہیں۔ بڑے بڑے استادوں نے دھوکا کھایا ہے"

گر مشغول ہووے جلوہ ریزی بہ دشت قبچاق

خود آزاد نے بھی اصولوں سے ذوق کے اس انحراف کو محسوس کیا تھا چنانچہ دیوان ذوق میں جا بجا اس کی مثالیں خود انھوں نے پیش کی ہیں (ملاحظہ ہو
ص۲۲، ص۱۲۰، ص۱۲۵ وغیرہ) آزاد نے کبھی کبھی اس مسئلہ پر استاد سے گفتگو بھی کی ہے۔ مثلاً ذوق کا مصرعہ ہے۔

صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

محاورہ ہے "سحر کا ہونا" ذوق نے اس کے خلاف نظم کیا ہے۔ آزاد نے پوچھا تو ذوق نے جواب دیا۔

"یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ ایسی ڈھول لگی کہ تڑکا ہو گیا خبر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی

پیدا ہوا بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا قباحت کیا ہوئی ۔ (دیباچہ دیوانِ ذوق ص ۳۴)

اس شعر کے متعلق ذوق کہہ سکتے تھے کہ یہ بچپن کا کلام ہے جب کہ شوق کے دورِ تلمذ کی یادگار رہے (عمدۂ منتخبہ) لیکن آزاد کے مذکورہ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذوق محاورہ میں اس تصرف سے شرمندہ بالکل نہیں تھے بلکہ وہ اسے زبان میں وسعت کا ایک قدم سمجھتے تھے اور اس پر وہ آخر تک قائم رہے۔ اس زمانہ میں جب کہ معمولی سی لغزش پر بھی برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔ ادنیٰ ادنیٰ بات کے لیے سند طلب کی جاتی تھی۔ ذوق کا اقدام بلاشبہ جرأت مندانہ ہے اس سلسلے میں شاہ نصیر کے دو شعر نقل کرتا ہوں جن میں ذوق پر گرفت کی گئی ہے۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے — قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہرِ خدا — یار کی چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں

(انتخاب کلیات شاہ نصیر مطبوعہ عالی پریس میرٹھ)

تعجب ہے کہ ان اشعار کو پنڈت کیفی نے لالہ گھنشیام داس عاصی کے نام سے شائع کیا ہے اور ایک شعر کا اضافہ بھی کیا ہے۔

شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ — باندھیے گر ہو سکیں تارِ نفس کی تیلیاں (خمخانۂ جاوید ۵/۳۴۴)

ان معرکہ آرائیوں کے باوجود ذوق نے محاورات اور روزمرہ میں بھی تصرف کیا اور اس طرح یہ بتادیا کہ قدیم روایات کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن ہر زمانے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ صرف قدامت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن جو شخصیتیں عہد آفریں ہوتی ہیں وہ نئے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں، زبان و ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان تبدیلیوں سے چشم پوشی کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور ان سے دامن بچا کر چلنے والا اپنے دور سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ ذوق کے زمانہ میں یہی بڑی بات تھی کہ انھوں نے نئے محاوروں، نئے الفاظ کو اختیار کیا، شاعری کے نئے مزاج کو پہچانا جو مضمون وہ نظم کرنا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے اگر اصول کی پابندی کو حارج دیکھا تو اس قید کو توڑ دینے میں کوئی تکلف نہ کیا، ان کے نزدیک اصل چیز وہ خیال تھا جو نظم کیا جاتا تھا نہ کہ وہ اصول جن کے مطابق نظم ہوتا تھا، اصول کا مقصد خود یہی ہے کہ وہ مضمون کو زیادہ دلکش اور پراثر بنا دیں نہ یہ کہ اس کی تاثیر اور کشش کو نقصان پہنچائے۔ ذوق کا شاعری کے متعلق جو نظریہ تھا وہ اس مقطع سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقیدِ مطلب جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

(۳)

ذوق آنکہ مدام ہمچو مردانِ خدا — برداشتہ بود دل ازیں جائے دنی (صہبائی)

ذوق ایک خدا پرست شخص تھے ان کے نزدیک تمام انسان "انسان" تھے وہ ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے تھے کہتے ہیں:

مت بھول بندگی پہ غرہ میں آ کے بندے — زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

مذہبی فرقوں کے متعلق وہ صرف اتنا ہی کہتے تھے کہ۔

جو اس کے نزدیک رہبری ہے — وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

ان کے سامنے انسانیت کا ایک تصور تھا شرافت اور اخلاق کا ایک معیار تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا مطالعہ کیا تو ہر طرف ادبار اور پستی نظر آئی، اس نے ان کو بہت متاثر کیا تھا چنانچہ مختلف انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں مثلاً:

رباعی

ان آنکھوں سے رنگِ لالہ گوں بھی دیکھا — دوراں کو ہزار رنگ خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھا نہ رنگ ہم نے اے ذوق — چوں بھی دیکھا جہاں کو دوں بھی دیکھا

اپنے زمانے کے وضعداروں کو بگڑتے دیکھا اور ان کی تباہی سے متاثر ہوئے ایک رباعی میں اس قسم کا تاثر بیان کیا ہے۔

رباعی

جب تلک گرہ میں احمقوں کے پیسے　　سب کہتے تھے ان کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق　　پوچھا نہ کہ تھے کون وہ ایسے تیسے

ذوق مسلمان تھے اور اس دور میں خصوصاً مسلمانوں کی تباہ حالی دیکھ کر بہت کڑھتے تھے دیکھیے اس کیفیت کو کس قدر دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں:

قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال　　دیکھتا ہوں میں اب اے ذوق میں انکا احوال
جس طرح سے کہ ہنسا دیتے کو بے دینوں کے　　نقل کرتا ہے مسلمان کی کافر نقال

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی نے آجکل دسمبر ۱۹۶۲ء میں ذوق کی بعض تحریروں کا عکس شایع کیا ہے، اس میں یہ قطعہ بھی ہے۔ اسی صفحہ پر نواب زینت محل بیگم کے مکان کی تاریخ کے کئی مادے ذوق نے لکھے ہیں جو ۱۲۶۲ھ کا واقعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطعہ مذکور ۱۲۶۲ھ میں کہا ہوگا۔ مذکورہ رباعیات سے ذوق کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے، انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب محض ہجر و وصال کی روایتی کیفیات کے بیان کا موقع نہیں ہے بلکہ اب ضرورت ہے کہ اخلاقی اور اصلاحی حقایق بیان کیے جائیں، چنانچہ ان کی غزلوں میں زندگی کی حقیقتوں اور نصیحتوں کا مختلف تمثیلوں کے ذریعے بیان ملتا ہے اور اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت ہیں:

دیدۂ آبلہ پا کا ہے یہی اب رونا　　کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا　　چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

جرأت اور حب الوطنی کے مضامین بھی ملتے ہیں نمونہ یہ ہے:

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب　　تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑے گا بدلا لیکر
یوں اسیران قفس تک کوئی پہنچا گلبرگ　　جیسے غربت میں نشیقان وطن کا کاغذ
زاں خلد میں گندم ہے سینہ چاک ابتک　　الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

ذوق نے غزلیں کہی ہیں اور غزلوں میں انھوں نے اس قسم کے مضامین نظم کیے ہیں، ان سے پہلے ہی غزل کا مزاج مخصوص ہو چکا تھا اس کی اپنی زبان ہے اپنی اصطلاحات ہیں اور اپنا انداز بیان ہے اس کا بہترین نمونہ ہمیں ذوق کے دوسرے استاد بھائی حکیم مومن کے یہاں ملتا ہے غزل کو غزل کے صحیح معنوں میں استعمال کرنے میں مومن سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ ذوق کے سامنے ایک مقصد تھا اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے غزل کا مروجہ انداز بہت تنگ تھا۔ ذوق کا عقیدہ تھا کہ:

کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

اور وہ کائنات کے ہر ذرہ سے فائدہ اٹھا لینا اپنا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں بھی روایتی اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی بہت نظم کیے ہیں، اس کے لیے غزل کی رمزیہ زبان ناکافی ثابت ہوئی۔ انھوں نے اشاروں، کنایوں کو چھوڑ کر صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز　　کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا
دین ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں　　اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

بعض اوقات تو ان مضامین کو اس قدر کھل کر نظم کر جاتے ہیں کہ وہ غزل میں کھٹکنے لگتے ہیں مثلاً:

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

مضمون کی افادیت سے انکار نہیں لیکن اس میں وہ کیفیت ہرگز نہیں جو غزل کے شعر کے لیے ضروری سمجھی گئی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ ذوق کو ان تمثیلوں کے

باتوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے " (آبِ حیات ص۱۴)

شمالی ہند میں سودا اور ان کے بعد انشا نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا تھا مگر ان کے بعد شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ ذوق نے اس بدلے ہوئے ماحول میں پھر سودا اور انشا کی یاد تازہ کی، انھوں نے قصیدوں میں علمی مسائل کو نظم کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھایا اور غزل جیسی لطیف صنف کو بھی اس کے لیے استعمال کیا، ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ہمیں اکثر ملتے ہیں جن کے متعلق خیال ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف کسی خاص مسئلہ کو نظم کرنے کے لیے یہ شعر کہہ دیا ہے مثلاً:

نخلِ گلِ مہندی نہ ہو نصب سبو میں اے نگار　　　تو کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

بر نخلِ گلِ مہندی کی یہ تاثیر معلوم ہوگی کہ یہ بہار کا پھول ہے اس کا ذائقہ قدرے تلخ ہوتا ہے، پودے کا عرق سوزشِ اعضا کے لیے مفید ہے خواہ جب وہ آگ یا گرم پانی سے جلنے کے سبب ہو۔

عدوئے نیش زن کے گھر سے میرا مہ جبیں نکلے　　　الٰہی برجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

برجِ عقرب دوازدہ بروجِ فلکی میں سے آٹھواں ہے، اس کی شکل بچھو سے مشابہ ہے، بہ لحاظ تاثیر آبی ہے، رنگ سیاہ ہے، اس برج میں قمر کا ہونا نحوست کی طرف اشارہ کرتا ہے ـــــ ان خواص کو ذہن میں رکھیے، یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ شاعر کا مقصد ان ہی کو نظم کرنا تھا اس قسم کی متعدد مثالیں دیوان ذوق میں ملیں گی۔

یہیں تصوف کے متعلق بھی اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ تصوف اردو شاعری کے حاوی رجحانات میں سے ایک ہے اور ذوق کے زمانے میں تو اس کا زور بھی زیادہ تھا خود مرزا غالب بھی " مسائلِ تصوف " بیان کر کے " ولی " بننا چاہتے تھے اس دور میں مسئلہ وحدت الوجود کو زیادہ اہمیت حاصل تھی خواجہ میر درد اسی کے قائل تھے لیکن اقبال نے آخر اس کی تردید کی اور اس کے مضر اور مہلک اثرات کو ظاہر و ثابت کیا، ذوق کے تصوف کے متعلق کوئی تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا اس لیے کوئی قطعی بات کہنا قبل از وقت ہے البتہ ایک شعر میں انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ پر نہایت عمدہ طنز کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلہ وحدت الوجود　　　لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

فلسفہ کی بحثوں کے متعلق بھی ذوق نے نہایت عمدہ بات کہی ہے:

کیا جانیں ہے زمانے کو حادث ہے یا قدیم　　　کچھ ہو ملا ہے اپنی کہیں فانیوں میں ہم

مولوی نذیر احمد مرحوم نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے:

" اگر تم میری صلاح مانو تو علمِ کلام کی کتاب تو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا ایک بڑا نقصان جو طالبِ دین کو اس فن کی کتابوں سے پہنچتا ہے یہ ہے کہ اس کی طبیعت دینیات سے متشکک ہو جاتی ہے جس ترتیب سے میں نے تم کو دینیات میں غور کرنے کو بتایا ہے اس کا لحاظ بھی حیرت احتمالات سے بچنے کے لیے مفید ہے جب انسان اس بات کو نصب العین کر لے گا کہ میں فانی اور بے حقیقت مخلوق ہوں اور معلوم نہیں کہ عہد مرگ کیا پیش آئے میں نہیں سمجھتا کہ ایسا آدمی ان جھگڑوں کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اپنی طبیعت کو حاضر پائے بعض باتوں سے تو وہ یہی خیال اعراض کرے گا کہ میں ان سے زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں " (ابن الوقت ص۱۴۵)

غرض یہ کہ ذوق نے مختلف علوم و فنون کے مسائل کو غزل میں داخل کر کے غزل کو ایک نئی وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی مختلف اختلافات مذہبی اندازِ فکر سے ذہنوں کو آزاد بھی کرنا چاہا ہے لیکن یہ کام ان کے زمانے میں ممکن نہ ہو سکا۔ آزاد حالی اور نذیر احمد وغیرہ کے دور میں زمانے نے خود ذہنوں کو سیم اور پر لگا دیا۔

(۵)

ذوق کے ابتدائی اور آخری دور کے اندازِ فکر میں فرق کو سمجھنے کے لیے ہی ہم ایک غزل نقل کرتے ہیں یہ غزل انھوں نے آغازِ شباب میں کہی تھی، صرف چند شعر اسی حالت میں مجموعہ منتخبہ میں مل سکے۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا　　　کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

— آتش دل سینہ میں مثل مشتعل　　— داغ سے انبار ہے انگاروں کا
گرد وہ ہے کہ جو خورشید قیامت —　　سایہ اس کشتۂ ابرو پہ تبر داروں کا
ہائے وہ عاشق جانباز کہ — تک　　ہدف تیر رہا تجھ سے کمانداروں کا
کیا تعجب ہے پس از مرگ بھی رہے تو وہ　　دل میں پیکانوں کا اور سینہ میں سوفاروں کا
ذوق بے چیدہ کہاں زلف بتاں کافر کی　　ہے مگر نامۂ اعمال سیہ کاروں کا

آزاد لکھتے ہیں کہ عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو رہا تھا آخر عمر میں آکر غزل پوری ہوئی ۱۲۶۸ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی (دیوان ذوق ص۲۵) چنانچہ کسی قدیم تذکرے میں مطلع کے سوا کوئی شعر نہیں ملا، دیوان ذوق میں بھی اس مطلع کے سوا مذکورہ بالا کوئی شعر نہیں ملتا البتہ جو غزل دیوان ذوق میں ہے مطلع مذکور کے علاوہ اس میں یہ اشعار ملتے ہیں:

محتسب گریہ دل آزار ہے میخواروں کا　　دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا
اتنا تو سوز فغاں ہو کہ چمن میں بلبل　　خرمن گل کی جگہ ڈھیر ہوا انگاروں کا
چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ　　ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا
ہوں نگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار　　گر تماشا تجھے منظور ہو فواروں کا
ہیں کماندار ترے تیر مژہ تشنۂ خوں　　منہ کھلا رہتا ہے اس واسطے سوفاروں کا
کیوں نہ ہر تار میں سو دل ہوں گرفتار کہ زلف　　جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا
دیں گے جاں بوسۂ لعل نمکیں پہ ہم بھی　　جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمک خواروں کا
بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق　　رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا　　(دیوان ذوق)

پہلی غزل کے مطلع میں واقعی ایک کیفیت ہے ایک والہانہ پن ہے، چنانچہ ذوق نے اسے قائم رکھا اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسے پسند کیا (دیکھیے عمدۂ منتخبہ، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، گلستان سخن، سخن شعرا وغیرہ) باقی تمام اشعار محض روایتی سوز و گداز پر مشتمل ہیں کوئی کیفیت نہیں چنانچہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ غزل دوبارہ پوری کرتے وقت شاعر نے ان کو قلم زد کر دیا تھا۔

تازہ غزل کے متعلق آزاد کا یہ قول کہ ۱۲۶۸ھ میں کہی گئی تحقیق طلب ہے البتہ آخر عمر کی تخلیق ضرور کہہ سکتے ہیں، اس کے مطلع پر غور کریں محتسب میخواروں کی دل آزاری ادائیگی فرض کے طور پر نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت یہ ہے کہ اسے بھی ایک جام مل جائے اس کا ثبوت دوسرے مصرعے سے فراہم کیا کہ اسے ایک جام دیجیے تو وہ یاروں کا یار ہوگا۔ مضمون اس دور کی رسم رشوت خوری اور خیانت منصبی کی غمازی کرتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق کا اپنا مشاہدہ بلکہ تاثر ہوگا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے آجکل دسمبر ۶۲ء میں ذوق کی تحریروں کا جو عکس شائع کیا ہے اس میں ایک مصرعہ یہ بھی ہے:

الٰہی مدعا نکلے یہ رشوت خوار اڑ جائے

یہ بھی اس دور کی رشوت ستانی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلے شعر کو بھی ذوق کا ذاتی تاثر کہہ سکتے ہیں، دہلی میں اس وقت جو انتشار عالم تھا اس نے ہر فرد کو بیقرار کر رکھا تھا ذوق اسی بیقراری میں افادیت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ فغاں میں اتنا سوز پیدا ہو جائے کہ خرمن گل کو بھی پھونک ڈالے۔ ذوق کی زندگی میں تو یہ ممکن نہ ہوا البتہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ غزل کے مقطع کو دیکھیے وہ بھی کیفیت سے خالی نہیں اس میں بھی ایک پیغام ملتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب ذوق کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس میں ایک حد تک عملیت کو بھی دخل ہے بیشک اس دور کی غزلوں میں بھی بعض شعر روایتی اور اشعار کی تعداد بڑھانے والے ہیں لیکن اگر غور کریں تو ذوق کے یہاں ہمیں ایسے نکات معلوم ہوں گے جو واقعی منفرد اور قابل قدر ہوں گے، ذوق کے کلام میں ہمیں قدیم انداز کے ساتھ ساتھ ایک نئے دور کی جھلکیاں بھی مل سکتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ کافی اہم ثابت ہو سکتا ہے۔

سن اُنیس سو باسٹھ کا بہترین طنزیہ مزاحیہ ادب

احمد جمال پاشا

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ برہمن نے کبھی کسی سال کو خراب بھی بتایا ہو۔ اصل یہی وہ واحد نکتہ ہے جس پر شیخ و برہمن ہمیشہ متفق پائے گئے لہٰذا میرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ میں بھی ان سے متفق ہو کر اس قران السعدین کو ساعتِ منحوس میں تبدیل ہونے سے بچا لوں۔

سن انیس سو باسٹھ کے بہترین ادب کے محض ایک پہلو یعنی طنز و مزاح کے وسیع اور عریض احاطے میں صحافتی کالم، مضامین، افسانے، خاکے، ناول، ناولٹ، مستقل مزاحیہ کردار، ڈرامے، فیچر، پیروڈی، انشائیے، تراجم، ڈائری، رپورتاژ، سفرنامے، خطوط، باقیات الصالحات، فکاہیات، لطیفے، کارٹون، غزلیں، نظمیں، آزاد نظمیں، مثنویاں، شہر آشوب، بنجارہ نامے، قصائد، ہجویات، واسوخت، مراثی، ریختی، قطعات اور رباعیات وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ نئے نئے رسالے، نئی کتابیں، نئے انتخابات، نئی آوازیں، نئے رجحانات نئی تحریکیں اور نئی روشیں سامنے آتی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ہمیں پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا ہے کارواں طنز و ظرافت کا کوئی راہی ہم سے بچھڑ تو نہیں گیا، ہماری متاعِ عزیز کے گرانمایہ سرمایے میں سے کچھ کم تو نہیں ہو گیا۔ اور بہ حیثیت مجموعی سال بھر میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

سال بھر کے جائزے میں پہلی چیز سب سے زیادہ نمایاں یہ ہے کہ اس وقت ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں صحافت کا بول بالا ہے ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگار محنت و مشقت کے ذریعے حیات و کائنات کے آفاقی مسائل سلجھانے کے بجائے روزمرہ کے ہنگامی واقعات اور سطحی موضوعات پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

کالم نویسی کی روایت کو سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ لکھنؤ میں جنم دیا تھا مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت نے اسے وزن و وقار اور مجید لاہوری نے اسے مقبول عام کیا۔

ہمارے موجودہ صحافتی مزاح نگاروں کے میر کارواں مولانا عبدالماجد دریابادی، شوکت تھانوی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، طفیل احمد جمالی، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی، خوشتر گرامی اور عبدالمجیب سہالوی ہیں۔ ان سب کے یہاں گہرا سیاسی و سماجی شعور بالغ نظری، گہرائی و گیرائی ہے ان کے ہاتھوں میں وقت کی نبضیں ہیں، ان کی آوازوں میں مسائل کی گونج اور قلم میں تلواروں کی کاٹ ہے۔ یہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر بین الاقوامی مسائل تک کی ناہمواری پر شدید طنز کر کے ہماری زندگی میں توازن پیدا کرنے کے مقدس فرض کو بڑی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

یہ عہد مولانا عبدالماجد دریابادی کا عہد ہے ضروری نہیں کہ آپ ان کے مسلک سے بھی متفق ہوں مگر ان کے طنز میں جو شدت اور زہرناکی ہے وہ آپ بھی تسلیم کر لیں گے۔ ہر ہفتے صدق جدید لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی سچی باتیں شایع ہوتی ہیں جن کو ہندوستان اور پاکستان کے بیشمار اخبار اور رسالے بڑے تواتر اور پابندی کے ساتھ اپنے یہاں نقل کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور عظمت ہمارے دلوں میں ظفر علی خاں، سالک اور حسرت کی یاد تازہ کر دیتی ہے اس عہد کی امامت کا سہرا انہی کے سر ہے۔

ہندوستان کے نامور صحافی ... بے شکنی ... کان پر رکھ کر قلم نکلے۔ پہلے مختار زمن لکھتے تھے اور اب نصر اللہ خاں لکھتے ہیں۔ مگر ان کے تیز انداز دلیر اور مزاح کے نوک نشتر کی سی تیزی، شوخی اور طراری ہے ان کی وہ بین نظروں سے کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدعنوانی اور بے اعتدالی سے بچ نکلنا محال ہے طفیل احمد جمالی کی بے شکنی، صحافتی مزاح کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی اور راولپنڈی اردو کا سب سے کثیر الاشاعت اور مقبول عام روزنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبار طنز و مزاح پر سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے اس میں شوکت تھانوی کا "پہاڑ تلے"، ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ"، رئیس امروہوی کا مزاحیہ کردار "نواب مرزا اچھے صاحب قبلہ کا خاکہ" اور طنزیہ قطعہ اور

شفیع عقیل کا گروہ پیش شائع ہوتا ہے۔ جنگ کا مزاحیہ کالم بہت سے اخبار اور رسالے بغیر کسی حوالے یا حوالے کیساتھ نقل کرتے ہیں۔ اکثر اشاعتی ادارے ان تراشوں کی مدد سے مزاحیہ افسانوں کے مجموعے تیار کرکے شائع کرتے ہیں جیسے شوکت تھانوی کا مارشل لا ۔۔۔ نمک مرچ، کارٹون اور جوکر وغیرہ۔ شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، رئیس امروہوی اور شفیع عقیل کے کالم عوام اور خواص میں بے حد مقبول و معروف ہیں خاص طور پر رئیس امروہوی کا "قطعہ" جو ہمیشہ دو دھاری تلوار ہونے کے علاوہ اپنے اندر ایک عجیب کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

روزنامہ امروز لاہور میں مشفق کے نام سے احمد ندیم قاسمی روزانہ "حرف و حکایت" کا کالم لکھتے ہیں۔ مشفق کے بیشتر موضوعات سماجی کے ساتھ ساتھ ادبی بھی ہوتے ہیں ادب کی یہ چاشنی ان کو عوام کے علاوہ خواص میں بھی مقبول بنائے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے "حرف و حکایت" کا یہ باغ و بہار کالم اردو کے صحافتی مزاح میں ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔

روزنامہ قومی آواز لکھنؤ گزشتہ ۸ سال سے اپنے پڑھنے والوں کو "گلوریاں" پیش کر رہا ہے۔ اس کے میزبان حیات اللہ انصاری اور عبدالمجیب سہالوی کا ایک مخصوص لہجہ، انداز، تہذیب، رکھ رکھاؤ اور معیار ہے بہت رچا بسا ہے۔ سیاسی و سماجی شعور اور سوجھ بوجھ ہے ان کی ظرافت میں مقصدیت اور توانائی کا خوشگوار آہنگ بہت عام ہے۔

روزنامہ ملاپ دہلی میں فکر تونسوی "پیاز کے چھلکے" لکھتے ہیں۔ فکر تونسوی صحیح معنوں میں صحافتی اور عوامی مزاح نگار ہیں ان کے پیاز کے چھلکے عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ کوئی مسئلہ کوئی گتھی غرض کوئی بات بھی ہو فکر تونسوی دم بھر میں اس کے چھلکے اتار کر رکھ دیتے ہیں ان کا سیاسی شعور ان کی ادبیت اور ان کی صحافت ان کی ظرافت پر حاوی ہے۔

خوشتر گرامی برسوں سے نہایت خاموشی کے ساتھ بیسویں صدی دہلی میں تیر و نشتر لکھ رہے ہیں ان کے ہر فقرے میں ایک مخصوص ادبی نشتریت پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے یہ فقرے اور حاشیے ہماری سیاست، ادب اور زندگی کی مختلف بے اعتدالیوں پر بڑا تیکھا طنز کرتے ہیں ان کے طنز میں مزاح کی نرمی اور گرمی کے ساتھ ساتھ توازن اور اعتدال بھی ملتا ہے جو فی زمانہ نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔

ہفتہ وار بھوپال پنچ میں "...." علامہ ڈھیر کے نام سے تخلص بھوپالی لکھتے ہیں۔ تخلص کے قلم میں بلا کی دھمک ضرور ہے مگر یہ زخم لگا کر پھائے رکھنے کے فن سے ناواقف ہے۔ زخموں کو کریدنا کوئی ان سے سیکھے ان کی شوخی نے بڑھ کر بے باکی اور بے حجابی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

صدق جدید لکھنؤ، جنگ کراچی، نگران کراچی، امروز لاہور، قومی آواز لکھنؤ، ملاپ دہلی، بیسویں صدی دہلی، اور بھوپال پنچ بھوپال، کے علاوہ اس میدان میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کا "...." رہا ہے، روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں کوکن کا شیشہ و تیشہ، روزنامہ پاسبان ڈھاکہ میں پروفیسر ارشد کاکوی کا شیشہ و تیشہ، روزنامہ انجام کراچی میں رمضانی کا ہسپتال تذکرہ، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی میں علامہ ہرفن کا قطعہ اور بے نقاب نے کہا، روزنامہ آبشار کلکتہ میں فرہاد کا سنگ و خشت اور ہفتہ وار آگ لکھنؤ میں علامہ نابینا کا "تنور" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پچھلے دنوں ہماری محفل سے ریاض خیرآبادی اور شاہد صدیقی اٹھ گئے۔ ریاض خیرآبادی اودھ پنچ کے آخری دور کے پرانے لکھنے والوں میں سے تھے انہوں نے منشی سجاد حسین کی آنکھیں بھی دیکھیں تھیں یہ ہمارے لیے اپنا قلمی دیوان "تفریحات ریاض" چھوڑ گئے ہیں۔ ریاض خیرآبادی کا نام اور ذاکر اور مرثیہ اسپ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھے گا۔ شاہد صدیقی کوکن کے قلمی نام سے روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن میں شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ شاہد قلم کے دھنی تھے، ان کے رنگ میں بڑی شوخی اور پرکاری تھی۔ ان کو شباب ہی میں موت نے آ لیا۔ دنیائے طنز و ظرافت کے لیے یہ دونوں حادثے ناقابل تلافی ہیں۔۔۔ ان کے علاوہ اودھ پنچ لکھنؤ اور بھوپال پنچ بھوپال اس درمیان بند ہوگئے۔ پاک پنچ اور پھلجھڑی بھی اس دوران نظر نہیں آئے ان رسائل کے بند ہونے پر ہمارے طنزیہ و مزاحیہ شعرا نے مرثیے نہیں کہے مگر پھر بھی ان حالات کا ماتم ضروری ہے جو اس کا ذمہ دار ہے۔

صحافت کے بعد ادب کا وسیع و عریض میدان شروع ہو جاتا ہے اردو کے مزاحیہ ادب میں مضمون نگاری کا وہی درجہ ہے جو شاعری میں غزل کا۔ اس سال کے جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے پرانے مزاح نگار رفتہ رفتہ میدان چھوڑ رہے ہیں۔ پرانی نسل میں گرمی، لگن اور فن پر ریاض کے مقابلے میں اطمینان، سہل پسندی اور خاموشی کے آثار زیادہ ہیں۔ اس کے ساتھ نئی نسل زیادہ دم خم کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ غزلوں کی طرح مضامین بھی بے تحاشہ لکھے جا رہے ہیں۔ مگر ان میں قابل ذکر مضامین بہ آسانی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اچھے مضامین کی یہ افسوسناک کمی تشویشناک ہے۔ مضمون نگاری (مزاح نگاری) دراصل ایک ایسی ریل گاڑی ہے جس میں صرف فرسٹ کلاس ہوتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے مسافروں کا اس میں گذر و سفر ممکن نہیں۔

اس سناٹے کو چراغ تلے اور اندیشۂ شہر نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شوکت تھانوی کی "ہم زلف" اور فرقت کاکوروی کی "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" سال رواں کے مزاحیہ ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضامین رشید عرصے سے نایاب تھی مگر اس سال اس کا بھی نیا ایڈیشن آگیا ہے۔

افسانے اس سال نہ لکھے جانے کے برابر لکھے گئے۔ شوکت تھانوی، شفیق الرحمان اور فکر تونسوی ہمارے قابل ذکر افسانہ نگار رہے ہیں۔ شوکت تھانوی نے کچھ قابل توجہ افسانے اس درمیان لکھے ہیں مگر شفیق الرحمن بالکل خاموش ہیں اور فکر تونسوی کالم نویسی کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔

ناولوں میں کرشن چندر کے گدھے کی واپسی، فکر تونسوی کا "پروفیسر بدھو" سید ضمیر جعفری کی تین لڑکیاں۔ تین داماد" محمد خالد اختر کی شیخ قربان علی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جمیل جالبی نے منشی سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" کو ایڈیٹ کیا ہے مگر انھوں نے اس کام کو محنت اور توجہ سے انجام نہیں دیا۔ حاجی بغلول کا سنہ تصنیف اور منشی صاحب کے حالات اس میں تقریباً ندارد ہیں۔ آخر میں انھوں نے کتاب کی جو فرہنگ تیار کی ہے وہ افسوسناک اغلاط سے پر عبارت ہے۔ بگر پھر بھی یہ اچھی کوشش ہے۔ منشی سجاد حسین کے دوسرے ناولوں (میٹھی چھری، طرحدار لونڈی، اور پیاری دنیا) کے نئے ایڈیشن بھی اسی عرصے میں سامنے آئے ہیں، سرشار کا "جام سرشار" اور ڈپٹی نذیر احمد کا ابن الوقت بھی شایع کیے گئے ہیں۔ ان سب کا تعلق ہماری کلاسکی ظرافت سے ہے۔

مرزا ظاہر دار بیگ، ابن الوقت، خوجی، چچا چھکن، خانم، مرزا جی، منشی جی اور قاضی جی کے علاوہ اس سال ہمارے مزاحیہ ادب میں دو نئے کرداروں کا خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا "مرزا ودود بیگ" اور عطیہ پروین کی "چچی" مشتاق احمد یوسفی نئے مزاح نگاروں میں سب سے ممتاز اور محترم ہیں "چراغ تلے" کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشید احمد صدیقی اور پطرس سے کہیں زیادہ خون خرابے کریں گے۔ ان کا مرزا ودود بیگ ہر وقت ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مرزا کا کردار بہت جاندار اور جیتا جاگتا ہے۔ خوجی کی طرح اس کے کوئی جسمانی کوڑ نہیں ہے۔ نہ یہ خوجی اور بغلول کی طرح منہ زور ہے عظمت کا احساس بھی ایک خاص انداز اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مرزا کے یہاں ملتا ہے غرض اردو کے ابتک کے تمام مزاحیہ کرداروں میں ظاہر دار بیگ، چچا چھکن اور شیطان کے بعد اتنا متوازن کردار ہمارے ادب میں یوسفی ہی نے پیش کیا ہے۔ عطیہ پروین کا چچی کا کردار ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ چچی کی بوکھلاہٹ اور سٹر پٹا پن اپنے اندر ایک عظمت کا احساس لیے ہوئے ہے ان کا یہ مستقل کردار اپنے اندر بڑی گنجائش رکھتا ہے۔ تخلص بھوپالی کی "پاندان والی خالہ" اور فکر تونسوی کے پروفیسر بدھو میں بھی مزاحیہ کردار کی ایک جھلک ملتی ہے۔ مگر ان میں ابھی وہ وسعت اور لچک نہیں پیدا ہو سکی ہے جو مزاحیہ کردار کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

ریڈیو اور اسٹیج کے لیے اس دوران برابر ڈرامے اور فیچر لکھے اور کھا کے اڑائے گئے مگر اس درمیان ہمارے سامنے آنے والی چیزوں میں سلطان الارشد کا "سو سال بعد" "ٹیڈی گرل کے لیے ضرورت رشتہ" اور ڈاکٹر محمد حسن کا فٹ پاتھ کے شہزادے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

خاکہ نگاری کی صنعت پر خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی ہمنفسان رفتہ، شاہد احمد دہلوی کی "گنجینۂ گوہر"، سید ضمیر جعفری کے "اڑتے ہوئے خاکے" اور تخلص بھوپالی کا پوسٹ مارٹم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماہ منیر خاں صرف خاکے ہی لکھتے ہیں لیکن اگر وہ متفرق کرداروں کے خاکے اڑاتے رہنے کے کسی ایک کردار کے تخلیق کرنے پر اپنی ساری توجہ صرف کردیں تو اس بہانے اردو ادب میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو جائے گا ویسے ان کے میر صاحب کے کردار میں بڑی صلاحیت ہے۔

پیروڈی کے میدان میں کنھیا لال کپور، شفیق الرحمان، غلام عباس، محمد خالد اختر، م۔ نسیم، ضیاء الحسن موسوی، نسیم درانی، تخلص بھوپالی اور اے آر ممتاز پیش پیش نظر آتے ہیں۔ سال رواں کا اہم ترین کارنامہ کنھیا لال کپور کی پیروڈی "انار کلی" ہے

اردو ادب میں جدید انشائیہ کی تحریک کے قائد ڈاکٹر وزیر آغا ہیں "خیال پارے" ہمارے جدید انشائیہ ادب میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت سے اب تک ہمارے بیشتر انشائیہ نگاروں کے نئے انشائیے خیال پارے کی بازگشت اور انشائیہ پر مقالے خیال پارے کے مقدمے کا ناقص چربہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میدان میں وزیر آغا اور مشکور حسین یاد کے علاوہ کم و بیش سب ہی "انشائیہ نگار" اس وقت انشائیہ نگاری کے نام پر مضمون نگاری اور مزاح نگاری میں مصروف ہیں۔ نظیر صدیقی کے مجموعے "شہرت کی خاطر" کو کسی طرح سے بھی انشائیوں کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ سیدھے سادے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں۔ نظیر صدیقی دراصل ہمارے اچھے طنز و مزاح نگار ہیں نہ کہ انشائیہ نگار۔ اس دوران

انشائیہ کے نام سے جو مختلف انتخابات شایع ہوئے ہیں ان مجموعوں میں بھی ہم کو سوائے انشائیہ نگاری کے سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔ دراصل یہ ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کے شگفتہ انتخابات ہیں جن کو مضمون تو بآسانی قرار دیا جا سکتا ہے مگر انشائیہ ہرگز نہیں۔

اس سال تراجم کی رفتار بہت اطمینان بخش رہی۔ اسٹیفن لی کاک، مارک ٹوین، وڈ ہاؤس، ہیزلٹ، سوئفٹ اور ولیم سرویان وغیرہ کے مضامین کے تراجم خاصی تعداد میں پیش کیے گئے۔ ترجمے کے باب میں ل احمد، شاہد احمد دہلوی، عثمان غنی، ابن انشا، ابراہیم رضوی، ضیاء الحسن موسوی، ممتاز مفتی، افضل صدیقی، لطیف صدیقی، سر سید رکمار اور اسرار عارفی کی کوششیں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ڈائری، رپورتاژ اور خطوط دراصل پیروڈی کی صورت میں زیادہ پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں شوکت تھانوی اور فرقت کاکوروی خاصے نمایاں رہے۔

نثر کے مقابلے میں دراصل شعر و شاعری کے میدان میں زیادہ گرمی، جوش اور چہل رہی۔ جوش، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، کوکبؔ، شاد عارفی، دلاور فگار، ابوالمجاہد زاہد، قاضی غلام محمد، اے ڈی اظہر، نذیر احمد شیخ، ماچس لکھنوی، مسٹر دہلوی، شوق بہرائچی، ظریف جبلپوری، شہباز امروہوی، رئیس امروہوی، مرزا محمود سرحدی، اور علامہ پاکٹ مار وغیرہ برابر اچھی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ راجا مہدی علی خاں اور قاضی غلام محمد کے نئے مجموعۂ کلام کے علاوہ دلاور فگار کی ستم ظریفیاں، اے ڈی اظہر کی لذت آوارگی، ظریف جبلپوری کا فرمان ظرافت، ابوالمجاہد زاہد کا سانگ و تانہ، شاد کا کلام بے لگام، کلام لق لق (حاجی لق لق کے کلام کا نیا ایڈیشن) اس سال شایع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سوا، غالب اور شاد عارفی وغیرہ کے شعری مجموعے پاکٹ بکس کی شکل میں شایع ہوئے ہیں۔ پاکٹ بک والوں نے طنزیہ غزلیں اور نظمیں اور مزاحیہ غزلیں اور نظمیں کے عنوان سے دو انتخابی مجموعے بھی پیش کیے ہیں مگر ان دونوں مجموعوں میں ایک تو سنجیدہ نگارشات ادھر ادھر کا دخل ہے دوسرے تازہ اور معیاری کلام ناپید ہے۔

طنز و مزاح پر ادھر تنقید و تحقیق کا خاصا کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی (اکبر اور نئی علامات) ڈاکٹر وزیر آغا (انشائیہ نگاری، پطرس اور حاجی بغلول) ڈاکٹر شوکت سبزواری (اردو ادب میں طنز و مزاح)، اسلوب احمد انصاری (ہمنفسان رفتہ) مظفر علی سید (اردو مزاح میں ایک نئی آواز، ممتاز حسین لال نیا مزاح نگار) خلیل احمد جمالی، بشیر بدر، منظر سلیم، رام لعل (اندیشۂ شہر کی ظرافت، احمد جمال پاشا بہ حیثیت مزاح نگار۔ ایک نیا طنز نگار) ڈاکٹر اعجاز نقوی (اردو کی مزاحیہ صحافت۔ اردو کے مزاحیہ کردار۔ ایک نیا طنز و مزاح نگار) آفتاب اختر (اردو ظرافت کے خالص نمونے) کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ نے طنز و مزاح سے متعلق موضوعات پر بہت جاندار مقالے لکھے ہیں۔

ہمارے بیشتر ناقدین کی کمزوری ہے کہ وہ طنز و مزاح پر توجہ نہیں دیتے، چبائے ہوئے نوالے کھاتے اور کہی ہوئی باتیں دہراتے رہتے ہیں، دوسرے ان کے یہاں مطالعے کی کمی کا افسوسناک حد تک شدید احساس ہوتا ہے۔

لطیفے ہمارے رسائل اور اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہے اور ان میں نئے لطائف کی پھلجھڑیوں کے ساتھ پرانے اور گھسے پٹے لطائف بار بار دہرائے جاتے رہے۔ نمکدان، بھوپال پنچ، پھلجھڑی، جائزہ، کھلونا، بھائی جان، کلیاں، داستان گو، سرپنچ، نصرت اور دوسرے رسائل میں اکثر اچھے اور معیاری لطائف بھی دل کو فرحت بخشتے رہے۔ ریڈیو سے ملا نصرالدین کے لطائف نشر کیے گئے ان کے علاوہ تبسم زیر لب اور زیر لب گرم جیسے مجموعے بھی شایع ہوئے اس درمیان انگریزی اور دوسری زبانوں کے اچھے لطیفے بھی بکثرت ترجمہ ہوکر ہم تک پہنچے۔

کارٹون بنانے والے کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا چھوٹے چھوٹے واقعات سے لیکر دنیا کے عظیم ترین مسائل کی تا ہمو کو اس رخ سے پیش کرتا ہے کہ اس واقعہ کا مضحک پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ایسی ہنسی آتی ہے جو ہماری فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جمیل، حر بران، نجم، شنکر، سبحر، عزیز احمد، پرکاش، محمود وہاب اور شہاب جیسے ممتاز کارٹون کاروں نے اپنے رم گرم خطوط کے ذریعہ سیاست، ادب، فلم اور زندگی کے ہر گوشے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ قیامت کی پیشگوئی کرنے والے نجومیوں، بشیر ساربان، ٹیڈی ازم، سیاست، لیڈر، عشق، بے ٹکٹ مسافر، تیز رفتار سواریاں، عالمی، مرکزی، صوبائی اور مقامی ارباب حل و عقد، ادیب، شاعر، فلسفی، فیشن کے مارے بوہیمی، قومی یکجہتی، امن عالم، اتحاد و انسانیت کے نعرے لگانے والے، فسادات میں آمیزش کرنے والے اور ٹیکسوں پر ٹیکس لگانے والوں کو

(باقی صفحہ [illegible])

ور سعیدی

اجنبیت باہم اس درجہ کہاں تھی پہلے
تھی وہاں بھی تو یہی صورت جو یہاں تھی پہلے

اب اک آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
چشمِ تر تھی کہ جواہر کی دکاں تھی پہلے

وہ فسونِ نگہِ ناز، ارے کیا کہنا
ٹھہری ٹھہری یہی عمرِ گزراں تھی پہلے

بن گئی کلفتِ دل تلخیِ جاں کیا کہیے
جو نظر راحتِ دل عشرتِ جاں تھی پہلے

کر دیا آبلہ پایانِ جنوں نے سیراب
خاکِ ہر دشت و چمن، تشنہ دہاں تھی پہلے

یہ نتیجہ ہے ترے غم سے سبکدوشی کا
زندگی اتنی گراں بار کہاں تھی پہلے

اب بھنور بن کے ڈبونے کو جو بیتاب ہوئیں
کشتیِ دل انھیں موجوں پہ رواں تھی پہلے

زندگی بھر کے لیے روگ بنی جاتی ہے
اک خلش سی جو قریبِ رگِ جاں تھی پہلے

کتنی محجوب سی دنیا کی طرف اٹھتی ہے
وہ نظر جو تری جانب نگراں تھی پہلے

ہم اک امید پہ بڑھ آئے ہیں آگے مخمور
ورنہ دنیا وہیں اب تک ہے جہاں تھی پہلے

ولوی محمد افضلی

بیزار مجھ سے گرچہ رہا کیجیے گا آپ
میرا ہی ذکر سب سے سوا کیجیے گا آپ

مانا کہ دور دور رہا کیجیے گا آپ
لیکن نہ ضبط ہوگا تو کیا کیجیے گا آپ

آئینے میں نہ جانے کیا دیکھ دیکھ کر
احساسِ غم کو طول دیا کیجیے گا آپ

ہوگا نہ اضطراب بظاہر مرے لیے
دل میں تو بے قرار رہا کیجیے گا آپ

بستر پہ بار بار بدلیے گا کروٹیں
راتوں کو چپکے چپکے دعا کیجیے گا آپ

کیجیے گا بار بار بھلانے کی کوششیں
ہم کو ہمیشہ یاد کیا کیجیے گا آپ

کوشش سے لائیے گا لبوں پر ہنسی مگر
دل ہی جو رو پڑے گا تو کیا کیجیے گا آپ

جب چارہ گر بتا نہ سکے گا مآلِ غم
بچنے کی میرے دل سے دعا کیجیے گا آپ

مجبور ہو کے غیر کی تسکین کے لیے
خود مجھ پہ اعتراض کیا کیجیے گا آپ

تنہائیوں میں میری تصور کے سامنے
رو رو کے پھر سے عہدِ وفا کیجیے گا آپ

لیجیے مرا سلام وہ دن بھی قریب ہے
جب میری بے رخی کا گلہ کیجیے گا آپ

یہ بد دعا نہیں ہے مگر افضلی کے بعد
بے وجہ سوگوار رہا کیجیے گا آپ

باب الانتقاد

جذباتِ نادر (ترقی اُردو بورڈ ایڈیشن) پر ایک نظر

رشید حسن خاں

نادر علی خاں نادر کاکوروی (متوفی اکتوبر ۱۹۱۲ء) اپنے زمانے کے معروف شاعر، اور نظم نگاری کی تحریکِ جدید کے قابلِ ذکر نمایندے تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، اور اس طرز کی طبع زاد نظمیں بھی کہیں۔ ان کا ایک ترجمہ "گزرے ہوئے زمانے کی یاد" آج بھی تاثیر و دلکشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ خیال کو زیادہ سے زیادہ سادگی کے ساتھ پیش کرنا، بھاری بھرکم الفاظ اور پُرشور اندازِ بیان سے دامن بچانا، اور لفظوں کے انتخاب میں مرصع سازی کے بجائے محض ادائے خیال کی ضرورت کا خیال رکھنا، ان کا خاص انداز تھا۔ ان کی نظموں میں جگہ جگہ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ شاعر کے پیشِ نظر طرزِ ادا میں پیچ و خم پیدا کرنے، چونکا دینے والے اندازِ بیان اختیار کرنے، اور مرصع شعر گوئی کے بجائے، کسی بیان کو پُر وضاحت انداز سے نظم کر دینے کا اصول رہتا تھا۔ ان کی کچھ نظمیں یقیناً ایسی ہیں، جن کو پڑھ کر آج کے بہت سے نوجوان نظم نگار، جو ابہام و ژولیدہ بیانی کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور اپنے ساتھ دوسروں کے صبر و ضبط کا بھی جا و بے جا امتحان لیتے رہتے ہیں، بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

حالی و آزاد کے بعد جن لوگوں نے نظمِ جدید کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا، اور اُردو نظم کو مغربی خیالات و اندازِ بیان سے آشنا کیا، اور اس طرح اس میں وسعت و تنوع کے ایک مستقل عنصر کا اضافہ کیا، ان میں نادر کا نام بھی ہے۔ اُن کے ذکر کے بغیر اور اُن کے کلام کو پیشِ نظر رکھے بغیر، اردو نظم کا تاریخی جائزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

نادر کی نظموں کا مجموعہ دو حصوں میں الگ الگ چھپا تھا۔ دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں نولکشور پریس سے شائع ہوا تھا، اس میں ان کی مثنوی "لالہ رخ" بھی تھی۔ یہ مجموعے عرصے سے کمیاب تھے۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے، ترقی اردو بورڈ کراچی کی اعانت سے، ۱۹۶۲ء میں ان دونوں مجموعوں کو ایک جلد میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ نہایت خوب صورت ٹائپ میں چھپا ہے۔ مضبوط جلد، خوب صورت گرد پوش، عمدہ کاغذ، غرض آرائشِ بیرونی کے سارے لوازم سے آراستہ ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، کہ اس کی ترتیب میں ساری ضروری باتوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔

بہت سی اچھی کتابیں عموماً بار بار نہیں چھپتی ہیں۔ خصوصاً کسی پرانے شاعر کا مجموعۂ کلام۔ اب بظاہر دس پندرہ برس تک اس مجموعے کا دوبارہ شائع ہونا مشکل ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری تھا کہ اس اشاعت میں حسنِ طباعت کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جاتی کہ نادر کا جو کلام مختلف رسالوں میں منتشر ہے، اس کو بھی شاملِ مجموعہ کر لیا جائے۔ کلامِ نادر کا دوسرا حصہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ نادر کا انتقال اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ دو ڈھائی برس کی مدت میں، انھوں نے جو نظمیں کہیں، وہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ پرانے رسالوں کے فائل روز بروز کم یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بات کا شدید احتمال ہے کہ نادر کی یہ نظمیں کچھ دنوں کے بعد فراموش ہو جائیں گی۔

کتابیں اس سے پہلے بھی چھپتی تھیں، آج بھی چھپتی ہیں۔ لیکن آج کل کسی کتاب کا نیا اڈیشن شائع کرنے کے کچھ اصول ہیں، جن کو پیشِ نظر رکھنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ نادر کا یہ مجموعہ ترقی اردو بورڈ جیسے معیاری ادارے کی اعانت سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے اس میں تو ترتیب کے اُن اصولوں کو بہر طور ملحوظ رہنا چاہیے تھا۔ پرانی کتاب کو اسی طرح چھاپ دینا ایسا معمولی کام ہے، جس کو معمولی سے معمولی پبلشر کر سکتا ہے، برابر اس کے نمونے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ اگر معتبر ادارے بھی یہی کرنے لگے، تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح امتیاز کیا جا سکے گا؟

اس سے بھی زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نقل مطابقِ اصل کا اصول، جس کا دعوا کیا گیا ہے، پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ خاص طور پر صحتِ متن میں۔ متن جگہ جگہ غلط ہے۔ جس کے سبب سے یہ ضروری ہو گیا ہے، کہ جو لوگ صحیح متن کے طلب گار ہوں، وہ پہلے پرانا اڈیشن ڈھونڈ

. نئے اڈیشن کی تصحیح کریں، اور پھر پڑھیں۔ پرانا اڈیشن بقولِ مرتب، نایاب کی حد تک کم یاب ہے، اس لیے نتیجہ معلوم !!
اسی طرح جو لوگ یہ چاہتے ہیں، کہ نادر کا مکمل کلام پڑھیں، وہ اس مجموعے کو خریدنے کے بعد مختلف لائبریریوں میں جاکر پرانے رسائل کی ورق گردانی کریں،
ظموں کو نقل کریں، جو اس مجموعے میں نہیں ہیں۔ یہ کوئی میر و سودا کا کلیات تو تھا نہیں، جن کو ہر شخص مرتب نہیں کرسکتا۔ معمولی تلاش اور ضروری اہتمام
لیا جاتا، تو مکمل مجموعہ بہ آسانی مرتب ہوسکتا تھا۔ اگر اتنی مشکل پسندی بھی بارِ خاطر ہو، تو اس پھیر میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے !! معمولی پبلشر یہ کاروبا
ئے ہیں کہ کسی کتاب کو ردّی میں سے ڈھونڈھ نکالا، یا کسی لائبریری سے لے آئے، اور اُس کو حوالۂ کاتب کردیا۔ نیا اڈیشن بہ آسانی تیار ہوگیا۔
ذیل میں کچھ فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ جو کتابیں شائع ہوں وہ اِس آلودگی سے پاک رہیں۔ تاکہ ایسے ادار
اداعتبار پر حرف نہ آئے۔

"جذبات نادر" حصّہ دوم کے قدیم اڈیشن میں، حصّہ منظومات کے بعد اور مثنوی سے پہلے، ایک صفحے کا "صحت نامہ" ہے۔ جس میں بارہ غلطیوں کی
گئی ہے۔ نئے اڈیشن میں وہ غائب ہے، اور غلطیوں کی تصحیح بھی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اصولاً، اس اڈیشن میں اُن غلطیوں کی تصحیح کرنا چاہیے تھی۔
ل مطابق اصل کا لحاظ رکھتے ہوئے، اُن غلطیوں کو بھی بعینہ رکھنا ضروری تھا، تو صحت نامے کو بھی نقل کرنا ضروری تھا۔ ذیل میں قدیم اڈیشن سے اُس صحت نامے
کیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے، صحت نامے میں بائیں طرف نئے اڈیشن کے صفحات اور سطروں کو بھی درج کردیا گیا ہے۔ نیز شروع میں نمبر شمار کا بھی اضافہ
ہے:

ر	صحت نامۂ جذبات نادر				جدید اڈیشن میں	
	صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر
	۲۱	۳	سکا تھا	چکا تھا	۱۲۶	۴
	۲۴	۴	کوہ طور	فرطور	۱۳۴	۴
	۳۱	۱۳	محنت	مشقت		
	۳۵	۱۵	مند	بند		
	۳۷	۱	اپنے مال	اپنے بال	۱۶۱	۶
	۵۰	آخری	استکار	انتظام	۱۸۵	۸
	۵۱	"	یہ بڑی	ہے تری	۱۸۷	۹
	۵۴	"	نام کی	قوم کی	۱۹۱	۱۳
	۷۹	نیچے سے سطر ۲	حرف	خون	۲۳۲	۰
	۹۱	۱۵	کس جال	کس حال	۲۶۰	۳
	۹۲	۹	یادہو	یاد ہیں	۲۶۲	۳
	۹۳	۱۳	بہادر	بہادر مرحوم	۲۶۴	۲

اس سلسلے میں یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، کہ جدید اڈیشن میں، بعض غلطیاں درست کردی گئی ہیں، اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا ہے، نیز
اڈیشن کے، اس "صحت نامے" میں بھی، بعض غلطیوں کی جو نشان دہی کی گئی ہے، وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ شمار کے
ت صحت نامے کے مطابق ہیں۔
۰ جدید اڈیشن میں یہ غلطی نہیں ہے۔

ہنگامہ اس میں سوز ہے (اور) اس میں ساز ہے (ص ۱۵۱) — قدیم میں لفظ "اور" موجود ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو قوسین میں کیوں لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا قدیم میں "اور" نہیں تھا مرتب نے اضافہ کیا

اچھا ہے بہت ہندو مسلماں کا اتفاق — قدیم میں لفظ "بہت" نہیں ہے۔ اس لیے یہاں اس کو قوسین میں لکھنا چاہیے تھا

ص ۲۳۹ پر حاشیے میں یہ عبارت بھی موجود ہے: "۲ حاشیہ از نادر، رشی دالمیک"۔ یہ عبارت قدیم اڈیشن میں نہیں ہے۔ البتہ ۱ کے تحت جو عبارت درج کی گئی ہے، وہ قدیم میں موجود ہے (یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ نظم جولائی سنہ ۔۔۔ کے زمانہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پہلا حاشیہ بھی نہیں ہے۔)

مرتب نے یہ اہتمام کیا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ غلط نظم ہوا ہے، یا اور کوئی فروگذاشت ہوگئی ہے، اُس کو حاشیے میں ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن متعدد مقامات ایسے ہیں، جہاں یہ التزام قائم نہیں رہ سکا ہے۔ اس سے عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ گویا مرتب کی رائے میں ان مقامات پر کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے! ایسے چند مقامات درج ذیل ہیں۔

ص ۳۴۲ پر رباعی کا ایک مصرع ہے۔ "ٹوٹی ہوئی شیشہ کی رہی ہے جھنکار"۔ قدیم میں بھی "ٹوٹی ہوئی" لکھا ہے۔ نقل مطابقِ اصل کی دھن میں یہ نہیں دیکھا گیا، کہ یہاں "ٹوٹے ہوئے" کا محل ہے۔ اگر قدیم کتابت میں تصرف شایانِ شان نہ تھا، تو "کذا" ہی لکھ دیا جاتا۔

ص ۷۷ پر ایک شعر ہے ~ خم و مینا میں تلچھٹ کیا کہ اک آخور باقی ہے ❊ مگر رندوں کے دل میں شوق ابھی بے طور باقی ہے۔ اس شعر میں لفظ "بے طور" پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے۔

"آخور میں واو مجہول ہے۔ دور، طور میں معروف۔ مرتب"

مجھ کو اپنے قصورِ فہم کا اعتراف ہے کہ میں یہاں "بے طور" میں "طور" کو بہ فتحِ اول سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بہ ضمِ اول ہے اور بہ واوِ معروف۔ سبحان اللہ! اس سے قطع نظر کرکے یہ عرض کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ حاشیے کی عبارت مفہوم سے بے نیاز ہے۔

ص ۵۷ پر یہ مصرع ہے: ؏ یہ رفتگانِ خاک جن کی تمام عمر ـــ یہ بحر سے ساقط الوزن ہے۔ اور اس پر کوئی نوٹ نہیں ہے۔

ص ۷۷ پر مسدس کا یہ بند بھی ہے۔

کیا ہے شجر ایک خوشنما طائر ہے	تیور کبھی کبھی بہ زور آور ہے
نالاں ہے کبھی بار زمیں کے نیچے	او زمزمہ ساز یہ بھی اس پر ہے

مرتب نے کسی جگہ حاشیے میں یہ لکھا ہے کہ یہاں قافیہ صحیح نہیں ہے۔ حرکات بدل گئی ہیں، لیکن "طائر" اور "زور آور" میں اُن کو کوئی غلطی محسوس نہیں ہوئی!

ص ۳۰۲ پر ایک مصرع ہے، ؏ افسوس اک بات ودکی جذبات۔ مرتب نے لفظ "جذبات" سے متعلق حاشیے میں لکھا ہے "کذا"۔ گویا یہ لفظ ان کی رائے میں صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں "جذبات" جذبہ کی جمع کے مفہوم میں ہے اور صحیح ہے۔

اسی صفحے پر ایک مصرعہ ہے ؏ ایک شکوہ ایک بے اصل بات ـــ اس پر مرتب نے نوٹ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ نادر نے یہاں قافیے میں لفظ اصل کو تلفظِ عام کے مطابق نظم کیا ہے لیکن انھوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اس مصرع میں لفظ "ایک" نے مصرع کو ساقط الوزن بنا دیا ہے اور اس پر نوٹ کا محل ہے۔

صحتِ املا اور یکسانیتِ املا کا حال سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں میں اس کا نام نہیں کیا جا سکتا! چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

املا میں یکسانیت کی نام کی کوئی چیز نہیں ہے ایک لفظ چار جگہ ایک طرح ہے، دس جگہ دوسری طرح مثلاً۔

مجکو ص ــ ۱۰۱، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۵۳ مجھکو ص ــ ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۲ مجکو ص ۱۳۴، ۱۵۵

مجکو ص ۱۳۵ تجکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، تجھ کو ص ۹۱، ۱۴۵
اسکو ص ۲۲۰ اس کو ص ۲۳۳
ڈھونڈھتا ص ۱۲۶، ۱۲۸، ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املائی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جن کے آخر میں ایک "ھ" زائد ہے۔

آنکھه ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھه ص ۹۰، ۱۳۰ — ساتھه ص ۱۲۷ — نتجھه ص ۱۲۸، ۱۳۲
جھه ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھه ص ۱۲۹ — کچھه ص ۱۳۳ — تجھهی ص ۱۴۰ — ہاتھه ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی بہتات ہے، جتنی امانت کے یہاں ملیع جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف "ھ" کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں "ھ" ہونا چاہیے، اور غائب ہے مثلاً "بوڑھا" "بوڑی بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف "ھ" کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی شائع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

منشی فخرالدین سفیر کاکوروی، نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا — اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے بطور تعارف لکھا ہے:

"نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت"

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر کاکوروی[1]، اور صفیر بلگرامی[2] میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے "صفیر از کاکوری" مقدمے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے: "اس مجموعے میں صفیر کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، البتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

مرتب نے کئی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابق اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ان کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو، تین مثالیں، محض اثبات مدعا کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۱۷۰ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سرورق) گویا اس صفحے پر قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ (۱) شروع میں لکھا ہوا ہے: "مثنوی لائٹ آف دی حرم"۔ جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں "مثنوی لالہ رخ" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف "لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۷۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بہ شمار صفحات) اگر منقول مطابق اصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ترتیب فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان "اسباب ملال" اور "لوزمل کی خورش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[1] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[2] صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۸ھ میں ہوا ہے (۱۸۹۰ء) تاریخ لطیف (قلمی۔ کتاب خانہ رامپور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

سن لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال ؎ لو ہو گئے جا کے اب صفیر، روح الامیں کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافۂ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطر اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "خمخانہ میں میرے جشنِ احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحے پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۶، ۷ پر فہرست مضامین حصۂ دوم ہے۔ ص ۷ کے آخر میں قوسین میں لکھا ہوا ہے (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول) اس کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔

شمارۂ ۳۴ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں، اس کے بجائے یہ عبارت ہے "تاریخ دیوان ملک الشعرا امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصریحات یا اُن سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں، جن کو مقدمے یا حواشی میں اگر پیش کیا جاتا، تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔ ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم و جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلام نادر کا حصۂ دوم، اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے۔

"انسان بطنِ قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلایشات دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گناہگار اور ناپاک ہو جاتا ہے، اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانون قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں۔ اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ (نادر)

۱۹۱۵ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیا نرائن نگم نے "یاد رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں، متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان ربیع" "نادر منہار" "دعوت گل" "شعاع امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد کسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے افسوس نادر کاکوروی صرف ۵۲ برس کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء[1] میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں جب سے زمانہ کا سلسلۂ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرتے رہے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں کہہ کر اپنے زود طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خرد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے"

---

[1] زمانہ میں یہاں ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا، جس کا پہلا جملہ یہ ہے "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا"

مجکو ص ۱۳۵　　تجکو ص ۱۲۷، ۱۳۳، تجکو ص ۹۱، ۱۴۵

اسکو ص ۲۲۰　　اس کو ص ۲۳۳

ڈھونڈھتا ص ۱۲۶، ۱۲۸،　　ڈھونڈتا ص ۱۴۰

غلط املا کی بھی کمی نہیں ہے۔ میں صرف ایسے الفاظ کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جن کے آخر میں ایک "ھ" زائد ہے۔

آنکھہ ص ۸۹، ۱۴۵ — دیکھہ ص ۹۰، ۱۳۰ — سانتھہ ص ۱۲۷ — نتجھہ ص ۱۲۸، ۱۳۲

جھہ ص ۱۳۱، ۱۳۲ — بیٹھہ ص ۱۲۹ — کچھہ ص ۱۳۳ — تجھی ص ۱۴۰ — ہاتھہ ص ۱۴۵

مندرجۂ بالا دونوں طرح کی مثالیں محض مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کی اس کتاب میں اتنی بہتات ہے، جتنی امانت کے یہاں بلبع جگت کی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف "ھ" کے اضافے ہی تک یہ غلطی محدود ہے۔ ایسے بھی مقامات ہیں، جہاں "ھ" ہونا چاہیے، اور غائب ہے مثلاً "بوڑھا" "بوڑی" بن گئی ہے (ص ۱۰۸) اور صرف "ھ" کی کمی زیادتی تک بھی یہ محدود نہیں ہے۔ وہ ساری غلطی ہائے املا موجود ہیں، جو معمولی معمولی ناشروں کی شائع کی ہوئی کتابوں میں ہوتی ہیں۔

منشی فخرالدین سفیر کاکوروی،[1] نادر کے ہم عصر بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ انھوں نے نادر کی وفات پر، رسالۂ زمانہ کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں ایک تعزیتی مضمون لکھا تھا — اس مضمون کو جدید اڈیشن کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ لیکن کئی بوالعجبیوں کے ساتھ۔ مضمون سے پہلے مرتب صاحب نے بطور تعارف لکھا ہے:

"نادر کاکوروی کی وفات پر صفیر بلگرامی کا اظہار تعزیت"

ملاحظہ فرمایا! مرتب صاحب کی رائے میں سفیر کاکوروی، اور صفیر بلگرامی[2] میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہوا ہے "صفیر از کاکوری"۔ مقدمے کے آخر میں مرتب نے لکھا ہے: "اس مجموعے میں صفیہ کاکوروی مرحوم کا ایک مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے"۔ یہاں وہ "بلگرامی" تو نہیں بنے، البتہ صفیر (بہ صاد) بدستور بنے رہے۔

مرتب نے کسی جگہ دعوا کیا ہے، کہ نقل مطابق اصل کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ دعوا صحیح نہیں ہے۔ دو، تین مثالیں، محض اثبات مدعا کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

مثنوی لالہ رخ کے آغاز میں ص ۱۲۷ پر پہلی سطر میں لکھا ہوا ہے (نقل سرورق) گویا اس صفحے پر قدیم اڈیشن کے صفحۂ اول کی مکمل نقل ہے۔ (۱) شروع میں لکھا ہوا ہے: "مثنوی لائٹ آف دی حرم"۔ جب کہ قدیم میں صرف "مثنوی لائٹ آف حرم" ہے (۲) اسی طرح چھٹی سطر میں "مثنوی لالہ رخ" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں صرف "لالہ رخ" ہے۔ (۳) اسی طرح ص ۲۰۲ پر مرتب نے آخری سطر میں لکھا ہے (منقول از نسخۂ اول بحز شمار صفحات) اگر حقّ مطابق اصل کا پورا پورا حساب کتاب کیا جائے، تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ق پر فہرست میں عنوانات ۱۹ ہیں، جب کہ اس میں ۲۱ ہیں۔ بات یہ ہے کہ دو عنوان "اسباب ملال" اور "نورمحل کی خوش الحانی" فہرست میں شامل نہیں تھے۔ اصل کتاب میں موجود تھے۔ اگر مرتب کی مراد یہ ہے کہ یہ صفحہ بالکل قدیم اڈیشن کے صفحے کی نقل

---

[1] سفیر کاکوروی کے حالات کے لیے دیکھیے، خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۲۱۹۔

[2] صفیر بلگرامی کا انتقال ۱۳۰۸ھ میں ہوا ہے (۱۸۹۰ء) تاریخ لطیف (قلمی۔ کتاب خانہ رام پور) میں جلال کے صاحبزادے، میر مہدی کمال کا قطعۂ تاریخ وفات موجود ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

کلک نے لکھ دیا کمال ان کی وفات کا یہ سال　　ہو گئے جا کے اب صفیر، روح الامیں کے ہم صفیر

ہے، تو اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہاں یہ عنوانات اضافہ مرتب ہیں۔ اس کے علاوہ سطر اول میں "لائٹ آف دی حرم" میں لفظ "دی" زائد ہے۔ قدیم میں "لائٹ آف حرم" ہے۔

قدیم اڈیشن میں رباعی "مئخانہ میں میرے جشن احباب رہے" "نغمۂ تمہید" کے بعد ہے۔ جدید میں "نغمۂ تمہید" سے پہلے علاحدہ ایک صفحے پر درج ہے۔

جدید اڈیشن میں ص ۶/۷ پر فہرست مضامین حصۂ دوم ہے۔ ص ۷ کے آخر میں، قوسین میں لکھا ہوا ہے، (علاوہ شمارۂ صفحات اصل نسخے سے منقول) اس کا عالم یہ ہے کہ جدید اڈیشن میں شمارۂ ۳۳ کے آگے صرف "غزلیات" لکھا ہوا ہے، جب کہ قدیم میں "غزلیات عاشقانہ فارسی و اردو" لکھا ہوا ہے۔

شمارہ ۳۴ کے آگے، جدید اڈیشن میں "متفرقات" لکھا ہوا ہے۔ قدیم میں، اس کے بجائے یہ عبارت ہے "تاریخ دیوان ملک الشعرا امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں صاحب بہادر ممتاز جنگ مرحوم"

قدیم رسائل کی ورق گردانی کی جاتی، تو نادر کی منتشر نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تصریحات یا اُن سے متعلق باتیں بھی مل جاتیں، جن کو مقدمے یا حواشی میں اگر پیش کیا جاتا، تو بعض اعتبارات سے افادیت میں خاصا اضافہ ہو جاتا۔ ایسے چند حوالے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نادر کی نظم "دو تصویریں" قدیم و جدید اڈیشن میں موجود ہے۔ یہ نظم زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر نادر کا یہ نوٹ تھا جو مجموعے میں نہیں ہے۔ کلام نادر کا حصۂ دوم، اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ انھوں نے دانستہ اس نوٹ کو چھوڑ دیا، یا غلطی سے شامل ہونے سے رہ گیا۔ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اور نظموں پر ایسے نوٹ موجود ہیں۔ یہ نوٹ درج ذیل ہے۔

(" انسان بطن قدرت سے ایک خوبصورت معصوم اور پاک جسم لے کر پیدا ہوتا ہے، لیکن جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر آلائشات دنیا سے ملوث ہوتا، اور ترقی معکوس کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتہائے عمر کو پہنچ کر وہ انتہا درجہ کا بدصورت، گنہگار اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور ہرگز اس قابل نہیں رہتا، کہ ایک منٹ کے لیے دنیا میں زندہ چھوڑ دیا جائے۔"

یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذہب اس قانون قدرت کو رد کرنے میں کہاں تک قادر اور کہاں تک مجبور ہے۔ اور کہاں تک اس منطقی دلیل کو تسلیم کرتا ہے لیکن ایک انگریزی شاعر نے اس ہیبت ناک تصویر کے دو رخ جس سادگی سے دکھائے ہیں وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ناظرین کو ایک نظر دکھائے جائیں، اور ان کو اس مسئلے پر غور کرنے کا ایک بار موقع دیا جائے۔ نادر)

۱۹۲۸ء میں زمانہ کا جبلی نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں منشی دیا نرائن نگم نے "یاد رفتگاں" کے عنوان کے تحت متعدد لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ ان میں نادر بھی ہیں، متعلقہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین" اور "بہارستان ربیع" "مادر ہند" "دعوت گل" "شعار امید" "نغمۂ شاعری" ملاحظہ فرمائی ہیں، ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ برس کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۲ء[1] میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ موجزن تھا اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے۔ اور طرز جدید میں خوب خوب نظمیں کہتے تھے، جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں جب سے زمانہ کا سلسلہ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرتے رہے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں لکھ کر اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ اڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے۔ ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی، تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا، جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔"

---

[1] زمانہ میں یہاں ۱۹۱۳ء لکھا ہوا ہے، جو غلطی کتابت ہے۔ نادر کی وفات پر سفیر کاکوروی کا تعزیتی خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کے زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر اڈیٹر کا بھی ایک نوٹ تھا، جس کا پہلا جملہ یہ ہے "پریس جاتے وقت ہم کو یہ افسوس ناک خط ملا"

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے
اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی — جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

صحیفۂ فطرت

"برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے — کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے
یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری — چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے
شاعری ہے وہ متاعِ کلیاتِ کائنات — جس پہ اہل الرائے کے اقرار ہیں لکھے ہوئے
دفترِ عالم کی نظم آرائیوں پر کر نظر — صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے
دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کاہ کاہ — برگِ گل مثلِ خطِ گلزار ہیں لکھے ہوئے
خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں — مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے — کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار — واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
یہ گھٹائیں اودی کالی کیا ہیں سائن بورڈ ہیں — جو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج — ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

سوزِ عشق

آفریں اے عشق اے محبت کے شرارِ بے قرار — آتشِ پنہاں کے اُف اے شعلۂ سیماب وار
اے خدنگِ عشق اے دل لے نشترِ سینہ فگار — تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خونابہ بار

کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیٔ فانی مری، میرا وجودِ دردمند — تھے اسی قابل کہ ہوں میرے جلاسب بند بند
شکر ہے یہ التجائے معنوی آئی پسند — باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے بالطف گزند

قطعاتِ تاریخِ وفات (زمانہ)

خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں ۔۔۔ مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھتے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر دیکھ شبنم کی بہار ۔۔۔ واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج ۔۔۔ ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے
اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی ۔۔۔ جا بجا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

صحیفۂ فطرت

"برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ۔۔۔ ہر ورقِ دفتریست معرفتِ کردگار"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ جو حسن و عشق کے طومار ہیں لکھے ہوئے ۔۔۔ کیا یہ سب مہمل ہیں، سب بیکار ہیں لکھے ہوئے
یہ جہانِ حسن خود ہے اک طلسمِ شاعری ۔۔۔ چپے چپے پر یہاں اشعار ہیں لکھے ہوئے
شاعری ہے وہ متاعِ کلیاتِ کائنات ۔۔۔ جس پہ اہل اللہ کے اقرار ہیں لکھے ہوئے
دفترِ عالم کی نظم آرائیوں پہ کر نظر ۔۔۔ صاف حسن و عشق کے اسرار ہیں لکھے ہوئے
دیکھ چشمِ غور سے نقش و نگارِ کاہ کاہ ۔۔۔ برگِ گل مثلِ خطِ گلزار ہیں لکھے ہوئے
خونِ بلبل کی کہاں پھولوں پہ رنگ آمیزیاں ۔۔۔ مجرمانِ عشق کے اظہار ہیں لکھے ہوئے
آسماں کی لوح پر خطِ شعاعِ شمس سے ۔۔۔ کیسے کیسے مطلعِ انوار ہیں لکھے ہوئے
ابرِ باراں پر نظر کر، دیکھ شبنم کی بہار ۔۔۔ واہ کیا مضمونِ گوہر بار ہیں لکھے ہوئے
یہ گھٹائیں اُودی کالی کیا ہیں، سائن بورڈ ہیں ۔۔۔ جو پئے ترغیبِ بادہ خوار ہیں لکھے ہوئے
ہر جگہ یاں دفن ہے اک شاعرِ عاشق مزاج ۔۔۔ ہر جگہ قطعے سرِ دیوار ہیں لکھے ہوئے

اس خرابے سے کوئی گزرا ہے نادر نام بھی
جا بہ جا دیوار پر اشعار ہیں لکھے ہوئے

(زمانہ، فروری ۱۹۱۳ء)

سوزِ عشق

آہ اے عشق، اے محبت کے شرارِ بے قرار ۔۔۔ آتشِ پنہاں کے اُف اے شعلۂ سیماب وار
اے خدنگِ عشق اے لے نشترِ سینہ فگار ۔۔۔ تیری کاوش سے گل افشاں دیدۂ خونابہ بار

کشتہ کر کے زندۂ جاوید تو نے کر دیا
ذرۂ پامال کو خورشید تو نے کر دیا

ہستیٔ ناکام مری، میرا وجودِ دردمند ۔۔۔ تھے اسی قابل کہ ہوں میرے صدا سب بند بند
شکر ہے یا اجابے معنوی آئی پسند ۔۔۔ باعثِ راحت ہے مجھ کو تیرے ہاتھوں سے گزند

آہ اے بزمِ جہاں کے شمعِ شبِ افروزِ عشق
اے شرارِ برقِ تاباں، اے شعلۂ جاں سوزِ عشق
اک مرقع ہے عدم کا جلوۂ ہستی مرا
مٹ گیا جب اپنی اصلیت سے جاکر مل گیا
یعنی جب تکمیل کو پہنچا تو میں کچھ بھی نہ تھا
میری ہستی اک دھواں ہے شعلۂ جوالہ کا
نغمہ زا ہے اب صدا میرے شکستِ رنگ کی
وسعتِ ہستی ہے وسعت میرے قلبِ تنگ کی

(زمانہ، شمارہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء)

سیرِ دریا

سیرِ دریا، لطفِ کشتی اور گھٹا چھائی ہوئی
بڑھ چلی حد سے، جوانی جوش پر آئی ہوئی
دستہ ہائے گل سے، کشتی کو بنا کر مہدِ گل
لے چلا تفریح کو عہدِ شباب اور عہدِ گل

عاشق و معشوق باہم سیر کرنے کو چلے
آشنایانِ محبت ڈوب مرنے کو چلے

کیا سرور افزا، نشاط انگیز چھائی ہے گھٹا
بوندیاں پڑتی ہیں یا کیوڑا چھڑکتی ہے گھٹا
بوئے گل کے مختلف کپڑے بدلتی ہے نسیم
پنکھیاں پھولوں کے گویا منہ پہ جھلتی ہے نسیم
لیتی ہے نظارۂ ہر برگ میں لذت نگاہ
چاٹتی ہے سبزۂ شاداب پر امرت نگاہ
جس طرح دریا میں موجوں سے کوئی کشتی نشیں
کھیلتا ہو ڈال کر پانی میں دستِ نازنیں
کشتیِ چشمِ طراوت آشنا سے کود کر
تیرتی ہے سبزۂ متواجِ ساحل پر نظر

دور، کوسوں دور، جاتی ہے فضائے آب میں
ڈبکیاں کھاتی ہوئی امواج اور گرداب میں

تیرتی ہیں وہ بطیں، کرتی ہوئی مرغابیاں
اور وہ کشتی میں بیٹھا جا رہا ہے اکسلا ل
خوب اک مہ پارۂ لڑ خیز بھی پہلو میں ہے
آدمی کے ایک دریائی پری پہلو میں ہے
ہائے وہ مستانہ انداز اور وہ رغبت کی نگاہ
وہ گلابی آنکھ، وہ نشے میں متوالی نگاہ
بے خودی میں زانوئے عاشق دبا کے پیار سے
اور وہ سینے پر اُس کے سر جھکائے پیار سے

عالمِ خلوت ہے اور معشوق در آغوش ہے
لطفِ سیر و لطفِ وصل و لطفِ ناو نوش ہے

اے ہوس آلودہ، اے لذت کشِ آغوشِ یار
چین ہی چین اب تو لکھتا ہے ترا نامہ نگار
چین ہے کیا! درحقیقت چین اسی کا نام ہے!!
کیا شباب چند روزہ کا یہی اک کام ہے!!
عیش کہتا ہے اسے!! سمجھا تو مفہومِ عیش
تیرتی ہے بحرِ غم پر کشتیِ موہومِ عیش
تیری کشتی گرچہ او کشتی نشیں جاتی ہے تیز
کشتیِ عمرِ رواں، اس سے کہیں جاتی ہے تیز
بس ہوا و حرص کی موجوں کو اپنے ساتھ روک
ٹھہر کشتی پھیر، ہتے چھوڑ، اپنے ہاتھ روک

زورِ طوفاں ہے، کہیں گرداب میں تو آ نہ جائے — دیکھ ساحل سے کہیں کشتی تری ٹکرا نہ جائے
ہے حبابِ بحر کے مانند انجامِ حیات — ایک غوطہ کھاتے ہی لبریز ہے جامِ حیات
اے حبابِ بحر اے پروردۂ آغوشِ موج — تیری ہستی اک جنازہ ہے رواں بردوشِ موج
لذتِ گہوارہ ہے جس کی تجھے ہر لہر میں
ایک تختہ بھی نہ ابھرا ڈوب کر اس بحر میں
دیکھ ہوتی جا رہی ہے اب گھٹا تاریک تر — اور جھونکے آمدِ طوفاں کی دیتے ہیں خبر
روک ہتے، پھیر رُخ کشتی کا، ناداں لوٹ آ — جان دینے کو نہ جا، اے دشمنِ جاں لوٹ آ
دیکھ تیرے ساتھ خطرے میں ہے تیرا ہم نشیں — آ، تو اس نازنیں کو بھی نہ لے ڈوبے کہیں
تو نہیں سنتا کسی کی، خیر، جاتا ہے تو جا — اپنی بربادی کی کھِے سیر جاتا ہے تو جا
جا، پر اس آغازِ الفت کا بخیر انجام ہو
تیرا بیڑا پار ہو ساحل پہ تجھ کو شام ہو (ادیب، جنوری ۱۹۱۱ء)

سہ مصرعی [۱]

خوشی سے خوشی کا نہ ہونا ہی اچھا — جہاں جان رو رو کے کھونا ہی اچھا
رلانا ہی اچھا ہے، رونا ہی اچھا
یہ قصر اور یہ گھر ہے سب چار دن کا — یہ فرشِ معطر ہے سب چار دن کا
تو خاکِ لحد کا بچھونا ہی اچھا
بھری تلخیوں سے ہے یہ جانِ شیریں — سم آلودہ ہے پارۂ نانِ شیریں
غذا سے یہاں ہاتھ دھونا ہی اچھا
تماشے جہاں کے کبھی کم نہ ہوں گے — زمانہ رہے گا مگر ہم نہ ہوں گے
نہ ہوں ہم، ہمارا نہ ہونا ہی اچھا
کہے جا اسی طرح اشعارِ نادر — نہ اشکوں کا ٹوٹے ترے تارِ نادر
یہ لڑیوں میں موتی پرونا ہی اچھا

(مخزن، نومبر ۱۹۱۲ء)

[۱] سب ایڈیٹر مخزن (لاہور) غلام محمد طور نے، نادر کی موت پر ایک مضمون مخزن شمارۂ نومبر ۱۲ء میں لکھا تھا۔ اس کے آخر میں یہ سطریں بھی ہیں:۔
"دنیا کے مصائب اور زمانے کے حادثات سے، جو پے درپے آپ کو پیش آئے، آپ کی طبیعت زندگی سے اچاٹ ہو گئی تھی چنانچہ حالتِ بیماری میں فی البدیہ کی سہ مصرعی ۱۲ء ستمبر کے پرچہ میں "کلامِ نادر" کے عنوان کے نیچے درج ہو چکی ہے، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔" اس کے بعد مندرجہ بالا سہ مصرعی نقل کی گئی ہے۔

بڑا امام باڑہ لکھنؤ

اے منادِ دیرِ اودھ، اے یادگارِ لکھنؤ   اے گلِ پژمردۂ رفتہ بہارِ لکھنؤ
تیرے گنبد کا کلس ہے طرۂ تاجِ اودھ   اور ترا گنبد ہے چترِ زرنگارِ لکھنؤ

ہر عمارت کو اودھ تجھ سے لڑا کر توڑ دے   ہر محل کو تیری اک ہلکی سی ٹھوکر توڑ دے
فاتحِ اقلیمِ تعمیرات ہے لاریب تو   ایک آئینہ ترا سدِ سکندر توڑ دے

رومی دروازے کی رفعت پر یہ ہے چکر میں عقل   سر اٹھا کر جس نے دیکھا، اس کو چکر آ گیا
اس طرح ہے سر اٹھائے تیری مسجد کا کلس   آسماں کا چتر ہے گویا تجھی پر گھومتا

آہ یہ طوطے نہیں، روحیں ہیں بہرِ بازدید   آئی ہیں جنت سے پہنے حلہ ہائے سبز فام
اور طے کر کے مسافت عالمِ ارواح کی   تیرے میناروں پہ دم لینے کو کرتی ہیں قیام

آ کے گرتے ہیں ترے گنبد پہ جب غولِ طیور   اور جب وہ چہچہاتے ہیں ترے مینار پر
آہ! کس حسرت سے گھنٹوں دیکھتا ہوں میں انھیں   اور مجھے اس محویت میں تب یہ آتا ہے نظر

صحنِ مے خانہ میں کی آراستہ ساقی نے میز   چن کے کچھ کنٹر سنہرے اور کچھ جامِ بلور
ناگہاں پریاں فضائے نیلگوں سے آ گریں   اور ہو کر مست، نغمہ زن ہوئیں مثلِ طیور

پھر شفق نے پھوٹ کر برسا دیا جب سرخ رنگ   لے کے بیٹھا گود میں پھولوں کی کشتی آسماں
چاندنی میں پھول مہکے، تارے کھل گئے   پھر پھڑپھڑا کر آ گریں لاکھوں سنہری تتلیاں

صبح دم کی خواہ جاپاں نے جو روشن ماہتاب   اور دنیا جگمگا کر بن گئی ارژنگِ چیں!
میں نے دیکھی پھوٹتے گردوں پہ فواروں کی طرح   ہر کلس سے تیرے برجوں کے شعاعِ آتشیں

دن کو کچھ ہے لطف تیرا، شام کو کچھ، شب کو کچھ   تیرے ہر انداز میں آہ اک ادائے تازہ ہے
کیا تری آرائش، اپنے آپ مشاطہ ہے تو   صبح گلگونہ ہے تیرا، شام تیرا غازہ ہے

اے اودھ کی جان، اے سد بار دانِ لکھنؤ   یادگارِ آصف الدولہ شایانِ لکھنؤ
سو بناؤ کا مرقع کش ہے اک تیرا رخ   ہے تری اک بے تکلف سو شانِ لکھنؤ

آہ کب تک حسرتِ نظارۂ چشمِ طیور
کاش اک شب ایسی ہم کو بھی دکھائے آسماں
میری آنکھوں کی سپیدی پھیل جائے اور تجھے
لے بغل میں، مثلِ آغوشِ فضائے آسماں
(زمانہ جولائی ۱۹۱۲ء)

پروانۂ جاں سوز

شعلہ زن ہے میرے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ
اور ہے اس آگ کو اس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اُس کی دولھن کا سہاگ
جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

بجھ گیا دل میرا شمعِ دل فروزِ عشق سے
آشیانہ جل اٹھا بلبل کا سوزِ عشق سے

خلق کہتی ہے مجھے، یہ ہوش سے بیگانہ ہے
عقل سے خارج ہے یہ، بے ہودہ ہے، دیوانہ ہے
جانتا ہے مجھ کو لیکن خوب جو فرزانہ ہے
میری ہستی آہ عکسِ جلوۂ جانانہ ہے

رنگ چہرے سے اڑا جب، نکہتِ گل ہو گیا
دم جو نکلا، نالۂ منقارِ بلبل ہو گیا

کھونا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی
یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حُسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی
ہے خوشی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے روحِ بلبل کا فشار

جس طرح اک قطرہ، گرد اُس کے محیطِ شش جہات
جس طرح ساغر میں چھلکے قطرۂ آبِ حیات
گرد میرے حلقہ زن ہے کائنات (کذا)
عشق کیا ہے اک متاعِ کلیاتِ بے ثبات

قطرۂ پر جوشِ طوفاں خیز، می ریزد زعشق
شعلۂ خاموشِ عالم سوز، می خیزد زعشق

میرے سر میں کیا ہے، بس اک شعلۂ عشقِ جنوں
میرے دل میں کیا ہے، جلنے کے لیے اک قطرہ خوں
میری ہستی کیا ہے، اک ریزۂ خسِ آتش درون
میں اناالحق گو ہوں میں منصور ہوں، میں نور ہوں

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن میرے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن میرے لیے

جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ
جس طرح کوسوں تلک اُڑتی پھرے خوشبوے باغ
تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
ڈھونڈھتی ہے میری مضطر روح پروازِ فراغ

سبزۂ و گل بن کے کاش اس خاک داں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضائے آسماں پر پھیل جاؤں
(زمانہ جون ۱۹۱۵ء)

سوزِ پروانہ[1]

سر میں پروانے کے ہے اک شعلۂ جوشِ جنوں ‏ ‏ ‏ ‏ اُس کے دل میں کیا ہے؟ جلنے کے لیے اک قطرۂ خوں
اُس کی ہستی ہے متاعِ صد طلسمات دسنوں ‏ ‏ ‏ ‏ پھونک دے خرمن، یہ وہ خس ریزہ ہے آتش درول

اُس کے بال و پر ہیں مثلِ شمع جلنے کے لیے
اور کلیجہ اُس کا شعلوں پر پگھلنے کے لیے

شعلہ زن ہے اُس کے دل میں الفتِ پنہاں کی آگ ‏ ‏ ‏ ‏ اور ہے اُس آگ کو اِس قالبِ خاکی سے لاگ
جیسے شوہر کی چتا پر اس کی دلہن کا سہاگ ‏ ‏ ‏ ‏ جل بجھے جس طرح ققنس چھیڑ کر دیپک کا راگ

عشق جل بجھتا ہے خود، سارا زمانہ پھونک کر
خاک ہو جاتی ہے بلبل آشیانہ پھونک کر

بھولنا اپنے کو، صورت ہے کسی کی یاد کی ‏ ‏ ‏ ‏ یعنی یہ معراج بھی اک شکل ہے اُفتاد کی
حسنِ شیریں کا فسانہ موت ہے فرہاد کی ‏ ‏ ‏ ‏ ہے خوشی منت کشِ غم عالمِ ایجاد کی

نالۂ قمری ہے وجہِ خندۂ صبحِ بہار
وسعتِ آغوشِ گل ہے، روحِ بلبل کا فشار

زیست کا کیا تذکرہ، پروانہ اِس سے سادہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ موت کا عاشق ہے، ہر دم مرگ کا دلدادہ ہے
مرنے کو یوں ہی کمر باندھے ہوئے استادہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ المدد اے آرزوے مرگ! وہ آمادہ ہے

ننگ ہے محتاجیِ گور و کفن اس کے لیے
شمع کے شعلے پہ ہے دار و رسن اس کے لیے

تا دمِ آخر تا کجا یہ صدمۂ سوزِ نہاں ‏ ‏ ‏ ‏ بس کہیں جل بجھ چکے بھی میرا جسمِ ناتواں
سوزِ حسرت سے مرے دل سے نکلتا ہے دھواں ‏ ‏ ‏ ‏ ہر نفس میرا صدائے صاف دیتا ہے کہ ہاں!

پھونک دے اے عشق تو اِس ہستیِ خاشاک کو
اور اُڑا دے ہاتھ اٹھا کر میری مشتِ خاک کو

ڈھونڈتی ہے روحِ مضطر میری پروازِ فراغ ‏ ‏ ‏ ‏ تنگیِ قیدِ قفس سے دل ہے میرا داغ داغ
جس طرح سے دور تک پھیلائے نور اپنا چراغ ‏ ‏ ‏ ‏ جس طرح کوسوں تلک آتی پھرے خوشبوے باغ

سبزۂ و گل بن کے، کاش اس خاکداں پر پھیل جاؤں
رنگ بن کر میں فضاے آسماں پر پھیل جاؤں

(زمانہ، جولائی ۱۹۱۵ء)

---

[1] اس نظم کے تین بند، دوسرا، تیسرا، اور آخری، "پروانۂ جاں سوز" میں بھی موجود ہیں۔ اس اختلاف کے ساتھ، کہ دوسرے بند کے آخری دو مصرع، بدلے ہوئے ہیں۔ اور آخری بند میں مصرعوں کی ترتیب مختلف ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ نادر کی نظم، "شرابِ الصالحین" کا پہلا بند، "مثنوی لالہ رخ" کے "نغمۂ تمہید" میں پہلے بند کی جگہ موجود ہے۔ "نغمۂ تمہید" رسالہ مانہ بابتہ فروری ۱۹۱۰ء میں "سوزِ عشق" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس اختلاف کے ساتھ کہ "نغمۂ تمہید" کا چھٹا بند، اس میں نہیں تھا۔

جلوۂ امید

ہو چکا ہے آہ جس مظلوم پر فتوائے قتل — گاتی ہے کانوں میں امید اُس کے گلبانگِ نوید
اور جب صدموں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل — جوڑتی ہے اپنے دامن میں انھیں رکھ کر امید

منزلِ ہستی میں امید ایک ایسی شمع ہے — راستہ چلتے ہیں جس کو دیکھ کر سب رفتنی
پھیلتی جاتی شبِ غم کی ہے جتنی تیرگی — تیز ہوتی جاتی ہے اتنی ہی اُس کی روشنی

(زمانہ، اگست ۱۹۱۴ء)

نپولین اور کم سن جہازی

بولَن پہ جب چڑھ آیا جرّار فوج لے کر — شاہِ نپولین سا جرّار حملہ آور
اور ہو گئی مسلح اک بار سب رعایا — کٹ مرنے کو ہر آزاد انگریز مستعد تھا
کتنوں نے جان دے دی مردانہ وار لڑ کر — کتنوں کو لے گیا وہ زندہ پکڑ دھکڑ کر
من جملہ اُن اسیروں کے ایک نوجواں تھا — ظاہر میں بھولا بھالا اور نیک نوجواں تھا
لیکن بھرا تھا سودا حبِّ وطن کا سر میں — سوزِ غمِ غریبی تھی شعلہ زن جگر میں (دکذا)

کیا جانیے سمندر پار اور گھر پہنچ کر — اور اپنے ملک میں با فتح و ظفر پہنچ کر
جب حلقۂ غلامی سب کے گلے میں ڈالا — اس ایک نوجواں کو آزاد کیسے چھوڑا
شاہِ نپولین نے دانستہ درگذر کی — یا یہ کہ کم سنی پر مظلوم کی نظر کی
کوئی سبب ہو، لیکن وہ مطلق العناں تھا — بے روک گھومتا تھا، بے قید و بے مکاں تھا
گھنٹوں سکوت میں وہ ساحل پہ بیٹھ جاتا — سر اپنا پکڑے پہروں منزل پہ بیٹھ جاتا
مرغابیاں جو اُڑ کر سوئے غروب جاتیں — اور نیلگوں فضا میں وہ جا کے ڈوب جاتیں
اُڑنے کا ان کے پہروں انداز دیکھتا وہ — حسرت سے اُن کی گھنٹوں پرواز دیکھتا وہ
کہتا تھا وہ کہ طوفاں میں نصف شب کا پہرا — آزادیِ غریبی سے لاکھ درجہ اچھا
ممکن ہے کوئی تختہ طوفان میں بہ آتا — اور صبح ہوتے مجھ کو میرا وطن دکھاتا

بے چین اس تفکر میں ایک شب رہا وہ — اور صبح ہوتے تھک کر غافل سا سو گیا وہ
کیفِ غنودگی میں اُس نے یہ خواب دیکھا — سوئے دیار اپنے گویا در رکاب دیکھا (دکذا)
گویا کہ ایک تختہ ساحل پہ آ لگا ہے — اور شاد شاد اپنے گھر کو وہ جا رہا ہے
چونکا تو واقعی اک تختہ رُکا ہوا تھا — اور اس کے خواب کی وہ تعبیر دے رہا تھا
جلدی سے گھس کے پانی میں تختے کو اٹھایا — اور کھینچ کر بعجلت اک کھوہ میں چھپایا

۱

ہر روز پا کے موقع، اُس غار میں وہ جاتا
اور شام کو پلٹتا، کیا جانے کیا بناتا

اس مشغلے میں اُس کو گذرے کئی مہینے
لیکن نہ بھید اُس کا پایا کبھی کسی نے

آخر کو ہو گیا فاش اک صبح راز اُس کا
جب بنا بنا کے نکلا باہر جہاز اُس کا

تیری پناہ یا رب، جانوں کی خیر کرنا
دانستہ ڈوب مرنا تھا جس پہ سیر کرنا

کیسا جہاز جس کا اسلوب تھا نہ کینڈا
پتوار تھی نہ جس میں، کپتان تھا نہ پینڈا

جس میں نہ بادباں کا مستول کا پتا تھا
مردہ بہانے کی تھی ٹکٹی، جہاز کیا تھا

قسمت میں کیا لکھا ہے یہ کون جانتا تھا
واں اس ذلیل بیڑے کا ناخدا، خدا تھا

اِس شان سے بہادر آمادۂ سفر تھا
اک پاؤں تھا زمیں پر اور اک جہاز پر تھا

آنکلا پہرے والا ناگہ کوئی اُدھر سے
اور دیکھتے ہی کھینچا اس کو جہاز پر سے

رسی سے باندھ کر اور اچھی طرح جکڑ کر
آگے نپولین کے لایا اسے پکڑ کر

اور ہاتھ جوڑ کے کی عرض، اے حضورِ عالم
جبروت تیرا شاہنشاہوں کے دل پہ قائم

رکھا تھا اس کو تو نے آزاد از غلامی
اس کے عوض میں اس نے کی یہ نمک حرامی

بے انتظارِ حکمِ شہ اور اذنِ شاہی
یہ بے تمیز اپنے گھر کو ہوا تھا راہی

گر میں پہنچ نہ جاتا، تو یہ نکل چکا تھا
اس کا جہاز بولن کی سمت چل چکا تھا

سُن کر نپولین نے حیرت میں آکے پوچھا
”اِس کا جہاز میرے ساحل پہ کیسے آیا

میں پوچھتا ہوں پہرے والے کدھر گئے تھے
کیا اک سرے سے سب کے سب ٹھہر گئے تھے

ہر چند کام کرتے اِس وقت تھک گیا ہوں
لیکن چلو بتاؤ، میں چل کے دیکھتا ہوں“

بولا سپاہی جی ہاں اس کو ضرور دیکھیں
وہ دیکھنے کے قابل بھی ہے، ضرور دیکھیں

یہ واقعہ حقیقت میں اک عجیب ہی تھا
خود پا پیادہ آیا، ساحل قریب ہی تھا

نزدیک آکے پوچھا لنگر کہاں ہے اُس کا
وہ ہاتھ اُٹھا کے بولا، وہ بادباں ہے اس کا

چھیتڑا سا اک ہوا کے جھونکوں میں ہل رہا تھا
اور لنگروں فضا میں تارا سا کھل رہا تھا

اچھی طرح سے دیکھا اس کو قریب جا کر
اور نوجوان مجرم سے بولا مسکرا کر

بے وجہ کی نہیں ہے اس درجہ بے قراری
لندن میں کوئی بے شک معشوقہ ہے تمہاری

آمادہ خودکشی پر تم کو کیا نہ گھر نے
تم چاہ میں اسی کی جاتے تھے ڈوب مرنے“

بولا وہ لڑکا شرما کر اور سر جھکا کر
میں کیا بتاؤں اپنی مجبوری بندہ پرور

معشوقہ ہے نہ میری کوئی نہ یار میرا
مجھ کو نہ کر رہا ہے مضطر دیار میرا

جو اک عزیز اور اک پیارا مرا یہاں ہے
وہ میری ایک بوڑھی بے کس ضعیف ماں ہے

میں اس کے دیکھنے کو بے چین ہو رہا ہوں
مردہ بدست زندہ، اِس ملک میں پڑا ہوں

سُن کر نپولین کا دل رحم سے بھر آیا
اور اُس کی راست بازی کا اُس کو پیار آیا

دل میں کہا کہ کتنا ہے یہ بھی نیک لڑکا
ہو ہر شریف ماں کے ایسا ہی ایک لڑکا

خوب اس کی پیٹھ ٹھونکی، خوب اس کو شاباشی دی گھر جانے کی اجازت اس کو بعد خوشی دی
کچھ نقد اس کو دے کر، اور اک نشان دے کر پہنچا دیا خود اپنی ہی کشتی پر اسے گھر
کہتے ہیں اکثر اس کو فاقے ہوئے، پر اس نے بیچے نہ مرتے دم تک سکے نپولین کے

اس واقعے کو گو اک مدت گزر چکی ہے یورپ میں اس کی اب تک ویسی ہی تازگی ہے
اس یاد سے ہے لندن کا دل گداز اب تک پیرس کے میوزیم میں ہے وہ جہاز اب تک

(زمانہ، جنوری سنہ ۱۹۱۱ء)

غزل

شکایت کر کے غم اور ان کا تیز کرنا ہے ابھی تو گفتگو سے مصلحت آمیز کرنا ہے
ترے اعمال نامے پر کہاں ہیں دستخط تیرے وہاں ثابت تجھے جعلی یہ دستاویز کرنا ہے
یہ دنیا جائے آسائش نہیں ہے، آزمائش ہے یہاں جو سختیاں تجھ پر پڑیں انگیز کرنا ہے
غزل خوانی کو تو آیا نہیں اس بزم میں نادر تجھے یاں وعظ کہنا، پندِ سود آمیز کرنا ہے

پیٹتا ہوں سر کہ میں دنیا میں رسوا کیوں ہوا میں نے ایسا کیوں کیا، افسوس ایسا کیوں ہوا

میں سمجھا تھا مرے حق میں دعائے خیر کرتے ہو مجھے تم کوستے ہو، ہمدمو! اندھیر کرتے ہو

(زمانہ، اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء)

سالِ گذشتہ

آہ بوڑھے، سن رسیدہ اور قریب المرگ سال اب تو ہوتا جاتا ہے ابتر ترا ہر روز حال
اور اب نزدیک تر ہے تیرا وقتِ واپسیں آہ تجھ کو ہم سے اب کچھ کہنا سننا بھی نہیں
مختصر سی کچھ وصیت، کچھ نصیحت ہی سہی اور اگر دل میں ترے شکوے ہوں تو وہ بھی سہی
کچھ تو کہہ حال اپنا او بیمار، لب اپنے تو کھول مرنے والے تیرے دل میں کیا ہے کچھ منہ سے تو بول
آہ کیا اس عالمِ ظلمات اور انوار میں اس جہانِ پُر طلسمات اور پُر اسرار میں
اپنی پُر غم زشتیِ تقدیر کا اک حرف بھی ہم سے کہنا ہی نہیں منظور تجھ کو واقعی
کیا تری غمگیں صدا یہ کان سن سکتے نہیں کیا یہ مژگاں اشکِ حسرت تیرے چن سکتے نہیں

مرنے والے سال! وہ بھی کتنا نازک وقت تھا جبکہ لیلائے ازل تھی دردِ زہ میں مبتلا
قسمت و تقدیر سے محروم تھی کل کائنات اور ہر اک چیز بے اندازہ، بے پیمانہ تھی، اور بے ثبات
جب زچہ خانے میں پیدائش زمانہ کی ہوئی کیا وہ حالت بھی تری او سال ہے دیکھی ہوئی

یاد ہے کا دن میں پہنچی تھی زچہ کی پہلی چیخ — یاد ہے تجھ کو کہ تھی کتنی بھیانک وہ بھی چیخ
تو دیکھ ہستیوں کی ابتدا تکلیف ہے — اور ہر اک زندگی کی انتہا تکلیف ہے

سالِ نو ہستے سال، اور مرحوم ہونے والے سال — بلکہ وہ اک روز میں معدوم ہونے والے سال
جب چلی تھی بحرِ ناپیداکنارِ دھر میں — ایک پہلی لہر، تو کیا بات تھی اُس لہر میں
پہلے وہ آغوشِ مادر کیوں بنی تیرے لیے — پھر دہانِ قبر وہ کیوں بن گئی تیرے لیے
مادرِ قدرت نے کیوں شیر کب موجِ فنا — لے کے لفظِ موت پیشانی پہ تیری لکھ دیا

مرنے والے سال! اچھا ہم کو اتنا تو بتا — آخری سورج ترا کیا بات تھی جو زرد تھا
عشق والفت کا ترے اس پر اثر تھا ہو نہ ہو — رحم کر کے تجھ پہ، وہ باچشمِ تر تھا ہو نہ ہو
پر نہیں تھا وہ تو ہے میری سمجھ کو رواں — وادیوں، جھیلوں پہ، باغوں، وادیِ پُرضو فشاں
اور نہ دیکھا اس نے مر کر بھی تجھے دم توڑتے — ایک آنسو بھی نہ ٹپکا آہ اس کی آنکھ سے

او ہمیشہ کے لیے معدوم اور مرحوم سال — کوچ رحلت کر رہا ہے تجھ پہ اظہارِ ملال
مختصر افسانۂ غم ہو چکا تیرا تمام — اور تیری زندگی کا ہو چکا اب ختم کام
مر چکا تو، اور اٹھا کر تیری نعشِ بے کفن — وقت نے کی غرقِ تاریکیِ دریائے محن
مرنے والے کی لحد ہے، اور نہ ہے شمعِ مزار — نوحہ خواں کوئی ہے اُس پر اور نہ کوئی اشکبار

آہ او سالِ گذشتہ، او راہ مرحوم سال — او غریقِ بحر، او معدوم فی المعدوم سال
کس قدر تو پہلے خوش آیند اور خوش لہر تھا — جس قدر اب چپ نظر آتا ہے ایسا تو نہ تھا
تیری چنچل امیدیں کب جھک جاتی نہ تھیں — دور سے دکھلاتی تھیں جھلکی قریب آتی نہ تھیں
آہ تیرے ساتھ اب او سال! وہ سب مر گئیں — اور نئی امیدیں میرے دل میں آکر بجھ گئیں

(زمانہ، جنوری ...)

جی بھر آیا پچھلا سامانِ اسیری دیکھ کر — رو دیا میں اپنا زنداں خالی خالی دیکھ کر
رحم آجاتے گا ان کو شکل میری دیکھ کر — میری حالت دیکھ کر میری غریبی دیکھ کر
ساحلِ جولانگہِ امواج پر شکلِ حباب — دم بخود بیٹھا ہوا ہوں اپنی ہستی دیکھ کر
منت بھی تو اہاں نہیں وہ دل کہ کچھ کر آوری — بے ضرورت چھیڑنے لیتا ہے سستی دیکھ کر
اب کہاں وہ ولولے اور کہاں جذباتِ عشق — پیار بھی آتا نہیں اب شکل پیاری دیکھ کر
وحشتِ غربت سے چلا آتا ہوں بستی کی طرف — کون پوچھے گا مجھے میری غریبی دیکھ کر
لاکھ میں اُن کو بھلاتا، ضبط کرتا ہوں مگر — دل بھر آتا ہے پہلو اپنا خالی دیکھ کر

کھنچ گیا نقشہ نظر میں ہستیِ موہوم کا — بن گیا تصویر میں تصویر اپنی دیکھ کر

عشقِ کا ناقد کہاں سے تو لگا لایا یہ روگ
رونا آتا ہے ہمیں تیری جوانی دیکھ کر (الناظر، مئی ۱۹۱۲ء)

سہرا[1]

ہے جلوۂ برقِ طور سہرا، ہے ساعدِ صافِ حور سہرا — ہے موجِ دریائے نور سہرا، ہے جوشِ جامِ طہور سہرا

فلک پہ تارے کھلے ہوئے ہیں، شفق میں بجلی چمک رہی ہے — افق میں سورج نکل رہا ہے، ہے مطلعِ صبحِ نور سہرا

نسیمِ جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہے یہ باقی — بہارِ فردوس ہنس پڑی تھی، اُسی ہنسی کا ظہور سہرا

ہوا ہے نوشہ پہ سایہ گستر، اسی نے پھیلا دیئے ہیں شہپر — ہے ورنہ عنقائے قافِ اقبال کا نشیمن ضرور سہرا

فلک نچھاور کہیں نہ کرتا ہو سر پہ نوشہ کے عقدِ پرویں — اسی کا پرتو نہ ہو سمجھتے ہیں جس کو اہلِ شعور سہرا

پری نے چھپ کے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہے اپنا آنچل — جو یہ نہیں ہے تو میں کہوں گا ہے طرۂ زلفِ حور سہرا

عروس نے اپنے نازنیں ہاتھ چشمِ نوشہ پہ رکھ دیئے ہیں — اسی کے یہ پنجۂ نگا(ریں) سے بن گیا منہ کا نور سہرا

فلک پہ رحمت برس رہی ہے، زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے — ہے رحمتوں کا نزول سہرا، ہے برکتوں کا وفور سہرا

بہار کی دیوی سر پہ نوشہ کے پھول برسا رہی ہے گویا — کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے لچھمی، یہ ہے مبارک ضرور سہرا

سرودِ عشرت کے تار لڑیاں ہیں اور نرالے ہیں پھول مطرب — ہے مطربِ جشنِ عیشِ نوشہ، ہے سازِ بزمِ سرور سہرا

گلِ مضامینِ فکرِ نادر سے، ورقِ کاغذ ہے کشتیِ گل
کہ نذرِ نوشہ کے شوق میں بن گئی ہیں سلکِ سطور سہرا (زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

یاددہانی بہ طرزِ احسن

کسی کافر کا وعدہ کر کے ممکن ہے پلٹ جانا — پلٹ جانا کسی طناز کا ممکن ہے پیماں سے

یہ ممکن ہے کہ گھر آئیں گھٹائیں جھوم کر لیکن — نہ ٹپکے ایک بھی قطرہ محیطِ ابرِ باراں سے

بہار آئے، چمن پھولے پھلے لیکن یہ ممکن ہے — کہ اک دانہ نہ ہو حاصل امیدِ کشتِ دہقاں سے

یہ ہو سکتا ہے چل جائے ہوا کچھ ایسی عالم میں — کہ رنگ اڑ جائے پھولوں سے چمک لعلِ بدخشاں سے

یہ ممکن ہے کہ ہو جائے دعا کی سلب خاصیت — نکل کر پھر پلٹ آنا ہے ممکن تیرِ پیکاں سے (دکذا)

یہ سب ممکن ہے لیکن وعدہ کر کے ناقد مکر جانا — نہیں ممکن ہے ہرگز راجہ شعبان علی خاں سے

دھنی ہیں قول کے اور اپنے وعدے کے وہ سچے ہیں — میں سچ کہتا ہوں پھر راجہ ہیں اور راجہ کے بیٹے ہیں (زمانہ، اپریل ۱۹۱۳ء)

---

[1] سہرے کے آغاز میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے۔ "ایڈیٹر زمانہ کے برادرِ عزیز منشی رام سرن نگم۔ بی۔ ایس۔ سی، کی شادی خانہ آبادی کی یادگار میں لکھا گیا۔"
اب صرف تخلص، ناقد کا تصرف ہے۔

تحفۂ تہنیت

(راجہ سید شبان علی خاں صاحب بہادر تعلقہ دار سلیم پور کو خطاب کے سی، آئی، ای، عطا ہونے پر لکھا گیا)

بڑھا دے دے رہا ہوں اپنی طبع گرم جولاں کو
مبارک باد دینے جائے گی شبان علی خاں کو

کہ تجھ سے سادگی ہارے جہاں کو حسن آرایش
تری رامشگری سے دلفریبی بزم امکاں کو

گھٹا کی طرح اٹھ اور چل نسیم صبحدم بن کر
چل اور لہکا دے باغوں کھیتوں کو اور بستاں کو

ہلا دے شاخ گل کو اور اڑا دے تو منادل کو
ہنسا دے غم زدوں کو چھیڑ دے زلف پریشاں کو

یہی موقع ہے شوخی کا یہی موقع مسرت کا
لٹا دے کھلا دے ہر سخنور ہر سخنداں کو

چلی جا شوخیوں سے اور پہنچ جا آستانے پر
ادب سے دے مبارکباد اس ممدوح ذی شاں کو

مگر میری زباں بھی کیوں نہ اپنے ساتھ لیتی جا
ادا کیا کر سکے گی تو مرے جذبات پنہاں کو

مرا دل بھی لیے جا تو، یہ وہ شے ہے کہ کہتا ہوں
خدا دل دے تو دے میرا ہی ایسا ہر مسلماں کو

مگر اس دل میں کیا ہے صرف سچی بے ریا الفت
رفیق سرخ جو شیریں کرے تلخی دوراں کو

لیے جا ہاں وہ بے پایاں خوشی بھی میری خاطر سے
جو اس تقریب پر حاصل ہوئی اس تہنیت خواں کو

جب اس سامان سے اس شاہ کو عرض ستائش ہو
تو کیوں مقبولیت حاصل نہ ہو فکر سخنداں کو

کسی کی ذات میں جب اس قدر ہوں خوبیاں یکجا
کہ ہو مد نظر اعزاز اس کا شاہ شاہاں کو

کسی ذرے میں جب یہ کیفیت کسب ضیا کی ہو
کہ وہ اپنی طرف کھینچے شعاع مہر تاباں کو

تو یہ کہنا بجا کیا ہے کہ شاہنشاہ لندن سے
خطاب ایسے ملے دینے کے لیے شبان علی خاں کو

حقیقت میں یہ عزت باعث صد فخر و نازش ہے
یہ عزت مایۂ صد ناز ہے امثال و اقراں کو

تمامی خوبیاں یکجا ہوں جس انساں میں خالق نے
دکھایا اپنی قدرت کو، بنا کر ایسے انساں کو

الٰہی ان کو عمر خضر دے، جاہ سکندر دے
کہ پہنچے مدتوں تک فیض خدام و عزیزاں کو

اٹھائیں فائدہ جس سے ہزاروں بے سروساماں
خدا وسعت دے ایسی زندگی عیش ساماں کو

خطاب کے، سی، آئی، ای، ملا دربار دلی سے
مبارک ہو یہ عزت راجہ شبان علی خاں کو

(زمانہ، فروری ۱۹۱۲ء)

قصیدۂ تہنیت دربار شاہنشاہی

پھر کھلا صبحدم دریچۂ نور
ظلمت شام غم ہوئی کافور

پھر چلا لے کے جام آتش رنگ
ساقی سرخ فام نشے میں چور

بن گیا پھر سواد ہندستاں
اک محیط فضائے عالم نور

وندھیاچل کی اونچی چوٹیاں پھر
ہو گئیں چشمک زن تجلی طور

یعنی بجلت کی راجدھانی میں
پھر دسہرے کے جشن کا ہے ظہور

یعنی شاہنشہِ معظّمِ ہند
جارج پنجم و میریِ غیور

تاجِ ہندوستان و انگلستان
رشکِ خاقان و قیصر و فغفور

آنکھیں جن کے جمال سے روشن
دل ہے جن کے خیال سے مسرور

عہد میں جن کے ہے رعیّت شاد
دور میں جن کے ملک ہے معمور

جلوہ آرا ہیں خود بہ نفسِ نفیس
زیبِ دربار ہیں نظام حضور

لشکریانِ صف شکن بہ جلو
راجگان، شاہزادگان بہ حضور

یعنی سب والیانِ ہندستاں
جموں، کشمیر، اور اودے پور

شاہِ آسام و لامۂ تبّت
راجگانِ بڑودہ و میسور

والیِ مسقط اور خانِ قلات
راجۂ گوالیار اور اندور

سب سورج بنسی اور چندر بنسی
راجۂ جودھپور اور جے پور

جس کے دربار میں ہیں یوں روشن
جیسے سورج سے ذرّے ہوں پُرنور

یادگارانِ پرتھی و جے چند
جانشینانِ تغلق و تیمور

وارثانِ سپاہِ درّانی
سر برآوردگانِ غزنی و غور

سورمایانِ راجپوت و سکھ
غازیانِ قبائلِ مشہور

غولِ دلیرانِ رادن و اندر
فوجِ بھیلانِ والیِ چتّور

تیغ باندھے کمر میں خونِ آشام
تیر کھینچے لگائے زخموں میں چور

جملہ شیرانِ بیشۂ پیکار
سب نہنگانِ بحرِ خوں مغرور

جس کے آگے ادب سے حاضر ہیں
جس کی تعمیلِ حکم پر مجبور

عہد کی جس کے برکتیں بے حد
عقلِ اوّل شمار سے مجبور

جس کے الطاف لاتعدّ و شمار
اور جس کے فیوض لامحصور

ہند میں اس طرح کا جشنِ عظیم
ایسا دربار، دیدۂ مذکور

کسی تاریخ سے نہیں ثابت
اور کسی عہد میں نہیں مشہور

خاکِ دلّی ترے نصیب کہ تو
بادشاہوں سے پھر ہوئی معمور

کامرانی کی ہر طرف ہے بہار
شادمانی کا ہر جگہ ہے وفور

کیا نصیبہ ہے ہند کا چمکا
کہ ہے عیش سے ہیں سب مخمور

اے شہنشاہِ آسمان اورنگ
اے جہاندارِ معدلت دستور

تیرے خادم خدیو اور خاقان
تیرے محکوم قیصر و فغفور

سلطنت تیری غرب سے تا شرق
ملک آباد شاد اور معمور

ہوئے اجزائے مذہب و ملّت
تیرے آئین اور ترے دستور

بادشاہوں پہ واجب التعمیل
تیرے احکام اور ترے منشور

تیری افواج بے حساب و شمار
تیرا اقبال فاتح و منصور

تو سلامت رہے ہزار برس　　ہر برس اک صدا سے بہ ہزار
اور رہے دور پھر تسلسل کا　　یوں ہی کرتا رہے زمانہ مرور
میں ہوں تیری مدح خوانی کا　　بس دعا گوئی تھی مجھے منظور

اس سے زائد تری ستائش میں
نطق ہے کارنا طقہ معذور

(زمانہ، دسمبر ۱۹۱۱ء)

دلّی دربار

فاتح اعظم سکندر رومی کے بعد، یہ پہلا موقع ہے کہ ممالک یورپ کے جلیل القدر تاجدار نے سات سمندر پار سے آکر سرزمین ہند پر قدم رکھا ہے۔ ہمارے حضور پر نور ملک معظم حضرت جارج پنجم شاہنشاہ ہندوستان اور شاہنشاہ بیگم ملکہ میری، ادام اللہ ملکہم و اجلالہم کے قدوم میمنت لزوم سے خاک ہندوستان کو شرف افتخار حاصل ہوا۔ اس مسرت خیز موقع پر وفا شعار رعایائے ہند کو جس قدر خوشی و مسرت ہو کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہندوستان کا زمین و آسمان اس کی کثیر التعداد اقوام کی مدح سرائیوں اور مختلف زبانوں کی نغمہ پردازی سے گونج رہا ہے۔ چنانچہ مشہور بنگالی شاعر، مسٹر جے، این، مکرجی نے انگریزی نظم میں دلی کو مخاطب کر کے، جس حسن سے اظہار مسرت کیا ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ نظم بطور خلاصہ، ۱۳ اکتوبر کے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔ ترجمہ نذر ناظرین ہے۔

اے پرانی دلی، اے آثار دیرینہ شکوہ　　اٹھے جوانوں بادشاہ ....
تو کبھی گہوارہ تھا، مذہب کا اور تہذیب کا　　اب شباب اور ....

بادشاہوں نے تجھ کو جب دیکھا نگاہِ شوق سے　　پڑ گئی آنکھوں میں اُن کی، بس چکا چوندھا ایک بار
خوب گایا ہے مہابھارت نے ہر بالہ ترا　　باندھ کر صنعت کا سہرا تیرے اور قدرت کا ہار

تیرے چپے چپے پر انبار ہیں اور تخت و تاج　　حوصلوں کے، ولولوں کے، جوش کے، جذبات کے
لگ لیتے اور تجھے کھوتے رہے ہیں بارہا　　چال سے، تدبیر سے، تلوار سے، اور توپ سے

تو عمارات نفیسہ کا ہے دارالسلطنت　　سات تعمیرات میں دنیا کی ہے تیرا شمار
آج بھی وہ خوبیاں ہیں تجھ میں جن کو دیکھ کر　　وجد کر اُٹھتے ہیں تیرے دوست دشمن ایک بار

اے مبارک! بعد مدت آئی ہے قسمت تری　　آرہا ہے یعنی شاہنشاہ ہندوستان کا
کوسوں دور سے، ساتوں سمندر پار سے　　چھوڑ کر پیچھے جزیرہ اپنا انگلستان کا
ہاں مبارک عظمت دیرینہ کے سنگ نشاں　　ڈال دے گا اپنے ہاتھوں سے تو اب پھر یار
ایک چادر تیری بوسیدہ شکستہ قبر پر　　یادگاروں میں تری اور ایک تازہ یادگار

لے پیشِ نظر رسالے میں یہاں پر کاغذ غائب ہے۔ بھلی الرقت یہ شمارہ دوسری جگہ نہیں ملا ہے۔

ہو رہا ہے دیکھ وہ صبحِ تجلی کی نمود — اٹھ رہا ہے پردہ بزمِ عظمت واقبال کا
فرش سے تا عرش آرائش ہے، آتا ہے نظر — پھر زمانہ راجہ آشوک کے اجلال کا

آج تک مطلع تمہارا ہر چند تھا تاریک و تار — لیکن اب موجودہ شاہی کر رہی ہے ضَو فشاں تر
اور یہ امید ہے فیضِ قدومِ شاہ سے — اور بھی ہو جائے گا وہ صاف تر شفاف تر

مجھ سے سن، تو درحقیقت فخرِ ہندوستان ہے — منتخب ہونے پہ تیرے ہے زمانہ بھر گواہ
اور رہیں گے تیرے مینار و مساجد مدتوں — تیری عظمت اور تیری شان و شوکت پہ گواہ

ملک تیرا آسماں کی طرح ناپیدا کنار — خطۂ کشمیر سے، وسعت میں، بحرِ ہند تک
اور تیرا عرض بھی ہے طول سے کچھ کم نہیں — برہما کے ملک سے گجرات اور سرہند تک

اس سے پہلے ہند کو تھی اس قدر وسعت کہاں — یعنی اب جتنا ہمالہ کے ادھر ہے ہند ہے
قلۂ ایورسٹ کے مانند کوئی سلطنت — گردشِ ایام سے محفوظ اگر ہے ہند ہے

امن و آسائش مسرت کا سبب ہے گو، مگر — ہونا توپوں اور تفنگوں کی گرج میں فتح مند
واقعی ہے تیری قدرت اور شوکت کی دلیل — آتش افشاں کوہ کے دامن میں رہنا بے گزند

سرزمینِ پانی پت کے آج خاک و خون پر — ہیں جلیل القدر مہماں کے نصب شاہی خیام
ہوں مبارک تجھ کو دلی تاجپوشی کے رسوم — تیرے شاہنشاہوں کی فہرست میں اور ایک نام

یعنی جھرمٹ میں رعایا کے نظر آئیں گے اب — شاہ و شاہنشاہ بیگم با لباسِ زرنگار
جلوۂ دربار و فرمانِ شہنشاہی سے ہوں — آنکھیں روشن، کان مشتاق اور دل شاد ایک بار

ہم بھی اس موقع پہ، اک پرجوش طوفاں کی طرح — ہیں فلک سر پہ اٹھا شور مبارک باد سے
اور لے کر ساتھ سچی مشرقی تمکین کو — ہم نوا ہو جائیں ہم برطانیہ آزاد سے

(ادیب، دسمبر ۱۹۱۱ء)

قیمت فی پرچہ — ۷۵ نئے پیسے

سالانہ — دس روپے

رام پور رضا لائبریری کی مطبوعات

نگار بک ایجنسی نے، رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات فراہم کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔ یہ کتابیں اپنے حسن ترتیب وطباعت کے لحاظ سے ہندوپاک میں ممتاز مقام رکھتی ہیں اور خوبصورت نسخ اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف محقق اور ادیب مولانا امتیاز علی عرشی کا نام ان کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے اس لیے کہ ان کتابوں کی ترتیب وتصحیح کا کام موصوف نے خود انجام دیا ہے۔ یا انکی زیر نگرانی ترتیب واشاعت کے مراحل طے ہوئے

دستور الفصاحت : یہ احد علی یکتا لکھنوی کی کتاب کا دیباچہ اور خاتمہ ہے جسے تذکرہ شعراء کے طور پر علیحدہ چھاپا گیا ہے۔ اس میں دو اساتذہ اردو کا حال اور منتخب کلام درج ہے۔ مولانا عرشی کے مبسوط دیباچے اور تفصیلی حواشی نے اس کی اہمیت میں چند در چند اضافے کیے ہیں۔ اردو کے کلاسکی شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے اس لیے کہ مرتب نے حواشی میں سارے اہم غیر مطبوعہ تذکروں سے احوال شعراء کا اضافہ بھی کیا ہے۔ بہت سے تذکروں سے بے نیاز کرنے والی یہ کتاب اردو میں اعلیٰ ایڈیٹنگ کا نمونہ ہے جسے بغیر جھجک ہم کسی بھی زبان کے تحقیقی کارناموں کے سامنے پیش کرسکتے ہیں (طباعت ٹائپ) قیمت ——— ۶ روپے (مجلد)

مکاتیب غالب : یہ مرزا غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو فرمانروایان رام پور اور ان کے متوسلین کو لکھے گئے تھے۔ اس کتاب میں بیتاب رامپوری اور ناظم رامپوری کے اشعار پر اصلاحیں، نیز مولانا حالی، صفیر بلگرامی، رنج میرٹھی اور نیر دہلوی کے غیر مطبوعہ قصائد و قطعات بھی موجود ہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ خطوط پر مشتمل کوئی بھی مجموعہ اتنے تفصیلی مباحث کے ساتھ آج تک شایع نہیں ہوا۔ اس میں انداز ترتیب وتہذیب کی ایک متعین راہ بتانے والی یہ کتاب ہر صاحب ذوق کے پاس ہونا چاہیے (طباعت لیتھو) قیمت —— ۸ روپے

فرہنگ غالب : اس کتاب میں مولانا عرشی نے مختلف ماخذ کے ذریعے غالب کے بتائے ہوئے عربی فارسی اردو وغیرہ زبانوں کے الفاظ و معانی جمع کردیے ہیں۔ اور اپنے دیباچے میں ہندوپاک کے ان فرہنگ نگاروں کی خدمات سے بحث بھی کی ہے جن کے مرہون منت ایرانی بھی ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم نیز خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ زبان و لغت کے بارے میں غالب کا رویہ جاننے کے لیے یہ کتاب بے حد ضروری ہے۔ (طباعت لیتھو) قیمت —— ۶ روپے (مجلد)

سفرنامۂ مخلص : رائے رایان انند رام مخلص کا سفرنامہ جسے ڈاکٹر اظہر علی مرحوم نے باضافۂ حواشی مرتب کیا تھا۔ (طباعت ٹائپ) [illegible]

نواب کلب علیخاں خلد آشیاں : مربی علم و ادب کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن وہ خود بھی ایک [illegible] گو شاعر تھے۔ [illegible] کئی جلدوں میں شایع ہوا تھا۔ اس وقت چار حصے موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں درۃ الانتخاب۔ توقیع سخن۔ تاج فرخی۔ دستنبو خاقانی۔ ہر حصے کی قیمت

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یو پی

نگار

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی یک دو را بتلا ہیں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پر تو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے، اگرچہ کتابی شکل ہیں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں بھی کئی تراجم ہیں اسکے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرۂ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار بھی کوشش کرے گا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرہ کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر، اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے

[illegible] نمایاں ہے۔ [illegible] کو اشتہارات [illegible] کی وجہ سے [illegible]

فہرست [illegible] سیالکوٹ اور شیروانی الہ آباد کے ہیں۔ ان تینوں کے اعلان اردو دوستی کی ہیں اور جناب [illegible]

یوں تو ان کے اشتہارات اردو جرائد میں چھپتے ہیں لیکن یہ بتایا جاتا ہے کہ اردو کی کسمپرسی میں یہ سنجیدہ ادب کی ترویج و ترقی کیلئے زیادہ دلچسپی
اردو کے ان چند گنتی کے رسائل پر خصوصی توجہ رکھیں جو زندگی اور موت کے درمیان جھولتے ہیں لیکن پھر بھی سستے اور گھٹیا ادب کی اشاعت سے
اجتناب برتتے ہیں۔ ایسے رسالے ۲۰ - ۲۵ سے زیادہ ہرگز نہ ہونگے۔ لاکھوں روپے کے بجٹ میں سے ایک حقیر رقم ان رسالوں میں نئی روح پھونک سکتی ہے
عبدالحمید خان۔ جناب حکیم عبدالحمید دہلوی اور جناب احمد رشید شیروانی سے، یہ ہماری توقع ہے کہ وہ اس مسئلے پر غور فرمائیں گے اور اپنے ایڈورٹائزنگ
[illegible]ن کو خصوصی ہدایات دیں گے۔ تاکہ اردو کے خادم اطمینان سے مصروف عمل رہیں۔

اس شمارے سے نگار میں ایک اہم کتاب کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ مفید اور ضروری ہے — ہر شخص جانتا
ہے کہ اسلامی تاریخ کا سر ورق یعنی سیرۃ رسول اللہؐ اس حیثیت سے ایک معمہ بنی ہوئی ہے کہ اس کے واقعات تاریخ و ایام کی چولیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور
بعض اوقات میں ایسا شدید تضاد پایا جاتا ہے کہ پوری سیرۃ کے راوی مشکوک نظر آنے لگتے ہیں۔ قدیم سیرۃ کی کتابوں میں لگ بھگ سو سوا سو واقعات کی
تاریخیں اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ ملتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ اسلامی مورخوں کا حیرت خیز کارنامہ ہے۔ لیکن موجودہ دور کے صاحب قلم اس شجر ممنوعہ تک
پہنچتے ڈرتے ہیں اور موجودہ کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی تاریخ سے ایام مطابقت نہیں کرتے
روایات سے موسم غیر مطابق ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کی علم
[illegible]ت تکذیب کرتا ہے۔ غرض یہ وادی پرخار ایسی ہے جس سے دامن بچا کر گزر جانے ہی میں عافیت ہے۔

یہ موضوع خالص انسانی نقطہ نظر سے بھی اہم ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کی ایک نمائندہ امت کی تاریخ کو صحیح صحیح سمجھنا خود اپنی جگہ ایک
مقصد ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس زنجیر سے ایک کڑی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نیلسن (Nielsen)، ونکلر (Winkler)
پرسول (Perceval)، میور (Muir) جیسے مستشرقین اور حمید اللہ جیسے صاحب نظر نے ایسے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش
[illegible] کامیاب نہ ہو سکے۔

اس موضوع کے لیے جس وسعت مطالعہ محنت اور خلوص کی ضرورت تھی مسرت کا مقام ہے کہ اس کا پورا پورا حق صاحب تصنیف نے ادا کیا ہے
ایک اسپیشلسٹ کی طرح پہلے مطالعہ کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ موصوف کا یہ کارنامہ علمی دنیا پر ایک احسان ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

یوں تو نگار کی محفل میں اسحاق النبی خاں صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ مگر ایک طرح ان کا رشتہ اس سلسلے سے بہت پرانا ہے۔ [illegible] کی
بات ہے مولانا نیاز فتحپوری نے ڈاکٹر شنڈلر کے ان اعتراضات کا ترجمہ شائع کیا تھا۔ جو قرآن مجید پر کیے گئے تھے، صاحب تصنیف ہی وہ پہلے مرد مومن
ہیں جنہوں نے عالمانہ انداز میں اس کے کچھ حصوں کا جواب لکھا تھا اور جو برہان دہلی میں "ہارون اور گوسالۂ طلائی" کے عنوان سے شائع بھی ہوا تھا۔ اسلام
سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں نے اس کا خیر مقدم پورے جوش و خروش سے کیا تھا اور اب بھی بہت سے حضرات کو یہ افسوس ہے کہ وہ کام پایہ تکمیل تک
نہ پہنچ سکا۔

موجودہ کتاب میں بظاہر ایک خشک موضوع کو جیسی تر زبانی صاحب تحریر نے عطا کی ہے وہ اس کے بہت سے بوجھل حصوں کو بھی گوارا بنا دیتی ہے۔
نگار کو یہ فخر ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس کی ضرورت کا احساس تو سب کو تھا مگر لب اظہار اور جرأت
[illegible]کار کی کمی نے اسے احاطۂ تحریر میں نہیں آنے دیا۔

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد

سحاق النبی خاں

مقالۂ اوّل

فصل اوّل

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یادگار رہے گی، کیونکہ اس زمانے میں دنیا ایک عجیب و غریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی جس کے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب و تعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے۔ عام طور میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے؛ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی بستی یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آنافاناً مقبولیت نے ثابت کر دیا کہ یہ وقت کی آواز تھی جو کہیں سے بھی اٹھی ضرور سنی جاتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرق وسطیٰ پر چھا گئی جہاں سے اس کا بڑھت ایسا عالم تھا؛

یہ بات سب کو تسلیم ہے، کہ جزیرہ نما سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت انگیز کام انجام دیئے اور آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعث کشش اور جاذب توجہ ہیں۔

تاریخ اسلام کی ابتدا پیغمبر اسلام کی سیرۃ، یا با الفاظ دیگر آپ کے ان احکام و افعال سے ہوتی ہے، جو اس تحریک کو منظم کرنے پھیلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا یہ ابتدائی حصہ صد درجہ اہم ہے، اور اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصل تحریک کو سمجھنے کے لئے اس حصے کا بغائر نظر مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی تعلیمات اور زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جد و جہد کی اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ یہ دعویٰ بڑی حد تک بجا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط، اور تلاش و تنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابل داد ہے۔ اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح و تنقید کے کچھ اور اصول بھی دریافت ہو گئے ہیں، لیکن پرانے اصول ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبر اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی:

۱۔ عہد ماقبل نبوت
۲۔ مکی عہد
۳۔ مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطے سے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور پرامن تھی، شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے؛ تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرت کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپ کی نظریاتی تعلیم کا، کیونکہ یہ آپ کی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی، اور سیاسی ترتیبات نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام مذہب کے ساتھ ساتھ ایک مفردہ معاشرے اور سیاسی طاقت میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ اعلیٰ قابلیت، اور پھر رہنمائی کا جوہر کا بیک وقت ہونا ندرت میں سب سے زیادہ

ہے کہ ابو مخنف اور الواقدی وغیرہ اسلام کے پہلے مورخ ہیں، جنہوں نے آنحضرت کی سیرۃ کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر لسانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے تک تھیں گویا اسلام کی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہور اسلام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا ابتدائی حصہ محض مشکوک اور شنیدہ لسانی روایات کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے، جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت ہے نہ تاریخی افادیت اور یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گذر جانے کے بعد بھی واقعات تفصیلات جوں کی توں اور اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے، جس کے خلا کو پر کرنے کے لیے رائج الوقت روایات، عقائد و تصورات ان میں شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے واقعاتی تسلسل ٹکسا نظر نہیں آتا، اور عباسی عہد کے عقائد مزعومات اور عصبیت اتنی کم ہے ان میں کھلکھلاتی ہے کہ بیہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ پہلے ضبط تحریر میں آچکا تھا!

اس صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے "رواۃ" کو بعض قدیم ترماخذوں سے مکتوبی صورت میں ملی تھیں جن کا تعلق عہد رسالت یا عہد صحابہ سے تھا، تو اس مفروضے کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ابتدائی عہد میں ایسے امکانات موجود بھی تھے کہ اس طرح کی یاد داشتیں یا دستاویزیں ضبط تحریر میں آسکتیں؟۔

اس سوال کا جواب ہر طرف سے نفی میں دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مستشرقین بلکہ علمائے اسلام کی اکثریت اس بات کی مدعی ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عربی معاشرہ فی الجملہ جاہل اور ان پڑھ تھا، اور ان میں علمی صلاحیتیں یا تو بالکل مفقود تھیں یا اتنی کم تھیں کہ قرآن مجید میں اس دور کے لوگوں کو "امی" کہا گیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے، ورنہ عام طور پر پورے ملک میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر یہ قیاس ممکن نہیں کہ اس دور میں یہ یاد داشتیں ضبط تحریر میں آسکیں۔ ہر شے ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لکھے پڑھے لوگ ہی نہ تھے تو پھر کوئی لکھتا بھی تو کیوں کس کے لیے!۔

ڈاکٹر نکلسن نے تاریخ ادبیات عرب (Literary History of Arabs) میں جاہل عربوں کو گویا ناخواندہ اور کہا ہے۔

مسلمانوں میں سرسید سے زیادہ آزاد قلم کس کا ہوگا مگر ان کی مہر بھی اس فتوی پر ثبت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آنحضرت کے زمانے سے پیشتر، اور نیز آنحضرت کے زمانہ میں کوئی معین باقاعدہ" طریقہ تعلیم کا جاری نہیں تھا، عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب، ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے، اسی وجہ سے اس زمانے میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی، پہلے یعنی وہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ پچھلوں کے مقابلے میں "امی" کہلاتے تھے، اگرچہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں بہت کم فرق تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے، اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اسی حیثیت سے آنحضرت کا لقب "امی" تھا۔"

حقیقت میں تصور جہالت کو مستشرقین نے اتنی ہوا نہیں دی ہے، جتنی خود مسلمانوں نے۔ جس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود بانی اسلام ناخواندہ تھے، جیسا کہ سرسید تک کا خیال ہے قرآن مجید میں آنحضرت کے لیے صاف طور پر لفظ "امی" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عام طور پر ان پڑھ کے لیے جاتے ہیں، اور یہی لفظ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر پوری عرب قوم کے لیے بھی آیا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کا عمومی تصور یا عقیدہ اس بات پر مبنی ہے کہ آنحضرت کے ساتھ اس پوری امت امیہ کو ناخواندہ یا ان پڑھ تسلیم کر لیا گیا جس میں آپ پیدا ہوئے یا پروان چڑھے اور جوان ہوئے۔ کیونکہ یہ بات ممکن نہیں کہ ایک مقام پر اس لفظ کے معنی ناخواندہ لیے جائیں اور دوسری جگہ کچھ اور مفہوم لیا جائے۔

چنانچہ یہاں حضور کے خواندہ یا ناخواندہ ہونے کی بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں، نہ اس عام عقیدے کی صحت اور عدم صحت پر کچھ

ابن اسحٰق (المتوفی سنہ ۱۵۱ھ) اسلام کے پہلے مورخ ہیں، جنہوں نے آنحضرت کی سیرۃ کو سب سے پہلے لکھا، اور ان منتشر لسانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں متداول تھیں گویا اسلام کی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہور اسلام کو تقریباً ڈیڑھ سو سال بیت چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا ابتدائی حصہ محض مشکوک اور مشتبہ لسانی روایات کا مجموعہ ثابت ہوتا ہے جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت ہے نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گزر جانے کے بعد بھی واقعات تفصیلات جوں کی توں اور اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے، جس کے خلا کو پر کرنے کے لیے رائج الوقت روایات، عقائد، اور تصورات ان میں شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے حتیٰ کہ نہ تو ان میں کوئی تسلسل تک نظر نہیں آتا، اور عباسی عہد کے عقائد، مزعومات اور عصبیت اتنی کم روایتوں میں محسوس ہوتی ہے جو یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس دور سے پہلے ضبط تحریر میں آچکا تھا!

اس صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدونین سیرۃ یا ان کے "رواۃ" کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی ہیں جن کا تعلق عہد رسالت یا عہد صحابہ سے تھا، تو اس مفروضے کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ابتدائی عہد میں ایسے امکانات موجود تھے کہ اس طرح کی یادداشتیں یا دستاویزیں ضبط تحریر میں آسکتیں؟۔

اس سوال کا جواب ہر طرف سے نفی میں دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف مستشرقین بلکہ علمائے اسلام کی اکثریت اس بات کی مدعی ہے کہ ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرہ فی الجملہ جاہل اور ان پڑھ تھا، اور ان میں علمی صلاحیتیں یا تو بالکل مفقود تھیں یا اتنی کم تھیں کہ قرآن مجید میں اس دور کے لوگوں کو "امی" یعنی ناخواندہ کہا گیا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو کسی قدر لکھ پڑھ سکتے تھے، ورنہ عام طور پر پورے ملک میں جہالت کا دور دورہ تھا۔ اس بنا پر یہ قیاس ممکن نہیں کہ اس ابتدائی زمانے میں یہ یادداشتیں ضبط تحریر میں آسکیں۔ ہر شے ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ جب لکھے پڑھے لوگ ہی نہ تھے تو پھر کوئی لکھتا بھی تو کیوں؟ اور کس کے لیے؟۔

ڈاکٹر نیکلسن نے تاریخ ادبیات عرب (Literary History of the Arabs) میں جاہلی عربوں کو گویا ناخواندہ اور جاہل تصور کیا ہے۔[۲]

مسلمانوں میں سر سید سے زیادہ آزاد قلم کس کا ہوگا مگر ان کی مہر بھی اس فتویٰ پر ثبت ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"آنحضرت کے زمانے سے پیشتر اور نیز آنحضرت کے زمانہ میں کوئی معین باقاعدہ طریقہ تعلیم کا جاری نہیں تھا، عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب، ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسے میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی، وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے، اسی وجہ سے اس زمانے میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی، پہلے یعنی وہ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، پچھلوں کے مقابلے میں "اُمّی" کہلاتے تھے، اگرچہ ان دونوں قسم کے لوگوں میں بہت کم فرق تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے، اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی حیثیت سے آنحضرت کا لقب "اُمّی" تھا"۔[۳]

حقیقتاً اس تصور جہالت کو مستشرقین نے اتنی ہوا نہیں دی ہے، جتنی خود مسلمانوں نے۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام ناخواندہ تھے، جیسا کہ سر سید تک کا خیال ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت کے لیے صاف طور پر لفظ "امی" استعمال ہوا ہے جس کے معنی عام طور پر ناخواندہ کے جاتے ہیں، اور چونکہ یہی لفظ قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر پوری عرب قوم کے لیے بھی آیا ہے، اس بنا پر مسلمانوں کا عمومی تصور یا عقیدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ آنحضرت علاوہ آنحضرت کے ساتھ اس پوری "امت امیہ" کو "خواندہ" یا پڑھا لکھا تسلیم کر سکیں جس میں آپ پیدا ہوئے یا پرورش پائی اور ہادی اعظم مبعوث ہوئے۔ کیونکہ کو اصولاً یہ بات ممکن نہیں کہ ایک مقام پر اس لفظ کے معنی ناخواندہ لیے جائیں اور دوسری جگہ کچھ اور مفہوم لیا جائے۔

میں یہاں حضور صلعم کے "خواندہ" یا "ناخواندہ" ہونے کی بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں، نہ اس عام عقیدے کی صحت اور عدم صحت پر کچھ کہنا ہے،

... ان پر دو لفظوں کا اور اضافہ کیجیے یعنی "خط" اور "املا" کا جو قرآن مجید میں جداگانہ استعمال ہوئے ہیں، گویا ظہور اسلام کے وقت صرف "لکھنے" یا "کتابت" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے عربی زبان میں کم سے کم آٹھ لفظ ایسے تھے جن کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے! یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کم ترزبانیں اس کا مقابلہ کرسکیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ الفاظ اس وقت تک "حصہ زبان" نہیں بن سکتے تھے جب تک بولنے والوں کو ان کی شدید ضرورت نہ ہو، اور پیہم استعمال نہ ہوتے رہیں؛ میں نے یہ الفاظ صرف قرآن مجید سے انتخاب کیے ہیں تاکہ عہد رسالت میں ان کا استعمال اور رواج شکوک و شبہات سے بالا رہے، ورنہ اسی عہد کے چند اور الفاظ بھی پیش کیے جاسکتے تھے!

کیا یہ تصور واقعی حیرت انگیز نہیں کہ جس زبان میں نوشت و خواند کے لیے اتنے زیادہ الفاظ مروج ہوں، اُسی زبان کے بولنے والے فن کتابت سے بے بہرہ فرض کرلیے جائیں اور یا ان معنی "امی" سمجھے جائیں کہ وہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیتوں سے محروم تھے؟

قطع نظر اس سے کہ خود قرآن مجید کے انداز بیان اور خاص طور پر طرز استدلال سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ظہور اسلام کے وقت عربی سماج "ان پڑھ" تھا، یا قرآن کے سامعین اولین اور مخاطب وقت جاہل تھے، اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ متداولہ کتابوں کے حوالے نظر آتے ہیں، عبارتیں نظر آتی ہیں جن کے خلاصے بطور سند پیش کیے گئے ہیں، جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ پست نہیں بلکہ بلند ہیں، جن سے سامعین کے طویل ذہنی ارتقا کا پتہ چلتا ہے، سماجی اور اخلاقی نکات کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ دنیا شعوری اور غیر شعوری طور پر انھیں آہستہ آہستہ قبول کرتی جارہی ہے، مگر بہت سے پسماندہ سماجوں کے لیے ہنوز ناقابل فہم و عمل ہیں۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی عبارت جو نازل ہوئی اس کی ابتدا "اقرأ" سے ہوتی ہے اور انتہا "علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم"[۳۱] پر۔ نزول قرآن کے بعد جب اس کتاب پر اعتراضات کی بوچھاریں ہونے لگیں، جرح و تنقید شروع ہوگئی، مطعون کیا جانے لگا، اور طرح طرح کے بہتان لگائے گئے تو ان میں سب سے زیادہ عام اعتراض یہ تھا کہ یہ پچھلی کتابوں یعنی "اساطیر الاولین"[۳۲] سے ماخوذ ہے، گویا سرقہ مضامین کا طعنہ جو اکثر ادیب و نقاد دیا کرتے ہیں جن کی نظریں کتابوں پر ہوتی ہیں، یہ الزام بھی کسی جاہل معاشرے کی طرف سے ممکن نہیں، چنانچہ قرآن نے جب اس کی تردید کی تو ان الفاظ میں: "فاتوا بکتب من عند اللہ ھو اھدی"[۳۳] — "فاتوا بسورۃ من مثلہ"[۳۴] — "فاتوا بعشر سور مثلہ"[۳۵] گویا تمام مصنفین عرب کو چیلنج کیا گیا کہ اگر قرآن آسمانی کتاب نہیں تو اس کی مثل، کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ایک ایسا طبقہ موجود تھا جس کو "دعوت تصنیف" دی جاسکتی تھی ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ان پڑھ سماج کے لیے یہ تمام تر مطالبات بے معنی ہیں، کم سے کم میرے لیے یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ قرآن کی یہ "دعوت تصنیف" ایک جاہل اور ان پڑھ معاشرے کے لیے تھی، جو اس کے جواب میں چند سطریں لکھنے سے بھی معذور تھا، قرآن میں یہ چیلنج ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر نظر آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ اتفاقی نہ تھا بلکہ مخالفین بار بار کوشش کرتے اور بار بار ناکام ہوتے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اللہ نے ان چیلنجوں میں یا تو قرآن جیسی "کتاب" کا مطالبہ کیا ہے یا "جز و کتاب" یعنی سورۃ کا، ظاہر ہے کہ "سورۃ" کسی کاوش لسانی کا نام نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں جبکہ قرآن کو ترویج و تنظیم سے ریگستان عرب کی آبیاری کرنا چاہتا تھا، ایک مکی عالم "نضر بن حارث" نے یہاں "ایران" کی مقدس آگ سلگانا چاہی تھی، اور مجوسیت قبول کرکے[۳۶] اس کی تبلیغ شروع کردی تھی، چنانچہ اس کی مشہور کتاب کا تذکرہ جس کو قرآن نے "لہو الحدیث" کا لقب دیا تھا، اوراق تاریخ میں آج تک محفوظ ہے، اس کتاب میں "نضر" نے رستم و اسفندیار کے دلچسپ قصے بیان کیے تھے، اور اس کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن سے کسی طرح کم نہیں[۳۷]، نضر صرف فارسی زبان ہی سے واقف نہ تھا، بلکہ شاید یونانی بھی جانتا تھا[۳۸]

۲۹: ۴۷ ۔ ۳۰ ۔ ۳۱ قرآن ۹۶: ۴

۲۵: ۶ ۔ ۸ : ۳۱ ۔ ۲۳: ۸۴ ۔ ۲۷: ۶۸ ۔ ۲۵: ۵ ۔ ۴۶: ۱۴ ۔ ۶۸: ۱۵

۲: ۲۳، نیز دیکھیے ۱۰: ۳۸ ۔ ۱۱: ۱۳ ۔

Arthur Jeffery-Foreign Vocabulry of the Quran p.p.18[illegible]

نضر بن حارث نے زندیقی یعنی مجوسی مذہب اختیار کرلیا تھا دیکھیے ابن حبیب المحبر ۱۶۱ ۔ قرآن ۳۱: ۶

ابن ہشام کا بیان ہے: نحدثهم عن رستم السندید وعن اسفندیار وملوك فارس، ثم یقول: واللہ ما محمد باحسن حدیثا منی وما حدیثه الا اساطیر الاولین اکتتبها کما اکتتبتها ۔ ابن ہشام

مدارس ... کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بچپن میں جب یہ مدرسے جاتی تو بچوں کے قلم دواتوں میں ڈال کر جلتی
ے کو ہنا گئی۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں مخلوط تعلیم کا رواج عام تھا، یمن میں بھی دیہاتی مدارس کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے ... دیہاتی
عہد رسالت میں جب نجرانیوں کا وفد مدینے پہنچا تو اس میں ان اطراف کے جملہ دیہی مدارس کا ناظم تعلیمات بھی تھا جس کا نام ابوحارثہ تھا۔[۳۵]
یہ برکت غالباً انہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدارس کی تھی کہ جب حضرت نبی امی نے حجاز کے ساحلی علاقے کے قبائل، اور مدینے کے گرد و پیش کی بستیوں
، معاہدے کرنا شروع کیے تو وہ سب کے سب تحریری صورت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان دیہاتی بستیوں میں تعلیمی فقدان ہوتا تو ان سیاسی دستاویزوں ... دیہاتیوں
مرتبہ ایک ورق پارے سے زیادہ نہ تھا، اور ان کی کوئی افادیت نہ تھی۔
ظہور اسلام کے وقت عربی سماج میں، اساتذہ اور معلمین کی بھی کمی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تعلیم میں دلچسپی لیتے تھے، اساتذہ
ابن حبیب نے "اشراف المعلمین" کے عنوان کے تحت جو نام گنائے ہیں، سب اونچے درجے کے لوگ ہیں ان میں کم سے کم پانچ نام ایسے جاہلی
اساتذہ کے ہیں جن کی عظمت سب کو تسلیم تھی۔[۳۶]
نہ صرف تعلیمی اغراض، بلکہ تصنیف و تالیف کے لیے کاغذ بہت ضروری شے ہے جس سے اس زمانے میں پورا مشرق وسطیٰ ناواقف
ہے مصر میں ایک خاص قسم کا کاغذ نرکل کی چھال سے بنایا جاتا تھا جس کو پیپائرس Papyrus کہتے تھے، عربی میں اسی کا نام قرطاس ہے قرطاس کے
علاوہ دوسری شے جو اس کام میں آتی تھی، جانوروں کی کھلی تھی جسے دباغت کے بعد قابل نوشت بنایا جاتا، عربی میں اس کو رق کہا جاتا تھا۔ یہ دونوں لفظ قرآن
مجید میں آئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس وقت عرب کے استعمال میں تھیں۔ غالباً ان کی درآمد مصر و فلسطین سے براہ راست ہوتی تھی چنانچہ
مکی تاجر مالک بن دینار کا نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔ غالباً یہ اشیا گراں تھیں۔
کتابتی ضروریات کے لیے اس زمانہ میں ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا بھی استعمال ہوتا تھا جس کو "حریر" کہا جاتا تھا اور غالباً لفظ تحریر کا تعلق بھی اسی حریر
سے ہے، حریر پر لکھے ہوئے کم سے کم ایک خط کا حوالہ بخاری میں ملتا ہے، جو شاہ غسان نے کعب بن مالک کو سنہ ۹ھ میں لکھا تھا۔[۳۷] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید
اس وقت سے بھی زیادہ قیمتی شے تھی، اور صرف رؤسا استعمال کرتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں عام ضروریات کے لیے دیسی ساخت کی اشیاء کتابت میں افراط
آتی ہیں، مثلاً ادیم، رقعہ، عسب، وغیرہ۔ ادیم چمڑے کے کاغذ کو کہتے تھے، عسب کھجور کی چھال یا ڈنٹھل کو صاف کر کے بنایا جاتا تھا، علاوہ ازیں لکڑی
کی تختیاں یا دھیں بھی استعمال میں آتی تھیں، جن کو "لخفہ"، "سبورہ" اور کتف کہا جاتا تھا۔ لخفہ اور سبورہ سفید پتھر کو باریک تراش کر بنائی جاتی تھیں
یہ پتھر کی سلیٹیں تھیں، کتف جانوروں کی شانے کی ہڈیاں تھیں جن کو چھو کر کاٹ لیا جاتا، یہ تمام چیزیں سہل الحصول معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ خلیفہ اول کے
زمانے میں جب قرآن کی تالیف کا کام شروع ہوا، تو اکثر لوگوں کے پاس قرآن کے اجزا انہیں سستی چیزوں پر لکھے ملے، اشیاء کتابت کی اس گوناگونی سے
مختلف طبقات کی تعلیم کا اندازہ دشوار نہیں۔
روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت تعلیم کسی خاص حلقے یا طبقے تک محدود نہ تھی، اور شاید اس جنس گراں سے سہارے اور ... تعلیم عام
اجارہ داری ختم ہو چکی تھی، اور بلا کسی تخصیص کے امیر، غریب، غلام، آقا، مرد اور عورت سب بہرہ مند ہو سکتے تھے، امرا اور دولت مند طبقے کی مثالیں تو
لیے ضروری نہیں کہ ہر ملک و قوم میں تعلیم ہمیشہ انہیں کی جاگیر رہی ہے، مگر مجھے یہاں ایسی مثالیں پیش کرنا ہیں جو غریب، کم مایہ اور خواتین کے طبقے سے تعلق رکھتی
ہیں کیونکہ یہی طبقہ ہمیشہ اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے۔
کم مایہ لوگوں میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ اسیران بدر میں تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ لگے تھے جن کو اس شرط پر رہا کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ ... غریب تعلیم
یہ بطور تاوان جنگ ادا کر دیں، چنانچہ بہت سے لوگ رہا کر دیئے گئے، مگر پھر بھی کچھ ایسے قیدی بچ گئے جو غریب تھے، اور یہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے، ایسے لوگوں
کے لیے یہ تاوان مقرر کیا گیا تھا، کہ وہ مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔ غلاموں میں، اگرچہ متعدد لکھے پڑھے نظر آتے ہیں مگر یہاں عامر بن فہیرہ کی مثال غالباً
کافی ہوگی جو حضرت ابوبکر کے غلام تھے، اور ... [illegible]

بتاتی ہے کہ عہد رسالت میں ایسے رجسٹر موجود تھے، اور ایک بار جب یہ مردم شماری ہوئی تو پندرہ سو مردوں کے نام درج کیے گئے۔ [۱]

(۶) معمولی جنگی ہدایات اور احکام کے لیے تحریرات کی کوئی ضرورت نہیں، معلوم ہوتی، مگر نخلہ کو روانگی کے وقت عبداللہ بن جحش کو جو ہدایت نامہ دیا گیا تھا وہ تحریری تھا۔ [۲]

(۷) محاذ جنگ پر جانے والے سپاہیوں کی فہرست سازی اور تحریری نامزدگی ایک جاہل معاشرہ میں بالکل ناممکن ہے، مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے عہد میں اسلامی فوج جب کہیں روانہ ہوتی، تو اس کے افراد کو پہلے سے نامزد کر دیا جاتا۔ اور ان کے نام باقاعدہ لکھ لیے جاتے، ابن عباس کہتے ہیں کہ ایک بار آنحضرتؐ کے پاس ایک سپاہی آیا اور اس نے عرض کیا کہ میرا نام فلاں فلاں غزوہ کے لیے لکھ لیا گیا ہے، مگر میری بیوی حج کو جانا چاہتی ہے، تو آپ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور حج کی اجازت دیدی۔ [۳]

(۸) فوجی کارروائیوں کے سلسلہ میں خفیہ اطلاعات زبانی بھی ممکن تھیں لیکن جنگ بدر کے لیے جب قریش نکلے تو حضرت عباس نے اس کی اطلاع خفیہ تحریری بھیجی تھی، اسی طرح جب مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے، تو ایک مسلمان ہی نے اس کی خفیہ اطلاع قریش کو کرنا چاہی لیکن یہ تحریر پکڑ لی گئی۔ [۵]

(۹) تقسیم غنائم اور عطیات کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو ایک ان پڑھ سماج میں تحریری صورت میں لایا جاسکتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں مال غنیمت تقسیم کی جب تقسیم ہوتی تو باقاعدہ تحریر ہوتی۔ چنانچہ خیبر کے اموال کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جس کی تحریر مرتب ہونے کا ثبوت موجود ہے۔ [۶]

(۱۰) اس سلسلے میں آخری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر واقعی عہد رسالت کا معاشرہ ان پڑھ ہوتا، تو خود قرآن مجید کی کتابت اتنے شروع زمانے سے بالکل ناممکن تھی!

یہ اور اسی قسم کی بے شمار مثالیں کتب سیرۃ واحادیث میں موجود ہیں جن سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت، پورا ماحول مائل بہ تعلیم ہو چکا تھا جس کو اسلام نے اور فروغ دیا، نئے نئے مدارس و مکاتب کھولے، اساتذہ اور معلمین میں قابل ترین لوگوں کا انتخاب کیا گیا، تعلیم بالغان کو فروغ دینے کی تمام ممکن تدبیریں اختیار کی گئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدارس قبیلہ کا اہتمام کیا گیا جس کے نصاب میں لکھنے پڑھنے کے ساتھ دینی تعلیم کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا، اس بنا پر یہ بات خارج از امکان نہیں کہ غزوات و سرایا کی ان تفصیلات کا اصل ماخذ کچھ ایسی دستاویزیں ہوں جو عہد غزوات میں مرتب ہوئی تھیں، اور ان کو ابتدائی سیرۃ نگاروں یا اگلے راویوں نے بچشم خود دیکھا تھا۔ ان مثالوں سے صرف یہی نتائج نہیں نکلتے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد جیسے اسلامی ریاست کی تشکیل ہوئی، اور مسلمان سیاسیات میں داخل ہوئے، تو ان کی تنظیم، اور ریاستی نظم و انصرام کیلئے ایک دفتری نظام بھی وجود میں آیا۔ اس نظام کو خواہ کتنا ہی ابتدائی نوعیت کا تصور کیا جائے لیکن بہر صورت اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے، کہ تاسیس ریاست کے بعد جو دستور مدینے میں رائج کیا گیا تھا (دیکھیے مثال ۳) یا ان معاہدات کی اصل کا بیان جن کی ابتدا رسول اللہ سے ہوگئی تھی (دیکھیے مثال ۴) محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح یہ امر بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ چھوٹے بڑے رجسٹر جو غزوات و سرایا کے ذیل میں یا اسلامی تنظیم کی غرض سے مرتب ہوتے رہے تھے (دیکھیے مثال ۵، ۷) فوراً ہی ضائع کر دیئے جاتے ہوں۔ مثال نمبر ۵ میں جس رجسٹر کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافی ضخیم معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ڈیڑھ ہزار افراد کی اسم نویسی کے لیے سیکڑوں صفحے درکار ہیں۔ اس رجسٹر کی ابتدائی غرض، اندازہ قوت، تحصیل زکوٰۃ، اور انتخاب عساکر کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں غزوات و سرایا کے ذیل میں جو نامزدگیاں ہوتی تھیں (دیکھیے مثال ۷) تو فوجیوں کے نام (باقی صفحہ ۲۵ پر)

---

[۱] دیکھیے بخاری بلب عن حذیفۃ قال قال النبیؐ اکتبو الی من یلفظ بالاسلام من الناس فکتبنا لہ الفا وخمسمائۃ رجل
بخاری /۳۰۴ — [۲] طبری ۲۶۴/۲ — [۳] دیکھیے بخاری / ۳۰۴ عن ابن عباس قال رجل الی النبیؐ، فقال یا رسول اللہ انی کتبت فی غزوۃ کذا وکذا وامراتی حاجۃ قال ارجع فحج مع امراتک (بخاری)

فنِ داستان نگاری اور باغ و بہار

سید ابو الخیر کشفی

"غزل" اور "داستان" یہی وہ دو اصنافِ ادب ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ادب کو عالمی ادب کے مقابلے میں نچلا اور پست قد محسوس نہیں کر سکتے۔

داستان گوئی اور داستان سرائی ہمارے بزرگوں کے لیے محض ادبی صنف نہیں تھی بلکہ اُن کے اندازِ زیست کا ایک جزو تھی۔ داستانوں کی مختلف تہیں ہماری صدیوں تک زندگی اور کلچر کی مختلف سطحوں کی امین رہی ہیں۔ داستانوں میں فسانہ گوئی کے اس ذوق کی تسکین کا سامان بھی تھا جو جسم سے انسان کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ اور داستانوں میں حقیقتوں کو سمجھنے اور بہ انداز دگران کے اظہار کا سامان بھی تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر داستانیں ذوق بخشی و نشاط انگیزی کا وسیلہ تھیں۔ ذوق بخشی کے بغیر تہذیبِ انسانی کا تصور محال ہے اور نشاط انگیزی تو نتیجہ آدم ہے۔ غالب کے الفاظ میں،

"ہر چند خردمند بیدار مغز تو تاریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے۔ لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل ہوں گے!"

یہ ذوق بخشی و نشاط انگیزی افیون نہ تھی بلکہ خردمندی اور بیدار مغزی کی دلیل تھی وہ خردمندی اور بیدار مغزی جس میں انسان کے کتنے ہی خواب اور ان کی تعبیروں کی تلاش مضمر تھی۔

داستانوں کے مطلع سے ہمارے تخیل اور تصور کا سورج ہی طلوع نہ ہوا۔ بلکہ ہماری داستانیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان داستان نگاروں میں خواب دیکھنے کی کیسی غیر معمولی سکت تھی۔ وہ سکت جس کے فقدان نے ہمارے جدید ادب کے بہت بڑے حصہ کو قانونی دستاویزوں کی طرح بے رنگ بنا رکھا ہے اور داستان نگاروں کے خواب کو عہدِ حاضر کی تسخیری قوت نے حقیقت میں بدل دیا ہے۔ اب دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے سینے سے فلک خراش عمارتیں ابھر آتی ہیں طلسمی قالینوں نے جیٹ ہوائی جہازوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور چاند کی بڑھیا ابن آدم کے انتظار میں ہے۔

داستانوں میں ہمیں مشرق اور برصغیر کی قاطبی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اپنے اجداد کا ذہن اور اس کی پیچیدگیاں بھی نظر آتی ہیں۔ داستانوں کی علامتوں میں زندگی کی حقیقتیں پڑی کلبلاتی ہیں۔ ان داستانوں نے عالمِ مخلوقات سے ہمارا رشتہ استوار کیا ہے۔ ان داستانوں سے زندگی کی محرومیوں کی تلافی کی صورت نکلی ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ داستانیں خیالات کا نسخہ بھی تھیں اور فرار کا ذریعہ اور نجات کا وسیلہ بھی۔

میری ناچیز رائے میں داستانیں ہمارے معاشرے اور سوسائٹی سے ادب کے رشتے کی سب سے مضبوط کڑی کا درجہ رکھتی تھیں۔ داستان نگاری بعد میں شروع ہوئی۔ اس سے پہلے داستان سرائی کے سہارے انجمن آرائی ہوتی تھی۔ اور شاید ہمارے ادب میں ڈرامے کے فقدان کا ایک سبب داستان کی مقبولیت بھی تھی۔ داستان سرا کی ذات اپنی جگہ خود ایک اسٹیج، پردوں اور اداکاروں کے مجموعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کبھی وہ اپنی چشم و ابرو کے اشاروں اور ہاتھ کی حرکات سے ہمیں میدانِ رزم میں پہنچا دیتا اور کبھی پریوں کے دیس میں۔ اب اس کی جگہ سینما اور ترقی یافتہ ممالک میں اسٹیج نے لے لی ہے۔ لیکن ہمارا لاشعور آج بھی کسی داستان سرا کو تلاش کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ داستان سرائی دلی میں میر باقر علی داستان گو کے ساتھ مر گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ فن آج بھی ان علاقوں میں زندہ ہے جہاں خاندان اب بھی بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں کہ ابھی نانی اماں کے پوپلے منہ سے ہر رات کہانی شروع ہوتی ہے: "ایک تھا بادشاہ! ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ......" اور یہ کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی اور سننے والے جوان ہو کر کارخانوں میں کام کرنے لگتے ہیں۔ کانوں میں بالے ڈالنے لگتے ہیں۔ سیاہ لباس پہن کر کچہریوں میں ملائی الامر کو مخاطب کرنے لگتے ہیں۔

انھوں نے جیسا بھی سنا بتا دیا۔ بات سچی تھی یا جھوٹ، مگر یہ بات ضرور سچ تھی کہ جو ایک بار وہاں چائے پی لیتا۔ اس کے قدم بار بار اس چائے خانے کی طرف اٹھتے تھے۔ اور اسی چائے خانے میں چند آدمیوں کے درمیان۔ ایک آدمی دو تین موٹی موٹی کتابیں لیے بیٹھا رہتا۔ اور داستان سناتا رہتا۔ میں نے اسے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ کتاب کا مقصد شاید توجہ کو مرکوز رکھنا تھا۔ اور اس محفل کا یہ عالم ہوتا تھا۔ جیسے ہوش و گمان دونوں اس دنیا سے واسطہ رکھتے تھے۔ وہاں حقیقتوں کے پیمانے بدل جاتے۔ جب امیر حمزہ صاحبقراں کسی طلسمی قید میں پھنستے تو تمام حاضرین محفل ہاتھ اٹھا کر ان کی رہائی کے لیے خلوص دل سے دعا مانگتے اور جب اسم اعظم کی تاثیر سے امیر حمزہ طلسم کو درہم برہم کر دیتے تو نگاہوں میں چمک آجاتی۔ سننے والوں میں سے کوئی اٹھتا قریب کی دکان سے مٹھائی لاتا اور سب میں تقسیم کی جاتی۔ یہ جلیبیاں کبھی کبھی ہمارے حصے میں بھی آجاتیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان جلیبیوں کی مٹھاس نے میرے لیے ادب میں نشاط انگیزی پیدا کر دی۔ اسے فیضان کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کروں؟

پتہ نہیں میں اپنے لڑکپن کی باتیں آپ سے کیوں کرنے لگا۔ شاید یہ بھی داستانوں کا اثر ہے جہاں "افسانہ از افسانہ می خیزد" —— میں کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ آج جن داستانوں کے متعلق ہمارے بہت سے نقاد یہ کہتے ہیں کہ ان کا ماحول غیر فطری ہے ان کے کردار عجیب ہیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر ہیں یہ داستانیں احساس تناسب سے عاری ہیں .... آج سے کچھ پہلے نہیں داستانوں میں سننے اور پڑھنے والوں کے لیے حکمت بھی تھی اور بصیرت بھی، ذوق جستجو اور نشاط انگیزی بھی۔ ماہ و سال کی گردشوں نے ہمیں دوبارہ اسی منزل سے قریب کر دیا ہے اور اب ہم زیادہ گہرے شعور کے ساتھ داستانوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارا کافر ذہن ان پیمانوں سے داستانوں کو ناپنا چاہتا ہے۔ جو داستانوں کے لیے وضع ہی نہیں کیے گئے۔ مغرب کی روشنی میں آپ ناول افسانہ اور جدید نظم کا مطالعہ شوق سے کیجیے لیکن اس مانگے ہوئے اجالے کی مدد سے اگر آپ داستانوں کے خط و خال کو دیکھنا چاہیں گے تو ہر راہ تاریک ہو جائے گی اور کوئی جگنو بھی آپ کی رہنمائی نہ کرے گا۔ پھر اس چشمۂ ظلمات سے شاید آپ لوٹ بھی نہ سکیں۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو آپ کی آنکھیں اپنے تہذیبی ماضی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

ادب کو زندگی کی تعبیر و تفسیر اتنی بار کہا گیا ہے کہ اب اس جملے کو لکھتے یا بولتے وقت ابکائی سی آنے لگتی ہے۔ ادب صرف حقیقت (مروجہ اصطلاح میں) نہیں بلکہ خواب بھی ہے۔ اور خواب بھی تو ایک بڑی حقیقت ہے۔ داستان اپنا عالم آپ ہے۔ اسی لیے اس کے ماحول کو غیر فطری اور اس کے کرداروں کو عجیب کہنے والے سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

ع سخن شناس نہ دلبرا! خطا اینجاست

اور داستان سرائی کے بارے میں مرزا غالب یہ فیصلہ پہلے ہی دے چکے ہیں کہ "داستان سرائی منجملۂ فنون سخن ہے" آپ میں اگر ہمت ہو تو غالب کے اس فیصلے کو نہ مانیے۔

مگر ع یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

تخیل داستان کی بنیاد ہے۔ اسی لیے داستان کی دنیا مثالی دنیا ہوتی ہے۔ جسے مناسب لفظ کی تلاش کے بغیر یاروں نے "عجیب" کا نام دے دیا ہے۔ بعض بڑے فن پاروں کی دنیا بھی تخیلی دنیا ہے۔ مگر تخیل کی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے انداز نظر کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور پھر اس دنیا کی ہر چیز حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شکسپیر کے ڈرامے "خواب شب نیم گرما" کو پیش کیا جا سکتا ہے ادب کی اس سے بڑی قوت اور کیا ہو گی کہ وہ ہمیں نئی دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دنیا مثالی ہے تو جواب میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مثالی دنیا داستانوں میں نہ ہو گی تو کیا ہمارے اس ذلیل معاشرے میں ہو گی؟ —— داستانوں میں ہمیشہ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ حسن ابدی ہوتا ہے۔ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ پھول عورت بن جاتا ہے اور عورت پھول۔ یہ فریب سہی، مگر یہ فریب بھی کتنا سچا ہے۔ یہ فریب ہمیں انسانیت کے تصور سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ اور رہا حسن ...... آپ جانتے ہی ہیں کہ کبھی یہ لالہ و گل بن جاتا ہے۔ کبھی شعلہ برق و شرر .... عورت ہو یا زندگی یا حقیقت .... ان تینوں کو بھیس بدلنے میں ملکہ

اس بات کو جاننے کے بعد کہ داستان اپنی دنیا آپ ہے، یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ داستانیں احساسِ تناسب سے عاری ہیں۔ یہ احساسِ تناسب ہمارے زمانے میں شہزادی افسانہ کی تنقید سے پیدا کیا ہے۔ اور یہ اصطلاح اتنی مختصر ہے کہ داستانوں کے جسم پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ داستانوں میں اُڑن طوطے اور گیدڑ کی باتیں ہم پڑھ چکے ہیں۔ مگر انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اڑن فلسفی بھی ہے اور ہمارے اس وجود کا غماز بھی جو خواب دیکھتا ہے .... جو طرز تپاک اہلِ دنیا سے الگ وہاں جانے کی تمنا کرتا ہے "جہاں کوئی نہ ہو"۔ "طوطا" ناصح بھی ہے اور مرشد بھی۔ جو کبھی ہیرو کو شہزادی سے ملا دیتا ہے۔ اور کبھی حقیقت تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے گیدڑ کے بارے میں اس دور میں کیا عرض کروں .... یوں سمجھیے کہ یہ جانور۔ اور یہ علامتیں رموزِ مملکت کو بھی بے نقاب کرتی ہیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کو بھی۔

حدیم المثال کردار اور غیر معمولی چیزوں مثلاً چراغ الہ دین وغیرہ کے بارے میں چند اشارے پہلے کیے جا چکے ہیں۔ ایک بات اور کہتا چلوں (کچھ باتیں آگے آئیں گی) وہ یہ ہے کہ ایسے تصورات اس عہد سے مخصوص ہوتے ہیں جب آدمی لڑکپن سے گزر کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اس دور میں جاگتے کے خواب " دیکھتا ہے۔ کیا کبھی آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا نہیں ہوئی کہ اگر آپ کے پاس کوئی طلسمی انگوٹھی ہوتی تو آپ اس کی قوت سے بہت بڑے " بادشاہ " بن جاتے ہیں اور پھر ہندوستان ۔ انگلستان کی ٹیم کو عبرتناک شکست دیتا۔ یا چراغ الہ دین کی مدد سے ایفل ٹاور فرانس سے اٹھا کر اپنے دیس لے آیا جاتا۔ یہی حال تہذیبوں کا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کو تہذیبوں کے لیے عنفوانِ شباب کا زمانہ کہہ لیجیے۔ ہماری داستانیں قرونِ وسطیٰ کی یادگاریں ہیں۔ اور دنیا کے ہر ادب کے قرونِ وسطیٰ کے کارناموں میں بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا " باغ و بہار " سے کیا تعلق ہے؟ میں نے اس کا جواب سوچ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ باتیں کہنی ہی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ باغ و بہار بھی ایک داستان ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ہمیں داستانوں کی تفہیم کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔ ویسے اس بات پر تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ایک طرف تو ہم خلاؤں کو فتح کر رہے ہیں اور دوسری طرف داستانوں کی دنیا کو اپنے لیے اجنبی پاتے ہیں۔ حسرت کی طبیعت ہی " طرفہ تماشا " دیکھتی ہماری طبیعت بھی طرفہ تماشا ہے ۔ باغ و بہار میں داستان گوئی و داستان نگاری کے فن کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مگر در میان " میر امن " کی ذات بھی ہے۔ یہ خصوصیت اسی " فلٹر " سے گزر کر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اسی لیے باغ و بہار ہماری داستانوں کی روایت کا حصہ بھی ہے۔ اور ان سے مختلف بھی۔

اردو کی اولین داستانوں میں تمثیلی رنگ غالب ہے۔ انھیں مثالیہ فقرہ کہنا مناسب ہوگا۔ ایسے قصوں کی نمائندگی کے لیے " سب رس " موزوں رہے گی یہ انداز مشرقی داستانوں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ مگر باغ و بہار یا بعد کی داستانوں میں اولیت مثالیہ یا تمثیلی کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ قصے کو حاصل ہے اسی لیے باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی سیر محض روحانی تجربے کا اظہار نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک مادہ پرست نقاد نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ ارضی کہانیاں ہیں۔ روح اس زمین پر بھی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ اس لیے ان کہانیوں میں روحانی تجربوں کی جھلک بھی ہے۔ مگر اولیت قصے ہی کو حاصل ہے۔ باغ و بہار میں " باطنی حقیقت " کا اظہار تو ہے۔ مگر یہ باطنی حقیقت " مقصود بالذات " نہیں ہے۔

تلاش و جستجو " سب رس " میں بھی ہے اور " باغ و بہار " میں بھی۔ سب رس میں تلاش ابدی حقیقتوں کی ہے اور باغ و بہار " میں " شہزادیاں " اور گمشدہ محبوبائیں گوشت پوست بھی رکھتی ہیں ـــ یہ الگ بات ہے کہ ان کی پیش کش پر روحانی تجربے کا گمان بھی گزرتا ہے۔ تلاش و جستجو کے یہ افسانے صرف ہمارے ملک تک محدود نہیں بلکہ ان کا عالمگیر سلسلہ ہندوستان اور ایران سے لے کر " آئرستان " تک پھیلا ہوا تھا۔ " سب رس کے سلسلے میں افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے عزیز احمد نے اپنی کتاب ترقی پسند ادب " میں لکھا ہے۔

" یہ سلسلہ تلاش و تجسس کے افسانوں کا سلسلہ ہے۔ کبھی یہ تلاش کسی پھول کی ہوتی ہے۔ جو پھول بھی ہے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی .... اس پھول کی تلاش رازِ حیات کی تلاش ہے اور یہ گل و بلبل کے قصوں سے زیادہ پرانی ہے کبھی تلاش کے قصوں میں ہیرو کا مقصود کوئی ظرف مقدس یا نایاب ہیرا ہوتا ہے۔ جو اپنی جگہ شوکت و شانِ شاہانہ کا رمز ہے .... تلاش کے قصوں کا تیسرا گروہ وہ ہے جس میں " چشمہ آبِ حیات " کی تلاش ہے .... مگر در اصل یہ تینوں گروہ ایک ہی

بگاڑ لی بھول بھی ہے۔ چشمہ بھی اور عورت بھی۔" ترقی پسند ادب صفحہ ۲۳ ۔ ۲۲۲)

ایسی تمام داستانوں میں ہیں "دوران محض" سے واسطہ پڑتا ہے "زماں" (وقت) سے نہیں ۔ "مکان" کے سلسلے میں مشکل یہ آپڑتی ہے کہ تلاش کے عمل کے لیے "مکان" ضروری ہے۔ "باغ و بہار" میں دوران محض نہیں بلکہ وقت ہے۔ اسی لیے میں اس داستان کو محض روحانی تجربہ نہیں سمجھتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مثالیہ قصوں میں تلاش کے عمل سے "مکان" اور "اشکال" وابستہ ہیں۔ مگر باغ و بہار میں "وقت" ہے۔ اور اسی لیے اس میں "اشکال" نہیں بلکہ "کردار" ہیں۔ وقت اور اس کے تقاضوں کے مطابق یہ بدلتے ہوئے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ باغ و بہار محض مثالیہ قصہ نہیں ہے ۔

"باغ و بہار" کے کردار متحرک ہیں اور ہماری آپ کی طرح زندہ۔ پہلی کہانی کا درویش بھلا آدمی تھا مگر "آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر وقت کے کہنے سننے" سے اس کا "مزاج بہک گیا۔ اور اگر اس کا مزاج نہ بہکتا اور وہ "آدمیت" کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا تو کہانی آگے نہ بڑھتی ۔ اسے سفر سے واسطہ نہ پڑتا۔ اور وہ بھی اپنے باپ "خواجہ احمد" کی طرح یمن کا "ملک التجار" بنکر چین کی بانسری بجاتا اور گھوڑے بیچ کر سوتا۔

میرامن کے فسانے میں صرف شہزادے۔ شہزادیاں۔ بادشاہ۔ وزیر اور امراء نہیں ہیں۔ ان کے کرداروں میں سوداگر۔ عام آدمی اور کٹنیاں بھی ہیں (آپ کا دل چاہے تو انھیں "سونپنا" شکلیں اور معنی دیدیں) دوسرے، تیسرے اور چوتھے درویش شہزادے ہیں۔ مگر پہلا درویش جس کی سیر میں سب سے زیادہ تکمیل موجود ہے۔ وہ سوداگر اور خواجہ زادہ ہی ہے۔ خواجہ۔ سگ پرست کی کہانی میں انسانی فطرت کے کئی پہلو موجود ہیں۔ بہزاد خاں کی شجاعت۔ تیسرے درویش کی کہانی میں کٹنی کی مکاری۔ اور پہلے درویش کی "بہن کی ممتا" اور جذبے کی گہرائی ہمارے ذہن پر گہرے نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ باغ و بہار کے بہترین عناصر پر شہزادوں اور شہزادیوں کی حکمرانی نہیں بلکہ عام آدمی کا ابھرتا ہوا ابھرا آتا ہے۔

آدمی اور مذہب میں سے میرامن کی بے پایاں محبت نے باغ و بہار کو اردو کی دوسری داستانوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ باغ و بہار داستانوں کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے اور ایسا دریچہ بھی جس سے پہلی بار ہم آدمی کے دل میں جھانکتے ہیں۔ باغ و بہار میں بھی مافوق الفطرت عناصر ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ثانوی ہے قصوں کی "ارضی" ہے۔ مگر بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے میرامن کو "ملک شہبال" کا سہارا لینا پڑا۔ جن اور پری اس کہانی کی بنیاد نہیں ہیں۔ ان کا سایہ بہت دور سے باغ و بہار پر پڑتا ہوا نظر آتا ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولیے کہ باغ و بہار ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو قرون وسطیٰ کا ذہن رکھتا تھا اسی لئے مافوق الفطرت عناصر سے نہ بھاگ سکتا تھا جنوں اور پریوں کا ذکر اور مافوق الفطرت عناصر تو عہد وسطیٰ کے ادب کی خصوصیات ہیں اور میرامن بھی اسی دور کے آدمی ہیں۔ ان کے دور کا عام آدمی ان عناصر پر ذہنی طور پر اعتقاد رکھتا تھا آج بھی آپ کی نانی جان یا دادی جان (اگر وہ زندہ ہوں تو خدا ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے) ان باتوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔ بچہ مضمحل ہوتا ہے تو اسے نظر بد سے تعبیر کرتی ہیں۔ محلے کی کسی کنواری لڑکی پر "ہسٹریا" کے دورے پڑتے ہیں تو "عامل" کو بلانے پر اصرار کرتی ہیں۔ میرامن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دور میں بھی دیر تک انسانی زندگی سے دور نہیں رہتے وہ "دیدہ ما" کے ساتھ اس عہد کی زندگی اور اس کی رنگا رنگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی لیے "باغ و بہار" میں ان کے عہد کا معاشرہ اور زندگی سمٹ کر آگئی ہے۔ (نہ جانے یہ کس کا کمال ہے۔ میرامن کا۔ یا فارسی قصہ چہار درویش کے نامعلوم مصنف کا)

"باغ و بہار" قصہ گوئی کی اس غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہے جو قدرت نے میرامن کو ودیعت کی تھی۔ "باغ و بہار" میں "بوستان خیال" اور "طلسم ہوشربا" کی سی وسعت اور طلسم بندی تو نہیں ہے لیکن میرامن کہانیوں کا سلسلہ یوں ملاتے ہیں کہ پڑھنے والا کہانیوں کی فضا میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور کہانی کہنے کا فن ہے۔ (داستان کا ایک اہم عنصر دلچسپی ہے) ان کی کہانیوں کی رفتار میں حرکت بھی ہے اور توازن بھی۔ باغ و بہار پر جدید تقاضوں کا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ داستانوں میں احساس تناسب نہیں ہے۔ ان کی کہانیوں میں بعض پراسرار واقعات بھی ہیں جو شروع میں ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے۔ گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور واقعات سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ مثلاً پہلے درویش کی کہانی میں شہزادی کا عجیب و غریب رویہ ۔۔۔ ان کہانیوں میں "ارضیت" صرف کہانی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس میں میرامن کے اسلوب کا بھی دخل ہے۔

میرامن کے یہاں رکاوٹ اور ٹھہراؤ نہیں۔ نہ اسلوب میں نہ کرداروں میں۔ رجب علی بیگ سرور کے کردار بڑی حد تک بے جان ہیں اس کے برعکس میرامن کے کرداروں میں ہمیں زندگی ملتی ہے اور تند و تیز انسانی جذبات بھی۔ یہاں "اسم اعظم" بھی جذبہ کو مغلوب نہیں کر سکتا۔ پہلے درویش کی

توبۃ النصوح کا ایک انگریزی ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت

نذیر احمد نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کس طرح شروع کیا، اس کی داستان بہت دلچسپ ہے محض حسن اتفاق سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور ایسے مبارک وقت اس کا آغاز ہوا کہ اس سے نذیر احمد کو لازوال شہرت نصیب ہوئی اور اردو زبان کو ایک ایسا عظیم المرتبت مصنف ہاتھ آیا جس کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہلا سکتی۔

یہ حسن اتفاق کیسے پیش آیا، اس کی تفصیل خود مولانا نے اپنے ایک لکچر میں بڑے دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں بیان کی ہے اور انھیں کی زبانی سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کے لیے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں، ڈھونڈا، تلاش کیا، لیکن پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے مناسب حالات آپ کتابیں بنانی شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات، بشیر کے لیے چند پند۔ یہ نہیں کیا کہ کتابیں سالم لکھ لیں، تب پڑھانی شروع کیں۔ نہیں بلکہ ہر کتاب کے چار چار، پانچ پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کردیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں کہ جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی، وہ آدھے کے لیے اور جس کو ایک صفحہ کی استعداد تھی، وہ ورق کے لیے مستعجل تھا جب دیکھو ایک نہ ایک متقاضی ہے کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے۔ اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں کتابوں کا پہلا گمان پورا ہوا۔

اتنے میں کیمپسن صاحب ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن دورہ کرتے کرتے ضلع کے ہیڈ کوارٹر اورئی کے باغ میں فروکش ہوئے۔ شام کے وقت خیمے کے باہر درختوں کے تلے ٹہل رہے تھے کہ بشیر ٹانگن پر سوار دو تین آدمی ساتھ لیے ادھر سے نکلا۔ صاحب کو دیکھ کر ٹانگن پر سے اتر کر سلام کیا۔ صاحب نے نام و نشان کے بعد پوچھا کیا پڑھتے ہو!

بشیر: چند پند

صاحب: یہ نام تو ہم نے نہیں سنا۔

بشیر: یہ کتاب میرے والد نے میرے لئے بنادی ہے۔

صاحب: کتاب کا مضمون کیا ہے؟

بشیر: بڑی اچھی اچھی نصیحت کی باتیں ہیں۔

صاحب: مجھ کو وہ کتاب دکھا سکتے ہو؟

بشیر: میں ابھی جاکر گھر سے لے آتا ہوں۔ وہ تالے پار ہمارا بنگلہ دکھائی دیتا ہے۔

(تھوڑی دور سے لوٹ کر)

میں آپا اور چھوٹی آپا کی کتابیں بھی لیتا آؤں؟ وہ چند پند سے بھی اچھی ہیں۔

صاحب: ضرور سب لاؤ۔

بشیر نے بستہ کا بستہ گھر سے لا صاحب کے حوالے کیا:

شام کو میں جو کچہری سے گھر آیا تو بہن بھائی لڑ رہے تھے۔ بہنوں کو شکایت تھی کہ ہماری کتابیں کیوں دے آئے۔ میں نے سن کر کہا کہ گیا

...سب کو ان سے بہتر کتابیں بنا دوں گا :

"اگلے دن میں جو کیمپسن صاحب سے ملا تو انھوں نے شایان کتابوں کو دیکھ بھال لیا ہوگا۔ فرمایا ان کی نقلیں مجھے پرسوں تک کاپی پہنچا دو۔ یہاں میرے پاس خسرے کی صفائی میں بہت سے اچھے خوش خط۔ اور کتابیں ہی چھوٹے چھوٹے رسالے۔ میں نے شیرازہ توڑ اوراق تقسیم کر دیئے۔ شاموں شام نقل ہو کر آگئے۔ جلتی ہوئی جلدیں بنا کر، صاحب تو پرسوں تک کو کہہ گئے تھے، میں نے اگلے ہی دن کتابیں پہنچا دیں۔ کوئی دو مہینے بعد نینی تال سے کیمپسن صاحب کی چٹھی آئی کہ مراۃ العروس کو پڑھ کر میں بہت ہی محظوظ ہوا۔ یہ اپنے طرز معقول میں پہلی ہی کتاب ہے اور ہر طرح سے انعام کی مستحق ہے اور اسی غرض سے میں اس کو گورنمنٹ میں پیش کروں گا۔ وہ سر ولیم میور جن کی فرمائش سے میں نے انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا۔ انھوں نے مراۃ العروس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے سر دربار انعام دیا۔ ایک قیمتی گھڑی تاکہ میں میرا نام کندہ کرا کے جیب خاص سے کیمپسن صاحب اور اپنے ریویو کو گورنمنٹ گزٹ میں چھپوایا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ مزدور خوش دل کار بیش کند، میں نے بھی تصنیف کا ڈربہ کھول دیا اور اب بھی کھلا ہی سا ہے۔ ہاتھ کے رعشے کی وجہ سے پہلے سے گھٹ دیئے ہیں، بند نہیں کیے۔"[1]

یہ قصہ [illegible] کا زمانہ ہے۔ اس سے پہلے مولانا الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کے عہدے پر فائز تھے۔ محض ایک حسن اتفاق سے ان کی رسائی سر ولیم میور تک ہو گئی تھی جو اس زمانے میں صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ سر ولیم میور کے حکم پر انھوں نے انکم ٹیکس کے قانون اور اس کے بعد قانون تعزیرات ہند کا اردو میں بہترین ترجمہ کیا تھا۔ اسی بنا پر وہ محکمۂ تعلیم سے محکمۂ مال میں عہدہ دار بندوبست کی حیثیت سے لے لیے گئے تھے۔ محکمۂ تعلیم سے ان کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ یہ محض دوسرا حسن اتفاق تھا اور اردو زبان کی خوش بختی تھی کہ اس صوبے کے انگریز ناظم تعلیمات میتھیو کیمپسن دورے پر اس مقام پر گئے جہاں مولانا نذیر احمد متعین تھے۔ بالکل ہی اتفاقی طور پر ان کی مڈبھیڑ مولانا کے صاحبزادے میاں بشیر الدین احمد سے ہوگئی اور وہ کتابیں جو محض خانگی استعمال کے لیے لکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ آگئیں۔ یہ کیمپسن کی جوہر شناسی تھی کہ انھوں نے بیک نظر ان کتابوں کی اہمیت اور ان کی خوبی کو پرکھ لیا۔ انھیں گورنمنٹ میں پیش کر کے ان پر انعام دلایا۔ اس ہمت افزائی نے مولانا نذیر احمد کے حوصلے بلند کر دیئے اور انھوں نے انتھک محنت سے ایک سے ایک اچھی کتاب لکھی اور اردو کے ایک انتہائی پایہ ادیب کی حیثیت سے ان کا مرتبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے مولانا نذیر احمد کی دریافت کا سہرا انھی کے نہیں سر میتھیو کیمپسن ناظم تعلیمات ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے سر بندھتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے تفصیلی حالات مجھے نہ مل سکے۔ مولانا کے اسی محولہ بالا لکچر کے ایک حاشیہ میں بشیر الدین احمد مرتب "لکچروں کا مجموعہ" نے لکھا ہے کہ کیمپسن صاحب ایم اے تھے۔[2]

انگلستان کی کس جامعہ کے ایم اے تھے، یہ واضح نہ ہو سکا۔ اس دور میں یعنی انیسویں صدی کے دوران میں جو بھی انگریز عہدہ دار ہندوستان بھیجے جاتے تھے ان میں بیشتر عہدہ دار عربی، فارسی، اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کافی درک رکھتے تھے۔ غالباً کیمپسن عربی اور فارسی سے واقف تھے۔ اور مولانا نذیر احمد سے جو معاملہ پیش آیا اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے انھیں اردو بہت اچھی آتی تھی۔ مولانا کے اولین قدردان سر ولیم میور کے داماد بھی تھے۔ چنانچہ بشیر الدین احمد نے اسی حاشیہ میں لکھا ہے:

"سر ولیم میور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ جو عربی کے بڑے ادیب اور فاضل اجل تھے۔ خدمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ اڈنبرا یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ کیمپسن صاحب ایم اے ان کے داماد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے۔ انھوں نے ہی مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور توبۃ النصوح کی ایک مبسوط شرح بھی انگریزی میں لکھی۔"[3]

مولانا نذیر احمد نے مراۃ العروس اپنی بچیوں کے لیے لکھی تھی اور اسے دریافت کر کے گورنمنٹ میں پیش کر کے انعام دلانے اور عام تک

---

[1] نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، چالیسواں لکچر ص ۴۳۶ — ۴۳۸ – مرتبہ بشیر الدین احمد مفید عام اسٹیم پریس آگرہ، ۱۹۱۸ء

[2] ایضاً، حاشیہ ص ۴۳۹

[3] لکچروں کا مجموعہ حصہ دوم حاشیہ، ص ۴۳۹

بیچنے کی سعادت کیمپسن صاحب کے حصے میں آئی تھی، لیکن اس کتاب کے لکھنے کے چند سال بعد ۱۸۷۳ء میں مولانا نے عامۃ المسلمین کو پیش نظر رکھ کر توبۃ النصوح لکھی تو اس کتاب کو بھی گورنمنٹ میں پیش کرنے کا افتخار کیمپسن صاحب کو حاصل ہوا۔ اسی لکچر میں مولانا نذیر احمد فرماتے ہیں:

"اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی جو میری تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور ملاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹرالٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر برا مانے۔ اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔"[1]

مسٹر میتھیو کیمپسن مولانا نذیر احمد کی کتابوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کتابوں کو انھوں نے خود ہی گورنمنٹ میں پیش کیا، اپنے شخصی اثر سے کام لے کر ان پر مولانا کو انعام دلایا، ان کو نصاب میں شامل کرایا۔ اتنا ہی نہیں طلبان کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک کی شرح بھی لکھی۔ انعام کے لیے توبۃ النصوح کو گورنمنٹ میں پیش کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو جو مراسلہ لکھا تھا اس میں اس کتاب کو مولانا کی اس وقت تک کی لکھی ہوئی تمام کتابوں سے افضل قرار دیا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"میں اس کتاب کو مصنف کی مراۃ العروس اور بنات النعش سے افضل سمجھتا ہوں۔ اس میں طرز عبارت اور قوت بیان کی خوبی ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔"[2]

راقم نے مراۃ العروس کا انگریزی ترجمہ اور توبۃ النصوح کی شرح نہیں دیکھی لیکن توبۃ النصوح کا ترجمہ دیکھا ہے، اس مضمون میں اسی انگریزی ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مسٹر میتھیو کیمپسن نے توبۃ النصوح کا انگریزی ترجمہ مولانا نذیر احمد کی اجازت سے اس وقت کیا ہے جب کہ مولانا ریاست حیدرآباد دکن کے بیدار مغز وزیر اعظم نواب سالار جنگ اول کی طلب پر حیدرآباد چلے گئے تھے اور اس ریاست میں ناظم محکمۂ مال کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مسٹر کیمپسن کا یہ ترجمہ "THE REPENTANCE of NUSOOH" کے نام سے انگلستان کے ایک ایسے مشہور ناشر ادارے نے ۱۸۸۴ء میں شایع کیا جو اس زمانے میں مشرق اور مشرقی علوم سے متعلق بے شمار کتابیں شایع کر رہا تھا اس ادارے کا نام ہے:

" W.H.Allen & Co, 8,Waterloo Place, London, 1884 "

ترجمہ کی ابتدا میں مترجم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے۔ اس دیباچہ کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مترجم کا دیباچہ

"یہ ہندوستانی قصہ جس کا آزاد ترجمہ اس چھوٹی سی کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں ملازمت کے دوران میں میرے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے مصنف خان بہادر مولوی حاجی حافظ نذیر احمد، ناظم محکمۂ مال ریاست حضور نظام، حیدرآباد دکن نے اسے شایع کر دیا۔ اگرچہ کہ اس کتاب کا علم اہل یورپ کو بہت کم ہے، لیکن آگرہ اور لکھنؤ کے مقامی مطبعوں سے اس کے کئی اڈیشن

---

[1] لکچروں کا مجموعہ، حصہ دوم حاشیہ، ص ۲۴۰

[2] توبۃ النصوح کی "تقریظ" کے ایک حاشیے میں مولانا نے لکھا ہے: "واضح ہو کہ اصل کتاب کے حاشیہ پر عند الملاحظہ جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے دست خاص سے اکثر جگہ کچھ کچھ عبارت خط پنسل سے لکھ دی تھی۔ چنانچہ مصنف نے چھپنے سے پہلے کتاب پر نظر ثانی کر کے جہاں تک ممکن ہوا ایما و اشارہ کے مطابق کتاب میں ترمیم کر دی۔"

[3] "چٹھی جناب صاحب ڈائرکٹر بہادر سررشتۂ تعلیم" تقریظ توبۃ النصوح۔

شائع ہو چکے ہیں۔

میں نے تین وجوہ کی بنا پر اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنی ہم جنس ہندوستانی رعایا کی حالت اور ان کی ترقی سے جتنی دل چسپی ہے، اگر وہ کتاب پڑھیں تو مجھے یقین ہے انھیں اس کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کتاب میں ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ جو ہندوستان میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ میں اصل کتاب کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ مستعمل زبان میں اب تک کی چھپی ہوئی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے۔ یہی زبان اس زبان کے وطن دہلی میں بولی جاتی ہے جہاں کا یہ قصہ ہے۔

توبۃ النصوح اور اس کے ساتھ ہی دوسرا قصہ مراۃ العروس دونوں ہی پہلے پہل مصنف کے افراد خاندان کے خانگی استعمال کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں زندگی اور عادات و اطوار کی جیسی تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس ملک کا باشندہ ہی پیش کر سکتا تھا۔

اس کتاب کے مصنف ایک بڑے عالم ہیں اور مشرقی مکتب فکر کے علم کلام کے ماہر ہیں۔ وہ عرصۂ دراز تک انگریزی حکومت کے تحت ڈپٹی کلکٹر رہ چکے ہیں۔ اور چند سال پہلے سر سالار جنگ مرحوم نے انھیں حیدرآباد کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک اہم عہدے کے لیے منتخب کیا تھا اس عہدے پر وہ اب تک فائز ہیں۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ ان کی اجازت سے کیا ہے۔

متھیو کیمپسن ۔ اسکوٹ۔ ۱۸۸۴ء

اس کے بعد مترجم کے خسر سر ولیم میور کا تذکرہ درج ہے جو چار صفحوں میں آیا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، سر ولیم میور، مولانا نذیر احمد کے اولین قدر شناسوں میں تھے۔ مولانا کو جو شہرت، جو عزت اور جو مرتبہ حاصل ہوا اس میں سر ولیم میور نے صوبہ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ ادا کیا ہے۔ ولیم میور ۱۸۱۹ء میں بمقام گلاسگو پیدا ہوئے۔ ان کے والد گلاسگو کے ایک تاجر تھے۔ اپنے والد کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کے سب سے بڑے بھائی جان میور سنسکرت کے بڑے عالم رہے ہیں۔

ولیم میور ۱۸۳۷ء میں پہلی بار ہندوستان گئے۔ مال گزاری کے تعین کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی خدمت پر کانپور، بندیل کھنڈ اور فتح پور میں دس سال تک مقیم رہے ۱۸۴۷ء میں شمال مغربی صوبے کے گورنر معتمد مقرر ہوئے ۱۸۵۲ء میں وہ اسی صوبے کی مجلس مال کے معتمد بنائے گئے۔ ۱۸۶۸ء میں انھیں شمال مغربی صوبہ کے لفٹنٹ گورنری کے عہدہ جلیلہ پر ترقی دی گئی اور ۱۸۷۴ء تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ ۱۸۷۶ء تک وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی کونسل کے رکن فینانس رہے اور اسی خدمت سے وظیفۂ حسن خدمت پر حکومت ہند کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وظیفۂ حسن خدمت حاصل کر کے وہ انگلستان پہنچے تو لارڈ سالسبری نے انھیں کونسل آف انڈیا کا رکن نامزد کیا۔ ۱۸۸۵ء میں کونسل آف انڈیا کی رکنیت سے استعفا دے کر انھوں نے ایڈنبرا یونیورسٹی کی چانسلری قبول کر لی اور مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے اس یونیورسٹی کی بڑی خدمت کی۔ اسی یونیورسٹی سے انھوں نے مولانا نذیر احمد کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دلائی۔

سر ولیم میور کو عربی اور اردو خوب آتی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انھیں کے مشورے سے قیصر ہند کا لقب اختیار کیا تھا۔ ملکہ کو اردو زبان سیکھنے میں بھی سر ولیم میور نے مدد دی تھی۔ الٰہ آباد کا میور کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی دونوں انھیں کی گورنری کے عہد میں قائم ہوئے۔ تاریخ اسلام سے انھیں شروع ہی سے دل چسپی رہی۔ ہندوستان میں قیام کے دنوں میں وہ کلکتہ ریویو میں مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ان ہی مضامین کی بنیاد پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب حیات محمدؐ (LIFE OF MOHAMMAD) چار جلدوں میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۱ء تک شائع کی۔ اس کتاب کا لب و لہجہ اور اس کے بعض مضامین ہندوستانی مسلمانوں کو سخت ناگوار گزرے۔ اسی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے سر سیدؒ نے اپنا اثاثہ بیچ کر انگلستان کا سفر کیا اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب کے سوا سر ولیم میور نے مسلمانوں سے متعلق اور بھی کتابیں لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ابتدائی خلافت اور اسلام کا عروج ۱۸۸۳ء (۲) سلاطین مملوک ـ مصر کا غلام خاندان ۱۸۹۶ء (۳) قرآن، اس کی ترکیب و تعلیم ۱۸۷۸ء (۴) قرآن مجید کے اقتباسات انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۸۸۰ء (۵) الکندی کی کتاب الاعتذار کا انگریزی کا ترجمہ ۱۸۸۲ء — ۱۸۸۱ء (۶) [illegible]

توراۃ، زبور اور انجیل کے دیکھنے اور پڑھنے کی دعوت ۱۸۶۲ء۔

۱۸۸۴ء میں وہ اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے صدر منتخب ہوئے، اسی حیثیت سے انھیں ۱۹۰۳ء میں جوبلی گولڈ میڈل عطا ہوا۔
۱۸۸۱ء میں جامعہ آکسفورڈ نے ڈی سی ایل کی اور جامعہ گلاسکو اور جامعہ اڈنبرا نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

سر ولیم میور نے ۱۹۰۵ء میں بمقام اڈنبرا وفات پائی۔

سر ولیم میور نے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمہ پر جو مقدمہ انگریزی میں لکھا ہے، اب اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔ یہ مقدمہ بھی ان کی کتاب حیات محمد کی طرح تعصب و تنگ نظری سے خالی نہیں۔

مقدمہ

"ہندوستان کی دیسی زبانوں میں دل چسپ اور کارآمد ادب کی بہت کمی ہے۔ ان زبانوں میں ایسی کتابیں بہت ہیں جن کا بڑا حصہ قابل اعتراض باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان زبانوں میں ایسی دل چسپ اور نصیحت آموز کہانیاں سرے سے موجود نہیں جو بچوں یا صنف نازک کے لیے موزوں ہوں۔ اس طرح تعلیم اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شوہروں اور باپوں کو فطری طور پر قابل اعتراض کتابوں کے پڑھانے میں بڑا تامل ہوتا ہے۔

آج سے کوئی دس سال پہلے دیسی زبانوں میں اچھی کتابوں پر انعامات کے ایک اعلان کے سلسلہ میں کتاب توبۃ النصوح مسٹر کیمپسن ناظم تعلیمات صوبجات شمال مشرقی کے پاس پیش کی گئی تھی۔ اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کیا گیا تھا۔

مصنف کو توبۃ النصوح پر ایک ہزار روپیہ کا انعام عطا کرتے ہوئے حسب ذیل احکام مسٹر کیمپسن کے نام جاری کیے گئے تھے۔ یہی احکام صوبجات شمال مشرقی کے سرکاری گزٹ بابت ۱۸۷۴ء میں شایع کیے گئے تھے۔

"کتاب کا مقصد اور زبان دونوں نہایت قابل تعریف ہیں۔ واقع میں بیان کی قوت اور جودت عبارت کی سادگی اور بے ساختگی اور محاورات کی مناسبت اور عمدگی جو اس کتاب میں ہے شاید اردو کی اور کسی کتاب میں نہ ہو۔ اور بڑی صفت یہ ہے کہ ہندی، فارسی، عربی الفاظ کی آمیزش اس بے تکلفی کے ساتھ ہے، جو دلی کی زبان میں پائی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ضرب الامثال بھی اور خصوص روزمرہ کی گفتگو کے مستعمل فقرے اس کثرت سے ہیں کہ ان کے سبب سے کتاب مذکور بہت ہی فائدہ مند معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک بات نہایت عمدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خانگی حالات بھی اس میں مشرح بیان کیے گئے ہیں جس کے سبب مراۃ العروس کے ایسا اہل یورپ کے لیے بھی جو اس کا مطالعہ کریں موجب آگاہی اور واقفیت ہے۔

اگرچہ اصل مضمون اس کتاب کا مذہبی باتوں سے علاقہ رکھتا ہے، لیکن مصنف نے شروع کتاب میں صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ مذہب سے علیحدہ اور خانگی میں اخلاق کی تعلیم کرنا میری طاقت سے باہر ہے اور اس بات میں اس نے اپنی رائے نہایت مستحکم عبارت میں ظاہر کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ پہلے میرا ارادہ تھا کہ خانہ داری اور بود و باش باہمی کے واسطے نیکی اور "خوش خوئی" کا ضروری ہونا بلا تعلق مذہبی ثابت کروں۔ لیکن جب لکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا قصد کرنا گویا روح کو قالب سے، شعاع کو آفتاب سے، عرض کو جوہر سے، ناخن کو گوشت سے جدا کرنا ہے جو اس بیان کے مطابق اس قصہ سے یہ نتیجہ نکلتی ہے کہ سرگرمی اور صدق دل سے عقائد مذہبی کی پیروی کرنا ہی خانہ داری میں خوش حالی کی مستحکم بنا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ مصنف کے اس زاہدانہ پیرایوں کا اختلاف واقع ہوگا، مگر مشار الیہ نے جس حسن عقیدت اور خلوص نیت سے اپنے مطلب کو بڑھایا ہے، مذہب اسلام ادا کیا ہے، اس کی نسبت کسی کو اشتباہ نہ ہوگا .... لیکن جب نواب ممدوح نے کل کتاب کو خود ملاحظہ فرمایا تو اس بات سے تسکین ہوئی کہ مصنف نے اپنے قصد کو کہ کوئی امر متعلق مذہب یا ایسا کہ غیر مذہب والوں کو ناگوار ہو، اس میں داخل نہ ہونے پائے، بہت خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اور عموماً بیان اور عقائد مذہبی کے ضمن میں جو جلائل حقائق مندرج ہیں ان کو اس قدر استحکام دیا ہے کہ جو نصیحتیں اس میں کی ہیں ان سے استنباطاً غیر مذہب والے بھی بوجہ احسن مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور اس باب میں جناب لفٹنٹ گورنر بہادر آپ کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف اہل اسلام بلکہ ہندوؤں اور مسیحیوں کو بھی پسند خاطر ہوگی۔ ایسے مناظر جیسے چھوٹی لڑکی کے مکالمے

تفصیل کے ساتھ در باب ان امور کے جن کا ذکر نا فاضل کی جناب میں اس پر فرض تھا وہ بالکل مقتضائے طبعی اور رقت قلبی سے بھرے ہوئے ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی مذہب کا آدمی اس کو پڑھے اور اس کے دل پر اثر نہ ہو۔

اس صورت میں جناب سر ولیم میور صاحب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہ ہوگا کہ اس کتاب کو بالکل منشائے اشتہار مذکور کے مناسب ہے۔ اس کو داخل کر کے جناب ممدوح کو خوشی تمام پورا انعام ایک ہزار روپیہ کا عطا فرماتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اردو زبان کے علم ادب میں ایک عمدہ تصنیف ہے اور اہل اسلام کو بہت پسندیدہ ہوگی اور دیگر اقوام میں بھی بہت رواج پکڑے گی۔[1]

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی ادب کی اس وقت جو حالت ہے اس کے پیش نظر انگریز طالب علموں کو بہترین اردو بولنا اور لکھنا سیکھنے کے لیے ہمارے مصنف کی مذکورہ دو کتابوں توبۃ النصوح اور مراۃ العروس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی ان کا روزمرہ وہ خالص زبان ہے جو دہلی میں بولی جاتی ہے۔ ان کتابوں کی کہانیاں مسلمانوں کی مخصوص حالات اور ان کے عادات و اطوار کی مفید مثالوں سے بھری پڑی ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں کتابیں خاص طور پر ان انگریز خواتین کے لیے مفید ثابت ہوں گی جنہیں شمالی ہند کے زنان خانوں میں آنے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔

مسٹر کیمپسن نے اس کتاب کا ترجمہ ایمان داری اور دیانت کے ساتھ کیا ہے انھوں نے اصل طرز ادا اور مقامی محاوروں کو بڑی خوبی کے ساتھ انگریزی کے سانچے میں ڈھالا ہے اور مشرقی تصورات اور خیالات کو یورپی قاری کے لیے آسانی کے ساتھ قابل فہم بنا کر پیش کیا ہے یہ کام اکثر اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ بعض ابواب اور مکالمے کیا طور پر مختصر کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ابواب اور مکالمے اصل میں غیر ضروری طور پر بہت طویل ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کے بہتر رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے یہ رجحانات ہیں خیر کی ہمت افزائی اور شر کے دبانے کے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے قصے کا مذہبی رنگ اپنی آپ مثال ہے اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بالکل ہی نئی چیز ہے۔ مسلمانوں کی لکھی ہوئی جو کتابیں میں نے پڑھی ہیں یہ کتاب ان سے اسی لحاظ سے بالکل مختلف ہے مسلمانوں میں جو مذہبی کتابیں مقبول ہیں وہ عام طور پر فقہ العبادات سمی ہیں اور ان میں صرف فرائض و واجبات اور دینی احکام ہی سے بحث کی گئی ہے۔ یہ خیال کہ مذہب کو ایک ہمہ گیر اثر ہونا چاہیے اور خاندان کو اسی کی رہنمائی میں اپنی گھریلو زندگی بسر کرنا چاہیے کسی مسلمان کی لکھی ہوئی کتاب کے لیے ایک نیا موضوع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس قسم کی کتاب لکھنے کا خیال صرف ایسے ہی ملک میں آسکتا ہے جو نصرانیت کے مذہبی تصورات سے متاثر ہوا ہو۔ ایسے ملکوں میں ایک ملک ہندوستان بھی ہے جہاں یہ اثرات مسرت کے ساتھ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہندوستان میں ہماری مذہبی تبلیغ کا ایک ہمت افزا اثر سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعہ اور بھی قابل لحاظ ہے کہ نذیر احمد صاحب نے جب یہ کتاب لکھی ہے تو وہ انگریزی ادب سے قریب قریب نا واقف ہی تھے اسی طرح انھوں نے انگریزی ادب کا اثر بالکلیہ بالواسطہ قبول کیا ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اثر اور بھی قابل قدر ہے کہ یہ بالواسطہ قبول کیا گیا ہے کتاب کا قصہ کسی انگریزی کتاب کا چربہ نہیں لیکن اس کے انگریزی خیالات اور تصورات کے حقیقی پیداوار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر کیمپسن کے ترجمہ کو ان تمام حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنہیں ہندوستان سے دلچسپی ہے۔ میں ان کے اس خیال کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ ہندوستانی سیکھنے اور ہندوستانی میں مہارت کے امتحانوں کے لیے اصل کتاب بطور نصابی کتاب کے استعمال کی جانی چاہیے۔

---

[1] مسٹر متھیو کیمپسن نے کتاب توبۃ النصوح پر انعام عطا کرنے کے لیے جو مراسلہ حکومت کو لکھا تھا اور حکومت نے اس کا جو جواب دیا تھا مولوی نذیر احمد نے ان دونوں مراسلوں کا ترجمہ کر کے توبۃ النصوح کے بعد کے اڈیشنوں کے ساتھ تقریظ کا عنوان دے کر چھاپا تھا۔ مولانا کا یہ ترجمہ منشی نولکشور لکھنؤ کے چھاپے ہوئے توبۃ النصوح کے بارھویں اڈیشن [illegible]

ولیم میور ۱۸۸۴ء

اب جناب میتھیو کیمپسن صاحب کے کیے ہوئے توبۃ النصوح کے انگریزی ترجمے کی طرف آیئے۔ یہ ترجمہ چھوٹی تختی کے کل ایک سو اٹھارہ صفحات میں آیا ہے۔ مترجم نے اس کتاب کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بڑی حد تک یہ آزاد ترجمہ ہے اگر آزاد ترجمہ نہ ہوتا تو یقیناً اتنے کم صفحات میں یہ ضخیم کتاب نہ سماتی۔ مولانا نذیر احمد نے اس کتاب میں وقت بے وقت نصیحتوں کا جو طومار لکھ ڈالا ہے وہ بجائے خود بالکل درست و بجا ہوتے ہوئے بھی اکثر مقامات پر قصہ کی دلچسپی میں بہت حائل و مانع ہوتا ہے۔ یہ مواعظ کافی اکتا دینے والے ہیں۔ کیمپسن نے ان مواعظ کو اکثر جگہ حذف کر دیا ہے یا پھر مختصر الفاظ میں ان کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس سے قصہ کی روانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس طرح ناول کی حیثیت سے کتاب زیادہ پر لطف ہو گئی ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ۱۲ باب قایم کیے تھے اور ان پر بڑے لمبے لمبے عنوان لگائے تھے۔ کیمپسن نے اپنے انگریزی ترجمے میں قصہ کے ابواب کی تقسیم میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور بارہ کی جگہ تیرہ باب قایم کیے ہیں۔ ابواب کے طول طویل عنوانوں کی جگہ بہت مختصر عنوان دیئے ہیں۔ کہیں کہیں ہندوستانی رسوم سے متعلق مختصر حواشی بھی ثبت کیے ہیں۔

آج کل اردو ادب کے شاہکاروں کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ توبۃ النصوح کا یہ انگریزی ترجمہ کمیاب ہی نہیں نایاب ہے اور اس قابل ہے کہ تھوڑی سی نظر ثانی کے بعد سے دوبارہ شایع کیا جائے۔ جب کبھی بھی توبۃ النصوح یا مولانا کی دوسری کتابوں کو انگریزی یا دوسری زبانوں میں پیش کرنے کی نوبت آئے کیمپسن صاحب کا آج سے لگ بھگ اسی سال پہلے کا کیا ہوا یہ انگریزی ترجمہ یقیناً ایک رہنما کا کام دے گا۔

حل التضاد فی تواریخ سیرۃ خیر العباد (بقیہ صفحہ ۱۳)

...ان رجسٹروں سے انتخاب کیے جاتے تھے۔

غالباً اس رجسٹر کی ضخامت چند ہی سال میں ہزاروں صفحات پر پہنچ گئی ہوگی، کیونکہ اسلام کی روز افزوں تحریک نے بہت جلد بلاد و ممالک فتح کر دیئے تھے۔ اور قبائل جوق جوق داخل اسلام ہو رہے تھے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس دیوان سے صرف اس قدر افراد کے نام قلمزد کیے جاتے ہوں گے، جو مر جاتے یا مرتد ہوتے؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تعداد نو مسلمین کے مقابلے میں تھی ہی کیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس عمومی رجسٹر کے مقابلے میں وہ چھوٹے رجسٹر زیادہ اہم اور مفید تاریخ معلوم ہوتے ہیں۔ جو غزوات و سرایا کے ذیل میں مرتب ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ ان سے شرکاء جنگ اور مقتولین و مجروحین کی ٹھیک ٹھیک تعداد کا اندازہ ممکن تھا؛ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں قسم کے رجسٹر عہد رسالت کے بعد بھی کچھ عرصہ محفوظ رہے تو ظاہر ہے تاریخ کا یہ بہت بڑا سرمایہ تھے جو ابتدائی مدونین اور رواۃ سیرۃ کی نظر سے گزر سکتا تھا۔

میں آئندہ فصل میں اس کی افادیت کو دوبارہ پیش کروں گا۔

نامۂ مومن

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

فارسی ادب میں ایک مدت تک سبکِ نثر ظہوری، مینا بازار اور پنج رقعہ کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور اسی انداز کو معیاری مقام حاصل تھا۔ مومن کے فارسی انشا کا بھی یہی انداز ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا وہ مرتبہ نہیں جو ظہوری کا ہے مگر ان کے اندازِ بیان نے ظہوری سے قربت ضرور حاصل کر لی ہے۔ اس وقت مومن کے فارسی انشا سے بحث مقصود نہیں، صرف چند باتیں اس خط کے متعلق عرض کرنا ہیں، تاکہ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔ ادبیات کے حسن و قبح کا فیصلہ ذوق و وجدان پر ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں فارسی کا سمجھنا چہ جائیکہ مومن کی فارسی کو سمجھنا مشکل ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے مومن کے خطوط کا ترجمہ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ یہ خط اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

خط مذکور انشائے مومن کا ستائیسواں خط ہے۔[1] جو انھوں نے ایک مطربہ کے نازِ بے جا کی شکایت میں لکھا ہے۔ اس خط کا جو عنوان حکیم احسن اللہ خاں مرتب انشائے مومن نے تحریر کیا ہے وہ یہ ہے: "نامۂ لبریز گلۂ نازِ بے جا۔ بنام مطربہ ماہ جبینے زہرا نوا۔" یہ خط کئی اعتبار سے دلچسپ اور اہم ہے۔

۱۔ یہ خط مومن کی حیاتِ معاشقہ سے متعلق ہے اور ان کی جوانی کی رنگ رلیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگرچہ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس "ماہ جبیں" کا نام کیا تھا۔

۲۔ اس میں ایک حسین ڈومنی کے نازِ بے جا کی شکایت کی ہے اور بڑے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ جس میں مومن کا طنز اپنے پورے نکھار پر نظر آتا ہے۔

۳۔ تحریر میں بے حد رنگینی ہے اور اس رنگینی کے باوجود بے ساختگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ مقفیٰ عبارتوں، برجستہ اشعار اور دلچسپ تشبیہات نے اور بھی زور پیدا کر دیا ہے۔

۴۔ حسبِ عادت مومن نے اپنے اس خط میں بھی "انا" اور "خودداری" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

مومن کی حیاتِ معاشقہ کے سلسلے میں صرف "صاحب جی" کا نام ملتا ہے اگرچہ مومن نے اپنے عشقوں کی داستان اپنی مثنویات میں لکھی ہیں۔ اور ان مثنویوں کو پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس خط کا مکتوب الیہا ان محبوباؤں میں کون ہے۔ محض "صاحب جی" کا نام معلوم ہونے کی صورت میں ہر مثنوی اور ہر عشقیہ خط کو ان سے منسوب کر دینا مضحکہ خیز ہے۔ اس خط میں محبوبہ کے نازِ بے جا کی شکایت ہے اور اس کی جفاؤں کا شکوہ جو ان کی تقریباً ہر مثنوی کا بھی موضوع ہے۔ افسوس ہے کہ اس خط کی تاریخ کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کاش حکیم احسن اللہ خاں نے جہاں اس کی ترتیب کا احسان کیا ہے وہاں تاریخ یا سنین کا بھی حوالہ دیتے۔

مومن کی جوانی عشق اور حسینوں کی چھیڑ چھاڑ میں گزری۔ اس لیے ان کے کلام میں بھی وہی انداز موجود ہے اور ان کے خطوط میں بھی بلکہ یہ رومانی کیفیت ان پر اس قدر حاوی ہے کہ جب وہ اپنے مربی (دعا لہ حکیم احسن اللہ) کو بھی خط لکھتے ہیں تو اس میں رنگین اور رومانی تشبیہات اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کا موضوعِ سخن جہاں حسینوں سے ہو گا وہاں شوخی بھی ہو گی اور طنز بھی۔ یہ طنز خواہ مقصد براری کے لیے ہو یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ مگر یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ شوخی اور طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ چند فقرے قابلِ غور ہیں۔

- ایسی جلاد کہ بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے!
- ایسی صیاد کہ اگر مرغِ بامِ حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے!
- ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو محض بے ستون کی محنت قرار دیتی ہے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو انشائے مومن مخزونہ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔

[2] جلادے کہ دست بخون بے گناہ آلاید و حنا پندارد و صیادے کہ اگر طائر بامِ حرم باشد آید بے کشتن نگزارد۔ سخت گیرے کہ قصۂ فرہاد و بے ستون ہمچو گل بر گرفتن گیرد۔

مومن کی نثر میں شوخی کے ساتھ وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جو نثر مرصع کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ چوں کہ یہ انداز ان کا اپنا مزاج ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس خط میں بیشتر رعایتوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آخر میں نہ صرف قافیہ کا اہتمام کیا گیا ہے بلکہ اس میں صنعت تجنیس اور ایہام تناسب کی مثالیں بھی موجود ہیں[1]۔ نئی نئی تشبیہات سے خط کو اور بھی رنگین بنا دیا ہے۔

آخر میں ایک امر کی طرف خاص طور سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ خط انھوں نے ایک محبوبہ کے نام لکھا ہے اور بارگاہ حسن میں اپنی خودداری کا اظہار تو بڑی چیز ہے اپنے وجود کا تصور بھی محال ہے۔ اس خط میں جذبۂ خود نگہداری بھی موجود ہے۔ حوالہ جات ذیل سے نہ صرف ان کی سیرت[2] کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ذہنی تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہوگی۔

"میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود نیازمندی کے بے احتیاج"

"اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا ہی کو چھوڑ دیتا ہوں"

"عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند"

"میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی"

موجودہ طبائع ممکن ہے کہ اس انداز کو نہ پسند کریں اور اس کے مقابلے میں سادگی اور اختصار کو ترجیح دیں مگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے ماحول میں دیکھیں۔

ایک مطربہ کے نام
(نازِ بے جا کی شکایت میں)

اے خامۂ فریاد نوا! بلبل کی طرح نالے کر کہ ایک گل گوش، غنچہ دہن تیری آواز پر کان لگائے ہے۔ اے نامۂ خونیں تحریر! لالے کی خوشی سے پھول جا کہ ایک رنگین ادا کے دستِ نگاریں میں تیری جگہ ہے۔ اے دلِ بےقرار مدد کر کہ ایک تغافل شعار نے میرا حال پوچھا ہے۔ اے دردِ جاں فرسا رحم کر کہ ایک عیسیٰ لب میری بے چارگی کے علاج پر متوجہ ہوا ہے۔ اے نازک معانی بے نوازش کا وقت ہے کہ ایک نازک دماغ نے پرسشِ حال کی ہے مگر میں اس کے دردِ سر سے ڈرتا ہوں۔ اے مضامینِ لطیف دل سے زبان تک آنے کا موقع ہے کہ لطیف مزاج میرے ملال کی چارہ جوئی پر آمادہ ہے مگر سخت کلامی کی سزا جانتا ہوں۔ اے میرے شب کی تیرگی میری سیاہی کے کام آ میں ایک ماہ رخسار کو دو حرف لکھنے والا ہوں اور اے میرے نصیب کی ظلمت مجھ سیہ کار کے خط کی تحریر میں مدد دے کہ میں ایک مہر لقا سے شامِ ہجر کی شکایت کرنے والا ہوں۔ اے دیدۂ خوں بار اشکوں میں جگر کے ٹکڑے گرا اس واسطے کہ میں لوحِ خط کی سرخی کے لیے حیران ہوں۔ اے زردیٔ رخسار میرے آنسوؤں میں شامل ہو جا اس واسطے کہ مکتوب کی زر افشانی کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ اے دودِ جگر میرے نامہ کی سطروں کا پیچ و خم بن جا، زلفِ پُرخم کی حسرت حوصلہ فرسا ہے۔ اے شعلۂ پُرشرر مدد کر، مضامینِ غم کی گرمیٔ ہنگامہ کا وقت ہے۔

---

[1] اے خامۂ تظلم صریر بلبل آسا نبال، گل گوش غنچہ دہانے بر صدائے تست و اے نامۂ خونیں تحریر چوں شقایق بر خود ببال نگاریں دستِ رنگیں ادا جائے تو۔ "صریر" اور "تحریر"، "خامہ" اور "نامہ"، "ببال" اور "بنال" یہ الفاظ ہم قافیہ ہیں۔ اس کے علاوہ "خامہ" "نامہ" "بنال اور ببال" میں صنعت تجنیس ہے۔ آگے بڑھ کر مومن نے ایہام تناسب سے کام لیا ہے۔ "بلبل" کی رعایت سے "صریر" کا لفظ لانا کہیں کہیں چار چار فقرے آئے ہیں اور ہر فقرہ اپنے متقابل فقرے کے قافیے سے ہم آہنگ ہے۔

[2] عاشق معشوقانہ مزاجم و باوصف نیازمندی بے احتیاج۔ مدعایم اگر دل بہ بے حاصلی نہد آں مدعا ہی گزارم .... عاشق وفا شعارم اما غیرت مند ...... بلبلم در ہر گلشن نغمہ سرا نہ و طوطیم بہر شکر لبے منقار نکشاید۔

رباعیات:-

اے لب! افسانۂ تمنا کی کچھ بات سنا
اے نالے! شوقِ حوصلہ فرسا کا کچھ ذکر کر
اے شخص! اس نے آج وفا کی حکایت پوچھی ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری داستان کا کچھ ذکر سننا چاہتا ہے۔

میں دیوانہ ہوں اور اس کے ساتھ اپنی دور اندیشی پر خوش ہوں۔
ایسے دیوانہ پر سو عقلیں قربان
اپنے خط کو کبھی چومتا ہوں، کبھی دل پر رکھتا ہوں۔
جانتا ہوں کہ یہ محبوب کے ہاتھ میں جائے گا۔

اے زبانِ ہرزہ درا، بے ہودہ نالے نہ کر کیوں کہ ایک شوخ جفا شعار مخاطب ہے۔ اے نطق پریشاں نوا بالکل فریاد نہ کر کیوں کہ ایک سخن ناشنو ظالم سے کام پڑا ہے۔

رباعی:-

ایسا شوخ جس نے کسی سے وفا نہ کی اور نہ کرے
جس نے کسی کی مشکل گرہ نہ کھولی ہے اور نہ کھولے
بے کار نالے کرنا کس لیے۔ میں جانتا ہوں
کہ ہمارے حال پر اس نے رحم نہ کیا اور نہ کرے

اے اثر! میری دادرسی کر میں ایک ظالم کے ہاتھ سے گرمِ فریاد ہوں۔ اے آسمان میری مراد کے مطابق گردش کر کہ میں ایک زہرہ جبین کے سر کے گرد پھرنے سے محروم ہوں۔ اے آہِ نارسا! یہ بے سر و پائی کیوں ہے۔ اے شورِ فریاد کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرا روئے سخن کس کی طرف ہے (اس کی طرف ہے) جس کی نا ہید نوائی بے اثر کرنے والی اور سرود سرائی مخلِ اختیار۔ باربد کا ترانہ اس کی شیریں ادائی پر قربان اور حضرت داؤد کا نغمہ اس کے انداز کا دعا گو۔ اس کے کلامِ شیریں کی بات میں حلاوتِ شیریں گفتار تلخ کام ہے اور اس کے سخنِ رنگین کے رشک میں باغ کا افسانہ بلبل کے لب سے ناتمام ہے۔ اس کی گوش آشنا آواز کی نرمی کے مقابل پھول کے کھلنے کی آواز خزاں دیدہ پتوں کے شور سے مشابہ ہے اور اس کی طرب فزا گفتار کی نزاکت کے سامنے بانسری کا نغمہ کسی ماتم رسیدہ کے گلے کی فریاد نہیں ہے۔

مثنوی

اس کا لعلِ لب موتی برسانے میں
رخِ معانی کے لیے آب و رنگ کا حکم رکھتا ہے
اس کے رنگین ہونٹ یاقوت کی تحریر میں
اس کے انفاس سحر و دانت کا کام کرتے ہیں۔
اس کے انفاس کا افسانہ اعجاز سے کم نہیں
حضرت مسیح بھی اس کے طرز پر جان دیتے ہیں
اس کے مژگاں کی تلوار مشتاقوں کی آہ کی طرح کاری ہے
اس کی چشمِ سیاہ عاشقوں کے نصیب کی طرح کالی ہے
اس کی نگاہیں دلبری میں سحر کرتی ہیں
اس نے جادوگری کو قصۂ ماضی بنا دیا ہے

اس کی پیشانی آئینہ تمثال ہے
صبح کی پیشانی اس کے رو برو سر بسجود ہے
اس کا رخسار اپنے دل افروز جمال سے
آفتاب کے جگر کا داغ (باعث رشک) ہے
قیامت اس کے قامت کے گرد پھرتی ہے
سو طرح کی بلائیں اس کے قد پر قربان ہوتی ہیں
جب وہ جلوہ دکھاتی ہے تو ستم ڈھاتی ہے
جب وہ اٹھتی ہے تو فتنے اٹھاتی ہے
اس کی جلوہ گاہ کا غبار سراپا آشوب ہے
صحرائے قیامت اس کی گزرگاہ ہے
اس کے زلف کی حکایت بہت دراز ہے
یہ سمجھو کہ وہ میری شب ہجر کی ترجمان ہے
اس کے گیسوؤں کا ہر بال اپنے پیچ و خم سے
دانا اور ناداں سب کے دلوں کے لئے جال کا کام دیتا ہے
نزاکت کے باوجود اس کی طبیعت
سنگ دلی کا بار اٹھاتی ہے
اس عادت میں سمن زار کی سی لطافت ہے
اس کی گلی میں چمن زار کی سی طراوت ہے
اس کا ہر غمزہ عاشقوں پر نظر رکھتا ہے
اس کا ہر عشوہ مشتاقوں کا آرزو مند ہے
اس کا شیوہ دل ستانی
لوگوں کو لطف و مہربانی کے ساتھ زندگی بخشتا ہے

ہے میں نے کیا کہا۔ طریقہ دل ستانی اور شیوہ مہربانی کا کیا ذکر وہ تو ایسی بے مہر ہے کہ دل بھی جبر سے چھینتی ہے۔ جفا اس کی طبیعت سے اتنی قریب ہے کہ فریاد بھی زبان مظلوم سے اس قدر قریب نہ ہوگی اور رحم اس کے دل سے اتنا دور ہے کہ ہنسی بھی غم رسیدہ کے منہ سے اس قدر دور نہ ہوگی۔ وہ ایسی خوں خوار ہے کہ میری چشم خوں فشاں کی طرح عاشقوں کا خون گراتی ہے اور ایسی ظالم جس کی گلی سے فتنۂ عرصۂ محشر کا غبار لے کر اٹھتا ہے۔ ایسی جلاد کہ بیگناہوں کے خون سے ہاتھ سے رنگتی ہے اور حنا سمجھتی ہے۔ ایسی صیاد کہ اگر مرغ بام حرم اس کے جال میں آئے تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے۔ ایسی سخت گیر کہ فرہاد اور اس کی کوہ کنی کے قصے کو مٹی ڈھونے کی محنت قرار دیتی ہے اور ایسی بد عہد کہ شیریں اور شیرویہ کے وعدے کو وفا شعاروں کی دوستی عہد ٹھہراتی ہے۔ ایسی بے درد کہ مظلوم کے نالے پر ہنستی ہے۔ ایسی بے رحم کہ پروانہ کی بالیں پر شمع کا رونا پسند نہیں کرتی۔ ایسی غلط اندیش کہ محتسب کو قتل کرنے کے لیے مستی کا بہانہ بناتی ہے اور ایسی فتنہ کش کہ بادہ گلگوں کا جام اٹھا لے کر مومن کا خون پیتی ہے۔ ایسی زود خشم کہ (کسی کو سزا دیتے وقت) اتمام حجت کی تاخیر اس کو درازی روز جزا نظر آتی ہے۔ ایسی سیاہ چشم کہ شب فراق کی سیاہی اس کی نگاہ میں نہیں جچتی۔ ایسی بے وفا کہ عہد باندھنے ہی کو ایفائے عہد سمجھتی ہے اور ایسی صبر آزما کہ عاشق کے دم واپسیں تک اذن امتحان شیر [illegible] ہے۔

رباعی: ایسی شوخ جس کی جفائیں نہیں اٹھائی جا سکتیں
ایک دن بھی اس سے مرادِ دل حاصل نہیں ہو سکتی
اگر اس نے میرا سرتن سے قلع کیا تو مشکل نہیں
مشکل تو یہ ہے کہ اس سے قطع محبت نہیں کر سکتے۔

اے کافرِ بے وفا۔ اے غیروں سے محبت کرنے والی۔ اے ناشکر، الفت دشمن، اے حق ناشناس، سخن ناشنو، اے درشتی پسند، سست عہد، اے وفا نہ کرنے والے وعدوں پر بھی پشیمان، اے ستم شعار، آسمان کو ستم سکھانے والی۔ اے گردشِ روزگار کی استاد۔ اے سفلہ پرور، رقیب نواز۔ اے لطفِ خدا سے بے نیاز۔ اے نامرادوں کے خون کو جلانے والی برق۔ اے دلوں کے جگر کو پگھلانے والے شعلے، اے قیامت کی پرسش سے بے پروا رہنے والی۔ اے قتلِ مومن بے گناہ پر کمر باندھنے والی۔ اے اہلِ عزت کی ذلت چاہنے والی۔ اے بے تمیزوں کے دام میں اسیر۔ اے غرور سے تیوری چڑھائے ہوئے۔ اے بے پروائی سے میرے حال تباہ پر نظر اٹھائے ہوئے۔ اے وہ جس نے عمر بھر ظلم سے میرا امتحان لیا۔ اے وہ جس نے مدتوں میری مہر و وفا کو آزمایا۔ اے مہربانیوں پر نامہربانی کرنے والی اے وہ کہ سوز و ملال کے باوجود میرے سر میں تیرا سودا ہے اور میری ناتواں، نیم جاں تجھ پر فدا ہے۔ آخر کب تک میں آتشِ فراق میں جلوں اور دردِ تنہائی سے نباہ کروں۔

فرد: تیری جفا اور میری وفا دونوں حد سے گزر گئیں
تجھ کو اپنے سے اور مجھے خود سے شرم آنی چاہیے

وصال کی شب نے جو ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے یہ دن دکھایا .... جب سے تو نے میرا ہاتھ تھاما، کبھی میں اس کو آنکھوں پر رکھتا ہوں اور کبھی سر پر اور جب سے تو نے اپنی انگوٹھی ہاتھ سے میری انگلی میں پہنائی کبھی انگلی کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی انگوٹھی کو۔ وہ محبت کی باتیں کیا ہوئیں اور وہ وفا کا ذکر کہاں گیا۔ راستی بنا جھوٹی قسمیں چھوڑ اور وعدہ ہائے تسلی آمیز یاد کر۔ آخر روزِ جزا آنے والا ہے۔ خدا و نبی ہمارا سامنا ہونے والا ہے۔ خدا اس دن سے بچائے کہ میں تیرا دامن پکڑوں اور دل کے ٹکڑے داورِ محشر کے سامنے پیش کروں۔ اپنے نالہ ہائے قیامت گداز سے ایک نئی قیامت برپا کروں اور شعلہ ہائے عالم سوز سے اہلِ جنت کو دوزخ میں ڈال دوں۔ میری آہوں کے شعلے فرشتوں کے بال و پر تک جلا دیں اور سدرہ و طوبیٰ کی شاخیں آتش پرستوں کے ہاتھ پاؤں کی طرح بھڑک اٹھیں۔ میں ایسی فریاد کروں جن کے شعلوں کی گرمی کوثر کو آب گرم اور خلد بریں کو جہنم بنا دے۔ سچ ہے۔

شعر: اگر ایک دن جدائی کی آگ دوزخ پر مسلط ہو
تو یقیناً اس کے شعلے پگھل کر رہ جائیں

نہیں نہیں کہاں میں اور کہاں یہ بے مروتی۔ لیکن "یوم تبلی السرائر فما لہ من قوۃ ولا ناصر"[1] کے مفہوم سے ڈرتا ہوں اور دل میں "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"[2] کی فکر سے دونیم ہے۔

بیت: میں نامراد تیرے مظالم سے کیوں کر نبھاؤں
میں نہیں کہتا کہ تو نے کیا کیا تو ہی بتا کہ میں کیا کروں

میرا غبار خاطر تیرے قدموں کے آوارگی ہوا سے اڑ جائے گا۔ میرے دل کی گرد راہ تیرے قدوم سعادت لزوم سے پامال ہو جائے گی۔ اگرچہ میں شیشۂ شراب کی طرح صاف طینت ہوں لیکن ساقی کی دستگیری کے بغیر سر جھکانے والا نہیں۔ میں صیقل شدہ شمشیر ہوں اور چلتے تک کھنچا ہوا تیرا جب تک تو مجھے سر پر نہ رکھے گی میں اپنے ناخن کو تیری عقدہ کشائی کی زحمت دوں گا۔ اور اگر تو مجھے چٹکی سے چھوڑے گی تو پھر تیرے ہاتھ نہ آؤں گا۔ میں عاشق معشوق مزاج ہوں اور باوجود دنیا سندی کے بے احتیاج۔ اگر میرا مدعا بے نتیجہ ثابت ہو تو میں سرے سے اس مدعا کو چھوڑ بیٹھتا ہوں اور اگر میری تمنا حاصل نہیں ہوتی تو اس تمنا ہی سے دست بردار

[1] جس دن لوگوں کے دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ مددگار
[2] جو کوئی ذرہ کے برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا۔

جاتا ہوں۔ میں عاشق وفا شعار ہوں لیکن غیرت مند اور بندۂ حق گزار ہوں لیکن خریدار پسند میری بلبل ہر باغ میں نغمہ سرائی نہیں کرتی اور میری طوطی ہر شکر لب کے سامنے منقار نہیں کھولتی۔ میرا پروانہ ہر شمع رخسار کے گرد نہیں گھومتا اور میرا دیوانہ ہر پری جمال کا مجنوں نہیں ہوتا۔ طور کو جلانے والی آگ سے میں بے خود ہو کر گرتا ہوں مثال دیے کے جلنے کا عذاب نہ دیکھوں .... میرا یوسف زلیخا کا غلام نہیں ہوتا کہ وہ اس کو زندان بلا میں ڈال دے اور میرا فرہاد عشق شیریں کی تلخی نہیں اٹھاتا کہ وہ (شیریں) اپنے لب شیریں پرویز کے لیے وقف کر دے۔ میں حلقۂ زنجیر ہوں جس کے پاؤں پر پڑا وہ اٹھا میرا گرفتار (گرفتار محبت) ہو گیا۔ میں رنگ حنا ہوں جس کے ہاتھ کو میں نے بوسہ دیا اس نے دوسروں کے قتل پر تلوار کھینچی۔ میں پایۂ منبر ہوں جس کے پاؤں پر سر رکھوں وہ اپنی جبین نیاز میرے قدموں سے گھسے اور میں حنا پرکار ہوں اسی کے گرد پھروں جو میرے آغوش میں آئے۔

رباعیات:

مومن مجھے تو بت پرستی سے روکتا ہے
مگر خود خدا کی بندگی کیوں نہیں چھوڑتا
یوسف نے زلیخا کی خدمت کا حق نہ پہچانا
میں اس کا غلام ہوں جو مجھے اپنا آقا سمجھے

وہ شوخ جو خدائی کے دعوے کرتا ہے
اور کبریائی کی سینکڑوں شیخیاں مارتا ہے
مومن کی محرومی گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں
کہ خدا عقدہ کشائی کی شان رکھتا ہے

جب تک فتنۂ روز قیامت نہ اٹھے تیرا قد محشر خرام جلوہ نمائی کرتا رہے۔ اور جب تک شور محشر ہنگامہ برپا نہ کرے تیری رفتار فتنہ انگیز ہنگامہ نمائی کرتی رہے۔

قطعہ:

جب تک عاشق کی شب ہجر کی درازی کے افسانے رہیں
تیری عمر تیری زلف مشکیں کی طرح دراز ہو
تو گرم صحبت رہے اور شمع محفل کی طرح
حاسد کی جان آتش غم سے پگھلتی رہے
میں تیرے ساتھ ہم کلام ہوں اور رقیب حسد سے گرم فریاد
میں تیرا ہم نشیں ہوں اور دشمن مارا مارا پھرے
میں کامیاب وصل ہو جاؤں اور غیر ناکامی کے باعث
مرنے کا امیدوار ہو
میں خدائے کارساز کی مہربانی کا شکریہ ادا کروں
اور وہ رقیب چرخ حیلہ ساز کی طرح شکایت کرتا رہے

غلام ربانی تاباں

کسے دوام کی فرصت یہاں خضر کی طرح — تپش کی زیست یہی ایک پل شرر کی طرح
طلب کی راہ سے گزرے ہیں یوں بھی دیوانے — زمانہ ساتھ چلا گردِ رہ گزر کی طرح
گلوں کو چاک گریبانیاں مبارک ہوں — نسیم آئی بہاروں کے نامہ بر کی طرح
کبھی گزر بھی گیا شوق حد تمکیں سے — کبھی چھلک بھی گیا جام چشمِ تر کی طرح
ہزار سادگی، صد ہزار پرکاری — نہ کوئی دوست نہ دشمن تری نظر کی طرح
جنوں وہ خام جو بن جائے انجمن کا چراغ — ہوا کی زد پہ رہو شمع رہ گزر کی طرح
وہ گفتگو کا سلیقہ بھی چاہیے تاباںؔ — کہ بات دل میں اتر جائے نیشتر کی طرح

امتیاز علی عرشی

شبابِ عمر دو روزہ کا اعتبار ہی کیا — چمک کے ساتھ جو بجھ جائے وہ شرار ہی کیا
نہ کر تو آمدِ فردا کا انتظار نہ کر — جو جا کے آ نہ سکے اس کا انتظار ہی کیا
اٹھا اور نگاہ کی خارا شگافیاں دکھلا — کہ جو علم نہ ہو وہ تیغِ آبدار ہی کیا
تلاش آہوئے رم خوردہ اے خوشا لذت! — جو آپ دام میں آ جائے وہ شکار ہی کیا
بہارِ دامنِ گلرنگ اے بسا زینت! — جو خونِ دل نہ بہائے وہ دلفگار ہی کیا

سحر رامپوری

یاد آیا جہاں بھولے سے تمہارا دامن — وہیں بیساختہ آنکھوں نے پکارا دامن
ایسے کم ظرف کو مٹی ہی میں مل جانا تھا — اشکِ حسرت کو نہ دینا تھا سہارا دامن
میری وحشت سے کچھ اچھی نہیں چھیڑیں یعنی — ہے اسی چاک گریباں سے تمہارا دامن
لوٹ ہی لی تھیں گلستاں کی بہاریں میں نے — کہاں آ کر دلِ کج فہم پکارا دامن
بفیلِ ہوش و جنوں کا ہے بہار آنے دو — دیکھنا ہے، کہ کسے ہوتا ہے پیارا دامن
مسکراتی ہیں جو کلیاں تو اسی دامن میں — اور کانٹوں کے لیے ہے تو ہمارا دامن
اپنا افسانۂ غم اب نہ سنائے گا سحرؔ — اپنی آنکھوں سے ہٹائیں وہ خدارا دامن

غلام ربانی تاباں

تھکے ہیں لاکھ مسافر سفر ہے کیا کیجے
ابھی وہی کششِ رہ گزر ہے کیا کیجے

جنوں پہ قید طلب بھی بہت گراں ہے مگر
جبیں نواز ترا سنگِ در ہے کیا کیجے

چمن میں کوئی نشیمن رہے رہے نہ رہے
بہار موسمِ رقصِ شرر ہے کیا کیجے

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے
غبارِ راہ سہی، ہمسفر ہے کیا کیجے

تمام عمر شکستوں سے دل کا کام رہا
خلوص شوق رقیبِ اثر ہے کیا کیجے

شکایتِ ستمِ روزگار لاحاصل
غمِ حیات سے کس کو مفر ہے کیا کیجے

ہنسے تھا عقل کی دیوانگی پہ کل تاباں
مگر وہ خود بھی تو آشفتہ سر ہے کیا کیجے

صبا اکبرآبادی

آگ بجھ گئی غم کی ہم ہنوز جلتے ہیں
دن بدل گئے لیکن دل نہیں بدلتے ہیں

وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں
گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں

وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں
زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

وہ عبور کر لیں گے قلزم مصائب کو ؟
روز جن سفینوں کے ناخدا بدلتے ہیں

ایک دن یہی شاید اس گلی میں لے جائے
دل جدھر چلے ہم بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وحشیوں کے رستے میں باغ ہو کہ جنگل ہو
پھول بھی کچلتے ہیں، خار بھی کچلتے ہیں

اتنی تیز رفتاری کیوں ہے سوئے میخانہ
اے صبا ذرا ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں

انجم قریشی رامپوری

عالم تمام مطلعِ انوار ہو تو ہو
جلوہ بقدرِ وسعتِ ذوقِ نظر نہیں

محروم ہوں نشاطِ محبت سے کیا کہوں
ظالم کو پاسِ سوزشِ زخمِ جگر نہیں

انجم نے پھول اپنے نشیمن میں رکھ لیے
افسوس بجلیوں کو ابھی تک خبر نہیں

غالبیہ ــــــــــ تیسرا باب

اکبر علیخاں

اس عنوان کے تحت اس بار ایسی خبریں شریک کی جا رہی ہیں جو غالب کی زندگی میں معاصر اخبارات کے صفحات پر جگہ پا چکی ہیں، سوائے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کے اشتہارات کے جو غالب کی وفات کے صرف دو ماہ بعد شایع ہوئے تھے۔ زیرِ نظر خبروں کی تعداد یقیناً کم ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ بہت سی خبریں ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔

مثال کے طور پر خود غالب نے اخبار لودھیانہ میں ایک خبر کی اشاعت کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے درباری اعزاز کی تخفیف و ترمیم کی اطلاع چھپی تھی۔

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی

تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام

سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم

نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا اہتمام

مگر اخبار لودھیانہ کے مذکورہ نمبر کا سراغ نہیں ملتا۔ اگر ہمارے پاس اُس عہد کے اخبارات و رسائل کی قابل لحاظ تعداد محفوظ ہوتی تو غالب اور معاصرین غالب کے بارے میں بڑے اچھے ذخیرے سے استفادہ کیا جا سکتا۔

بہر حال غالب کے معاصر اخباروں کے صفحات پر جو کچھ ملا ہے اسے ایک سلسلے میں پرو دیا گیا ہے۔

غالب کا اردو فارسی کلام بھی اخبارات میں چھپا کرتا تھا۔ مراسلات بھی شایع ہوتے تھے اور غالب کی نیز غالب سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔ خبروں میں قاطع برہان کے ہنگامے، قمار بازی کے ذیل میں سزائے قید، ہند کا ذکر، انگریزی حکومت سے تعلق اور مشاعروں میں شرکت کا حال موجود ہے۔ جو غالب کی مقبولیت کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ یہ غالب کے مورخ کے لیے حسب مراد اور اطمینان بخش نہ سہی مفید اور کارآمد مواد کا درجہ ضرور رکھتا ہے۔

دہلی اردو اخبار ——— (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء)

قمار بازاں

سنا گیا کہ ان دنوں گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم خاں وغیرہ کے جو سابق بڑی ملتوں میں دور تک سپرد ہوتے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب و کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار تم سے سیاہ و بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے .... یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی۔ لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے۔ لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پھیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۷۳)

اخبار مہر منیر کلکتہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۴۱ء)

از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی، یکی از عزیزان نواب شمس الدین خاں مرحوم، تنی چند مقامران نابکار کہ در لیل و نہار بجز قمار دیگر کار نداشتند، در حالت قمار ... بسعی تھانیدار اسیر و گرفتار شدند و بر محکمہ حاکم حاضر گردیدند۔ حاکم نصفت شعار از شاعر یک صد روپیہ و از دیگران سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۵۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۲۰ دسمبر ۱۸۴۴ء)

بتاریخ ۱۴ ماہ اکتوبر میجر جان کوب اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی وارد ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رفاقت قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا۔ اور نواب ضیاء الدین خاں کے مکان میں جہاں پہلے ہی مہمانداری کا انتظام کیا گیا تھا ٹھیرایا دو دن کے بعد میجر صاحب بہادر نے ٹامس مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ (دہلی کا آخری سانس ص ۵)

احسن الاخبار بمبئی ——— (۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء)

ماہ گزشتہ کی پندرہ اور سترہ تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ عمائدین، رؤسا شرفا اور خاص خاص اصحاب شریک تھے۔ تمام اہل دربار کو ان کے مرتبے کے موافق انعام و اکرام دیا گیا .... ۱۷ تاریخ کے دربار کی رپورٹ اور تقسیم انعام کی تفصیل حسب ذیل ہے: دربار عام ہوا دور دور سے انگریزوں کو بلایا گیا بڑے بڑے صاحبان عالی شان تشریف فرما تھے۔ مجمع بہت بارونق تھا دو گھنٹے تک ملکی معاملات پر تقریریں ہوئیں اس کے بعد دو نئے آدمیوں نے نواب گورنر جنرل بہادر سے تعارف حاصل کیا۔ محفل میں ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں سے ہر ایک کے بالخصوص حاکموں اور افسروں کے چہروں پر خوشی اور کامیابی کی سرخی جھلک رہی تھی اس کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

.... (۱۳) مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خلعت ہفت پارچہ سہ رقم جواہر .... (۱۷) مولوی صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی کو خلعت پارچہ اور ایک گھنٹہ .... اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے دست مبارک سے ایک ایک شال مرحمت فرمایا .... ۱۷ سید فیض الحسن صاحب ... اس شہر ... نذرانہ پیش کی گئی ہر شکریہ کے ساتھ قبول ہوئیں مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی نیک نامی اور علم و فراست سے صاحب بہت مسرور ہوا اور ممنون ہیں .... ۱۸ تاریخ کو بدر الدین مہرکن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل کا نام کھدا ہوا تھا تدر کے

پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

جس صدق سے موجودہ گورنر کے عہد میں ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور اخلاق و عنایات کا برتاؤ کیا گیا اس سے پہلے ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ علما میں ہر چھوٹے ے کی زبان پر ان کے عدل و داد کے تذکرے ہیں ان کے عہد کی یہ خصوصیت ہے کہ انشا پردازوں، تحصیلداروں تک کو خلعت تقسیم کیا گیا (دیباچہ فارسی کا اندازہ ص ۲۱۰)

بار فوائد الناظرین۔ کلکتہ ———— (۳۱ رمئی ۱۸۴۷ء)

۵ ہوا ہی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پاکر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب ہ چند قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔

(قدیم اخبارات کی کچھ جھلکیاں امتیاز علی عرشی نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء)

ن الاخبار۔ بمبئی ———— (۲۵ رجون ۱۸۴۷ء)

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کی باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی اس لیے کہ انھیں کی معروفیات۔ ۱۰ رجمادی الثانی کے مخبر سے یہ خبر آئی ہے کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معزز شہر میں سے ہیں یہ جو کچھ ہوا ہے ن حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کالی بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں انون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ (دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۱)

ن الاخبار۔ بمبئی ———— (۲ رجولائی ۱۸۴۷ء)

میرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ ا سزا ہوئی۔ اگر دو سو روپیہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اتنی مصیبت اور مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل ی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے۔ بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے، ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔

(دہلی کا آخری سانس ص ۱۷۴ — ۱۷۵)

سعد الاخبار آگرہ ———— (۱۲ رمارچ ۱۸۴۹ء)

نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل میں قیمت چھپنے سے تین روپے اور جو بعد اس کے بیچے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن　　پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن
طے کرو راہِ شوق زود زود　　آن پہنچی ہے منزلِ مقصود
پاس ہے اب سوادِ اعظم نثر　　دیکھیے چل کے نظم عالم نثر
سب کر اس کا سواد ارزانی　　چشم بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا　　جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہ دہلی ہے　　مطبع بادشاہ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ　　گل و ریحان اللہ اللہ رنگ

ہے یہ وہ گلشن ہمیشہ بہار — بار ور جس کا سرو گل بے خار
نہیں اس کا جواب عالم میں — نہیں ایسی کتاب عالم میں
اس سے انداز شوکت تحریر — اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرز نغز گفتاری — حبذا رسم و راہ نثاری
نثر مدحت سرائے ابراہیم — ہے مقرر جواب پئے تعلیم
اُس کے نقروں میں کون آتا ہے — کیا کہیں کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلا — ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلا
ورزش قصہ کہن کب تک — داستان شہ دکن کب تک
تا کجا درس نثر ہائے کہن — تازہ کرتا ہے دل کو تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے بیت — "ہر کرا پنج روز نوبت اوست"
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمع بزم سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دان معنی ہے — بادشاہ جہان معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز — نظم اس کی نگارنامۂ راز
دیکھیو اس دفتر معانی کو — سیکھیو آئین نکتہ دانی کو
اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلب گاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیدہ ور کرے درخواست — تبن بھیجے بھیجے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زر قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — آسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہار ریاض مہر و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں در پے حصول شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصل تحریر — کہ نہ ارسال زر میں ہو تاخیر
چشمۂ انطباع جاری ہے — ابتدائے ورق شماری ہے

مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار بسبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا۔

آثار غالب صفحات ۸۰۷ و ۲۵۸)

سعد الاخبار آگرہ —————— (۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء)

ان دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلی القاب مرزا اسد اللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر

جو تیموریہ کے زمانے سے سلطنت دہلی تک ہو مامور کیا اس اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر کے آئندہ از راہ پرورش کا مترقی کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب دے کر چھ پارچے کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے۔ یقین ہے کہ تاریخ ایسی دلچسپ ہوگی کہ ہر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ہوگا۔ (ہندوستانی اخبار نویسی ص ۲۸۸)

اسعد الاخبار آگرہ ——— (۲ ستمبر ۱۸۵۰ء)

تاریخ عطائے خطاب و خلعت از حضور بادشاہ دہلی بہ جناب اسد اللہ خاں غالب

از روئے اخبار اسعد کے ہر شہر و دیار میں مثل آفتاب روشن و ظاہر ہو چکا ہے کہ شاہ دہلی نے جناب اسد اللہ خاں غالب کو، جو نظم و نثر میں استاد اکمل اور تمام کشور ہند میں لاثانی و بے بدل ہیں حضرت شاہ والا درگاہ نے بکمال اعزاز و اکرام اپنے حضور بلوا کر بہ عطائے خطاب خلعت معزز فرما کر کل سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جناب تفتہ نے ان کے خطاب و خلعت عطا ہونے کی تاریخ لکھی۔

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب   خطابائی کہ ہر یک لفظ آں روشن تراز اختر
دبیرالملک نجم الدولہ و یک تیز در جنگ ہم   نظام اول بود زاں بعد لفظ جنگ ہے مسور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید و خلعت   فزوں جیغہ سرپیچ و مالای دُر و گوہر
بدیں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی   سخن فہم و سخن گو پرور و دانا و دانشور
پئے تحریر تاریخ خطاب خلعت شاہی   بہ دریای تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
بہ ہنگامی کہ شد در غوطہ پایش بر زمین قائم   بہ گوش تفتہ ہاتف گفت کای تفتہ طلب آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی
یکی ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز، چارم فر

(شاہکار لاہور ص ۳۸ اپریل ۳۵ء)

سراج الاخبار دہلی ——— (یوم سہ شنبہ چہاردہم محرم (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۵۱ء)

چون بہ نسبت نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب تخلص ایچ کس غماز ...... سمت اثنا عشریہ و مذہب امامی وا نمودہ بود، پس چند رباعی بکمال متانت و نرمی ادائی پیش بندگان قدسی احاطہ گذرانید از جمیل پسندافتادگی ایاں طبع فرمودند۔

رباعیات نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ

جن کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں وہ مجکو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی   شیعہ کیونکر ہو ماوراء النہری

ایضاً

اصحاب کو جو کہ ناسزا کہتے ہیں   سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبی نے ان کو اپنا ہمدم   ہے ہے نہ کہو کسے برا کہتے ہیں

ایضاً

یاران رسول یعنی اصحاب کبار   ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار   غالب وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایضاً

یاران نبی میں تھی لڑائی کس میں — الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق وہ عدل وہ حیا وہ علم — بتلاؤ کوئی کہ تھی برائی کس میں

ایضاً

یاران نبی سے رکھ تو لا باللہ — ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم ان کے دشمن — لاحول و لا قوۃ الا باللہ

(ہماری زبان ۱۵ اپریل ۱۹۶۱)

اردو اخبار ———— (۳۰ مارچ ۱۸۵۱ء)

قصیدہ جو کہ نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب نے مدح بندگان حضور والا میں نوروز کے دن پڑھا تھا اس ہفتے میں ہمارے پاس آگیا واسطے تفریح ناظرین اخبار کے درج ہوتا ہے:

خورشید بہ بیت الشرف خویش در آمد — زانسان کہ شہنشاہ بہ اورنگ بر آمد

(نوائے ادب بمبئی۔ اپریل ۵۸ء)

اردو اخبار ———— (۱۱ مئی ۱۸۵۱ء)

اس ہفتہ میں ایک غزل جناب نواب اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بغالب کی ہمارے ہاتھ آئی سو درج اخبار ہوئی:

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے — یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

(نسخۂ عرشی حواشی ص ۳۶۳)

اردو اخبار ———— (۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء)

حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ، جو جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم صاحب نے بتقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار سہرا مبارک بادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سردر بار گزرانے ... چند اشعار علاوہ اس کے جناب نجم الدولہ بہادر نے پھر گزرانے، واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین اہل بصیرت و ماہرین و واقفین فصاحت کے بموجب ترتیب دلچسپ ہونے کے ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ (نوائے ادب اپریل ۵۸ء)

اردو اخبار ———— (۲۸ اگست ۱۸۵۲ء)

اس ہفتے میں جو مشاعرہ مرزا نور الدین بہادر دام اقبالہ المتخلص بہ شاہی نبیرہ جناب مرزا سلیمان شکوہ بہادر مرحوم نے کیا جو کہ لکھنؤ سے ... لائے میں غزلہای شاعران کثیر پڑھی گئیں۔ اور شاہ زادہ والا تبار اکثر رونق افروز محفل مشاعرہ تھے۔ ایک غزل جناب مرزای ممدوح ... مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں بہادر المتخلص بغالب کی راقم اخبار کے پاس پہنچی۔ سو درج اخبار ہوئی:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۴)

اردو اخبار ———— (۱۳ فروری ۱۸۵۳ء)

ایک مخمس جناب صاحب عالم مرشد زادہ بہادر مرزا نور الدین المتخلص بہ شاہی جن کے مدائح صفات اخبارات گزشتہ میں لکھے تھے، بتحقیق سنا ... بندگان حضور والا جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب بحر بیان نے ایک غزل اس ہفتے میں لکھی تھی، اور اس مقصود سے وہ غزل کہوائی

گئی تھی کہ مصرع لگاتا جس میں دشوار یک ... صاحب عالم بہادر ممدوح نے اوّل فی البدیہہ ... کامل مخمس لیا کر کے پڑھ دیا۔ حضور والا اور سب حضار دربار والا نے نہایت پسند کیا۔ حضور نے پانچ دفعہ اس مخمس کو پڑھوایا اور بہت خوش ہوئے اور سب لوگوں کو کمال تعریف و توصیف تر زبان پایا۔ جہاں سبحان اللہ کے سوا کوئی لب نہ ہلاتا تھا۔ (نسخۂ عرشی حواشی ص ۲۴۸)

دہلی اردو اخبار تتمہ ——— (۲۲ مئی ۱۸۵۳ء)

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں مجتمع ہوئے۔ حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شاہزادگان والا تبار بعد باریابی بجز اسب الحکم قضا توام بشرف نشست سے حسب مراتب بمقام معزز و مکرم ہوئے بارہ پر ایک بجے تک حضور اقدس جلوہ فرما رہے۔
(نسخۂ عرشی، حواشی ص ۳۶۷ — ۳۶۸)

اودھ اخبار لکھنؤ[1] ——— (یکم جنوری ۱۸۶۲ء)

"اشتہار طبع کلیات نظم" جناب میرزا غالب دہلوی۔

اک بشارت نئی سنو ہم سے   گوہر آبدار لو ہم سے

ایسا مژدہ سننے میں کسی نے سنا نہیں، وہ سامان کہتے ہیں کہ اب تک ہوا نہیں۔ مرحبا کیسا شاہد شیریں کار آتا ہے۔ مبارک ہو یوسف سر بازار آتا ہے معز عزیز ہر دل عزیز ہے۔ دلبری میں کامل ہے۔ جب مشتاق دوچار ہوں گے نقد تمنا سے خریدار ہوں گے۔ پردے میں جمال کیا دکھائیے۔ اب نقاب چہرۂ سخن سے اٹھائیے۔ آ مژدہ گوش جہاں ہو۔ نزدیک و دور عیاں ہو کہ نواب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر غالب دہلوی کا فارسی کلیات مطبوع ہوا چاہتا ہے۔ نقش دیگر ارباب دل ارام رنگین ادا کا شہرہ ہوا چاہتا ہے۔ اقسام سخن پر مشتمل ہے ہر ایک شعر فرد ہے، عالی مضامین قصائد لاجواب، رنگین غزلیں انتخاب کہ انہیں دیکھ کر ظہیر کا کمال بھول جائیے۔ نظیری کی شوکت کبھی خیال میں نہ لائیے۔ مثنوی کی جادو بیانی میں جائے گفتگو نہیں، سحر حلال زلالی کی اس کے سامنے آبرو نہیں۔ رباعیوں کو پیکر سخن کے ارکان عناصر کہیے، آبدار قطعات کو بے تردد قطعات جواہر کہیے۔ ہر مصرع قد موزوں سے بڑھ کر ہے۔ ہر بیت شاہد معانی کا گھر ہے۔ دس ہزار چار سو کئی اشعار ہیں، کہ سب سلک گوہر شاہوار ہیں۔ خدا کے فضل سے نسخہ بھی وہ صحیح و درست بڑے کتب خانے کا ہاتھ آیا جس کو نواب ضیاء الدین خاں صاحب بہادر دہلوی نے بعد جد و جہد تمام سے جمع فرمایا۔ مقبول آفاق کو تعریف کی حاجت نہیں۔ آفتاب کے صفات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظم کی بے مثالی آشکار ہے۔ عالم کو ان کی استادی کا اقرار ہے۔ اس زمانے میں سحبان ثانی ہیں۔ جواب انوری و خاقانی ہیں۔ ہر لفظ ان کے قلم کا افتراع کمال ہے۔ جو سخن زبان سے نکلا سحر حلال ہے۔ ایسی نادر چیز کہاں میسر آتی ہے۔ کس خوش نصیب کی یہ امید بر آتی ہے۔ دیکھیے ہم در نایاب کے ڈھیر لگائے دیتے ہیں۔ موتی کوڑیوں کے مول لٹائے دیتے ہیں۔ سب کتاب تخمیناً چالیس جز میں چھپے گی۔ بعض مقام مناسب پر تصویر مصنف کھنچے گی۔ شروع طبع میں قیمت بھیجنے والے سہے کو پائیں گے۔ چھپ چکنے کے بعد پورے عشہ مقرر ہو جائیں گے۔ غالباً اہل ہنر سنتے ہی اہتزاز میں آئیں گے۔ چھپنے تو دو بانسوں ہاتھ اٹھالے جائیں گے۔

اشتہار دینے کا یہ سبب ہے۔ صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ درخواست بھیجنے والوں کو اطمینان یکسر رہے گا۔ پہلے ان کا استحقاق مد نظر رہے گا۔ اگر ابھی سے طلب گار ہوں اس کی قیمت کے حصہ دار ہوں۔ فقط

(ص ۱-۲)

---

[1] اودھ اخبار کے حوالے سے مندرجہ تحریروں کے لیے میں محترمی ڈاکٹر محمد حسین ہمدانی صاحب کے لطف و کرم کا شکر گزار ہوں یہ صرف ان کا عطیہ ہیں (دیکھیے)

اودھ اخبار لکھنؤ ——— (۱۲ مارچ ۱۸۶۲ء)

نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

سب جانتے ہیں کچھ حاجت دلیل نہیں کہ آج ہندوستان میں اُن کا عدیل نہیں، فصاحت و بلاغت میں سحبان ثانی ہیں۔ فن شعر میں انوری و خاقانی ہیں۔ زمین سخن کو آسمان پر پہنچایا۔ ہر نقطہ کو اختر اوج معانی بنایا۔ زور فکر اُن کا جہاں میں مشہور ہے۔ نتائج طبع عالی کا آوازہ دور دور ہے۔ جناب جہانیاں ب ملکہ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی ہندوستانی کے لیے اُس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ کیفیت نواب ممدوح نے خود لکھی ہے اپنی کتاب دستنبو میں مفصل بیان کی ہے۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا۔ نظر تورسے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔ وہاں تو ہر کمال کی قدر دانی ہے۔ کھلا ہوا باب فیض رسانی ہے جب فیضیاب سماعت ہوا۔ منظور نگاہ مرحمت ہوا۔ جد ڈال کی طرف ہمت آئی۔ صلۂ شاہانہ دینے پر طبیعت آئی۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی۔ ولایت سے ڈاک پر بھیجکر اس نوید سراپا امید سے خبر دی کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیر تجویز ہے بعنقریب خط اٹھاؤ گے۔ بعد صدور حکم انڈیا گورنمنٹ سے اُس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمین ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوج حوادث نے کل متاع امید کو لوٹا۔ بہتیرے بیگناہ لوں زیر آسیائے ردوں پسے۔ جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا کیا انجام ہوا کہ ہر مقصد بھی ناکام ہوا۔

نواب صاحب کا وہ معاملہ گویا خواب تھا ع "جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا"۔ عجب نہیں کہ پرورش سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالت یاس میں لطف حسن دانی سے امید بر آئے۔

اس تقریب میں ایک ذکر اندسینے کہ ان دنوں جب تعزیت شاہزادۂ عالی پایہ گا عالمگیر تھی دہلی میں ایک ورق بخط انگریزی لکھا ہوا اور اس کے ساتھ دو سادہ ورق سادہ پیشگاہ حکام سے شاہیرشہ کے پاس پہنچا۔ ہر ایک نے اپنا نام لکھدیا۔ نواب صاحب (غالب) نے اس راہ سے صاحب سخن ہیں مدح سرائے حضرت ملکۂ زمن ہیں، یہ شعر بدیہہ کہا ہوا لکھ کر مہر کر دی:

شاہ عالی گہر دگوہر پاکش صد حیف ——— دیگہ ناچار سپردند بخاکش صد حیف (ص ۱۸۵)

اودھ اخبار لکھنؤ ——— (۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء)

ہندوستان کی سمجھ

افغانستان کا روز نامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ مخالف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال از سکے سنتے سنتے کان بھر گئے۔ کسی امر کا ظہور رہا یا افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان کیا کیا قلعے ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے بانا منصوبا باندھے۔ تو پلے اٹھا ہے محض اپنے گمان پر سیکڑوں قیاس نکالتے۔ اے بے فکرو! خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے۔ جنجھنا وقائع نگار ان انگریزی کو کون سنا کرتا ہے۔ کیا کریں جب صاحبوں کو ایسے اخبارات سے ملو یاتے ہیں تو ہم بھی حسب ضرورت کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپواتے ہیں،

آج کل دانائے روزگار، مرکز الوالابصار، ارسطو فطرت، افلاطون فطنت، جناب والا شان، عالی مناقب، مرزا اسد اللہ خاں غالب نے جو عکس سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے، استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے۔ انہوں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمون خیالی سے تو اسد جا ایک تقریر فرمائی۔ ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں۔ بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کش ناظرین مشتاق ہوا کریں گی۔

نثر

یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کہ فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان

کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں بھری ہوئی کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور یہ اُس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ طرف رفاہ رعیت کے ہے۔ اُدھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے۔ بفرض محال اگر اُس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ جائے انصاف ہے۔ جن سعید من اللہ حاکموں نے اپنی فوج باغی لشکر اپنے حسن تدبیر و جرأت بخشش سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوج جرار و لشکر بے شمار ساتھ ہے مخالف کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔ ہندو مسلمان جو اہل ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں۔ وہ اپنی سلامت و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں۔ غلہ پاکیزہ سستا آج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی سرعت کو دیکھیں، تار برقی میں پیام کے پہنچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواج علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں، حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں، ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے، بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے، وہ احمق ہے جو نا قدر دان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخشنود ہے، حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی منظور بہر صورت ہے؛ اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پہنچے تو یہ اُس شخص کی خوبی قسمت ہے آدمی رحمت خاص کو نہ دیکھے رحمت عام پر نظر کرے۔ اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے، امن و اماں کا طالب بخت و قسمت کا شاکی۔ غالب۔ فقط　　　(ص ۲۸۱)

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۱۴ مئی ۱۸۶۲ء)

خیال خیر مآل رعنا

مکرم خاکسار صاحب اودھ اخبار سلامت

آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۲ اپریل سنہ رواں صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم حضرت استادی جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی دام اقبالہم کی درباب تمہید و تنبیہ عوام و کج فہماں ہند میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں با افغانان میں عام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں۔

بہ تقویت مضمون خیر اندیشی جناب مرشدنا و استادنا حضرت غالب دام فضلہم بابت تنبیہ ابلہان نسبت شہرت جنگ اہل ایران با افغانان اتنا کہ تحریر جناب ممدوح کی حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم و محکوم ہے، اس لیے اس کو منتج نتائج خیر و عافیت عام خیال کر کے اس مطلب بالا ضمیر کو بھی حتی الوسع بسیط کرنا سعادت جان کر واسطے مزید تنبیہ خواص و عام عرض کر کے عارض ہوں کہ آپ بوسیلہ اندراج اخبار گوہر بار خود بدگمان خام خیالان کو متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمائیے گا

اودھ اخبار لکھنؤ ـــــــ (۲۴ ستمبر ۱۸۶۲ء)

جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم

آپ کے اخبار ۱۰ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر اور میں مندرج ہے کہ مہاراجہ الور کے جنگل سے ایک شیر کو گڑھے میں قید کر کر کئی روز گرسنہ کر کے جب وہ شور سے بلند ہا پنجرہ آہنی میں گرفتار کر لائے

اسے صاحب مہاراجہ صاحب تو والی ملک اور صاحب اقبال ہیں وہ اگر شیروں کو اگر چاہیں تو گوسفند سے گرفتار کرا منگا دیں۔ انہی کے رعب عدل سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں پھر اُن کو شیر کیا حقیقت ہے۔ میں اس پر ایک ذکر عجب نیز اور فسانہ حیرت انگیز گرفتاری زندہ شیر کا بے سر و سامان

میں ایک [illegible] صاحب نے کہ اُس وقت تحصیلدار کوہ مری دارالقرار گورنمنٹ پنجاب کے تھے اور اب ایک سرکار
پنجاب میں اہلکار ہیں خود ایک شیر ژیان جنگل کوہ مری سے زندہ یوں گرفتار کیا تھا کہ شیروں کا ایک چھوٹا سا صندوق کے طور کا فقط اسی قدر کا بنایا کہ شیر
اس میں سما سکے اور شکار لگا دیا تھا۔ ایک شیر مردم خور اس میں پھنسا تھا لاکھ کی سو آدمی کا خان صاحب کے ساتھ اس علاقے کے جو تھے ایک یار پاس جانے تک نہ ہوا اور ان شیر دل جوانوں نے رسّا ڈال اس کے
اور پیر کر رسّے سے پھنسا لیا اور تھے اس کے منہ سے ہٹا کر خود ایک چوبی صندوق میں گرفتار کر کر قید کر لیا۔ اس وقت شیر کا گرج اور شور و غوغا کوسوں تک آدمیوں
کے زہرے کو آب کرتا تھا اور لطف یہ کہ جس دن شیر لگا اسی دن اس شجاعت خداداد اور جرأت سے اُس کو گرفتار کیا۔ اور وہ چار ماہ پالا پھر قضا سے مر گیا۔

یہ بات طشت از بام اظہر من الشمس ہے وہ شیر بڑے سے قد کا تھا۔ خان ممدوح سے صرف شیر کا پکڑ لانا اس لیے کچھ بعید نہ تھا کہ ان کی شجاعت کئی وقت
بظہور میں آ چکی ہے۔ یعنی جب وہ اٹک کی حدود پر تحصیلدار وغیرہ ہے تو ملک باغی اور ملک آفریدی سے صرف جریدہ جا جا کر بہت سے خونی اشتہاری مسلح بہادر
پکڑ پکڑ لائے اور ہزارہا روپیہ سرکار انگریزی سے انعام پایا۔ فی الحال میں بھی بخیر خواہی سرکار وہ سینہ سپر ہے۔ کوہ مری کے بغاوت و فساد میں جب کہ وہ
دوسری تحصیل میں تھے کوہستان میں جا کر دافع فساد رہے۔ غرض شجاعت اور جرأت و دلیری بھی ایک بڑی نعمت خداداد ہے اور جبلی ہے کچھ اختیاری نہیں اور
امیر غریب پر بھی منحصر نہیں ہے۔ الغرض خان ممدوح بھی اسم بامسمیٰ ہیں اور حق بجانب مرد کی صفت ہی مردانگی ہے۔ فقط   راقم بندہ اسد اللہ

مفصلات دہلی —— (مارچ ۱۸۶۸ء)

CORRESPONDENCE

Our columns are open to all but we do not hold ourselves responsible for any thing that appears in our correspondence-- Ed. Mof.

TO THE EDITOR OF THE MOFUSSILITE.

Dear Sir,

You have, I observe, in your issue of the 30th instt., taken notice of the liable case now under enquiry before the Assistant Commissioner, Delhi, in which Mirza Asadullah Khan alias Mirza Nausha Ghalib, the most celebrated Persian Scholar and the Poet laureate of India, is plaintiff.

The following are some further particulars relating to the same; they will, I hope, be interesting to your readers and expose at the same time the acts of injustice to which people in the Punjab are subject. The small army of Maulavis and Munshis, alluded to in your issue, consists of Lala Piaare Lall, Headmaster Delhi Normal School and secretary Delhi Literary Society; Hakim Latif Husain, first Oriental Master Delhi Collegiate School, and Maulavi Nasiruddin, first Oriental and Mathematical Master, Delhi Normal School; Hookum Chand, the famous Essayist and Persian scholar of Delhi. Maulavi Ziyauddin, Assistant Professor of Arabic, Delhi College

and several others of less note. The first four gentlemen appeared as witnesses on the part of the plaintiff, the rest on that of Defendant. The evidence for prosecution was taken on Monday the 20th instant; of the witnesses for the defence; only one, Maulavi Ziyauddin was examined on Tuesday when a curious instance of partiality was shown him by the court. Some interested party, said to be an "awarda"? of the presiding Magistrate, whispered in his ear that Maulavi Ziyauddin was the most respectable and learned of all the witnesses, and requested the Magistrate to give him a chair on the dais next to himself, while taking his evidence. This was done, although a practice followed nowhere but in the court of the Assistant Commissioner, Delhi. As far as my knowledge of law and the practice of Indian courts, is, no witness ever so respectable, can be allowed to remain seated while giving his deposition. "Nek Hairanam vo sakht parishan," What rule does the Assistant Commissioner observe in that respect? The witness, to whom injustice and a gratitous insult has been offered by this concession to Maulavi Ziyauddin, holds a very respectable position in society, was honoured with a seat at the Durbar of His Honour the Lieutenant Governer of the Punjab and took precedence of the gentleman to whom such marked favour has been shown; and although not a very good Persian Scholar, he is in every other respect deserving of greater consideration.

I refrain at present giving you the evidence so far as it has been recorded, since the case will be resumed on Monday next. As soon as the evidence is concluded and judgement delivered, I will furnish you with the whole misl for publication.

In conclusion I would suggest that the opinion of Major Lees or any other European Orientalist be taken as to the proper interpretation of the defamatory passages printed and published in the work entitled the "Qateh-ul-Qateh." (Sic.)

Yours truly,

March, 1868 — IXION

[اکم]ل الاخبار دہلی —— (۶ مئی ۱۸۶۸ء)

[illegible] حضرت ممدوح [illegible] کی تصویر [illegible] کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کی ہے۔ پس جو صاحب کہ یہ شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ [illegible] کے ٹکٹ [illegible] کے نام اکمل المطابع دہلی میں [illegible] ان کی خدمت میں مرسل ہوگی۔

([illegible] ص ۲۹)

ل الاخبار دہلی ــــــــــ (۲ر ستمبر ۱۸۶۸ء)

تہنیت

بفضل الٰہی ۲۶ ر ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے۔ جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت کے ہاں فرزند پیدا ہوا، گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک دوش ستارہ چمکا حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ماہ رخشندہ اور اختر تابندہ کو اوج عزت اقبال میں طلوع آفتاب قیامت پر نور ضیا گستر رکھے ......

جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط دیدہ فہمید کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے ہم بہ افزائش رونق اخبار وہ رباعی اور قطعہ لکھتے ہیں۔

رباعی

حق داد بہ سید ازپی انعامش ۔۔۔ فرخ پسری کہ داجبست اکرامش

تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش ۔۔۔ ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

قطعہ

۱۲ ۸۵

غالب حال سنین ہجری ۔۔۔ معلوم کن از خجستہ فرزند

چوں یکصد و بست و چار ماند ۔۔۔ انیست شمار عمر دلبند

غور کی جائے کہ جب خجستہ فرزند سے ۱۲۸۵ عدد لیے جائیں تو ایک سو چوبیس باقی رہتے ہیں۔ اس کو بطریق دعا مولود کی عمر قرار دی ہے؟

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

ل الاخبار دہلی ــــــــــ (۲۸ر اکتوبر ۱۸۶۸ء)

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب ہے۔ مہتمان اخبار بلاد ہند سے عموماً عرض کرتا ہے کہ یہ فقیر کا استغاثہ از روئے ل الاخبار اپنے صحائف میں درج فرما کر مجھ کو اپنا ممنون فرمائیں؟

استغاثہ غالب

کئی ہفتے پہلے ایک خط لکھنؤ سے بسبیل ڈاک انگریزی بصیغہ بیرنگ میرے نام آیا راقم عبد اللہ رئیس و معافیدار ـــ یہ نہیں مرقوم کہ رئیس و معافیدار کہاں کا ـــ بہر حال محصول دے کر میں نے خط کو لیا اور پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کہ تو نماز نہیں پڑھا کرتا۔ خبردار نماز پڑھا کر اور اگر نماز نہ پڑھا کرے گا تو بعد مرنے کے صورت بن جائے گا۔ کل پنجشنبہ کے دن ایک اور خط بیرنگ آیا۔ سرنامہ پر یہ عبارت مرقوم "انشاء اللہ لفافہ ہذا ابتمام در شہر دہلی رسیدہ بملاحظہ اقدس جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب مشرف باد مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ بیرنگ تاریخ ۲ ر رجب ۱۲۸۵ ہجری روانہ شد" مضمون بعینہٖ یہ کہ نماز پڑھا کر ورنہ بعد مرنے کے صورت ہو جائے گی سلام علیک نام نامہ رفتہ مرسلہ مظہر علی از مارہرہ ضلع ایٹہ سرکار خود تمام ہوا۔ اب فقیر مکتوب الیہ کہتا ہے کہ پہلے خط میں میں نے عبد اللہ کا اسم فرضی سمجھ لیا تھا مگر اب جب دوسرے خط میں اس توضیح سے کاتب کا اسم و مقام لکھا ہوا ہے کچھ شک و شبہ باقی رہے۔ آپ کے جیب میں جو ہر دو شی پہلا بعد دلیل کے مفہوم پر عمل کر کے چپ ہو رہتا ہوں مگر یہ حافظ کا شعر جواب میں لکھتا ہوں ؎

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش ۔۔۔ ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت

یہ دوسرے شخص صاحب تام دوستان ہیں۔ اخبار میں دیکھ کر کچھ لیں گے۔ شاید وہ پہلے صاحب بھی کسی اخبار میں شاہدہ فرمائیں؟

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اکمل الاخبار دہلی ــــــ (۱۴ اپریل ۱۸۶۹ء)

"اشتہار کتاب اردوئے معلیٰ۔

جو کچھ کہ ریختہ کہیں لکھو رشک فارسی گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

"فرزندگان والا اتحار و شائقان پاک گوہر مژدہ ہو کہ نا طورہ معانی نے جلوہ دکھایا، شاہد سخن نے نقاب چہرے سے اٹھایا، گلستان فصاحت نے خوبی و نضارت پائی چمنستان بلاغت میں بہار آئی یعنی حصۂ اول نسخۂ دلپذیر و کتاب بے نظیر "اردوئے معلیٰ" منشآت زبدۃ الفصحاء عمدۃ البلغاء جناب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر مرحوم غالب کہ جس کا ہر ورق حدیقۂ تحفۂ پسندی و ہر صفحہ ریاض دلگستری ہے اکمل المطابع دہلی میں بہ تصحیح و تنقیح احقر العباد چھپ کر تیار ہو گیا ہے۔ یہ کتاب خصوصاً واسطے طلباء مدارس کے ایک عمدہ دستور العمل زبان دانی اور عموماً ہمہ مشتاقین و محققین زبان اردو کے سرمایہ فصاحت و طلاقتِ لسانی ہے مضامین طبعزاد و الفاظ عبارت سے خود ایک معلم بے بدل اور استاد کامل ہے۔ غرضکہ بہتر اس سے زبان اردو میں کوئی کتاب ہاتھ نہ آئے گی۔

چار جلدیں اس شہر میں ہاتھوں ہاتھ اکثر متاع روئے دست خریداران خرد مند ہو گئیں۔ بااینہمہ قدر و قیمت اس کی زیادہ قرار نہیں دی گئی۔ حجم اس کا ۲۹ جز ہے اور کاغذ ۲۰ ۲۶ پر بہت خوشخط منطبع ہوئی ہے لہٰذا جن صاحب کو اس صحیفۂ دانش و آگہی کی خریداری منظور ہو دو روپیہ بابت قیمت کتاب اور ۳ محصول ڈاک کے ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

"المشتہر سید فخر الدین مہتمم اکمل الاخبار دہلی۔

"محبان کرم گستر یعنی وقائع نگاران ہم عصر سے امید ہے کہ براہِ عنایت اشتہار مرقومہ بالا کو اپنے اخبار گوہر بار میں درج فرما دیں"

(ماہ نو جولائی ۱۹۵۲ء)

اخبار عالم میرٹھ ــــ (۲۲ اپریل ۱۸۶۹ء)

عود ہندی

یہ کتاب لطافت مآب بہ زبان اردو نثر جس میں اکثر خطوط اور مضامین مختلف لاجواب پایہ کتاب لکھے ہیں جناب اسد اللہ خاں صاحب غالب مرحوم کے نتائج فکر سے ہے، جس کا مطالعہ واسطے صفائی اور مشق زبان اردو کے مفید اور کارآمد مطبع مجتبائی واقع میرٹھ میں صاف اور خوشخط ...... ۱۸۸ صفحے کی چھپی ہے قیمت اس کی ایک روپیہ اور محصول ڈاک تین آنے ہیں۔ (اردوئے معلیٰ غالب نمبر جلد دوم)

مطبوعات موصولہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کچھ پرانے خط: جواہر لال نہرو کے نام آئے ہوئے مشاہیر سیاست و ادب کے خطوط کا ایک انتخاب ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے خطوط شامل تھے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اسے خود پنڈت جی نے مرتب کیا ہے۔ ان خطوط میں سے بیشتر خط مرتب ہی کے نام ہیں مگر کہیں کہیں استثنا بھی برتا گیا ہے یعنی کچھ خطوط موتی لال نہرو کے نام اور کچھ موتی لال کے دوسروں کے نام بھی شریک ہیں۔ اسی طرح مرتب نے چند اپنے خطوط بھی شامل کرلیے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کی شمولیت دوسرے خطوط کو سمجھنے میں مدد و معاون ہوگی۔

یہ مجموعہ نہ صرف اس لیے اہم ہے کہ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کے خط شامل ہیں، بلکہ اس اہمیت کی وجہ یہ بھی ہے کہ خود ان کے مکتوب الیہ کی شخصیت، جدوجہد آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں ترین حیثیت کی ہے۔ نیز اس مجموعے کی قدر و قیمت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ خطوط جس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی پیچ در پیچ سیاست کو اتنی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کوئی اور مواد پیش نہیں کرسکتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے اپنی روایات کے مطابق یہ تحفہ اردو ترجمے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ دو حصوں میں شائع ہوا ہے اور ہر حصے کی قیمت ۸ روپے ہے۔ جو کتاب کی باطنی خوبیوں کے علاوہ سفید نفیس کاغذ صاف ستھری طباعت اور مجلد ہونے کی وجہ سے بہت معقول ہے۔ اس کے مترجم مولانا عبدالمجید حریری مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت رواں اور شستہ اردو میں خطوں کا ترجمہ کیا ہے۔ مگر کیا اچھا ہوتا کہ آخر میں انڈکس بھی ہوتا تاکہ اسے حوالے کے طور پر استعمال کرنے والوں کو مطالب کی تلاش میں دشواری پیش نہ آتی۔

اردو ڈائجسٹ لاہور: اردو میں یوں تو کئی ادبی ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں اور سب دل چسپ اور کامیاب ہیں مگر خالص معلوماتی نقطۂ نظر سے ایک ڈائجسٹ کی کمی بار بار محسوس ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کا رسالہ مرتبین سے جس لگن محنت اور سلیقہ مندی کا مطالبہ کرتا ہے وہ بجائے خود حوصلہ شکن ہے لیکن اب لاہور سے چند نوجوانوں نے ریڈرز ڈائجسٹ کو نمونہ بنا کر اردو ڈائجسٹ جاری کیا ہے۔ اس رسالے کی کامیابی کا یہی ایک ثبوت کیا کم ہے کہ دو سال کے مختصر وقفے میں اس کے عام شماروں کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ گزشتہ نومبر میں اردو ڈائجسٹ نے اپنی دوسری سالگرہ پر ایک خاص نمبر شائع کیا تھا جو خاصا متنوع اور دلچسپ رہا۔ ہماری طرف سے اس ماہنامے کے مطالعے کی پرزور سفارش کی جاتی ہے اس لیے کہ اردو رسائل میں حسن صورت اور سیرت دونوں کم نظر آتے ہیں اور یہ اردو ڈائجسٹ ان گنتی کے رسائل میں ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔

بچوں کے لیے نظمیں: ننھے منوں کے لیے جن لوگوں نے لکھا ہے ان میں جناب شفیع الدین نیر کا نام بہت ممتاز ہے۔ نیر صاحب نے بچوں ہی کی ہلکی پھلکی زبان میں شاعری کی ہے، اور موضوعات کے انتخاب میں بھی بچوں کی نرم و نازک طبیعت اور معصومانہ دلچسپیوں کو سامنے رکھا ہے۔ وہ بچوں کو جو کچھ دیتے ہیں اس میں بچپن کی شوخیاں سمٹ آئی ہیں یہی وجہ ہے کہ نیر صاحب بچوں کے مقبول اور محبوب شاعر ہیں اس وقت ہمارے پیش نظر جو کتابیں ہیں ان کے نام یہ ہیں:

ہماری نعت۔ وطنی نظمیں۔ منی کا تحفہ اور بچوں کا کھلونا۔

ہر ایسے گھر میں جہاں بچے ہوں، ان کتابوں کو بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کتابوں میں وقتی تفریح ہی نہیں اصلاح اخلاق و عمل کا مقصد بھی کارفرما ہے۔

ملنے کا پتہ: نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی

نذرِ وطن: ہندوستان کی قومی تحریکات میں اردو ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ جنگ آزادی کا سب سے اہم نعرہ "انقلاب زندہ باد" اردو ہی کی دین ہے جس نے مخالف طاقتوں کے قدم اکھاڑ دیئے اور آج بھی جوش و ولولے کا عظیم نشان ہے۔ چین کی حالیہ جارحانہ یورش نے ہر ہندوستانی کو متاثر کیا۔ اس ہنگامی موضوع پر کہی گئی اردو نظموں کا ایک مجموعہ مرتبہ داود آفریدی بلوری بک ڈپو بمبئی نے شائع کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرتب نے دو چار کو چھوڑ کر ساری اہم نظمیں شریک کرلی ہیں۔ ضرورت تھی کہ انتخاب کچھ اور کڑا ہوتا تاکہ بعض کمزور نظمیں در آنے نہ پاتیں۔ پھر بھی اس انداز کی کتابوں کو خریدنا چاہیے اس طرح قومی خیالات کی تجدید و تقویت ہوتی ہے جو کہ ملک کی ترقی اور اس کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔

ایڈیٹر پبلشر نے [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر نگار رکیبرگنج رام پور یوپی سے شائع کیا۔

رامپور رضا لائبریری کی مطبوعات

عرشی: غالب کے اردو دیوان کا یہ ایڈیشن اپنی تاریخی ترتیب مقدمے اور حواشی کے لحاظ سے ایک اہم بالشان کارنامہ ہے۔ تحقیق و ترتیب کے فن میں اردو کا سر بلند کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساہتیہ اکیڈیمی نے اسے ۱۹۶۰ء کی اہم ترین اردو کتاب قرار دیتے ہوئے ایوارڈ دیا۔ (طباعت ٹائپ۔ قیمت ــــ ۲۰ روپے (مجلد)

درات شاہی: شاہ عالم ثانی کا اردو اور ہندی کلام جو تاریخ زبان کے مدونین کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔ مغل بادشاہوں کی مت زبان کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا عرشی کے تفصیلی مقدمے نے اس کتاب کی اہمیت اور اس دور کی تاریخ کو جس عالمانہ از میں پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۸ روپے (مجلد)

قائع عالم شاہی: کنور پریم کشور فراقی کا روزنامچہ جس میں شاہ عالم کے عہد کی نوادر معلومات درج ہیں۔ افراتفری کے دور کی ک اہم تاریخ ہے۔ مولانا عرشی کے مقدمے اور حواشی نے مزید سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ تاریخ ہندوستان کا طالعہ کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۸ روپے (مجلد)

سلک گوہر: انشا کی بے نقط کہانی جو خود انشا کی صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو نثر کے کلاسکی نمونوں میں اس کتاب کو ک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کتاب کا تعارف بھی مولانا عرشی ہی کے قلم سے ہے اور اسے بھی ان کی دوسری کتابوں کی طرح ظاہر و باطن کی تمام خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ــــ ۳ روپے (مجلد)

متفرقات غالب: مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اس کتاب میں ادیب صاحب نے غالب کی بہت سی نظم و نثر کی ایسی تحریریں جمع کر دی ہیں جو اس سے پہلے کبھی اور شائع نہیں ہوئیں۔ غالب سے متعلق لٹریچر اس کتاب کے بغیر نامکمل رہیگا۔ (طباعت ٹائپ) قیمت ۔ ۵ روپے (مجلد)

اوراق گل: مرتبہ نسیم احمد ہاشمی، ریاست رامپور کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں کا انتخاب جو بہترین آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ شاعر کی تصویر اور حالات زندگی نے اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جوش، جگر، دانش، اختر شیرانی جیسے دو درجن سے زائد شاعر اس میں شریک ہیں۔ یہ تذکرۂ شعرا اپنے اہتمام طباعت اور حسن ترتیب کے لحاظ سے مثالی ہے۔ قیمت ــــ ۱۵ روپے (مجلد)

رامپور انتھالوجی: یہ کتاب مشرقی شعرا کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ جسے انگریزی کے مشہور شاعر جے اے چیپ مین نے ترتیب دیا۔ حافظ، سعدی، غالب، خیام اور عرشی کے کلام کو جس خوبی سے انگریزی نظم میں منتقل کیا گیا ہے وہ لائق داد ہے اس لیے کہ نزاکت بیان مجروح نہیں ہونے پائی۔ قیمت ــــ دس روپے (مجلد)

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یو پی

REGD. NO. A—464
NIGAR, URDU MONTHLY, RAMPUR U.P.
REGISTERED WITH THE REGISTRAR OF NEWSPAPERS AT R.N. NO. 2136/57
JUNE 19

اگست ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

سالانہ چندہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
ایک روپیہ

آپ کا دل نہ آجائے تو پھر کہئے
بیوٹی سوپ
آپ خود ہر ایک سے کہیں گے کہ بیوٹی
ٹائیلیٹ سوپ جلد کے لئے تازگی
بخش ہی نہیں بلکہ تسکین کا سامان
بھی ہے
تین حسین رنگوں میں اور دلفریب خوشبو میں
ہر جگہ ملتا ہے
Beauty
ZULFIQAR INDUSTRIES LTD
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹیڈ

معتبر آدمی
کی
معتبر نشانی
THE MUSLIM COMMERCIAL BANK LIMITED

رجسٹرڈ نمبر ایل ـــــ ۲۳۵۲

اگست ۱۹۶۳ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری ـــــ عارف نیازی

زرِ سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
ایک روپیہ

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف ایجی ۔ بی ۳۶۶۹ ۔ ۶۸ / ۶۲ محکمۂ تعلیم کراچی

پرنٹر، پبلشر، ایم عارف نیازی نے مشہور آفسٹ پریس سے چھپوا کر ادارۂ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا
چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہوگیا

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ: ــــــ نیاز فتحپوری

۴۲ واں سال	فہرست جولائی، اگست ۱۹۶۳ء	شمارہ ۷-۸

ملاحظات

نگار کا آئندہ لائحہ عمل

نیاز فتحپوری

سالنامہ نگار (نیاز نمبر) کے دونوں حصے خدا خدا کرکے آخر کار شائع ہو ہی گئے۔ "خدا خدا کرکے" اس لئے کہ ان کی ترتیب، کتابت اور طباعت کے جن دشوار گزار مراحل سے "ادارۂ نگار" کو گزرنا پڑا وہ ایک طویل داستان ہے، ان تلخ تجربات کی، جو ہر چند میرے لئے بالکل نئے، لیکن یہاں کے حالات کے لحاظ سے غیر متوقع نہ تھے۔

جولائی کا "نگار" لکھنؤ سے نکال کر جب ۳۱ جولائی کو میں کراچی آیا تو یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ اشاعت "نگار" کا تسلسل بدستور قائم رکھا جائے (چنانچہ اگست اور اس کے بعد کے پرچے یہیں سے شائع بھی ہوئے) آئندہ سالنامہ کے موضوع کا کوئی تصور میرے سامنے نہ تھا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ جنوری ۶۳ء کا سالنامہ اپنے وقت پر شائع ہو، لیکن اس ارادہ کی تکمیل تقریباً بہت دشوار تھی۔ کیونکہ ابھی تک مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں اپنے آپ کو یہاں کا "مسافر" سمجھوں یا "مہاجر"۔ سفر تو خیر میرے اختیار کی بات تھی، لیکن اس کو "ہجرت" قرار دیا جانا یہاں کے ارباب حکومت کی مرضی پر موقوف تھا۔ بہرحال دو مہینے تو اسی غیر یقینی حالت میں بسر ہوگئے اور جب فی الجملہ اس طرف سے اطمینان ہوا تو پھر سالنامہ "نگار" کا سوال سامنے آیا۔ لیکن اس وقت جب نومبر ۶۲ء کا "نگار" پریس جا چکا تھا اور سالنامہ کی ترتیب کے لئے خواہ اس کا موضوع کچھ ہو کم از کم چھ ماہ کی مہلت ضروری تھی۔ ظاہر ہے کہ چارۂ کار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سالنامہ کی اشاعت کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے۔ لیکن میرے عزیز و مخلص دوست جناب فرمان فتحپوری، جو اعزازی طور پر ادارہ "نگار" میں شامل ہو چکے تھے، مجھ سے متفق نہ ہو سکے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ حسب دستور سابق سالنامہ نگار ضرور شائع ہوگا۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن جب انھوں نے اس کا موضوع "نیاز نمبر" تجویز کیا تو میں چونک پڑا۔ کیونکہ خود ادارہ "نگار" کا میری زندگی ہی میں "نیاز نمبر" شائع کرنا کچھ عجیب سی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ فرمان صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا ہو (گو اس کا اظہار کبھی نہیں کیا) کہ مجھے اب زیادہ جینا نہیں ہے اور میرے بعد میری زندگی کے حالات بتانے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔

ایک سبب میری مخالفت کا یہ بھی تھا کہ یہ کام کافی وقت چاہتا تھا اور جنوری ۶۳ء تیزی سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ لیکن فرمان صاحب ذرا ضدی قسم کے انسان ہیں۔ انھوں نے میری خواہش، میرا اندیشہ اور میرا مشورہ سب نظر انداز کر دیا اور کام شروع ہوگیا لیکن بعد کو یہ کام اتنا پھیل گیا کہ وہ اسے جلد سمیٹ نہ سکے اور سالنامہ دو حصوں میں شائع کرنا پڑا۔

عمیر احباب و قارئین "نگار" کا عرصہ سے تقاضہ چلا آ رہا تھا کہ میں اپنے سوانح زندگی قلمبند کر جاؤں لیکن چونکہ میرے سوانح "تقریباً نگار" ہی کے سوانح ہیں، اور ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ گویا نصف صدی کی داستان چھیڑ دینا ہے اس لئے میں ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ "تا کے خواہم فشردن ایں دامن نمناک را" لیکن اب فرمان صاحب نے میرے پیراہن زندگی کے اس دامن کو جس کا تعلق نگار سے تھا، پوری طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔ (فرشتے وضو کریں یا نہ کریں) اور اب صرف دوسرا دامن باقی رہ جاتا ہے جس کا تعلق میرے ذاتی سوانح سے ہے اور میں اسے بدستور "نمناک" رکھنا چاہتا ہوں

فرمان صاحب نے اس کام کو کیونکر شروع کیا، کس طرح آگے بڑھایا اور کتابت و طباعت کی دشوار گزار منزلوں سے کس طرح گزرے اس کی تفصیل وہ اور عارف نیازی بتا سکتے ہیں۔ مجھے اس کا علم نہیں اور نہ میں اسے جاننا چاہتا ہوں لیکن یک لطیفہ اور ایک المیہ کا ذکر ضروری ہے۔ جس وقت فرمان صاحب نے متوقع مقالہ نگاروں کی فہرست تیار کر کے مجھے دکھائی تو میں نے بعض ناموں سے اختلاف کیا۔ کیونکہ یہ وہ مذہبی حضرات تھے جن کے حضور میں مجھے "محض کافر مطلق" اور "نگار" کو "صحیفۂ الحاد" ہونے کا اختصاصی شرف حاصل ہے اور وہ کسی حیثیت سے بھی میرا نام سننا یا لینا گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن فرمان صاحب نہیں مانے اور انھیں بھی لکھنے کی دعوت دے دی۔ ان میں ایک میرے قدیم کرم فرما جناب مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے جنھوں نے کوئی مضمون تو نہیں بھیجا لیکن ایک لطیفہ ضرور عنایت فرمایا۔ لکھتے ہیں:-

"ایک نیاز مند کی فرمائش مدیر صدق سے کہ وہ مناقب نگار و نیاز پر کچھ لکھے۔
ستم ظریفی کا شاہکار ؟
عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب ــــــ !
فرمان کی تعمیل میں بس اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ نیاز صاحب سخن سنج اچھے ہیں،
شعر کی پرکھ خوب رکھتے ہیں۔ اور صاحب طرز ادیب ہیں۔"

حیرت ہے جناب دریابادی نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ فرمان ان سے مناقب نگار و نیاز کے متمنی تھے انھوں نے تو "نیاز نمبر" میں ہجویات ہی کا باب بڑھانے کے لئے عبدالماجد صاحب کو تکلیف دی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ فرمان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اور تحقیر نیاز کا کالم بدستور خالی رہا۔ اس خط میں لطیفہ کی جو بات ہے وہ بھی سن لیجئے۔

جس وقت میں "من و یزداں" مرتب کر رہا تھا۔ تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس میں کسی کا پیش لفظ بھی شامل کر دیا جائے۔ حالانکہ اس وقت تک میں نے اپنی کسی کتاب پر کسی سے مقدمہ یا پیش لفظ لکھوانا پسند نہیں کیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات گرامی سامنے آ گئی اور میں نے ان کو ایک خط لکھا کہ

"بڑا کرم ہو اگر آپ من و یزداں پر مختصر سا پیش لفظ لکھ دیں"

اس کے جواب میں انھوں نے وہی مصرعہ تحریر فرمایا جو اب فرمان صاحب کے خط کے جواب میں دہرایا گیا ہے۔

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب!

میں نے جواب میں مولانا کو لکھا کہ

آپ نے میری درخواست کا مفہوم صحیح نہیں سمجھا۔ میری مراد پیش لفظ سے یہ تھی

کہ آپ "من ویزدان" یا مصنف "من ویزدان" کی تعریف
کریں۔ بلکہ چاہتا یہ ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد آپ جتنی
گالیاں مجھے دینے والے ہوں وہ سب لکھ کر اکٹھا بھیج دیں تاکہ میں
پہلے ہی ایڈیشن میں شائع کردوں اور آپ دوبارہ غم و غصہ کھانے سے بچ جائیں"

لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے نہ خط کا جواب دیا اور نہ کوئی قصیدۂ سب و شتم لکھکر بھیجا کہ میں اسے نوشتۂ آخرت سمجھ کر "من ویزدان" میں شامل کردیتا۔

اب المیہ کی روداد سُنیئے۔

فرمان صاحب نے باوجود میری مخالفت کے ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی خط لکھا اور جس کا جواب ان الفاظ میں موصول ہوا

"آپ کا عنایت نامہ ملا۔ میری صحت آج کل اتنی خراب ہے کہ اپنے
بہت ضروری کام بھی انجام دینے سے قاصر ہو رہا ہوں اس لئے تعمیل ارشاد
سے معذور ہوں"

عبدالماجد صاحب نے تو خیر اپنے خط میں ایک جگہ میرا نام بھی لے لیا ہے لیکن ابوالاعلیٰ نے تو یہ بھی گوارا نہ کیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ بھی مجھے کافر و ملحد سمجھتے ہیں، حالانکہ اب سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ ابوالاعلیٰ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر دونوں کا طویل زمانۂ تعلّم (عجب دام ہمرنگ زمیں بود) اسی کافر و ملحد کی صحبت میں بسر ہوا ہے اور سب سے پہلے نگار ہی نے انھیں روشناس خلق کیا — ہو سکتا ہے کہ بھوپال کی وہ رنگین شامیں جب تاج محل کے تالاب میں وہ اور میں دونوں ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر پانی سے کھیلتے ہوئے گزر جایا کرتے تھے انھیں فراموش ہو گئی ہوں اور شب و روز کے علمی و ادبی مذاکرات جن سے ان کے ذہن کی تعمیر ہو رہی تھی ان کے دل سے محو ہو گئے ہوں لیکن میں اس لطیف زمانہ کی یاد کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اور اس وقت بے اختیار مجھے مومن کی ایک مشہور غزل یاد آرہی ہے —————— (ابوالاعلیٰ کو "یاد ہو کہ نہ یاد ہو") مجھ کو ابوالاعلیٰ (مولانا مودودی نہیں) اب بھی اسی طرح عزیز ہیں اور غالباً ہمیشہ رہیں گے۔

دوست بودی شکوہ سر کردم ولے جرم تو نیست
کایں ہمہ بیداد بر من از دل تنگ من است

نیاز نمبر میں دوسرے جن احباب نے شرکت کی ہے ان کا شکریہ ادا کرنا جبکہ میں اس سے صحیح معنے میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے میں اس منزل سے سر اعتراف جھکا کر خاموش گزر جانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ تاہم جناب قیصر ابن حسن (لائبریرین لیاقت لائبریری) کی سعی بلیغ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جنہوں نے نگار کے تمام فائلوں کے غائر مطالعہ کے بعد ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کے تمام اداریوں کا مفصل اشاریہ مرتب کرکے میری اور نگار دونوں کی زندگی کا عطر نکال کر رکھ دیا۔

بالکل اسی انداز کی دوسری کاوش عزیزہ کا رث نیازی کی ہے جنہوں نے تمام مطبوعات پر میرے تبصروں کا

اشاریہ مرتب کر کے بڑا مفید ریکارڈ یکجا کر دیا۔

نگار کا یہ شمارہ جولائی و اگست کا مشترک نمبر ہے۔ ہر چند اشتراکی انداز کے شمارے مجھے پسند نہیں، کیونکہ یہ ترکیب روایت نگار کے منافی ہے۔ لیکن سالنامہ کے دو حصوں نے (جن کی مجموعی ضخامت ۲۲۴ صفحات کو محیط ہے) کافی وقت لے لیا۔ اور مجبوراً دو دو ماہ کے مشترک پرچے تین بار شائع کرنا پڑے۔ یقین ہے کہ آئندہ یہ صورت پیش نہ آئے گی اور نگار ہر مہینے وقت مقررہ پر شائع ہوتا رہے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں مستقبل نگار کے متعلق البتہ مجھے ضرور کچھ عرض کرنا ہے کیونکہ کراچی آنے کے بعد میرے معمولات زندگی میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور یہاں کے اصول کار کے پیش نظر جن جدید تاثرات سے میں دوچار ہوا ہوں ان سے قدرتاً نگار کو بھی متاثر ہونا چاہیے۔ (صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے) اور اس مسئلہ پر مجھے اور قارئین نگار دونوں کو غور کرنا ہے۔

نگار کا نصب العین ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ ذہن عامہ کو اس سطح پر لے آئے جسے دنیاوی زبان میں "ترقی علوم و فنون" کہتے ہیں اور سماوی زبان میں "کتاب و حکمت"۔ پھر حکمت کا مفہوم ہمارے علمائے کرام کے ذہن میں خواہ کچھ ہو لیکن میرے نزدیک وہ نام ہے انسان کے تمام قوائے ظاہرہ و کامنہ کو اخلاقی پس منظر پر بروئے کار لانے کا جس میں نظام تمدن کا ہر شعبہ شامل ہے اور اسی لئے نگار کا موضوع سخن ہمیشہ غیر محدود رہا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا۔ شروع ہی سے اخلاقی رکھ رکھاؤ کی تھی اس لئے مذہبیات پر مجھے زیادہ لکھنا پڑا کیونکہ اسلام میں اخلاق کا سرچشمہ مذہب ہی ہے اور ہمارے علماء سو نے اس کو خس و خاشاک سے پاٹ دیا تھا۔ اس وقت ان تمام تفصیلات میں جانا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ ہندوستان و پاکستان کا ہر فرد اس سے کم و بیش واقف ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ ظاہر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ نگار کی روش مذہب کے باب میں یہاں بھی وہی رہے گی جو وہاں (ہندوستان میں) تھی۔ مقصود چھیڑ چھاڑ یا مناظرہ و مجادلہ نہیں بلکہ مسالمت و نرمی کے ساتھ صرف ان تعلیمات اسلام کو پیش کرنا جن کا دوسرا نام قرآن کی زبان میں "علم و حکمت" ہے اور جو حیات انسانی کے تمام خارجی و داخلی مسایل پر حاوی ہے۔

نگار میں "سیاسیات" پر بھی ہمیشہ گفتگو کی گئی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی بدستور جاری رہے گا لیکن زیادہ تر بین الاقوامی سیاست پر۔ کیونکہ جس حد تک یہاں کی اندرونی سیاست و تنظیم کا تعلق ہے وہ ہنوز رقیق حالت میں ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل کا آئین جو قرآن و سنت کی بنیاد پر استوار ہونے والا ہے اس کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ فقہاء جو صحیح معنی میں پاکستان کے مستقبل کو سامنے رکھ کر جدید فقہ مرتب کر سکیں کہاں سے آئیں گے۔ اور اگر یہ میسر آ بھی گئے تو اس کا کیا یقین ہے کہ علماء ظواہر اور عوام ان کے وجود کو برداشت کر لیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی جائے پناہ پاکستان ہی ہے۔ اور یقیناً وہ بڑا سخت وقت ہوگا اگر خدا نہ کرے کسی وقت مسلمانوں کو اس یقین پر شرمندہ ہونا پڑا۔ میں نہیں کہتا کہ یہاں کے ارباب حکومت اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ لیکن "اپنے" اس بے خبر رہنے کا یقین دلانے کی کوشش غالباً انھوں نے کم کی ہے۔

نگار کا تیسرا موضوع گفتگو "ادب و ادبیات" ہے۔ جس کا جاری رکھنا یہاں کے ادبی ماحول کے پیش نظر نہ صرف

مزوری بھی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں اُردو زبان کی خدمت کا جذبہ بہت ضعیف ہے اور بھارت کے مقابلہ میں (حالانکہ ان سرکاری زبان ہندی ہے) اردو کی معیاری تصانیف کی اشاعت کا تناسب یہاں کم ہے۔ اس کمی کو لاہور کی مجلس ترقی ادب ایک حد تک پورا کر رہا ہے۔ لیکن تنہا ایک جماعت یا ایک مقام کی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک ملک اس پر آمادہ نہ ہو جائے اور یہ حالات موجودہ فی الحال یہ دشوار نظر آتا ہے۔

کراچی یونیورسٹی کا اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا یقیناً بڑا اچھا اقدام ہے اور اس سے یہاں کی تصنیفی تحریکات کو بھی متاثر ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کی افادی حیثیت صحیح معنی میں اسی وقت بروئے کار آ سکتی ہے جب یہ مسئلہ حصارِ یونیورسٹی سے گزر کر ایوان حکومت کے حدود تک پہونچ جائے اور اُردو کے Production کے لئے اس کے demand کا مرکز خود نظام حکومت قرار پائے۔

یہاں کے نیم سرکاری ادبی و علمی اداروں میں انجمن ترقی اردو، ترقی اردو بورڈ اور رائٹرس گلڈ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی بنیاد تجارتی اصول پر قائم نہیں ہے اس لئے انھیں خود کفیل نہیں کہہ سکتے اور اس طرح وہ ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ضرورت ہے عوام میں ذوق ادب پیدا کرنے کی۔ اور عوام کسی ادارہ سے اسی وقت دل چسپی لے سکتے ہیں جب ان کی نمائندگی اس کو حاصل ہو۔ اس وقت دنیا کا کوئی کام عام اشتراکِ عمل کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اور اسی لئے میں نے اس سے قبل بھی کہا تھا کہ ان تمام اداروں کو ایک کارپوریشن کے اصول پر چلانا زیادہ مناسب ہوگا۔

مجلس ترقی اردو بورڈ اس وقت ایک نہایت اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔ اور اردو کا ایک بسیط و مستند لغت مرتب کرنے میں منہمک ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ الف مقصورہ کی پہلی جلد جو ایک ہزار سے زاید صفحات پر مشتمل ہے۔ زیر طباعت ہے اور غالباً سال رواں کے اخیر تک سامنے آجائے گی۔ لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف ایک حرف "پر کئی سال صرف ہو گئے" تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس تعویق کے دُور کرنے اور مدت تالیف گھٹانے کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے۔ اور یہ بات ناممکن نہیں۔ اگر اسلوب کار میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں اور عمل کو آسان تر بنا دیا جائے۔ افسوس ہے کہ میں اس ادارہ کے نظام و اصول کار سے واقف نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ میری رائے درست نہ ہو۔

"نگار" کی چوتھی خصوصیت اس کا "باب الاستفسار" ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسے اور زیادہ وسیع کیا جائے اور اس خدمت کے لئے دیگر ارباب فکر و نظر کو بھی دعوت دی جائے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ ملک میں ایک جماعت "اخوان الصفا" کے انداز کی پیدا ہو جائے گی اور دوسرے یہ کہ عوام کے جذبہ استفسار کی تسکین و تسلی زیادہ صحت و لقین کے ساتھ ہو سکے گی۔

"نگار" کے دو باب اور بھی قابل ذکر ہیں ایک "باب المراسلہ والمناظرہ" دوسرا "باب الانتقاد" میں سمجھتا ہوں کہ ان ابواب کا قایم رہنا بھی ضروری ہے اور اگر زمانہ نے فرصت دی تو میں ان کو بھی زیادہ دلچسپ و مفید بنانے

کی کوشش کروں گا۔

اخیر میں دو باتیں اور عرض کرنا ہیں۔ ایک یہ کہ نگار میں افسانوں کی اشاعت عرصہ سے بند کر دی گئی تھی لیکن اس سلسلہ کی تجدید میں مجھے عذر نہ ہوگا بشرطیکہ ادبی، فنی، انتقادی یا علمی حیثیت سے کوئی خصوصیت خاص رکھتے ہوں اور زیادہ طویل نہ ہوں۔

منظومات کے باب میں نگار کی پالیسی بدستور وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ یعنی منظومات خواہ وہ قدیم رنگ کی ہوں یا جدید رنگ کی۔ ان میں حذف و انتخاب کا حق حسب دستور سابق مجھی کو حاصل رہے گا۔

ادبیات کے سلسلہ میں دو چیزوں کا اضافہ اور بھی میرے پیش نظر ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں میں فارسی و عربی ذوق پیدا کیا جائے۔ نہ صرف اس لئے کہ ان کے جانے بغیر کوئی شخص صحیح اردو نہیں لکھ سکتا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہ دونوں زبانیں ان مسلم ممالک کی ہیں جن کے جذبات کا مطالعہ ہر مسلمان کا اجتماعی فرض ہے۔ دوسرے یہ کہ شعرا کو فن کی آگاہی کی طرف مایل کرنے کے لئے "مسایل عروض" پر بھی گاہ گاہ مضامین شائع کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جو استفسارات موصول ہوں گے ان پر خاص توجہ کی جائے گی۔

"نگار" کا ایک خصوصی باب "علمی معلومات" کا بھی تھا۔ میں اسے بھی وسعت دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کیونکہ اس کام کے لئے زیادہ وقت دینے کی ضرورت ہے۔ اور فی الحال یہ میرے لئے دشوار ہے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر قارئین نگار اس بوجھ کو سنبھال لیں۔ تاہم جس حد تک تاریخی معلومات کا تعلق ہے میں خود پیش کرتا رہوں گا۔ اور اس باب میں کسی اور کو تکلیف نہ دوں گا۔

بہرحال یہ ہے نگار کا آیندہ لائحہ عمل جس کی تکمیل کی ذمہ داری تنہا مجھ پر نہیں بلکہ آپ پر بھی عاید ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ "میں کہوں اور آپ اسکے سننے والے پیدا کیجئے"۔

ایران کے" لیلیٰ و مجنوں"

نیاز فتحپوری

علی قلی خاں والہ داغستانی کی شہرت اس کے تذکرہ "ریاض الشعراء" سے وابستہ ہے۔ حالانکہ وہ شاعر بھی تھا اور عاشق (زا)ر بھی۔ ہرچند کسی شاعر کا عاشق ہونا ضروری نہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو کیا ضروری ہے کہ وہ ناکام و سوگوار رہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں (کہ فارسی) ہی اور ہو سکتا ہے کہ اردو شعراء میں بھی، جس حد تک عشق کی ناکامی کا تعلق ہے، صرف والہ داغستانی ہی تنہا ایسا شاعر تھا جس کا (نام مجنوں و فرہاد کے ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ قدرت کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہ تھا جو اس نے والہ کی محبت کو ناکام رکھنے میں صرف (نہ کیا) ہو۔

اس وقت ہمارا مقصود نہ اس کے تذکرہ "ریاض الشعراء" پر گفتگو کرنا ہے اور نہ اس کے موہبات شعری پر اظہارِ خیال، بلکہ (اس) کی زندگی کے صرف اس پہلو کو پیش کرنا ہے جو اس کی ناکام حیاتِ معاشقہ سے تعلق رکھتا ہے۔

فتنۂ چنگیزی کے زمانہ میں اس کا جدِ اعلیٰ داغستان آ گیا تھا، لیکن بعد کو اس کے اخلاف اصفہان چلے آئے اور یہیں عہد (صفوی) میں علی قلی خاں پیدا ہوا (۱۱۲۴ھ)۔ اتفاق کی بات کہ اسی زمانہ میں اس کے چچا حسن علی خاں کو بھی قدرت نے ایک لڑکی دی (جس) کا نام خدیجہ رکھا گیا۔ اور یہ دونوں عم زاد بھائی بہن ایک ہی گھر، ایک ہی فضا اور ایک ہی مکتب میں ساتھ ساتھ پروان (چڑ)ھنے لگے۔

اوّل اوّل تو ان دونوں کا باہمی انس کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن جب جذباتِ شباب ابھرنے لگے تو انہوں نے اپنی زندگی (میں ا)یک نیا پن محسوس کیا اور جب اسی کے ساتھ یہ دلوں کی دبی ہوئی چنگاریاں آنچ دینے لگیں تو اس کی گرمیاں، شعر میں تبدیل (ہونے ل)گیں۔ خدیجہ نے سلطان تخلص اختیار کیا اور علی خاں نے والہ۔

خدیجہ، غیر معمولی حسین لڑکی تھی اور متعدد امراء زادگانِ ایران اس کے خواستگار تھے، لیکن اس کے والدین نے یہ تمام (خواست)گاریاں رد کر دیں اور وہ والہ سے منسوب ہو گئی۔ اس میں شک نہیں یہ زمانہ ان دونوں کی انتہائی مسرت و نشاط کا تھا اور (آئ)ندہ کامیاب زندگی کے تصور سے وہ پھولے نہ سماتے تھے کہ بدقسمتی سے اسی زمانہ میں اصفہان پر افاغنہ کی دستبرد شروع (ہو گ)ئی اور جب ۱۱۴۴ھ میں نادر شاہ، شاہ طہماسپ کو معزول کر کے اصفہان پر متصرف ہو گیا تو کریم داد غلام محمود خاں نے بہ جبر (خدی)جہ سے نکاح کر لیا۔ چونکہ والہ بھی شاہ طہماسپ کا مقرب ہونے کی وجہ سے مصائب میں مبتلا تھا اس لئے وہ خود اپنی جان (بچا)تا پھرتا تھا کیا کرتا۔ اس نے یہ سب سنا اور خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ لیکن خدیجہ کی داستان الم اور زیادہ طویل ہو گئی کیونکہ (ج)ب کریم داد کے رقیبوں نے اسے ہلاک کر دیا اور خدیجہ پھر آزاد ہو گئی تو خود نادر شاہ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا اور چند دن

لطف اٹھانے کے بعد اس کی شادی نجف قلی بیگ حاکم یزد سے کردی۔ اس کے بعد جب نادرشاہ کے ساتھ نجف قلی بیگ بھی قتل ہوا تو صالح خاں (قاتل نادرشاہ) نے خدیجہ کو اپنی بیوی بنالیا اور جب کریم خاں زند نے صالح کو قتل کردیا تو میرزا احمد وزیر اصفہان نے اس سے شادی کرلی۔ لیکن چونکہ خدیجہ کے تمام شوہروں کا قتل مقسوم ہو چکا تھا اس لئے کریم خاں نے میرزا احمد کو بھی قتل کردیا اور خدیجہ نے گھبرا کر بلائے معلیٰ کا رخ کیا تاکہ وہاں سے براہ بصرہ وہ ہندوستان پہونچ جائے اس کا محبوب والہ پہلے ہی پہونچ چکا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور کرمان پہونچتے پہونچتے اس کا انتقال ہوگیا۔ اور جب والہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ دیوانہ ہوگیا اور چند دن بعد اس کی یہ دیوانگی ابدی خاموشی میں تبدیل ہوگئی۔

والہ نے ہندوستان پہونچکر خدیجہ کی یاد میں ایک طویل مثنوی بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے:-

از گلشن حسن تازہ سروے نشستہ بہ شاخ او تدروے

علاوہ مثنوی کے اپنی محبوبہ کی یاد میں اس نے اور بھی متعدد اشعار لکھے۔

در ہند (والہ) من تپاں آرام جاں در اصفہاں
یکسالہ رہ اندر میاں (سلطان) کجا و من کجا

اسی رنگ کی چند رباعیاں یہ ہیں:-

از دختر عم خویش دارم فریاد زاں ظالم جورکیش دارم فریاد
فریاد کساں بود ز بیگانہ و من پیوستہ ز قوم خویش دارم فریاد

والہ ز فراق روے جاناں مُردم در ہند غریب و زار و حیراں مُردم
نگذاشت اثر ز ہستیم مہر رخش مُردم ز غم خدیجہ سلطاں مُردم

جانانہ مرا بے سروساماں کرداست آشفتہ ام آں زلف پریشاں کرداست
گفتی کہ ترا کردہ چنیں آوارہ؟ آوارہ مرا (خدیجہ سلطاں) کرداست

خدیجہ سلطان خود بھی خوشگو شاعرہ تھی اور اس نے بھی بعض اشعار میں اپنے خیالات حزیں کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

افسانۂ درد و من اگر گوش کنی از لیلیٰ و داستانش خاموش کنی
ور قصۂ عشق ابن عم شنوی مجنوں و حکایتش فراموش کنی

من سستی عہد یار می دانستم بے مہری آں نگار می دانستم
آخر بہ خزاں ہجر خویشم بنشاند من عادت نوبہار می دانستم

جب نادرشاہ نے اصفہان کی غارتگری شروع کی اور والہ کی محبوبہ خدیجہ سلطان کو بھی اپنے حرم میں داخل کرلیا تو

نے اپنی جان بچاکر ہندوستان کا رخ کیا اور سب سے پہلے لاہور پہنچا (۱۱۴۷ھ) یہاں سے وہ شاہجہاں آباد گیا اور روشن الدولہ کی وساطت اور برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری کی سفارش سے وہ محمد شاہ کے دربار سے وابستہ ہوگیا یہاں ظفر جنگ کا خطاب بھی اسے عطا ہوا اور چار ہزاری منصب بھی۔ اس کے بعد عہد احمد شاہ میں وہ شش ہزاری منصب اور خان زماں خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوا اور ۱۱۶۷ھ میں صفدر جنگ کے ساتھ اودھ آیا۔ عالمگیر ثانی کے زمانہ میں پھر شاہجہاں آباد آیا اور بہ سفارش عماد الملک نواب آصف جاہ کا ہفت ہزاری امیر ہوگیا۔ اور یہیں ۱۱۸۰ھ میں اس نے وفات پائی اس کے بعض اشعار سے بھی اس کی ناکام و نامراد زندگی کا پتہ چلتا ہے :-

جاناں بہ سر مزارم آمد　　آخر مردن بکارم آمد

در دشت عشق مجنوں دنبال ماند از من　　با آنکہ من دریں رہ صد جادر رنگ کردم

آب حیات و کیمیا، عمر دوبارہ و وفا　　ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نہ رسد

قارئین کے اصرار پر
آخر ستمبر ۶۳ء میں
شائع کیا جارہا ہے

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدنِ انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاءِ کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوامِ عالم نے کس طرح اپنا لیا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہبِ عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کے اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہلِ فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا "خدا نمبر" اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے۔

قیمت: تین روپے

خریدارِ نگار سے رعایتی قیمت: **دو روپے**

غیب داں

برہم ناتھ دت

سقراط نے اپنے مقدمے کے دوران اپنی غیر ہر دل عزیزی کے اسباب بیان کرتے ہوئے اپنے ججوں سے یہ بھی کہا تھا:۔
"حضرات! مجھے اس حقیقت کے اظہار میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں نے شاعروں کے رو برو اُن کے منتخب و برگزیدہ اشعار
اور انہیں تعبیر و بیان کے لئے کہا مگر وہ ناکام رہے، در آنحالیکہ اس مجمع میں اُن کے علاوہ اور کوئی ایسا نہ تھا جو اُن اشعار سے
ن موثر زاویے پیش نہ کر سکتا ہو، اس وقت مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ شاعر شعر اس لئے نہیں کہتے کہ خدا نخواستہ وہ دوسروں
یادہ زیرک اور باخبر واقع ہوئے ہیں بلکہ کہتے ہیں صرف اس لئے کہ شعر کہنے کا ولولہ ان کی ذات میں اس طرح پنہاں ہوتا ہے
فولاد میں جوہر۔ وہ پیغمبروں اور غیب گو لوگوں کی طرح بلا ارادہ بہت سی نادر و پر مغز باتیں یونہی کہہ جاتے ہیں۔"
سقراط نے ان الفاظ میں ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا ہے جو اُس سے پہلے کسی اور کو نہ سوجھی تھی کہ "شعر کہا نہیں جاتا بلکہ تحریک
ں شعر کہلواتی ہے۔ فہم و فراست اور علم و آگہی کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔" سقراط اس کے ساتھ اگر یہ بھی کہہ دیتا کہ
ن طرازی اور سخن فہمی یکسر دو علیحدہ علیحدہ اور مختلف صفات اور حقیقتیں ہیں اور شعر کہنا اگر خدائی دین ہے تو شعر فہمی بھی خدائی انعام
ریے جانہ ہوتا۔ اشعار پر تنقید کے اصول تو وضع ہو سکتے ہیں اور انہیں ترتیب و تہذیب بھی دی جا سکتی ہے مگر ایسا کوئی گُر یا
دل نہیں گھڑا جا سکتا جس سے کسی غیر شاعر کو شاعر بنایا جا سکے یا اُس میں سخن فہمی کا ملکہ پیدا کیا جا سکے۔
غالب سے متعلق کہا گیا ہے کہ "پایہ امعنی از فحول استاداں کم نیست" مگر ابو نواس کے کلام کو "الہام" کا درجہ دیا جاتا ہے
ں کی شخصیت کو ہمہ گیر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی سقراط کی ہم نوائی میں اپنے متعلق بڑے طمطراق سے کہتا ہے۔

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اور سرور کے نام ایک خط میں اس نظریے کی ان الفاظ میں تائید کرتا ہے "قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے شاعری سے
ن کو کیا علاقہ؟"
پس نتیجہ اس استدلال کا یہ ہوا کہ جس طرح قوس قزح کے سات رنگوں کی شعاعیں قدرت کی اپنی کارسازی کا کرشمہ ہیں
ور جس طرح طاؤس کے پروں کی بوقلمونی اور رعنائی، یا پھولوں کی شگفتگی و عطر بیزی اُن کے اپنے بس کی بات نہیں، بلکہ قدرت
؛ عطیہ ہیں۔ اسی طرح شعر کہنا بھی عطائی و وہبی ہے، اکتسابی و علمی نہیں۔
اس کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر "شعر" ہے کیا؟ اولین شاعرِ اسلام حضرت حسان بن ثابت کے خرد سال بچے کو بھڑ نے کاٹ

لیا۔ وہ دوڑتا آیا تو باپ نے پوچھا "کس نے کاٹا" وہ نام تو نہ بتا سکا بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا " کأنہ ملتف ببردی حبرۃ
وہ کہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ حسان خوشی سے اچھل پڑے اور جوش مسرت میں کہا " واللہ صار البنی الشاعر " خدا کی
میرا بیٹا شاعر ہوگیا۔ فقرہ موزوں بھی نہ تھا، محض ایک عمدہ تشبیہ کا حامل تھا۔ حسان نے اسے بھی شعر ہی سمجھا۔ حسان بڑے کا
ہے۔ ابن رشیق قیروانی نے عربی ادیبوں کے اقوال جو اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ان سے بھی اس خیال کی تصدیق وتائید ہوتی ہے کہ
شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں بلکہ "تخیل" ہی سمجھتے تھے۔ اور واردات قلب کا اظہار۔

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری " دراصل " تخیل " ہی کا دوسرا نام ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی اپنی کتاب " چہار مقالہ"
میں اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

" شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند والتیام قیاس نتیجہ برآں وجہ کہ معنی خرد را
بزرگ کند و بزرگ را خرد، نیکو را لباس زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و با ایہام قوت غضبانی و شہوانی برانگیزد
تابداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب گردد "

رگ وید کا نظریہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ تخلیق کے باب میں شاعروں سے متعلق یہ کہا ہے:۔

" آغاز میں نازل ہوئی " محبت " حیات کی پہلی کرن، کرن کی پہلی نمو شاعروں نے من کی گہرائیوں میں ڈوب کر " عدم " میں
" وجود " کو ڈھونڈ نکالا۔ تفریق وتمیز کی حدیں باندھ دیں "۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے شاعر کا درجہ فلسفی سے بھی بلند مانا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے محسوسات کو معقولات پر فضیلت دی
یعنی انہوں نے بھی شاعری کو " تخیل " ہی سمجھا ہے۔ واردات قلب! سامی شاعری، ہندوؤں کی طرح آغاز آفرینش سے شروع ہوتی ہے۔ اس
کی رو سے پہلا شاعر آدم ہی تھا۔ امیر خسرو نے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے۔

ما ہمہ دراصل شاعر زادہ ایم
دل بایں محنت نہ از خود دادہ ایم

اور صائب تو اور کھل کر کہتا ہے۔

آں کہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

پھر یہ رزمیہ بن جاتی ہے اور حضرت داؤد کے وقت متبرک گیتوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ حضرت سلیمان کے وقت
انتہائی بلندی پر پہنچ کر الہامی عظمت وفضیلت اختیار کرلیتی ہے۔

ارسطو نے اسے نقالی کہا ہے۔ یعنی خیالات، احساسات وجذبات کی تصویر۔ اور یوں دیکھا جائے تو شاعر کے معنی بھی ہی
" ذی شعور "۔

دانایان فرنگ نے بھی شعر کو " تخیل " ہی کہا ہے گلفن کی نگاہ میں یہ " حسن وحقیقت " کا امتزاج ہے۔ لی ہنٹ کی نظر
حسن کی مہک ہے۔ فیلڈ کے خیال میں یہ " خیالات کی موسیقی ہے جو ترنم الفاظ کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔ پادری ٹکن اسے خیا
کی شگفتگی کا نام دیتے ہیں۔ بلزاک کہتے ہیں کہ " خیالات کے گھنے جنگل میں جستجو کی انتہائی کٹھن منزلیں طے کرلینے کے بعد
شعر کا ظہور ہوتا ہے " کالرج کا نظریہ ہے کہ " بہترین ترتیب میں الفاظ کا آنا شعر ہے۔ اور بہترین خیالات کا بہترین الفاظ وترتیب میں آ

صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "انسانی فہم و فراست! تخیل و جذبات، جوش و انبساط اور سجے ہوئے طرز کلام کا نام شعر ہے"
کہتے ہیں کہ شاعری کیا ہے سوا ان خیالات اور الفاظ کے جن میں ولولہ غیر آزادی طور پر شامل ہو جاتا ہے" ولیم بلیک نے اسے
القدس" کا نام دیا ہے۔ اور میڈم ڈیوڈی وانٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "حقیقی شاعر تو وہ ہے جو شعر میں عمیق ترین جذبات مسرت و انبساط
ایت بخش آسودگی کے تاثرات ڈھونڈ نکالتا ہے اگرچہ عمر بھر اس نے ایک موزوں مصرع بھی نہ کہا ہو"
وحشی اقوام کے لوگ بھی غم و اندوہ اور ولولہ و جوش کے اظہار میں انداز بیان بدل لیتے ہیں۔ الفاظ کے رد و بدل سے موسیقیت پیدا کر لیتے ہیں۔
بن ہیت برلسے میں یہ نوحہ پڑھتے ہیں۔ نوجوان عورتیں پہلی سطر، بوڑھی عورتیں دوسری اور پھر سب یک زبان تیسری اور چوتھی سطریں۔

کارڈنگ ماربو .. انی جوان، بھر
عامل گارو - لخت دل وجاں
میلا ناڈوجو - بعد ازاں ہم
ننگا برو - دید نہ ہوگی

دیکھئے یہ ہماری مروجہ بحر "فعلن فعلن فعلن فعلن" سے کس قدر مشابہ ہے (میں نے "مشابہ" کہا ہے" بعینہٖ" نہیں کہا) شمالی
کے لوگ ریچھ کے شکار یا کسی اور مہم پر جاتے وقت، اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے حصول کے لئے جو دعا کرتے ہیں۔ اس کا آخری
ہوا کرتا ہے۔ جسے وہ بار بار دہراتے ہیں۔

ہا، آہ! ہا! ہا آہ! ہا!

جنوبی امریکہ کے باشندے

نیاہ آہ وا! نیا آہ وا

کی گردان ہرلے کے بعد رٹتے ہیں۔ اچھلتے اور کودتے ہیں! یہ بھی شعر ہی ہیں اور ان کے کہنے والے "شاعر" ہمارے ہاں مقفیٰ و
ں کلام کو "شعر" کہا جاتا ہے مگر یہ تعریف سطحی اور رسمی ہے، غالب نے تعریف شعر کے باب میں تصریحات کی ہیں۔ جو قابل قدر اور
غور ہیں۔ کلیات نثر پنج آہنگ میں کہتے ہیں:۔
"لیکن محفل ادب میں جس "سخن" کو بار حاصل ہے وہ ایک معشوقہ پری پیکر ہے، تقطیع شعر اس کا لباس ہے، مضامین اس
زیور۔ دیدہ وروں نے شاہدِ سخن کو، اس لباس اور اس زیور میں روکش ماہ تمام پایا ہے"
اور پھر ایک اور خط میں "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" کے نظریہ کی تائید میں اس طرح رقم طراز ہیں:۔
"گفتار موزوں کہ آں را شعر نامند، در ہر دل جائے دیگر و در ہر دیدہ رنگی دیگر و سخن سرایاں را ہر زخمہ جنبشے دیگر و ہر ساز آہنگی
دارد"

اور آخر میں بطور اقوال فیصل اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:۔
"شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں"
ظاہر ہے کہ قدما کی تقلید اور اپنی توضیح میں انہوں نے بھی شاعری کو "تخیل و واردات قلب" سے ہی تعبیر کیا ہے،
اصناف سخن میں قصیدہ، مثنوی، رباعی اور غزل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ قصیدہ عرب کی خصوصیت ہے، تعشق، مدح،
فخر، موعظت اور مرثیہ، تشبیب قصیدہ میں سب ہی سما جاتے ہیں۔ فارسی شاعری کی ابتدا قصیدے ہی سے ہوئی تھی، اردو

میں بھی اس نے خوب رواج پایا۔ سودا اور ذوق نے اس صنف میں خاص شہرت حاصل کی۔ استاد مرحوم حکیم طغرائی امرتسری نے بھی بڑے زوردار اردو، فارسی قصیدے کہے ہیں جن کو قدماء اہل زبان کے قصائد کی صف میں بے تکلف جگہ دی جا سکتی ہے۔

مثنوی، بیانیہ شاعری کا دوسرا نام ہے۔ اس میں قدرت کے مناظر حسن وعشق، رزم وبزم کی کہانیاں، فلسفہ مذہب غرضیکہ انواع واقسام کے سب مضامین بخوبی آسکتے ہیں۔ یہ صنف ایران کی اپنی ایجاد ہے اور وہیں سے اردو میں آئی۔ سودا، میر تقی، میرحسن، نسیم، شوق قدوائی مشہور مثنوی گو گزرے ہیں۔

رباعی کی ایجاد کا سہرا بھی عجم کے سر ہے، عربی میں سرے سے یہ وزن ہی موجود نہ تھا، قصیدہ ومثنوی کی طرح یہ صنف بھی فارس سے ہندوستان آئی۔ درد، سودا، میر تقی، میرحسن اور تلوک چند محروم اپنے اپنے دور کے مشہور رباعی گو مانے جاتے ہیں۔

اب رہ گئی غزل، اس سے متعلق ہمیں کچھ تفصیل سے کہنا ہے۔ اگرچہ "غزل" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی ہیں "محبوب سے باتیں کرنا"۔ مگر یہ خالص فارس کی پیداوار ہے۔ اور وہیں سے ہندوستان پہنچی، مقبول ومعروف ہوئی اور اب ربان زد عام ہے خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر جامعیت کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے اور کم سے کم لفظوں میں وسیع سے وسیع مضمون اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں۔

درین زمانہ رفیقی کہ خالی از خلل ست
صراحی مے ناب وسفینۂ غزل ست

یعنی یہ کہ اس زمانے میں قطعی بےضرر دوست شراب کی صراحی اور غزل کی بیاض کے سوا کوئی نہیں۔ یہ غزل کی اہمیت مقبولیت اور ضرورت کا اظہار ہے، نیاز فتحپوری نے اسے ایک ایسی "پیاری" صنف کہا ہے جو بہ لحاظ نزاکت "کارگہ شیشہ گری" ہے اور بہ نسبت فکر کے خیال سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ غزل محض حسن وعشق کی زبان ہے اور کامیاب غزل وہی ہے جس پر محبت کی فضا چھائی ہوئی ہو۔ اور جس میں انہی جذبات کا اظہار ہو جس کا تعلق نفسیاتی تاثرات ومشاہدات یعنی شکوہ وشکایت، امید وبیم، ہجر ووصال وغیرہ سے ہے فلسفیانہ خیالات، سائنسی معلومات، مذہبی تصورات، منطق اور اعداد وشمار سے اس کا کوئی اساسی تعلق نہیں۔ غزل کہنا آسان نہیں۔ غالب کا قول "ہر بوسناکے نداند جام وسنداں باختن" ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ غزل کے لئے خود داری وربودگی چاہیئے۔ ولولہ وجوش چاہیئے۔ دلربائی ودلدہی کے تاثرات چاہئیں۔ عشق ومحبت کی واردات چاہیئے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو کامیاب غزل ناممکن ہے۔ غالب اس حقیقت سے آگاہ تھا۔ ایک خط میں سرور کو لکھتا ہے۔

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوار غزل

معشوق کس کو قرار دوں کہ غزل کی روش ضمیر میں آئے۔

لفظی، قلمی، کتابی یا خیالی عشق طبیعت میں وہ ہیجان، ولولہ، وارفتگی نہیں پیدا کر سکتا جو شعر کو "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کا اعجاز دے سکے۔ اور نہ "معشوق قرار دینے سے" غزل کی روش ضمیر میں آسکتی ہے۔ اس کے لئے وہی بات چاہیئے جو عرفی کا کہا گیا ہے۔

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر　　تو خیالی و من معنی رنگیں بستم

اور اس کے لئے ہمیں لامحالہ میر، جرأت، غالب، مومن، حسرت اور اقبال کی طرف رجوع ہونا پڑے گا کہ اپنے اپنے دور کے سرد فتر ہیں۔

کچھ "ایسا" کے بارے میں

اکٹر شوکت سبزواری

اردو قواعد کے بہت سے گوشے ہنوز تاریکی میں ہیں جنھیں جدید تحقیقات کے پیش نظر روشنی میں لانا زبان کی ترقی اور
داری کے لئے ضروری ہے۔ اس سے پہلے "ایسا" کے رفیق "جیسا" کی پیدائش سے لیکر جوانی تک کے ارتقائی منازل اور سوانح حیات
ر شائع کرا چکا ہوں۔ اس کے آخر میں میں نے لکھا تھا کہ حضرات لکھنؤ "جیسا" کی جگہ اور معنوں میں "ایسا" استعمال کرتے ہیں۔ اس
ت میں "ایسا" کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اس کا اولین محرک تو خود لفظ "جیسا" ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس کی تحقیق کا حق
نہیں ہوا۔ میں نے یہ لکھ کر:۔

"عہد اوّل کے اردو شعراء کے یہاں "جیسا" کا استعمال بطور لاحقہ تشبیہ مجھے نہیں ملا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں اٹھارہویں
ری کا نصف آخر اس کے ابھار یا پیداوار کا زمانہ ہے۔"

جمعہ جمعہ آٹھ دن اس کی عمر بتائی جس سے مشہور عالم وادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی کی اس رائے کو تقویت پہنچی کہ:۔

"میرے بچپن تک فصحاء عموماً اس موقع پر "سا" یا "سی" ہی لاتے تھے اور اس حد تک جوش صاحب کا خیال صحیح ہے۔ پھر
ایہ نہ تھا کہ "جیسا" کا استعمال سرے سے معدوم ہو۔ آخر سبزواری صاحب نے اس دور سے بھی سندیں ڈھونڈ نکالی ہیں۔
رے دیکھتے ہی دیکھتے دوسرے درجے کے ادیبوں (خصوصاً اخبار نویسوں) نے "جیسا" اور "جیسی" کی بھرمار کر دی اور اس لئے
ت اوّل کے بھی بعض ادیبوں کو متاثر ہونا ہی پڑا[۱]"

اس کے علاوہ حضرت جوش کو آج بھی "جیسا" کی شخصیت سے انکار اور اس پر اصرار ہے کہ "سا" یا "سی" کی جگہ "جیسا" لانا
یح نہیں۔ چنانچہ مشہور انشا پرداز شاہد احمد دہلوی کے ایک مضمون کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے شاہد صاحب کی تحریر میں
ہاں لفظ "جیسا" دیکھا اس کے آگے قوسین میں کہیں "ایسا" اور کہیں "کا ایسا" تحریر فرما دیا۔ "جیسا" کو اگر "سا" سے بدلا جاتا
شاید چنداں قابل اعتراض نہ ہوتا اس لئے کہ "سا" (جیسا کہ مولانا عبدالماجد نے ارشاد فرمایا) "جیسا" سے زیادہ قدیم ہے اور
لوماً فصحائے دہلی و لکھنؤ کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ لیکن "ایسا" "جیسا" کا رفیق اور برابر کا ساتھی ہے۔ دونوں "سا" کی کوکھ
سے پیدا ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہم سر ہیں۔ شکایت اس امر کی ہے کہ "جیسا" کو بے دخل کر کے اس کے رفیق "ایسا"
و اس کی جگہ دیدی گئی اور حق دار کو حق سے محروم کر دیا گیا۔

---

[۱] اردو نامہ، ۸ : ۷۷

یہ میں عرض کر چکا ہوں کہ "جیسا" اور "ایسا" دونوں "سا" کی پیداوار ہیں۔ اول الذکر "جے" (جس) اور "سا" کی ترکیب سے بنا اور ثانی الذکر "اے" (اس) اور "سا" کی ترکیب سے۔ "سا" دونوں میں شریک ہے۔ جیسا کے اصلی معنی ہیں جس طرح اور ایسا کے معنی ہیں اس طرح۔ جب سے یہ الفاظ وضع ہوئے اپنے ان معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں۔ امتداد زمانہ سے ان کے اولین جزء "جس" اور "اس" کے معنی فراموش ہوئے تو یہ دونوں لفظ "سا" کے معنوں میں اور اس کی جگہ استعمال ہونے لگے۔ "جیسا" کا دعویٰ ہے کہ وہ "سا" کا قدیم جانشین ہے۔ "سا" کی جگہ اول اول اسے ملی اور سب سے پہلے اس کی نیابت کا شرف اسے حاصل ہوا۔ بعد میں حضرات لکھنو نے "سا" کی نیابت کا شرف چھین کر اس کے رفیق "ایسا" کو بخش دیا۔ وہ "سا" کی جگہ "ایسا" استعمال کرتے اور اسے صحیح قرار دیتے ہیں اور "جیسا" کو "سا" کے معنوں میں سرے سے صحیح ہی نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں "جیسا" کی شکایت بے جا نہیں۔ صحیح معنوں میں وہ "سا" کا قدیم جانشین ہے۔ قدیم زمانے میں بھی "جیسا" "سا" کی جگہ مستعمل تھا چنانچہ سب رس کے درج ذیل جملے میں اس کا محل استعمال وہی ہے جو "سا" کا ہے:

"ہمارا بادشاہ ایسا ہے ایسا ہے، جیسی تعریف کریں گے اس تعریف جیسا ہے۔" (سب رس، ۲۷)

اوّل اوّل اس کے معنی موافق و مطابق ہوئے (جیسا کہ اس جملے میں ہیں) اس کے بعد مثل اور مانند۔

سب رس ۱۶۳۴ء میں تصنیف ہوئی۔ سترہویں صدی عیسوی کے ابتدا میں "سا" کی جگہ "جیسا" کا بے تکلف استعمال اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یہ لفظ سترہویں صدی سے پہلے "سا" کے موقع پر عام طور سے بولا جاتا اور "سا" کے معنوں میں اس کا استعمال فصیح سمجھا جاتا تھا۔ انشا نے ۱۸۰۲ء کے لگ بھگ اس کے معنی متعین کئے اور اس کے استعمال کے قاعدے بتلائے:

"جیسا..... مثل "سا" حرف تشبیہ باشد مانند ایں کہ تیرے قد جیسا ایک بوٹا باغ میں نہیں [1]"

اس سے معلوم ہوا کہ جیسا (اور اس کے صیغے جیسی، جیسے وغیرہ) معنی اور استعمال دونوں لحاظ سے "سا" کی طرح ہے اور انشا کے زمانے میں ہر شخص (فصیح ہو کہ غیر فصیح دوسرے درجے کا ہو کہ صف اوّل کا) "سا" اور "سی" کے موقع پر "جیسا" اور "جیسی" استعمال کرتا تھا اور اس پر کسی کو اعتراض نہ تھا۔ انشا نے اس استعمال کی جو مثال پیش کی ہے اس میں "جیسا" (تیرے قد جیسا) ٹھیک اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح آج ہم بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

اس سے پہلے انشا کا حسب ذیل شعر پیش کر چکا ہوں۔ اس میں "چاند جیسا" (چاند سا کی جگہ) استعمال ہوا ہے۔

اٹھتی کونپل اور چاہت بیگما کیا قہر ہے
چاند جیسا لگ گیا بے ڈول یہ لکہ تجھے

اس شعر کی تاریخ بتانا مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انشا کے زمانے میں "جیسا" کا یہ استعمال عام تھا۔ انشا کے علاوہ اس دور کے دوسرے فصحا نے بھی اس موقع پر "سا" اور "سی" کے ساتھ ساتھ "جیسا" اور "جیسی" استعمال کیا اور اسے صحیح درست سمجھا۔ اس کی تائید سعادت یار خاں رنگین جیسے زبان داں اور فصیح اللسان کے مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے:

گرچہ زنانی جیسی نبیلی نہیں ہوں میں
لیکن ازار بند کی ڈھیلی نہیں ہوں میں

---

[1] دریائے لطافت، ۲۹۲

اس کے بعد مسلسل اس کا استعمال ہوتا رہا۔ ذوق، ظفر، نذیر احمد، ناطق، کیفی کے منظوم و منثور کلام سے مثالیں اس سے
پیش کی جا چکی ہیں۔ مولانا دریابادی فرماتے ہیں آج "جیسا" اور "سا" دونوں برابر برابر مستعمل ہیں۔ "جیسا" کا یہ استعمال
رھویں صدی سے آج تک چلا آرہا ہے۔

میں نے اس سے پہلے لکھا تھا کہ "جیسا" اسم کی مغیرہ حالت پر داخل ہوتا ہے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں
علامت اضافت "کا، کی" کی مدد سے اسم کے آخر میں لاحق کیا جاتا ہوگا۔ علامت اضافت تخفیف ہو گئی اسم کی محرف حالت آج
برقرار ہے۔ سودا کے ایک قطعے میں جو کلیات سودا کے ایک مخطوطے کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں شامل ہے ذیل کا شعر ملا ہے۔
میں "کی جیسی" (علامت اضافت "کی" کے ساتھ) استعمال ہوا ہے۔

کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہ جہاں کی جیسی ہے

اس سے میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے۔

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ "سا" کے موقع پر "جیسا" آج فصحا کی زبان ہے۔ البتہ "ایسا" یا "کا ایسا" اس محل پر صرف
لکھنؤ کی زبان پر ہے یا ان اہل قلم کے یہاں ہے جو لکھنؤ کے مقلد ہیں۔ داغ کی طرح جنھیں لکھنو والوں کی خاطر عزیز ہے وہ
کبھی استعمال کر جاتے ہیں۔ "ایسا" اصلاً متعلق فعل (Adverb) ہے۔ انشا لکھتے ہیں:

"وایسا بمعنی چنیں"۔ یعنی ایسا کے معنی ہیں اس طرح۔ اور چونکہ یہ اصلاً متعلق فعل ہے اس لئے انشاء نے "جیسا" کے
س پر اس کے دوسرے صیغے ایسی، ایسے وغیرہ نہیں لکھے۔ صرف "ایسا" لکھ کر چھوڑ دیا۔ انشا کی تحقیق ہے کہ "ایسا" کو صفت
طور پر اس "جیسا" کے معنوں میں سب سے پہلے مغل پورہ والوں نے استعمال کیا۔ اس کے بعد یہ استعمال اردو میں عام ہو گیا۔

"اہل مغل پورہ 'ایسا' را 'اس سا'، 'اس جیسا' گویند و ایں ہم صحیح و فصیح نزد اردو داناں بود۔"

اس عبارت سے دو چیزیں دریافت ہوئیں۔ اول یہ کہ "ایسا" اردو میں متعلق فعل ہے اور فارسی چنیں کے معنوں میں
۔ دوسرے یہ کہ مغل پورہ کے رہنے والوں نے اسے صفت کے طور پر اس جیسا کے معنوں میں استعمال کیا اور اہل اردو نے
قبول کر لیا۔ انشا کے عہد تک "ایسا" کے صرف یہ دو استعمال تھے اور اہل اردو صرف ان دو معنوں میں اسے استعمال کرتے
ان میں سے پہلا استعمال دوسرے سے زیادہ قدیم ہے۔ ان استعمالات کی دو چار مثالیں توضیح کی غرض سے درج کی جا رہی ہیں۔
کے شعر میں "ایسا" متعلق فعل ہے اور اس کے معنی ہیں اس طور پر اور اس طرح۔

چمن میں میں نہیں ایسا پھنسا کہ یوں چھوٹوں
مجھے تو ہر رگ گل تار دام ہے صیاد

"ایسے" اس کی جمع ہے۔

فرہاد و قیس و میر یہ آوارگان عشق
ایسے گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ

اس استعمال کی قدیم مثال سب رس کا یہ جملہ ہے:

"ہمارا بادشاہ ایسا ہے ایسا ہے"

ذیل کی مثالوں میں ایسا، ایسی، ایسے صفت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ معنی ہیں اس طرح کا، اس قسم کا۔

اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مفت دیکھو ہمیں
پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

عشق کی تہمت جب نہ ہوئی تھی کاہے کو ایسی شہرت تھی
شہر میں اب رسوا ہیں یعنی بدنامی سے کام کیا

دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا

ان کے علاوہ "ایسا" کے دو استعمال اور بھی ہیں جن کا ذکر انشا نے نہیں کیا ایک اسم کے طور پر مثل و مانند کے معنوں میں
"آسمان جو کسی کسی جگہ سفید کوڑی یا کنول کے پھول کا ایسا ہے[1]"
"پھول کا ایسا" یعنی پھول کی طرح یا پھول کی مثل۔
دوسرے حرف (لاحقہ) کے طور پر "سا" کے معنوں میں، جیسے[2]:

بھرے آمیرے دل میں نور ایسا
کہ خاکستر یہ دل ہو طور ایسا

نور ایسا۔ نور سا۔ طور ایسا۔ طور سا۔ اس کا قدیم استعمال فائز دکنی کی مثنوی رضوان شاہ و روح افزا (۱۰۹۴ھ) میں ملتا ہے۔

منج ایسا نراسی بھی ہچیا ہے کئیں
ندی کے کنارے سوں پیاسا ہوں میں

اگرچہ اہل لکھنؤ آج "کا ایسا" اور "ایسا" دونوں یکساں طور سے استعمال کرتے ہیں لیکن میرا قیاس ہے کہ اوّل "ایسا" کے معنوں میں استعمال ہوا اس کے بعد "سا" اور "جیسا" کے قیاس پر حرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اردو میں کی تاریخ اور ان کے قواعدی ارتقا پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لئے جب تک اچھا خاصہ مواد نہ ہو محض اٹکل سے آخر کے استعمالوں کی صحیح اور قطعی تاریخ کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ تاہم اس قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آ جب "دریائے لطافت" کی تصنیف کا ڈول ڈالا گیا "کا ایسا" اردو میں مستعمل نہ تھا اور اگر تھا تو فصیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔
خالص ہندوستانی زبان کی ایک نا تمام مثنوی کا ذکر معاصر (پٹنہ) نے کیا ہے جس کا ایک شعر ہے:-

بچھڑ جاتے تھے جو کبھی اک گھڑی تو لگتی تھی ساون کی ایسی جھڑی

---

[1] مضامین شرر ج ۱، حصہ ۲، ص ۴۰۵
[2] عشق نامہ فگار، ص ۱۰

"معاصر کا بیان ہے کہ یہ مثنوی کلیات انشا کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں نہیں۔ کلیات کے صرف دو قلمی نسخے ایسے
یں جن میں اس مثنوی کے اشعار پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں ہیں[1]۔ میرا خیال ہے کہ انشا نے
ی جیسی" استعمال کیا اور کاتب نے اپنے محاورے کے مطابق اسے "کی ایسی" بنا لیا۔

اگر یہ مثنوی انشا کی ہے اور انشا ہی نے "کی ایسی" لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ "کا ایسا" اور "ایسا" دونوں اٹھارہویں
دی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں عام طور سے "سا" کی معنوں میں استعمال ہوئے۔ اوپر کی سطروں میں "ایسا"
استعمال کی مثال میں جو شعر درج ہوا وہ قادر علی نگار عظیم آبادی کی مثنوی عشق نامہ کا ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۱۲ھ
(۱۷۹۷ء) ہے۔

بہر حال "ایسا" کے آخر کے دو استعمالات کا رواج پورب میں ہوا اور غالب خیال یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ
ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک پورب میں یہ استعمال عام ہیں اور عالم و عامی سب "سا" کی جگہ "کا ایسا" یا "ایسا"
تے ہیں۔ دہلی کے اہل قلم میں سے مولوی نذیر احمد نے شاید اہل لکھنؤ کی خاطر سے یا ان سے متاثر ہو کر "جیسا" کی جگہ "ایسا"
ستعمال کیا لیکن بہت کم اور ندرت کے ساتھ مثلاً "رویائے صادقہ" کا ایک جملہ ہے:

"اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعات ایسے علوم کی قدر ہے[2]۔"

(نگار) جناب شوکت سبزواری نے اس بحث میں جس تحقیق سے کام لیا ہے اور وہ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اس کی اہمیت و
صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سا، ایسا اور جیسا کے مفہوم میں کسی وقت بر بنائے محل استعمال ہلکا سا فرق
ن پیدا ہو جاتا ہے جس کا تعلق زیادہ تر معانی و بیان سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں الفاظ مترادف ہیں اور مفہوم مماثلت، سب میں پایا جاتا ہے، لیکن اظہار خیال کے
بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جب صرف وجدان ہی صحیح فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان تینوں میں کس لفظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔

فارسی میں سا اور آسا (قطع نظر ان کے متعدد معانی سے) دونوں مفہوم مماثلت میں مستعمل ہیں۔ اردو والوں نے
کو تو جوں کا توں رہنے دیا، لیکن آسا کو ایسا کر دیا اور مفہوم دونوں کا وہی باقی رکھا جو فارسی میں پایا جاتا ہے۔ رہا جیسا
یسا سو اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ فارسی چوں اور سا دونوں کا مسخ شدہ مخلوطہ ہے یا حسب تحقیق ڈاکٹر صاحب جس اور
کا مرکب مخفف ہے لیکن جیسا ایک معنوی خصوصیت اور بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو سا اور ایسا میں نہیں پائی جاتی یعنی جس طرح فارسی میں حروف مماثلت
کرار سے کلام میں زور پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح اردو میں بھی (خصوصاً تعریض کے وقت) جیسا مستعمل ہونا چاہیئے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مجھ سے کہے کہ "تم سے دنیا
ما ہزاروں ہیں" اور میں اس کی تعریض میں کہوں کہ "مجھ سا"! تو بات ہلکی رہے گی۔ لیکن اگر میں کہوں کہ (مجھ جیسا!)، تو اس میں زور پیدا ہو جائے گا۔
اور جیسا کا یہ نازک فرق غالباً ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بھی ہوگا، اہل لغت نے تو اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

---

[1] معاصر، حصہ اول، ص ۵۹ [2] رویائے صادقہ، ص ۱۸۴

ذیل کی مثالوں میں ایسا، ایسی، ایسے صفت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ معنی ہیں اس طرح کا، اس قسم کا۔

اب جو ہاتھ آ گئے ہیں ہم مت مفت دیجو ہمیں
پھر نہ ہوگا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

عشق کی تہمت جب نہ ہوئی تھی کاہے کو ایسی شہرت تھی
شہر میں اب رسوا ہیں یعنی بدنامی سے کام کیا

دل کے تئیں اس راہ میں کھو افسوس کناں اب پھرتا ہوں
یعنی رفیق و شفیق پھر ایسے میر کہاں میں پاؤں گا

ان کے علاوہ "ایسا" کے دو استعمال اور بھی ہیں جن کا ذکر انشا نے نہیں کیا ایک اسم کے طور پر مثل و مانند کے معنوں میں، جیسے:
"آسمان جو کسی کسی جگہ سفید کوڑی یا کنول کے پھول کا ایسا ہے[1]"
"پھول کا ایسا" یعنی پھول کی طرح یا پھول کی مثل۔
دوسرے حرف (لاحقہ) کے طور پر "سا" کے معنوں میں، جیسے[2]:

بھرے آ میرے دل میں نور ایسا
کہ خاکستر یہ دل ہو طور ایسا

نور ایسا۔ نور سا۔ طور ایسا۔ طور سا۔ اس کا قدیم استعمال فائز دکنی کی مثنوی رضوان شاہ و روح افزا (۱۰۹۴ھ-۱۶۸۲ء) میں ملتا ہے۔

منج ایسا نزاسی بھی اپچیا ہے کئیں
ندی کے کنارے سوں پیاسا ہوں میں

اگرچہ اہل لکھنؤ آج "کا ایسا" اور "ایسا" دونوں یکساں طور سے استعمال کرتے ہیں لیکن میرا قیاس ہے کہ اوّل "ایسا" مثل کے معنوں میں استعمال ہوا اس کے بعد "سا" اور "جیسا" کے قیاس پر حرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اردو میں لفظوں کی تاریخ اور ان کے قواعدی ارتقا پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لئے جب تک اچھا خاصہ مواد نہ ہو محض اٹکل سے آخر کے ان دو استعمالوں کی صحیح اور قطعی تاریخ کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ تاہم اس قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب دریائے لطافت کی تصنیف کا ڈول ڈالا گیا "کا ایسا" اردو میں مستعمل نہ تھا اور اگر تھا تو فصیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انشا کی خالص ہندوستانی زبان کی ایک نا تمام مثنوی کا ذکر "معاصر" (پٹنہ) نے کیا ہے جس کا ایک شعر ہے:

بچھڑ جاتے تھے جو کبھی اک گھڑی　　تو لگتی تھی ساون کی ایسی جھڑی

---

[1] مضامین شرر ج ۱، حصہ ۲، ص ۴۰۵
[2] عشق نامہ فگار، ص ۱۰

"معاصر" کا بیان ہے کہ یہ مثنوی کلیات انشا کے مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں میں نہیں۔ کلیات کے صرف دو قلمی نسخے ایسے ہیں جن میں اس مثنوی کے اشعار پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ میں ہیں[1]۔ میرا خیال ہے کہ انشا نے "جیسی" استعمال کیا اور کاتب نے اپنے محاورے کے مطابق اسے "کی ایسی" بنا لیا۔

اگر یہ مثنوی انشا کی ہے اور انشا ہی نے "کی ایسی" لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ "کا ایسا" اور "ایسا" دونوں اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں عام طور سے "سا" کی معنوں میں استعمال ہوئے۔ اوپر کی سطروں میں "ایسا" کے استعمال کی مثال میں جو شعر درج ہوا وہ قادر علی نگار عظیم آبادی کی مثنوی عشق نامہ کا ہے جس کا سالِ تصنیف ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) ہے۔

بہرحال "ایسا" کے آخر کے دو استعمالات کا رواج پورب میں ہوا اور غالب خیال یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک پورب میں یہ استعمال عام ہیں اور عالم و عامی سب "سا" کی جگہ "کا ایسا" یا "ایسا" بولتے ہیں۔ دہلی کے اہل قلم میں سے مولوی نذیر احمد نے شاید اہل لکھنؤ کی خاطر سے یا ان سے متاثر ہو کر "جیسا" کی جگہ "ایسا" استعمال کیا لیکن بہت کم اور ندرت کے ساتھ مثلاً رویائے صادقہ کا ایک جملہ ہے:

"اب تو ہندسہ اور ریاضی اور طبیعات ایسے علوم کی قدر ہے[2]۔"

(نگار) جناب شوکت سبزواری نے اس بحث میں جس تحقیق سے کام لیا ہے اور وہ جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اس کی اہمیت و صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سا، ایسا اور جیسا کے مفہوم میں کسی وقت بر بنائے محل استعمال ہلکا سا فرق بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کا تعلق زیادہ تر معانی و بیان سے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں الفاظ مترادف ہیں اور مفہوم مماثلت، سب میں پایا جاتا ہے، لیکن اظہار خیال کے بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جب صرف وجدان ہی صحیح فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان تینوں میں کس لفظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے۔

فارسی میں سا اور آسا (قطع نظر ان کے متعدد معانی سے) دونوں مفہوم مماثلت میں مستعمل ہیں۔ اردو والوں نے سا کو توجوں کا توں رہنے دیا، لیکن آسا کو ایسا کر دیا اور مفہوم دونوں کا وہی باقی رکھا جو فارسی میں پایا جاتا ہے۔ رہ گیا جیسا سو اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ فارسی چوں اور سا دونوں کا مسخ شدہ مخلوطہ ہے یا حسب تحقیق ڈاکٹر صاحب جس اور سا کا مرکب مخفف ہے لیکن جیسا ایک معنوی خصوصیت اور بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو سا اور ایسا میں نہیں پائی جاتی یعنی جس طرح فارسی میں حروف مماثلت کی تکرار سے کلام میں زور پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح اردو میں بھی (خصوصاً تعریض کے وقت) جیسا مستعمل ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مجھ سے کہے کہ "تم سے دنیا میں ہزاروں ہیں" اور میں اس کی تعریض میں کہوں کہ "مجھ سا" تو بات ہلکی رہے گی۔ لیکن اگر میں کہوں کہ (مجھ جیسا!)، تو اس میں زور پیدا ہو جائے گا۔ سا اور جیسا کا یہ نازک فرق غالباً ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں بھی ہوگا، اہل لغت نے تو اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

---

[1] معاصر، حصہ اول، ص ۵۹　　[2] رویائے صادقہ، ص ۱۸۴

ہوس لکھنوی شخصیت اور فن

حامد حسن چھپروی

اردو شاعری کے دبستانوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ دبستان کی تخریب نے دوسرے دبستان کی تعمیر کی یا ایک دبستان برباد ہوا تو اسی کی مٹی سے ایک نئے دبستانِ ادب کی بنیاد پڑی۔ اورنگ زیب کے حملوں نے دکن کی ادبی اور تہذیبی بساط منتشر کر دی تو شعر و ادب کا مرکز دکن سے دہلی منتقل ہو گیا اور جب دبستان دہلی کے باغ ادب پر خزاں کے سایے منڈلانے لگے تو لکھنؤ کا نصیب جاگا اور دہلی کے برباد شدہ ایوانوں کی مٹی سے دبستان لکھنؤ کا قصر تعمیر ہونے لگا۔ لیکن دہلی کی بہاروں کو لکھنؤ منتقل کرنے میں فیض آباد کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ دہلی جب تباہیوں کا شکار ہوئی تو دہلوی شعراء براہ راست فیض آباد آتے رہے۔ ان کی آمد کا سلسلہ کم و بیش ایک ربع صدی تک جاری رہا اور اس نے فیض آباد کے رنگِ سخن کو کافی متاثر کیا۔ اسی لئے ادبی لحاظ سے فیض آباد کا سلسلہ دبستان دہلی کی ادبی روایتوں سے ملتا ہے۔ انہیں روایتوں کا اثر تھا جس نے ایک عرصہ تک داخلیت کی شمع جلائے رکھی لیکن، درباری رنگینیوں اور نزاکت و لطافت کے مذاق عام کی تیز ہواؤں میں جلد ہی یہ شمع ٹمٹمانے لگی۔ چنانچہ جب آصف الدولہ نے اپنا دارالحکومت لکھنؤ بنایا تو اردو شاعری میں خارجی عناصر بڑی تیزی سے داخل ہونے لگے اور عروس شاعری کا سنگار "دل پر خون کی گلابی" کے بدلے گلال و عبیر اور غازہ و مسی سے ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ اس شاعری نے وہ رنگ اختیار کیا جسے مصحفی "تیغ اور بھالے کی شاعری" کہتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اودھ کی شاعری تیغ اور بھالے کی شاعری ہونے کے باوجود بھی میر کو نظر انداز نہ کر سکی اور ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اسی لئے آصف الدولہ کے عہد حکومت کے آخری دولوں میں اگر جرأت اور ان کے شاگردوں کی خارجیت پسندی نظر آتی ہے تو دوسری طرف مصحفی اور ان کے شاگردوں کی داخلیت پسندی بھی سامنے آجاتی ہے۔ چونکہ یہ دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اس لئے ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتی رہیں۔ خود مصحفی خارجی شاعری سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ ان کا انداز ان دونوں طرزوں کا امتزاج ہے۔ یا یوں کہیے کہ دہلی اور لکھنؤ دونوں کی روایات کا امتزاج پہلی بار ہمیں مصحفی کے یہاں ملتا ہے بعد ازاں اس انداز کو ان کے شاگردوں نے پروان چڑھایا جن میں آتش اور ہوس سر فہرست ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہوس کے کلام پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی جس کا وہ مستحق تھا۔ تذکروں میں جہاں کہیں اس کا ذکر ملتا ہے وہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ بہرحال، اس مضمون میں مختلف تذکروں کی روشنی میں ہوس کی شاعری اور شخصیت کا تعارف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

ہوس کا اصل نام مرزا تقی تھا۔ باپ کا نام نواب مرزا علی خاں تھا۔ دادا نواب اسحاق خاں محمد شاہ، بادشاہ دہلی کی طرف سے گجرات کے صوبہ دار مقرر ہوئے[1]۔ ہوس لکھنؤ کے محلہ سرائے معالی خاں میں ۱۱۹۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۰ھ میں بہ عمر

[1] آب بقا خواجہ عشرت لکھنوی

۲۰ سال وفات پائی اور کربلائے تال کٹورہ (لکھنؤ) میں دفن ہوئے۔ نواب مرزا تقی ہوس کے یہاں چونکہ دولت کی فراوانی تھی ر شعر و سخن کا ذوق تھا اس لئے اکثر شعراء ان کے دربار سے منسلک رہے جن میں میر حسن، طالب اور مصحفی کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے[1] مصحفی اور میر حسن تو ان کے استاد بھی تھے۔ تذکرہ عشقی میں مرقوم ہے کہ

"مرزا تقی ہوس لکھنوی، نواب آصف الدولہ سالار جنگ کے رشتہ دار، ذی علم شخص اور مصحفی کے شاگرد ہیں۔"

شیخ غلام محی الدین قریشی مبتلا و عشق میرٹھی مولف طبقات سخن (سن تصنیف ۱۲۲۲ھ) نے لکھا ہے:۔

"مرزا علی خاں لکھنوی کے بیٹے اور لیلیٰ و مجنوں کے مصنف ہیں۔"

تذکرہ دیوان جہاں مرتبہ کلیم الدین احمد میں مرقوم ہے کہ:۔

"ہوس تخلص۔ نام مرزا تقی خاں۔ نواب مرزا علی خاں کے بیٹے، نواب اسحاق خاں کے پوتے۔ اب لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں (صفحہ ۲۷۹)

اس تذکرہ کا سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء ہے اس لئے مصنف کے بیان کے مطابق ۱۸۱۲ء میں ہوس لکھنؤ میں موجود تھے۔

نصیر الدین ہاشمی اپنے مقالہ "لکھنوی شعراء کے قلمی اردو دیوان کتب خانہ نواب سالار جنگ میں" مطبوعہ "نیا دور" ی ۱۹۶۰ء میں رقمطراز ہیں:۔

"مرزا محمد تقی خاں المتخلص بہ ہوس میر حسن کے شاگرد تھے۔ سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے دربار سے تعلق تھا"

تذکرہ شعرائے اردو[2] سے پتہ چلتا ہے کہ:۔

"میر تقی ہوس لکھنوی، شخصے مشاق بود۔ مضمون سوز و گداز می گفت۔ روزے چند است کہ ازیں دار ہوس رفت" (صفحہ ۸)

اس تذکرہ کے سن تصنیف سے ہوس کا سنہ وفات معلوم ہو سکتا تھا لیکن اس پر سن تصنیف درج نہیں ہے۔ تذکرہ نادر رتبہ سید مسعود حسن رضوی میں بھی ہوس کے متعلق محض چند الفاظ ملتے ہیں:۔

"ہوس، نواب مرزا تقی خاں ابن نواب مرزا علی شاگرد میاں مصحفی، صاحب مثنوی لیلیٰ مجنوں۔" (صفحہ ۱۸۰)

محمد مبین الدین کیفی نے "جواہر سخن" جلد دوم میں لکھا ہے:۔

"مرزا محمد تقی خاں نام۔ ہوس تخلص۔ نواب مرزا علی خاں کے بیٹے اور نواب آصف الدولہ کے قریبی عزیز تھے۔ وطن فیض آباد ور مسکن لکھنؤ تھا۔ نہایت فارغ البال اور خوش حال تھے۔ ہوس مصحفی کے شاگرد تھے مگر استاد کے طرز کی تقلید نہیں کی۔ اپنا راستہ لگ بنایا۔ ان کے یہاں آمد کم آورد زیادہ ہے۔ پھر بھی ان کا کلام لطف سے خالی نہیں۔ عبارت کی چستی اور فارسی ترکیبوں کی کثرت میں پنے ہمعصروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔" صفحہ (۸۱ھ)

سعادت خاں ناصر اپنے تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا"[3] میں رقمطراز ہیں:۔

"شاعر مسیحی نفس نواب مرزا محمد تقی خاں تخلص ہوس خلف الصدق نواب مرزا علی خاں زیور فضل و کمال سے آراستہ و پیراستہ سب و نسب ان کا محتاج شرح و بیان کا نہیں۔ چند شاعر ہمیشہ اس سرکار میں مثل میر حسن و طالب علی عیشی و میاں مصحفی نوکر ۔۔۔۔۔۔۔ قصہ کوتاہ "مثنوی لیلیٰ مجنوں" اور دیوان معہ قصائد اس امیر نامدار سے یادگار ہے۔" (صفحہ ۱۳۱)

---

[1] تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا۔ ناصر لکھنوی، قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش خاں پٹنہ

[2] قلمی نسخہ (مخطوطہ نمبر ۱۱) کتب خانہ خدا بخش خاں۔ پٹنہ [3] قلمی نسخہ۔ خدا بخش خاں لائبریری۔ پٹنہ۔

صفیر بلگرامی تذکرہ جلوہ خضر میں لکھتے ہیں :۔

"یہ کیفیت تمام ہونے پر تھی کہ مرزا تقی ہوس کی آمد ہوئی ۔ میر حسن نے ان کی خبر پاکر تعظیم کی اور لوگوں نے اٹھ کر بہت آؤ بھگت سے بٹھایا ۔ یہ امیر زادے تھے ۔ مرزا محمد تقی خاں نام تھا ۔ خلف مرزا علی خاں بن نواب سالار جنگ باشندۂ فیض آباد مقیم لکھنؤ شاگرد مصحفی ۔

آتے ہی پہلے گفتگو یہ کی کہ میں اس لیئے آیا ہوں کہ میر حسن نے مثنوی بدر منیر جو کہی ہے اس کی شہرت بہت ہوئی مگر میں نے بھی ایک مثنوی لیلےٰ مجنوں کہی ہے چاہتا ہوں اہل سخن اس کی بھی داد دیں ۔ میر حسن کو یہ کہنا ناگوار ہوا مگر کیا کر سکتے تھے کہ ان کے متوسل تھے ۔ بولے! بہت مناسب ہے ۔ مگر میرے نزدیک اس مجمع میں مثنوی کا پڑھا جانا لطف نہیں ہے ۔ اس کے لیئے خاص جلسہ کیا جائے گا اور میری اور میر تقی کی مثنوی اور آپ کی مثنوی کا مزا دیکھا جائے گا ۔ اس وقت کچھ اشعار عاشقانہ غزلوں سے پڑھیئے ۔ مرزا تقی ہوس نے بھی اس کو گرچہ قبول کیا مگر ذرا بے دلی سے . . . . ان کا قاعدہ تھا کہ لیلیٰ مجنوں کا ذکر اشعار میں بہت کرتے تھے ۔"

(جلوہ پنجم ، خاتمہ کیفیت ششم صفحہ ۱۹۴ ، ۱۹۵)

خواجہ عشرت لکھنوی نے تذکرہ آب بقا میں ہوس کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں :۔

"نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس شوستری شاگرد مصحفی و میر حسن دہلوی خلف نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ ابن موتمن الدولہ نواب اسحاق خاں صوبہ دار گجرات ۔ مالک بن ابراہیم کی نسل سے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ نواب محمد اسحاق خاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی طرف سے صوبہ دار مقرر ہوئے اور امت الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ زوجہ شجاع الدولہ بہادر، موتمن الدولہ بہادر کی بیٹی اور نواب مرزا علی خاں دلاور جنگ کی بہن تھیں ۔ اس صورت میں نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس بہو بیگم صاحبہ کے بھتیجے ہوتے ہیں ۔ عہد آصف الدولہ میں فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے اور مفتی گنج میں سکونت اختیار کی ۔ میر تقی میر کے زمانے میں ان کی اس قدر شہرت نہ تھی ۔ ابتدائی شاعری تھی ۔ ناسخ کی طرح متروکات زبان انھوں نے بھی قائم کئے اور جو کچھ کہا دہلی کے رنگ میں کہا ۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے ۔ طبیعت میں رنگینی اور کلام میں بہت شوخی تھی ۔ معاملہ بندی میں مشہور ہوئے ۔ آخر میں بہت شہرت پائی ۔" (صفحہ ۱۲۴)

نیاز فتحپوری رقمطراز ہیں :۔

"اس دور کا ذکر ناتمام رہے گا اگر مصحفی کے شاگرد نواب مرزا تقی خاں ہوس کا ذکر نہ کیا جائے ۔ یہ اصل میں فیض آباد کے رہنے والے تھے لیکن نشوونما لکھنؤ میں ہوئی ۔ ان کا زمانہ ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۴۰ھ کے درمیان رہا ہوگا ۔ تذکروں میں کہیں ان کا ذکر نہیں پایا جاتا ۔ بڑے بے مثل شاعر تھے ۔"

(نگار، جنوری ۱۹۳۵ء)

مصنف تذکرہ "بہارستان ناز" نے ہوس کی دو لڑکیوں کا ذکر کیا ہے ۔ یہ دونوں شاعرہ تھیں ۔ حیا اور بار ۔ حیا اور بار تخلص تھا بار ساعمر بھر ناکتخدا رہی ۔ کیونکہ بقول صاحب تذکرہ "بہارستان ناز"۔

"اس صاحب عصمت کا نکاح خود نواب صاحب مرحوم نے اس وجہ سے نہیں کیا کہ کسی شخص کو نسبت دامادی دینے میں ننگ و عار تھا ۔"

(صفحہ ۲۲ ، ۲۳)

بہرکیف ! پارسا کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے :-

تن صورت حباب بنا اور بگڑ گیا
یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا

تذکرہ بہارستان ناز میں حیا کے مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں :-

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا — اب تو گہر میں عکس ہما تا ہے یار کا
دل میں اک بوند تو رہنے دے لہو کی میرے — چشم خوں بار تیرے ہاتھ سے دم ناک میں ہے
بنگئی کان کی بالی تلک اونکی بجلی — گرمئ حسن غضب روئے غضب ناک میں ہے
نہ سُنئے گا کبھی بھولے سے بھی قصہ محبت کا — اڑا دیتی ہے نیند ایسا اثر ہے اس کہانی کا

ہوس کی شخصیت اور ان کے خاندانی حالات کے متعلق اردو تذکرے ہمیں اس سے آگے نہیں لے جاتے۔

ہوس کے کسی مطبوعہ دیوان کا پتہ نہیں چلتا لیکن قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ان کی غزلیات کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ نواب سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہے۔ اس کا سائز ۸ ½ × ۵ ½ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون لکھنوی شعراء کے قلمی اردو دیوان - کتب خانہ نواب سالار جنگ میں (مطبوعہ "نیا دور" مئی ۱۹۶۰ء) میں اس دیوان کو ۱۵۵ صفحات پر مشتمل بتایا ہے اور سنہ کتابت ۱۲۴۴ھ لکھا ہے لیکن اپنے مضمون "مرزا تقی ہوس کے دیوان کے قلمی نسخے" مطبوعہ "ہماری زبان" ۸ اگست ۱۹۶۴ء میں اس دیوان کے متعلق لکھتے ہیں "کتب خانہ سالار جنگ کا قلمی نسخہ (۸ ½ × ۵ ½) سائز کے ۵۵ صفحات پر مشتمل ہے اور کتابت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی ہے"۔ معلوم نہیں موصوف کے ان دو مختلف بیانات میں کون صحیح ہے؟ ہوس کا ایک دیوان انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانہ میں بھی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد) میں دیوان کے علاوہ ایک کلیات بھی موجود ہے۔ دیوان کا سائز (۹ × ۶) ہے اور صفحات ۲۵۰ ہیں۔ اس میں غزلیات، قصائد، مخمس اور رباعیات کے علاوہ منظوم خطوط بھی شامل ہیں۔ کلیات (۱۵ × ۸) سائز کے ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان اور کلیات دونوں کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :-

نقوش کلک قسمت میں ہے اندیشہ کو حیرانی
پڑھا جاتا نہیں ہرگز کسی سے خط پیشانی

سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کے کتب خانہ میں بھی دیوان ہوس کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ رباعیات، مخمسات، ترکیب بند، مثنویات اور ایک مرثیہ پر مشتمل ہے اور اس کی تاریخ کتابت ۴ محرم ۱۲۸۸ھ ہے۔ دوسرے نسخہ میں سوائے مثنوی اور مرثیہ کے تمام چیزیں موجود ہیں۔ قصائد کا اس میں البتہ اضافہ ہے۔ اس پر تاریخ کتابت درج ہے۔ لیکن بقول مسعود حسن رضوی صاحب یہ پہلے نسخہ سے قدیم تر ہے۔ ہوس کی مشہور مثنوی "لیلیٰ مجنوں" (جو دراصل جامی کی مثنوی کا ترجمہ ہے) کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور کتب خانہ خدا بخش خاں پٹنہ میں موجود ہیں۔ یہ مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بتایا گیا ہے، ہوس کے زمانے میں دو شعری تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایک مصحفی اور ان کے شاگردوں کی داخلیت اور دوسرے جرات وغیرہ کی خارجیت۔ داخلیت سے ادب میں وزن میں پختگی پیدا ہوتی ہے لیکن بغیر خارجیت کے اس میں حسن و رعنائی نہیں پیدا ہو سکتی۔ داخلیت سے فن میں گرمی تو پیدا ہوتی ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ داخلیت کی تندی سے آبگینۂ فن پگھل بھی جاتا ہے۔ اسی طرح محض خارجیت سطحیت کی دلیل ہے۔ فن میں جب تک فن کار کی روح اور جذبہ

کا گداز شامل نہ ہو تب تک اعلیٰ فن پارہ جنم نہیں لیتا۔ بڑے فن کاروں کے یہاں داخلیت اور خارجیت گھلے ملے ہیں اور اعلیٰ فن میں خارجی اور داخلی دونوں میلانات کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ ہوسؔ نے ایک باشعور فن کار کی طرح ان دونوں تحریکوں سے اثرات قبول کئے اور ان دونوں میلانات کے امتزاج سے ایک نئی قوسِ قزح تخلیق کی۔ ان کے یہاں داخلی سوز و ساز بھی ہے اور خارجی رنگ و جمال بھی۔ ان کے فن میں اگر ایک طرف داخلی گداز اور گہرائیاں ملتی ہیں تو دوسری طرف معاملہ بندی کی چاشنی زبان کی صفائی و طرح داری اور الفاظ کی تراش و خراش بھی۔ آتشؔ بھی اسی اندازِ تغزل کے متوالے تھے۔ مگر آتشؔ اور ہوسؔ کے درمیان فرق ہے۔ میرے خیال میں آتشؔ کی شاعری میں خارجیت اور داخلیت کا امتزاج تو ہے لیکن شاعری زیادہ ترجمانی اور جسی ہے۔ یہی ان کی شاعری کا دسطی دھارا ہے۔ برخلاف اس کے، ایک احساسِ غم اور ایک المیہ فضا ہوسؔ کی پوری شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ ان کے یہاں ہر جگہ میرؔ کا درد و گداز، یاس و ناکامی کا احساس اور حرماں نصیبی کا انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی لئے بقول نیاز فتحپوری "ان کے کلام میں بالکل میرؔ کا لطف آتا ہے۔" یہ ٹھیک ہے کہ ان کے یہاں ہڈیوں کو پگھلا دینے والا غم نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ میرؔ کے سامنے اجڑی ہوئی دلّی تھی اور ہوسؔ اس لکھنؤ میں سانس لے رہے تھے جہاں بقول سحرؔ "ہر اک گھر خانۂ شادی ہر اک کوچہ ہے عشرت کا" اس لئے ظاہر ہے کہ ان کے غم میں میرؔ کا پورا انداز نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی ہوسؔ نے لکھنوی ماحول سے متاثر ہونے کے باوجود میرؔ کے تغزل کی شان باقی رکھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ میرؔ نے جس رنگِ تغزل کو پیدا کیا تھا اس کے رنگ و آہنگ کو۔ بہار میں راسخؔ عظیم آبادی اور لکھنؤ میں ہوسؔ نے نبھایا۔ ہوسؔ کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

جس سے کل خون میں ڈوبا قفس اے مرغِ اسیر
تو نے پھر آج وہی زمزمہ بنیاد کیا

سینہ کے داغ دیکھ لیے میرے خلق نے
وحشت میں پھاڑ کر میں گریباں خجل ہوا

شغلِ شبِ تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا
دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا
نزع میں ہم نے عجب طرح سے دل شاد کیا
آئی ہچکی تو کہا اس نے ہمیں یاد کیا

اگرچہ آج ہے بالینِ سنگ و بسترِ خاک
کبھی تو سر مرا آغوشِ یار میں بھی تھا

حالِ بیمارِ عشق مت پوچھو اب تو ہر دم نفس شماری ہے

ان دنوں لے ہوسؔ میرے ہمراہ
نالہ و درد و آہ و زاری ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہوسؔ کا سلسلہ مصحفی سے لے کر دبستان میرؔ تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن ان کے اشعار میں بقول
ت لکھنوی میرؔ کے زمانے کے متروک الفاظ کہیں نظر نہیں آتے، نہ ٹک ہے نہ پٹ ہے نہ لالیاں کا لیاں:
دہلی جب تباہیوں کا شکار ہوئی اور جب اردو شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا تو یہاں اردو غزل سے
وف واخلاق یکسر خارج ہوتے چلے گئے اور یہ معاملہ بندی اور ہوسناکی کا شکار ہوتی گئی۔ مگر دردؔ نے تصوف کی جو روایت
م کی تھی لکھنؤ میں مصحفی نے اسے برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہوسؔ کے یہاں بھی صوفیانہ اشعار مل جاتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں:

عدم سے ترا شوق لایا ہمیں
غرض تو نے یہ دن دکھایا ہمیں

تہمت دید ہم پہ ناحق ہے کون کہتا ہے، ہم نے کب دیکھا
روز و شب دیکھتے رہے لیکن روز دیکھا نہ اس کو شب دیکھا

ہوسؔ لکھنؤ کے جس ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ اس میں لفظی بازیگری، خارجی پیکر تراشی، ظاہرداری وغیرہ برتنا
ب کا عام مذاق ہو گیا تھا۔ ہوسؔ کا ان سے متاثر ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اس لئے ان کے یہاں عصری میلانات کی جھلکیاں ملتی ہیں اور
بار رعایت لفظی اور معاملہ بندی نظر آتی ہے لیکن ان کے یہاں ان دونوں میلانات میں تصادم نہیں ہے اور وہ ہر جگہ توازن
رار رکھتے ہیں۔

آخر میں ہوسؔ کے چند اشعار اور پیش ہیں ؎

کہاں کی نیند آگئی الٰہی مسافران رہ عدم کو
کچھ ایسا سوئے کہ پھر نہ چونکے تھکے انہیں ہم جگا جگا کر

ہوس کا دل ترے جانے سے اب ہے منزل غم
کبھی خوشی کا گذر اس دیار میں بھی تھا
اٹھا جو خاک رہ قیس سے بگولا سا
اک اضطرار سا پیدا غبار میں بھی تھا

بال و پر جھڑ گئے جب کنج قفس میں میرے
بے ستم تب مجھے صیاد نے آزاد کیا

برگ گل لوٹتا ہے کیوں خوں میں اس نے کس نازنیں کا لب دیکھا

دل کا مرے کام ہو چکا اب
قصہ ہی تمام ہو چکا اب
نقارۂ کوچ پر صدا ہے
چل یاں سے مقام ہو چکا اب

کیا جانیں کیا غضب ہے تری جادو بھری نگاہ
غش کر گیا ہوں میں جسے اک بار دیکھ کر

پھنسا یا تھا دل زلف میں لے ہوس
خدا ہی نے واں سے چھڑا یا ہمیں

ہوا قطع رشتۂ زندگی تیری تیغ سے تو بجا ہوا
میرا سر بھی دوش پہ بار تھا، مرا تن بھی مجھ پہ وبال تھا

رنجش کا انھوں نے بھی کیا وقت نکالا ہے
مجھ سے وہ بگڑتے ہیں جب خوب سنورتے ہیں

مرغوب جنوں پائی پوشاک نہ جب کوئی
ہم جامۂ عریانی لاچار پہن نکلے

کیونکر نہ ہوس جاوے صدقے فلک نیلی
نیلم ہے یہ سب گہنا جب یار وہ پہن نکلے

جب شال سرخ اوڑھی اس نے ہوس میں اس دم
دیکھا شفق میں پنہاں خورشید خاوری کو

کلامِ ذوق میں الحاق

محمد انصار اللہ نظر

تحقیق کا کام اس وقت اور بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات میں الحاق کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ الحاق عموماً درجۂ اول کے فن کاروں کے یہاں ہی ہوتا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں جن پر ہمیں نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ہی کے دیوان کو لے لیجئے، اس میں بھی الحاق ہوا اور ہر طرح ہوا، اس میں ہمیں الحاق کی مختلف صورتوں اور وجہوں کی دریافت میں آسانی ہو سکتی ہے۔

ذوق کی ابھی ابتدا تھی، لیکن تیز طبع تھے خوش فکر تھے، اچھے شعر کہتے تھے، استاد نصیر سے مشورہ کرتے تھے۔ استاد نصیر لکھنؤ گئے ساتھ میں ان کے فرزند شاہ وجیہ الدین منیر بھی تھے، مصحفی سے بھی ملے، دونوں نے اپنا کلام مصحفی کو سنایا ہوگا، شعر پسند آئے مصحفی کے حافظہ میں محفوظ ہو گئے، تذکرہ لکھتے وقت مصحفی نے منیر کا بھی ذکر کیا، تعریف کی اور کہا کہ " جوان خوش فکر است " اور ایک مطلع لکھ دیا۔

مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے ۔۔۔ رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے

(ریاض الفصحا صفحہ ۳۱۹)

اب معلوم نہیں منیر نے یہ مطلع خود مصحفی کو سنایا تھا یا کسی اور ذریعہ سے مصحفی تک پہنچا اور منیر کا خیال ان کو رہا انھوں نے ان ہی کے نام سے لکھ دیا، ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ ذوق سے مصحفی واقف نہ تھے ورنہ ذکر ضرور کرتے، یہ امر مسلّم ہے کہ یہ مطلع ذوق کا ہے تمام تذکرے اور انتخابات اس پر شاہد ہیں، اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کے اشعار بھی پڑھ کر داد طلب ہوتے ہیں۔

سلاست ذوق کے کلام کا جوہر ہے، اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے میر سے تاثر لیا اور خود تو وہ یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ یاروں کو میر کا طرز نصیب نہیں ہوا۔ گویا خود انہیں میر کے انداز کا شعر کہنے کا ملکہ ہے، یہ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ میر اور ذوق میں کوئی نہ کوئی مناسبت ضرور ہے شاید یہی سبب ہوا کہ خواجہ فخر الدین سخن نے اپنی داستان میں ذوق کے نام سے ایک شعر یہ بھی لکھا ہے

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا ۔۔۔ بے چارہ سینہ چاک گریباں دریدہ تھا

(سروش سخن)

لیکن میر حسن کا تذکرہ جو ذوق کی پیدائش سے پہلے مکمل ہو چکا تھا اس میں یہ شعر میر تقی میر کے نام سے درج ہے (صفحہ ۱۵۱)

البتہ دوسرے مصرعہ میں "سینہ چاک" کے بجائے "گریہ ناک" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر ذوق کا نہیں ہو سکتا، لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اس میں سخن کی نیت بہرحال اچھی ہی تھی۔

آزاد لکھتے ہیں کہ ذوق کی غزلیں "گلدستہ" ہیں، اور اگر یہ صحیح ہے تو دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ پھر تو ہر شاعر کا کلام یہاں چھپ سکتا ہے۔ دیکھئے جہاندار کا شعر تھا:

آخر گِل اپنی صرف درِ مے کدہ ہوئی ——— پہنچے وہاں ہے خاک جہاں کا خمیر ہو

(گلشن بے خار)

یہ شعر دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں اس طرح چھپ گیا:

آخر گِل اپنی خاک درِ میکدہ ہوئی ——— پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اسی طرح دیوان ذوق میں آزاد نے یہ دو شعر بھی لکھے ہیں:

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے ——— جو کور ہو عینک سے اسے کیا نظر آئے

فردوس میں ذکر اس لب شیریں کا گر آئے ——— پانی دہن چشمۂ کوثر میں اُتر آئے

کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار "مولوی وضع" "ذوق" ضرور کہہ سکتے تھے، لیکن اسے کیا کیجئے کہ خود آزاد ہی نے ان دونوں اشعار کو آب حیات (ص ۲۹۶) جرأت کے نام سے لکھا ہے، اگر آزاد کی نیت کا خلوص تسلیم کیا جائے تو اس سے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ ....." حافظ ندارد "

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی شاعر ایک ہی زمین میں شعر کہتے ہیں۔ ان ہم طرح غزلوں میں کچھ شعر ہمیں پسند آجاتے ہیں، چونکہ یہ اچھے ہوتے ہیں اسلئے فطری طور پر ہم ان کو اچھے شاعر کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذوق اور ظفر دونوں نے ایک طرح میں غزل کہی میرزا قادر بخش صابر کو یہ شعر پسند آیا:

ہم نے اس بت میں جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے ——— کہ مبادا کہیں سُن پائیں شریعت والے

میرزا صاحب نے اسے استاد ذوق سے منسوب کر دیا، اور اپنے تذکرہ میں ان کے اشعار کے ساتھ لکھ دیا حالاں کہ یہ شعر ذوق کی غزل کا نہیں ہے۔ ظفر کے کلیات میں آج بھی موجود ہے۔

شعر کہنے کے لئے کبھی کبھی شاعر کسی دوسرے استاد کا کوئی مصرعہ یا شعر لے لیتا ہے اور اس پر غزل کہتا ہے۔ مثلاً ناسخ کی ایک غزل پر شعر کہنے کے لئے شاید ذوق نے ان کا ایک مطلع لیا۔

سرو عاشق ہو گیا اس غیرتِ شمشاد کا ——— غل مچایا قمریوں نے بھی مبارک باد کا

آزاد نے دیوانِ ذوق مرتب کیا، انھوں نے اس مطلع کو بھی استاد ذوق کی غزل میں شامل کر لیا، اس کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں، ذوق اور ظفر دونوں نے ایک طرح میں غزلیں کہیں، غلطی یہ ہوئی کہ ذوق کا مطلع سرور نے ظفر کے نام سے

دیا۔

نعل شکلِ مہ نو جب ترے توسن کو لگے ——— چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

(تذکرہ سرور صفحہ ۲۱۴)

بعد میں یہ غلطی گلشن بے خار سے ہوتی ہوئی گلستانِ بے خزاں تک پہنچی، لیکن ایک مدت کے بعد دیوان ذوق کے مرتبین نے غلط طور پر اسے ذوق ہی کے دیوان میں لکھ لیا، اسی طرح یہ شعر گلشن بے خار میں ظفر کے نام سے لکھا گیا۔

چار ٹکڑے کرو دل کے کہ نہیں ہو سکتا ——— لب کو دوں رُخ کو نہ دوں، زلف کو دوں تل کو نہ دوں

صہبائی نے شاید سب سے پہلے یہ لکھا کہ "یہ شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کا شعر ہے"

(رسالہ قواعد صرف نحو اردو صفحہ ۱۳۱)

اور اس طرح اس الحاق کا پتہ چلا، تمام مرتبین دیوان ذوق نے بھی اسے ذوق کا مانا ہے۔ استاد اور شاگرد کا تعلق بھی عجیب ہے۔ استاد اکثر شاگرد کو شعر کہہ کر دے دیتا ہے۔ ذوق نے بھی یہ کیا، انھوں نے ایک غزل ظفر کو دی جس کا ایک شعر یہ ہے:

اُلفتِ سوزِ غم ہر نقطہ ہیں یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں ——— کہ مثل قط گیر خط پہ خط ہیں ہنوز باقی ہر استخواں پر

آزاد کہتے ہیں جب بادشاہ کا دیوان آیا تو والد نے اس غزل کو بھی اس میں دیکھ کر افسوس کیا (دیوان ذوق صفحہ ۱۱۳)

دیران وغیرہ نے یہ غزل دیوان ذوق میں نہیں لکھی، یہ جرأت بھی شاید آزاد ہی نے پہلے کی، صہبائی کو اس غزل کے دے ڈالنے کا علم نہیں تھا۔ انھوں نے شعر مذکور کو رسالہ قواعد صرف و نحو اردو میں دو مرتبہ نقل کیا اور کہا کہ "شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ" (صفحہ ۵، صفحہ ۱۷۳) اس قسم کی باتیں اکثر استادوں شاگردوں کے درمیان مل سکتی ہیں۔

لیکن یہاں تک الحاق کی صرف وہ صورتیں سامنے آئی ہیں جن میں بہرحال خلوص نیت شامل حال ہوتا ہے، اس سے خطرناک صورت وہ ہوتی ہے جب عمداً ایسا کام کیا جائے، اس کی مثال بھی دیکھ لیجئے۔ آزاد نے ایک طویل تمہید کے بعد دیوان میں دو شعر لکھے کہ یہ استاد کے "لڑکپن ملکہ بچپن" کے ہیں اور ایک "مجہول آدمی" نے ان کو سنائے تھے خود استاد نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ یہ شعر انہی کے ہیں۔ سنئے:

نامۂ شوق کو مرے باندھے جو تو نے بال و پر ——— کیوں ارے مرغ نامہ بر تجھ کو ہوئے وبال پر

مصحف روئے یار میں دیکھا ہے موجو خال پر ——— لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

ان اشعار کو اور ان کی تمہید کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ آزاد نے واقعی کس قدر دیدہ ریزی اور جانکاہی سے استاد کا کلام جمع کیا ہے۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ اشعار خود آزاد کے دیوان میں دیکھتے ہیں اور اس طرح:

نامۂ شوق کو مرے باندھے اگر تو بال و پر ——— کیوں ہوئے مرغ نامہ بر تجھ کو ترے وبال پر

مصحف روئے یار میں مو ہے جو دیکھا خال پر ——— لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم خط میں چنے کی دال پر

کیا یہ صحیح ہے کہ وہ "مجہول آدمی" خواہ آزاد ہی ہے جس نے یہ اشعار دیوان ذوق میں لکھے؟ خیر پوری غزل سنئے:

سبزۂ خط کے شوق میں دل نہیں اپنے حال پر ——— طائر دل وہ اڑ رہا ہے ورق الخیال پر

شوق تو دل کا اسے پری دیکھ کے گل کے کان میں ——— بیٹھا فسانہ کہتا ہے گلبن نونہال پر

۱۔ صفحہ ۱۱۳ تا صفحہ ۱۱۴

صید افگن کدھر کو ہے دیکھ تو اے مرغ دل —— لپٹے ہوئے قفس کو ہیں لوٹ رہے ہیں جال پر
دشتِ جنوں میں قیس کو خاک بھی دے دو پیرہن —— منتِ قاصدِ صبا لیتا ہے بال بال پر
چھوڑ دے خط کو ہاتھ سے ذوق پہنچ رہے گا یہ —— اس کو صبا اڑائے گی ہوں گے ترے خیال پر

(مجموعہ نظم آزاد مطبوعہ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۸۹۹ء مرتبہ مولوی سید ممتاز علی ص۱۱۱)

اور بھی تعجب خیز چیز یہ ہے کہ غزل میں تخلص ذوق کا ہے، اس موقع پر ایک واقعہ ذہن میں رکھیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔
"ایک بار کوہ نور کے ایڈیٹر سے آزاد نے کہا کہ میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شائع کرتا ہوں اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شائع کرتا۔"
اگر آزاد پر وہ الزام غلط تھا تو ان کے دیوان میں غزل مذکور کے ہونے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ واضح رہے کہ سید ممتاز علی آزاد کے ارشد تلامذہ میں ہیں ان کو اگر شبہ بھی ہو گیا ہوتا کہ یہ غزل آزاد کی نہیں تو وہ اسے ان کے دیوان میں شامل نہ کرتے بات ایک ہی غزل کی نہیں" غزلیں اور بھی ذوق تخلص کی مجموعہ نظم آزاد میں ملتی ہیں حاضر ہیں:

گر تصور میں نگارِ خطِ جاناں ہوگا —— پھر تو جو خط میں لکھا ہے خطِ ریحاں ہوگا

ہاتھ جو میں گئے مرے گبر و مسلماں دونوں —— ایک ہی دستِ صنم ایک میں قرآں ہوگا
غنچۂ دل کو مرے توڑ کے خوش ہوتے ہو کیا —— وہ ہی گل ہے کہ جو پھولا تو گلستاں ہوگا
دل نہیں ہے تو نہ ہو دیکھو تو سینہ میں ہے کون —— مجھ سا دل دادہ بھلا کوئی مری جاں ہوگا
دل ہے اپنا کہ جہاں ہوتے قدم خاک ہے یہ —— یا کسی زلف میں ہوگا تو پریشاں ہوگا
بارِ تسلیم ہوا پیش کہ دیکھو اس کو —— کون سمجھا تھا اٹھائے گا تیر انساں ہوگا
ذوق کا دل ابھی روتا ہے ابھی ہنستا ہے —— زیرِ شبنم کہیں دیکھا گلِ خنداں ہوگا

(صفحہ ۱۱۳)

رات سونے کے لئے تھی اب ہے رونے کے لئے —— دن رہا باقی سو ہے وہ جان کھونے کے لئے
ناخدائی کی وہیں موجِ تبسم نے تری —— گریہ جب آیا مری کشتی ڈبونے کے لئے
چشم کے چشموں پہ میرے مردم دیدہ نہیں —— پتلیاں بیٹھی ہیں در موتی پرونے کے لئے
ذوق جو کشت امل تھی ہوگئی سرسبز یاں —— اب ہے کیا باقی جو پھر آئیں گے بونے کے لئے

(صفحہ ۱۱۵)

یہ تو چند مثالیں ہیں، ورنہ دیوانِ ذوق میں اس قبیل کے الحاقی اشعار اور بھی مل سکتے ہیں، ان کے محرکات کا تفصیلی مطالعہ یقیناً ایک اہم کام ہوگا لیکن جتنا اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔

★

شمس العلما مولوی عبدالرحمان دہلوی

سید یوسف بخاری دہلوی

۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ ہم دلی مرحوم کے اردو بازار میں جامع مسجد کے زیر سایہ ایک میخانۂ ادب کھولے بیٹھے تھے۔ جامع مسجد
۔ قدیم تعلق اور اس نسبت خاص سے کہ حضرت شاہ جہاں بادشاہ غازی نے جامع مسجد کو "مسجد جہاں نما" کے نام سے موسوم فرمایا تھا
نے اس میخانے کا نام "مکتبۂ جہاں نما" رکھا تھا دلی کا "اردو بازار" بھی دلی کے ناشروں اور کتب فروشوں کی ایک ادبی اور تاریخی
ار ہے۔ یہ آج بھی وہاں اسی نام سے باجتا ہے لیکن اس کے بانیوں میں سے، جس میں یہ راقم بھی شامل ہے، اب دو چار کے سوا
ہاں کوئی نہیں رہا۔ جن کے دم سے یہ بازار گرم اور شاد و آباد تھا وہ اس اجڑے دیار سے کالے کوسوں دور اس خاک پر خانہ بدوش
منتشر پڑے ہیں۔ ہائے کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ سدا رہے نام اللہ کا۔

اسے پیرایۂ آغاز سمجھئے یا اس تذکرے کا پس منظر، اسی مکتبہ کی بدولت ہم اپنے ممدوح شمس العلما مولوی عبدالرحمان صاحب مرحوم
خدمت میں باریاب ہوئے۔ ڈیڑھ دو سال بعد جب ہمارے کاروبار کتب میں سرسراہٹ اور ترقی رونما ہوئی تو اس میں ہماری
ت کے پھل سے زیادہ مولوی صاحب کے دم قدم کی برکت شامل تھی ورنہ پہلے سال تو ہمارا عالم یہ تھا کہ دوکان میں خالی بیٹھے بیٹھے اکثر
ں کا یہ شعر گنگنایا کرتے تھے:

خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی
برابر مسجد جامع کے ہم نے بھی دکان رکھ دی

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ مولوی صاحب ان دنوں مشن کالج دہلی میں پروفیسر ہونے کے علاوہ دلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی،
ی اور اردو کے صدر بھی تھے۔ کالج اور یونیورسٹی کے لئے مولوی صاحب ہی کی منظوری سے کتابوں کی خریداری عمل میں آتی تھی۔ مولوی
حب کی خدمت میں شہر کے بڑے بڑے تاجر کتب پہنچتے اور کتابیں فروخت کراتے تھے اور غیر معروف تاجر ہونے کی وجہ سے ہماری
لوی صاحب تک کوئی رسائی نہ تھی۔ مولوی صاحب کے متعلق یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بہت ہی سخت واقع
ے ہیں۔

خدا کا کرنا اسی سوچ و بچار میں ہمیں اپنے میر عاشق علی مرحوم کا وسیلہ ہاتھ آ گیا۔ میر صاحب ہماری والدہ ماجدہ اشرف بیگم
حقیقی ماموں تھے۔ پرانی وضع قطع کے بزرگ، مخلص اور ملنسار ایسے کہ جگت ماموں کہلاتے تھے۔ ہم بھی انہیں نانا کے بجائے ماموں
ہا کرتے تھے۔ میر صاحب گو اردو خواندہ تھے لیکن فارسی میں بھی خاصی شدبد رکھتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں ان کا مشغلہ یا تو
العۂ تصوف تھا یا پھر عرس کے مواقع پر وہ خواجگان چشت کے درباروں میں حاضر ہو کر عرسوں میں شریک ہوتے۔ اسی لئے وہ عرف

عام میں پیر جی اور صوفی کہلاتے تھے۔ ان کا خط نہایت پاکیزہ اور منشیانہ تھا۔ دلی کے چند رؤسا کی جائدادوں کا کرایہ وصول کرتے اور ان کا حساب و کتاب رکھتے۔ بس یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ جو جائدادیں ان کے سپرد تھیں ان ہی میں گلی راجان، بازار گندہ نالہ، دہلی کا وہ مکان بھی تھا جس میں تقسیم ہندوستان سے قبل ہمارے مولوی صاحب کی رہائش تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں ہم نے میر صاحب کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ کرائے کے لین دین کے علاوہ میر صاحب اور مولوی صاحب کے درمیان کافی دوستانہ تعلقات ہیں۔ ماہ بماہ جب میر صاحب کرایہ لینے جاتے ہیں تو اس دن تصوف کی مے ان دونوں کے درمیان خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ جی بھر کر بائیس خواجہ کی چوکھٹ کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ مولوی صاحب، میر صاحب کو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے اشعار سناتے ہیں اور میر صاحب سن سن کر خوب جھومتے اور مزے لیتے ہیں۔ قصہ کوتاہ ہم نے میر صاحب کو اپنے حق میں سفارش کے لئے آمادہ کر لیا اور ایک دن انسے کرایہ وصول کرنے کے لئے گئے تو ہم بھی ان کے ہمراہ اس گوشہ نشین بزرگ عالم کی چوکھٹ پر پہنچ گئے۔

وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کا زنان خانہ صرف ایک دالان، ایک طرف ایک چھوٹی سی سہ دری اور مختصر سے صحن پر مشتمل تھا دالان سے ملحق تقریبًا دس بارہ مربع فٹ کا ایک حجرہ یا کوٹھری تھی۔ یہ مولوی صاحب کی مردانہ نشست گاہ تھی۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ دالان سے کوٹھری میں جاتا تھا اور دوسرا گلی کے رخ پر کھلتا تھا۔ ملاقاتی اسی بیرونی دروازے سے آتے جاتے۔ اس کوٹھری کے بیش طاق کے نیچے مولوی صاحب کا نواڑی پلنگ تھا۔ یہ بیک وقت پلنگ اور کرسی دونوں کا کام دیتا تھا، کیونکہ ہم نے مولانا صاحب کو ہمیشہ اسی پلنگ پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے دیکھا۔ بیرونی دروازے کے قریب دو تین سے زائد کرسیاں بھی کبھی نہیں دیکھیں۔ یہ کرسیاں ملاقاتیوں اور شاگردوں کے لئے وقف تھیں۔ بلا امتیاز اور بے تکلف سب انہی کرسیوں پر آکر بیٹھتے تھے۔ پلنگ کے پاس ایک چھوٹی سی میز تھی۔ اس پر مولوی صاحب کا قدیم وضع کا متوسط پاندان رکھا رہتا تھا اسی میز پر دوسری طرف دو تین زیر مطالعہ کتابیں یا چند علمی رسائل اور یونیورسٹی کے پمفلٹ وغیرہ رکھے رہتے تھے۔ جب یونیورسٹی کے امتحانات ختم ہو جاتے تو اس وقت اس میز پر صرف ان کا پاندان اور پرچے نظر آتے جنھیں وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے دیکھا کرتے تھے اس کوٹھری میں کوئی الماری نہ تھی، اس لئے اکثر کتابیں پیچھے طاق میں اور باقی پلنگ پر دائیں بائیں بلا ترتیب پڑی رہتی تھیں۔ قیمتی کتب اور مختلف مسودات اور لباس وغیرہ گھر میں رکھا رہتا تھے۔ یہ پہلی اور چند ابتدائی ملاقاتیں جن کا حال میں اس وقت قلمبند کر رہا ہوں اگرچہ محض ایک کاروباری اور رسمی ملاقاتیں تھیں لیکن ان سے بھی آپ یہ اندازہ لگائیں گے کہ مولوی صاحب کتابوں کے انتخاب اور خریداری میں کس قدر محتاط اور با اصول تھے اور ساتھ ہی ساتھ سادہ لوح بھی۔

میر صاحب نے مولوی صاحب سے میرا تعارف یوں کرایا "حضرت یہ میری بھانجی کا لڑکا ہے اپنے شوق کے ہاتھوں کتابوں کا دھندا کھول بیٹھا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ کتابوں کی تجارت پتھر کا اچار ہے مگر یہ نہ مانا، اب آپ سے مدد چاہتا ہے" یہ سن کر مولوی صاحب نے فرمایا "یہ تو آپ نے ٹھیک کہا کہ کتابوں کی تجارت پتھر کا اچار ہے لیکن یہ اچار اس خوبی کا ہے کہ کبھی سڑنے کا نام نہیں لیتا" یہ فرمانے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے "ستو میاں میں اکثر جامعہ ملیہ سے کتابیں لیا کرتا ہوں۔ میں اس ادارے کو چھوڑ تو نہیں سکتا البتہ آج سے نصف کتابیں آپ سے لیا کروں گا اور نصف جامعہ سے۔ اس وقت تم کوئی فہرست کتب لائے ہو؟" میں نے فوراً ایک فہرست ان کی خدمت میں پیش کی۔ چند منٹ بعد انھوں نے ۲۵ یا ۳۰ کتابوں پر نشانات لگا کر ایک معقول رقم کا آرڈر مجھے عنایت کیا۔

اس سال تو معاملہ تقریباً نصف نصف رہا لیکن دوسرے سال ہم نے پہلے سے زیادہ دوڑ دھوپ سے کام لیا اول تو یہ کہ نئی پرانی کتابوں کے کھوج میں رہنے لگے پھر یہ کہ جہاں دس بیس معقول قسم کی کتابیں جمع ہوئیں ہم بلائے بے بلائے سب سے پہلے ان کی خدمت میں پہنچ جاتے اور عرض کرتے۔

"مولوی صاحب یہ چند نئی کتابیں لایا ہوں اگر آپ کے مطالعے میں کوئی حرج نہ ہو تو دیکھ لیجئے"

"لائیے اب آپ لائے ہیں تو کچھ دیر ان ہی کتابوں کا مطالعہ سہی، مگر یہ افسانہ ناول اور ڈرامہ! بھئی یہ کیا خرافات اٹھا لائے۔ یہ چیزوں کو تو لڑکے خود بھی خرید کر پڑھ سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں صرف علمی کتابیں خریدا کرتا ہوں"

"مگر یہ منشی پریم چند کے صرف دو ناول ہیں اور یہ تین تراجم مولوی عنایت اللہ کے ہیں اور باقی تمام کتابیں مرزا غالب اور اقبال وغیرہ پر ہیں۔ سنجیدہ لٹریچر روز روز کہاں ملتا ہے یہ بھی بڑی تجسس کے بعد لایا ہوں"

"جی ہاں، جی ہاں تو اب میں آپ کی انتخاب کردہ کتابیں خریدوں"

"جی نہیں یہ تو میرا مقصد نہیں آپ مناسب سمجھیں تو دو تین ان میں سے بھی انتخاب کرلیں"

"اچھا صاحب یہ تین کتابیں تمہاری پسند کی بھی سہی اور ہاں وہ تم نے کہا تھا کہ فرہنگ آصفیہ لاؤ گے"

"فرہنگ بھی حاضر ہے لیکن اس وقت صرف دو جلدیں لایا ہوں"

"نہیں صاحب ہمیں تو مکمل نسخہ درکار ہے"

"نسخہ مکمل ہی ہے، اس وقت بوجھ زیادہ تھا، صرف دو جلدیں لے آیا"

"اچھا تو پہلے وہی دکھاؤ کیا قیمت ہے جناب؟"

"بہت ہی نایاب اور کمیاب ہے"

"جی ہاں، قیمت تو بتائیے"

"یہ میرا نسخہ نہیں ہے، جس کا ہے وہ تین سو روپیہ طلب کرتا ہے"

"جناب یہ تو بہت زیادہ ہے، اچھا باقی وہ دو جلدیں"

"وہ بھی پیش کروں گا"

"آپ جانے میں دیکھے بغیر نہیں خریدوں گا، اچھا تو دو سو روپیہ کہہ دیجئے"

"یہ تو بہت کم ہے"

"پھر؟"

"بیس پچیس روپے کم ہوں تو شاید مل جائے"

"اس میں آپ کی کمیشن کتنی ہے؟"

"پچیس روپے"

"تو اس میں یہ پچیس اور بڑھا لیجئے"

"نہیں ملے گی"

"پھر کتنے میں دے گا"

"میرا خیال ہے ڈھائی سو سے کم نہیں لے گا"

"تو آپ اپنے پچیس گھٹا دو"

"واہ مولوی صاحب میری محنت اور نفع سب غائب"

"پچیس روپے تو آپ پہلے ہی وصول کر چکے"

"وہ کس طرح"؟

"ان کتابوں میں سے جن میں آپ کی سفارش کردہ کتابیں بھی شامل ہیں، باقی آئندہ سہی"

"اچھا جناب یونہی سہی"

"لائیے پرچہ لکھئے" "صحیح صحیح قیمت درج کیجئے"

ہم نے ایک سادہ کاغذ پر منتخب کتابوں کے نام اس ترکیب سے لکھے کہ بین السطور میں ایک ایک سطر کے اضافے کی گنجائش رکھی۔ دو سو پچاس روپے کی فرہنگ آصفیہ اور باقی کتب ایک سو پچاس روپے کی ہوتی تھیں، لکھ کر پرچہ ان کو پیش کر دیا۔ مولوی صاحب نے دستخط فرما کر پروانۂ خریداری ہمارے حوالے کیا۔ اب ہم دوکان پر آئے۔ بین السطور کے فصل کو ذرا سوچ سمجھ کر اپنی من مانی لیکن ایسی معقول کتابوں کے ناموں سے پُر کیا جو مولوی صاحب کا انتخاب سمجھا جا سکے اور ان پر ہمیں زیادہ نفع حاصل ہو۔ اسی پرچے کی بنیاد پر بل بنایا اور اسی دن یونیورسٹی یا کالج پہنچ کر یہ سارا دفتر لائبریرین کے حوالے کیا۔

قصہ کوتاہ اس طرح رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ بڑے بڑے کتب فروشوں کی سربراہی کتب تو برائے نام رہ گئی اور ہم کالج اور یونیورسٹی دونوں کتب خانوں پر چھا گئے۔ دو تین ہزار روپے سالانہ کی کتابیں صرف مولوی صاحب کے طفیل فروخت ہونے لگیں۔

مولوی صاحب شب بیدار تھے یا نہیں لیکن سحر خیز اور پابند صوم و صلوٰۃ ضرور تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا ان کے لئے دونوں موسم یکساں تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر صبح ۶ بجے سے ۹ بجے تک کالج جانے سے قبل اور شام کو مابین عصر و مغرب مولوی صاحب اپنے حجرے ہی میں ملتے تھے۔ دراز قد، گندمی رنگ، کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی روشن غلافی آنکھیں، ابرو جدا جدا۔ گوش قدرے دراز، متوسط دہانہ۔ مختصر بھر وان ریش، ۱۹۴۷ء تک خضاب آلودہ رہی، پاکستان میں آ کر کافوری ہو گئی تھی۔ گرمی کے دن میں تو اکثر برہنہ سر، ڈھیلا ڈھالا ململ کا کرتا، چوڑی موری کا پاجامہ زیب تن کئے، دائیں بائیں دونوں ہاتھ پلنگ پر ٹکائے، ٹانگیں نیچے لٹکائے آرام سے بیٹھے ہیں۔ جاڑے کا موسم ہوا تو سفید یا خاکی فلالین کی قمیص یا کرتا، زیادہ سردی ہوئی تو اس پر موٹے اون کا ایک سوئیٹر، سر پر اونی انگریزی کنٹوپ پہنے، کمبل اوڑھے آلتی پالتی مارے پلنگ پر بیٹھے ہیں یا سر سے پاؤں تک منہ ڈھانپے لیٹے ہوئے ہیں۔ اتوار کی اتوار اپنے عزیز دوست خواجہ عبدالمجید مرحوم کے پاس مٹیا محل، جامع مسجد جاتے تو اونچی باڑ کی سیاہ انور کیپ پہن لیتے تھے لیکن ٹوپی کی بہ نسبت ملاگیری رنگ کا صافہ بہت پسند تھا۔ جے پور سے رنگوا رنگوا کر منگاتے اور مولویانہ انداز سے باندھتے تھے۔ پہلے ہندوستانی نوک جوتی کی کامدار جوتی پہنا کرتے تھے پھر انگریزی شو پہننے لگے تھے۔ ہاتھ میں ہمیشہ ایک گول موٹھ دار لکڑی رکھتے تھے۔ مٹھائی کے بہت شوقین تھے، تیز مرچ سے چڑتے تھے۔ شلجم شوق سے پکوایا کرتے تھے۔ مٹھائی میں قلاقند بہت مرغوب تھا۔

شاگرد ہوں یا ملاقاتی سب مذکورہ بالا اوقات ہی میں آتے تھے لیکن ملاقاتیوں سے زیادہ صبح و شام شاگردوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ کبھی کسی شاگرد سے خواہ ہندو ہو یا مسلمان کوئی فیس نہیں لی۔ بضرورت مند اور مستحق طلبہ کو تعلیم کے ساتھ خود وظیفہ دیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے ایک نہیں بیسیوں شاگرد تھے۔ ہندوؤں میں بڑے بڑے عہدہ دار لالہ برج نرائن، ایشور دیال، شیو نرائن، شیو پرشاد اور ہری سنگھ بھنت

گردوارہ شیش گنج دہلی اور مسلمانوں میں جناب ممتاز حسن صاحب، صدر ترقی اردو بورڈ۔ کراچی۔ جسٹس سرعبدالرحمان۔ ڈاکٹر اظہر علی مرحوم۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ مشتاق احمد ریٹائرڈ آڈیٹر جنرل پاکستان، آغا محمد اشرف نبیرۂ آزاد، خواجہ محمد شفیع، شاہد احمد دہلوی، حلیم جعفر عبدالعلی خاں اور نہ معلوم کون کون، اس گوشۂ ادب سے خدا جانے کتنے منشی فاضل، مولوی فاضل بن کر نکلے اور کتنے ڈاکٹریٹ حاصل کئے بیٹھے ہیں۔ شاگردوں کے آنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو ان کے انتظار میں بے چین ہو جاتے۔

مولوی صاحب کفایت شعار اور نہایت جزرس تھے۔ وہ اپنے تمام ملاقاتیوں کی تواضع صرف پان سے کیا کرتے تھے۔ پان خود بنا کر کھلاتے تھے۔ شاگردوں کو جب تک وہ حلقۂ شاگردی میں رہتے پان کھانے کی اجازت تو تھی لیکن خود بنا کر کبھی نہیں دیتے تھے۔ راقم کو ان کی شاگردی کا اعزاز تو حاصل نہیں ہوا لیکن شاگردوں کو پڑھاتے وقت بارہا دیکھا اور سنا۔ سردی کا موسم ہے، مولوی صاحب سر سے پاؤں تک کمبل میں ملفوف پلنگ پر دراز ہیں۔ کان شاگردوں کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ جہاں ذرا اٹکا۔ اشارہ دیا، چل پڑا ورنہ آگے کی عبارت خود ہی فر فر پڑھ ڈالی۔ شاگرد جب چند سطریں پڑھ چکا تو اب مولوی صاحب کمبل کے اندر سے گویا ہوئے۔ زبان نے گنج معانی اور علوم کے جوہر لٹانے شروع کئے۔ علم و ادب کے پیچیدہ اور ادق مسائل آن کی آن میں پانی ہونے لگے۔ شاگرد سنتا جاتا ہے، حسب ضرورت جلدی جلدی اپنی بیاض پر نوٹ لے رہا ہے یا کتاب پر حواشی چڑھا رہا ہے اور یوں اپنے دامن میں موتی بھر رہا ہے۔

شاہد دہلوی نے نقوش کے شخصیات نمبر میں اپنے زمانۂ شاگردی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے یہاں اس کا اقتباس پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ایک دن اخلاق جلالی کے سبق میں شاہد صاحب کسی عربی فقرے پر اٹک گئے۔ مولوی صاحب نے کہا "رک کیوں گئے؟" شاہد بولے۔ "جی عربی ہے۔" فرمایا۔ "تو کیا ہوا؟" شاہد نے کہا "ممکن ہے قرآن کی کوئی آیت ہی ہو، غلط پڑھ جاؤں" جواب دیا۔ "آپ پڑھیئے عذاب ثواب مجھ پر ہوگا۔" شاہد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ عربی کو اردو کی طرح پڑھ گئے۔ مولوی صاحب نے کہا "سبحان اللہ مولوی صاحب کے بیٹے اور قابلیت کا یہ حال۔" شاہد صاحب کو مولوی صاحب کا یہ طنز بہت ناگوار گذرا۔ کتاب بند کر دی اور طے کر لیا کہ اب نہیں پڑھیں گے۔ اب مولوی صاحب بار بار فرما رہے ہیں "صاحب پڑھیئے" مگر شاہد ہیں کہ گم سم بیٹھے ہیں۔ آخر مولوی صاحب اٹھ بیٹھے کمبل ہٹا کر بولے۔ "بہت غصہ آتا ہے آپ کو" شاہد نے کہا۔ "جی ہاں آتا ہے، یہ بھی کوئی میرا قصور ہے کہ میں مولوی نذیر احمد کے ہاں پیدا ہوا، نہیں آتی مجھے عربی۔" فرمایا "ارے بھئی تو میں نے کیا تمہیں منع کیا ہے عربی بھی پڑھ لیا کرو۔" لیکن شاہد صاحب روٹھ کر گھر بیٹھ رہے۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اتفاق کی بات چند ہی روز بعد شاہد صاحب اپنے ماموں کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے کہ راہ میں مولوی صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی شاہد صاحب کے ماموں اور مولوی صاحب کے درمیان بھی یاد اللہ تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مولوی صاحب سے مصافحہ کرنے لگے۔ مولوی صاحب نے کہا "نہیں بھئی پہلے ان سے، یہ استاد زادے ہیں اور ہمارے روٹھے ہوئے شاگرد، ہمیں تو ان کا احترام ملحوظ رکھنا ہی پڑے گا۔" شاہد صاحب کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا یہ فقرہ سن کر ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ شاہد صاحب کی بدقسمتی تھی کہ اس کے باوجود وہ ایسے شفیق استاد کے تلمذ سے محروم رہے۔

مولوی صاحب مختلف یونیورسٹیوں کے ممتحن تھے، پاکستان آنے کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ یار لوگ کسی نہ کسی طرح معلوم کر لیتے تھے کہ مولوی صاحب کے پاس فلاں فلاں پرچے ہیں۔ پرچے دیکھنے کے وقت مولوی صاحب کو ان کے مخصوص احباب کی معرفت سفارشیں موصول ہوتی تھیں کہ ذرا فلاں فلاں پرچے میں فلاں رول نمبر کا خیال رکھئے گا مولوی صاحب کی مرنجان مرنج طبیعت میں بے حد لحاظ اور احساس تھا۔ لہٰذا ایسے نازک مواقع پر وہ وعدہ تو کسی سے نہ کرتے البتہ سفارشی کی زبانی خاموشی سے امیدوار کا رول نمبر نوٹ کر لیتے۔ سفارشی اس پر مطمئن ہو جاتا۔ اصل بات یہ تھی کہ مولوی صاحب نمبر دینے میں فطرتاً نہایت منصف اور فیاض تھے۔ دیکھنے میں ہمیشہ یہی آیا کہ امیدوار

صرف وہی ناکام رہتا جو بالکل ہی کودن اور صفر ثابت ہوتا۔ راقم نے کئی مرتبہ اپنے کئی دوستوں کی مولوی صاحب سے سفارش کی اور کامیاب ہونے کے بعد ان سے معقول مٹھائی اینٹھی۔

حق یہ ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑے ہی خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ گھل مل کر اس طرح باتیں کرتے گویا ان کا مخاطب کوئی قریبی عزیز ہے۔ میں ان بزرگانہ شفقتوں کے باعث ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ بعض اوقات میں ان سے بہت شوخ ہو جاتا اور خوشی میں کچھ اول جلول بک جاتا، اس وقت وہ ہنستے ہوئے اپنی لکڑی اٹھا کر زمین پر مارتے اور فرماتے "شیطان کہیں کا" وہ شیطان کا لقب سن کر مجھے کس قدر مزا آتا تھا کہ آج تک اس کو سننے کے لئے میرا دل اور گوش دونوں تڑپتے ہیں۔ وہ ہمیشہ آہستہ اور متانت کے ساتھ گفتگو کرتے۔ الفاظ کو چبا چبا کر اور کھینچ کھینچ کر ادا کرتے۔ انھوں نے شاگردوں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ میرے عم بزرگوار سید احمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی، حکیم اجمل خاں مرحوم کے ساتھ بیس برس تک دواسازی میں شریک رہے۔ وہ اجمل خانی یا شریف خانی نسخے کے مطابق حب جواہر تیار کر کے مخصوص احباب کو تحفے میں دیا کرتے تھے۔ میں نے ان حبوب کی تعریف میں کئی بار زمین آسمان کے قلابے ایک کئے لیکن مولوی صاحب یہ تحفہ لینے پر راضی نہ ہوئے ایک دن جب میں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ یہ نہایت مجرب اور مقوی دماغ گولیاں ہیں آپ قیمتاً ہی لے لیجئے تو راضی ہو گئے دس روپے کا نوٹ دے کر گولیاں مجھ سے لے لیں۔ اسی اثنا میں مولوی صاحب کسی ضرورت سے ایک دو منٹ کے لئے اندر گئے۔ میں نے وہ نوٹ ان کے پاندان میں رکھ دیا اور جونہی وہ واپس آئے سلام کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دو تین روز بعد اتوار کے دن وہ اپنے دوست خواجہ عبدالمجید سے ملاقات کرنے کے بعد میرے کتب خانے پر تشریف لائے۔ وہ دوکان کے باہر کھڑے تھے۔ ڈنڈا اٹھا کر آہستہ سے دوکان کی چوکھٹ پر مارتے ہوئے فرمایا۔

"شیطان کہیں کا، ادھر آیئے میں آپ کی خبر لوں" میں دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے سر جھکائے ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اسی حالت میں اس وقت تک کھڑا رہا۔ جب تک ان حب جواہر کی پیشکش بلا قیمت مولوی صاحب نے قبول نہ فرمالی۔ مولوی صاحب نے وہ گولیاں لینی تو منظور کر لیں لیکن ایک دلچسپ اور مستقل سزا کے ساتھ۔ ہائے وہ سزا بھی کتنی ناقابل فراموش تھی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ جامع مسجد سے اپنے مکان گندے نالے تک پیدل لے گئے اور پھر اس دن سے میری یہ سزا مولوی صاحب کی ایک مستقل ادا اور میرے حق میں ایک انوکھی جزا بن گئی۔ وہ اتوار کی اتوار خواجہ صاحب سے ملنے کے بعد میری دوکان پر تشریف لاتے۔ چند منٹ بیٹھتے، نئی کتابوں کا معائنہ فرماتے، آرڈر مرحمت کرتے اور پھر اکثر مسجد فتحپوری اور بعض اوقات باتیں کرتے یونہی اپنے مکان تک پہنچ جاتے اور پھر بڑی محبت کے ساتھ مجھے رخصت کرتے۔

رہ گزر کی وہ باتیں یاد آتی ہیں تو بصد حسرت اپنا سر دھننے کو جی چاہتا ہے آج ان یادوں کے چراغ جلاتا ہوں۔ صرف ایک دن کی گفتگو سناتا ہوں۔ حسب معمول ایک اتوار کے دن مولوی صاحب دوکان پر کچھ دیر ٹھیکی لینے کے بعد مجھے اپنے ہمراہ لے کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا وقت ہم پریڈ گراؤنڈ کی راہ سے چاندنی چوک کی طرف جا رہے تھے۔ راہ میں ایک لڑکا جو کم عمر اور ناسمجھ تھا ہمارے پاس سے یہ گاتا ہوا نکلا۔

چیل پہ چیل چلاتی جائے چیل کا بچہ روتا جائے
چڑیا منگل گاتی جائے کوا ڈھول بجاتا جائے

تو میرے منہ سے بے ساختہ اس کی تعریف نکل گئی۔ میں نے کہا "مولوی صاحب گوشت کھلاتے وقت بچوں کی چیل چلو"

تو سنی تھی یہ املی کیسی ہے اور اس لڑکے کی تان میں کتنا رس ہے۔" میرا اس قدر عرض کرنا تھا کہ :-

یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کی تفسیر میرے سامنے آگئی۔ مولوی صاحب نے میری اس تعریف کو میرے لئے اپنے ایک درس کا موضوع بنا ڈالا۔ الفاظ کے حسن صوت پر عقدہ کشائی فرمانے لگے۔ متبسم ہو کر پہلے تو یہ فرمایا "جناب آپ کو کچھ معلوم بھی ہے۔ جیل کے گھر میں یا رس ہوتا ہے" پھر فرمایا۔

"سنو۔ الفاظ کی دو حیثیتیں ہیں۔ اول صوت جو الفاظ کی اصل ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو الفاظ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے حسن صوت یعنی صوت کی موزونیت اور روانی۔ صوت کی یہ صفت الفاظ کو موزوں قالب میں ڈھال کر کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے۔ آدمی تو آدمی حیوان تک اس سے مسحور ہو جاتا ہے۔ پھر انہوں نے اس کی مثالیں دینی شروع کیں۔ "مثلاً بِین کی لہرے پر سانپ کا مست ہونا، حدی کی آواز سن کر اونٹ کا دوڑنا۔ لوری سن کر بچوں کا نیند کی آغوش میں چلا جانا۔ خوانچے والوں کی من موہنی صدائیں جو سننے والوں کو بے اختیار اپنی چیزوں کا خریدار بنا لیتی ہیں" یہ مثالیں دینے کے بعد فرمایا "جس طرح اس املی یا موزوں بولوں کو اس لڑکے کے قدرتی حسنِ صوت نے دلکش بنا دیا ہے، اسی طرح بعض فقیروں کی صدائیں بھی موزوں ہوتی ہیں۔" یہ کہکر وہ مرزا غالب کے ایوان سخن میں پہنچ گئے۔

"ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے"

یہ شعر پڑھ کر مجھ سے پوچھا۔" بتاؤ یہ کس کا شعر ہے؟" میں نے کہا۔ "مشہور شعر ہے اور مرزا غالب کا ہے"، فرمایا۔ ہاں اب تو مرزا غالب ہی کا کہلاتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ ایک فقیر کی صدا تھی، جسے آپ کے چچا لے اڑے ہیں۔" میں ابھی اپنے دل میں اس انکشاف پر حیرت زدہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب نے حضرت بہادر شاہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمانے لگے۔" اور اسی طرح ہمارے بہادر شاہ نے بھی ایک فقیر کی دعا لیتے لیتے اس کی صدا کو بھی اپنے دیوان میں ٹانک دیا تھا۔" میں نے پوچھا۔" وہ کون سی صدا تھی۔" کہنے لگے۔" بازار سے بادشاہ کی سواری گزر رہی تھی، اسی راہ میں کہیں ایک فقیر بھی بیٹھا یہ صدا دے رہا تھا۔

"کچھ راہ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہو گا"

الفاظ اور حسن صوت کا یہ موضوع تمام راستے جاری رہا۔ گھر پہنچ کر فرمایا۔" آج تم نے میرا بہت دماغ چاٹا اگر کچھ اور معلوم کرنا ہو تو میری کتاب مراۃ الشعر پڑھ لینا۔ اس میں ان دونوں اشعار کا ذکر اور پوری تفصیل موجود ہے۔

————— مولوی صاحب اپنی ہر ملاقات میں، باتوں باتوں میں اپنے مخاطب کے دل و دماغ پر ایسے نہ معلوم کتنے نقوش مرتسم کرتے تھے لیکن بایں ہمہ علم و فضل وہ جامعہ کے ایک بلند مرتبہ خطیب اور اعلیٰ درجے کے ادیب تو بلاشبہ تھے لیکن اسٹیج کے مقرر نہ تھے۔

۱۹۳۹ء میں جب مولوی صاحب نے کالج کی خدمات کو خیرباد کہا تو دلّی یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے یونیورسٹی کے گنجان اور پُرفضا باغ میں ایک شاندار الوداعی جلسہ منعقد کیا۔ راقم بھی اس میں مدعو تھا۔ ٹی پارٹی کے بعد ایک طویل ایڈریس پڑھا گیا جس میں مولوی صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف تھا اور ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ آخر میں جب مولوی صاحب ایڈریس کا جواب دینے کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے تو فرمایا۔

" حضرات میں کالج کا خطیب ہوں، اسٹیج کا مقرر نہیں۔ لکھ سکتا ہوں، پڑھ سکتا ہوں تقریر نہیں کر سکتا

کیا کروں مجھے اس کی عادت نہیں؟"

یہ فرمانے کے بعد ایڈریس کے جواب میں مشکل سے ایک دو جملے ہی کہے ہوں گے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ بولنا چاہتے تھے لیکن زبان نے یاری نہ کی۔ بالآخر فرمایا۔ " دیکھا آپ نے میں نہ کہتا تھا کہ میں تقریر نہ کرسکوں گا لہٰذا میرا دلی شکریہ قبول فرمائیے "

بھولی بسری یادوں کے یہ صرف چند ناقابل فراموش نقوش جو اس وقت میں نے آپ کے روبرو پیش کئے ہیں ان سے کہیں زیادہ اسی محفل میں ان حضرات کے دل و دماغ میں محفوظ ہوں گے جن کو مجھ سے زیادہ مولوی صاحب کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ لیکن میرے دل کا تقاضہ تھا، روح کی پکار تھی کہ مولوی صاحب کی یادوں کو تازہ کیا جائے۔ آخر میں میں اپنے دوست شاہد احمد دہلوی اور بعض ناواقف دوستوں کی اس لاعلمی اور غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ " مولوی صاحب .... بڑے لدھڑ اور سست آدمی تھے .... بہت کچھ لکھ سکتے تھے مگر کچھ نہ لکھا، رہ جانے مرآۃ الشعر بھی کیسے لکھ گئے "

۱۔ **شرح اصطرلاب اردو** مولوی صاحب کی سب سے پہلی تصنیف زیج محمد شاہی، جے پور کی شرح اصطرلاب اردو ہے۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان جب دلی اور جے پور کی رصدگاہوں کی مرمت کا مسئلہ پیدا ہوا تو پنڈت چندر دھر گلیری کو حکومت نے اس کام کا مہتمم مقرر کیا لیکن زیج کی عقدہ کشائی میں بڑے بڑے عالم زچ ہو چکے تھے۔ یہ عظیم تاریخی خدمت مولوی صاحب نے اپنے سر لی۔ چنانچہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں آج بھی اس زیج کا نسخہ موجود ہے۔

۲۔ **ترجمہ العروس البدیعہ فی علم الطبیعہ** کم و بیش اسی زمانے میں مولوی صاحب کو بعض عصری طبیعات کی کتابوں کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اس کے ماتحت انہوں نے العروس البدیعہ کا ترجمہ شروع کیا۔ ابھی صرف چند ابواب کا ترجمہ کیا تھا کہ رنگ محل ہائی اسکول میں عربی فارسی کا ہیڈ مقرر ہونے کی وجہ سے انہیں لاہور جانا پڑا اور یوں یہ ترجمہ نا تمام رہا۔ جب لاہور سے دلی آئے تو ایک شاگرد نے مطالعہ کے بہانے طلب کیا اور ہضم کر گیا۔

۳۔ **ترجمہ مقدمہ ابن خلدون** اس وقت لاہور میں مقدمہ ابن خلدون کے اردو ترجمے کی زبردست مانگ تھی لہٰذا اول الذکر ترجمہ کو نا تمام چھوڑ کر آخر الذکر کا اردو ترجمہ تمام و کمال پورا کیا خوش قسمتی سے اس ترجمہ کا ایک نسخہ اس وقت ترقی اردو بورڈ کراچی کی لائبریری میں موجود ہے۔

۴۔ **الحصون الحمیدیہ اردو** مقدمہ ابن خلدون کے بعد الحصون الحمیدیہ کا اردو ترجمہ کرنے کے علاوہ چند دیگر تراجم اور تصانیف وجود میں آئیں لیکن بجز مقدمہ ابن خلدون اور الحصون الحمیدیہ کے دیگر کتابوں پر بحیثیت مترجم یا مصنف مولوی صاحب کا نام درج نہ ہو سکا۔ ان دنوں مولوی صاحب تنگدست ہونے کے علاوہ اپنی اہلیہ کی شدید بیماری کے باعث انتہائی پریشان تھے۔ عسرت اور پریشانی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ کے اخراجات اور بیوی کی دوا دارو کے لئے ان کو کم از کم پانچ روپیہ یومیہ درکار تھے۔ چنانچہ یہ پانچ روپے وہ صبح تا شام سخت محنت کرنے کی بعد پیدا کرتے تھے۔ بعض سنگدل ناشروں نے مولوی صاحب سے تالیف و تصنیف کا کام لینے پر یہ کڑی شرط لگا دی تھی کہ یا تو نام کی اشاعت کا حق تصنیف یا ترجمے پر قربان کردیا اجرت کو نام کی بھینٹ چڑھا دو مجبوراً مولوی صاحب کو اپنے نام کی اشاعت سے دست بردار ہونا پڑا۔ ایسی کتابوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں کہ وہ کتنی تھیں۔

۵۔ **مرآۃ الشعر** تین سال بعد ۱۹۰۷ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں عربی پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی۔ اس دوران میں مولوی صاحب، درس و تدریس کے علاوہ تالیف و تصنیف اور تراجم میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے چنانچہ آپ کا انتخاب اور تقرر عمل میں آیا۔ اس کالج میں وہ مسلسل ۳۳ برس تک ایم۔ اے ایم او ایل کے طلبہ کو عربی اور فارسی کا درس دیتے رہے۔

جب دلی یونیورسٹی وجود میں آئی تو انہیں عربی فارسی اور اردو کی صدارت تفویض ہوئی۔ تقریباً ۱۵ سال تک اس منصب پر بھی رہے۔ یہاں دہلی میں دلی یونیورسٹی کی تحریک اور مسٹر سین پرنسپل مشن کالج کی فرمائش پر انھوں نے عربی شعر کے موضوع پر کم و بیش بارہ لیکچر دئے۔ جب ان مقالات کی خواندگی ختم ہوئی تو مولوی صاحب نے خواجہ عبدالمجید کے اصرار پر ان مقالات پر نظر ثانی کی اور ان کو از سر نو فارسی اور اردو کی مثالوں سے آراستہ کرکے مراۃ الشعر کے نام سے ۱۹۱۶ء میں جید برقی پریس دہلی سے طبع کراکے خود شائع کیا۔

۶۔ **حیات اورنگ زیب عالمگیر** ۔ اسی دوران میں مولوی صاحب نے حیات اورنگ زیب کو بڑی محنت اور جانکاہی سے مرتب کیا انہی دنوں خواجہ محمد شفیع بھی عالمگیر پر کچھ لکھ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے جب یہ سنا تو ایک صبح خواجہ شفیع کو اپنے گھر بلاکر برسہا برس کی محنت و کاوش دماغی کا نتیجہ، عالمگیر کا مسودہ تمام و کمال ان کے حوالے کیا اسی اثنا میں ہندوستان تقسیم ہوگیا اور خواجہ شفیع لاہور آگئے۔ وہاں ایک انکم ٹیکس آفیسر نے کسی بہانے یہ گنج گراں مایہ خواجہ شفیع سے اینٹھ لیا۔ آج تک غصب کئے بیٹھے ہیں۔

۷۔ **نرالا قاعدہ اور اردو تاش** ۔ دہلی ہی میں مولوی صاحب نے " نرالا قاعدہ " کے نام سے ایک اردو قاعدہ اور اسی ضمن میں ایک اردو تاش شائع کیا۔ ان دونوں چیزوں کی طباعت کے سلسلے میں راقم سے بھی کچھ خدمت لی گئی تھی قاعدے میں خصوصیت یہ تھی کہ ہجا کو اس سے بالکل خارج کرکے نہایت آسان اور سہل بنادیا تھا۔

۸۔ **حقیقت حکومت الٰہیہ** ۔ یہ مولوی صاحب کی آخری تصنیف تھی جسے انہوں نے قیام پاکستان کے بعد کراچی آکر تحریر کیا تھا۔ جن دنوں پاکستان کا دستور تشکیل پارہا تھا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں بعض افراد کا مطالبہ تھا کہ دستور قرآن و حدیث کی روشنی میں بنایا اور اسی سانچے میں ڈھالا جائے۔ دوسرے گروہ کا اصرار تھا کہ دستور ایسا ہونا چاہیئے جو زمانہ حال کے تقاضوں کو پورا کرے۔ مولوی صاحب نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ قرآن و حدیث کے دلائل دے کر مسلمانوں کو بتایا کہ حکومت الٰہیہ جس کا اتنا کچھ زور شور ہے وہ کیا ہے اور اس میں کتنی جان ہے ؟

مذکورہ بالا آٹھ کتابوں میں سے اس وقت صرف دو کتابیں مراۃ الشعر اور حقیقت حکومت الٰہیہ عام طور پر تو نایاب ہیں لیکن بعض لائبریریوں اور کتب خانوں میں اب بھی اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔

تالیف و تصنیف کے ضمن میں ۱۹۲۸ء کے اس تاریخی مقالے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو مولوی صاحب نے صوبۂ دہلی کے مندوب کی حیثیت سے آکسفورڈ کی انٹرنیشنل اورینٹلسٹ کانفرنس میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس مقالے کی شہرت مولوی صاحب کو انگلستان، جرمنی اور مصر تک لے گئی۔ چنانچہ جامعہ ازہر میں بھی مولوی صاحب نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنا اول الذکر مقالہ مشہور پروفیسر مارگولیتھ کے نظریئے کے خلاف پڑھا تھا۔ وہ شعر کو جاہلیت کا شعر کہتا تھا۔ مولوی صاحب نے ان کے اس دعوٰی کی تکذیب اور تہذیب کے لئے اپنا ایک نیا تنقیدی پہلو اختیار کیا تھا۔ آپ نے ضرب الامثال سے عہد جاہلیت میں شعر کے وجود کو ثابت کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ شعر مطلق جاہلیت کا نہیں بلکہ تیسری صدی میں گھڑ کر جاہلیت کے سر تھوپ دیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے بہت کچھ لکھا لیکن وہ کیا تھا اور کس قدر تھا مذکورہ بالا وجوہ کے باعث اس کا اندازہ اور سراغ لگانا بہت دشوار ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی ہی سے نہ معلوم ان کے کتنے مقالات نشر ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مولوی

صاحب کا تراجم اور تصانیف میں کیا مرتبہ ہے چھوٹا منہ بڑی بات، راقم ہرگز اس کا اہل نہیں، مزید برآں یہ کہ بجز مرآۃ الشعر اور حقیقت حکومت الٰہیہ راقم مرحوم کی تصانیف کے مطالعے سے یکسر محروم رہا بنا بریں اس [illegible] صرف اس قدر عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ مصنف کی زبان اور انداز بیان ان کے موضوع اور مبحث کے عین مطابق تھا۔ مرآۃ الشعر میں بقول ان کے عزیز شاگرد جناب سلیم جعفر "نہ آزاد کا سجع و ترصیع و تشبیہ ہے نہ شبلی کی رنگین بیانی نہ حالی کی سادگی، ایک سلاست ہے پُر شکوہ، ایک گہرا دریا آہستہ آہستہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ رواں ہے۔"

اور راقم یہ کہتا ہے کہ مولوی صاحب قلزم عربی اور خلیج فارسی کے ایک بلند پایہ شناور تھے۔ انہوں نے شاعری کے بحر زخار کو کوزے میں سمویا ہے اور دریا کو حباب ہیں۔ انہوں نے اپنے موئے قلم سے ان حباب کو ایسی رنگینی اور بوقلمونی عطا کی جو انہی جیسے ایک شمس العلماء کا کام تھا۔ مثلاً مرآۃ الشعر میں خیال کی وسعت و عظمت کی شرح میں خود ان کی پرواز خیال ملاحظہ ہو۔

"خیال اور اس کی عام بلند پروازیوں اور نکتہ آفرینیوں سے بحث کرنا نہ میرا مقدور ہے اور نہ اس مختصر کا وہ موضوع ہے اس کا موضوع ہے وہ خیال جس کو بحیثیت عواطف و جذبات شعر و شاعری سے تعلق ہوتا ہے جو جادوگری کرتا ہے اور سحر حلال نام رکھتا ہے۔ سیدھا سادھا ہے تو اتنا کہ بات کرنی بھی نہیں جانتا اور فتنہ ہے تو وہ کہ زہرہ کو بھی چٹکیوں میں اڑاتا اور بام فلک پر جا بٹھاتا ہے۔ کبھی رند ہے، کبھی پارسا، کبھی کافر ہے کبھی باخدا، یار بھی ہے اور ستمگار بھی۔ کبھی درد ہو جاتا ہے اور کبھی دردمند کبھی خود کسی پر مرتا ہے اور کبھی کسی کو مار رکھتا ہے۔ کہیں کسی کی بے نیازی اور کہیں کسی کی نیاز مندی۔ نہ اس کی وفا کی حد ہے نہ جفا کا ٹھکانا۔ عشرت کدوں کا قہقہہ بھی ہے اور ماتم کدوں کا گریہ و بکا بھی۔ مروت پر آتا ہے تو خلیل ہے اور سنگدلی پر کمر باندھتا ہے تو خون شہدا بھی اس کے لئے سبیل ہے۔ صابر و قانع ہے تو بڑا، اور حریص و ناشکیبا ہے تو بُرا۔ بے دست و پا بنتا ہے تو نقش سطح ہو جاتا ہے اور بال و پر بناتا ہے تو سی مرغ ہو کر تا بقاف اڑ جاتا ہے بلکہ عرش تک کی خبر لاتا ہے اور گرتا ہے تو تحت الثریٰ میں جا نکلتا ہے۔ خود دار بھی ہے اور خدائی خوار بھی۔ کبھی مشعل راہ اور تجلائے شمع طور ہے اور کبھی غرق ضلالت، راہ ہدایت سے منزلوں دور ہے۔ طاغی اور سرکش ہے تو اتنا کہ تخت تمرد پر بیٹھ کر نفسانیت میں اڑتا ہے تو فرعون بن کر کہتا ہے کہ انا ربکم الاعلیٰ اور مطیع و فرمانبردار ہے تو ایسا کہ خاک مسکنت پر سر رکھ کر زار زار روتا ہے اور کہتا جاتا ہے۔ وانا لہ ساجدون۔

وقت کم اور دامن کوتاہ ہے ورنہ مولوی صاحب کے اور کئی شہ پارے پیش کرتا جن سے مرآۃ الشعر کے اوراق لبریز اور پُر ہیں۔ مولوی صاحب کے قدیم مولد و مسکن اور آبا و اجداد کا بھی کچھ مختصر حال سن لیجئے۔

مولوی صاحب ۱۰ فروری ۱۸۷۳ء کو جے پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد محمد رمضان خاں ریاست جے پور کی فوج میں نائب میجر تھے۔ آپ کا آبائی و جدی وطن موضع جکھیڑا (صحیح یکیہ گھیڑا) ضلع میرٹھ تھا۔ آبا و اجداد پہلے تو اور قوم نسل کے ہندو راجپوت تھے جو اورنگ زیب عالمگیر کے عساکر شاہی میں ملازم تھے۔ اس موضع جکھیڑا میں ایک بزرگ صاحب فیض کا مزار پُر کرامت تھا۔ اس مزار کی کئی کرامتیں دیکھ کر یہ لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے انہی لوگوں میں مولوی صاحب کے آبا و اجداد بھی تھے جو طیانی اور منڈی فرقوں کے کہلاتے تھے۔ ہندی الاصل ہونے کی وجہ سے یہ نو مسلم فرقہ بعد میں شیخ اور شیخ زادوں کے نام سے موسوم ہوا۔ اس لحاظ سے مولوی صاحب مرحوم نو مسلم مشائخ میں سے تھے۔ ۶۰ یا ۷۰ برس بعد جب زمانے نے کروٹ لی، مرہٹوں نے یورش کی تو مرحوم کے اسلاف اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے بالآخران کے ایک چچا اپنی عمر کے آخر حصے میں چھولس ضلع بلند شہر میں آکر آباد ہو گئے۔ پھر ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے بعد ان کے والد ہجرت کر کے جے پور آن بسے۔

مولوی صاحب نے مہاراجہ کالج جے پور میں اول فارسی اور اردو کی تعلیم پائی بعدازاں جب اس کالج میں علوم مشرقیہ
باب کھلا تو عربی اور فارسی میں منتہی ہوئے۔ منشی فاضل میں اول آئے پھر مولوی فاضل ہوئے۔ کالج کے پرنسپل نے اسی کالج
میں شعبۂ فارسی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ اب ان کی شہرت نے رنگ پکڑا۔ رنگ محل ہائی اسکول لاہور میں صدر مدرس ہوئے۔
۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۶ء تک لاہور رہے۔ ۱۹۰۶ء سے یکم جنوری ۱۹۳۳ء تک کامل ۲۹ برس مشن کالج دہلی میں پروفیسر رہے۔
اسی دوران میں دلی یونیورسٹی میں ۱۵ سال تک شعبۂ عربی فارسی اور اردو کی صدارت کی۔ اسی ضمن میں فیکلٹی اور اکیڈمک
کونسل کی رکنیت کے فرائض انجام دئے۔ اب تک وہ انگریزی سے کنارہ کش رہے تھے مجبوراً اب اس زبان کو بھی بقدرِ ضرورت
حاصل کیا۔ ۱۹۲۸ء میں حج کعبہ شریف سے فارغ ہو کر مصر و شام اور قسطنطنیہ ہوتے ہوئے یورپ کے بلاد اور امصار کی سیاحت
فرمائی۔ آکسفورڈ لندن اور جامعہ ازہر مصر میں مقالات پڑھے۔ یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو حکومت ہند نے آپ کی علمی و ادبی خدمات
کے اعتراف میں شمس العلما کا خطاب عطا فرمایا۔

۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک سید بشیر حسین زیدی وزیر اعظم رامپور کی تحریک اور نواب صاحب رامپور کی دعوت پر
مدرسہ عالیہ رام پور کی اصلاح اور پروفیسری کے لئے رام پور میں قیام رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد دلی یونیورسٹی کے پراویڈنٹ
فنڈ کی رقم سے دلی میں کچھ جائداد خریدی جو تقسیم ہندوستان کی بدولت کسٹوڈین کی نذر ہو گئی۔ مولوی صاحب ہجرت فرما کر کراچی
آگئے یہاں وہ آرٹلری میدان کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے تھے۔

مولوی صاحب کی اہلیہ کا نام حمیدہ بیگم تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ ان کے بعد مولوی صاحب نے دوسری
شادی نہیں کی۔ مرحومہ کے بطن سے مولوی صاحب کے تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ ان میں سے صرف
محمد عبدالرشید صاحب بقید حیات ہیں اور آج کل بسلسلۂ ملازمت اکاونٹس، نیول ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں مقیم ہیں۔
صاحب اولاد ہیں۔

یک پیری و صد عیب، پھر پے درپے صدمات اور حوادث روزگار نے اس بوڑھے عالم کی کمر توڑ دی تھی۔ کراچی آکر
بیمار ہی رہے۔ ۱۹۴۹ء میں سماعت میں اس قدر فرق آگیا کہ بغیر آلۂ صوت کشا گفتگو ناممکن ہوگئی۔ بالآخر ۲۶ جون ۱۹۵۴ء
مرض موت لاحق ہوا اور ۳۰ جولائی ۱۹۵۴ء کو جمعہ کے دن صبح کے چار بجے اللہ کو پیارے ہوئے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　آج وہ کل ہماری باری ہے

عالمِ امکاں کا ایک دن

غالب کا ایک شعر ہے :-

ہے کہاں تمنّا کا دُوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

لیکن ایک مغربی مفکر کی مادی تعبیر ملاحظہ ہو :-

فرض کر لو ہے کہیں سو میل ایک اُونچی چٹان — طُول بھی اس کا یہی ہے، عرض بھی اس کا یہی

آتی ہے ہر دس صدی کے بعد اک چڑیا یہاں — اور منقار اپنی کر کے تیز اُڑ جاتی ہے وہ

گھس کے ہم سطحِ زمیں ہو جائے گی جب یہ چٹان — ختم ہوگا عالمِ امکاں کا ایک اور صرف ایک دن

قدیم لکھنؤ کی ایک تاریخی مثنوی

ناؔدم سیتاپوری

اردو کے "مثنویاتی ادب" کو مرزا شوق کی بدنام مثنویوں کے علاوہ لکھنؤ سے جو کچھ ہاتھ آیا وہ "رسوائیوں کی جھنکار" میں اس "فسانے" کی نذر ہو گیا جس کے "پند عارفانہ"، پر خواجہ میر آثر دہلوی کے تقدس کی چھاپ لگی تھی اور میر اثر کا یہ دعویٰ ؂

کچھ نصیحت نہ واعظانہ ہے
بلکہ یہ "پند عارفانہ" ہے

"خواب و خیال" کے ان مبتذل اور سوقیانہ اشعار کی عظمت کو دوبالا ہی کر گیا ؂

کچھ نہ کچھ "زیر ناف" کیسا ہے؟ ——— رفتہ وشستہ صاف کیسا ہے؟
وہ ترا بے حجاب مل جانا ——— وہ ترا آپ ہی آپ شرمانا
بات ٹھہرا کے پھر پھل جانا ——— عین "اس وقت" پر مکر جانا
وہ ترا ڈھیلا چھوڑنا بے بس ——— وہ ترا سست ہو کے کہنا "بس"

لیکن مرزا شوق کی مثنویاں جب اخلاق کے ترازو میں تولی گئیں تو "خم خانہ جاوید" (جلد پنجم) کو ان میں بجز بے حیائی — بے غیرتی اور شہد پن کے کچھ نہ ملا۔

"ان (مرزا شوق) کی شہرت کا ذریعہ عناصر چار مثنویاں ہیں . . . . . . یہ اس زمانہ کی رندیت اور عیاشانہ زندگی یا یہ کہیے تن بازی کا دفتر ہیں . . . . . . ان مثنویوں میں سے اکثر سلاست بیان۔ فصاحت، شگفتگی، اسلوب اور صحت روزمرہ کے اعتبار سے بطور نمونہ پیش کی جا سکتی ہیں —— لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بد تہذیبی اور عیاشانہ آوارگی کی پھٹکار' ان اوصاف پر . . . مٹھیاں بھر بھر کر خاک ڈالتی ہے۔"

(خم خانۂ جاوید بحوالہ تذکرۂ شوق صفحہ ۱۲ مطبوعہ سویرا آرٹ پریس لاہور)

مثنویات کی تند و تیز بحث میں دلّی اور لکھنؤ کی قدیم تہذیب و معاشرت کا جائزہ بھی لیا گیا اور بقدر وسعت ایسے ایسے گڑے مردے اکھاڑے گئے جن کی قبروں کا نشان بھی مٹ چکا تھا۔ اودھ کے آخری بد نصیب تاجدار واجد علی شاہ کا عہد انگریزوں کے مسموم پروپیگنڈے کا شکار ہو ہی چکا تھا۔ اسی بنیاد پر رنگین محلوں کا ایک ایسا سنسار بسا دیا گیا جہاں عیاشیاں ہی عیاشیاں تھیں۔ بدکاریاں ہی بدکاریاں تھیں —— اور گناہوں سے بھری صبح و شام کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

واجد علی شاہ کے دور کا "اودھ" تو انگریزوں کے سیاست کارانہ پروپیگنڈے کے ہاتھوں بدنام ہی ہوا۔ لیکن اودھ کے "تاریخ

نگاروں" نے نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت کو اودھ کا بدترین زمانہ قرار دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا! رہی سہی کسر مورخ ہونے کے باوجود اردو زبان و ادب کے "آغائی" مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم نے "گذشتہ لکھنؤ" میں یہ لکھکر پوری کردی۔

" نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پرانے لوگوں کا بیان ہے کہ ان "زنانہ مزاجی" اور طفلانہ حرکتوں کیساتھ نہایت ہی ظالم تھے ـــ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوئی تھی۔ اس لئے ان کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوئیں! بیسیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا۔ فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے"

(صفحہ ۴۵۔ گذشتہ لکھنؤ۔ مطبوعہ مرکنٹائل پریس۔ لاہور)

اگر یہ صحیح ہے کہ ہر دور کا "شعری ادب" کسی نہ کسی نہج سے اس دور کا ترجمان ہوتا ہے تو انہیں نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء میں لکھنؤ کے شعری ادب نے ایک ایسی مثنوی کو بھی جنم دیا ہے جو اسی "بدنام لکھنؤ" کے ایک اخلاقی پیغام کا درجہ رکھتی ہے اور مرزا شوق کی مثنویات کے بالکل برعکس ـــ اخلاقیات کی ایسی کڑی ہے جسے کسی نہ کسی نہج سے ایک تاریخی اہمیت ضرور حاصل ہے۔

مثنوی" خلاصۃ النصائح "کا جو نامکمل اور ناقص نسخہ مجھے دستیاب ہوا ہے وہ "مطبوعہ" ہونے کے باوجود اتنا کمیاب ہے۔ کہ کافی تلاش کے بعد بھی میں اس کا دوسرا نسخہ فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ـــ مجھے جو نسخہ ملا ہے اس کے آخری صفحے کا نمبر ۲۰۴ ہے لیکن دو تین درمیانی صفحات اور بھی غائب ہیں اور کل" نصائح " کی تعداد ۱۶۶ ہے۔ کتاب دس سطری ہے اور یہی سائز میں شاہ اودھ نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ ـــ ۱۸۳۷ء) کے اس سرکاری پریس میں چھپی ہے جو ان کے والد غازی الدین حیدر نے ۱۲۳۴ھ[1] میں "موتی محل" کے اندر قائم کیا تھا۔ یہ مطبع اودھ میں پہلا ٹائپ پریس تھا جس کے ٹائپ حروف ہندوستانی پریس کلکتہ اور فورٹ ولیم کالج پریس (کلکتہ) سے نسبتاً کچھ بہتر تھے۔ لیکن اس کتاب میں جو کاغذ استعمال کیا گیا ہے وہ "سیرام پوری" ہی ہے "خلاصۃ النصائح" کا جو نامکمل نسخہ میرے پیش نظر ہے اس سے قطعاً پتہ نہیں چلتا کہ یہ مثنوی کس کی کہی ہوئی ہے؟ اور اس کا مصنف کس مذہب و عقیدے سے تعلق رکھتا ہے صفحۂ اول پر صرف چند سطریں پائی جاتی ہیں جس سے مذکورہ بالا تفصیلات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مثنوی خلاصۃ النصائح"

اردو زبان میں نظم ہو کے چھاپہ خانہ دارالسلطنت لکھنؤ میں بموجب حکم اقدس واعلیٰ ابوالنصر قطب الدین سلیمان جاہ۔ سلطان عادل و نوشیرواں زماں۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ خلد اللہ ملکہ کے واسطے طالب علموں کے مطبوع ہوئی"

نصیر الدین حیدر کا عہد حکومت کتنا بھیانک اور تاریک تھا؟ اس کا جواب تو محققین تاریخ ہی دیں گے! جہاں تک شاہان اودھ کی معارف پروری کا تعلق ہے نصیر الدین حیدر کا زمانہ بھی یقیناً انہیں اوراق کا ایک اہم جزو ہے! اور اس دور کا لکھنؤ بہ ایں تعیش و تن آسانی ارباب علم و فن سے بھرا پڑا تھا ـــ خود نصیر الدین حیدر ایک باکمال زود گو شاعر تھے۔ "بادشاہ اور بادشہ" دو تخلص فرماتے تھے۔ ان کی متفرق اور منتشر غزلیں ہیں تو کم ہی! مگر بعض اتنی مقبول اور مشہور کہ ان کے مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں ۔

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

---

[1] (صفحہ ۱۴ "قطرۂ محیط بحر ہند" مطبوعہ مصطفائی لکھنؤ ۱۸۸۵ء)

یہ مصرعہ جس طرح زبان زد خاص و عام ہے اسی طرح یہ جاننے والے بھی کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ مصرعہ نصیر الدین حیدر ہی کی ایک غزل کا مصرعہ ثانی ہے۔ بارہ اشعار کی یہ مکمل غزل ایک قدیم قلمی بیاض میں لکھی ہوئی ہے جس سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ آنے کی کس مست کی آرزو ہے ——— کہ ساقی لئے ساغر مشکبو ہے
سمایا ہے جب سے تو آنکھوں میں میری ——— جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے
شفق بن کے گردوں پہ ہوتا ہے ظاہر ——— یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
عبث مجھکو ہنس ہنس کے دیتے ہو گالی ——— زباں کو سنبھالو یہ کیا گفتگو ہے

رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر
خداوند عالم نگہبان تو ہے

اسی طرح نصیر الدین حیدر کی دو ایک غزلیں[1] مجموعۂ سخن میں محفوظ ہیں جن سے اس "بدنام و بدنصیب تاجدار کے شعری معیار کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا ہی جا سکتا ہے ؎

یہ بات ہے ایک عاشق کی　　کہئے نہ کسی سے اپنے جی کی
پہنچایا ہما کے نامۂ شوق　　اشکوں نے ہماری قاصدی کی
دل میں رہتی ہے یاد تیری　　گو لب پہ ہے مہر خامشی کی
کیا دیں گے جواب روز محشر　　کچھ اس کی نہ ہم نے بندگی کی

ہوتی آگاہ جو پروانے کے سوز دل سے ——— شمع فانوس سے باہر نکل آئی ہوتی
آسماں نے جو نہ قدرت دی اسے خوب کیا؟ ——— ورنہ انسان نے زمیں سر پہ اٹھائی ہوتی

ان سب باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نواب سعادت علی خاں کے دور حکومت (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) تک سلطنت اودھ کا نصف حصہ پا جانے کے باوجود انگریز کئی زاویوں سے اپنے آپ کو کامیاب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی اصل کامیابیوں کا دور غازی الدین حیدر کے زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ انگریزوں کی سیاست کاری شاہی محلات تک پہنچ چکی تھی۔ غازی الدین حیدر نے ایک یورپین لیڈی کو "ولایتی محل" کا خطاب دیکر اپنے حرم میں داخل کیا۔" ولایتی باغ" کے نام سے ایک باغ بنوایا اور رفتہ رفتہ ان چور دروازوں سے "مسیحیت"

---

[1] "مجموعۂ سخن" کا مخطوطہ پروفیسر سید مسعود حسین ادیب (لکھنؤ) کی لائبریری میں محفوظ و موجود ہے جو بعہد نصیر الدین حیدر ۱۲۴۷ھ میں "غلام ہمدی" نے ترتیب دیا تھا۔ یہ غلام ہمدی جرنیل اقبال الدولہ قطب الملک محمد عباس مبارز علی خاں بہادر مظفر جنگ کی سرکار میں داستان گوئی و بذلہ سنجی کی خدمت پر مامور تھے۔ اس مجموعہ میں ۶۶ شعراء کا کلام جمع کیا گیا ہے سب سے زیادہ غزلیں شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ہیں جن کی تعداد ۳۱۰ ہے ان کے علاوہ میر حسن کی ۴۵، میرزا تقی ہوس کی ۱۲۴، میر تقی میر کی ۸۵۔ طالب علی خاں عیشی کی ۵۷، مرزا رفیع سودا کی ۲۳ انشاء اللہ خاں انشاء اور خواجہ آتش کی پچاس پچاس۔ اور ناسخ کی ۷۳ غزلیں ہیں۔ اگر چھان بین کی جائے تو میرا خیال ہے کہ مذکورالصدر شعراء میں جن کے دواوین چھپ چکے ہیں کچھ نہ کچھ ایسا کلام ضرور مل جائے گا جو شاید مطبوعہ دیوانوں میں نہ ہو ــــ غلام ہمدی تقریباً اسی عہد کے آدمی تھے جنھوں نے غالباً ان میں سے اکثر شعراء کا زمانہ دیکھا ہوگا۔ قیاس یہی ہے کہ "مجموعۂ سخن" کا بیشتر حصہ براہ راست ان شعراء سے حاصل کیا ہوگا۔ جن کی غزلیں اس میں موجود ہیں۔　(نادم سیتاپوری)

اودھ میں داخل ہونا شروع ہو گئی۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا تو یہ تحریک اپنے قدم اچھی طرح مضبوط کر چکی تھی۔ ان کی نجی زندگی پر بھی اثر پڑا ـــــ اور اگر " اچھوتیوں " کی روایت غلط نہیں ہے تو کیا عجب یہ تصورات "مسیحی کلیساؤں" کے اس قدیم طرز رہبانیت سے اخذ کئے ہوں جس میں کنواری نن " کو تمام عمر اس گھناؤنے تقدس کا شکار ہونا پڑتا تھا جو صدیوں سے مسیحی تعلیمات میں دخیل ہو چکا تھا چنانچہ مثنوی " خلاصۃ النصائح " کے پیش نظر اوراق کا پس منظر ایسے ہی ماحول کا غماز ہے ـــ اور باوجودیکہ ان صفحات سے مثنوی نگار کی نشاندہی نہیں ہوتی پھر بھی قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ مثنوی "مسیحی مشنریوں" کی فرمائش پر لکھی گئی ـ لکھنے والا خواہ ہندو ہو یا مسلمان یقیناً اس مثنوی کی تصنیف سے اس کے ذاتی نظریات اور عقائد کو کوئی تعلق نہ تھا۔ کیونکہ عام طرز مثنوی نگاری کے خلاف اس مثنوی کا آغاز نہ تو حمد سے کیا گیا ہے نہ کہیں نعت، منقبت اور سلطان اودھ کی مدح کی گئی ہے ـ ابتدا بسم اللہ " سے ضرور کی گئی ہے ـ پر اس کی اہمیت اتنی ہے جیسے کوئی منکر خدا اپنی مجلسی زندگی میں خدا کو سماجی طور سے اپنا لے۔ یہی نہیں ـ بلکہ میرے اس خیال کی تائید ان اشعار سے بھی ہوتی ہے جو مثنوی کے صفحہ ۲ پر موجود ہیں ـ

جو ہیں عیسوی کہتے ہیں بالیقیں	رہے ہم میں کاہل یہ ممکن نہیں
عبادت کا کاہل نہیں عیسوی	گنہگار اس دین سے ہے بری
حواری عیسیٰ جو ہیں . . ۱ . نام	یہ مشہور عالم ہے ان کا کلام
وہ عیسوی . . ۲ . . ہے تمام	جو ہیں عیسوی اونکا یہ ہے کام
. . . .	. . . .
. . . .	. . . .
کہ کہلاتے جو ہیں عیسیٰ کا نام	کرے ادعا پیروی کے مدام
بدی سے لئے چاہئے دور ہو	کرے وہ جو عیسیٰ کو منظور ہو

پیش نظر اوراق میں صرف یہی اور صاف طور پر یہی اشعار ملتے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد یہ قیاس یقین میں بدل جاتا ہے کہ یہ مثنوی مسیحی پادریوں نے تبلیغی مقاصد کے لئے لکھوا کر " شاہی مطبع " سے شائع کی تھی جس کی اجازت یقیناً بادشاہ سے لی گئی ہوگی۔ اس جگہ جگہ " عبادت " پر زور دیا گیا ہے لیکن " طریق عبادت " کی وضاحت کہیں نہیں کی گئی ہے جو اس دور کی " مسیحی تبلیغ " کا خاص آرٹ تھا۔ اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار میں بیماروں کی امداد کو " خیرات " کہا گیا ہے جو تعلیمات اسلامی کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ ہماری تعلیمات کے لحاظ سے حسب مقدرت مریضوں کی مدد کرنا ایک قسم کا انسانی فرض ہے نہ کہ خیرات ـــــ !

سنو تم کہ " خیرات " کے دو ہیں طور	اوسے دل میں رکھو کرو فکر و غور
ہے اول مریضوں کی کرنی دوا	کہ ہو جائے اونکو مرض سے شفا
غریبوں کو دوئم سکھانا تمیز	اونھیں تربیت کرنا سمجھو عزیز
کہ دور کرتا ہے اونکا گناہ	بچاتا ہے اون سے معیبت کی راہ

موضوع کے اعتبار سے مثنوی " اخلاقیات " کے تقریباً ہر جزو سے تعلق رکھتی ہے ـ عبادت ـ ریاضت ـ مجلسی اور سماجی اچھائیاں برائیاں ـــ جا بجا نصائح کے پیرائے میں انہیں مسائل کو پیش کیا گیا ہے فنی اعتبار سے اس مثنوی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی ـ پھر بھی اس لحاظ سے اہم ضرور ہے کہ اس کا تعلق اس قدیم لکھنؤ سے وابستہ ہے جسے ابتک عوام کے سامنے

۱ـ شکستہ ۲ـ شکستہ

ہیئت گاہ، ہی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے ۔

ذیل میں اس مثنوی کا سرسری انتخاب چند عنوانات کے تحت پیش کیا جا رہا ہے جو مسلسل اور مربوط نہیں ہے بلکہ مختلف ستے کے تحت جابجا سے کیا گیا ہے ۔

خوف خدا اور اطاعت شاہ

خدا سے خطر ہے مناسب تمہیں ۔ بزرگی ہے سلطان کی واجب تمہیں
ہمیشہ خدا سے رہو خوفناک ۔ کہ وہ ہے خداوند خلاق پاک

عبادت

خدا کہتا ہے کرو تم عبادت مری ۔ کرو دل سے یہ طاعت ظاہری
خدا کی عبادت بڑا کام ہے ۔ جو غافل ہے وہ سخت ناکام ہے
خدا کی پرستش کرو اختیار ۔ کبھی اس میں نقصان نہیں زینہار

فضیلت علم

جو جاہل ہیں ۔ علم ان کو اپنا سکھا ۔ کہ ہوتا ہے اوسکا بڑا مرتبا
ترقی کرو ہر طرح علم کی، ۔ ہے کوتاہی اس بات میں جاہلی
اگرچہ کوئی شخص کم .... ہے ۔ تو پھر علم دیتا ہے عزت اوسے

روز جزا

کرو تم وہ پہچانے جس میں خدا ۔ تو آرام ہو تم کو روز جزا

نفس امارہ

زبر دست سمجھو کہ ہے وہ بشر ۔ جسے غلبہ ہے نفس امارہ پر

قناعت

قناعت کرو نفع جو ہو قلیل ۔ کہ طامع ہوتے ہیں خوار و ذلیل

بزرگوں کی تعظیم

جو بوڑھے ہیں تعظیم اونکی کرو ۔ منھ اونکے دیکھو خدا سے ڈرو

معزز رکھو اپنے ماں باپ کو کہ عزت سے پھر دیکھو تم آپکو

رازداری

کسی کا نہ کہہ بھید تو زینہار کہ جاتا رہے گا ترا اعتبار

خیانت

امانت میں ہرگز خیانت نہ کر ذلیل آپکو بے دیانت نہ کر

خیرات

جو دیوے گا محتاج درویش کو یقیں ہے کہ پھر خود نہ محتاج ہو

اپنوں سے حسن سلوک

اگر تیرے بھائی کو ہو بے زری مناسب ہے اوسکی کرو یاوری

غریبوں سے برتاؤ

غریبوں پہ جس کا ہے لطف وعطا تو وہ باغ دولت سے پھل کھائیگا
غریبوں پہ ہرگز نہ کرنا جفا کہ اس بات سے خوش نہ ہوگا خدا

چوری

کرو تم نہ چوری برا کام ہے خیانت جو کرتا ہے بدنام ہے

سود

روپے مفلسوں کو نہ دو سود پر ..... غریبوں کا ہونا ضرور

ادائی قرض

کسی کا جو ہے قرض تم نے لیا ہے دون ہمتی ورنہ کرنا ادا

گداگری

گدائی پہ ہرگز نہ کر زندگی توانا کو ہے اس میں شرمندگی

حق المحنت

جو اُجرت ہے مزدور کی کم نہ کرنا　　ذرا اونکی محنت پہ رکھ تو نظر

رشوت

کبھی تو نہ نزدیک رشوت کے جا　　کہ کرتا ہے اس سے تنفر خدا

اخلاقیات کے یہ نمونے لکھنؤ کے اسی دور کی ترجمانی کرتے ہیں جب بقول روائت نگاروں کے لکھنؤ کی صبح وشام بہر تعیش اور بہ کاریوں کی پھٹکار برستی تھی اور سوائے برائیوں کے اس عہد تاریک نے تاریخ کو ایک بھی اچھائی نہیں دی۔ اور اگر کچھ خوبیاں تھیں بھی تو وہ مذہبی افراط وتفریط کی نذر ہوگئیں۔! تاریخ کی چھان بین کرنے والے محمود غزنوی سے لیکر اورنگ زیب عالمگیر تک کی صفائی دے سکتے ہیں۔ لیکن اہل تحقیق کا دامن خالی ہے تو بس ان بدنصیب سلاطین اودھ کیلئے جنہیں انگریزوں نے ہمیشہ اپنی سیاست کاری کا شکار بنائے رکھا۔

قاضی محمد حمید الدین ناگوریؒ

ڈاکٹر محمد عمر تقی دہلی

حضرت شیخ قاضی حمید الدین ناگوری ایک جید عالم تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں میں مذہبی اور روحانی زندگی پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور صوفیہ میں سماع کو رائج کیا۔

قاضی محمد حمید الدین کے تفصیلی حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ ملفوظات اور تذکروں میں منتشر مختصر حالات مل سکے ہیں جن کو جمع کر کے اس مقالے میں ان کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وطن مالوف، دہلی میں آمد اور والد کا وصال

کہا جاتا ہے کہ قاضی محمد حمید الدین اپنے والد بزرگوار عطاء اللہ محمود کے ہمراہ وطن مالوف بخارا سے سلطان معز الدین سام[1] کے عہد حکومت میں دہلی تشریف لائے کسی تذکرے میں یہ واضح طور پر مرقوم نہیں ہے کہ ان کے والد اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کیوں آئے تھے؟ لیکن اگر اس زمانے کے اسلامی ممالک کی سیاسی و اقتصادی حالت کا سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

خلافت عباسیہ کے آخری زمانے میں خلفاء عباسیہ کی حکومت کی جڑیں کھوکھلی پڑ گئی تھیں۔ ان کا سیاسی اقتدار رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے کے سبب سے دور دور کے علاقوں کے حکام نے عملی طور پر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی مغلوب قومیں اپنی آزادی اور فتوحات ملکی کے لئے سر اٹھانے لگی تھیں سیستان اور خراسان پر تباہی اور بربادی کی آگ برس رہی تھی۔ پامالی پر پامالی ہوتی تھی۔ تباہی پر تباہی آتی تھی۔ نہ تو وحشی لٹیروں کو رحم آتا تھا اور نہ کسی قسم کا نظم و نسق ہی قائم ہونے پاتا تھا۔ خطائی تاتاریوں کا ایک نیا پرجوش گروہ جو غزو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، بڑے جوش و خروش اور ولولوں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے لوٹ مار، تاخت و تاراج، ظلم و ستم و جبر کا ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر کو ان لوگوں کے ہاتھوں ایک بہت بڑی ہزیمت اٹھانی پڑی۔ سلطان سنجر بے یار و مددگار رہ گیا اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ اور خراسان کے شہروں پر تاتاریوں نے بے پناہ مظالم کئے۔

---

[1] سلطان کا اصلی نام محمد تھا تخت نشینی کے بعد اس نے معز الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس لئے اس کا صحیح نام سلطان معز الدین محمد غوری ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ اسے ایام شہزادگی میں شہاب الدین بھی کہتے تھے اور مملکت ہند میں اس کی اکثر فتوحات اسی زمانہ شہزادگی میں ظہور میں آئیں جب وہ اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کا نائب تھا۔ لہٰذا بعض مورخوں نے شہاب الدین غوری بھی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ طبقات ناصری۔ انگریزی کا ترجمہ۔ از میجر ریورٹی۔ ص ۴۴۷)

سنہ ۶۱۵ھ میں چنگیز خاں نے خوارزم شاہ پر چڑھائی کر دی اور بخارا تک بلا مزاحمت بیس ہزار سپاہ کے ساتھ آ پہونچا۔ سنہ ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں بخارا شہر میں داخل ہوا اور وہاں کے باشندوں کو جلاوطنی کا حکم دیا۔ جو بچ رہے ان کو قتل کر دیا گیا۔ کچھ غلام بنا لئے گئے۔ بخارا سا عظیم الشان شہر جلا کر خاک کر دیا گیا[1]۔ اس کے بعد چنگیز خاں نے سمرقند کا رُخ کیا اور اس شہر کا بھی یہی حال کیا۔ تاتاریوں نے خوارزمی مملکت کو بلائے بے درماں کی طرح غارت کر دیا۔ ہمدان کو فتح کیا۔ اور قزوین کو فتح کر کے چالیس ہزار باشندوں کو تہ تیغ کر دیا۔ خوارزم شہر پر قابض ہونے کے بعد اس دریا کے بند کو جس کے ذریعہ شہر میں پانی لایا جاتا تھا کھول دیا جس کی وجہ سے سارا شہر مع اپنی آبادی کے تہ آب ہو گیا[2]۔ چنگیز نے خود ترمذ پر فوج کشی کی اور وہاں کے باشندوں کو قتل کرا دیا۔ بعد ازیں بدخشاں اور بلخ فتح کئے اس نے غزنہ اور غور پر قبضہ کیا۔ پوری آبادی کو قتل کرایا اور اُن شہروں کو ویران کر دیا۔

جلال الدین خوارزم شاہ کے تعاقب میں چنگیز ہندوستان تک آیا لیکن جب مفرور شاہ ہاتھ نہ آیا تو تاتاری پنجاب اور ملتان کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے[3]۔

مختصر یہ کہ اسلامی دنیا چنگیز خاں کے ہاتھوں زیر و زبر ہو گئی۔ لاکھوں مسلمان تاتاریوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہوئے۔ بقیہ بے سرو ساماں اپنے گھروں سے ہجرت کر گئے۔ جو شہر صدہا برس میں علم و فن، تہذیب و تمدن اور تجارت کے مرکز بنے تھے، تباہ و برباد ہو گئے[4]۔

ہندوستان میں صرف دہلی ہی ایک ایسا شہر تھا جو بلائے ناگہانی اور حملہ آوروں کی خونریزی سے محفوظ تھا۔ یہاں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی جا رہی تھیں اور اس کے برخلاف دیگر اسلامی ممالک میں تاتاریوں کے ہاتھوں اسلامی حکومتوں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں۔ اس وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں علماء، مشائخ، شعراء و ادبا، صوفی اور شہزادے اور دیگر پیشہ ور اپنا سر چھپانے کیلئے ہندوستان چلے آئے[5]۔

عہدِ شمسی کی نسبت عصامی لکھتا ہے ؎

غرض چوں کہ خورشید روئے زمیں — شد التمش آں شمس دنیا و دیں
بہ دہلی چناں تخت گاہے بساخت — سپاہش در اقصائے آں ملک تاخت
در آں شہر یک رونقے شد پدید — بلے لذتے باشد اندر جدید

۱۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاریخ ملت (جلد ششم) ص ۲۶۰ — ۲۶۱

۲۔ ابن اثیر۔ (ج ۱۲۔ ص ۱۴۱) بحوالہ تاریخ ملت (جلد ششم)

۳۔ ایضاً ص ۱۵۲

۴۔ تاریخ ملت (جلد ششم) ص ۲۶۴

۵ ملاحظہ ہو۔ تعارف۔ Some Aspects of Religion and politics in India during the 13th century. by K.A. Nizami PP III — IV

۶- Studies in Medieval Indian History. by K.A. Nizami — P.2

بسے سیدانِ صحیح النسب — رسیدند دروے ز ملک عرب
بسے کاسبانِ خراسان زمین — بسے نقش بندانِ اقلیم چین
بسے عالمانِ بخارا نژاد — بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک و ہر جنس صنعت گراں — ز ہر شہر و ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقدان جواہر شناس — جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیمانِ یونان، طبیبان روم — بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
درآں شہرِ فرخندہ جمع آمدند — چو پروانہ بر نورِ شمع آمدند
یکے کعبۂ ہفت اقلیم شد — دیارش ہمہ دار اسلیم شد[1]

قرین قیاس ہے کہ ان ہی تباہ کن حالات سے دل برداشتہ اور متاثر ہو کر بحالت مجبوری قاضی حمید الدین ناگوری کے والد ماجد پناہ لینے کی غرض سے ہندوستان چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

قاضی صاحب کے والد کا صحیح سنِ وفات نہیں معلوم۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال دہلی میں ہوا ہے[2]۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں مختصر معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔ مگر ان کی علمی قابلیت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر رائج زمانہ کے مطابق ہوئی ہو گی اور انھوں نے جیّد عالموں اور استادوں کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم کیا ہوگا۔ سیر العارفین میں مرقوم ہے کہ

"درعلم ظاہری بپایۂ اجتہاد رسیدہ بود"[3]

مصنف اخبار الاخیار کا بیان ہے:۔

"جامع بود میانِ علومِ شریعت و طریقت"۔[4]

آپ صاحبِ تصانیف تھے اور اُن کتب سے اُن کے علمی تبحّر کا پتا چلتا ہے۔

عہدۂ قضا پر تقرری اور تارک الدنیا ہونا

غالباً سلطان شمس الدین التمش نے حمید الدین کو ناگور کا قاضی مقرر کیا تھا چونکہ وہ تین سال تک ناگور کے قاضی رہے۔ اسی لئے ناگوری مشہور ہیں۔ انھوں نے بڑی دیانت داری سے اپنے عہدے کے فرائض انجام دیئے اور بعد ازیں مستعفی ہو گئے۔

۱۔ فتوح السلاطین، مترجمہ محمد یوشع، ص ۱۱۴-۱۱۵۔ نیز ملاحظہ ہو۔ طبقات ناصری منہاج السراج ص ۱۹۶۔

۲۔ سیر العارفین۔ ص ۱۴۸

۳۔ سیر العارفین۔ ص ۱۴۸۔ نیز ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار۔ ص ۴۰

۴۔ اخبار الاخیار ص ۴۰ "حضرت قاضی عالم جلیل بود"۔ سیر الاقطاب۔ ص ۱۴۸

مستعفی ہونے کی یہ وجہ تذکروں میں لکھی ہے ۔

• ایک رات انھوں نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ وہ انھیں اپنی طرف بلا رہے ہیں ۔ دوسرے دن انھوں نے ترک و تجرید اختیار کرلی اور اس بات کی کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی " [1]

سیر وسیاحت عہدہ قضاء سے مستعفی ہونے کے بعد قاضی حمید نے بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوکر فیض روحانی حاصل کرنے کی غرض و غایت سے سیر و سیاحت اختیار کی ۔ اور اسلامی ممالک کے بزرگوں سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے بغداد پہونچے ۔

بغداد مسلمانوں کا عظیم الشان شہر اور صدیوں سے خلافت کا صدر مقام چلا آرہا تھا علم وفن اور تہذیب و تمدن کا مرکز علما اور فقہا کا مرجع اور دولت و ثروت کا مخزن تھا جس زمانے میں قاضی حمید وہاں پہونچے اس وقت سات سو دانش مند مفتی وہاں موجود تھے [2] وہاں سے علم و ادب کے چشمے اُبلتے تھے ۔ روحانی تربیت اور صوفیائے کرام کا ملجا و ماویٰ تھا ۔ بغداد پہونچ کر قاضی حمید شیخ شہاب الدین عمر سہروردی [3] کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ مرید ہوکر خرقۂ خلافت کی سعادت حاصل کی ۔ روضۃ اقطاب کے مصنف کا بیان ہے کہ اس زمانے میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ قاضی حمید، شمس الدین سمرقندی کے مرید تھے ۔ لیکن مصنف مذکا خیال ہے کہ یہ ممکن ہے کہ قاضی حمید نے دونوں بزرگوں کی خدمت میں رہ کر استفادۂ باطنی کیا ہو کیونکہ وہاں سلف میں یہ طریقہ عام تھا کہ ایک مرید بیک وقت متعدد مشائخ سے روحانی تربیت حاصل کرتا تھا [4]

لیکن خزینۃ الاصفیاء میں قاضی حمید الدین ناگوری کے بارے میں شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کا ایک قول نقل کیا گیا ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ قاضی حمید الدین شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کے مرید اور خلیفہ تھے ۔

• خلیفہ ہائے من در ہندوستان بسیار اند واز ایشان حمید الدین از بزرگ ترین خلیفہ ہائے من است • [6]

۱۔ سیر العارفین ــ ص ۱۲۸ ــ نیز ملاحظہ ہو ۔ اخبار الاخیار ۔ ص ۴۲ ، روضۃ الاقطاب ۔ ص ۴۲ ۔ خزینۃ الاصفیاء (ج ۱) ص ۳۰۹

۲۔ سیر الاقطاب ۔ ص ۱۴۷

۳۔ مصنف عوارف المعارف ـ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی (م ۶۳۲ھ ـ ۱۲۳۴ء) سہروردی سلسلے کے بانی، شیخ ابو النجیب سہروردی کے بھتیجے اور خلیفۂ اکبر بلکہ سلسلہ کے بانی ثانی تھے ۔ ملاحظہ ہو ۔ سفینۃ الاولیاء ــ ص ۱۱۲ ــ ۱۱۳ ــ تاریخ مشائخ چشت ص ۱۱۰ ، ۱۱۴ ، ۱۱۵ ، ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۱۲۴ ، ۱۲۸ ، ۱۳۱ ، ۲۹۰ ، ۲۹۱ ، ۲۲۸ ،

۴ ۔ روضۃ الاقطاب ص ۴۲ ۔

۵ سیر العارفین ص ۱۲۸ ، اخبار الاخیار ص ۴۲ ، گلزار ابرار ص ۴۲

۶ خزینۃ الاصفیاء ج اوّل ۔ ص ۲۱۰ ۔

زیارت روضۂ مقدس سرورِ کائنات

پیرو مرشد سے رخصت ہو کر قاضی حمید، مدینہ منورہ پہونچے اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مقدس کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور ایک سال دو ماہ اور آٹھ دن حرم شریف میں رہ کر مجاوری کے فرائض انجام دیئے۔ وہاں سے مکۃ اللہ تشریف لائے اور تین سال وہاں بھی مجاور رہے، متعدد اولیاء اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بے شمار روحانی نعمتیں حاصل کیں [1]۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات اور اُن سے عقیدت

جس زمانے میں قاضی حمید بغداد پہونچے۔ اُن ایام میں حسنِ اتفاق، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی وہیں موجود تھے۔ خوش قسمتی سے قاضی صاحب ان کی خدمت میں برائے قدمبوسی حاضر ہوئے۔ ان کی ذات بابرکات سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ قدرتی طور پر ان کے دل میں قطب صاحب کے لئے بے حد اخلاص اور محبت پیدا ہو گئی [2]۔ دونوں بزرگوں کے درمیان یہ خلوص و محبت ہمیشہ قائم رہا۔

دہلی میں بارِ ثانی ورود

قاضی صاحب جب سیر و سیاحت کے بعد دوبارہ دہلی تشریف لائے۔ تو حضرت قطب الدین بختیار کاکی پہلے ہی سے دہلی آ چکے تھے۔ اور اپنے پیرو مرشد خواجہ معین الدین چشتی کے حسب منشار دہلی کو اپنا مرکز بنا کر اشاعت اسلام اور لوگوں کی روحانی تربیت کے کام کو بڑی استعدی اور پوری کوشش کے ساتھ شروع کر دیا تھا۔ قاضی صاحب، قطب صاحب کی اعلیٰ شخصیت پر اس قدر فریفتہ تھے کہ انھوں نے قطب صاحب کی خدمت میں ہی رہنا شروع کر دیا۔ اور ان سے انواع و اقسام کے فیوضِ روحانی حاصل کر کے کمالیت کے درجے پر پہونچے۔ اور اُن کے قریبی حلقہ مصاحبین میں شامل ہو گئے۔ جب تک حضرت قطب صاحب بقیدِ حیات رہے۔ قاضی صاحب ان سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے اور یہاں تک کہ ان دونوں بزرگوں کے مزار بھی قریب قریب بنے ہوئے ہیں [3]۔

سماع - قاضی حمید الدین اور علماء ظاہر کے درمیان تنازعہ

سماع کے مسئلے پر ابتدا ہی سے علماء ظاہر اور علمائے باطن (صوفیائے کرام) میں بڑا اختلاف رہا ہے۔ بعض مشائخ نے سماع روحانی ارتقاء کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ جب کہ کچھ علماء نے سماع کو صریحاً حرام بتایا ہے۔ اور خواجہ میر درد جیسے محتاط بزرگوں نے

۱۔ سیر العارفین ص ۱۴۸۔ اخبار الاخیار ص ۷۲-۷۳۔ روضۃ الاقطاب ص ۷۲-۷۳

۲۔ قطب الدین بختیار کاکی۔ (۵۶۹ھ تا ۶۳۳ھ) آپ ترکستان کے شہر اوش میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کے بعد بغداد میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مرید ہوئے۔ جب ان کے پیرو مرشد خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان تشریف لے آئے تو حضرت بختیار کاکی بھی ان کی زیارت کے لئے بغداد سے ہندوستان آئے۔ اور حضرت خواجہ بزرگ کے حکم سے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ اور آخری دم تک دہلی میں رہ کر مسلمانوں کی تربیت کرتے رہے۔ برائے سوانح ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ص ۴۸-۵۷۔ فوائد الفواد۔ سیر العارفین۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۶۷-۲۷۶۔ اخبار الاخیار ص ۲۸-۳۰۔ سیر العارفین ص ۱۴-۳۱۔ روضۃ الاقطاب ص ۲-۷۱۔ سفینۃ الاولیاء ص ۹۴-۹۵

۳۔ سیر العارفین ص ۱۴۸۔

۴۔ سیر العارفین ص ۱۴۸۔ روضۃ الاقطاب ص ۶۳۔ خزینۃ الاصفیاء ج اول ص ۳۰۹-۳۱۰۔ گلزار ابرار ص ۴۷

"نہ بیکار می کنم نہ ایں کار می کنم" کہہ کر خاموشی اختیار کر لی [1]

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے چشتیہ سلسلہ کے علاوہ تمام دیگر سلسلوں میں سماع سننا ممنوع ہے۔ باوجودیکہ قاضی حمید الدین سہروردی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ سماع سننے کے بہت شائق تھے۔ اور کوئی دوسرا شخص اس بات میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان میں اور بالخصوص دہلی کے صوفیاء کے حلقوں میں قاضی صاحب نے سماع کو رائج کیا اور عوام الناس میں بھی سماع سننے کا شوق تیزی سے پھیل گیا۔

حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ

"اگرچہ حمید الدین مرید و خلیفہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی بود
فاما در سماع غلو تمام داشت۔ اگرچہ بعضے از سہروردیاں سماع بر سبیل ندرت بشنوند۔
فعلاً او را بواسطہ صحبت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی در ایں کار استغراقے و غلوے تمام بود
بلکہ در دار الخلافہ دہلی باوجود مدعیان و منکران سماع او سکہ ایں کار درست ساخت [2]"

اس کام میں قاضی صاحب کو قاضی منہاج الدین سراج جرجانی [3] سے کافی مدد ملی۔ قاضی منہاج قاضی شہر تھے۔ پھر بھی سماع کو درست سمجھتے تھے اور خود بھی سماع سنتے تھے۔ اس بنا پر ان کے زمانۂ قضاء میں سماع کے رواج کو استقامت حاصل ہوئی۔ فوائد الفواد میں حضرت سلطان المشائخ کا ایک ارشاد نقل ہوا ہے۔

"سکۂ سماع دریں شہر قاضی حمید الدین ناگوری نشاند رحمۃ اللہ علیہ و قاضی منہاج الدین
ہم چوں او قاضی شہر و صاحب سماع بود۔ بسبب ایشاں ایں کار استقامت پذیرفت [4]"

خلفاء راشدین کے عہد زریں کے بعد مسلمانوں کا مذہبی گروہ دو طبقوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ایک طبقہ علماء ظاہر (یا علماء سو) کہلاتا تھا اور دوسرا طبقہ علماء باطن (طبقۂ صوفیاء کرام)۔ اوّل الذکر گروہ قرآن اور حدیث کی تعلیمات پر آنکھ بند کر کے عمل پیرا تھا اور دوسروں کو اس کے مطابق عمل کی تلقین کرتا تھا۔ اور جو بات قرآن اور حدیث سے ثابت نہ ہوتی تھی اس کی سخت مخالفت کرتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کا اقتدار بڑھتا گیا اور چونکہ یہ گروہ عام مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ اس لئے بادشاہوں اور سلاطین کو بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے تھے۔ اپنے بڑھتے ہوئے اقتدار

۱۔ سماع کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو۔ رسالہ السماع والرقص۔ ابن تیمیہ تلبیس ابلیس۔ مولانا ابو الفرج ابن جوزی، اصول السماع۔ مولانا فخر الدین زرادی۔ کیمیائے سعادت امام غزالی۔ کشف المحجوب۔ شیخ علی ہجویری۔ شرح السماع بالحقائق اقوال المشائخ واحوالہم فی السماع۔ عبد الحق محدث دہلوی۔

۲۔ فوائد الفواد۔ ص ۲۳۹۔ نیز ملاحظہ ہو سیر العارفین ص ۱۴۹۔ اخبار الاخیار۔ ص ۴۰۔۴۱۔

۳۔ مصنف طبقات ناصری۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار ص ۸۰۔ طبقات ناصری (انگریزی ترجمہ میجر ریورٹی) دیباچہ

۴۔ فوائد الفواد۔ ص ۲۳۹۔

کی وجہ سے یہ گروہ وقتاً فوقتاً اپنی محدود ذہنیت کا بھی مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ دوسرا گروہ، علماء باطن، قرآن و حدیث کے اتباع کے ساتھ ساتھ روحانی زندگی کی ارتقاء کے لئے آزاد خیالی کا سہارا لیتا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ اپنے ہر فعل کا جواز قرآن و حدیث سے پیش کرتے تھے۔ اور بڑی حد تک اپنے ہر فعل کو قرآن و حدیث کی رو سے صحیح بھی ثابت کر دیتے تھے لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ان دونوں گروہوں میں سماع کے مسئلے پر سخت اختلاف رہا۔ اور علماء ظاہر کا گروہ علماء باطن کو ہمیشہ نیچا دکھانے اور ان کی تذلیل کے درپے رہتا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے ابتدائی زمانے میں علماء ظاہر کا تسلط بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ لوگ سلاطین سے لیکر عوام کی زندگی تک میں چھائے ہوئے تھے۔ اور قرآن اور حدیث کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرانے کی سعی بھی کرتے تھے۔ چوں کہ عوام پر اُن کا بہت اثر تھا۔ اس لئے سلاطین کو بھی ان کے خلاف دم مارنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور ان کے سامنے انھیں گردن جھکانی پڑتی تھی۔

مختصر یہ کہ جب دہلی میں سماع کی گونج سنائی دی تو علماء ظاہر میں ایک طرح کی بے چینی پیدا ہوئی۔ سیر الاقطاب میں سماع کے مروج ہونے کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے

"قاضی حمید[۱] نے بازار سے سات غلام خریدے اور ان کو غزلخوانی کی تعلیم دی چنانچہ چند روز میں انھوں نے اس فن میں مہارت پیدا کر لی۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے متواتر سماع سننا شروع کر دیا۔ پس یہ خبر سرعت کے ساتھ شہر میں پھیل گئی۔ اکثر دانشمندانِ عصر مثلاً قاضی سعد الدین[۲] و قاضی منہاج الدین۔ قاضی عماد[۳] سید مبارک[۴] غزنوی۔ اور مولانا مجد الدین وغیرہ نے اس عمل کے خلاف آواز بلند کی اور قاضی صاحب کی طعن و تشنیع کی۔ انہوں نے آپس میں کہا۔

"دیکھتے ہو۔ قاضی صاحب اپنے پیروں کے برخلاف سماع سنتے ہیں"

حضرت قاضی حمید کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے جواب دیا:—

"چوں کہ میں نے چشتیوں کا دامن پکڑا ہے اور ان کے روضۂ مقدس کی خاکروبی کر کے ایسی علم نعمتیں تحصیل کی ہیں کہ اُن کا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت جنید بغدادی[۵] قدس اللہ سرہ العزیز (متوفی سنہ ۲۹۷ھ) کی توبہ سے میرا کوئی

۱۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ روضۃ الاقطاب ص ۷۷

۲۔ روضۃ الاقطاب ص ۷۷

۳۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فوائد الفواد ص ۱۹۳ ۔ اخبار الاخیار ص ۵۳ ۔ سیر الاولیاء ص ۱۶۴ - ۱۶۶

۴۔ اخبار الاخیار۔ ص ۵۲ ۔ روضۃ الاقطاب ۔ ص ۷۷

۵۔ آپ کا مزار بغداد میں ہے۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو سفینۃ الاولیاء ص ۳۷ - ۲۹ ۔ خزینۃ الاصفیاء ۔ اوّل ص ۸۱ - ۸۶

واسطہ نہیں لے

دوبارہ بغداد تشریف لے جانا

اس واقعہ کے بعد قاضی صاحب دوبارہ بغداد تشریف لے گئے۔ بغداد پہونچ کر انھوں نے اپنے ایک مرید کے یہاں قیام کیا۔ جو بذاتِ خود ایک کامل بزرگ تھے۔ اور علاوہ ازیں فارغ البالی خوش حال اور صاحب ثروت تھے۔ قاضی صاحب نے اُن سے دریافت کیا

" میرے بھائی! اس حجرے کو کیوں نہیں کھولا؟"

مرید نے جواب میں عرض کیا کہ

" اے حضرت، اس حجرے میں ایک نے نواز مقید ہے۔ خلیفۂ وقت کے خوف سے میں نے اسے یہاں چھپا رکھا ہے خلیفہ جہاں کہیں کسی قوال یا اہل سماع کے متعلق خبر پاتا ہے۔ اسے سخت سزا دیتا ہے۔ اور اس سے باز پرس کرتا ہے "

قاضی صاحب نے اس مرید سے کہا

" بھائی میں آشفتہ سماع ہوں۔ اس کو میرے پاس لاؤ۔ مت ڈرو "

مرید نے اسی وقت حجرے کا قفل کھولا اور نے نواز کو قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ قاضی صاحب کے حکم سے اس نے گانا شروع کیا۔ قاضی صاحب سماع میں غرق ہوگئے۔ اور ان میں وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ شہر کی خلقت کو اس کا علم ہوگیا۔ اور انھوں نے شہر کے قاضیوں اور مفتیوں کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ اس وقت بغداد میں سات سو فقیہہ تھے انھوں نے قاضی صاحب کو دیوان عدالت میں حاضر ہونے اور اپنے فعل کو شریعت سے ثابت کرنے کا حکم صادر فرمایا اور یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ اگر وہ ملزم ثابت ہوگئے تو انھیں دار پر چڑھا دیا جائے گا جب پیغامبر قاضی صاحب کی خدمت میں پہونچا۔ تو قاضی صاحب کو سماع سننے میں مستغرق دیکھا۔ خوف سے اس کا دل لرز اٹھا۔ اور وہ خاموش کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جب قاضی صاحب ہوش میں آئے تو اس نے انھیں مفتیوں کا پیغام پہونچایا۔ قاضی صاحب نے جواباً کہا۔

" کہ سماع بر بعضے ہا کہ احوال آں شکل پسند اشتند حرام و بر بعضے ہا کہ عنایت ایزدی تقدس بکام ست حلال ۔"

یہ کہہ کر چند قدم آگے بڑھے اور پھر رک گئے۔ اور اس شخص سے کہا۔

" اے عزیز۔ جاؤ۔ اور حاکمان قاضیوں اور مفتیوں سے کہنا کہ کل سب علماء ایک مقام پر جمع ہو جائیں۔ اور یہ فقیر بھی وہاں حاضر ہوگا۔"

" گر ایں درویش اہل سماع ،، است، سماع می شنود واللہ نہ چندیں کس بردار نمود اند، حمید الدین را نیز بردار کردہ باشند "

وہ شخص چلا گیا اور قاضیوں اور مفتیوں کو قاضی حمید کا جواب پہونچایا۔ ان لوگوں نے قاضی صاحب کی بات مان لی۔ بعد ازیں قاضی حمید نے اپنے مرید سے تمام شہر کے قاضیوں اور مفتیوں کو بتقریب دعوت مدعو کرنے کا حکم دیا۔ مرید نے حسب الارشاد سب کو مدعو کیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے فرمایا کہ چوں کہ شہر میں قوال نہیں ہیں۔ لہٰذا جس قدر بھی مزامیر

لے سیر الاقطاب ص ۱۴۲

ستیاب ہو سکیں۔ جمع کئے جائیں۔ اس طرح بہتر مزامیر اکٹھا کئے گئے۔ اور انھیں گھر کے صحن میں رکھ دیا گیا۔ اور خوبصورت کپڑوں ان پر غلاف چڑھا دیئے گئے۔ دوسرے دن شہر کے تمام قاضی اور مفتی حضرت قاضی حمید الدین کی دعوت پر ایک جگہ جمع ہوئے انھوں نے کہا

"حمید الدین کہاں ہے جس نے تمام شہر میں سماع کا یہ فتنہ برپا کر رکھا ہے۔"

ی حمید پہلے ہی سے موجود تھے۔ اور انھوں نے جواب دیا

"میں حمید الدین ہوں جو سماع سنتا ہوں۔ اور اپنے اس فعل کو مباح کہتا ہوں۔ بروایت علماء میں ایک مریض ہوں مجھے دل کا مرض لاحق ہے۔ اور سماع اس درد کا درماں ہے۔ بقول حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پیاسے کو ازحد ی کے موقع پر اگر پانی نہ ملے تو اور وہ جاں بلب ہو تو اس کے لئے شراب بھی مباح ہے۔ لیکن

بہر تقدیر درشرع شریف ہلاکت نفس روا نداشتہ اند"

"بقول حضرت امام شافعی قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز اگر کوئی شخص دلی حزن واندوہ رفع کرنے کے لئے ع سنتا ہے تو ایسی صورت میں مباح ہے۔"

چونکہ قاضی حمید الدین ایک بلند پایہ کے عالم تھے اور انھوں نے ایسے دلائل پیش کئے کہ کوئی دوسرا شخص ان کی بات رد نہ کر سکا آخر کار محفل سماع منعقد ہوئی اور تمام مفتی اور قاضی سماع سے محظوظ ہوئے اور وجد کی حالت میں انھوں نے رقص کیا ت کیفیت میں ان سبھوں نے حضرت قاضی حمید کے قدموں پر اپنا سر جھکا دیا۔ اور معذرت کے خواستگار ہوئے۔ اور ان سب ماع کے حلال ہونے کا اقرار کیا۔ کچھ دنوں وہاں قیام کے بعد قاضی صاحب پھر دہلی واپس آئے۔ (باقی)

باب المراسلہ والمناظرہ

الحرب خدعتہ

(مولانا عرشی امرتسری)

محترمی مولانا! سلام و رحمت

نگار کا فروری ۶۳ء نمبر میرے سامنے ہے۔ اس میں آپ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے مراسلہ ومناظرہ میں مشغول نظر آرہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"خداع (فریب) مطلق سورت میں مذموم و معیوب نہیں، قرآن مجید میں بے تکلف اس کا استعمال اللہ کے لئے آیا ہے " واللہ خادعہم "۔ ۔ ۔ ۔ " آپ کا ارشاد ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ "خدا کا اپنے آپ کو " خادع " کہنا طنزیہ مفہوم میں اسی طرح استعمال کیا گیا ہے، جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ واللہ خیرالماکرین ۔ ۔ ۔ ۔

میرے خیال میں " خادعہم " کا مطلب یہ ہے کہ منافقین جو مسلمانوں کو اور خدا کو فریب دینے کے لئے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔ قانون خداوندی کے مطابق خود فریب خوردہ ہیں، اپنے ہی ضمیر کا خون کر رہے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ میرے اس خیال کی تصدیق یہی آیت کر رہی ہے ۔ وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔ لہٰذا خدا کا اپنے آپ کو خادع کہنا طنز نہیں ہے۔ اسی طرح " خیرالماکرین " بھی حقیقت ہے طنز نہیں۔ مکر کے معنی خفیہ تدبیر ہیں، یعنی کفار کی خفیہ تدبیروں کے جواب یا بدلے میں خدائی قانون بھی خفیہ طور پر ان کی گرفت و سزا کے لئے تیار تھا۔ اور خدائی تدبیر نتیجے کے لحاظ سے خیر (بہتر) ہوتی ہے ۔

حرب کو مولانا عبدالماجد نے غیر اسلامی اور قتال کو اصطلاحاً اسلامی جنگ قرار دیا ہے۔ حرب کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں " اسلام اپنی جنگوں کو صرف قتال کے نام سے جانتا پہچانتا ہے "۔ میرے نزدیک ان کی یہ تحقیق بالکل مطابق قرآن ہے۔ قتال کے ساتھ " کتب " کا لفظ اسی طرح وارد ہوا ہے جس طرح صیام و وصیت وغیرہ کے ساتھ ۔ کتب علیکم القتال، کتب علیکم الصیام، کتب علیکم القصاص، کتب علیکم ۔ ۔ الوصیہ ۔ لیکن " کتب علیکم الحرب " کہیں نہیں آیا۔ اس کے برعکس ہر جگہ اس کو

کفار ہی سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ لفظ قتال کا حقیقی مترادف نہیں ہے۔ اس کے معنی میں جنگ کے ساتھ سلب و نہب اور سرکشی داخل ہیں (محیط، تاج العروس، مقائیس اللغتہ وغیرہ) جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے "یحاربون اللہ ورسولہ" اور اس سے بھی "ممن حارب اللہ ورسولہ"۔ آپ فرماتے ہیں کہ "کلام مجید میں حرب کہیں نہیں پایا جاتا"۔ آپ نے اس آیت کی طرف توجہ نہیں فرمائی کلما اوقدوا ناراً للحرب (مائدہ) اس سے بھی کفار ہی حرب کے مرتکب پائے جاتے ہیں۔ مسلمان کہیں بھی آمادہ حرب نظر نہیں آتے۔ آپ کا یہ خیال کہ "قتل و قتال اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں ہر جگہ حرب و جنگ ہی کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں" محل نظر ہے۔ اسی طرح آپ کے یہ الفاظ "قتال اور حرب محاربہ میں کوئی فرق نہیں" قرآنی تصریحات سے مطابقت نہیں رکھتے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ آپ نے مولانا دریابادی کے اس فقرے "فتح و شکست کا تعلق اعلیٰ اخلاقی معیار سے نہیں" سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "اسلام نے حرب و جدال میں خدعہ یا مکر و فریب کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری یا مستحسن قرار دیا ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا دریابادی کے پورے فقرے سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔ پورا فقرہ یہ ہے۔
"دنیا کی عام جنگوں میں چال بازی عام ہے اور فتح و شکست کا تعلق کسی اعلیٰ اخلاقی معیار سے نہیں" اس سے ظاہر ہے کہ وہ اسلامی قتال کو دنیا کی عام جنگوں سے الگ سمجھتے ہیں۔ اسی عام غیر اسلامی جنگ کو وہ حرب اور خدعہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں "حرب جیسی کہ وہ رائج ہے (یعنی بشکل خدعہ) اس کی زد اسلام پر کسی طرح بھی نہیں پڑتی"۔ اسی طرح ان کے الفاظ "جوئے کے پانسے" کو اسلامی جنگوں کی طرف منسوب کر کے جو آپ نے تعجب کا اظہار کیا ہے اور ان پر یہ مصرع چسپاں کیا ہے "ایں کہ می شنوم بہ بیداری ست یارب یا بخواب" ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ صراحتہً غیر اسلامی تمام جنگوں کے لئے ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اور اسلامی جنگوں کا تعلق "اعلیٰ اخلاقی معیار" سے قائم کر رہے ہیں۔ انہوں نے اسلامی جنگ (قتال) سے خدعہ کا لزوم کہیں نہیں لکھا۔ اس کے برعکس عام دنیوی جنگ (حرب) کو خدعہ سے تعبیر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی طور پر ان میں اور آپ میں کوئی اختلاف نہیں۔ الفاظ کے استعمال میں کشاکش دکھائی دے رہی ہے۔

(نگار) اس بحث کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک صاحب اکتوبر ۶۲ء میں حدیث "الحرب خدعۃ" میں لفظ خدعۃ کے مفہوم کے پیش نظر مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ رسول اللہ نے بہ صورت جنگ فریب، کذب و دروغ سے بھی کام لینے کی اجازت دی ہے حالانکہ یہ بات تعلیم اسلام کے منافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ

حدیث کا یہ مفہوم قرار دینے میں نہ صرف مفسرین بلکہ ہمارے بعض علماء کرام نے بھی غلطی کی ہے اور اس کا اصل سبب ابن اثیر کی یہ روایت ہے کہ ایک بار جناب ابن عباس نے حضرت علی کو یہ مشورہ دیا کہ فی الحال امیر معاویہ کو معزول کرکے لڑائی چھیڑنا مناسب نہیں اور اسی کے ساتھ اپنی تائید میں رسول اللہ کی حدیث "الحرب خدعۃ" بھی سنادی لیکن حضرت علی نے اس پر عمل نہیں کیا۔

میں نے اکتوبر کے نگار میں اسی روایت کی صحت یا عدم صحت پر کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ یہ ضرور ظاہر کردیا تھا کہ حضرت علی نے جناب عباس کے مشورہ پر عمل نہیں کیا تو اس کا سبب یا تو یہ تھا کہ حضرت علی اس حدیث کو صحیح باور نہ کرتے یا یہ کہ اس پر عمل کرنے کا وہ موقع صحیح نہ تھا، اس پر جناب عبدالماجد دریابادی نے "حرب و قتال" کی اصطلاحی تفریق پیش نظر بصورت حرب (غیر مذہبی جنگ) "خدعۃ" کو درست قرار دیا جس میں فروری کے نگار میں تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ظاہر کیا کہ وہ حرب ہو یا (قتال)، یعنی مذہبی جنگ ہو یا غیر مذہبی، رسول اللہ نے کسی حالت میں خدعۃ کا مشورہ نہیں دیا اب میرے فاضل دوست مولانا عرشی امرتسری نے پھر اس بحث کو اٹھایا ہے لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے بعض ضمنی مباحث میں پڑ کر اصل کو نظر انداز کردیا۔

بیں "حرب و قتال" کے اصلاحی فرق سے واقف ہوں یقیناً قتال اصطلاحی نام ہے اسلام کی مدافعانہ جنگوں کا اور حرب کا اطلاق غیر مذہبی لڑائیوں پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف مفہوم کے باوجود یہ سوال بدستور اپنی جگہ قایم رہتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے خدعۃ کی اجازت دی ہے یا نہیں اور جناب عبدالماجد دریابادی اور مولانا عرشی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ حالانکہ میری رائے میں رسول اللہ نے کبھی کسی حالت میں اس کی اجازت نہیں دی۔

مولانا عرشی کا یہ فقرہ کہ رسول اللہ نے حرب ہی کو خدعۃ کہا ہے البتہ بہت تسلی بخش ہے اور اس طرح بات کا رخ پلٹ جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ جناب ابن عباس کا الحرب خدعۃ کی حدیث پیش کرتے ہوئے حضرت علی کو امیر معاویہ سے جھگڑا بند کرنے کا مشورہ دینا کیا معنی رکھتا تھا۔ اگر حدیث کا مفہوم یہی ہے کہ ہر حرب خدعۃ ہے تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ حضرت علی کا امیر معاویہ کے خلاف جنگ کرنا ابن عباس کے نزدیک خدعۃ تھا حالانکہ جناب ابن عباس کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ بہ حالت جنگ رسول اللہ نے خدعۃ کی بھی اجازت دی ہے اور اسی لئے میں نے خدعۃ کے مفہوم میں دوراندیشی و مصلحت بینی کو بھی شریک کردیا تھا بہر حال اصل سوال "الحرب خدعۃ" کے مفہوم کا ہے اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ حرب میں کذب و دروغ جائز ہے" تو میں اس کا مخالف ہوں اور اگر اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ نفس حرب خود اپنی جگہ مکرو فریب ہے" تو بیشک میں اس سے متفق ہوں۔ چنانچہ اصل حدیث جو صحیح بخاری میں درج ہے اس کی نوعیت بھی بالکل یہی ہے اور اس سے "الحرب خدعۃ" کا وہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا جو عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں بخاری کی حدیث پر بھی غور کرلیا جائے۔

جب رسول اللہ نے عبداللہ بن حذافہ کے ذریعہ سے تحریری پیام امن و صلح کا کسرائے ایران کے پاس روانہ کیا تو اس نے آپ کی تحریر کو چاک کردیا اور گورنر یمن کو ہدایت کی کہ وہ "محمد کو گرفتار کرلے"

جس وقت رسول اللہ کو یہ حال معلوم ہوا تو (حسب روایت بخاری) آپ نے فرمایا کہ" وہ وقت دور نہیں کہ کاسرۂ عجم اور قیاصرۂ روم میں سے کوئی باقی نہ رہے گا اور ان کی ساری دولت خدا کی راہ میں صرف ہوگی اور اسی کے ساتھ آپ نے یہ کلمہ بھی ارشاد فرمائے کہ" الحرب خدعۃ"۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کا اکاسرہ وقیاصرہ کی تباہی کی پیش گوئی کے سلسلے میں "الحرب خدعۃ"

دیا تا اکاسرہ و قیاصرہ ہی سے متعلق سمجھا جائے گا نہ یہ کہ اس کو ایک مستقل ہدایت یا اصول سمجھ لیا جائے اب آیئے غور کریں کہ اس پیش گوئی کے سلسلہ میں "الحرب خدعتہ" کا مفہوم کیا رہ سکتا ہے ۔ عینی شارح بخاری نے اس کا مفہوم یہ ظاہر کیا ہے کہ "حرب یا جنگ محض دھوکا ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان اپنے آپ کو تباہ کر دیتا ہے "

ابن اثیر نے خدعتہ ۔ خُدعہ ۔ خُداعہ ۔ تینوں لفظوں کو سامنے رکھ کر جو مفہوم اس کا بتایا ہے وہ بھی قریب قریب وہی ہے جو عینی نے ظاہر کیا ہے یعنی رسول اللہ نے "الحرب خدعتہ" کہکر حرب کو دھوکا قرار دیا ہے ، نہ یہ کہ "حرب میں دھوکا دینا جائز ہے" حیرت ہے کہ الحرب خدعتہ کا مفہوم "لاباس بالخدعتہ فی الحرب" یا تجوز الخدعتہ فی الحرب" کیونکر قرار دید یا گیا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مغالطہ کی بنیاد دراصل ابن عباس کی روایت ہے جس میں انھوں نے حضرت علی کو امیر معاویہ سے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے حدیث "الحرب خدعتہ" کو بھی پیش کر دیا اور لوگوں نے اس کا یہ مفہوم قرار دیا کہ "لڑائی میں دھوکا دینا جایز ہے "

ہو سکتا ہے کہ خود جناب ابن عباس نے اس حدیث کا صحیح مفہوم نہ سمجھا ہو یا یہ کہ اس کا استعمال انھوں نے بھی اسی معنی میں کیا ہو جو عینی نے ظاہر کیا ہے ۔ لیکن اب اسے کون مانتا ہے ۔

بہر حال میرے نزدیک حرب ہو یا قتال یعنی جنگ غیر مذہبی ہو یا مذہبی خدعہ سے کام لینا قطعاً ناجائز ہے اور جناب عبد الماجد دریا بادی و مولانا عرشی کا یہ فرمانا کہ "خداع (فریب) مطلق صورت میں مذموم و معیوب نہیں " مجھے تسلیم نہیں ۔ کیونکہ یہ رسول اللہ کی بلند اخلاقی تعلیم کے بالکل منافی ہے ۔

باب الاستفسار

(۱)
جوشؔ کی نظم ہوائے جنوں کے بعض قوافی

(جناب سوز شاہجہانپوری)

جوشؔ کی نظم ہوائے جنوں جو ۱۷ر مئی کے جنگ میں شائع ہوئی ہے، اس کی بابت آپ کی کیا رائے ہے۔ اس کے بعض قوافی میری نگاہ میں کھٹکتے ہیں جس کا اظہار میں اس لئے نہیں کرتا کہ ممکن ہے، میں غلطی پر ہوں۔

(نگار) حضرت جوشؔ کی یہ نظم میری نگاہ سے گزر چکی ہے اور ان کی دوسری نظموں کی طرح یہ بھی ان کی طباعی وصناعی کی ہر اتم ہے۔ اس کے بعض قوافی کا ذکر آپ نے صراحت کے ساتھ نہیں کیا تاہم اس میں شک نہیں کہ اس کے بعض قوافی محل نظر ہیں۔ نظم غیر مردّف ہے یعنی اس میں ردیف کوئی نہیں ہے اور صرف قوافی سے ردیف کا کام لیا گیا ہے۔ ایسی نظموں کا حسن کلیتہً قوافی صحیح استعمال پر منحصر ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعض قافیے اپنے معنی کے لحاظ سے درست نہیں۔ مثلاً :-

(۱) پہلے شعر کا مصرعۂ اول ملاحظہ ہو :-

فغاں کہ عشق و جنوں کی چلی وہ باد حمیم

حمیم انھوں نے مطلق گرم کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ حمیم کے معنی "کھولتے ہوئے پانی" کے ہیں، محض گرم کے نہیں۔ بی میں یہ لفظ لغات اضداد میں شامل ہے یعنی آب گرم کے علاوہ آب سرد کے مفہوم میں بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ علاوہ اس کے مں دوست کو بھی حمیم کہتے ہیں۔ عربی میں مطلق گرم کے لئے حاد و سخین وغیرہ کے الفاظ مستعمل ہیں۔ اور گرم ہوا کے لئے کلام مجید ں لفظ سموم استعمال ہوا ہے۔ اس لئے بہ اعتبار لغت "باد حمیم" کہنا درست نہیں۔

(۲) آٹھویں شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :-

فضائے وہم میں گونجی نوائے ساز ارَیم

ارَیم عربی کا نہایت غیر معروف لفظ ہے جس کے معنی ویران مقام یا کھنڈر کے ہیں اور اس کے استعمال کا یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ ملوم ہوتا ہے یہ غلطی کاتب کی ہے میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ انھوں نے آرم کو ارَیم لکھا ہوگا۔ جوشؔ نے یقیناً ارَیم کی جگہ کوئی ر لفظ استعمال کیا ہوگا، لیکن وہ کیا ہو سکتا ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے :-

مسافروں کو جو منزل کی سمت اشارہ کرے
اس ایک نقشِ قدم پر نثار سو دیہیم

شعر کی نثر یوں ہوگی :-
ایک نقش قدم پر جو (مسافروں کو) منزل کی سمت اشارہ کرے سو دیہیم نثار (ہیں)" اس میں مسافروں کو زائد اور
فہوم شعر پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے "مسافروں کو اشارہ کرنا" بھی کوئی اچھی زبان نہیں۔ اگر مسافروں کا ذکر ضروری
مرعہ یوں بہتر ہوتا۔

جو ہو اشارۂ منزل مسافروں کے لئے
یا
مسافروں کو جو منزل کی سمت لے جائے

ہ اس کے لفظ دیہیم کا استعمال بھی بے محل ہے کیونکہ دیہیم تاج کو کہتے ہیں اور تاجداروں کی طرف سے کبھی صحیح
قع نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے نقشِ قدم کا تقابل دیہیم سے درست نہیں۔ ہاں اگر مفہوم کچھ اس طرح ظاہر کیا جاتا کہ

اس ایک نقشِ قدم پر ہزار خضر نثار

ہتہ تقابل درست ہوتا۔

وزن کے قوافی میں ایک قابل توجہ قافیہ رقیم بھی تھا جو حضرت جوش نے نظر انداز کر دیا۔ اس کمی کو میں پورا کئے
بہ صد معذرت)

سرت چو آبلہ از جیبِ خود برآرد مجھے
بجز خزیدگیِ راہبانِ کہف و رقیم

---

(۲)

کس کا شعر ہے

ین جبالپور)

ذیل کا شعر آپ نے بھی کہیں کہیں استعمال کیا ہے اور ابوالکلام آزاد نے بھی

چشم اگر این ست و ابرو این و ناز و عشوہ این
الوداع اے زہد و تقویٰ الفراق اے عقل و دیں

یہ شعر مجھے پسند ہے۔ از راہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس شعر کا مصنف کون ہے اور اگر
اس کے کچھ اور اشعار آپ کو یاد ہوں تو انہیں بھی لکھ دیجئے اور شاعر کے حالات بھی
مختصراً بیان فرما دیجئے۔

(نگار) یہ شعر کمال خجندی کا ہے۔ اس کا نام کمال الدین بن مسعود تھا۔ خجند (ماوراء النہر) میں پیدا ہوا (آغاز آٹھویں صدی ہجری) دولت شاہ نے اس کا سال وفات ۷۹۲ھ ظاہر کیا ہے اور خوندمیر نے ۸۰۳ھ۔
یہ صوفی شاعر تھا اور حج سے واپسی کے بعد اس نے تبریز میں قیام کر لیا تھا۔ جب توقتمش خاں نے تبریز فتح کیا تو اسے اپنے ساتھ اپنے پایۂ تخت سرائے لے گیا، لیکن چار سال کے بعد وہ پھر تبریز آگیا اور جلائری خاندان کے فرمانروا سلطان حسین نے ایک خانقاہ اس کے لئے بنوادی۔ میران شاہ (تیمور کا بیٹا) گورنر آذربیجان بھی اس کا بڑا قدر شناس تھا اور مصارف خانقاہ پورے کرتا رہتا تھا۔
خواجہ عبید اللہ اور شاہ زین الدین کا مرید تھا اور بڑی بے ہمہ زندگی بسر کرتا تھا۔ جامی کا بیان ہے کہ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے حجرہ میں ایک چٹائی اور ایک پتھر کے سوا (جو اس کا تکیہ تھا) اور کچھ نہ تھا۔ اس کا دیوان نایاب ہے اور سوا چند غزلوں کے جن کا ذکر بعض قدیم تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، اس کا کلام محفوظ نہیں رہا۔
وہ شاعر ضرور تھا لیکن صرف تصوف کا اور اسی لئے اس کے یہاں صحیح تغزل بہت کم ہے۔ اس کے جو اشعار براؤن نے نقل کئے ہیں ان میں صرف وہی ایک شعر مجھے پسند ہے جو اس کی قبر پر کندہ ہے:-

کمال از کعبہ رفتی بر در یار
ہزارت آفریں مردانہ رفتی

آپ نے جس شعر کا ذکر کیا ہے اس سے ایک خاص روایت متعلق ہے۔ وہ یہ کہ مغربی نے (جو اس کا ہمعصر تھا) اس شعر پر اعتراض کیا کہ اس کا تعلق محض حسن مجازی سے ہے اور حقیقت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ کمال خجندی نے یہ اعتراض سنکر اس کی تردید میں کہا کہ "چشم" مترادف ہے عربی لفظ عین کا اور عین سے مراد ذات خداوندی ہے اسی طرح ابرو کا عربی مترادف لفظ حاجب ہے جس سے صفات خداوندی کی تعبیر کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی اس تاویل سے مطمئن ہو گئے۔ حالانکہ ناز و عشوہ کی کوئی تاویل اس نے نہیں کی تھی۔
مغربی کے ذکر کے ساتھ مجھے چند سال قبل کا وہ واقعہ یاد آگیا جب بعض رسایل میں حالی کے مصرعہ "حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں" پر یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ مغربی سے حالی کی کیا مراد ہے۔ اور اکثر حضرات نے مغربی (شاعر) ہی قرار دیا تھا کیونکہ اگر اس سے حالی کی مراد "مغرب کی شاعری" ہوتی تو "پیروی مغرب" کہتے نہ کہ "پیروی مغربی"۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن حالی کے کہنے کا جو مقصود تھا وہ اسی وقت پورا ہو سکتا تھا کہ وہ "شاعری میں پیروی مغرب" کی تبلیغ کرتے نہ کہ تقلید مغربی (شاعر) کی۔
حالی کلاسکل غزلگوئی کی اصلاح چاہتے تھے اور اسی لئے انھوں نے مثالاً مغرب کی شاعری کا ذکر کیا تھا۔ جس کی بنیاد تجربات زندگی کے حقیقی بیانات پر قایم ہے۔ ان کا ذہن کبھی مغربی (شاعر) کی طرف منتقل نہ ہو سکتا تھا جس کی شاعری بعید از قیاس مفروضات تصوف کے سوا کچھ نہ تھی۔
ریاض قلی نے مجمع الفصحاء میں مغربی کی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "مذہبش وحدت وجود ست و مشربش لذت شہود و بجز یک ہمیں معنی در ہمہ گفتارش نتواں یافت"
اور حالی کا مقصود کبھی یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ شعراء وحدت وجود اور لذت شہود کی شاعری اختیار کریں، جبکہ خود حالی کے زمانہ میں بھی اس کی کمی نہ تھی (حتٰی کہ غالب بھی اس سے محفوظ نہ تھے) اور حالی اسی رجحان کو دور کرنا چاہتے تھے۔
ہر چند حالی کا مصرعہ نقص بیان سے خالی نہیں۔ لیکن لکھ دور کرنے کے لئے اس کا کوئی ایسا مفہوم ظاہر کرنا جو حالی کے مقصود حقیقی کے منافی ہو حد درجہ سوء فہم ہے۔

(۳)

(محمد انور ۔ راولپنڈی)

قوی امید ہے کہ آپ نگار میں اس بات پر روشنی ڈالیں گے کہ گاؤں "چھاؤں" اور "پاؤں" کا صحیح املا کیا ہے نیز یہ کہ گاؤں، چھاؤں، پاؤں، بروزن فعلن نظم ہو سکتے ہیں یا نہیں اور یہ الفاظ "فضاؤں" اور "گھٹاؤں" کے ہم قافیہ ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ جدید شعرا تو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کیا یہ اقدام غلط ہوگا یا مستحن قرار دیا جائے گا کیونکہ اس طرح قوافی میں اضافہ تو ہوتا ہے اور الفاظ کے تلفظ اور مطلب میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔

(نگار) گاؤں، چھاؤں اور پاؤں کو اکثر اساتذہ نے بروزن فاع نظم کیا ہے۔ کیونکہ بول چال میں ان کا صحیح تلفظ یہی ہے۔ بعض نے بروزن فعلن بھی نظم کیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ مناسب نہیں۔

---

(۴)

عبدالغفور خانصاحب (امراؤتی)

عربوں نے علم ہیئت میں جن بارہ بروج کے نام رکھے ہیں ان کا ماخذ کیا ہے۔

نگار) آسمان کے بارہ برجوں کے نام عربوں کے وضع کئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ترجمہ ہیں یونانی یا لاطینی الفاظ کا جو پہلے سے رائج تھے اور وہ خود بھی ترجمہ تھے قدیم مصری الفاظ کے۔ لیکن اس سلسلے میں بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ روما، یونان عرب اور ہندوستان ہر جگہ ان اصطلاحات کے ترجمے میں بجنسہ مصری الفاظ کے مفہوم کو لے لیا گیا ہے اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا گیا۔

برجوں کے جو نام مصر والوں نے متعین کئے تھے وہ بے معنی نہیں تھے بلکہ ان کا ایک خاص مفہوم تھا اور تعیین مفہوم کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ موجود تھی۔ قدیم اہل مصر کے سال کو چار موسموں میں تقسیم کیا تھا۔ (۱) بہار (۲) گرمی (۳) خزاں (۴) جاڑا۔ اور ہر موسم تین تین ماہ کا قرار دیکر ان کے آغاز کا حساب گردش زمین اور مختلف مواقع آفتاب کے لحاظ سے کیا جاتا تھا۔ چونکہ آفتاب کا طلوع و غروب ہمیشہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ بدلتا رہتا ہے اور اسی تبدیلی کے زیر اثر موسم اور اس کے طبعی اثرات و نتائج بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے انہیں کو سامنے رکھ کر برجوں کے نام وضع کئے گئے۔ مثلاً ۲۱ مارچ کے بعد جب آفتاب ایک خاص حصۂ فلک یا فضا سے گزرتا ہے تو یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب بھیڑیں بچہ دیتی ہیں اور اسی مناسبت سے مصریوں نے جو نام اس کا رکھا اس کا ترجمہ لاطینی میں (Aries) عربی میں حمل اور ہندی میں میکھ ہو گیا اور ان سب میں بچہ جننے کا مفہوم پنہاں ہے۔ اسی طرح دوسرے بروج کو لے لیجئے کہ جب وسط اپریل سے کاشت کا زمانہ شروع ہوتا ہے

تو مصریوں نے اس کا نام وہ رکھا جس کا ترجمہ لاطینی میں ([illegible]) اور عربی میں ثور ہے۔ کیونکہ ثور یا بیل ہی پر کاشت کا انحصار ہے۔ اس کے بعد اخیر مئی میں چونکہ بکریاں اکثر و بیشتر دو بچے جنتی ہیں اس لئے اس زمانہ کا نام لاطینی میں (Gemini) اور عربی میں جوزا اور ہندی میں متھن ہو گیا جو سب کے سب "جڑواں" کا مفہوم رکھتے ہیں۔ جب جون میں آفتاب خط نصف النہار پر واپس لوٹا تو اس کا نام (Cancer) سرطان۔ کرک قرار پایا کیونکہ کیکڑا الٹا چلتا ہے۔ اس کے بعد جب گرمی اپنے شباب پر پہنچی تو اس قوت و حرارت کے لحاظ سے [illegible] اسد اور سنگھ سے موسوم کیا جس کے معنی شیر کے ہیں۔ جب اگست میں گیہوں کی بالیں نکلیں تو ان کی دوشیزگی کے لحاظ سے اس زمانہ کو (VIRGO) سنبلہ، کنیا سے موسوم کیا۔ جب رات دن برابر ہوتے ہیں تو اسی کا نام ([illegible])۔ میزان۔ تلا رکھا۔ اکتوبر میں تداخل فصلین کے وقت چونکہ بیماریاں پھیلتی ہیں اس لئے اسی کا نام SCORPION عقرب برچھک رکھا۔ اس کے بعد کا زمانہ چونکہ شکار کا ہوتا ہے اس لئے اس کا نام (Sagittarius) قوس۔ دھنک قرار پایا۔ جب ۲۱ دسمبر کے بعد آفتاب اونچا ہونے لگا تو اسے برج (Capricornus)۔ جدی یا مکر سے منسوب کر دیا جس کے معنی اونچے سینگ والے مینڈھے کے ہیں۔ اس کے بعد جنوری کی بارش کو سامنے رکھ کر (Aquarius)۔ دلو۔ کنبھ کہنے لگے جس کے معنی ڈول کے ہیں اور جب جنوری میں مچھلی کے شکار کا زمانہ آیا تو اسے (Pisces)۔ حوت۔ مین سے منسوب کر دیا جس کے معنی مچھلی کے ہیں۔ الغرض مصریوں نے برجوں کے نام موسمی اثرات و مشاغل کے لحاظ سے رکھے تھے جو بجنسہٖ لاطینی، عربی اور ہندی میں ترجمہ کر لئے گئے اور اہل نجوم میں اب تک یہی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ اب رہا آسمان میں مختلف ستاروں کے منظری جائے وقوع کے لحاظ سے ان برجوں کی تعیین کرنا، یہ زمانۂ بعد کی تاویلیں یا ذہانتیں ہیں جو مفروضات سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

---

(۵)

ہامان کون تھا

(جناب فضل عظیم صاحب۔ ناگپور)

قصص قرآنی کے اغلاط کے متعلق مستشرقین اور ارباب کلیسا نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ایک واقعہ وجود ہامان کا بھی ہے اور اگر ان کا بیان صحیح ہے تو اس سے یقیناً قرآن کا یہ بیان کہ ہامان و فرعون دونوں ایک ہی زمانہ میں پائے جاتے تھے یا یہ خیال کہ ہامان فرعون کا وزیر تھا (جیسا کہ تمام مفسرین ظاہر کرتے ہیں) غلط قرار پاتا ہے، کیونکہ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ دراصل ایک ایرانی بادشاہ کا وزیر تھا جو موسیٰ کے بہت زمانہ بعد پایا جاتا تھا۔ آپ کی رائے اس باب میں کیا ہے؟

(نگار) ہر چند میں قصص قرآنی کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا قائل نہیں ہوں، کیونکہ کلام مجید کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے اور اس میں جو روایات عہد عتیق کی بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق صرف اخلاقی اعتبار و بصیرت سے ہے، تاہم جن جن مقامات پر صراحتاً تعیین اسماء کی گئی ہے وہ ضرور تاریخی حدود میں آجاتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کو دیکھنا چاہیئے۔ جیسا کہ ہامان و فرعون کے ہمعصر

نے کا واقعہ ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ بعض مستشرقین جن میں سیل (مترجم قرآن) پادری وہیری اور مسٹر ایسنبرگ (مقالہ نگار انسائکلو پیڈیا آف اسلام) بھی شامل ہیں، یہی ظاہر کیا ہے کہ ہامان کا زمانہ موسیٰ کے بہت بعد کا ہے اور قرآن میں فرعون و ہامان کا ساتھ ساتھ ذکر ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ کا تاریخی علم بہت ناقص تھا نیز یہ کہ قرآن منزل من اللہ ہوتا تو اس قسم کی غلطیوں سے پاک ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ اعتراض بڑا سخت ہے لیکن ہاور کیجئے کہ یہ اتنا ہی غلط بھی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قرآن میں ہامان کا ذکر کہاں کہاں کس حیثیت سے آیا ہے۔ کلام مجید میں چھ جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔ تین جگہ سورۂ قصص میں، دو جگہ سورۂ مومن میں، اور سورۂ عنکبوت کی ایک آیت میں۔

(قصص) : و نری فرعون و ہامان وجنود ہما ماکانوا یحذرون۔

: ان فرعون و ہامان وجنود ہما کانو اخاطیئن۔

: فا وقد علیٰ یا ہامان علی الطین۔

(مومن) : ولقد ارسلنا موسیٰ ــــ الیٰ فرعون و ہامان وقارون۔

: وقال فرعون یاہامان ابن لی صرحاً۔

(عنکبوت) : وقارون وفرعون وہامان۔

ان تمام آیات میں فرعون و ہامان کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے (سورۂ مومن وعنکبوت کی دو آیتوں میں قارون بھی شامل کر دیا گیا ہے جو اس وقت زیر بحث نہیں) اور دو آیتوں میں تو صاف صاف فرعون کو ہامان سے خطاب کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ "اے ہامان میرے لئے ایک اونچی عمارت تعمیر کر ــــ" اس لئے اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حسب بیان قرآن "فرعون و ہامان" دونوں ایک ہی زمانہ میں پائے جاتے تھے بلکہ یہ بھی کہ ہامان، فرعون کا وزیر یا معتمد علیہ سردار بھی تھا۔

اب آپ مستشرقین کا بیان بھی سن لیجئے۔ وہ کہتے ہیں کہ " ہامان نام تھا ایک ایرانی بادشاہ اخسویرس کے وزیر کا جو پانچویں صدی سے قبل مسیح میں، موسیٰ کے بہت بعد پایا جاتا تھا اور فرعون کے عہد سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا" لیکن سوال یہ ہے کہ مستشرقین کے اس بیان کا ماخذ کیا ہے؟ اس کا ماخذ صرف بائبل ہے جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ "جب اخسویرس شاہ ایران کے وزیر ہامان نے یہودیوں کے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو اس کی بیوی آستر نے جو یہودی تھی بادشاہ کو اس کی طرف سے بدظن کر دیا اور بادشاہ نے اسے قتل کرا دیا"

اول تو بائبل کی کتاب استر کی اس روایت کو خود بعض مستشرقین نے جن میں مارٹن لوتھر بھی شامل ہے غلط قرار دیا ہے اور اس کی حیثیت ان کے نزدیک فسانوی روایت سے زیادہ نہیں، لیکن اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی بنیاد پر عہد فرعون کے ہامان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے یہی نام اخسویرس کے کسی وزیر کا ہو ــــ " ایک ہی نام کے دو آدمیوں کا پایا جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔

اب آیئے تاریخی حیثیت سے بھی اس مسئلہ پر غور کریں:۔

مصر قدیم کی تاریخ پر اس وقت تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عہد فراعنہ میں ہامان کا حقیقی شخصیت ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔

ان تاریخوں میں جن میں ہنری بریسٹیڈ کی تاریخ مصر اور سینوپس کی "تاریخ ملل قدیمہ" خاص اہمیت رکھتی ہیں

ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر قدیم میں جب بت پرستی عام تھی اور متعدد دیوتاؤں کے استھان وہاں قایم تھے تو ایک بڑے دیوتا کا نام آمون ، یا آمان بھی تھا اور از راہ عقیدت یہ لفظ مصری بچوں کے نام میں بھی شامل ہوتا تھا۔ اب اس کے ساتھ لفظ ہم کو دیکھیے جس کے معنی قدیم مصری زبان میں غلام کے تھے تو معلوم ہوگا کہ ہم اماں کے معنی غلام آمان ہونگے اور والیس بج مصنف The Dwellers on the Nile کی صراحت کے مطابق بتکدہ آمان کے کاہن کو جو تمام کاہنوں میں بہت اونچا مرتبہ رکھتا تھا ہم آمان کہتے تھے۔

رامیس دوم کے زمانہ میں جب حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تو اس وقت کے ہم آمان نے غیر معمولی اقتدار حاصل کر لیا یہاں تک کہ علاوہ کاہن اعظم ہونے کے وہ وزیر، افسر خزانہ ، سپہ سالار اور مذہبی عمارات کا مہتمم بھی تھا۔ اس کے بعد جب رامیس دوم کے بعد منفتاح تخت نشین ہوا تو اس وقت بھی کاہن اماں یا ہم آمان اتنا ہی مقتدر رہا اور بغیر اس کی اعانت یا مرضی کے کوئی اہم کام سرانجام نہ پاتا تھا۔ الغرض جس حد تک تاریخ کا تعلق ہے اس سے انکار ممکن نہیں کہ فرعون موسیٰ کے عہد میں بھی کاہن آمون یا ہم آمون کا وجود پایا جاتا تھا جو فرعون کا مشیر خاص تھا۔ اور اسی لیے جب موسیٰ نے خدائے واحد کی تعلیم فرعون کے سامنے پیش کی تو اس نے طنزاً ہامان سے کہا کہ "خدائے موسیٰ کے دیکھنے کے لیے ایک اونچی عمارت طیار کراؤ" اور اسی طرف اشارہ ہے کلام مجید کی اس آیت کا :-

"وقال فرعون یاہامان ابن لی صرحاً"

---

(۶)

شاعر لکھنوی

(سید سبط حیدر ـ کراچی)

نگار کے "نیاز نمبر" (حصہ دوم) میں صفحہ ۲۵۸ پر "نیاز کے تبصرے" کے تحت کئی جگہ بعض کتابوں کے سلسلے میں شاعر لکھنوی کا ذکر آیا ہے۔ مہربانی کرکے اس کی وضاحت فرما دیجئے کہ یہ شاعر لکھنوی کون ہیں۔ شکرگزار ہوں گا۔

(**نگار**) ان شاعر لکھنوی کا نام تھا سید اولاد حسین اور یہ بیٹے تھے سید ذاکر لکھنوی کے۔ عرصہ ہوا ان دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

اسٹیشن کراچی کا تبصرہ نیاز نمبر پر

ایک دور کی کہانی

لم:- ثریا جبیں ایم-اے

"نگار پاکستان" کے "نیاز نمبر" میں جو دور حاضر کے اردو ادب کی سب سے زیادہ رنگین و نزاعی ہستی کی
شت اور ان کے شاہکاروں پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، فرمان فتح پوری کے "ملاحظات" اور
لامہ نیاز کے مضمون میں معذرت کی جو ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے وہ خلاف توقع نہیں ہے۔ میری مراد یہ نہیں
ہ مولانا کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خاص نمبر نکالنے میں "نگار" حق بجانب نہ تھا، بلکہ اشد ضرورت
اس بات کی کہ اردو ادب کے اس باغی پٹرل (Petrel) اور روحانی انشاء پرداز کے ہر پہلو پر
نی ڈالی جائے۔ عجز و انکسار کے جذبات سے قطع نظر ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ "نگار" اس مہم کو
رنے اور دوسروں کی رہنمائی کرنے میں اخلاقی طور پر پابند تھا۔ خاص کر جبکہ مولانا کی پاکستان میں مستقل سکونت
کستانی صحافت و ادب کے لئے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے باوجود ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں
سکتے کہ "نیاز نمبر" پڑھنے والوں کے تمام مطالبات کو پورا نہیں کرتا۔ اس کے تنقیدی مضامین کی ترتیب
ب پڑھنے والوں کی تشنگی کو دور نہیں کرتی۔ خدا کرے نیاز نمبر کا دوسرا حصہ اس کمی کو پورا کر سکے۔
نگار کے تجربہ کار ایڈیٹر نے وقت کی کمی کا اشارہ اسی وقت کر دیا تھا۔ جب فرمان صاحب نے اس
وع کو پہلی دفعہ چھیڑا۔ لیکن فرمان صاحب بہت جلدی میں تھے۔ اور بے چین بھی، اس وقت مولانا
تبسم آمیز ریمارک کہ "کیا آپ کو واقعی میرے جلد مر جانے کا یقین ہو گیا ہے" بڑی معنی خیز بات
اور اب نیاز نمبر کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی بہت روا روی میں نکالا گیا اور اس کے
ہ تر مضامین نہ صرف مختصر اور سرسری ہیں بلکہ تدوین و ترتیب پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ تین سو
ت میں اکاون مضامین ٹھونس دیئے گئے ہیں یعنی اگر حساب لگایا جائے تو اوسطاً ہر مضمون چھ صفحات
کا۔ صرف دو تین مضامین جس میں خود مولانا کا بھی مضمون شامل ہے دس صفحات سے بڑھ جاتا
اور ۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ بمشکل سے ایک درجن مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ہیں۔ بہت سے لکھنے
ے صرف ایک، دو یا زیادہ سے زیادہ تین صفحات پر اکتفا کرتے ہیں۔ زیادہ اہل قلم مولانا سے نہ صرف
ہ اور لحاظ سے بھی کم ہیں اس لئے وہ زیادہ تر مولانا سے اپنی ملاقاتوں کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ اور
، خدمت میں صرف نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ بعض قلمکار جنہوں نے اپنے دعووں پر وثوق سے

قائم رہتے ہوئے گستاخی اور جسارت کی حدوں کو چھو لیا ہے وہ بھی ان اثرات کا تجزیہ نہیں کر سکے جو مولانا نے اردو پڑھنے والوں کی تقریباً تین نسلوں کے دل و دماغ پر چھوڑا ہے۔

وہ نصف صدی جو مولانا کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھی نہ صرف برصغیر ہی بلکہ پورے عالم کی تاریخ میں ایک دور انقلاب تھا۔ اس متغیر زمانے میں ایک وسیع پیمانے پر سیاسی سماجی اور مذہبی انقلاب لانے کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ اگر ہم جغرافیائی حالت کو بھی مدنظر رکھیں تو والٹیر کا فرانس بھی اس انقلابی مہم میں ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ اس زمانے کی تاریخ میں مولانا کا رول کسی بھی صورت میں والٹیر سے کم نہ تھا۔ سیاسی ہستیوں کو چھوڑ کر ہمیں کوئی بھی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جس نے نظریات کی ماہیت پر اتنا اہم یقینی اور راسخ اثر چھوڑا ہو جتنا کہ مولانا کے عقائد و خیالات نے۔

چنانچہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس تاریخی بیک گراؤنڈ کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا کے شاہکاروں کی عظمت کا تعین کیا جاتا۔ جس میں "نیاز نمبر" ناکام رہا۔ نیاز نمبر کے زیادہ تر مضامین داستان کی صورت رکھتے ہیں اور اگر بعض مضامین میں خاص خاص پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سنجیدہ کوشش بھی کی گئی ہے تو وہ بہت غیر واضح اور مبہم ہے۔ عورت کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر جو ان کے مضامین و خطوط سے ظاہر ہوتا ہے اہل قلم نے اسے اپناتے ہوئے حد سے زیادہ پیٹا ہے اور ان کے شہ پاروں کے خاص خاص پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے مگر صد افسوس کہ پھر بھی موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر پائے۔

عورت کے بارے میں نیاز کے ذاتی جذبات ایک تنومند اور تندرست مرد کے جذبات ہیں جو ایک مہذب معاشرے کا فرد ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نیاز ان حیات بخش جذبات کا اظہار اپنی پر اثر طرز نگارش سے کر دیتے ہیں۔

مولانا کی کہانیوں میں عورت سماج کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ اس زمانے کے حالات پر نظر غائر ڈالنے سے ہو سکتا ہے جس میں مولانا یہ کہانیاں لکھ رہے تھے۔ کلاسیکی کرداروں ساقی اور زہرہ اور ان بدنصیب عورتوں کا ذکر چھوڑ کر جو مکار و دغا باز مولویوں کے ظلم و ستم کا شکار نہیں نیاز کی کہانیوں کی عورت مثلاً اختر اور سکینہ "شہاب کی سرگزشت" میں، افضال اور حمیدہ "شاعر کا انجام" میں، سلیم اور صفیہ "نکاح مکرر" میں اس متغیر سوسائٹی کے مختلف سماجی طبقوں کے روپ کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

نیاز کی کہانیوں کی عورت ابھرتی ہوئی نہ صرف جدید سوسائٹی کے مسائل کو پیش کرتی ہے بلکہ اس جدید عورت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو زوال پذیر تہذیب سے برسر پیکار تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کا مقام مولانا کی معرکۃ الآرا تصانیف میں اتنا عظیم نہیں ہے جتنا کہ ان کی شخصی زندگی میں کہ عورت ہی نے تخلیق و ادب کے اس سرچشمے کو جنم دیا ہے۔

عورت ہو یا عشق یا مذہبی عقائد۔ مولانا نے ان تمام موضوعات پر خاص نظریے پیش کئے تحقیق و تفتیش کی ترغیب دلائی تعصب کے دبیز پردوں کو چاک کیا اور اپنے ہم عصروں کے ذہنوں کو جدید افکار و خیالات

سے روشناس کیا۔ لیکن "نگار" کا "نیاز نمبر" مولانا کے اس اہم رول کا ذکر ہی نہیں کرتا۔

بدقسمتی سے مولانا کا مضمون بھی ان کے ابتدائی ایام زندگی کے متعلق اس درجہ سرسری ہے کہ ہمیں ان کی جوانی کے وہ رنگین تجربات جو انھوں نے ریاست بھوپال، رامپور اور راجپوتانہ میں حاصل کئے تھے ان کا حوالہ بھی نہیں ملتا اور نہ چودھرائن کے گھرانے کا ذکر جس کا تذکرہ ان کی سرگذشت میں بار بار ملتا ہے۔

اگر مولانا کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی زندگی کے حالات تفصیل سے لکھیں تو ان کے بہت سے ہم عصر اب بھی موجود ہیں جن کے ایما پر اور خود مولانا کے خطوط و کہانیوں سے اس بتدریج تغیر مذہبی سوسائٹی کے خاص خاص واقعات کو یکجا کر سکتے ہیں جو برصغیر ہند و پاکستان کے بدلتے ہوئے معاشرے کے نمایاں نشان ہیں۔

اس دقیق مہم کو سر کرنے کا بیڑا "نیاز نمبر" کے ایڈیٹروں نے اٹھایا ہے لیکن افسوس کہ ان کا یہ کام اور ہمارا چیلنج ہنوز باقی ہے۔

**

نگار پاکستان کے خاص نمبر

اقبال نمبر

(سالنامہ ۱۹۶۲ء) جیسے پاکستان کے معجز بیان شاعر اقبال کے نامِ نامی پر موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار، شاعری کی ابتدا اور مختلف ادوار شاعری، اقبال کا تصوف، فلسفہ و پیام، تعلیم و اخلاق اس کا آہنگِ تغزل اور اس کی حیات معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت :۔ تین روپے

نظیر نمبر

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی و اردو کلام میں عارفانہ رنگ، اس کی قدرت بیان و زبان اس کا معیار، تغزل ادبیات اردو میں اس کا فنی و لسانی درجہ اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام، صناع و طباع شعرا کا فرق، معلومین کی رائیں، مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔

قیمت :۔ تین روپے

مصحفی نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ جس میں اردو ادب کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء ان کی تالیف و تصانیف، ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری، ان کے معاصر شعراء و ادبا اور ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

قیمت :۔ تین روپے

ہندی شاعری نمبر

جس میں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ قیمت :۔ ۴ روپے

نیاز نمبر

جس میں تقریباً پاک و ہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابرِ ادب نے حصہ لیا ہے۔ اس میں حضرت نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید، اسلوب نگارش، انشا پردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات، صحافتی زندگی، شاعری، ازدواجی زندگی ان کے افکار و عقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کی علمی و ادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایک ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صفحات ۴۶۴ — قیمت آٹھ روپے

سنگم

فضا ابنِ فیضی

اس کا شاداب و نازنیں پیکر　　گل کا ہدیہ، شراب کی سوغات
کتنی رنگین، کس قدر دل کش　　اس کی ہر چشم غزل فروز کی بات

اس کی پلکوں کے شبنمیں سائے　　نوجواں خواب کے جزیرے ہیں
لب ہیں اس کی تجلیٔ رُخ کے　　ترشے ترشائے کتنے ہیرے ہیں

اس کی آنکھوں میں کاجلوں کی لکیر　　جیسے ہو جائے میکدے میں رات
وہ تلاطم نظر میں مستی کا　　سانس لیں جیسے ساز میں نغمات

کتنے اسرارِ کائنات ابھی　　اس کے بندِ قبا کے بس میں ہیں
دل سے اب دور وہ نگاہ کہاں　　فاصلے اس کی دسترس میں ہیں

اس کے آغوش کی وہ نرم گرفت　　بند ہوں جیسے پنکھڑی کی تہیں
چلبلا پن وہ اس کی رعنائی　　ننھے بچے جیسے میکدوں میں رہیں

مرتعش سی وہ گیسوؤں کی شکن　　دل میں جذبات لہر لیں جیسے
رخ پہ ناگن لٹیں ہیں یوں جو ریں،　　ہاتھ میں جامِ زہر لیں جیسے

دیکھ کر آئینے کو اس کی نظر　　کیف و مستی میں کھو گئی ہو گی
سطحِ شفاف آئینے کی، مگر　　شفق آلود ہو گئی ہو گی

اس کی گُم سُم جوان خلوت میں،　　فاصلے وقت کے سمٹتے ہیں
انگلیوں سے وہاں تصور کی　　زندگی کے ورق الٹتے ہیں

اس کی انگڑائیوں کے پہلو میں — حادثوں کا شباب ملتا ہے
اس کی رفتار کے اشارے پر — وقت کا انقلاب چلتا ہے

روئے گلگوں کو اس کے کر کے گواہ — میں نے کانٹوں سے رس نچوڑا ہے
کہہ کے شبنم پکارا بجلی کو — آگ کو برف کر کے چھوڑا ہے

اس کی وہ سبزگی کی خوشبو سے — وقت کا پیرہن مہکتا ہے
اس کی ہر انفرادیت کا رنگ — میرے افکار میں جھلکتا ہے

ہر مفصل نگاہ میں اس کی — ہیں کنایات و رمز کے انداز
اس کے پیکر کے ارتعاش میں ہے — نشے کا لوچ، پھول کی پرواز

اس کی آنکھوں میں آگہی کا خمار — استعارے غزل میں ہوں جیسے
اس کی چتون میں دلبری کا وقار — رنگ بہتے کنول میں ہوں جیسے

خال و خد کی وہ دلکشی وہ پھبن — جیسے شوخ و لطیف تشبیہیں
بر محل وہ جچی تلی سی ادائیں — شعر میں جیسے چست ترکیبیں

اس کے ہونٹوں کی چاشنی کے سبب — کتنی شیریں ہے داستانِ غزل
اس کی سرشار انکھڑیوں کے طفیل — ہوش میں ہیں نظر درانِ غزل

اس نے تخیل کے دریچوں سے — بارہا مجھ کو دی ہے یوں آواز
جیسے نغمے کی ایک جنبش سے — گنگنا اٹھے روح و دل کا ساز

میرے جذبات کے خروش میں ہے — جوشِ آہنگِ دلبری اُس کا
میرے روئے سخن کا غازہ ہے — جلوۂ رنگِ دلبری اس کا

اس کی پرکار اداؤں سے مل کر — میرے فن کا شعور جاگ اٹھا
میرے سوئے ہوئے حواس میں پھر — اک انوکھا سرور جاگ اٹھا

وہ بہ ایں عشوہ ہائے کم سخنی　　　سر بسر اعتبارِ نغمہ ہے
سر سے پا تک وہ بولتا جادو　　　جیسے پرورد گارِ نغمہ ہے

وہ جو چاہے تو میرا اک اک شعر　　　مسکرا کر گلاب ہو جائے
میرے رنگِ سخن کی کم عمری　　　فکر و فن کا شباب ہو جائے

اس کے سانسوں کے نرم جھونکوں سے　　　میری نظموں کے پھول کھلتے ہیں،
اس کی آنکھوں میں راہ بھولے ہوئے　　　کاروانِ خیال ملتے ہیں

زلفِ آراستہ نے اس کی مجھے　　　اک غزل کی طرح سنوارا ہے
اس کی رعنائیوں نے مل جل کر　　　میرے اسلوب کو نکھارا ہے

جذب ہے میرے دل کی دھڑکن میں　　　اس کے لہجے کی نرم شہنائی
اس نے جب بھی سنے مرے اشعار　　　خود غزل کو غزل کی یاد آئی

میری صہبائے فکر میں اس نے　　　اپنے ہونٹوں کا شہد گھولا ہے
میرے فن کے سجیلے خوابوں کو　　　اپنی پلکوں پہ اس نے تولا ہے

اس نے معیارِ شعر و مستی پر　　　میرے حسنِ زباں کو پرکھا ہے
دلبرانہ سلیقہ مندی سے　　　میرے طرزِ بیاں کو پرکھا ہے

اپنی بانہوں میں لیکے اس نے مجھے　　　دعوتِ کیف و آگہی دی ہے
میرے لب تشنہ فکر پاروں کو　　　اپنے بوسوں کی تازگی دی ہے

سادہ سادہ مری طبیعت کو　　　اس نے ذوقِ جمال بخشا ہے
بے بضاعت سی، میری ہستی کو　　　شاعرانہ کمال بخشا ہے

ہنس پڑے وہ تو رنگ بن کے حیات　　　میرے احساس پر بکھر جائے
اور اگر پھیرے نظر اپنی　　　زندگی کا نشہ اتر جائے

اک تغزل ، از فرق تا بہ قدم میرے جذبوں کی کہکشاں ہے وہ
وہ نہ ہو تو یہ گیت سو جائیں میرے احساس کی زباں ہے وہ

میرا عالم بھی اس کا عالم ہے
وہ مرے فکر و فن کا سنگم ہے

اقبال شاہد

اب تو سر ٹکراؤ ، اب تو جیب و دامن چاک ہو موسمِ گل بھی ہے اور زنداں کی دیواریں بھی نہیں

صبح زنداں ہی سوگوار نہیں اب گلستاں میں بھی بہار نہیں

تمہیں اے قافلے والو خبر کیا کوئی اس راہ سے تنہا گیا ہے

کاش صحراؤں کے دیوانے کبھی شہرِ دل میں بھی کسی کو ڈھونڈتے

کچھ عجب حال ترے بعد ہوا ہے دل کا چاند نکلے تو در و بام سے ڈر جاتا ہوں !

تیری محفل میں تو ہم پہلے بھی تنہا تھے مگر ہائے وہ عالم کہ جب محفل سے اٹھ کر تو چلا

ضیاء شبنمی

قریب آ گئے کیا موسمِ بہار کے دن پکارنے لگیں زنداں سے مجھ کو زنجیریں

کی شامِ غم جو آہ ، بجھی شمعِ زندگی اُٹھا تھا کچھ دھواں بھی شراروں کے ساتھ ساتھ

مجھ میں جراتِ گریہ ہے اب نہ تابِ سخن حضورِ دوست ہیں ناگفتنی سب افسانے

وہ بدل سکتا ہے طوفانوں کا رخ جس کو غم میں مسکرانا آ گیا ہے

سعادت نظیر

ابھی تو رات بڑی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ! — سحر تو دور پڑی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ!
تمہاری یاد دمِ نزع تھی، تم آ پہنچے — تمہاری عمر بڑی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ!
وہ ہم نہیں کہ یہ سن کر گھروں میں بیٹھ رہیں — "نہ نکلو، دھوپ کڑی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ!"

گویا نشاط و لطف کا گلزار کھل گیا — مہکی جو یادِ یار کی خوشبو کبھی کبھی
باوصف یکدلی بھی مرے ان کے درمیاں — نکلتے ہیں اختلاف کے پہلو کبھی کبھی
کھو بیٹھتے ہو تم بھی تو قابو کبھی کبھی — یوں بولتا ہے حسن کا جادو کبھی کبھی
ہم دونوں ایک جان دو قالب اگرچہ ہیں — چھڑتی ہے پھر بھی بحث "من و تو" کبھی کبھی
نکھرے تو رخ کبھی کبھی صبحِ بہار ہے — بکھرے تو شام ہے ترے گیسو کبھی کبھی
کچھ اس طرح ہے اس دلِ وحشت زدہ کا حال — جیسے رمیدہ ہو کوئی آہو کبھی کبھی
بزمِ حیات اور بھی رنگین ہو گئی — جاگا جو اس کی آنکھ کا جادو کبھی کبھی
موجیں زبانِ حال سے کہتی ہیں کیا، سنا؟ — آنا کسی بہانے لبِ جو کبھی کبھی!
دل میرا عندلیب سے کیوں بدگماں نہ ہو؟ — آتی ہے گل سے مجھ کو تری بو کبھی کبھی
باوصفِ ضبط دردِ شبِ ہجر کیا کروں؟ — بے اختیار ٹپکے ہیں آنسو کبھی کبھی

پھر اور کچھ گلہ ہی نہ ہوتا نظیر کو
مل لیتا اس سے یوں ہی اگر تو کبھی کبھی

فضا جالندھری

کوئی ہمت نہیں کرتا ہے اظہارِ تمنا کی — صدائے بازگشت اب تک جواب لن ترانی ہے

دیکھ لو پیار کی نگاہوں سے — یہ نہ پوچھو کہ مدعا کیا ہے

تنگ آ کر گردشِ ایام سے — دل کو بہلاتا ہوں تیرے نام سے

شان تیری بے نیازی ہی سہی — کیا کرے وہ جس کا دل مجبور ہے

سید حرمت الاکرام

رات کی شمع ساں بسر تنہا　　　دل جلایا ہے تا سحر تنہا
آفتِ جاں ہے وضعِ ہمسفری　　　وقت کی راہ سے گذر تنہا
کیسی ہمسائیگیٔ لالہ و گل　　　ہے چمن کا شجر شجر تنہا
قتل گاہ وفا ملی خالی　　　حرمت آئے ہمیں نظر تنہا

سید شفقت کاظمی

راہ ان کی دیکھنا دشوار نہ وار　　　یاد ہے اب تک وہ شامِ انتظار
دوستوں کی یاد تازہ ہو گئی　　　شکریہ اے موجۂ بادِ بہار
اُس دیارِ جاں فزا سے ایک بار　　　ہم بھی گذرے تھے مگر بیگانہ وار
قرب تیرا اپنی قسمت میں نہ تھا　　　گو ترے ملنے کی راہیں تھیں ہزار
مٹنے والے کاروانوں کا نشاں　　　آج بھی دیتا ہے راہوں کا غبار
باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا مگر　　　باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار
کیا خبر بھولے سے آ نکلے کوئی　　　اور تھوڑی دیر کر لیں انتظار
حادثوں سے دل کا یہ عالم ہے اب　　　کاظمی جیسے کوئی اجڑا دیار

طالب جے پوری

محبت میں کچھ ایسے لمحے بھی آئے　　　سنبھالا جو دل تو قدم ڈگمگائے
تمہارے لئے خود کو جو بھول جائے　　　تمہیں وہ بھلائے تو کیونکر بھلائے
نظر سے وہ چھپ کر رہے میرے دل میں　　　بہت دور جا کر، بہت پاس آئے
نہ آنکھوں میں آنسو، نہ لب پر تبسم　　　محبت میں ایسے بھی لمحات آئے
کسی کی کرم گستری اللہ اللہ　　　زمانے سے بیٹھا ہوں میں ہاتھ اٹھائے

جب دردِ محبت کا دل کو احساس ذرا کم ہوتا ہے　　　اُس وقت مری بے تابی کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے
ہر شئے مترنم ہوتی ہے ہر شئے متبسم ہوتی ہے　　　جب یاد تری آ جاتی ہے کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے
یہ لالہ و گل، یہ شمس و قمر نظروں سے مری گر جاتے ہیں　　　جب میرے دیدہ و دل میں تمہارا حسنِ مجسم ہوتا ہے
جب یاد کسی کی آ آ کر تسکینِ جنوں فرماتی ہے　　　شیرازۂ ہوش و خرد طالب کیوں درہم برہم ہوتا ہے

مظہر کوٹی

شادمانی کا کوئی پہلو تو پہلے بھی نہ تھا — اب تو پہلا سے دلِ ناشاد بھی جاتا رہا

بناتے تھے چمن میں بجلیاں تنکے نشیمن کے — کریں گی اب انہیں کی پتیاں برق و شرر پیدا

رہ گئے ہاتھ گریباں میں الجھ کر ورنہ — جانے یہ جوشِ جنوں اور ابھی کیا کرتا

کوئی دیکھے میرے جذبِ ذوقِ طاعت کا کمال — بن گیا کعبہ اسی جانب جدھر سر خم ہوا

آیا جو بزمِ ناز میں اہلِ وفا کا ذکر — ہر ایک کی زباں پہ مرا نام آگیا

میں نے چاہا تھا کہ رکھدوں بابِ کعبہ پر جبیں — سامنے نظروں کے اُن کا آستانہ آگیا

نگاہِ شوق میں ہے حسنِ یار کی دنیا — بڑی حسین ہے مرے انتظار کی دنیا

بجا سہی غمِ الفت سہا نہیں جاتا — مگر بغیر محبت جیا نہیں جاتا

نہیں کہ وہ مری رودادِ غم نہیں سنتے — مجھی سے اپنا فسانہ کہا نہیں جاتا

فصلِ گل میں نہ ہوا چارۂ جوشِ وحشت — میں نے دامن کو سنبھالا تو گریباں نکلا

کس غضب کی کیف آور تھی نگاہِ عشق بھی — حسن کی معصوم آنکھوں میں خمار آہی گیا

ہیں تو وہ وعدہ شکن لیکن اسے ہم کیا کریں — دیکھ کر نیچی نگاہیں اعتبار آہی گیا

سعادت نظیر

جادۂ شوق میں اک نقشِ کفِ پا بھی نہیں — کیا مری طرح اِدھر سے کوئی گزرا بھی نہیں

حسن کی جلوہ گری عام ہو، ایسا بھی نہیں — غیرتِ عشق کو یہ بات گوارا بھی نہیں

شدتِ غم میں تری یاد بھی ہے دل سے الگ — ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی نہیں

اشک و خوں کے عوض آنکھوں میں ہے شعلوں کا سماں — یوں ترا غم زدہ روتا بھی ہے، روتا بھی نہیں

داد کیا دوگے مرے ضبطِ الم کی ؟ سچ ہے — کوئی دن میری طرح تم نے گزارا بھی نہیں

عالمِ درد کسے کہتے ہیں ؛ تم کیا جانو؟ — تم نے محسوس کیا ہو کبھی، ایسا بھی نہیں

یاس و حرماں کی وہ ظلمت ہے شبِ ہجر کہ بس — جھلملاتا کوئی امید کا تارا بھی نہیں

حادثہ ہی مری الفت کا کچھ ایسا ہے، نظیرؔ!
جس کو دنیا نے سنا بھی نہیں، دیکھا بھی نہیں

نقشِ فریاد

(ساقی جاوید۔ ایم۔اے۔بی ایڈ)

بول اے جلتے ہوئے سورج کے سازِ آتشیں — بول اے بوڑھے سمندر بول اے گونگی زمیں

بول اے اٹھتے تلاطم بول اے اڑتے غبار — بول اے روحِ عناصر اے ضمیرِ روزگار

بول اے فانوسِ ہیکل بول اے شمعِ حرم — بول اے مذہب کہ تجھ کو تیرے یزداں کی قسم

رات کا رقصِ طرب کس کے صنم خانے کا ہے — آنسوؤں کا یہ ہلاہل کس کے پیمانے کا ہے

کون ہے تنویرِ معبد کون ہے نورِ حرم — یہ دہکتا ہے جبینِ زیست پر کس کا قلم

کون ہے جو ہر صدائے دل کو ٹھکراتا ہوا — جا رہا ہے روز و شب کے ساز پر گاتا ہوا

کیا اسے معلوم ہے اس کے کلیساؤں کا نور — ایک مریمؑ کی خطا ہے ایک عیسٰیؑ کا قصور

کیا اُسے معلوم ہے اس کی یہ محرابِ حرم — کتنی آہوں سے ہے لرزاں کتنے اشکوں سے ہے نم

بھیج دیں کچھ آیتیں کچھ کر دیئے پیدا رسول — کیا خبر اس کو کہ پھر مرجھا گئے جنت کے پھول

اس کا زر محلوں میں اس کا نور ایوانوں میں ہے — اور وہ خوابیدہ جانے کن شبستانوں میں ہے

دے دیا حکمِ اطاعت رکھ دیا بارِ یقیں — اس سے کہہ دو یہ خدائی اس قدر آساں نہیں

سرخ ہے دیوارِ چیں خوں رنگ ہے رودِ کبیر — کاتبِ تقدیر بن کر کھینچ دی خونیں لکیر!

کون توڑے گا فصیلیں کون ڈھائے گا محل — سونے والے! پردۂ تنویر سے باہر نکل

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

دار و رسن

فضا ابنِ فیضی

بھر دیا زہر سے ماحول کے نوشینے کو — کس نے توڑا مرے اخلاص کے آئینے کو
نشتروں پر مرے زخموں کو یہ تولا کس نے — گرہِ غنچہ کو کانٹوں سے یہ کھولا کس نے
کس نے پہنائی نسیمِ سحری کو زنجیر — کرلیا کس نے یہ کرنوں کو غباروں میں اسیر
کس نے راہوں میں گل و لالہ کے کانٹے بوئے — کس نے سینے میں بہاروں کے شرارے بوئے
کس نے یہ پھول کی خوشبو کو تہِ دام کیا — کس نے کلیوں کے تبسّم کو غم انجام کیا
بو دیا زہر مری کشتِ سکوں میں کس نے — بجلیاں بھر دی، گریبانِ جنوں میں کس نے
مجھ کو نغمے کے عوض نالۂ شب گیر دیا — کس نے ہنستے ہوئے لالے کا جگر چیر دیا
دیے تریاق کو زہراب میں غوطے کس نے — بھر دیے تازہ گلابوں میں یہ شعلے کس نے
کس نے پگھلے ہوئے شعلوں میں مجھے غسل دیا — کس نے مجھ کو غمِ دوراں کا سزاوار کیا
میرے ناسوروں کو ناخن سے کریدا ہے ابھی — کس نے کانٹوں پہ لٹا کر مجھے کھینچا ہے ابھی
کون اٹھا اوڑھ کے یہ میرے لہو کی چادر — کس نے سینے میں مرے گھونپ دیا ہے خنجر
شب کی چوکھٹ پہ جھکا دی مری صبحوں کی جبیں — کس نے سورج کی شعاعوں پہ کمندیں پھینکیں
خون سے بھر دیے کس نے مرے ہاتھوں کے ایاغ — کن ہواؤں نے بجھائے مری منزل کے چراغ

چھین لی یہ مرے خوابوں کی لطافت کس نے | آگ میں جھونک دی لیکر مری جنت کس نے
پی گیا کون لہو کو مرے صہبا کہہ کر | کس نے لوٹا مجھے "منزل کی تمنا" کہہ کر
کس نے مجروح کیا آہوئے تاتاری کو | کس نے پامال بنایا مری خودداری کو
گریۂ درد کو ہنسنے کا بہانہ سمجھا | کس نے احساس کی چیخوں کو ترانہ سمجھا
کس نے رسوا کیا پاکیزہ تخیل کو مرے | توڑ کر رکھ دیا جذبوں کے تسلسل کو مرے
میرے جذبات کے نیلم کو خزف کس نے کہا | میرے ترشے ہوئے گوہر کو صدف کس نے کہا
کرلیا کس نے یہ بلبل کی فغاں کو بس میں | کون یہ بھول گیا حسن و وفا کی رسمیں
کون لایا ہے سرِ قتل گہ شوق مجھے | کس نے پہنا دیئے تہمت کے حسیں طوق مجھے
میری ناکردہ گناہی پہ تراشے الزام | اف یہ کس نے کیا تقدیس وفا کو بدنام
کس نے آہوئے حرم کو یہ گرفتار کیا | اپنے منصور کو کس نے یہ سرِ دار کیا
جو خود امرت ہے اسے جرعۂ خوناب دیا | کس نے سقراط کو پھر ساغرِ زہراب دیا
کس نے حل کر دی یہ پیمانۂ زمزم میں شراب | کون ظالم بدہمن کر گیا کعبے کو خراب
کس نے عیسیٰ کو سرِ راہ یہ مصلوب کیا | کس نے اس جرم کو جبریل سے منسوب کیا
کس نے معصوم فرشتے کو گنہ گار کہا | کس نے فطرت کے تقدس کو خطاوار کہا
ابھی رہنا تھا یونہیں فطرتِ سیمابی کو | کرلیا قید یہ کس نے مری بیتابی کو
چھین لی طائرِ سدرہ کی فغاں کی تاثیر | کس نے بازار میں کی زخموں کی میرے تشہیر
ہیں مرے زخم اک احسان ابھی مرہم پر | ہنس پڑا کون مری دیدہ وری کے غم پر
یہی تقدیرِ وفا ہے تو گوارا ہیں ستم | یہ حوادث نہیں میرے لئے مہمیز سے کم
میرا خوددارِ جنوں صید نہیں ہو سکتا | جام و ساغر میں نشہ قید نہیں ہو سکتا

جانتا ہوں ابھی طوفاں سے گزرنا ہے مجھے
ڈوب کر اپنے ہی اشکوں میں ابھرنا ہے مجھے

مطبوعات موصولہ

تاریخ جمالیات حصہ اول حصہ دوم از نصیر احمد ناصر ایم۔ اے

اصطلاح جمالیات کا استعمال حال کی بات ہے۔ اوّل اوّل اصطلاحی معنوں میں اسے بام گارٹن نے استعمال کیا اور بعد ں والٹر پیٹر کی خصوصی توجہ سے فنونِ لطیفہ کے تخلیقی اور تنقیدی شعبوں میں اس کا رواج عام ہو گیا۔

اردو میں جمالیات پر چند منتشر مقالات، مجنوں کی تاریخ جمالیات، اور ریاض الحسن کی "فلسفۂ جمال" کے سوا درنظر نہیں آتا۔ دونوں کتابیں نقشِ اوّلیں کی حیثیت سے اگرچہ اہم خیال کئے جانے کے لائق ہیں لیکن اُن کی حیثیت دع کے مختصر تعارف سے زیادہ نہیں ہے۔ نصیر احمد ناصر کی "تاریخ جمالیات" البتہ اردو میں اس موضوع پر پہلی مبسوط ب ہے جو محققانہ کاوشوں اور مورخانہ تبصروں کے ساتھ قلمبند کی گئی ہے۔

کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی میں بڑی تقطیع کے ۵۲۰ صفحات اور دوسرے میں ۶۳۰ صفحات ہیں۔ طرح پوری کتاب تقریبًا ۱۲۰۰ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں مصنف نے قبل مسیح سے لے کر بیسویں صدی عیسوی ے سارے مفکرین کے حالات و خیالات کا جائزہ لیا ہے اور جمالیات کے سارے مباحث کو کچھ اس طرح سمیٹ دیا ہے ں کی محنت، وسعت مطالعہ، مورخانہ بصیرت اور تحقیقی دیدہ ریزی کی داد بہرحال دینی پڑتی ہے۔ سقراط سے لے کر اقبال ک جن علما نے حُسن اور متعلقات حسن پر اظہار خیال کیا ہے، اُن سب کے افکار و نظریات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے اور کافی ل کے ساتھ موضوع سے متعلق وافر مواد اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحات کے ترجمے، ماخذات ہرست، اور مصطلحات و اسماالرجال کا اشاریہ دے کر مصنف نے کتاب کو ہر طرح مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجلس اردو نے کتاب کو خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اور دونوں جلدیں نہ صرف موضوع و مواد کے لحاظ سے بلکہ پرنٹنگ طباعت کے اعتبار سے بھی معیاری ہیں۔

مصنف نے موضوع پر فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے البتہ سیر حاصل بحث نہیں کی دیباچہ اور مقدمہ کے ۲۵ صفحات میں ں نے جمالیات اور اس کے موضوع کو سلجھانے کے لئے جو اظہار خیال ہے وہ بہت مختصر اور مبہم ہے اور ان کے مطالعہ سے نوع کے متعلق کوئی واضح تصور یا رائے قائم کرنے میں مدد نہیں ملتی مصنف نے جمالیات کی بحث میں حسُن، نیکی، سچائی، نت، عرفان، وجدان، الہام الہویت، روحانیت اور عشق و محبت کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ یہ کتاب تاریخ اور فلسفۂ جمال سے زیادہ تاریخِ فلسفہ یا فلسفہ حیات بن گئی ہے۔ مثلاً وہ ص ۲۵ پر لکھتے ہیں کہ "حسُن

چونکہ فطرت کا جوہر ہے لہٰذا یہ ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے اس اعتبار سے یہی ایک قائم بالذات ہے اور باقی سب عرض ہی ہے"۔ یہاں پر حسن کا فلسفہ، حقیقت، سچائی، الہوہیت یا تصوف کی اصطلاح میں مسئلہ وحدت الوجود کے مترادف قرار پاتا ہے۔ مقدمہ میں ان کے اکثر پیراگراف اور استدلال کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے" میرا ایمان ہے کہ ..... ص۱۸ " میرا ایقان ہے کہ .... ص۱۸ اس قسم کے فقروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جمالیات کے باب میں اکثر اپنے ہی عقائد میں گھر کر رہ گئے ہیں اور جمالیات کے موضوع پر انھوں نے حکیمانہ نگاہ ڈالنے کے بجائے تاثراتی نظر ڈالی ہے۔

زبان و بیان کی پیچیدگی بھی اکثر جگہ کھٹکتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ موضوع کو ذہن میں پوری طرح اتار نہ سکے اور اسی لئے بعض جگہ ان کی عبارت انگریزی سے اخذ و ترجمہ کی کوشش میں ژولیدہ و مبہم ہو گئی ہے۔ مثلاً وہ ص۱۳ پر لکھتے ہیں کہ " .... یونانی زبان کا لفظ ہے جس سے وہ شے مراد ہے جو علم کے سرچشمہ کے طور پر حسیاتی ادراک سے تعلق رکھتی ہے" اس تعریف سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی۔ جمالیات "کو" شے" سے تعبیر کرنا مناسب نہیں اس لئے کہ جسے جمالیات کہتے ہیں اس سے مراد کوئی شے نہیں بلکہ وہ ادراکات و ارتسامات ذہنی ہیں جو کسی خارجی محرک کے باہمی ربط سے حسن کا احساس بیدار کرتے ہیں۔ کاش یہ کتاب جو بیان حسن سے تعلق رکھتی ہے حسنِ بیان سے بھی آراستہ ہوتی۔

پہلی جلد پندرہ روپیہ میں اور دوسری سولہ روپیہ میں مجلس ترقی ادب لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مجاہد اندلس (ناول) از۔ محمد زکریا مائل

اندلس کا نام آتے ہی تاریخ اسلامی کا ایک درخشاں باب ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ اس درخشانی کا تعلق اگر صرف امارت و جہانبانی کے حسنِ نظام سے ہوتا تو شاید تاریخ کے طالب علم کے سوا، کسی دوسرے کی دلچسپی کا سوال نہ پیدا ہوتا لیکن چونکہ اس کا تعلق امورِ سلطنت سے کہیں زیادہ تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کے لازوال نقوش و آثار سے ہے اس لئے ہماری نگاہ بہر حال اس پر ٹھہر جاتی ہے۔ پھر یہ نگاہ کبھی"مسدس حالی" کی صورت اختیار کرتی ہے کبھی اقبال کی "مسجد قرطبہ" کی۔ اور کبھی "مجاہد اندلس" جیسے ناول کی۔

ناول کا اصل مصنف علی الجارم مصری ہے۔ اسے محمد زکریا مائل نے آزاد ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل کیا ہے۔ "ناول" فن لطیف کی حیثیت سے مقامی آب و رنگ کے ساتھ مخصوص ادبی اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے کسی ناول کو اس کے مکالمات اور ڈرامائی عناصر سمیت کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ لیکن محمد زکریا مائل اس کٹھن منزل سے نہ صرف آسانی سے گذر گئے ہیں بلکہ زبان و بیان کی شگفتگی اور اردو اشعار کے برمحل و برجستہ استعمال کے ذریعے اس عربی ناول کی فضا کو پاک و ہند کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

کتاب مکتبہ اُسلوب کراچی سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

اخلاق عالمگیر از۔ عزیز ملک سلیمانی

صفحات ۳۸۴۔ قیمت :۔ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ عزیز ملک سلیمانی۔ گلزار مسجد کچہری روڈ۔ کراچی

اورنگ زیب عالمگیر اپنے مبلغ علم اور مخصوص نظریہ مملکت کی وجہ سے شاہان مغلیہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

کا پچاس سالہ دورِ حکومت صرف اس کی سطوت و جبروت نہیں بلکہ اس کی سخت کوشی، مستقل مزاجی اور الوالعزمی کا مظہر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یورپ کے اکثر مورخین نے محمود غزنوی کی طرح عالمگیر کے واقعات بھی کچھ اس طرح مسخ کرکے پیش کئے ہیں کہ وہ ایک مذہبی مجنوں نظر آنے لگا۔ مولانا شبلی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک تحقیقی کتابچہ تالیف کرکے اس پر عیسائیوں کے عائد کردہ بہت سے الزامات بے بنیاد ثابت کئے۔ مولانا عزیز ملک سلیمانی نے مولانا شبلی کے کام کو آگے بڑھایا ہے قدیم مخطوطات و ماخذات کی مدد سے انھوں نے اس کتاب میں اورنگ زیب کے اخلاق و صفات کی ایسی تصویر پیش کی ہے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین اور انداز نگارش میں اس سلیقے سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی مستحق یہ تھی اس لئے کہ اس کا انداز جدید تاریخ نگاری سے نہیں بلکہ قدیم تذکرہ نگاری سے قریب ہے۔

گلبانگ

عندلیب میرٹھی کی نظموں کا مجموعہ ہے جسے علمی ادارہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ عندلیب میرٹھی اردو کے ان چند پختہ کار شاعروں میں سے ہیں جو شعر کی نوک پلک درست کرنے اور فنی رموز و علائم کے باب میں خاصا اہتمام برتتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مجموعہ کلام کے مطالعہ سے بالعموم زبان و بیان کی کلاسیکل لطافتوں کا احساس ہوتا ہے۔

گلبانگ میں ۲۹ نظمیں ہیں، یہ نظمیں بیسویں صدی کے قومی و ملی اور سیاسی رجحانات کی آئینہ دار ہیں ان میں اشخاص و تحریکات کا تاریخی جائزہ بھی ہے اور کوائف و واردات کی دلنشیں تفسیر بھی۔ ان نظموں میں دیانرائن نگم اور اسمٰعیل میرٹھی کے ساتھ مطرب، دریا، بغاوت، صبح انقلاب، خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور براہ راست مطالعہ کا تقاضا کرتی ہیں۔

کتاب تقریباً دو سو صفحات میں چھپی ہوئی ہے اور چار روپیہ میں علمی ادارہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

طالب علم کی ڈائری

از الطاف علی بریلوی

طالب علم کی ڈائری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے الطاف علی بریلوی کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اب سے کوئی ۔۔ سال قبل اپنی ڈائری کے اوراق میں محفوظ کرلی تھیں۔ ڈائری چونکہ ایک فرد کا روزنامچہ ہوتی ہے اور اس میں سارے تجربات و مشاہدات کی تفصیل عموماً بے کم و کاست درج کی جاتی ہے اس لئے اس میں خطوط، سوانح اور تاریخ نگاری تینوں کی خصوصیات کم و بیش پیدا ہوجاتی ہیں اور یہ چیزیں جب کسی ادبی اسلوب میں ڈھل جاتی ہیں تو ادب کا مستقل جزو بن جاتی ہیں۔ طالب علم کی ڈائری کچھ اسی نوع کی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے ذوقِ ادب کی تسکین کے ساتھ تاریخ ادب اور سیاست کی بعض ایسی جزئیات یہاں مل جاتی ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

کتاب مجلد ہے اور تین روپیہ میں اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، سعیدہ منزل، ناظم آباد سے مل سکتی ہے۔

مسائل نفسیات

از محمد فائق لکچرار نفسیات اردو کالج

عہد حاضر میں علم نفسیات کی مقبولیت اور اہمیت کا کم و بیش سب کو اندازہ ہے لیکن اردو میں ابھی اس پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ اب جبکہ یونیورسٹیوں میں سارے علوم و فنون کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جارہا ہے، اس بات کی سخت ضرورت

چونکہ فطرت کا جوہر ہے لہٰذا یہ ایک ازلی و ابدی حقیقت ہے اس اعتبار سے یہی ایک قائم بالذات ہے اور باقی سب عرض ہی عرض ہے"۔ یہاں پر حسن کا فلسفہ، حقیقت، سچائی، الوہیت یا تصوف کی اصطلاح میں مسئلہ وحدت الوجود کے مترادف قرار پاتا ہے۔ مقدمہ میں ان کے اکثر پیراگراف اور استدلال کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے "میرا ایمان ہے کہ ..... ص۱۸ "میرا ایقان ہے کہ ..... ص۱۸" اس قسم کے فقروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جمالیات کے باب میں اکثر اپنے ہی عقائد میں گھر کر رہ گئے ہیں اور جمالیات کے موضوع پر انھوں نے حکیمانہ نگاہ ڈالنے کے بجائے تاثراتی نظر ڈالی ہے۔

زبان و بیان کی پیچیدگی بھی اکثر جگہ کھٹکتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ موضوع کو ذہن میں پوری طرح اتار نہیں سکے اور اسی لئے بعض جگہ ان کی عبارت انگریزی سے اخذ و ترجمہ کی کوشش میں ژولیدہ و مبہم ہوگئی ہے۔ مثلاً وہ ص۱۳ پر لکھتے ہیں کہ "[illegible]" یونانی زبان کا لفظ ہے جس سے وہ شے مراد ہے جو علم کے سرچشمہ کے طور پر حسیاتی ادراک سے تعلق رکھتی ہے"۔ اس تعریف سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی۔ جمالیات "کو" شے" سے تعبیر کرنا مناسب نہیں اس لئے کہ جسے جمالیات کہتے ہیں اس سے مراد کوئی شے نہیں بلکہ وہ ادراکات و ارتسامات ذہنی ہیں جو کسی خارجی محرک کے باہمی ربط سے حسن کا احساس بیدار کرتے ہیں۔ کاش یہ کتاب جو بیان حسن سے تعلق رکھتی ہے حسنِ بیان سے بھی آراستہ ہوتی۔

پہلی جلد پندرہ روپیہ میں اور دوسری سولہ روپیہ میں مجلس ترقی اردو لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

مجاہد اندلس (ناول)

از۔ محمد زکریا مائل

اندلس کا نام آتے ہی تاریخ اسلامی کا ایک درخشاں باب ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ اس درخشانی کا تعلق اگر صرف امارت و جہانداری کے حُسنِ نظام سے ہوتا تو شاید تاریخ کے طالب علم کے سوا، کسی دوسرے کی دلچسپی کا سوال نہ پیدا ہوتا لیکن چونکہ اس کا تعلق امورِ سلطنت سے کہیں زیادہ تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کے لازوال نقوش و آثار سے ہے اس لئے ہماری نگاہ بہرحال اِدھر اُدھر ٹھہر جاتی ہے۔ پھر یہ نگاہ کبھی "مسدس حالی" کی صورت اختیار کرتی ہے کبھی اقبال کی "مسجد قرطبہ" کی۔ اور کبھی "مجاہد اندلس" جیسے ناول کی۔

ناول کا اصل مصنف علی الجارم مصری ہے۔ اسے محمد زکریا مائل نے آزاد ترجمہ کے ذریعے اردو میں منتقل کیا ہے۔ "ناول فن لطیف کی حیثیت سے مقامی آب و رنگ کے ساتھ مخصوص ادبی اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے کسی ناول کو اس کے مکالمات اور ڈرامائی عناصر سمیت کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ لیکن محمد زکریا مائل اس کٹھن منزل سے نہ صرف آسانی سے گذر گئے ہیں بلکہ زبان و بیان کی شگفتگی اور اردو اشعار کے برمحل و برجستہ استعمال کے ذریعے اس عربی ناول کی فضا کو پاک و ہند کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

کتاب مکتبہ اُسلوب کراچی سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

اخلاقِ عالمگیر

از۔ عزیز ملک سلیمانی

صفحات ۳۸۴۔ قیمت:۔ پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ عزیز ملک سلیمانی۔ گلزار مسجد کچہری روڈ۔ کراچی

اورنگ زیب عالمگیر اپنے مبلغ علم اور مخصوص نظریہ مملکت کی وجہ سے شاہانِ مغلیہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے

اس کا پچاس سالہ دورِ حکومت صرف اس کی سطوت و جبروت نہیں بلکہ اس کی سخت کوشی، مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کا مظہر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یورپ کے اکثر مورخین نے محمود غزنوی کی طرح عالمگیر کے واقعات بھی کچھ اس طرح مسخ کر کے پیش کئے ہیں کہ وہ ایک مذہبی مجنوں نظر آنے لگا۔ مولانا شبلی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک تحقیقی کتابچہ تالیف کر کے اس پر عیسائیوں کے عائد کردہ بہت سے الزامات بے بنیاد ثابت کئے۔ مولانا عزیز ملک سلیمانی نے مولانا شبلی کے کام کو آگے بڑھایا ہے قدیم مخطوطات و ماخذات کی مدد سے انھوں نے اس کتاب میں اورنگ زیب کے اخلاق و صفات کی ایسی تصویر پیش کی ہے جو اب تک ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ لیکن اس کی ترتیب و تدوین اور انداز نگارش میں اس سلیقے سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی مستحق یہ تھی اس لئے کہ اس کا انداز جدید تاریخ نگاری سے نہیں بلکہ قدیم تذکرہ نگاری سے قریب ہے۔

گلبانگ

عندلیب میرٹھی کی نظموں کا مجموعہ ہے جسے علمی ادارہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ عندلیب میرٹھی اردو کے ان چند پختہ کار شاعروں میں سے ہیں جو شعر کی نوک پلک درست کرنے اور فنی رموز و علائم کے باب میں خاصا اہتمام برتتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مجموعہ کلام کے مطالعہ سے بالعموم زبان و بیان کی کلاسیکل لطافتوں کا احساس ہوتا ہے۔

گلبانگ میں ۸۰ نظمیں ہیں، یہ نظمیں بیسویں صدی کے قومی و ملی اور سیاسی رجحانات کی آئینہ دار ہیں ان میں اشخاص و تحریکات کا تاریخی جائزہ بھی ہے اور کوائف و واردات کی دلنشیں تفسیر بھی۔ ان نظموں میں دیانرائن نگم اور اسمٰعیل میرٹھی کے ساتھ مطرب، دریا، بغاوت، صبح انقلاب۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور براہ راست مطالعہ کا تقاضا کرتی ہیں۔

کتاب تقریباً دو سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اور چار روپیہ میں علمی ادارہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

طالب علم کی ڈائری

از الطاف علی بریلوی

طالب علم کی ڈائری جیسا کہ نام سے ظاہر ہے الطاف علی بریلوی کی ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اب سے کوئی تیس سال قبل اپنی ڈائری کے اوراق میں محفوظ کر لی تھیں۔ ڈائری چونکہ ایک فرد کا روزنامچہ ہوتی ہے اور اس میں سارے تجربات و مشاہدات کی تفصیل عموماً بے کم و کاست درج کی جاتی ہے اس لئے اس میں خطوط، سوانح اور تاریخ نگاری تینوں کی خصوصیات کم و بیش پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ چیزیں جب کسی ادبی اسلوب میں ڈھل جاتی ہیں تو ادب کا مستقل جزو بن جاتی ہیں۔ طالب علم کی ڈائری کچھ اسی نوع کی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے ذوقِ ادب کی تسکین کے ساتھ تاریخ ادب اور سیاست کی بعض ایسی جزئیات یہاں مل جاتی ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

کتاب مجلد ہے اور تین روپیہ میں اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، سعیدہ منزل، ناظم آباد سے مل سکتی ہے۔

مسائل نفسیات

از محمد فائق لیکچرار نفسیات اردو کالج

عہد حاضر میں علم نفسیات کی مقبولیت اور اہمیت کا کم و بیش سب کو اندازہ ہے لیکن اردو میں ابھی اس پر کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ اب جبکہ یونیورسٹیوں میں سارے علوم و فنون کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا ہے، اس بات کی سخت ضرورت

جائے "علم النفس" پر مستند کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابیں اردو میں منتقل کی جائیں۔ محمد فائق صاحب نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی ہے۔ کتاب زبان و بیان کے لحاظ سے صاف ستھری ہے اور اس میں خیال بیان کی وہ ژولیدگیاں نظر نہیں آتیں جو عموماً ایسی کتابوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ نئے علوم پر کچھ لکھتے وقت جو مشکل آتی ہے وہ اصطلاحات کے ترجموں کی ہے۔ محمد فائق نے اس سلسلے میں بڑی احتیاط و تلاش سے کام لیا ہے۔ پھر بعض اصطلاحات کے ترجمے کھٹکتے ہیں مثلاً انھوں نے (Sublimation کے لئے "ارتفاع" اور Experimental (Psychology) کے لئے "اختیاری نفسیات" کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بعض اردو کتابوں میں ان کی جگہ "تصعید" اور "تجربی نفسیات" کے الفاظ اپنائے گئے ہیں اور یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

یہ کتاب علمی بک ڈپو ۲۵ اردو بازار سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے اور سرورق بھی خوبصورت ہے۔

گلستاں کی حکایات اردو میں

ترجمہ و تعلیق: از شاہ حسن عطا مہدوی

ناشر: مکتبہ جامعہ تعلیم ملی - ملیر سٹی کراچی

چھیتر صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ سفید کاغذ پر ٹائپ میں بڑے سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ مشرق میں گلستان سعدی اور مغرب میں ڈفو کی رابنسن کروسو دو ایسی چیزیں ہیں جو عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب انہیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ زبان کی سادگی بیان کی حلاوت اور اثر خیزی کے لحاظ سے مشرق کی کوئی کتاب گلستان سعدی کے مرتبہ کو نہیں پہنچی وہ معاشرت، مذہب اور اخلاق کی اصلاح کا صحیفہ بھی ہے اور سادہ و پرکار فارسی نثر کا کامل نمونہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مقبولیت میں آج بھی کمی نہیں ہوئی یہ اور بات ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں فارسی کا پہلا سا مقام نہیں رہا۔ پھر بھی وہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور اس سے ذوق رکھنے والے آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس لئے یقین ہے کہ شاہ عطا حسن مہدوی کا یہ کتابچہ جو کہ طلبہ کے لئے خصوصاً اور اہل ذوق کے لئے عموماً مفید ہے۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور گلستان سعدی کو نئی نسل سے روشناس کرانے میں مدد کرے گا۔

شاد

شاد عارفی کے کلام کا مختصر انتخاب ہے جسے "نیا خواب" رامپور نے شائع کیا ہے۔ شاد عارفی شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ اقبال کے اس شعر کو

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

انھوں نے اپنی فکر سخن کے لئے رہنما بنایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ کامیاب ہوئے ہیں۔ قدیم و جدید خیالات اسالیب کی پیوند کاری آجکل اکثر شعرا کے یہاں ملتی ہے لیکن شاد کی جرأت اظہار اور طنزیہ لب و لہجہ نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے اس مصرع میں ؎

کسی کے ظاہر سے اسکے باطن کا جائزہ بھی سہل نہیں ہے

سہل کو بروزن غزل اور محل استعمال کیا گیا ہے یہ درست نہیں۔ سہل ساکن الاوسط ہے۔

پتھر کی لکیر

سرشار صدیقی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات میں جو چیزیں نمایاں ہیں وہ اس کے شاعرانہ رموز و علائم ہیں۔ رمزیت یا اشاریت کوئی بری چیز نہیں ہے، کنایہ، استعارہ اور بیان مجاز ہمیشہ ہماری شاعری میں پایا گیا ہے اور اشاریت کے حدود ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابہام و اہمال کو ہمیشہ سمجھا گیا ہے اور سمجھا جائے گا خواہ وہ نتیجہ اشاریت کا ہو یا استعارہ و کنایہ کا۔ سرشار صدیقی نے اس سلسلے میں مفید و معتدل راہ اختیار کی ہے۔ اور لفظ و معنی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیا۔

کتاب دو روپیہ میں ہمارا ادارہ ڈرگ روڈ کالونی سے مل سکتی ہے۔

اردو املا کا آسان طریقہ

از عبدالغفار مدھولی

قیمت ۷۵ پیسے ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی

۴۸ صفحات کے اس کتابچہ میں املا کی تدریس کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنف کے ذاتی تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ان کی افادیت مسلّم ہے۔ اردو میں حروف تہجی اور متشابہ الصوت حروف کی کثرت نے املا کو بچوں کے لئے خاصا مشکل بنا دیا ہے۔ غیر ملکیوں اور بالغوں کو اردو لکھنا سکھانے میں بھی اسی بنا پر بڑی دشواری ہوتی ہے۔ عبدالغفار مدھولی نے اپنے تعلیمی تجربات کی مدد سے اس دشواری کو آسان بنانے کی قابل عمل تجویزیں پیش کی ہیں۔ ہر چند کہ انھوں نے املا کے سلسلے میں صرف سالم حروف سے بحث کی ہے اور املا کی اصل دقت یعنی مختلف حروف کے ان مختلف النوع صورتوں کو نظر انداز کر دیا جو حروف کے باہم ملانے سے پیدا ہوتی ہیں پھر بھی اُن کے مشوروں سے املا کے بعض مسائل کو آسان اور دلچسپ بنانے میں مدد ملتی ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات

مولفہ خورشید احمد

قیمت چھ روپے پچاس پیسے۔ ناشر۔ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ۔ کراچی یونیورسٹی

جس طرح کسی زمانے میں پاپائے روم نے عیسائیت کو اور ہندو مت کو برہمنوں نے اپنی جاگیر و میراث سمجھ رکھا تھا بالکل اسی طرح ایک مدت تک نام نہاد اور رجعت پسند مولویوں نے دین اسلام اور قرآن کو اپنی اجارہ داری میں لے رکھا تھا اور قرآن کے پیغام کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرکے دوسروں تک پہنچانے کی اجازت تک نہ تھی۔ لیکن جس طرح مارٹن لوتھر نے پوپ اور پادریوں کی مرضی کے خلاف انجیل کا ترجمہ پیش کرکے پورے یورپ پر علم و فکر کے نئے دروازے کھول دیئے تھے بالکل اسی طرح برصغیر میں شاہ ولی اللہ نے مولویوں اور ملاؤں کے احکامات و فرمودات کو یکسر انداز کرکے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کر دیا۔ اس طرح قرآن کی روشنی پہلی بار عربی زبان کے حلقہ سے باہر دوسرے ممالک تک پہنچی۔ تاریخ ادب ہندوستانی کا مصنف اور مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی جو کہ مذہب کے معاملے میں کٹر عیسائی ہے لکھتا ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹے اردو فارسی ترجموں کے ذریعے قرآن کے پیغام کو عام نہ کر دیتے تو یورپ اور دنیا کے دوسرے علاقوں پر اسلام کو

اثر و نفوذ اتنی تیزی سے نہ بڑھتا ان سطور سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ مولویوں نے بہت دنوں تک اسلام کو صرف گھر کا چراغ بنا
لیکن جب ایک وسیع النظر اور کشادہ قلب سچے مسلمان کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اسلام اور قرآن کو دنیا کے سامنے ایک بلند
منارۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا۔ خدا کا شکر ہے اسلام اور قرآن دونوں کے باب میں اب نام نہاد مولویوں اور ملاؤں
بیانات پر بھروسہ نہیں کیا جاتا بلکہ اس دینِ فطرت کو فطرت کے اصول ہی کی روشنی میں دیکھنے، سمجھنے اور مشعل راہ بنانے
کوشش کی جا رہی ہے۔ زیر نظر کتاب جسے کراچی یونیورسٹی کے استاد خورشید احمد صاحب نے نعیم صدیقی کی مدد سے مرتب کیا
اس نوع کی عملی کوشش ہے۔ اس کتاب میں فروعی اور نزاعی مسائل کو یکسر نظر انداز کر کے صرف ان مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے جو
قرآن کی اصل روح سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعلیم سے انسان میں مجہول کیفیت کی بجائے ایک فعال روح بیدار ہوتی۔
یہ کتاب چونکہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے اس لئے امید ہے کہ نوجوانوں میں وہ جذبۂ انسانیت بیدار ہوگا جس کا
اسلام اور بانیٔ اسلام کا اصل مقصد تھا۔

نصابی نقطۂ نگاہ سے کتاب قدرے ضخیم ہے اور تعلیمی سال کے اندر اسے ذہن نشین کرانا دشوار نظر آتا ہے اگر اس کی
ضخامت کچھ کم کر کے قیمت میں بھی تخفیف کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔

ادب و آگہی

مجتبیٰ حسین کے تنقیدی مقالات کا دوسرا مجموعہ ہے اس سے پہلے "تہذیب و تحریر" کے عنوان سے
ان کے ادبی مضامین کا ایک مجموعہ اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے یوں تو افسانے بھی لکھے ہیں اور
بھی کہے ہیں لیکن ان کے فکر و خیال کی محبوب جولان گاہ ادبی تنقید ہے۔ تنقید، نقاد سے وسیع مطالعہ کے ساتھ ایک خاص قسم کا
تجزیاتی ذہن، فنی شعور اور پختہ مذاق کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ چیزیں مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں ملتی ہیں۔

اس کتاب کے پہلے تین مقالے نظری مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے دو مضمون "نقاد"، اور "ادب میں نظریے کا صرف"
انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے بحث کی ہے۔ اس بحث میں الجھاؤ یا ابہام کی وہ کیفیت کہیں پیدا نہیں ہوئی جو بعض ناقد
کے یہاں موضوع کا واضح تصور نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ جو کچھ لکھتے ہیں ایک خاص اثر
اور جذبے کے ساتھ لکھتے ہیں اور اسی وقت لکھتے ہیں جب "درون خانہ" کے ہنگاموں سے مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان
مقالات میں تخلیقی شان کے ساتھ ایک خاص ادبی اسلوب بھی ملتا ہے۔ یہ ادبی اسلوب سادہ و پرکار، نرم و سنجیدہ، شگفتہ
ذی وقار اور رنگین و دلکش ہے۔ عملی تنقید کے باب میں مجتبیٰ حسین کا ذہن کچھ اور روانی کے ساتھ چلتا ہے اور تجزیہ و تحلیل
تشریح و تعبیر کے ذریعے وہ موضوع کو سامع یا قاری کے ذہن میں پوری طرح اتار دیتے ہیں۔ اس کتاب میں افسانوں کی بر
"اعمال نامہ" "مسجد قرطبہ"، حالی کی عشقیہ شاعری پر جو مقالے ہیں وہ کم از کم اسی قبیل کے ہیں۔

کتابت و طباعت بہت اچھی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور سوا چار سو صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ مقالات چھ روپے
میں مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی سے مل سکتا ہے۔

تدریس حساب

از برکت علی۔ ناشر- جامعہ تعلیم ملی ملیر کراچی قیمت چار روپیہ ۵۰ پیسے

اردو میں فن تدریس سے متعلق کتابوں کی جو قلت ہے اس سے ہمارے ماہرین تعلیم بے خبر نہ ہونگے، لیکن افسوس

کہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی جا رہی۔ مختلف علوم و فنون پر تو اچھی بڑی، ہر سال سینکڑوں کتابیں وجود میں آجاتی ہیں لیکن فن تدریس پر ایک دو کتابوں سے زیادہ کے نام نہیں لئے جا سکتے۔

جامعہ تعلیم ملی کراچی البتہ اس طرف خصوصی توجہ دے رہا ہے اور اس نے اس قسم کی مطبوعات کا ایک مستقل سلسلہ شروع کیا ہے قرآن تجویدی کی تدریس اردو اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی اور تدریس حساب اس کی دوسری کڑی ہے۔

"تدریس حساب" ابتدائی مدرسوں کے لئے مخصوص ہے اور ایک ایسے ماہر مضمون کے تجربات کا نچوڑ ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ حساب کی تعلیم و تدریس میں گزارا ہے ــــ کتاب سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے اور تقریباً ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ آغاز کتاب میں حساب کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے بعد ازاں ابتدائی حساب کے سارے اصول و کلیات نہایت شرح و بسط سے واضح کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب زیر تربیت اساتذہ کے لئے نہایت مفید ہے اور یقین ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں حساب کی تدریس اس کی مدد سے زیادہ موثر اور دلچسپ بنائی جا سکے گی۔

تاریخ زبان فارسی

تالیف:۔ ڈاکٹر غلام سرور صدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی

ہر چند کہ پاک و ہند میں فارسی کا پہلا سا ذوق و معیار باقی نہیں رہا پھر بھی فارسی زبان و ادب پر جس طرح کام ہو رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر جان چھڑکنے والوں کی اب بھی ایک خاص جماعت موجود ہے۔ یہ اسی جماعت کی کوشش و توجہ کا نتیجہ ہے کہ اس دورِ مادیت میں جبکہ فارسی کی تعلیم سے کسی مالی منفعت و منصب کا سوال نہیں پیدا ہوتا بہت سے لوگ فارسی کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور محض تسکین ذوق کی خاطر اسے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر غلام سرور اسی قسم کے لوگوں میں سے ہیں جو فارسی کا اچھا ذوق رکھنے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کی طرف دعوت دیتے رہتے ہیں۔ تاریخ زبان فارسی ان کی اس قسم کی کوشش کا بین ثبوت ہے۔ اس کتاب میں ایران و پاکستان کے تاریخی و لسانی تعلقات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور فارسی کے اسالیب و اصناف پر مورخانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ زبان و ادب کے عہد بہ عہد ترقی کا جائزہ لیکر ہر دور کی لسانی و ادبی رجحانات و خصوصیات پر تبصرہ اور ہر دور کے مروجہ لغات و تراکیب کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جو اختصار کے باوجود جامع ہے۔

کتاب مجلد ہے اور پانچ روپیہ میں مکتبہ خورشید درخشاں ۹۶۸/۱۵ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی سے مل سکتی ہے۔

وحدت الوجود والشہود

مرتبہ ثناء الحق ایم۔ اے۔ ملیگ

ناشر پاک اکیڈمی گولی مار۔ کراچی

مولانا شیخ محمد محدث اونیسویں صدی عیسوی کے عالم متبحر تھے اور طریقت و شریعت دونوں کے ادا شناس بھی۔ تالیف و تصنیف ان کا محبوب مشغلہ تھا

"وحدت الوجود والشہود" نامی رسالہ انھوں نے فارسی زبان میں لکھا تھا۔ یہ رسالہ نایاب تھا جسے ثناء الحق صاحب نے بڑی محنت سے ترتیب دیکر ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ مرتب نے مصنف کے حالات زندگی جمع کرنے اور ان کے افکار و خیالات پر تبصرہ و محاکمہ کرنے میں جس دیدہ ریزی اور تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے اس سے ان کے ذوق تحقیق و تنقید دونوں کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔ یقین ہے کہ مسائل تصوف سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

ماشیے نہ ماشیے

(۱)

ایک بار ایران کے قاسم خان نے ایک چیونٹی کو جو اس کے کپڑوں میں لگ کر آگئی تھی ایک ہزار میل سفر کرکے اس کی اصل جگہ تک پہونچایا۔ اب اس کا مقبرہ گویا چیونٹیوں کا "مکہ" ہے جہاں کوئی شخص چیونٹیاں نہیں مار سکتا ——— !

(۲)

ایک عجیب سکہ

کسی وقت مشرقی افریقہ میں لوہے کا ایک قانونی سکہ تھا جو روپیہ کی طرح خرید و فروخت کے کام آتا تھا

(۳)

گانا کا یہ پرندہ جس کے پر سنہرے ہوتے ہیں، سونے کی کانوں کے قریب پایا جاتا ہے۔ سونے کی تلاش کرنے والے اس پرندہ کی جستجو میں رہتے ہیں اور اس کا تعاقب کرکے سونے کی کانوں تک جا پہونچتے ہیں

۴
آئس کریم کا دلدادہ
روس کا کاؤنٹ
جولیس لٹسار (۱۷۴۳ - ۱۸۳۹)
آئس کریم کا اتنا رسیا تھا کہ
وہ تیس سبز آئس کریم ہر روز
دوپہر کے کھانے کے بعد کھاتا تھا۔ اور —
مستقلاً ۹۴ سال تک اس معمول میں فرق
نہ آیا
۵
شہنشاہوں کے مصارف
اسپین کے بادشاہ
فلپ چہارم (۱۶۲۱ — ۱۶۶۵)
نے اپنے ۴۴ سالہ دورِ حکومت
میں ۱۴۴۳۸ ہزار ڈالر
کی وردی کی
صرف کیے — اور —
۶۱۹۲ ہزار ڈالر موم
بتیوں پر —!

تصانیفِ مولانا نیازؔ فتحپوری

انتقاداتِ مولانا نیاز فتحپوری کے معرکۃ الآرا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی ہر مقالہ اپنی جگہ حرفِ آخر اور مجموعہ ادب کی
انتقادیات حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان، اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتارِ ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر
ضروری ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہبِ عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفۂ ارتقاء، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مسیحیت کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے قیمت 75-1

مشکلاتِ غالب غالب کے تمام مشکل اشعارِ اردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۲ روپے

عرضِ نغمہ ٹیگور کی گیتا نجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ مع ایک بسیط مقدمہ کے۔ قیمت: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ترغیباتِ جنسی مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ نہایت محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی۔ قیمت ۵ روپے پچھتر پیسے

تاریخ کے گمشدہ اوراق حضرت نیاز کے چوبیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت ۲ روپے

جذباتِ بھاشا مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کر کے ان کی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی۔ قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ایک شاعر کا انجام حضرت نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا ایک طویل افسانہ جس سے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اس کا ایک ایک جملہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی قیمت ایک روپیہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے پیرانِ طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرتی و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے یہ مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۷۵ پیسے

شبستان کا قطرۂ گوہریں مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسنِ بیان ندرتِ خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں ہر افسانہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے

نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

خـــدا نمـــبـــر

قارئین کے اصرار پر

آخر ستمبر ۶۳ء میں

شائع کیا جارہا ہے

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ بندے اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی تعبیر کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر با شعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کے اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا ”خدا نمبر“ اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے۔

★

قیمت : تین روپے

مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی -

19

ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ:- نیاز فتحپوری

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

ستمبر ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ

نیاز فتح پوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری ——— عارف نیازی

زرِ سالانہ	قیمت فی کاپی
دس روپے	۷۵ پیسے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی/ رالیف یوپی ۔ بی ۲۶۶۹ ۔ ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر، پبلشر:۔ ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارۂ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا (کتبہ صادق)

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ
آپ کا چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہوگیا

نگارِ پاکستان

مدیر اعلیٰ :۔۔۔۔۔۔۔۔ نیاز فتحپوری

۴۲ واں سال	فہرست ستمبر ۱۹۶۳ء	شمارہ ۹

ملاحظات

ایڈیٹر طلوعِ اسلام جناب پرویز کی پروازِ فکر پر سرسری تبصرہ

یاز فتحپوری

حال ہی میں میرے ایک کرمفرما اور ادارۂ طلوعِ اسلام کے قیم نے مجھے جناب پرویز کی ایک تقریر کا ریکارڈ سنایا اور پورے ب گھنٹہ تک بیٹھے اس تقریر کو پورے صبر و سکون کے ساتھ سنا۔

تقریر کا موضوع یہ تھا کہ دین و مذہب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور جس تعلیم کو اس وقت پیش کیا جا رہا ہے یا اس ے پہلے بعض علماء نے پیش کیا اس کا تعلق مذہب سے ہے، دین سے نہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ان کے نزدیک موجودہ ہب نام ہے دین کی مسخ شدہ صورت کا جس کو اسلام کی صحیح تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔

جناب پرویز کی تقریر اس میں شک نہیں بڑی دل کش، مدلل اور پرمغز تقریر ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بڑی شگفتہ و لیف، لیکن مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ ادبی لب و لہجہ اور خطیبانہ آہنگ سے ہٹ کر محض اس کی ے صداقت و خلوص اور رہولئے شیفتگی تھی جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ جناب پرویز جو کچھ کہتے ہیں وہ واقعی ان کے دل کی واز ہے اور ان کے جذبۂ دردمندی کی سچی تصویر۔ لیکن جب اس انداز کے خطبات و مواعظ میرے سامنے آتے ہیں تو میں یہ ہیں دیکھتا کہ ان کا موضوع کیا ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ ان کی غرض و غایت کیا ہے اور جس نصب العین کو پیش کیا جاتا ہے اس کے حصول کے عملی ذرائع بھی بتائے گئے ہیں یا نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ آیا واقعی کوئی ایسی جماعت وجود میں آگئی ہے جسے ہم ان نصائح کی عملی "روئیداد" کہہ سکیں۔

افسوس ہے کہ میں نے اس تقریر میں کوئی اشارہ ایسا نہیں پایا جس سے مجھے یہ سمجھنے کا موقع ملتا کہ زندگی کا کوئی لی پروگرام بھی ان کے سامنے ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا؟

میں اس سے بے خبر نہیں کہ جناب پرویز کی تحریک "طلوعِ اسلام" کافی مقبول ہو چکی ہے اور ملک کے مختلف مقامات یں اس نام کی جماعتیں بھی قائم ہو چکی اور ہو رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تشکیل کا مقصد فی الحال صرف تربیتِ ذہان ہے اور اس تحریک کی حیثیت زیادہ تر اکاڈیمی کی سی ہے جو آہستہ آہستہ منازلِ تحقیق سے گزر رہی ہے چنانچہ جناب پرویز کا یہ خطبہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے جس میں انھوں نے دین اور مذہب دو جداگانہ اصطلاحیں قرار دیکر دین کو اصل چیز ور مذہب کو اسکی مسخ شدہ صورت ظاہر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ "اسلام" ذہنی و عملی دونوں حیثیتوں سے افسوس ناک حد تک نیچے گر گیا ہے لیکن اس کو ابھارنے کی مناسب صورت یہ نہیں کہ سارا وقت صرف لفظی بحثوں

ں ضائع کردیا جائے اور صحیح تعلیمات اسلام پیش کرنے کے لئے پہلے دین و مذہب کی معنوی تفریق پر مقالہ لکھنا ضروری
بھا جائے کیونکہ جب گفتگو صرف لغت و زبان پر منحصر ہوجائے گی تو دوسروں کو بھی اسی نقطۂ نظر سے بحث و ایراد کا موقع
ے گا اور اصل مقصد فوت ہوجائے گا۔ مثلاً لفظ دین ہی کو لیجئے کہ وہ پرویز صاحب کے نزدیک ایک ایسا مقدس لفظ ہے
، اسلام کا صحیح مفہوم صرف اسی لفظ سے ظاہر ہوسکتا ہے۔ لفظ دین کی تحقیق کے سلسلہ میں یقیناً یہ حدیث بھی ان کی
اہ سے گزری ہوگی کہ :-

کان صلی اللہ علیہ وسلم علی دین قومہ ای علی
ما بقی فیھم من ارث ابراھیم و اسماعیل فی
حجھم و مناکحھم و بیوعھم و اسالیبھم واما
التوحید فانھم کانوا قد بدلوہ والنبی
لم یکن الا علیہ۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کا تعلق صرف عقیدہ توحید سے ہے۔ علاوہ اس کے خود قرآن کا ارشاد:-

"لکم دینکم ولی دین"

ظاہر کرتا ہے کہ دین نام ہے صرف کسی مخصوص طریقہ یا مسلک پر چلنے کا اور محض دین بول کر ہم "دینِ اسلام" مراد نہیں لے سکتے
ں اگر دین و مذہب دونوں اصطلاحوں کو چھوڑ کر صرف لفظ اسلام اختیار کریں تو بیشک بات بن جاتی ہے اور کسی اختلاف
ں صورت باقی نہیں رہتی۔

کلام مجید میں ۹۴ جگہ لفظ دین استعمال ہوا ہے جن میں اکثر عمومی طور پر اسلام و غیر اسلام دونوں شامل ہیں۔
فظ اسلام اور اس کے مشتقات کا استعمال بھی ۲۳ جگہ آیا ہے اور چند آیات ایسی ہیں جنھوں نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کردیا
ہے کہ اصل چیز دین نہیں اسلام ہے اور مسلمانوں کے دین یا مذہب کو اسلام ہی کہنا چاہیئے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام .... (آل عمران)

ورضیت لکم الاسلام دینا .... (مائدہ)

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ..... (آل عمران)

اس سے قطع نظر اگر خالص لغوی تحقیق کو سامنے رکھا جائے (جس پر جناب پرویز شدت سے مائل ہیں) تو ان کو اور
زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ مخالف کہہ سکتا ہے کہ آپ جس لفظ دین کو اسلام کا صحیح مصداق ظاہر کرتے
یں اس کے معنی پاداش، خواری، ذلت، بیماری اور ارتکاب گناہ کے بھی ہیں۔ اس لئے کیوں نہ آپ کے بتائے ہوئے دین
ا یہی مفہوم لیا جائے اور کیوں نہ لفظ مذہب کو زیادہ مناسب سمجھا جائے جبکہ اس کا مفہوم صرف طریقہ، راستہ یا جائے ظہور
ہے اور وہ کسی متضاد معنی کا بھی حامل نہیں۔

اس بیان سے میرا مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ذہنی تربیت و اصلاح کے سلسلہ میں لغوی و لسانی پہلو پر زیادہ
زور دینا مناسب نہیں کیونکہ اس طرح فضول لفظی نزاع شروع ہوجاتی ہے اور اصل مقصود تربیت و اصلاح کا مفقود ہوجاتا
ہے۔ اصل چیز اسلام کی صحیح تعلیم پیش کرنا ہے خواہ اسے آپ مذہب کہیں یا دین۔ اور پرویز صاحب نے یقیناً اس سلسلہ میں بہت

کرچکے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے تمام اصلاحی لٹریچر میں لغوی تحقیق کا پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے جس کو وہ تعلیم دین کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور بنیادی مباحث سے دامن کشاں گزر جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی تازہ تصنیف "مفہوم القرآن" کو لیجئے جس کا صرف پہلا حصہ میری نگاہ سے گزرا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔ مذہب کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے ساتھ اپنا پرائیویٹ رشتہ جوڑے، اپنی نجات کی فکر کرے۔ اس کے لئے خدا کی پرستش کرتا رہے باقی رہے دنیاوی امور واجتماعی مسائل حیات سو اپنی صوابدید کے مطابق خود حل کرے اس کے برعکس دین کا مقصود یہ ہے کہ

(۱) خارجی کائنات اور انسانی زندگی کے اللہ تعالیٰ جو اٹل قوانین مقرر کرے ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کاروان انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے

(۲) خارجی کائنات کے قوانین علوم سائنس کی رو سے معلوم کئے جاسکتے ہیں لیکن انسانی دنیا سے متعلق قوانین وحی کی رو سے عطا ہوئے ہیں جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

(۳) ان قوانین کا پورا پورا اتباع انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ایک نظام ومعاشرہ کے اندر ہوسکتا ہے جو قرآنی معاشرہ کہلائے گا۔

اس نظام کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد اس زندگی کے بعد حیات اخروی کے منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ دنیا میں سرفرازیاں نصیب ہونگی، امن وسلامتی کا دورہ ہوگا اور انسان کو دنیا وآخرت دونوں میں جنت کی زندگی نصیب ہوگی"

اگر مذہب کا مفہوم وہی ہے جو جناب پرویز نے ظاہر کیا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کونسی بات قابل اعتراض ہے۔ خدا سے "پرائیویٹ رشتہ" کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اگر اس سے مراد انفرادی طور پر رموز الٰہی کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے تو یہ میرے نزدیک ہر شخص کا فطری فرض ہے اور غالباً خود پرویز صاحب بھی عرصہ سے اسی علاقۂ عبد ومعبودیت کے سمجھنے میں سرگرداں ہیں۔ اب رہا سوال فکر نجات کا، خدا کی پرستش اور اجتماعی مسائل حیات کو اپنی فکر سے حل کرنے کا، سو ان کو بھی اگر دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو ان کا مفہوم بھی وہی قرار پائے گا جو ان کے نزدیک دین کا ہے بلکہ انھوں نے تو دین کے مفہوم میں حیات اخروی اور جنت کا ذکر کرکے اسے اور زیادہ معمہ بنا دیا ہے۔ حیات اخروی اور اس کے مزید ارتقائی منازل! آخرت اور اس کی فردوسی زندگی! اللہ اللہ کیسی سنہلے دلآویز ہیں لیکن ضرورت تھی کہ پرویز صاحب سب سے پہلے ان مفروضات کو حقائق ومسلمات کی حدود میں لے آتے اور پھر انھیں دین کا جزو قرار دیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنی جگہ یہ فرض کرکے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں مسلمۂ عوام ہے اسے اصل دین قرار دے دیا۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے کسی اور جگہ اس پر گفتگو کی ہو لیکن مناسب تھا کہ اس سلسلہ میں بھی اس کا حوالہ دے دیا جاتا اور بات صاف ہو جاتی۔

اس کے ساتھ تعریف دین کے سلسلہ میں جب ان کی دیگر تصریحات کو سامنے رکھا جاتا ہے تو وہ بھی انکی تباہی ہوئی

تعریف مذہب سے قطعاً تعلق نہیں آتی۔

قرآن میں لفظ اسلام اور اس کے مشتقات بھی بکثرت استعمال کئے گئے ہیں اور ہر جگہ لفظ اسلام پر جتنا زور دیا گیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو جن دعاؤں کی تلقین کی گئی ہے ان میں ایک دعا یہ بھی ہے کہ:-

" ربنا واجعلنا مسلمین لک .... وتوفنا مسلمین "

بہرحال " دین و مذہب " کی معنوی تفریق کے سلسلہ میں مجھے جناب پرویز سے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس بحث میں وہ اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کریں لیکن اگر کسی اصطلاح کا وضع کرنا ان کے نزدیک ضروری ہے تو وہ کیوں نہ لفظ اسلام اختیار کریں جو زیادہ صاف و واضح ہونے کے علاوہ اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے بھی صحیح تعلیم انسانیت و تشکیل جامعۂ بشری کا سنگ بنیاد ہے۔

یہاں تک تو گفتگو تھی جناب پرویز کے صرف اس نظریہ دین و مذہب پر جو ان کی ریکارڈ کی ہوئی تقریر کا اصل موضوع تھا لیکن چونکہ اس کے ساتھ ان کے چند رسائل بھی مجھے مرحمت ہوئے تھے اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس سلسلہ میں ان پر بھی مختصراً اظہار خیال کروں۔

ان رسائل میں سب سے زیادہ قابل ذکر " مفہوم القرآن " ہے۔ یہ ترجمہ ہے پہلے پارہ کا۔ لیکن جیسا کہ جناب پرویز فرماتے ہیں یہ " دراصل نہ ترجمہ ہے نہ تفسیر بلکہ اس کے مفہوم کی وضاحت ہے، ایک مسلسل، مربوط اور دلکش انداز میں "

اس کے افتتاحی مقدمہ میں منجملہ دیگر حسنی مسائل کے انھوں نے قرآن کے متداول تراجم و تفاسیر کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی ترجمہ یا تفسیر سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں اس باب میں بڑی حد تک ان سے متفق ہوں کیونکہ اکثر تفاسیر خواہ وہ عربی کی ہوں یا فارسی اُردو کی ان سب کا ماخذ محض روایات ہیں اور روایات بھی وہ جو اصول درایت سے بالکل ہٹی ہوئی ہیں۔ خود مفسرین نے اپنی ذاتی فکر و رائے سے کہیں کام نہیں لیا اور روایات کی صحت یا عدم صحت پر کوئی رائے زنی نہیں کی۔

عہد نبوی میں کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی اور نہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی خود ایک زندہ تفسیر موجود تھی۔ علاوہ اس کے وہ زمانہ بھی چون و چرا کا نہ تھا جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے از خود صحابہ کے ذہن نشین ہو جاتا اور اگر کوئی اشتباہ پیدا ہوتا تو رسول اللہ سے دریافت کر لیتے اور بلا تامل اسے تسلیم کر لیتے۔

رسول اللہ کے بعد صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن عباس قدیم ترین مفسر تسلیم کئے جاتے ہیں جن کا انتقال ۶۸ھ میں ہوا لیکن وہ کتابی صورت میں کبھی مدون نہیں ہوئی۔ بخاری کی کتاب التفسیر میں البتہ اس کے اقتباسات پائے جاتے ہیں لیکن مجھے اس کی صحت کا یقین نہیں کیونکہ ان کا انحصار صرف روایات پر ہے اور روایات کی صحت پر مشکل ہی سے یقین کیا جا سکتا ہے اب رہ گئی تفسیر عباسی جسے ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے سو وہ بھی دراصل حضرت ابن عباس کی تفسیر نہیں ہے۔

الغرض صحابہ کے زمانہ میں کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس کے بعد مشاہیر تابعین میں صرف مجاہد بن جبر ایسے بزرگ تھے جن سے ایک تفسیر منسوب کی جاتی ہے لیکن وہ بھی حضرت ابن عباس ہی کی روایات کا مجموعہ ہے۔ تابعین کے بعد کا زمانہ بڑے ذہنی خلفشار اور فتنہ و ابتلا کا زمانہ تھا۔ ہر جگہ احادیث کی ٹکسالیں قائم تھیں اور قرآنی آیات کی تاویل و تفہیم کا ذریعہ یہی جعلی روایات رہ گئی تھیں اس لئے اس زمانہ میں جو تفاسیر لکھی گئیں ان کے متعلق علامہ سیوطی کی یہ رائے کہ:-

"فیہ کل شئ الا التفسیر"

یعنی تفسیر کے سوا ان میں سب کچھ ہے) بڑی پاکیزہ تنقید ہے۔

باقاعدہ تفسیر نگاری کا زمانہ تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کی اولین تفسیر امام شافعی کی احکام القرآن ہے۔ لیکن صحیح معنی میں تفسیر وہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد متعدد تفاسیر لکھی گئیں لیکن سب مختصر کیا بلکہ مقتصر تھیں۔ چوتھی صدی ہجری کی تفاسیر میں تفسیر ابن جریر البتہ بہت بڑی تفسیر ہے جو ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے لیکن وہ انتہائی بڑا ذخیرہ موضوع احادیث کا بھی ہے۔ اس کے بعد پانچویں صدی سے لیکر تیرھویں صدی تک جتنی تفسیریں لکھی گئیں (اور بکثرت لکھی گئیں) ان میں تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک، تفسیر ابن کثیر بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض تو محض کورانہ تقلید کا نتیجہ ہیں بعض عقیدۂ اعتزال کی تبلیغ ہیں اور بعض صوفیہ کے سمجھ میں نہ آنے والے نظریات کی۔

الغرض تفاسیر متداولہ کی طرف سے پرویز صاحب کی طرح ہم بھی غیر مطمئن ہوں۔ اب تراجم کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بعض تو وہ ہیں جو قرآن کا محض لفظی ترجمہ ہیں اور مترجم نے وضاحتِ مفہوم کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے خود پڑھنے والے کی فکر و استعداد پر چھوڑ دیا ہے۔ ہرچند یہ تراجم ہمیں یقین کی منزل تک نہیں پہونچاتے لیکن انھیں نشانِ منزل و دلیلِ راہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور لبسا غنیمت ہیں۔ بعد کو بعض مترجمین نے قوسین کے اندر وضاحتی عبارت کا بھی اضافہ کیا اور حاشیہ پر آیات کی شانِ نزول و تفسیری حوالے دینا بھی شروع کئے جو یقیناً محل نظر ہیں اور ان کی اس کوشش کو میں نے کبھی بنظر استحسان نہیں دیکھا کیونکہ ان کے تفسیری حاشیے کچھ اس قسم کے ہیں جنھیں عقل انسانی مشکل ہی سے قبول کر سکتی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ قرآن کے تمام متداول ترجمے اور اس کی اکثر مشہور تفاسیر تنقیح کی محتاج ہیں اور اس وقت جبکہ جدید علمی اکتشافات نے عقل و درایت کے تمام سابق نظریوں کو باطل ٹھہرا دیا ہے یقیناً اس کی ضرورت ہے کہ قرآن کا مفہوم زمانۂ حال کے اندازِ فکر کو سامنے رکھ کر پیش کیا جائے اور غالباً اسی ضرورت کا احساس تھا جس نے جناب پرویز کو "مفہوم القرآن" کی تصنیف پر مجبور کیا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے جو نئی راہ اختیار کی ہے وہ اگر سیدھی عرب تک نہیں جاتی تو ترکستان کی بھی نہیں ہے۔

جناب پرویز نے "مفہوم القرآن" کا تعارف کراتے ہوئے بعض ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جو ذہن انسانی کو مشوش کرنے والی ہیں۔ انھوں نے بڑے وثوق کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ کسی زبان میں ممکن نہیں یہاں تک کہ خود عربی زبان بھی ایک حد تک اس سے قاصر ہے۔ گویا بالفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اپنے اسالیب بیان کے لحاظ سے اتنی مشکل کتاب ہے کہ غیر عرب کیا خود اہل عرب بھی جن کی مادری زبان عربی ہے، اس کے مفہوم کے صحیح ادراک سے عاجز ہیں۔ پرویز صاحب نے کھل کر تو نہیں کہا لیکن ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں قرآن نازل ہوا ہے اس وقت بھی اس کے سمجھنے والے کم تھے۔ خیر یہ تو ایک ایسی بات ہے جس کا صحیح علم اس وقت کسی کو نہیں ہو سکتا لیکن اس سلسلہ میں ایک سوال (جو بڑا اصولی سوال ہے) ضرور ہمارے سامنے آتا ہے کہ اگر قرآن کا مقصود اصلاح عوام تھا تو اسے کیوں ایسی دقیق و مشکل زبان میں نازل کیا گیا کہ اسے عوام کیا خواص بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

ایک طرف قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ہر "رطب و یابس" کا مجموعہ ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا جامع قانونِ حیات ہے جس نے ہر اچھائی برائی کی وضاحت کر دی ہے اور جامعۂ بشری کا کوئی تمدنی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی تشریح اس میں

موجود نہ ہو۔ لیکن پرویز صاحب اس کی زبان، اس کے طرز بیان، اس کے اسلوب ادا کو فہم انسانی سے بالاتر سمجھتے ہوئے اس کی شرح و تفسیر کی سعی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن انشا و ادب کی کتاب نہیں جس کے حسن و خوبی کا انحصار اس کی نادر تشبیہات و استعارات یا صنائع و بدائع پر ہو بلکہ وہ صحیفہ ہے درس اخلاق کا عام و خاص سب کے لئے، اس لئے اصولاً اس کی خوبی کا معیار صرف یہی ہونا چاہیئے کہ اسے ہر شخص سمجھ سکے اور آسانی سے سمجھا یا جاسکے۔ اور میرے نزدیک قرآن کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ وہ باوجود اپنے بلند معیار فصاحت و بلاغت کے اس درجہ صاف و سلیس ہے کہ ہر وہ شخص جو عربی زبان سے کچھ بھی مناسبت رکھتا ہے اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں جب ہم خود قرآن سے استصواب کرتے ہیں تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ کلام مجید میں لفظ قرآن فرقان وکتاب بکثرت نظر آتا ہے اور اگر ان تمام آیات کو سامنے نہ رکھا جائے بلکہ صرف چند مشہور و متعارف آیتوں ہی کو لے لیا جائے تو بھی پرویز صاحب کا یہ نظریہ کہ قرآن کا سمجھنا بہت دشوار ہے، باطل ہو جاتا ہے

(۱) سورۂ نساء کی آیت ہے :-

" افلا یتدبرون القرآن .... یستنبطونہ منھم "

اس آیت میں تدبر فی القرآن اور استنباط دونوں باتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ دونوں باتیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں جب قرآن فہم انسانی سے باہر نہ ہو۔

(۲) سورۂ زخرف میں ارشاد ہوتا ہے :-

" انا جعلنا ہ قرآناً عربیا لعلکم تعقلون "

یعنی قرآن عربی میں نازل کیا گیا ہے جو تمہاری زبان ہے اور جسے تم بہ آسانی سمجھ سکتے ہو۔

(۳) سورۂ شوریٰ کی آیت ہے :-

" اوحینا الیک قرآنا عربیا لتنذر ام القریٰ

یعنی وحی قرآنی عربی میں نازل کی گئی ہے تاکہ تم ام القریٰ کے لوگوں کو متنبہ کر سکو ——— ظاہر ہے کہ اگر قرآن ان کی فہم سے بالاتر ہوتا تو کیوں انھیں یہ ہدایت کی جاتی۔

(۴) سورہ زمر میں صاف صاف ارشاد ہوتا ہے :-

" قرآناً عربیا غیر ذی عوج

یعنی قرآن اور اس کے بیان میں کسی قسم کی کوئی الجھن نہیں پائی جاتی

(۵) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ہے :-

" و ننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمۃ للعالمین "

یعنی کلام پاک میں شفاء روحانی اور برکات خداوندی دونوں مضمر ہیں ——— لیکن اگر ہم قرآن کو عسیر الفہم فرض کر لیں تو ہم ان دونوں باتوں سے محروم رہیں گے۔

(۶) سورۂ نمل میں قرآن کے واضح و روشن ہونے کا ذکر ان

الفاظ میں کیا گیا ہے :-

" تلک آیات القرآن و کتاب مبین "

(۲) ان آیات سے قطع نظر آپ سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کو
لے لیجئے جس کا مفہوم خود پرویز صاحب نے متعین کیا ہے
تو اس سے بھی ان کے دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے

آیت یہ ہے :-

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ، هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

اور اس کا مفہوم پرویز صاحب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ :-

" تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو وہ ہمارے اس ضابطۂ
قوانین کے اندر محفوظ ہے جس میں نہ بے یقینی ہے نہ تذبذب
ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن "

حیرت ہے کہ مقدمۂ کتاب میں تو وہ قرآن کو دشوار و عسیر الفہم ظاہر کرتے ہیں لیکن جب وہ اس کی ایک آیت کا مفہوم ظاہر کرنے پر آجاتے ہیں تو اس میں نہ کسی قسم کی بے یقینی نظر آتی ہے نہ کوئی نفسیاتی الجھن - !

قرآن کا تنہا مقصود اخلاق کی تعلیم دینا ہے اور وہ بھی کسی خاص قوم یا جماعت کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو، اس لئے اسے صد درجہ صاف واضح و روشن ہونا چاہیئے تاکہ ہر شخص اس سے مستفید ہو سکے - لیکن پرویز صاحب کے نزدیک وہ صرف مجموعہ ہے ایسے ناقابل فہم رموز و غوامض کا جسے اکابر علماء بھی نہیں سمجھ سکے چہ جائیکہ عوام ! ہو سکتا ہے کہ پرویز صاحب اسے خدمت قرآن و اسلام سمجھتے ہوں لیکن میری رائے میں اس سے زیادہ نقصان رساں بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ جب غیر مسلم اقوام کی نگاہ سے پرویز صاحب کی یہ تحریر گزرےگی تو قدرتاً ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب قرآن کا سمجھنا خود مسلمانوں کے لئے بھی مشکل ہے تو وہ کیوں بیکار اپنا سر کھپائیں -

اس میں شک نہیں کہ "مفہوم القرآن" میں انھوں نے آیات کا مفہوم ظاہر کرنے میں بڑی وسعت فکر سے کام لیا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے زیادہ غلو سے کام لیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر وہ الٰہیات کی الجھن میں مبتلا ہو جائیں اور اخیر میں وہی کہنے لگیں جو افلاطونیت جدیدہ کے زیر اثر ہمارے صوفیہ کا شعار تھا

رسالہ مفہوم القرآن کے علاوہ جناب پرویز کے دو رسالے اور بھی مجھے دیئے گئے جن میں سے ایک پاکستان کے عائلی قانون سے متعلق ہے ، دوسرا غلاف کعبہ سے اور ان دونوں مسایل کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں سوا اس کے کہ انھوں نے حضرت عائشہ کی تاریخ ازدواج پر جو کچھ لکھا ہے نہ میرے نزدیک صحیح نہیں۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ کی شادی ۱۹ سال کی عمر میں ہوئی جو یقیناً صحیح نہیں لیکن خیر یہ بحث جدا ہے کہ شادی کے وقت ان کی عمر کیا تھی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں مشکوٰۃ کی ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں حالانکہ وہ احادیث سے استناد کے قایل نہیں خیر یہ ایک ضمنی بات تھی اصل مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ عائلی قانون کے سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ صد درجہ قرین عقل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک عائلی قانون کیا دنیا کے اور جتنے تمدنی معاشی اور اقتصادی مسایل شامل ہیں ان سب پر موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیئے اور فقۂ سابق سے بالکل بے نیاز ہو جانا چاہیئے

شائع کیا جا رہا ہے

خدا کیا ہے؟

خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟
مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟

اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟
بندے اور خدا کا کیا تعلق ہے؟
اس تعلق کی تعبیر کس کس انداز میں کی گئی ہے؟
انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟
ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے
اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتر خیال کیا گیا ہے؟

یہ اور اس قسم کے بہت سے اہم سوالات ہیں
جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر با شعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں

لیکن افسوس

کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے.

"نگار" کا "خدا نمبر"

اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مشرح جواب دیا گیا ہے

قیمت :- تین روپے ——— خریدار نگار سے رعایتی قیمت :- دو روپے

مسیح کے مصلوب ہونے اور زندہ رہنے کی دستاویزی شہادت

نیاز فتح پوری

رومی ۸۱۵ سنہ یا عیسوی ۶۲ سنہ کی بات ہے کہ رومہ کے ایک طبیب (اسکولیپس کلیٹلس) نے اپنے بھتیجہ کو جو شام کی رومی افواج سے متعلق تھا ایک خط لکھا:-

میرے عزیز بھتیجے

چند دن ہوئے مجھے ایک مریض کے علاج کے لئے طلب کیا گیا جس کا نام پال تھا۔ یہ یہودی النسل تھا اور رومہ کا شہری، اچھا خاصہ پڑھا لکھا اور تربیت یافتہ انسان تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ کسی مقدمہ کی اپیل کے سلسلہ میں یہاں آیا تھا۔ مجھ سے لوگوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بڑا شوریدہ سر انسان ہے اور حکومت رومہ کا مخالف ہے، لیکن میں نے اسے بڑا سچا اور دیانت دار انسان پایا۔

میرے ایک دوست نے جو ایشائے کوچک میں عساکر رومہ کے ساتھ رہ چکا ہے یہ بھی بتایا کہ اس نے پال کا ذکر افیوس میں بھی سنا تھا جہاں وہ ایک نئے خدا کے ظہور کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنے مریض (پال) سے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ وہ حکومت رومہ کے خلاف کسی نوع حکومت کا قائل ہے" اس نے جواب دیا "میں جس حکومت کی تبلیغ کرتا ہوں اس کا تعلق دنیاوی حکومت سے نہیں ہے اور اس سلسلہ میں اس نے اور بہت سی عجیب وغریب باتیں کیں جو غالباً تپ کی بحرانی کیفیت کا نتیجہ تھیں۔ تاہم میں اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور جب بعد کو میں نے یہ سنا کہ اسے لوگوں نے قتل کر دیا تو

مجھے افسوس ہوا۔

میں یہ خط تمہیں اس غرض سے لکھ رہا ہوں کہ جب تم یروشلم جاؤ تو تحقیق کر کے مجھے اطلاع دو کہ پال کون تھا اور وہ کس یہودی کی پیغمبری کا مبلغ تھا ہماری غلام رعایا میں اس مدعی نبوت مسیح کا بڑا چرچا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کو جو اس نئے پیغمبر کی نئی حکومت سے اظہار دلچسپی رکھتے تھے سولی دے دی گئی۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس افواہ کی کیا حقیقت ہے۔

تمہارا مخلص چچا

اسکولپیس

چھ ہفتہ کے بعد اس کے بھتیجے (گلیڈیس انسا) نے جو رومی فوج متعینہ شام کا کپتان تھا اپنے چچا کو جواب میں لکھا کہ:

میرے مخلص چچا

آپ کا خط مجھے ملا اور اس کی تعمیل میں یہ تحریر آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ دو ہفتے ہوئے کہ ہماری فوج یروشلم آگئی ہے۔ پچھلی ایک صدی میں یہاں اتنے ہنگامے اور انقلابات ہوئے ہیں کہ اس قدیم شہر یروشلم میں اب کچھ نہیں رہ گیا۔

ہم یہاں صرف ایک مہینے کے لئے آئے ہیں۔ اس کے بعد ہماری فوج پیڑا چلی جائے گی۔ جہاں بعض عربی قبائل سرکشی پر آمادہ ہیں۔ بہرحال آج مجھے کچھ فرصت مل گئی ہے اور میں تفصیلی رپورٹ آپ کو بھیج رہا ہوں۔

میں نے اس بارے میں یروشلم کے معمر ترین لوگوں سے گفتگو کی لیکن یقین کے ساتھ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اتفاق سے ایک دن ہمارے کیمپ میں ایک پھیری والا دکاندار آگیا جس سے میں نے کچھ چیزیں خریدیں اور دوران گفتگو میں مسیح کا بھی ذکر آگیا اور میں نے اس سے پوچھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ یہاں کوئی شخص مسیح پیدا ہوا تھا جسے جوانی ہی میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس نے کہا: ہاں مجھے یہ واقعہ یاد ہے۔ کیونکہ میرا باپ مجھے بھی گولگوتھا (شہر سے باہر ایک پہاڑی) لے گیا تھا جہاں حکومت رومہ کے اس دشمن کو سولی دی جانے والی تھی۔ اس بیان کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک زیادہ واقف کار شخص یوسف کا پتہ بتلایا جو مسیح کا دوست تھا اور آج صبح میں اس سے بھی مل آیا۔ یہ بڑا معمر رسیدہ ملاح ہے

اور بڑا اچھا حافظہ رکھتا ہے۔ اس نے جو حالات مجھے بتائے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ جس زمانہ کی یہ بات ہے وہ زمانہ "ٹائبرلیس" کی حکومت کا تھا اور "پانٹیس پلاٹوس" سوبۂ یہودا کا گورنر تھا جو اپنی دیانت و شرافت کے لحاظ بہت مقبول تھا۔ جب ۲۴ء (رومی سال) میں وہ یروشلم کی بغاوت فرو کرنے پر مامور ہوا، تو اسے بتایا گیا کہ ایک نوجوان شخص جو یوسف نجار کا بیٹا ہے، حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات پھیلا رہا ہے لیکن تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہوئی اور اس نوجوان کے خلاف قدم اٹھانے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی لیکن چونکہ اس نوجوان مسیح کی تعلیم سے یہودی مذہب کے تمام بڑے بڑے رہنماؤں کا اقتدار خطرہ میں پڑ گیا تھا اس لئے وہ نئے گورنر کے طرز عمل کے مخالف ہو گئے کیونکہ اس کے نزدیک مسیح نے کوئی بات حکومت روما کے خلاف نہیں کہی تھی اور اس کی سرزنش یا سزا کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔

جب ان لوگوں نے دیکھا کہ گورنر ان کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تو انھوں نے خود قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مسیحی افراد کو پکڑ پکڑ کر ہلاک کرنا شروع کیا۔ لیکن گورنر نے مسیح کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور ایک محبس میں بند کر دیا۔ جب مخالفین مسیح کا اصرار بڑھا اور مسیح کے قتل کا مطالبہ شدید ہو گیا تو گورنر نے سب کو یکجا کر کے پوچھا کہ مسیح کے خلاف الزام کیا ہیں؟ انھوں نے کہا کہ وہ حکومت کا باغی ہے اور اس کی تعلیمات موسوی مذہب کے منافی ہیں۔ مسیح نے اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ میں حکومت کا مخالف نہیں ہوں اور نہ مجھے اس کی سیاست سے کوئی تعلق۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ

"صرف آسمانی خدا کی پرستش کرو اور اپنے پڑوسیوں سے محبت کے ساتھ پیش آؤ"

گورنر چونکہ فلسفۂ یونان کا متبع تھا اور ظواہر مذہب کا قائل نہ تھا اس لئے اس نے مسیح کی تعلیم میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں پائی اور اس نے قتل مسیح کے مطالبہ کو رد کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کا ہیجان تیز تر ہو گیا اور انھوں نے حکومت سے شکایت کی کہ گورنر مسیح کا طرفدار ہو گیا ہے اور یروشلم کے ہنگامے بڑھنے لگے آخر کار گورنر کو بدامنی دور کرنے کی غرض سے یہودیوں کا مطالبہ پورا کرنا پڑا اور مسیح کو سولی دے دی گئی

تھا بیان یوسف کا مسیح کے انجام کے متعلق۔ پال کے بابت اس نے کہا کہ وہ ایک خیمہ دوز تھا جو مسیح کی تعلیم سے متاثر

ہو کر اس کی تبلیغ کیا کرتا تھا اور یہودی اس کے دشمن ہو گئے تھے۔

آپ کا وفا شعار بھتیجہ
گلاڈلیس

ان خطوط سے مسیح کا مصلوب ہونا تو ثابت ہوتا ہے لیکن ہلاک ہونا نہیں کیونکہ صلیب دینے کے بعد کئی کئی دن تک انسان زندہ رہتا تھا اور مسیح کو ہلاکت سے قبل ہی ان کے حواریوں نے (غالباً گورنر کے اشارہ سے) صلیب سے جدا کر کے کسی غار میں چھپا دیا تھا جہاں سے وہ بعد کو مع اپنی والدہ کے مشرق کی طرف چلدیئے اور ایک شاداب قطعہ زمین میں پہونچ گئے جسکی تصدیق کلام مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

وجعلنا ابن مریم وامہ آیۃ وآوینا ھما الی ربوۃ
ذات قرار ومعین

علاوہ اس کے وادی قمران (ساحل بحر مردہ) میں جو کتبات DEAD SEA SCROLLS حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں ان سے بھی مسیح کے زندہ رہنے کی تصدیق ہوتی ہے۔

میر تجلّی

اور

مثنوی لیلےٰ مجنوں

سید محمد فاروق شاہپوری

بزرگوں کی متروکہ کتابوں میں ایک قلمی نسخہ میر تجلّی دہلوی کی مثنوی "لیلےٰ مجنوں" کا دستیاب ہوا ہے۔ حیرت بالائے حیرت ہے کہ اس بے بہا گوہر پر اس سے پہلے نظر نہ پڑی۔ یہ مثنوی ایک یادگار چیز ہے جس کا ذکر تذکروں میں نگاہ سے گزرا تھا لیکن آجتک اس کا وجود غیر یقینی اور مبہم رہا خیال گذرا کہ شاید اس سے پہلے یہ کہیں چھپ چکی ہو لیکن جس قدر بھی تفتیش کی گئی نتیجہ یہی نکلا کہ اس کا وجود ناپید ہے۔ اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ درحقیقت ادبی اور تاریخی اعتبار سے یہ چیز آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے۔

میر تجلّی جو اس مثنوی کے مصنف ہیں معروف شخصیت کے حامل تھے۔ دہلی میں بیگم کے باغ واقعہ چاندنی چوک میں گھر تھا اور غالب کی طرح پیشہ سپاہ گری رکھتے تھے۔ ان کے والد میر محمد حسین کلیم شاہجہان آبادی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ یہ میر تقی میر کے بہنوئی تھے۔ اس طرح تجلّی میر صاحب کے بھانجے ہوئے۔ مصحفی اپنے "تذکرہ ہندی" میں کلیم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

> " محمد حسین کلیم والد میاں حاجی صاحب تصنیفِ بسیار است
> چنانچہ ترجمہ فصوص الحکم و دہ مجلس ہندی بہ سلک نظم کشیدہ "

کہتے ہیں کہ قائم نے اپنے تذکرے میں ان کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔

تجلّی کی[1] عرفیت "میاں حاجی" تھی لیکن نام کے اوپر تذکرہ نویسوں کا اختلاف ہے۔ بعض محمد حسن ولد محمد حسین اور بعض محمد حسین ولد محمد حسن کہتے ہیں۔ میرزا علی لطف نے انھیں بجائے میر شیخ لکھا ہے۔ مصحفی سے ان کی ذاتی ملاقات تھی لیکن وہ صرف عرفیت (میاں حاجی) سے کام لیتے ہیں۔ میر قدرت اللہ قاسم نے اپنے "مجموعۂ نغز" میں تین جگہ تجلّی کا نام لیا ہے اور تینوں جگہ ان کو "میر محمد حسن" لکھا ہے۔ متاخرین میں صاحب خم خانۂ جاوید (لالہ سری رام دہلوی) نے جن کو دہلی میں تحقیق کے اچھے مواقع حاصل تھے، ان کا ذکر میر حسین عرف میر حاجی پسر میر حسن کلیم کے نام سے کیا ہے۔ یہ زیادہ قرین صحت معلوم

---

[1] تجلّی کے نام وغیرہ کی تحقیق کے سلسلے میں جو قیمتی معلومات ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے حاصل ہوئی اس کا اعتراف دلی شکریہ کے ساتھ کیا جاتا ہے (ف)

ہوتا ہے جس کا ثبوت خود تجلی کے قلم سے بھی ملتا ہے۔ ان کا شعر ہے :-

زبانِ عرب میں وہ آشفتہ حال
پکارا مجھے یا حسینی تعال

یہ شعر اس مقام کا ہے جہاں وہ لیلیٰ اور مجنوں کو خواب میں دیکھتے ہیں اور مجنوں انھیں بلا کر اپنی سرگزشت زبان ہندی میں قلمبند کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔ حسینی، میر حسین یا محمد حسین کا مخفف تو ہو سکتا ہے لیکن محسن سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ بہر حال یہ اختلافات معمولی ہیں۔ محمد حسین، محمد حسن، محمد محسن یہ سب نام ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ پڑھنے لکھنے میں غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

تجلی کا شمار اپنے وقت کے بہترین شعراء میں سے تھا۔ شاعروں کے تذکرے ان کے ذکر سے خالی نہیں اور تمام تذکروں میں ان کی شاعری کو سراہا گیا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں :-

"میاں حاجی ولد میر محمد حسین کلیم جولانے است در فنِ ریختہ بے نظیر"

ان کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں :-

"کہ بر زبانِ شایقانِ زمان در شاہجہان آباد جاری است"

مصحفی اور لالہ سری رام نے ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں :-

کئی دن سے روٹھ گئے ہیں وہ نہ پیام ہے نہ سلام ہے
جو یہی طرح رہی ہم نشیں تو ہمارا کام تمام ہے

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھ پسِ مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

یہ تارِ دم ہے صورت بازکا رشتہ کہ بہر صورت
چلے جاتے ہیں پردے میں اسے تا جا جب کھینچا

عشق میں کرتے ہیں بدنام تجلی کو عبث
وہ بچارا کبھی اس کوچے میں آیا نہ گیا

لالہ سری رام ان کو میر کا شاگرد بتاتے ہیں جس کو خدائے سخن میر سے دو دو نسبتیں حاصل ہوں اس کی قدر و منزلت کا کیا کہنا۔ مصحفی فرماتے ہیں :-

"دیوان ضخیم ترتیب دادہ"

لیکن وہ دیوان آج کہاں ہے کہ اہلِ ذوق عقیدت کے ہاتھوں اسے سر پر رکھیں۔ اللہ اللہ کیا کیا گراں بہا خزانے

...نے کی دستبرد سے تلف ہوگئے۔ بزرگوں کی علم دوستی کا صدقہ کہ مثنوی ضائع ہونے سے محفوظ ہے۔ اگر انجمن ترقی اردو ...ی اور ادارہ متوجہ ہو تو اس گراں پایہ ادبی شاہکار کو زندگی دوام حاصل ہو سکتی ہے۔

مثنوی "لیلے مجنوں" تجلی کی مستقل یادگار اور ان کا بیش قیمت سرمایۂ حیات ہے۔ میرے قلمی نسخے میں اس کا نام ...دمہ لیلے مجنوں" اور "حکایت لیلے مجنوں تصنیف میر تجلی" لکھا ہے۔ اس جگہ ایک ضمنی بحث آجاتی ہے کہ اس کے ...نف میر حسین تجلی خواہر زادۂ میر تقی میر ہیں یا کوئی اور تجلی۔ بہر صورت مثنوی "لیلے مجنوں" کو ہر تذکرہ نگار نے ان کی ...یف بتایا ہے۔ قطب الدین باطن اکبرآبادی کو اس سے ضرور اختلاف ہے اور وہ "لیلے مجنوں" کو غلام علی تجلی سے ...دب کرتا ہے اور ان کے یہ دو شعر بھی نقل کئے ہیں۔

تجھے بھیج مکتب میں پچھتائے ہم ترے لکھنے پڑھنے سے باز آئے ہم
تجلی دل آزاریٔ عشق دیکھ بہارِ جفا کاریٔ عشق دیکھ

یہ دونوں شعر بعض تبدیلیوں کے ساتھ اس قلمی نسخے میں موجود ہیں۔ لیکن باطن کی تحقیقات اہل نظر کے سامنے ...ہ مستند نہیں۔ اس کا تذکرہ "گلستانِ بے خزاں"، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے "گلشنِ بے خار" کے جواب میں لکھا گیا ...جس میں شیفتہ اور دوسرے نامور شعرا کو بہت کچھ برا بھلا کہا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی دائرۂ امکان سے ...ج نہیں کہ کوئی غلام علی تجلی گزرا ہو لیکن یہ نام باطن کے تذکرے کے سوا اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس کی غیر معروف ...یت کے خلاف تمام تذکرہ نویس جہاں میر حسین تجلی کا نام لیتے ہیں وہاں ان کی مثنوی "لیلے مجنوں" کا ذکر ضرور کرتے ...۔ اس جگہ اس کم سواد کی رائے میں خود مثنوی کا ایک شعر

زباں پہ رہے وردِ نامِ علی
لقب میرا ٹھہرے غلامِ علی

...تی کو سلجھا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ باطن کو بظاہر پوری مثنوی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اِدھر اُدھر سے سن کر اوپر ...و شعر نقل کر دیئے۔ یہ تیسرا شعر بھی گوش گزار ہوا ہوگا اور اس نے نتیجہ نکالا ہوگا کہ شاعر کا نام یا لقب "غلام علی" ...۔ یہ چیز بعید از قیاس نہیں۔ بہرکیف اس لحاظ سے کہ اس مثنوی کے علاوہ کسی اور مثنوی "لیلے مجنوں" کا جو تجلی نام ...ر کی تصنیف ہو اردو لٹریچر میں پتہ نہیں چلتا اور یہ مسلمہ امر ہے کہ میر حسین تجلی نے اس نام سے ایک مثنوی لکھی تھی یہ ...پڑے گا کہ یہی اس مثنوی کے مصنف ہیں۔

یہ مثنوی "لیلے مجنوں" ایک ضخیم تصنیف ہے جو پندرہ سطری مسطر کے ۱۴۱ سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے درمیان ...خر کے دو ایک صفحے ضائع ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب اپنی جگہ پر مکمل ہے اور ضائع شدہ صفحات کے نہ ہونے سے ...خاص کمی نہیں محسوس ہوتی۔ پرانے قسم کے دبیز کاغذ پر نہایت صاف اور پاکیزہ خط میں لکھی گئی ہے۔ مطالب ...ماخذ سے یہ منظوم مصنف کی پُرگوئی، سخن کی مشاقی اور پختہ کلامی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ لیلے مجنوں کا افسانہ اور ...ے متعلقات اس درجہ مشہور اور زبان زدِ عام ہیں کہ یہ داستان ایک فرسودہ کہانی ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اسی جگہ ...ر کا کمال نظر آتا ہے کہ وہ واقعات پر رنگ و روغن چڑھا کر انھیں جاذب نظر بنا دیتا ہے۔ اس کوشش میں تجلی پورے ...ر کامیاب نظر آتے ہیں اور انھوں نے یہ مثنوی لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

مثنوی کا خلاصہ یہ ہے۔ حمد، نعت، منقبت اور تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ عرب کا ایک بادشاہ تھا جس کے اولاد نہ ہوتی تھی، کعبہ شریف میں دعا کرنے کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکا قیس پیدا ہوتا ہے۔ اپنے وقت پر اس کو مکتب میں بٹھایا جاتا ہے جہاں لیلیٰ بھی پڑھنے جاتی تھی، دونوں میں محبت کی بنیاد پڑتی ہے جس کا چرچا ہوتا ہے لیلیٰ مکتب سے اٹھا لی جاتی ہے، اس کے فراق میں قیس کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ یہ فقیر کے بھیس میں جا کر لیلیٰ سے ملتا ہے۔ یہ راز بھی کھل جاتا ہے، اور ملاقات کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں، باپ پند و نصائح سے کام لیتا ہے لیکن سب بے اثر، فرطِ دیوانگی میں وہ جنگل کی راہ لیتا ہے اور قیس سے مجنوں بن جاتا ہے۔ مجنوں کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کے قوم کے سربرآوردہ لوگ لیلیٰ کے باپ کے پاس وفد لے کر جاتے ہیں اور اس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ مجنوں کو اپنی فرزندی میں قبول کرے لیکن یہ التجا منظور نہیں ہوتی۔ لیلیٰ کا عقد ابن السلام کے لڑکے سے ہو جاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتی اور آخر کار علیحدگی ہو جاتی ہے۔ مجنوں شادی کی خبر سن کر لیلیٰ کو شکایت آمیز خط لکھتا ہے لیلیٰ جواب میں اپنی حقیقی محبت کا اطمینان دلاتی ہے۔ مجنوں کے لئے فقیر فقرا سے دعا کرائی جاتی ہے، اطباء کا علاج ہوتا ہے۔ مجنوں کو نشتر دیا جاتا ہے تو اس طرف لیلیٰ کے ہاتھوں سے خون جاری ہو جاتا ہے، بادشاہ نوفل کا گزر ہوتا ہے وہ مجنوں کو جنگل سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور لیلیٰ کے باپ کو مجنوں کی طرف سے پیام دیتا ہے لیکن اس کی درخواست بھی مسترد ہوتی ہے۔ نوفل فوج کشی کر کے اسے شکست دیتا ہے لیکن لیلیٰ کے حسن و جمال پر وہ خود فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اشارہ سے مجنوں کے لئے ایک جام زہر آلود تیار کیا جاتا ہے کہ اس کو ختم کر کے لیلیٰ پر قبضہ کیا جائے لیکن غلطی سے زہر کا پیالہ خود نوفل کو پلا دیا جاتا ہے اور وہ تمام ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ اپنے باپ کے پاس جا پہونچتی ہے اور حضرت مجنوں بدستور جنگل باسی ہو جاتے ہیں۔ اتفاقاً لیلیٰ کا ناقہ راہ گم کر کے ادھر آ نکلتا ہے اور اس طرح دونوں فراق زدہ آپس میں مل لیتے ہیں۔ مجنوں ایک شتر سوار کی وساطت سے لیلیٰ کے شہر جا پہونچتا ہے لیلیٰ کو لب بام پاتا ہے اور گفتگو ہوتی ہے۔ لیلیٰ کا بھائی اس پر حملہ آور ہوتا ہے لیکن اس کے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔ لیلیٰ خواب میں مجنوں کا جنازہ دیکھتی ہے، صدمے سے بیمار ہو کر بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔ وصیت کے مطابق دایہ مجنوں کو خبر پہونچاتی ہے۔ وہ لیلیٰ کے مزار پر آتا ہے۔ مزار شق ہو جاتا ہے اور مجنوں اس میں سما جاتا ہے۔

یہ ہے مرقع نجد کے قبیلۂ عامر کے ایک سردار ملوح بن مزاحم کے صاحبزادے قیس مجنوں کا، جس کو تجلی کے موشگاف قلم نے شاعرانہ رنگینیوں کے ساتھ تیار کیا ہے اس پلاٹ کے قائم کرنے میں بعض تغیرات سے قطع نظر، مولینا نظامی اور حضرت امیر خسرو کا تتبع کیا گیا ہے۔ ان تمام و کمال واقعات کا ثبوت پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے لیکن وہ ان دونوں کے وجود سے قطعی طور پر منکر بھی نہیں ہے [۱] پھر یہ حالات ذہنی ہی سہی لیکن "لیلےٰ مجنوں" کی داستان کے مقبول عام ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ عربی لٹریچر ان کے ذکر سے مملو ہے۔ فارسی میں مولینا نظامی گنجوی، ملا ہاتفی ہروی، ملا مکتبی

---

[۱] لیلیٰ اور مجنوں دونوں بنی عامر کے چشم و چراغ تھے ان کے عشق و محبت کا فسانہ بھی صحیح ہے اور مجنوں کی دشت نوردی بھی مسلم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا۔ اس کا ایک دیوان بھی چھپ گیا ہے جو معبرین کے نزدیک والہانہ جذبات کا مجموعہ ہے۔ لیلیٰ کا انتقال پہلے ہوا۔ اس کی شادی ہو گئی تھی لیکن مجنوں کے ساتھ اس کی محبت صادق تھی۔ اسی غم میں گھل گھل کر ختم ہوئی۔

اور حضرت امیر خسرو دہلوی نے اس کے منظومے تیار کئے اور اُن کے اندر معرفت و اخلاق کے وہ دُرّ بے بہا اکٹھا کئے جنھیں اہلِ دل نے آویزۂ گوش بنایا۔ اسی کی بدولت اسالیب بیان، محاورات، تماثیل اور تلمیحات کے نئے نئے راستے کھلے جن سے علم و ادب مالا مال ہوا۔ غور کیجئے کہ ایک طرف مولینائے روم خدا شناسی کی تعلیم دیتے ہیں تو عکسِ رخسارِ من کی جلوہ ریزیاں حسنِ لیلےٰ سے پیدا کی جاتی ہیں۔

عشقِ لیلےٰ نیست ایں کارِ من است
حُسنِ لیلےٰ عکسِ رخسارِ من است

تو دوسری طرف اس صدی کے نباض شاعر اکبر کو اپنے مخصوص ظریفانہ پیرائے میں تعلیم جدید کی تلقین کی ضرورت ہوتی ہے تو "مادرِ لیلےٰ" کی زبان سے کام لیا جاتا ہے اور برداشتہ خاطر نوجوانوں کی پست ہمتی دکھلانے میں مجنوں کو مثالی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر کرلے مڈل پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلےٰ کو تجھ سے　　بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی　　مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
کہاں یہ فطرتی جوشِ طبیعت　　کہاں ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے　　ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

اگر ٹھہری یہ شرطِ وصلِ لیلےٰ
تو استعفےٰ مرا با حسرت و یاس

اگرچہ مجنوں بجائے خود کم حوصلہ نہ تھا۔ وہ اپنے میدان کا مردِ تھا۔ لیلےٰ کی محبت میں اس نے اپنی جانِ عزیز کی بازی لگا دی اور اسی دھن میں دنیا سے نامراد گیا۔

تجلی کی یہ مثنوی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے سودا اور میر کے عہد کا نمونہ ہے۔ متروک الفاظ اور ترکیبیں جو اس زمانے میں مستعمل تھیں اس میں ضرور موجود ہیں مثلاً تئیں، نپٹ، نت، ٹک وغیرہ اسی طرح بعض مقامات پر فارسیت کا رنگ غالب آگیا ہے جو موجودہ مذاق کے لئے غیر مطبوع ہوگا لیکن مجموعی حیثیت سے طرزِ بیان سلجھا ہوا ہے اور زبان صاف اور رواں ہے مستثنیات کو چھوڑ کر خود فارسی ترکیبیں بھی اپنی جگہ پر کچھ کم دل آویز اور معنی خیز نہیں ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

پیر آزمودہ کار کی تعریف میں:۔
لگا کہنے اے رہبرِ راہِ عشق　　برآرندۂ غرقۂ چاہِ عشق
طبیب کی تعریف میں:۔
طبیبِ شفابخشِ آزارِ عشق　　کشایندۂ مشکلِ کارِ عشق
مجنوں کے احباب کی کیفیت:۔
ولے سب تھے ناواقفِ کارِ عشق　　ستم گارِ دل، ناخبردارِ عشق

لیلیٰ کی تعریف میں

کہ وہ سروِ نوخیزِ بستانِ حسن　　گلِ رنگ بخشِ گلستانِ حسن

مجنوں کی تجویز کردہ "معجونِ دیدار" کے خصوصی اثرات :-

شفا بخشِ بیماریٔ جاں ہے یہ　　دلِ دردمنزل کا درماں ہے یہ

"دردمنزل" کی ترکیب کتنی اچھوتی اور کس قدر بھلی ہے۔ ایک جگہ رات کو "سویدائے دل ہائے اہلِ حضور" کیا خوب کہا ہے :-

نہ شب، بلکہ تھی مردمِ چشمِ نور　　سویدائے دل ہائے اہلِ حضور

قلم کی صفت میں کتنا صحیح کہا ہے :-

صفت جس کی کہتے ہیں دل تفتگاں　　دریدہ دہاں و بریدہ زباں

ایک دوسری جگہ قلم کو "زباں کا گدا" کہا ہے جو معنی خیز ہے۔

شاعر کو اپنے قلم پر پورا پورا قابو حاصل تھا۔ تمام مناظر غیر معمولی صراحت اور وضاحت سے سامنے لائے گئے ہیں جس واقع کو قلم بند کیا ہے اس پر ہر پہلو سے نظر ڈالی ہے اور بے تکان کہتے چلے گئے ہیں۔ یہ شاعر کی قدرتِ کلام کی دلیل ہے۔ ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا :-

تری رہ کا پامال ہوں اسقدر　　کہ سرمہ کریں جس سے اہلِ بصر

غمِ عشق کی تیری کاہش رہے　　سوا تیری خواہش نہ خواہش رہے

گزارندۂ جرمِ آدم ہے تو　　برآرندۂ کارِ عالم ہے تو

نعت :-

شفیعِ قیامت بلاغِ المبیں　　رسولِ خدا رحمت العالمیں

شہِ دوجہاں مخزنِ التفات　　وقیع المکاں اشرفِ کائنات

طبیبِ شفا بخشِ آزارِ جرم　　رہانندۂ ہر گرفتارِ جرم

بیت اللہ شریف میں مجنوں کا باپ دعا مانگتا ہے۔ اس کی قبولیت کا اعلان ہاتفِ غیب سے سنیئے:

کہ اتنے دنوں تو ہی بھٹکا پھرا　　نہ آیا ادھر اور ہر جا پھرا

وگرنہ یہ وہ در نہیں جس سے یار　　کوئی پھر گیا ہوئے امیدوار

جو کچھ تو نے چاہا وہ ہم نے دیا　　پسر یعنی تجھ کو عنایت کیا

مجنوں عشق بازی کا چسکا اپنی پیدائش کے ساتھ لایا تھا۔ رات دن گریہ وزاری کرتا اور کسی تدبیر سے نہ بہلتا لیکن جہاں کوئی اچھی صورت سامنے آجاتی تو اس کے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی۔ عمر کے ساتھ یہ جذبہ بھی ترقی کرتا گیا۔ اس وقت کی کیفیت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی ہے :-

حکایاتِ عشق اس کو اچھی لگے　　محبت ہی کی بات میں جی لگے

دلِ آرزومند، ماوائے شوق سر شورش افزائے سودائے شوق

مکتب میں لیلیٰ سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس جگہ لیلیٰ کا سراپا دیا گیا ہے "مقیاس الشباب" کی تشبیہ سرو کے بیں سے جدت نہ سہی لیکن نارنگیوں کو ہم چشمی کے دعوے پر جو سزا دی گئی ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں:۔

کہا ہوکے نارنگیوں نے بہم ہم ان سے ہیں کیا رنگ و روغن میں کم
وہ دعوے انھیں عاقبت کھا گیا گئیں جس جگہ پوست کھینچا گیا

اس کے حسن کی مجموعی طور پر جو تعریف کی ہے وہ نہایت بلیغ ہے۔

لگا ناخنِ پا سے تا موئے سر پڑے حسن پر جس جگہ پر نظر
نظر وہ دہیں کی رہے ہوکے محو تماشا کرے اور جا کہ کا سہو

راز و نیاز عشق کا واقعہ جب لیلیٰ کی ماں تک پہونچتا ہے تو وہ قدرتی طور پر بہت برہم ہوتی ہے اور لیلیٰ کو آڑے ہاتھوں لیتی ہے:۔

جب اس زن نے اس ماجرے کو سُنا رکھ انگشت دانتوں تلے سر دُھنا
غضب سے لگی ڈالنے سر پہ خاک دیا پھینک معجر، کیا جیب چاک
بلایا اُسے غصہ و قہر سے کہا دیکھ چشمانِ پر زہر سے
سُنا ہے کہ مکتب میں اک نوجواں طرحدار خوش خلق و صاحب زباں
ترے دام زلفوں کا نخچیر ہے گرفتار ہے پا بہ زنجیر ہے
بھلی کیا ہے اے دشمنِ جاں یہ بات کسی سے ہوئی تھی ترے تاں یہ بات
ترے پڑھنے لکھنے سے باز آئے ہم بہت بھیج مکتب میں پچتائے ہم

اس کے بعد ایک طرف لیلیٰ:۔

ہوئی وہ ستم کش جدا یار سے بڑا کام اندوہِ بسیار سے
کئی دن میں تن ہوگیا زار سا فسردہ سا، پژمردہ، بیمار سا

دوسری طرف:۔

فراموش کئے قیس نے سب نشاط کسی سے نہ اس کو رہا ارتباط
یہ رو رو کے کہتا تھا اے رشکِ حور محبت میں کیا ایسا دیکھا قصور
مجھے کچھ بن آتا نہیں، کیا کروں جیوں تیرے ہجروں میں یا اب مروں
یہ کہتا تھا اور مارتا ہوکے تنگ کبھو سر پہ سنگ اور کبھو سر بہ سنگ

مجنوں کی حالتِ زار کا نقشہ (پہلا شعر سہل ممتنع کی ایک اچھی مثال ہے)

تنِ زار میں غیرِ جاں کچھ نہ تھا سوا پوست اور استخواں کچھ نہ تھا

* دوپٹہ۔ اوڑھنی

رگیں خشک گردن کی تھیں آشکار — نحافت میں جیسے گریباں کے تار
تن اس کا جو وہ ناز پرورد تھا — تپِ غم سے پژمردہ تھا، زرد تھا

باپ کی فہمائیش :-

گئی عمر سب آرزو میں تری — ہوا پیر میں جستجو میں تری
یہ جانا تھا میں نے کہ جب ہونگا پیر — تو فرزند ہوگا جواں دستگیر
سو اب تجھ کو لیلیٰ نے مجنوں کیا — زخود رفتہ رسواؤ مفتوں کیا
ابھی ہے مری جان تو خورد سال — نہیں ماہرویوں کی دیکھی ہے چال
عجب طرح کے دشمنِ جان ہیں — کہ لیتے ہیں جان اور انجان ہیں

عشق بازوں کی قسم، مجنوں کی زبان سے (آخری شعر کا دوسرا مصرعہ کس قدر بدیع ہے):-

قسم اس عذارِ دل افروز کی — اور اُن کے غمِ عشق کے سوز کی
قسم اس کے محراب و مسجد کی ہے — کہ مردم ہیں جس کے تلے مست ہے
قسم ناز کی آنکھوں میں جو کھپے — قسم اس ادا کی جو دل میں چھپے
قسم چشمِ گریاں کی اپنی کہ جو — رکھے ہیں مری عشق میں آبرو
قسم اشک کی جس کو چشمانِ تر — جو چھوڑیں تو مژگاں کریں تلملا سر

فراقِ لیلیٰ میں مجنوں کا خدا سے بے تابانہ خطاب :-

کہے یوں کہ اللہ کیا جور ہے — عجب طرح ہے اور عجب طور ہے
خدائی میں کیا تیرے آتا قصور — یہ مجنوں جو لیلیٰ سے ہوتا نہ دُور

درویش "عجیب الدعوات" کی خدمت میں پہونچ کر مجنوں کیا مدعا بیان کرتا ہے۔

لگا کہنے مجنوں کہ مجنوں ہوں میں — جنونِ محبت کا مفتوں ہوں میں
دلِ زار وابستۂ عشق ہے — یہ تفتہ جگر خستۂ عشق ہے
تو سر لائے اپنا سوئے سجدہ گاہ — خدا سے دعا میرے حق میں یہ چاہ
الم یار کا ایک دم کم نہ ہو — یہ جس دم نہ ہوئے وہ دم اس دم نہ ہو

پسرابن السلام کے ساتھ لیلیٰ اپنی مرضی کے خلاف بیاہ دی جاتی ہے۔ یہ سن کر مجنوں لیلیٰ کو شکایت آمیز خط لکھتا ہے :-

ترے عشق نے مجھ پہ کیا کیا کیا — گرفتار و بدنام و رسوا کیا
زبانِ خلائق کا مطعوں ہوا — کہ تھا نام قیس، آہ مجنوں ہوا
یہ برعکس کیا ہے ستم جو ہوا — تیرا آئینہ غیر کا رو ہوا
وہ وعدے مری جان کیا ہو گئے — ترے عہد و پیمان کیا ہو گئے
وہی تو ہے لیلیٰ وہی قیس میں — بھلا کیا ہوا پھر گئی اب جو تیں

لیکن آخر میں کہتا ہے :-

مری جاں شکایت کا پایاں نہیں ولیکن محبت میں شایاں نہیں

لیلیٰ کا جواب :-

یہ باتیں کہیں جس نے تجھ سے وہاں یہ سب کذب ہیں جان اے میری جاں
امانت ہے تیری امانت ہنوز نہیں کی کسو نے خیانت ہنوز
رطب ہے سلامت ترے باغ کی نہیں پہونچی منقار واں زاغ کی
مرے لب دہن تجھ کو شکر رہیں لب غیر کے حق میں اخگر رہیں

اپنی بے لبسی اور بے کسی کا حال بھی کہتی ہے ۔

تو جنگل میں، میں گھر میں اے یار ہوں تو آزاد ہے میں گرفتار ہوں
میں تنہا بھی رہتی ہوں غم سے خموش کہ کہتے ہیں دیوار کے بھی ہیں گوش
پر اے عاشق پاک پاکیزہ خُو خدا نے رکھی عشق کی آبرو
خس طعن آتش پہ میری نہ ڈال ذرا رحم کر اور سمجھ میرا حال

لیلیٰ و مجنوں کی خط و کتابت کا ایک ٹکڑا اور اس واقعے سے متعلق ہے کہ مجنوں کی فصد کھولی جاتی ہے اور لیلیٰ کی انگلیوں سے خون کے فوارے جاری ہوتے ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ لیلیٰ کو بدگمانی ہوتی ہے کہ صحت یاب ہو کر مجنوں کی نگاہیں اس سے پھر گئیں تو وہ کسی طرف کی نہ رہے گی ۔ کتنا اچھوتا خیال ہے وہ مجنوں کے نام نامۂ محبت لکھ کر کبوتر کے حوالے کرتی ہے اور دیکھئے وہ اپنے نامہ رساں کو کس طرح پرچاتی ہے اور مجنوں کی نشان دہی کرتی ہے ۔

کہ سنتا ہے اے پیک اہلِ وفا تو ہُدہُد ہے بلقیس کے ہے سوا
نہیں گو کہ ہدہد نمط تجھ کو تاج ترے سر کو میں تاجِ زر دوں گی آج
کہ میرا جو ہے وہ سلیماں شکوہ ہے اب تخت گاہ جس کی صحرا و کوہ
غبار دل، آیات لشکر جسے حزیں نالہ، رایات لشکر جسے
مرا نامہ جا کر اسے دیجیو جواب اس کا جو کچھ کہ دے لیجیو

حرف مطلب یوں ادا ہوتا ہے رچوتھا شعر " من تو شدم تو من شدی " کی کھلی ہوئی تفسیر ہے:

یہ صحت مبارک ہوا تو نے بھلا کیا فصد سے خون فاسد جُدا
پر اس فصد سے یہ ارادہ نہ ہو جنون محبت کو دل سے دھو
مجھے اپنے دل سے بھلانا نہیں کہ اب کوئی میرا ٹھکانا نہیں
نہیں آب و گوہر کے مانند فرق تو ہے مجھ میں غرق اور میں تجھ میں غرق
الٰہی وہ گل ہے جو رشکِ بہار اگرچہ لبِ ہر خزاں سے بے خزار
رہوں گلشن دہر میں جب تلک اسی گل کی بلبل رہوں تب تلک

مجنوں کی طرف سے جو جواب ہونا چاہئیے اس کا اندازہ دشوار نہیں۔
بزم کی رنگینیاں دیکھ چکے اب رزم کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ نوفل مجنوں کی طرف سے لیلیٰ کے یہاں پیام بھیجتا ہے جس کو رد کر دیا جاتا ہے نوفل کی فوج کشی اور جنگ کی حالت بیان کرتے ہیں:-

دلیرانِ پیکار و مردانِ چست ۔۔۔ سلاح اپنی کرنے لگے سب درست
کٹی رات کو اندیشہ و فکر میں ۔۔۔ اسی دغدغے اور اسی ذکر میں
کہ کل دیکھئے کیا پڑے طرح جنگ ۔۔۔ کرے کس کے اوپر فلک عرصہ تنگ
سحر گہ کہ خورشید تابانِ تیغ ۔۔۔ دھری سان پر چرخ کی بے دریغ
نقیبوں نے فریاد کی ایک بار ۔۔۔ کہ تیار ہو اے جوانانِ کار
دلیرانِ جنگ آزمایانِ چست ۔۔۔ صفیں باندھ ہوئے ایستادہ درست
نقیبانِ میداں پکارے دو سُو ۔۔۔ کہ اے شیر مردانِ پیکار جُو
یہی وقت ہے ترک تازی کرو ۔۔۔ سرِ خونِ دشمن سے بازی کرو

اب گھمسان کی لڑائی ہونے لگی:-

ہوا دمبدم عرصۂ حرب تنگ ۔۔۔ بگڑنے لگا رنگ میدانِ جنگ
گئے اس طرح دونوں انبوہ مل ۔۔۔ کہے تو گیا کوہ سے کوہ مل
یہ آفت جو دیکھی تو خورشید کانپ ۔۔۔ چلا چادر گرد میں منہ کو ڈھانپ
ہوئے گرم کہیں گرز و تیغ و کمند ۔۔۔ بگیر و بزن کی صدا تھی بلند
زبس تیغ پر تیغ پڑتی تھی واں ۔۔۔ سناں سے رگڑتی تھی سینہ سناں

مجنوں کی آخری ملاقات لیلیٰ سے وہ تھی جب وہ ایک ناقہ سوار کیساتھ لیلیٰ کے شہر میں پہونچتا ہے اور اسے دیکھکر لیلیٰ اردان کرتی ہے

کہ گھر تک مرے تجھ سا مہمان آئے ۔۔۔ اور آ بیٹھنے کو بھی جاگہ نہ پائے
مجھے ننگ اس زندگانی سے ہے ۔۔۔ کہ خجلت تری میہمانی سے ہے

مجنوں کے لئے لیلیٰ کی ملاقات ہی ہزار مہمانی کے برابر تھی:-

ترے دل میں مجھ کو جگہ ہے اگر ۔۔۔ تو درکار کب ہے یہ ظاہر کا گھر
میں سب چیز سے سیر اے یار تھا ۔۔۔ مگر گرسنہ ایک دیدار تھا
سو شکرِ خدا وہ میسّر ہوا ۔۔۔ زیادہ ہے مہمانی اب اس سے کیا

ان حسرت نصیبوں کے حسرت ناک انجام پر کہانی ختم ہوتی ہے جس طرح عاشقوں کی فہرست میں مجنوں اور لیلیٰ کا نام اجاگر ہے اسی طرح ان کے سیرت نگار کا یہ کارنامہ بھی حیات جاوید پانے کا مستحق ہے تقی کا یہ کمالِ فن تھا کہ ایک افسانہ آپ کی نظروں کے سامنے واقعہ بن کر آتا ہے اور لیلیٰ مجنوں اپنے حقیقی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔

خموشی اے تقی، آتش بجاں ۔۔۔ زمانہ ہے آتش کا تیری زباں
تجھے گلشن دہر میں اے حبیب ۔۔۔ طا پھر بتا کون سا عندلیب
کہ تو بے نوا خوش نوا ہو گیا ۔۔۔ ہزاروں کا داستاں سرا ہو گیا

قرۃ العین ـــ زرّین تاج

بابی تحریک کی میرا بائی

نیاز فتحپوری

ایران کی بابی تحریک بڑی مشہور چیز ہے اور اب بھی ہندوستان، یوروپ، امریکہ میں کہیں کہیں اس کے آثار ملتے ہیں۔
اس تحریک کی تاریخ ایثار و قربانی کی عجیب و غریب داستان ہے جس کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس تحریک کی تاریخ کا زرّین حصہ "قرۃ العین" سے تعلق رکھتا ہے، جو اپنے والہانہ جوش، اپنے ساحرانہ حسن جمال اور غیر معمولی عزم و ثبات کے لحاظ سے میرا بائی اور جون آف آرک کی صف میں آتی ہے۔

قرۃ العین کی تاریخ ولادت صحیح طور پر نہیں معلوم اور نہ اس کی زندگی کے مسلسل واقعات کہیں ملتے ہیں۔ لیکن دو باتیں بالکل یقینی ہیں ــــ ایک یہ کہ وہ حد درجہ حسین تھی۔ دوسرے یہ کہ بابی تحریک پر قربان ہو گئی۔

قرۃ العین کے والد حاجی ملا محمد صالح، قزوین کے بڑے ذی اثر مجتہد تھے۔ ایک زمانہ میں رشت کے حاجی سید قاسم سے ان کے خاص تعلقات رہ چکے تھے، جو شیخ احمد احسائی (شیخی تحریک کے بانی) کے خاص شاگرد و جانشین تھے۔

چونکہ حاجی سید قاسم کی آمد و رفت اس گھر میں زیادہ تھی اس لئے قرۃ العین نے سب سے پہلے انہیں کی زبانی اس نئی تحریک کا ذکر سنا اور اس سے کافی متاثر ہوئی۔ اس کا اصلی نام زرّین تاج تھا لیکن حاجی سید قاسم اس کو قرۃ العین ہی کہکر پکارا کرتے تھے اور بعد کو وہ اسی نام سے مشہور ہو گئی۔

اس کی ابتدائی تعلیم ایسے ماحول میں ہوئی جو فضل و کمال کے لحاظ سے بہت مشہور تھا اور اس لئے اس نے وہ سب کچھ حاصل کیا جو اس وقت عام طور پر مردوں کا، فضیلت کے لئے ضروری تھا۔ فقہ، حدیث اور قرآن پر اس کو اتنا عبور حاصل تھا کہ جس وقت اس کا باپ اپنے بھائی اور بھتیجے سے علمی بحث کرتا تھا تو یہ بھی باپ کی طرف سے اس میں شریک ہوتی تھی۔

یہ ابھی کمسن ہی تھی کہ برگن کے مجتہد اخوند محمد تقی سے اس کی نسبت ہو گئی، لیکن شادی ہوئی چچا زاد بھائی حاجی ملا محمد تقی سے جو خود بھی قزوین کا بڑا زبردست عالم تھا۔

قرۃ العین نے حسن و جمال اور فضل و کمال کے علاوہ ذہن بھی بلا کا پایا تھا۔ عربی ادب کے علاوہ علم حدیث کی بھی بڑی محقق تھی۔ قرآن کی تمام متداول تفسیروں کا ناقدانہ مطالعہ بھی اس نے کیا تھا اور قزوین میں اس کے فضل و کمال کا بڑا شہرہ تھا۔

جب سید قاسم کا انتقال ہو گیا تو قرۃ العین نے اس کے شاگرد خاص ملا حسین کو لکھا کہ میں شیخی اصول کی متبع ہوں اور اس بات کی قائل ہوں کہ انسان پر الہامات بھی نازل ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ مظہر خداوندی ہو سکتا ہے۔" ملا حسین اٹھے شیخ کے اس اصول کی تبلیغ کے لئے باہر نکل پڑے اور گھومتے پھرتے شیراز پہونچے۔ یہاں مرزا علی محمد باب سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ خود بھی بابی عقیدہ رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو

اس تحریک کا پیغمبر کہتے ہیں۔ ملا حسین نے ان کی قیادت کو تسلیم کیا اور قرۃ العین کا خط بھی دکھایا۔ باب پر اس کا بہت اثر ہوا اور قرۃ العین
اس نے اپنے مخصوص ۱۹ متبعین میں شامل کر لیا جنھیں وہ "حروف الحیٰ" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

یہ واقعہ ۱۲۶۴ھ کا ہے لیکن خود قرۃ العین کو باب سے ملنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔

قرۃ العین نے بابی مذہب اختیار کرتے ہی پردہ کو خیرباد کہہ دیا اور بابی تحریک کی تبلیغ میں مصروف ہو گئی۔ اس کی بے پردگی کو اس
تمام خاندان والوں نے برا سمجھا اور سوسائٹی میں اس پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ لوگوں نے اسے بہت سمجھایا، لیکن اس نے کسی کی نہ سنی ا
رفتہ رفتہ اس کے مقلدین کی جماعت بڑھنے لگی، یہاں تک کہ بابیین دو جماعتوں میں تقسیم ہو گیا، ایک اس کی طرف تھی اور دوسر
تمام علماء کی طرف۔

کچھ دن بعد وہ کربلا کی زیارت کے لئے گئی اور وہاں اس نے لکچروں کا سلسلہ شروع کیا جن کو عورتیں بھی پردہ کے پیچھے
بیٹھ کر سنتی تھیں۔ یہاں کے علماء کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور انہوں نے قرۃ العین کو برا بھلا کہنا شروع کیا، لیکن اس کا نتیجہ
یہ نکلا اور اس کے متبعین کی تعداد بڑھتی گئی۔ قرۃ العین نے اب اپنے آپ کو جناب فاطمہ کا مظہر کہنا شروع کیا اور اس کی خبر جب
حکومت کو ہی تو کربلا کے گورنر نے اسے گرفتار کرنا چاہا۔ قرۃ العین کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ میں تمام سنی و شیعی عالموں کو چیلنج د
ہوں کہ مجھ سے بحث کریں اور اگر میں ہار جاؤں تو بے شک مجھے گرفتار کر لیں۔ کربلا کے گورنر کو اس کا علم ہوا تو اس نے کہا کہ :
اس باب میں بغداد کے حاکم اعلیٰ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں لیکن جب تک وہاں سے جواب نہ آئے قرۃ العین کربلا چھوڑ کر باہر
مگر قرۃ العین نے اس حکم کی پروا نہ کی اور وہ سپاہیوں کی نظر بچا کر مع چند رفیقوں کے کربلا سے بغداد کی طرف چلدی۔

یہاں وہ مفتی اعظم سے ملی لیکن اس کی جان خطرہ میں پڑ گئی بغداد کے حاکم اعلیٰ نے باب عالی سے استمزاج کیا تو وہاں سے ہدایت ہوئی کہ
کو کسی نہ کسی طرح بغداد سے ایران پہونچا دیا جائے۔

راستہ میں خود اس کے رفیقوں سے بعض مسایل میں بحث اپڑی اور انھوں نے باب سے شکایت کی کہ کیا ایک عورت کے لئے منا
ہے کہ وہ کھلم کھلا بے پردہ ہو کر وعظ کہتی پھرے۔

باب نے قرۃ العین کی موافقت میں جواب دیا اور اسی کے ساتھ طاہرہ کے لقب سے بھی اسے سرفراز کیا۔ کرمانشاہ اور ہمہ داں میں
کرمانشاہ نے پھر تبلیغی لکچر شروع کئے اور بہت سے متبعین پیدا کر لئے۔ ہمدان سے اس نے پایہ تخت جانے کا ارادہ کیا تاکہ خود شاہ ایران
کو بابی مذہب کی طرف متوجہ کرے۔

قرۃ العین کے والد نے اس کی مخالفت کی اور کچھ آدمی روانہ کئے کہ وہ اسے قزوین واپس لے آئیں۔ جب وہ قزوین آئی تو اس
والد نے اس کو مجبور کیا کہ وہ بابی مذہب کو ترک کر دے اور اپنے شوہر کے پاس واپس آئے۔ لیکن وہ باز نہ آئی اور برابر بابی مذہب کی تبل
کرتی رہی۔

۱۲۶۳ھ میں حاجی محمد تقی نے جو اس کا چچا بھی تھا اور خسر بھی، علانیہ باب اور اس کی تعلیمات کی مخالفت شروع کر دی لیکن ایک
جبکہ وہ ایک جلسہ میں باب کو برا بھلا کہہ رہا تھا، تین بابیوں نے اسے قتل کر دیا۔

اس واقعہ سے بڑا ہیجان پیدا ہو گیا اور اس قتل کا اصل مجرم قرۃ العین کو قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن بعد کو رہا کر دی گئی ا
اس کو صرف شہر چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا۔

یہاں سے خراساں جانے کے لئے پہلے وہ تہران پہونچی اور بدشت میں بابی مذہب کے بعض سربرآوردہ علماء سے اس کی ملاقات

ان میں مرزا یحییٰ (صبح ازل) ملا حسین اور حاجی ملا محمد علی بھی تھے۔
باب کی تاریخ میں یہ اجتماع خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی صحبت میں قرۃ العین اور حاجی ملا محمد علی کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور اس نے ایک طویل مثنوی لکھ کر ملا محمد علی کے دلائل کی تردید کی۔
بدشت سے وہ صبح ازل کو ساتھ لے کر جو ابھی بہت کمسن تھا، نور گئی اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے شیخ طبرسی کے مقبرہ میں پناہ لی جو بغاوت مازندران کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جب تک بغاوت فرو نہیں ہو گئی۔ قرۃ العین کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور وہ نور میں اطمینان سے بیٹھی رہی، لیکن اس کے بعد نور والوں نے اسے بھی مرکزی حکومت کے حوالے کر دیا۔ جب یہ تہران پہونچی تو ناصر الدین شاہ کے حضور میں لائی گئی۔ بادشاہ اس کے حسن و جمال اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ اسے پریشان نہ کیا جائے اور پولیس کے حاکم اعلیٰ کی نگرانی میں دیدی گئی۔ اس کے بعد جب ۱۸۵۲ء میں بابیوں نے بادشاہ کو قتل کرنا چاہا اور حکومت کی طرف سے ہنگامۂ گیرودار شروع ہوا تو قرۃ العین پر بھی مصیبت آئی اور اس کی نجات کی صرف ایک ہی صورت رہ گئی، یعنی یہ کہ وہ اپنے عقاید سے باز آئے، لیکن اس نے یہ منظور نہ کیا اور نہایت جرات سے ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ تیشۂ جلاد کے سامنے اپنی گردن جھکا دی۔ قرۃ العین میں شاعرانہ اہلیت بھی بڑی زبردست پائی جاتی تھی لیکن اس کا پورا کلام دستیاب نہ ہو سکا اور پروفیسر براؤن اس کی صرف دو غزلیں اور ایک مثنوی پا سکے۔
اب فارسی کے تذکرۂ "زنان سخنور" نے بڑی کاوش کے بعد اس کا نایاب کلام کچھ اور فراہم کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرۃ العین کا تغزل کتنے عمیق و تلخ تاثرات کا نتیجہ تھا۔
اردو صحافت میں سب سے پہلے نگار ہی ان جواہر پاروں کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

انتخاب از کلامِ قرۃ العین

چکامہ

جذبات شوقک الجمت، لسلاسل الغم والبلا
ہمہ عاشقان شکستہ دل، کہ دہند جان برہِ بلا
اگر آن صنم زسر ستم، پے کشتنم بنہد قدم
لقد استقام لبیفہ، فلقد رضیت بما رضی
سحر آن نگار ستمگرم، قدمی نہاد بہ بسترم
فاذا رأیت جمالہ، طلع الصباح کانما
لمعات وجہک اشرقت، وشعاع طلعتک اعتلی
زچہ روالست بربکم۔ نزنی بزن کہ بلی بلی

بجواب، طبل الست تو، ز ولا چو کوس بلا زدند
همه خیمه زد بدر دلم سپه غم و حشم بلا
من و عشق آں مه خوبرو که چو شد صلائے بلا برو
بنشاط قهقهه شد فرو، که انا الشهید بکربلا
نه چو زلف غالیه بار او، نه چو چشم فتنه شعار او
شده نافه‌ای بهمه ختن، شده کافرے بهمه خطا
تو که غافل از می و شاهدی، پی مرد عابد و زاهدی
چکنم که کافر جاحدی، ز خلوص نیت اصفیا
بمراد زلف معلقی، پی اسب و زین مغرقی
همه عمر کافر مطلقی، ز فقیر فارغ بینوا
تو و تخت و تاج سکندری، من و رسم راه قلندری
اگر آن خوش است تو درخوری و گر این بد است مرا سزا
بگذر ز منزل ما و من، بگزین بملک فنا وطن
فاذا فعلت بمثل ذا، فلقد بلغت بما تشا
چو شنید ناله مرگ من پی ساز من شد و برگ من
فمشی الی مهرولا، و بکی علی مجلجلا
چه شود که آتش حیرتی، زنم بقله طور دل
فسککته و دککته، متدککا، متزلزلا
پی خوان دعوت عشق او، همه شب ز خیل کروبیان
رسد این صفیر مهیمنی، که گروه مزده الصلا
تو که فلس ماهی حیرتی، چه زنی ز بحر وجود دم
بنشین چو طاهره دمبدم بشنو خروش نهنگ لا
بلد ایگروه امامیان، بکشید لوای رامیان
که ظهور دلبر ماعیان شده فاش ظاهر و برملا
گرتان بود طلب بقا، ورتان بود هوس لقا
ز وجود مطلق مطلقه، بر آن صنم بشوند لا

طلعات قدس بشارتی کہ ظہور حق شدہ برملا　　بزن ای صبا تو بحضرتش، بگروہ زندہ دلان صلا
ہلہ الطوائف منتظر ز عنایت شہ مقتدر　　ہمہ مفتخر شدہ مشتہر متمصیا متجللا
شدہ طلعت صمدی عیاں کہ بپا کند علم بیان　　کہ زوہم و کمال جہانیان جبروت اقدسش اعتلا
بتموج آمدہ آن یمی کہ بکر بلاتش بخری　　متظہر است بہر دمی دو ہزار وادی کربلا
صمدم ز عالم سرمدم، احدم ز طلع لاحدم　　پی اہل افتدہ آدمم، و بہم الی لمقبلا
منم آن ظہور مہیمنی منم آن منیت　بی منی　　منم آن سفینہ ایمنی۔ والقد ظہرت و قد علا
ہلہ ایگروہ عماتیاں بزنید ہلہلہ ولا　　کہ جمال دلبر ہائیاں شدہ فاش و ظاہر و برملا
بزنید نغمہ ز بیر طرت کہ زد بہ طلعت ما عرف　　رفع القناع و قد کشف ظلم اللیال قد انجلا
طبر العماء تلفلعت و بک الشتاء تضعضعت　　ورق البہاء قد فدفت رکزو الیہ مہر ولا
نوران نور ز شہر یا طیران طور شہر　لبا　　ظہران روح ز شہر یا ولقد سلہ د تہر انجلا
دو ہزار احمد مصطفٰے، ز بروق آتشہ باصفا　　شدہ مختفی شدہ درخفا، منذ شرا متز سلا
کسی ار بکرد اطاعتش نگرفت حبل ولا یتش　　کندش بعید ز ساحتش دہدش از قہر تبا ولا

قطعہ (۱۱)

گر بتو افتدم نظر، چہرہ بچہرہ، رو برو　　شرح دہم غم ترا نکتہ بنکتہ، مو بمو
از پئے دیدن رخت، ہمچو صبا فتادہ ام　　کوچہ بکوچہ، در بدر، خانہ بخانہ کو بکو
در دل خویش طاہرہ، گشت و ندید جز ترا　　صفحہ بصفحہ، لا بلا، پردہ بپردہ، تو بتو

قطعات ——— از کتاب ظہور الحق

ای خفتہ رسید یار برخیز　　از خود بفشان غبار برخیز
ہیں بر سر مہر و لطف آمد　　ای عاشق زار یار برخیز
آمد بر تو طبیب غمخوار　　ای خستہ دل نزار برخیز
ای آنکہ خمار یار داری　　آمد مہ غمگسار برخیز
ای آنکہ بہ ہجر مبتلائی　　ہاں مردن وصل یار برخیز
ای آنکہ خزاں فسردہ کردت　　اینک آمد بہار برخیز
ہاں سال نو و حیات تازہ است　　ای مردہ لاش یار برخیز

دین من

اگر بباد دہم زلف عنبر آسا را — اسیر خویش کنم آہوان صحرا را
وگر بنرگس شہلای خویش سرمہ کشم — بروز تیرہ نشانم تمام دنیا را
برای دیدن رویم سپہر ہردم صبح — برون برآورد آیینۂ مطلا را
گزار من بکلیسا اگر فتد روزی — بدین خویش برم دختران ترسا را

سرنوشت من

ای بسر زلف تو سودای من — وز غم ہجران تو غوغای من
لعل لبت شہد مصفای من — عشق تو بگرفت سراپای من
من شدہ تو آمدہ برجای من

گرچہ بسی رنج غمت بردہ ام — جام پیاپی، ز بلا خوردہ ام
سوختہ جانم اگر افسردہ ام — زندہ دلم گرچہ زغم مردہ ام
چون لب تو ہست مسیحای من

گنج منم بانی مخزن توئی — سیم منم صاحب معدن توئی
دانہ منم صاحب خرمن توئی — ہیکل من چیست اگر من توئی
گر تو منی چیست ہیولای من

من شدم از مہر تو چون ذرہ پست — وز قدح بادہ عشق تو مست
تا بسر زلف، تو دارم دست — تا تو منی من شدہ ام خودپرست
سجدہ گر من شدہ اعضای من

دل اگر از تست چرا خون کنی — ور ز تو نبود ز چہ مجنون کنی
دمبدم این سوز دل افزون کنی — تا خودیم را ہمہ بیرون کنی
جای کنی در دل شیدای من

آتش عشقت چو برافروخت دود — سوخت سراپایم ہر ہست و بود
کفر و مسلمانیم از من زدود — تا بخم ابروت آرم سجود
فرق نہ از کعبہ کلیسای من

کلک ازل تا بورق زد رقم — گشت ہم آغوش چو لوح و قلم
نامۂ خلقی بوجود از عدم — بر تن آدم چو دمیدند دم
مہر تو بد در دل شیدای من

دست قضا چون گل آدم سرشت   مهر تو در مزرعۂ سینه کشت
عشق تو گردید مرا سر نوشت   فارغم اکنون ز جحیم و بهشت

نیست بغیر از تو تمنای من

باقیم از یاد خود و فانیم   جرعه کش بادۂ ربانیم
سوختۂ وادی حیرانیم   سالک صحرای پریشانیم

تا چه رسد بر دل رسوای من

بر در دل تا ارنی گو شدم   جلوه کنان بر سر آن کو شدم
هر طرفی گرم تماشا هو شدم   او همگی من شد و من او شدم

من دل واد گشت دلارای من

کعبۂ من خاک سر کوی تو   مشعله افروز جهان روی تو
سلسلۂ جان خم گیسوی تو   قبلۂ دل طاق دو ابروی تو

زلف تو در دیر چلیپای من

شیفتۂ حضرت اعلاستم   عاشق دیدار دلاراستم
راهرو وادی سوداستم   از همه بگذشته ترا خواستم

پر شده از عشق تو اعضای من

تا که و کی پند نیوشی کنم   چند نهان بلبله پوشی کنم
چند ز هجر تو خموشی کنم   پیش کسان زهد فروشی کنم

تا که شد راعب کالای من

خرقه و سجاده بدور افگنم   باده بمینای بلور افگنم
شعشعه در وادی طور افگنم   بام و در از عشق بشور افگنم

بر در میخانه بود جای من

عشق علم کوفت بویرانه ام   داد صلا بر در جانانه ام
بادۂ حق ریخت به پیمانه ام   از خود و عالم همه بیگانه ام

حق طلبد همت والای من

ساقی میخانۂ بزم الست   ریخت بهر جام چو صهبا ز دست
ذره صفت شد همه ذرات پست   باده ز ما مست شد و گشت هست

از اثر نشۂ صهبای من

(باقی)

عہد شاہجہاں کا مینا بازار

شاہجہاں نے ایک بار مینا بازار قائم کیا اور دربار کے تمام امراء کی خواتین کو حکم دیا کہ وہ اپنے زیورات اور جواہر وغیرہ مینا بازار میں لائیں اور جو قیمت وہ طلب کریں ادا کی جائے۔ شاہجہاں خود امراء کے ساتھ اس بازار میں گیا اور مختلف دکانوں سے اس نے جواہرات وغیرہ خریدے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک ایسی دکان کی طرف سے بھی گزرا جو ایک نہایت حسین و جمیل عورت کی تھی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ کن جواہرات کا سودا کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔

"میرے پاس ایک بڑا بیش قیمت ہیرا ہے جسے جہاں پناہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں"

بادشاہ نے کہا —

"میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں"

خاتون نے اسے پیش کیا تو شاہجہاں دل ہی دل میں ہنسا کیوں کہ وہ ہیرا نہ تھا بلکہ مصری کا ایک ٹکڑا تھا جو ہیرے ہی کی ساخت تھا۔ لیکن اس نے کہا۔

"اس کی کیا قیمت چاہتی ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"ایک لاکھ روپیہ"

بادشاہ اس کی ذہانت و شوخی سے بہت متاثر ہوا اور یہی قیمت ادا کر دی لیکن اس کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ وہ محل میں اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو۔ چنانچہ یہ وہاں گئی اور تین شبانہ روز وہیں رہی۔ جب لوٹی تو اس کے شوہر جمال خاں نے کہا کہ آیندہ نہ میں تمہارا شوہر ہوں نہ تم میری بیوی۔ میں تمہارا احترام ضرور کروں گا لیکن زن و شو کا تعلق اب قائم نہ رہے گا۔ یہ سن کر وہ محل پہونچی اور شاہجہاں کو سارا قصہ سنایا۔ بادشاہ بہت برہم ہوا اور حکم دیا کہ جمال خاں کو گرفتار کر کے فیل خانہ لیجایا جائے اور وہاں ہاتھی کے آگے ڈالدیا جائے۔ چنانچہ غریب گرفتار ہو گیا اور سپاہی اسے فیل خانہ کی طرف لے چلے۔ اس نے بادشاہ کے حضور میں درخواست بھیجی کہ وہ قصاص سے پہلے کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ درخواست قبول ہو گئی اور جب وہ بادشاہ کے حضور میں پہونچا تو عرض کی کہ میرا قصور بتایا جائے بادشاہ نے کہا کہ تم نے کیوں اپنی بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ اس نے کہا کہ پیر و مرشد جس خاتون کو جہاں پناہ کی رفاقت کا فخر حاصل ہو چکا ہو وہ ہیں کیا ساری دنیا کے لئے واجب الاحترام ہے اور سخت بے ادبی ہوتی اگر میں اس سے زن و شو کا تعلق قائم رکھتا۔ شاہجہاں یہ سنکر خوش ہو گیا اور اس کو پانچ ہزاری منصب عطا کیا ——— (ایشیاٹک جرنل جلد × × × صفحہ ۲۱۵)

قاضی محمد حمید الدین ناگوری

بسلسلۂ گذشتہ

ڈاکٹر محمد عمر — نئی دہلی

دہلی کے علماء سے تنازعہ

دہلی واپس آکر قاضی حمید الدینؒ نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ میں دن رات محفل سماع منعقد ہونے لگے۔ قاضی عماد اور قاضی صادق اور دہلی کے دیگر علماء سوٗ نے ان کے اس فعل کی سختی سے مخالفت شروع کی۔ اور ایک بار انھوں نے سلطان التمش سے شکایت کی اور اس سلسلے میں سلطان سے مدد اور استمداد کی خواہش کی۔ دہلی کے علماء کا قاضی صادق اور قاضی عماد کی قیادت میں ایک وفد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ قاضی حمید الدین اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی شب و روز سماع کا شغل کرتے ہیں شریعت کی رو سے ان کا یہ فعل حرام ہے۔ علاوہ ازیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ابھی تک ڈاڑھی بھی نہیں آئی ایسی صورت میں ہم کس طرح اس بات کو جائز قرار دے سکتے ہیں کہ وہ سماع سنا کریں۔ سلطان نے جواب دیا۔

- میں ان لوگوں کو اس کام سے منع نہیں کر سکتا۔ تم لوگ جو چاہو کرو۔"

اس واقعہ کے بعد قاضی عماد اور قاضی صادق حضرت خواجہ قطب الدین کی خانقاہ میں پہونچے۔ اتفاقاً اس وقت محفل سماع گرم تھی۔ اور قاضی حمید الدین وجد کی حالت میں تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ قاضی عماد نے حضرت خواجہ قطب الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ نامرد کو محفل سماع میں شرکت نہیں کرنی چاہیے آنحضرت نے فی الفور دونوں ہاتھ اپنے چہرۂ مبارک پر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے پھیرے اسی وقت روئے مبارک

---

۱ - سیر الاقطاب ص ۱۴۷ - ۱۴۸

. داڑھی نمودار ہوگئی۔ پس انھوں نے جواب دیا کہ امرد کو محفل سماع میں حاضر نہیں ہونا چاہیے۔ ہم لوگ اہل سماع ہیں اور سماع
رسماع سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال سے لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اور وہ میلہ قلب
رگ خوف زدہ ہوکر آگے نہ بڑھ سکے۔ اور واپس لوٹ گئے [1]

اس سختی کے باوجود ان لوگوں نے ان بزرگوں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور آپس میں مشورہ کیا کہ ان دونوں نے سماع کی جو بنیاد
مدی ہے اگر آج یہ فتنہ فرو نہ کیا گیا تو قیامت تک باقی رہے گا۔ لہٰذا انھیں اس معاملے کی طرف سے غفلت نہیں کرنی چاہیے
. لوگ پھر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت خواجہ کی داڑھی نمودار ہونے کا واقعہ بیان کیا۔ اس واقعہ کے سننے کے بعد
لطان ان دونوں بزرگوں کا اور بھی زیادہ معتقد ہوگیا۔ اور اس نے کہا۔

" یہ دونوں بزرگ اہل سماع اور اہل حال ہیں۔ ان سے ہرگز تنازعہ نہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

نھوں نے جواب دیا

" ہم لوگ متشرع ہیں۔ اور سماع کو جائز نہیں سمجھتے۔ جب تک ہم ان کو اس فعل سے روک نہیں لیتے۔ اس وقت تک ہمیں چین
نہیں آسکتا۔"

لطان نے یہ سنکر کہا۔

" تو پھر میرے پاس کیوں آتے ہو۔ اگر تم لوگ ان کو روک سکتے ہو تو جاکر روک لو۔"

علما نے سلطان کا جواب سنکر اس سے عرض کیا کہ اگر ہم ان کے پاس جاکر انھیں اس فعل سے روکتے ہیں تو گمان غالب ہے کہ وہ ہم
سے یہ پوچھیں کہ تم لوگ کس حیثیت سے ہمیں اس کام سے روکتے ہو۔ اگر شہر کے قاضی اور مفتی ہم کو اس بات کی اجازت دیتے تو
ن کا یہ کہنا کسی حد تک مناسب اور بجا تھا۔ سلطان نے کہا۔

" آخر تم لوگوں کا مقصد اور مطلب کیا ہے؟"

انھوں نے عرض کیا۔

" ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمیں منصب قضا اور صدارت پر متمکن کیا جائے۔"

ن دنوں قاضی عماد سلطان کا منظور نظر تھا۔ لہٰذا سلطان نے قاضی صادق کو منصب قضا، اور عماد کو منصب صدر جہانی تفویض کیا۔
اس کے بعد ان دونوں حضرات نے حضرت خواجہ قطب الدین اور قاضی حمید الدین کو اس واقعہ سے مطلع کیا اور انھیں حکم جاری
کیا کہ دار العدالت میں وہ لوگ حاضر ہوکر خلاف شرع سماع سننے کا جواز و عذر پیش کریں۔ اور مناسب حال یہی ہے کہ اس فعل
سے باز رہا جائے۔ اس پیغام کے سنتے ہی حضرت خواجہ قطب الدین کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔

" ای حسترافان می نمایند یا نہ زیر زمین رشتہ رہ می خواہند"

قاضی حمید الدین نے حضرت خواجہ کے دہن مبارک پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت خواجہ صاحب نے قاضی صاحب کو جواب دیا
کہ تیر اب کمان سے نکل چکا ہے۔ انھوں نے جواباً قاضی صاحبان کو کہلا بھیجا کہ کل میرے پیر کا عرس ہے۔ کل کی مہلت اور دو تاکہ ہم
سماع سن سکیں۔ کل تمام علما جمع ہوں گے۔ اگر ہمارا رشتہ ثابت ہوگیا تو محفل منعقد ہوگی۔ ورنہ ہم توبہ کرلیں گے جب

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۵۳

قاضی اور مفتی نے یہ جواب سُنا تو انھوں نے حضرت خواجہ کی یہ شرط قبول کر لی۔ اور کہا کہ کل کی اور مہلت دی جاتی ہے بشرطیکہ ان دونوں اشخاص یعنی قاضی حمید الدین اور حضرت خواجہ قطب الدین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص محفل سماع میں شرکت نہ کرے

اس زمانے میں دہلی قلعہ کے دو دروازے تھے۔ مشرقی اور جنوبی۔ ان دونوں بزرگوں کی خانقاہیں اور مکان رہائش قلعہ کے اندر تھے۔ قاضی عماد اور قاضی صادق نے احتیاطاً دونوں دروازوں پر سو سو سپاہی تعینات کر دیئے تھے۔ تاکہ وہ کسی دوسرے شخص کو قلعے کے اندر داخل نہ ہونے دیں۔ مبارک نامی خادم نے حضرت خواجہ سے التماس کیا کہ قاضی شہر نے ہر دروازے پر سو سو سپاہی متعین کر دیئے ہیں۔ تاکہ کوئی اندر داخل نہ ہو سکے۔ لہٰذا کھانا پکوایا جائے یا نہیں۔ قاضی حمید الدین نے جواب دیا کہ دگنا طعام پکوایا جائے۔ کس کی ہمت ہے کہ خلقت کو مجلس میں شرکت کرنے سے باز رکھ سکے۔ خواجہ قطب الدین نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عماد اور قاضی صادق اپنی زندگی سے سیر ہو چکے ہیں اور ان کی خواہش اس دنیا سے اب جلد ہی رخصت ہونے کی ہے۔ یہ جواب سُن کر مبارک خادم چلا گیا اور طعام تیار کرایا۔ قاضی حمید الدین نے دوگانہ نماز ادا کی اور اس کے بعد کہا۔ برادرم شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ایک مرد صالح ہیں اور ابھی ملتان سے پہونچنے والے ہیں۔ اسی اثنا شیخ بہاء الدین زکریا مشرقی دروازے سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ اور دربانوں کی بینائی بیکار ہو گئی بعد ازیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے فرمایا کہ برادرم شیخ جلال الدین تبریزی بھی تشریف لا رہے ہیں۔ اور وہ جنوبی دروازے سے داخل ہوئے اور دربان اندھے ہو گئے۔ اس کے بعد سماع شروع ہوا۔ اور ہائے ہُو کے نعرے بلند ہونے لگے جب اس کی آواز قاضی صادق اور قاضی عماد کے کانوں میں پڑی تو انھوں نے آپس میں کہا

"حضرت خواجہ قطب الدین اور قاضی حمید الدین کی خانقاہوں میں اس سے پہلے بھی بارہا محفل سماع منعقد ہوئی تھی۔ لیکن اس قدر شور و شغف پہلے کبھی نہیں سُنا گیا۔"

انھوں نے اپنے ایک معتبر آدمی کو بھیج کر اندر کے حالات معلوم کرائے۔ وہ آدمی اندر گیا اور فوراً ہی دوڑا ہوا واپس آیا۔ اُس نے کہا کہ وہاں اس قدر مجمع ہے کہ کثرت خلقت کی وجہ سے لوگوں کو سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ اور محفل سماع گرم ہے۔ چونکہ قاضی صادق اور عماد کا آخری وقت پہونچ چکا تھا۔ لہٰذا وہ قابو سے باہر ہو گئے اور حیران ہو کر کہنے لگے کہ اب ان لوگوں کو ذرا بھی مہلت دینا مناسب نہ ہوگا۔ انھیں اندر جا کر لوگوں کو اس فعل سے روکنا چاہیے۔ لہٰذا وہ دونوں اپنے ساتھ ایک بڑی جماعت لے کر موقع پر پہونچ گئے۔ حضرت خواجہ سماع میں مستغرق تھے۔ اور قاضی حمید الدین ہاتھ باندھے سامنے کھڑے تھے۔ اور ایک بڑی تعداد میں لوگ گریہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں قاضی حمید الدین کی نظر ان لوگوں پر پڑی۔ قاضی حمید الدین نے بآواز بلند کہا

"وہیں رہنا۔ اے سنگدلو۔"

۱۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فوائد الفواد۔ خیر المجالس ص ۲۱، ۱۰۰، ۱۳، ۲۰، ۸۲۔ سیر العارفین ۲۰۔۱۰۳۰۔۱۲۸، اخبار الاخیار ص ۳۰۔۔۔ گلزار ابرار ص ۵۵۔۵۶۔ سفینۃ الاولیاء ص ۳۴۱۔۱۱۵۔ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۵۲۔۵۰

۲۔ مختصر حالات کیلئے [illegible] سیر الاولیا۔ سیر العارفین۔ اخبار الاخیار۔ گلزار ابرار۔

وہ دونوں اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ہر چند غیظ و غضب اور پیچ و تاب کا مظاہرہ کیا۔ اور آگے بڑھ کر ان بزرگوں کے قریب تک پہونچنے کی سعی کی۔ مگر ایک ستون کے مانند ان کے قدم زمین پر جم گئے اور وہ آگے نہ بڑھ سکے یہاں تک کہ جب تک حضرت قطب الاقطاب سماع سننے میں مشغول رہے وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکے اور ستون کی طرح ایک ہی جگہ پر کھڑے رہے سماع سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خواجہ کی نظر ان پر پڑی۔ انھوں نے کہا۔

" برادر آؤ۔ اور پھر رخصت ہونا۔ لیکن سماع کا کچھ حظ تو اٹھالو۔ تاکہ دل میں سماع نہ سننے کی حسرت باقی نہ رہ جائے اس کے بعد سفر کرنا۔"

حضرت خواجہ کی اس بات کا ان دونوں پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اور ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت دیر کے بعد ان کو ہوش آیا۔ انھوں نے حضرت خواجہ کے قدموں پر جبیں فرسائی کے بعد عرض کیا

" واللہ جل و علیٰ ہم لوگ سماع کے راز سے آگاہ نہ تھے۔ یہ خود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔"

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اب اس بات کا اقرار کرنا لاحاصل ہے کیونکہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب تو یہ استغفار بے سود ہے۔ اور اب بھی تم لوگ سماع کا راز کہاں معلوم ہوا ہے۔ سماع کا راز مجھ سے پوچھو۔ اگر بتا دوں تو لوگ اس کے دیوانے ہو جائیں۔ لہٰذا دونوں شرمندہ و نادم ہو کر واپس چلے گئے۔ اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا اس کو سنایا۔ سلطان نے ان لوگوں کو بہت پھٹکارا، لعن طعن کی اور درشت کلامی سے پیش آیا۔ اور آئندہ بلا حکم دربار میں حاضر ہونے کی ممانعت کر دی۔ دونوں پشیمان واپس لوٹے اور اسی دن ان دونوں کا انتقال ہوگیا۔

سلطان کو جب اس حادثے سے مطلع کیا گیا تو سلطان نے کہا۔

" آنحضرت نے فرمایا تھا کہ یہ نااہل اپنی زندگی سے سیر ہو چکے ہیں۔ اور دار فانی سے دار جاودانی کے لئے سفر کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت کا ارشاد صحیح ثابت ہوا۔ [1]

مولانا رکن الدین سمرقندی نے بھی قاضی حمید الدین اور حضرت خواجہ کی محفل سماع کی سختی سے مخالفت کی اور بوقت سماع اپنے ہمراہ ایک بڑی جمعیت لیکر ان کی خانقاہ میں پہونچے تھے۔ مگر وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے [2]

مولانا شرف الدین بھرنے بھی اکثر ان سے سماع کے مسئلہ پر تنازعہ کیا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے جب مولانا بیمار پڑے اور قاضی حمید الدین ان کی عیادت کو ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ تو مولانا نے خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

" وہ شخص خدا تعالیٰ کو معشوق کہتا ہے۔ میں ایسے شخص سے نہیں ملتا۔"

مختصر یہ کہ قاضی حمید الدین واپس چلے گئے [3]

---

(۱) سیر العارفین۔ ص ۱۵۳ - ۱۵۶ - خزینۃ الاصفیا۔ ج ۱، ص ۲۷۰ - ۲۷۲

شیخ نظام الدین اولیاء نے بھی مختصراً اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فوائد الفواد ص ۱۹۲

۲۔ ارشاد محبوب۔ ص ۲۳۹ - سیر العارفین ص ۱۴۹ - ۱۵۰

۳۔ ارشاد محبوب ص ۱۴۴ - اخبار الاخیار ص ۴۱ .

دوسرے تذکروں اور بالخصوص فتوح السلاطین سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سعد اور عماد نے ایک محضر مرتب کیا تھا اور اس پر دیگر علماء سے حرمت سماع کی مہر ثبت کرائی اور سلطان التمش کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ قاضی حمید الدین کو خلاف شرع کام کرنے سے روکے۔ دربار میں بلا کر ان سے اپنے فعل کے جواز میں قرآن و حدیث سے ثبوت پیش کریں۔

قاضی حمید الدین اور سلطان التمش

ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے سلطان قاضی صاحب کا بہت احترام اور توقیر کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ دربار میں تشریف لے جاتے تو سلطان بڑی خندہ پیشانی درگرم جوشی سے ان کا خیر مقدم کرتا تھا۔ عصامی لکھتا ہے۔

به تعظیم او شاه برخاستے
نظر از جمالش بیاراستے [۱]

جب قاضی حمید دربار میں حاضر ہوئے تو سلطان ان کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنے بازو میں انھیں بروئے احترام جگہ دی۔ جب ان سے سماع کے مسئلہ پر استفسار کیا گیا تو قاضی صاحب نے جواب دیا۔

"اہل قال (علماء) کے لئے سماع حرام ہے۔ لیکن اہل حال (صوفیاء) کے لئے حلال ہے۔"

اس کے بعد قاضی صاحب نے سلطان کو بغداد کی اس محفل سماع کی یاد دلائی جو ایک رات اس کے آقا کے مکان پر منعقد ہوئی تھی۔ اس مجلس میں چالیس صوفی موجود تھے۔ اور قاضی حمید بھی تھے۔ اور التمش بھی تھا۔ قاضی حمید الدین دوسرے صوفیوں کے ساتھ سماع میں مشغول تھے۔ اور حال کی کیفیت میں رقص کر رہے تھے۔ لیکن التمش اس زمانے میں ایک کم عمر لڑکا ہی تھا۔ اور بلکہ اس رات، رات بھر موم بتی کا گل گلگیر سے کاٹتا رہا تھا۔ اس خدمت سے خوش ہو کر ان صوفیوں نے اسے ہندوستان کی سلطنت عنایت کی تھی۔ عصامی لکھتا ہے

درآں شب ترا ملک ہندوستان
بدادند زآں چاکری عارفان [۲]

قاضی حمید الدین کی بات سنتے ہی سلطان کو اس رات کا تمام واقعہ یاد آگیا جسے وہ بھول چکا تھا اور وہ قاضی حمید کے قدموں پر گر گیا۔

اتنا سب کچھ ہوتے پر بھی قاضی عماد اور سعد نے امتحان لینے پر زور دیا۔ قاضی صاحب نے محمود نامی اپنے قوال کو بلوا کر اسے غزل خوانی کا حکم دیا۔ قاضی صاحب پر حال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور وہ رقص کرنے لگے۔ ان لوگوں نے قاضی کے پیروں کے نیچے کانٹے اور دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے لیکن قاضی اتنے مست تھے کہ انھیں اس کا پتا بھی نہ چلا اور وہ بدستور رقص کرتے رہے۔ جب قوال خاموش ہوا اور قاضی صاحب اپنے ہوش میں آئے تو قاضی عماد اور سعد نے ان کی بڑی عزت کی۔

۱۔ فتوح السلاطین ص ۱۱۰

۲۔ فتوح السلاطین ص ۱۱۹

جب قاضی صاحب وہاں سے رخصت ہوئے تو سلطان بھی ان کے ہمراہ ان کی خانقاہ تک گیا۔ سلطان نے دعوت انتظام کیا۔ محفل سماع کے انعقاد کا بھی انتظام کیا گیا اور حاضرین مجلس رات بھر رقص و وجد کی حالت میں بے ہوش رہے ب فجر کی اذان ہوئی تب جاکر کہیں حاضرین مجلس کو ہوش آیا۔ [1]

اس واقعہ کے بعد سے سلطان التمش قاضی حمید الدین سے بے حد اعتقاد رکھنے لگا۔ اور اس نے اپنے بھتیجے سعد الدین کو قاضی حمید کے حلقہ مریدان میں داخل ہونے کے لئے ان کی خدمت میں بھیجا [2]

سلطان التمش ایک صوفی سلطان تھا [3] اور صوفیوں اور درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اور نیز ان کا احترام یا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ نظام الدین اولیا جیسے بزرگوں کی محفلوں میں سلطان کا ذکر خیر آتا تھا۔ اکثر تذکروں میں یہ ا لکھا ہے کہ سلطان التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید اور خلیفہ تھا۔

مختصر یہ کہ سلطان التمش جب کسی پریشانی کا سامنا کرتا اور خود وہ اس بلائے ناگہانی کا مقابلہ نہ کرسکتا تو وہ دفیائے کرام سے مدد کی درخواست کرتا۔

خیر المجالس میں بروایت حضرت شیخ نصیر الدین محمود اودھی کھا ہے کہ حضرت شیخ المشائخ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی کی وفات کے بعد دہلی میں شدید قحط رونما ہوا۔ امساک باراں کی وجہ سے غلہ بہت گراں ہوگیا اور لوگ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اور بہت سے لوگ فاقوں کے مارے ہلاک ہوگئے۔ التمش پر اس کا بہت اثر ہوا اور اس نے اپنے ایک معتمد کو حکم دیا کہ جا

"اس شہر میں جو درویشان اہل اللہ ہیں ان کو میرا سلام اور راہ نیاز پہونچا اور عرض کر کہ ظلم اور فتنہ کا دفع کرنا بادشاہوں کا کام ہے میں اس (کام) میں کوتاہی نہیں کرتا۔ حق تعالیٰ کی طرف توجہ باطن اور خلق کی بہتری کے لئے دعا کرنا آپ کا حق ہے۔ اللہ کی طرف توجہ کیجئے۔ اور دعاء استسقاء فرمائیے تاکہ آپ کی دعاؤں کی برکت اور توجہ سے حق تعالیٰ کرم فرمائے اور باران رحمت نازل فرمائے [6]

۱۔ فتوح السلاطین ص ۱۱۹

۲۔ سیاسی ابل (بحوالہ تاریخ مشائخ چشت) ص ۲۳۲ - ۲۳۳

۳۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو The Religious life and leanings of Iltutmish studies in medieval Indian history. By K.A. Nizami p 15-4

۴۔ ملاحظہ ہو سیر الاولیاء ۔ فوائد الفواد ۔

۵۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو [illegible] جلد ، مقدمہ ، ص ۲۸ - ۲۶

۶۔ خیر المجالس ۔ [illegible] ۔ مندرجہ بالا اردو ترجمہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۱۱۲ سے ماخوذ ہے

جب سلطان کا مندرجہ بالا پیغام قاضی حمید الدین ناگوری قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچا تو انھوں نے جواب دیا کہ
حضرت سلطان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ درویشوں کی دعوت کرے اور محفل سماع کا انتظام کرے تاکہ وجد کی کیفیت میں ہم لوگ دعاء استسقاء کریں۔

جب قاضی حمید الدین کا یہ پیغام سلطان نے سنا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس نے محفل سماع کا انتظام کیا اس کام کے لئے ایک مفرح جگہ مقرر کی عمدہ فرش بچھوائے۔ اور لذیذ کھانے تیار کروائے گئے۔ شہر کے خوش الحان اور ممتاز قوالوں کو مدعو کیا گیا۔ اور اہل اللہ کو دوسرے دن مدعو کیا گیا۔ دوسرے دن شہر کے تمام درویش اس مقام پر جمع ہوئے۔ اس مجلس میں سلطان التمش اور قاضی حمید الدین ناگوری کے علاوہ شیخ علی سنجری، شیخ احمد نہروانی، حضرت بدرالدین سمرقندی۔ اور حضرت شیخ سیف الدین باخرزی کے خلیفہ اور شیخ رکن الدین فردوسی کے پیرومرشد تھے۔ سید قطب الدین غزنوی جو شیخ نورالدین مبارک کے بھتیجے تھے، شیخ نظام الدین ابو المویدغزنوی، حضرت شیخ محمود موئینہ دوز اور دیگر صوفیائے کرام جمع ہوئے تھے۔ یہ تمام بزرگان دین سماع میں مستغرق ہوگئے۔ ابھی محفل جمی ہی تھی کہ باران رحمت نازل ہوئی اور اتنی شدید بارش ہوئی کہ لوگ بڑی پریشانی سے اپنے گھروں کو پہونچے۔[۱]

تصانیف

قاضی حمید الدین اپنے زمانے کے مشہور عالموں میں سے تھے سخندانی اور سخنوری میں آپ کو کمال حاصل تھا سیرالعارفین میں لکھا ہے کہ۔

در علم ظاہری بپایۂ اجتہاد رسیدہ بود

ان کی تصانیف مشائخ کے حلقہ میں خاص طور پر بنظر احترام اور عزت دیکھی جاتی تھیں۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔

۱۔ روضۃ الاقطاب۔ ص ۶۴ - ۶۵
۲۔ اخبار الاخیار ص ۵۰
۳۔ ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار ص ۱۱۲ - ۱۱۳
۴۔ آپ شیخ نجم الدین کبریٰ (ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیاء۔ ج ۲۔ ص ۲۵۸ - ۲۶۱) کے بڑے مریدوں میں سے تھے۔ آپ کی وفات ۶۹۵ھ میں ہوئی۔ مزار شریف بخارا میں ہے۔ ملاحظہ ہو سفینۃ الاولیاء ص ۱۰۵
۵۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ اخبار الاخیار ص ۱۱۳۔ گلزار ابرار ص ۹۶۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۲۔ ص ۲۸۶
۶۔ ان کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے۔
۷۔ مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فوائد الفواد۔ (اردو ترجمہ) ص ۱۳، اخبار الاخیار۔ ص ۳۲ - ۳۳۔ گلزار ابرار ص ۱۱۸۔ روضۃ الاقطاب ص ۶۷۔ سیرالاولیاء ص ۱۱۰ - ۱۱۱
۸۔ اخبار الاخیار ص ۴۹۔ روضۃ الاقطاب۔ ص [illegible]۔ گلزار ابرار ص ۹۵۔
۹۔ اخبار الاخیار ص ۹۱۔ روضۃ الاقطاب ص [illegible]
۱۰۔ سیرالعارفین ص [illegible]۔ سیرالمجالس ص [illegible]۔ روضۃ الاقطاب ص [illegible]۔ خزینۃ الاصفیاء (ج ۱ ص ۱۴۔)

محبوب الٰہی کی روایت ہے کہ حمید الدین کو روح الارواح حفظ تھی۔ آپ جب وعظ فرماتے تھے تو روح الارواح کے مضامین بیان فرماتے تھے۔ [1]

لوائح، طوالع شموس اسماء الحسنیٰ دو جلدوں پر مشتمل اُن کی مشہور تصانیف ہیں طوالع شموس میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں کی شرح ہے ان دونوں کتابوں میں بہت سے رموز حقائق اور معرفت کی باتیں صفحہ در صفحہ لکھی ہیں [2] اور آں نسخہ بغیر اہل کمال وصاحب حال در نتواند یافت " [3] شیخ نظام الدین اولیاء نے قطب الدین کاشانی کا ایک قول نقل کیا ہے۔ جو انھوں نے اپنے شاگردوں سے قاضی صاحب کی تصانیف کے بارے میں کہا تھا

"اے متعلمو! تم جو کچھ پڑھتے ہو اس میں ہے۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے وہ بھی ان (کتابوں) میں ہے۔ جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہ بھی ان میں ہے جو میں نے نہیں پڑھا وہ بھی ان میں ہے۔" [4]

ان مکتوبات کی چاشنی کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ قاضی حمید نے بہت سے خطوط بابا فرید گنج شکر کو لکھے تھے بشیخ نظام الدین اولیاء نے اپنی ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ بابا فرید نے سماع سننا چاہا۔ قوال موجود نہ تھے۔ انھوں نے مولانا بدر الدین اسحاق سے فرمایا۔ کہ تھیلہ وہ مکتوب ہی نکالو جو قاضی حمید ناگوری نے ناگور سے بھیجے تھے۔ مولانا بدر الدین اسحاق مکتوبات کا تھیلہ نکال لائے۔ اگرچہ اُن خطوط کو آئے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اس کے بعد اور بہت سی عرائض موصول ہوئی تھیں۔ اور وہ سب کی سب اسی تھیلے میں ڈال دی گئی تھیں لیکن حضرت شیخ الاسلام کی کرامت سے سب سے پہلے وہی قاضی صاحب والا خط ہاتھ آیا۔ حضرت بابا فرید نے کھڑے ہو کر خط پڑھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ مولانا نے تعمیل حکم کی۔ اس خط میں لکھا تھا۔

"فقیر حقیر ضعیف ونحیف محمد عطا کہ بندۂ درویشاں است از سر تا قدم خاک قدم ایشاں۔"

یہ جملہ سنتے ہی حضرت شیخ الاسلام پر حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور ذوق تمام میسر ہوا۔ اس خط میں یہ رباعی بھی تحریر تھی

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد وآں روح کجا کہ در جمال تو رسد

گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد [5]

۱۔ فوائد الفواد (اردو ترجمہ) ص ۱۹۱

۲۔ گلزار ابرار ص ۴۸

۳۔ سیر العارفین ص ۱۵

۴۔ ارشاد محبوب ص ۲۷۱ ۔ سیر العارفین ص ۱۵۰

۵۔ سیر الاولیاء ص ۱۲۵ ۔ ۱۴۸ ۔ اخبار الاخیار ۹۸ ۔ ۹۹

۶۔ ارشاد محبوب ص ۳۰۷ ۔ اخبار الاخیار ص ۴۰

روضۂ اقطاب ص ۷۳

ظرافت طبع قاضی حمید الدین ایک صوفی اور عالم ہونے کے باوجود خشک مزاج نہیں تھے۔ ان کی گفتگو میں رسائی طبع پائی جاتی تھی۔ محبوب الٰہی نے ایک واقعہ بیان فرمایا تھا جس سے ان کی ظرافتِ طبع کا علم ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ قاضی کبیر[1] مولانا برہان الدین بلخی اور قاضی حمید الدین ہم سفر تھے۔ قاضی کبیر اور مولانا برہان الدین بنی عمدہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور قاضی صاحب اونٹ پر سوار تھے۔ مولانا برہان الدین بلخی نے قاضی صاحب سے ازراہِ مزاح کہا کہ

"قاضی صاحب! تمھاری سواری بہت صغیر (چھوٹی) ہے"

آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ

"ہاں کبیر (بڑی) سے اچھی ہے"

یہ واقعہ بیان فرما کر شیخ نظام الدین اولیاء نے تبسم فرمایا کہ رسائی عقل حمید الدین دیکھیے۔ کیا موزوں جواب دیا کہ ان پر اعتراض بھی نہ آیا۔[2]

وصال سیر الاولیاء، اور دیگر تذکروں میں لکھا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے انتقال کے دس سال تک قاضی حمید الدین بقیدِ حیات رہے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے لڑکوں کو وصیت کی کہ انھیں خواجہ قطب الدین کے پائیں دفنایا جائے۔ چوں کہ مرحوم والد کی ایسی ہی وصیت تھی لہٰذا اس وصیت پر عمل کیا گیا۔ لیکن انھوں نے قاضی حمید الدین کا چبوترہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے اونچا تعمیر کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنے لڑکوں سے خواب میں کہا کہ تم لوگوں نے چبوترہ کیوں بلند بنوایا اور مجھے خواجہ صاحب کے روبرو شرمندہ کیا۔ قاضی حمید الدین کا وصال ۵ رمضان مبارک ۶۴۳ھ کو ہوا تھا۔[3]

سیر العارفین میں لکھا ہے کہ وصال کے وقت قاضی صاحب کسی مرض میں مبتلا نہ تھے۔ اور ماہ رمضان میں وہ خود تراویح پڑھاتے تھے۔ نویں رمضان المبارک کو وتر کی نماز کے بعد سر مبارک سجدہ میں رکھ دیا۔ اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ بہت دیر کے بعد لوگوں کو اس واقعہ سے آگاہی ہوئی کہ انھوں نے دارِ فانی سے سرائے جاودانی کے لئے کوچ کر دیا۔[5]

۱۔ قاضی کبیر خوارزمی اپنے عہد کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ برائے مختصر حالات ملاحظہ ہو۔ روضۂ اقطاب۔ ص ۴۳

۲۔ گلزار ابرار۔ ص ۸۱۔ اخبار الاخیار ص ۴۹

۳۔ ارشادِ محبوب۔ ص ۵۰-۴۹۔ اخبار الاخیار۔ ص ۴۰۔ سیر العارفین ص ۱۴۹۔ روضہ اقطاب ص ۴۳، خزینۃ الاصفیاء ج ۱۔ ص ۳۴۰

۴۔ تاریخ وصال کے بارے میں تذکروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ میں ۵ رمضان المبارک۔ کچھ میں نو یا دس رمضان المبارک لکھا ہے۔ روضۂ اقطاب۔ ص ۴۲۔

۵۔ سیر العارفین ص ۱۵۵۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱۔ ص ۳۱۳

تان سین اطالوی تھا

ایک نیا انکشاف

۱۸۶۸ء میں ایک ماہوار رسالہ "تذکرۂ عالم" کے نام سے منشی بلاقی داس نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت میں بسلسلہ ذکر اکبر، تان سین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ اس کا ماخذ غالباً فرانسیسی مصنف اسٹوارٹ ہیلی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا بیان کس حد تک صحیح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

تان سین جس کا اصلی نام ٹانٹا سینا یا ٹونٹا سائنا تھا اطالیہ کا رہنے والا تھا۔ پیدائش کے متعلق اختلاف ہے جلال الدین شروانی لکھتا ہے "اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی تھی" ہوسکتا ہے کشمیر میں پیدا ہوا ہو تان سین فخراً بیان کیا کرتا تھا "میں حضرت داؤد کی اولاد میں سے ہوں"۔

$\frac{۹۷۵ھ}{۱۵۶۷ء}$ میں کشمیر سے لاہور آیا پھر یہاں سے دہلی گیا اور ملا سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔ اسلامی نام ... ملا سلامت شاہی مسجد میں رہتے تھے اور ہر ہفتہ قوالی کی مجلس ہوتی تھی۔ اس صحبت میں ایک بار تان سین بھی شریک ہوا اور گایا۔ چونکہ لوگ ملا سلامت کے خلاف تھے اس لئے وہ اور تان سین $\frac{۹۷۷ھ}{۱۵۶۹ء}$ میں پشاور بھاگ گئے۔ ان کا تعاقب کیا گیا۔ گرفتار ہوئے اور دہلی لائے گئے۔ ملا سلامت کو معافی دی گئی اور وہ ۳ ماہ بعد مر گئے۔ تان سین بہار و بنگال کی طرف چلا گیا۔ یہاں داؤد خان کی حکومت تھی یہاں بہت قدر ہوئی۔ ایک دن اس نے کسی فقیر کو دیکھا جو گنگناتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ بہت متاثر ہوا۔ اس کا نام گکو تھا۔ ایک سال تک اس سے تعلیم حاصل کی۔ بنگال کے حالات بدلے تو آگرہ آیا اور اکبر کے دربار میں پہونچا۔ یہاں زین خاں کا اکبر کا رضاعی بھائی خود بڑا ماہر موسیقی تھا ان دونوں میں خوب چلتی تھی۔

فرانسیسی مصنف مسٹر اسٹوارٹ ہیلی یہ بھی کہتا ہے کہ

"اس کا ہم عصر روم کا انگلیلا تھا"۔

انتقال ۱۵۹۱ء میں ہوا۔ آگرہ میں مدفون ہے۔ ۱۸۰۵ء میں اس کی قبر کسی نے اکھاڑ دی۔ بعض کہتے کہ کشمیر میں انتقال ہوا، بعض لاہور بتاتے ہیں۔

اُردو غزل کا اوّلین معمار - ولی

ان فتحپوری

آزاد نے ولی کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"یہ نظمِ اُردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا" [1]

بات آج تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ولی کو نظمِ اُردو کی نسل کا آدم تسلیم نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اردو لم یا شاعری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ دکی سے بہت پہلے شمالی ہند اور دکن دونوں میں اُردو شاعری کا چرچا ہو چکا تھا۔ خاص طور پر دکن تو ایسا مرکز تھا جہاں ولی سے پہلے ایک دو نہیں متعدد صاحبِ کمال شاعر گزر چکے تھے۔ ان یں سے بعض صاحبِ دیوان ہیں اور اُردو شاعری کی تاریخ میں بعض وجوہ سے نہایت اہم خیال کئے جاتے ہیں۔ خود آزاد نے اردو زبان و شاعری کے ارتقا پر جس عالمانہ انداز سے "آبِ حیات" کے ابتدائی حصے میں روشنی ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ولی سے قبل کے اُردو شعراء سے ناواقف نہ تھے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے آبِ حیات" میں ولی کو اُردو نظم کا آدم کیوں قرار دیا ؟

اس کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے۔ ولی سے قبل کے شعراء پر دکنی کا اثر اتنا گہرا ہے کہ میر درد کے زمانے کی اُردو تو درکنار، خود ولی، عاجز اور سراج اورنگ آبادی کی زبان و بیان سے اس کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہے۔ قدیم دکنی سے واقفیت یا دکنی لغت سے مدد لئے بغیر اس سے استفادہ کرنا یا لطف اندوز ہونا مشکل ہے لیکن ولی کی زبان کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ولی پہلے اُردو شاعر ہیں جن کا کلام صاف اردو میں ہے۔ بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ولی کا کلام گویا زبان اور خیالات کے اظہار کا وہ آخری نقطۂ ارتقا تھا جسے "تاریخ عرصہ سے طے کر رہی تھی" [2]۔ حقیقت یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ کی وہ خوبصورت پیوند کاری جس نے اُردو شاعری خصوصاً جس نے اردو غزل کو جنم دیا ہے وہ ولی سے پہلے کسی دکنی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ولی کی زبان صرف یہی نہیں کہ درد، مصحفی، میر حسن اور میر کی زبان سے آنکھ ملاتی ہے بلکہ آج کی اُردو

---

[1] آبِ حیات

[2] کلیاتِ ولی مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

اور شاعرانہ زبان سے ہم رنگ وہم آہنگ ہے۔ ولی کے بیان وزبان کی صفائی وسادگی اور روانی دیکھئے کہ یہ عالم ہے کہ آج ہم جس طرح فانی، حسرت، اصغر اور جگر و یگانہ کی غزلوں سے لطف اٹھاتے ہیں اسی طرح ولی کے کلام سے بے تکلف محظوظ ہوتے ہیں۔

ولی سے پہلے دکن میں مرثیہ اور مثنوی کے سوا کسی اور صنف کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا۔ بعض کے یہاں غزل کے نمونے بھی ملتے ہیں مثلاً محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں غزلوں کی تعداد خاصی ہے لیکن ان میں غزل کا وہ بلند معیار نظر نہیں آتا جس کی بنا پر غزل اردو شاعری کا سب سے قابلِ قدر سرمایہ خیال کی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کے بڑے شعراء ولی سے پہلے کی دکنی شاعری کو کم رتبہ خیال کرتے تھے۔ ولی نے دوسرے دکنی شعراء کی طرح اگرچہ قصیدے، قطعات، رباعیاں اور مثنویاں سبھی کچھ کہی ہیں لیکن ان کے فنی کمالات کا جیسا بھرپور اظہار غزل میں ہوا ہے کسی اور صنف میں نہیں ہوا۔ غزل کا جو بلند و خوبصورت اسلوب ومعیار آج نظر آتا ہے اس کا اولیں نقش ولی کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ شمالی ہند اور دکن دونوں میں اردو غزل کو برسرِ عام لانے، فارسی شعراء کی توجہ کا مرکز بنانے اور فارسی غزل کے مدمقابل بنا دینے میں جتنا ہاتھ ولی کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔ ولی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام روش سے ہٹ کر قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے بجائے صنفِ غزل کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور یہ اظہارِ شاعرانہ کچھ ایسا نظر گیر و دلکش تھا کہ عام و خاص دونوں اس پر ریجھ گئے۔ اس لئے اگر ولی کو آزاد کے لفظوں میں اردو شاعری کا آدم نہ تسلیم نہ کیا جائے تو اردو غزل کا بابا آدم ماننا ہی پڑے گا۔

افسوس کہ اردو غزل کے اس بابا آدم کی زندگی و کلام کے بعض اہم پہلو ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں اگرچہ گذشتہ بیس پچیس سال میں ان پر خاصا تحقیقی وتنقیدی کام ہوا ہے۔ لیکن ان کے نام اور وطن کے سلسلے میں اب تک محققین میں اتفاقِ رائے نہیں ہوسکا۔ قدیم تذکرہ نگاروں سے لیکر آج تک کی تحریروں میں یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ دکن کے قدیم ترین تذکرہ نگار حمید اورنگ آبادی نے ولی کو احمد آبادی لکھا ہے۔ گارساں دتاسی، مصحفی، میر حسن، محمد ابراہیم خاں، مرزا لطف علی لطف، قائم اور آزاد نے بھی انھیں احمد آبادی یا گجراتی ہی لکھا ہے حال کے ناقدین ومحققین میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، پروفیسر نجیب اشرف، قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی اور ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں نے بعض نہایت قوی دلیلوں کے ذریعے ولی کو احمد آبادی یا گجراتی بتایا ہے۔

لیکن اس مکتبۂ خیال کے برعکس بعض اصحاب ولی کو اورنگ آبادی ہی سمجھتے ہیں۔ میر تقی میر، فتح علی حسینی، قدرت اللہ قاسم، آصفی ملکاپوری، مولوی عبدالحق اور رام بابو سکسینہ نے ولی کو اورنگ آبادی ہی لکھا ہے، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی اور بعض دوسرے دکنی ادیب آج بھی ولی کو اورنگ آبادی ہی قرار دیتے ہیں۔

ولی کے وطن کے بارے میں اس اختلاف رائے کے مختلف اسباب ہیں، اوّل یہ کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں سے بعض نے انھیں اورنگ آبادی اور بعض نے احمد آبادی لکھا ہے۔ مثال کے طور پر گلشنِ گفتار اور نکات الشعراء کو لیجئے۔ یہ اردو کے قدیم ترین دستیاب تذکرے ہیں اور دونوں ۱۱۶۵ھ میں لکھے گئے ہیں لیکن گلشن گفتار کے مصنف حمید اورنگ آبادی نے ولی کو احمد آبادی اور صاحب نکات الشعراء میر تقی میر نے انھیں اورنگ آبادی لکھا ہے۔

دوسرے یہ کہ ولی کا قیام فی الواقع اورنگ آباد اور احمد آباد دونوں جگہ رہا ہے اور انھوں نے ہر دو مقام کے بعض دوستوں اور شاگردوں کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ ولی کے نام کے ساتھ اکثر دکنی کا لفظ آیا ہے۔ خود ولی نے کئی جگہ اپنے دکنی ہونے کا اعلان کیا ہے مثلاً :-

ولی ایراں و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

اسی طرح میر نے ایک جگہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ

واقف نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا خیال ہے کہ اس "دکنی کے لفظ نے "ولی" کے وطن کے بارے میں خاص طور پر مغالطے پیدا کئے ہیں۔ ان حضرات نے اپنے تحقیقی مقالوں میں بڑی تلاش و محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ولی کا اصل وطن اورنگ آباد نہیں بلکہ احمد آباد (گجرات) ہے۔

اوّل اس لئے کہ اس زمانے میں دکنی کے لفظ کا اطلاق آج کل کی طرح صرف اورنگ آباد اور حیدر آباد پر نہیں بلکہ پورے جنوبی ہند پر ہوتا تھا اور اس میں گجرات بھی شامل تھا۔ چنانچہ تاریخ اور ادب کی قدیم کتابوں میں جہاں کہیں دکنی کا لفظ آیا ہے بہ شمول گجرات آیا ہے۔ خود اہل گجرات اپنے آپ کو شمالی ہند کے مقابلے میں دکنی کہتے تھے۔ بعض تحریروں سے اس بات کی صراحت بھی ہو جاتی ہے کہ اس وقت گجرات بھی دکن کا ایک حصہ خیال کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر محمد ابراہیم خاں لکھتے ہیں :-

"ولی دکھنی۔ شاہ ولی اللہ، اصلش گجرات، در شعرائے
دکن مشہورِ جہاں است" [1]

اسی طرح میر حسن دہلوی کا بیان ہے :-

"ولی از خاک پائے گجرات است، چوں دکھنی است اکثر
بہ زبان خود حرف زدہ است" [2]

ایسی صورت میں "دکنی" سے صرف اورنگ آباد یا حیدر آباد کا علاقہ مراد لینا واقعی درست نہیں معلوم ہوتا۔

ولی کو گجراتی کہنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ولی نے گجرات کے علاقوں کے بزرگوں سے خاص عقیدت کا اظہار کیا ہے شیخ علی رضا جن سے ولی مرید تھے اور مولانا نور الدین ابن شیخ محمد صالح جن سے ولی کو گہری عقیدت تھی گجرات ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ علی رضا کا ذکر انھوں نے کئی جگہ اس طور پر کیا ہے کہ

ہمدمِ شاہِ نجف ولی اللہ
پیرِ کامل علی رضا پایا

تیسرے ولی کے اکثر احباب و اعزا اور معاصر شعرا یا شاگرد جن کا ذکر ان کے کلام میں جا بجا آیا ہے مثلاً سید ابو المعالی، کامل، اکمل، شاہ سراج الدین، سراج الدین کے بیٹے شمس الدین۔ محمد مراد، اکرم

[1] گلزار ابراہیم ، [2] تذکرۃ الشعراء

گوبند لال، امرت لال، کھیم داس، فراقی، شوقی اور آزاد وغیرہ سب گجراتی ہیں۔

چوتھے ولی کے یہاں ایک جگہ "بیجاپور" کے تمثیلی ذکر کے سوا موجودہ دکن یا اس کے علاقے کا کوئی مفصل ذکر نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ان کے کلام میں گجرات اور اس کے نواح مثلاً نربدا، تاپتی، سورت، گجرات وغیرہ کا اکثر تفصیلی ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورت کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

عجب شہروں میں ہے پرنور یہ شہر
بلاشک جگ میں ہے مشہور یہ شہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سے کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سو سورت
ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

اسی طرح "در فراق گجرات" کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منیں آتش بہار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں
اس میکدے سوں اُٹھ کے چلا سدھ بِسار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سے
پھر اس کے دیکھنے کا ہے اُمیدوار دل

پانچویں ولی کے کلام پر دکنی کی طرح گجراتی زبان کا گہرا اثر ہے۔ بہت سے ایسے محاورات اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو گجرات کے علاقے سے مخصوص ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی فہرست بھی بطور مثال ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور احمد میاں اختر نے دے دی ہے۔

سب سے قوی اور آخری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ گجرات کے ایک قدیم محضر پر ولی کی ایک مہر اور ایک قطعہ تاریخ مرقومہ ۱۱۲۳ھ دستیاب ہوئے ہیں جس میں ولی اور ان کے بیٹوں کے دستخط موجود ہیں اور انھیں گجراتی ثابت کرتے ہیں۔

ان میں سے بعض دلیلیں بہت قوی ہیں اور اسی بنا پر اب عام طور پر ولی کو "ولی گجراتی" ہی خیال کیا جاتا ہے لیکن بعض دکنی ادیب اسے تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ ولی کو "گجراتی" کے بجائے اورنگ آبادی ثابت کرنے کے لئے متعدد دلیلیں دیتے ہیں۔

اوّل یہ کہ گجرات میں ولی اور ان کے بیٹوں کی دستخط کردہ جو دستاویز اور مہر ملی ہے وہ اُن ولی سے تعلق

نہیں رکھتی جو اردو کے مشہور شاعر گزرے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے بزرگ ہیں جن کا نام شاہ ولی اللہ ہے اور جو شاہ وجیہ الدین گجراتی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔

دوم شاہ ولی اللہ گجراتی اور ان کے فرزندوں سے متعلق جو کاغذات ملے ہیں ان سے شاہ ولی اللہ کے شاعر ہونے یا "ولی" تخلص رکھنے کا کوئی سراغ نہیں ملتا حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کے لڑکے اس کا ذکر ضرور کرتے یا یا رسالہ نور المعرفت کے مؤلفہ شاہ ولی اللہ میں اس بات کا ذکر ضرور ہوتا۔

سوم یہ کہ اگر ولی گجراتی ہوتے تو ان کی غزل کا یہ معیاری رنگ نہ ہوتا جو کہ ولی کے موجودہ کلام میں پایا جاتا ہے اس لئے کہ گجرات میں اس وقت اردو غزل کا کوئی رواج نہ ہوا تھا۔ اس کے برعکس دکن میں غزل ولی سے پہلے بھی موجود تھی اور ولی کو یہیں سے رہنمائی ملی ہوگی۔

چوتھے یہ کہ ولی کے دوست ابوالمعالی کے فرزند نے ولی کا جو دیوان قلمی مرتب کیا تھا اس پر انھوں نے شاعر کا نام شاہ ولی اللہ نہیں بلکہ "میاں ولی محمد متوطن دکن لکھا ہے"۔ اگر ولی دکنی یا اورنگ آبادی نہ ہوتے تو ولی کے عزیز ترین دوست کا بیٹا شاعر کے نام میں غلطی نہ کرتا اور ولی محمد کے بجائے ان کا نام شاہ ولی اللہ گجراتی لکھتا۔

پانچویں یہ کہ ولی کی زبان اور گجراتی میں جو مماثلت ہے وہ حیرت انگیز نہیں ہے دوسرے دکھنی شعراء پر بھی گجراتی کا اثر پایا جاتا ہے۔

چھٹویں ولی کے چھ شاگردوں میں عمر، آزاد اور داؤد دکن سے تعلق رکھتے تھے رضی کے متعلق گجراتی یا دکنی کی صراحت موجود نہیں ہے۔ باقی دو شاگرد ثنا اور شرف گجراتی تھے اس طرح چونکہ پانچ میں تین یعنی شاگردوں کی زیادہ تعداد دکن سے تعلق رکھتی ہے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ ان کا اصل وطن اورنگ آباد تھا۔ علم کی پیاس بجھانے کے لئے البتہ وہ گجرات گئے پھر واپس وطن آئے [۱]

غرض کہ ولی کے گجراتی یا اورنگ آبادی ہونے کا قضیہ اب تک طے نہیں ہوا۔ اس کے طے ہونے کے امکانات بھی کم ہوتے جا رہے ہیں اس لئے کہ اب اسے تحقیق و تنقید کے ایک علمی و ادبی مسئلے کے طور پر نہیں بلکہ علاقائی عینکوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اہل گجرات انھیں گجراتی لکھتے ہیں اور اہل دکن اورنگ آبادی۔ لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے ولی کے گجراتی ہونے کی دلیلیں زیادہ قوی نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر ان کے کلام سے جتنی داخلی شہادتیں ملتی ہیں وہ انھیں گجراتی ثابت کرتی ہیں۔ پانچ شاگردوں میں سے تین کا دکنی ہونا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ دکنی تھے۔ ان کے کلام میں ان کے جتنے دوستوں، عزیزوں، بزرگوں اور ہم عصر شاعروں کا ذکر آیا ہے ان میں سے اکثر گجراتی ہیں۔ گجرات اور گجرات کے بعض شہروں اور علاقوں کا ذکر بھی انھوں نے اکثر جگہ نہایت دردبھرے لہجے میں کیا ہے۔ ان کی زبان میں گجراتی زبان کے بعض ایسے الفاظ و محاورات بھی ملتے ہیں جو کسی دکنی شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ پھر ان کے اسلوبِ غزل میں جو نکھار پیدا ہوا ہے وہ

---

[۱] نوائے ادب صفحہ ۴۹ بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء

دکنی ہونے سے نہیں بلکہ وہ دلی سے قربت و دلی کے شعرا اور سعداللہ گلشن سے ملاقات کے سبب پیدا ہوا ہے اس لئے جب تک ان قوی دلیلوں کی تردید نہ کر دی جائے ہمارے خیال میں ولی کو دکنی یا اورنگ آبادی کے بجائے گجراتی ہی سمجھنا چاہیئے۔

ولی کے وطن کی طرح ان کے نام میں بھی اختلاف چلا آ رہا ہے میر حسن اور میرزا علی لطف اور نساخ نے انھیں شاہ ولی اللہ لکھا ہے۔ علی ابراہیم، یوسف علی، آزاد اور کریم الدین انھیں شمس ولی اللہ کہتے ہیں۔ صاحب گل رعنا مولوی عبدالحیٔ نے ان کا نام ولی اللہ لقب شمس الدین اور تخلص ولی لکھا ہے۔ ولی کے دوست سید ابوالمعالی کے بیٹے محمد تقی شوق نے ولی محمد لکھا ہے۔ احمد میاں اختر جوناگڑھی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے ولی کی مہر اور ایک قطعہ تاریخ کی مدد سے ان کا نام ولی اللہ ظاہر کیا ہے۔ محی الدین قادری زور اور دوسرے دکنی ادیب انھیں ولی محمد ہی کہتے ہیں۔ اس طرح ان کے نام کے سلسلے میں بھی ادیب اور تذکرہ نگار دو خاص گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ولی کو گجراتی تسلیم کرنے والے ان کا نام شاہ محمد ولی اللہ لکھتے ہیں اور انھیں اورنگ آبادی خیال کرتے والے ان کا نام ولی محمد تحریر کرتے ہیں لیکن چونکہ ابھی تک اہلِ گجرات کی تحقیق اہلِ دکن کے مقابلے میں زیادہ وزن رکھتی ہے اس لئے ان کا اصل نام شاہ محمد ولی اللہ یا میاں محمد ولی اللہ اور ان کا اصل وطن احمد آباد گجرات قرار پاتا ہے۔

ولی کی تاریخ پیدائش کی تحقیق اب تک نہیں ہو سکی۔ مولوی عبدالحیٔ اور رام بابو سکسینہ نے جو تاریخ پیدائش دی ہے وہ یکسر غلط ہے۔ اِں ولی کا سالِ وفات اب متحقق ہو چکا ہے۔ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں ولی کے دیوان کا جو قلمی نسخہ ہے اس کے آخر میں احمد آباد کے مفتی محمد احسن کا لکھا ہوا یہ قطعۂ تاریخ دیا ہوا ہے۔

مطلعِ دیوانِ عشق سید ارباب دل
والیٔ ملکِ سخن صاحبِ عرفاں ولی
سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت
بار پناہِ ولی ساقیٔ کوثر علی

۱۱۱۸

اس سے ۱۱۱۹ھ جو نکلتے ہیں ولی کے والد شریف محمد متوفی ۱۱۰۲ھ شاہ نصر اللہ کے خاندان سے تھے۔ چنانچہ ولی ابتدائی تعلیم و تربیت شاہ وجیہ الدین کے خانقاہی مدرسے میں شیخ نورالدین سہروردی کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ رموزِ تصوف سے بھی انھیں اسی آستانے میں آگاہی ہوئی۔

۱۱۱۲ھ میں اپنے محبوب دوست سید ابوالمعالی کے ساتھ وہ دلی گئے [1] بعض تذکروں میں ہے کہ انھوں نے سورت اور برہان پور کا سفر کیا تھا [2] اور حج بیت اللہ کے لئے بھی گئے تھے [3]

---

[1] مخزن نکات از قائم
[2] چمنستانِ شعرا
[3] گلشن گفتار

چونکہ ولی کے نسبتی بھائی شیخ فرید اورنگ آباد میں مقیم تھے اور بعض دوسرے اعزا بھی وہاں موجود تھے اسلئے یقین ہے کہ ولی نے اورنگ آباد میں بھی ایک عرصہ تک قیام کیا ہوگا۔

جہاں تک شعر و سخن کا تعلق اس میں خود ولی کے قول کے مطابق انھیں اپنے زمانے کے مشہور صوفی بزرگ سعداللہ گلشن سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۱۱۲ھ میں سعداللہ گلشن ہی سے ملنے کے لئے دلی کا سفر کیا تھا۔ سعداللہ گلشن کا آبائی وطن گجرات تھا۔ مرزا بیدل کے شاگرد تھے۔ اس وقت چونکہ دکن اور گجرات کی سیاسی فضا پرآشوب تھی اس لئے ترکِ سکونت کرکے دلی میں بس گئے تھے۔ سعداللہ گلشن چونکہ اپنے آبائی وطن آتے جاتے تھے اس لئے بہت ممکن ہے ولی کے دلی جانے سے پہلے بھی ولی کی ملاقات سعداللہ گلشن سے ہوئی ہو۔ یہ خیال البتہ درست نہیں ہے کہ ولی نے ۱۱۳۸ھ میں بعہد محمد شاہ دلی کا دوبارہ سفر کیا۔ یہ غلط فہمی دراصل اس شعر سے پیدا ہوئی ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

آبِ حیات میں یہ شعر غلط نقل ہوا ہے۔ یہ شعر ولی کا نہیں بلکہ مضمون دہلوی کا ہے اور اس کی اصل صورت یوں ہے:-

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سے

۱۱۳۸ھ میں ولی کے دوبارہ دلی جانے کا سوال یوں بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ۱۱۱۹ھ میں ان کا انتقال ہوا چکا تھا۔ ہاں ولی کا مکمل دیوان البتہ ۱۱۳۸ھ میں بعہد محمد شاہ دلی پہونچا ہے جیسا کہ مصحفی کے تذکرے سے ظاہر ہے۔ آزاد سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے "دیوان مصحفی آمدہ" کے بجائے "مصحفی آمدہ" لکھدیا ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ولی اپنے استاد سعداللہ گلشن کے مشورہ ہی سے اردو غزل کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ جب ۱۱۱۲ھ میں ولی دلی پہونچے تو بقول میرتقی میر سعداللہ گلشن نے ولی سے کہا

"این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ
خود بکار ببر۔ از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ [1]

اور قدرت اللہ قاسم کے مطابق سعداللہ گلشن نے مشورہ دیا کہ:-

"شما زبان دکھنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ
شاہجہاں آباد موزوں کنید کہ موجب شہرت و رواج قبول
خاطر صاحب طبعان عالی مراد گردد"۔ [2]

(باقی)

---

[1] نکات الشعراء
[2] مجموعہ نغز

شیخ علی بخش بیمار

حنیف نقوی

اردو کے بعض ناقدین نے ہندوستان کی فضائے شعری کو بگاڑنے کے سلسلے میں جاگیردارانہ نظام اور درباری ماحول کو خاص طور پر موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور یہ خیال بڑی حد تک درست بھی ہے کیونکہ اردو ادب کو حُسن وعشق کی بے بنیاد داستانوں اور ستائشِ اربابِ اقتدار کے مبالغہ آمیز مضامین کا دفترِ بے معنی بنانے میں سلاطین و نوابین کی سرپرستی و حوصلہ افزائی کو کافی دخل رہا ہے۔ درباروں کی اس سرپرستی کی بدولت عشق و محبت کے پاکیزہ اقدار کے ابلاغ اور مسائلِ حیات کی ترجمانی کے بجائے رندی اور ہوسناکی اور تکلف و تصنع ہمارے ادب کی سرشت میں داخل ہوئے اور سوز و گداز، سادگی و سلاست اور حُسنِ معنی کے مقابلے میں نشاط و طرب کے مضامین، مبالغہ آرائی اور الفاظ کی طلسم بندی قابلِ ترجیح قرار پائے۔ غرضیکہ مختلف عیوب اُردو شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر گئے جن کی وجہ سے وہ آج تک بدنام ہے لیکن جب ہم اسی ماحول کے اثرات پر ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اگر اس دور کے ادب کو جو کہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک بیش قیمت تاریخی و تہذیبی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے یہ سہارے نہ ملتے تو شاید ہمارے اظہار و بیان کے سرمائے میں بہت سے گہرہائے گراں مایہ کی کمی رہ جاتی اور لسانی و فنی ارتقار کی وہ منزل جس پر آج کے ادیب و شاعر گامزن ہیں اس قدر واضح اور روشن نہ ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ اسی ماحول نے سوداؔ، میرؔ، ناسخؔ، آتشؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، انیسؔ و دبیرؔ، داغؔ اور امیرؔ جیسے فن کاروں کو جنم دیا۔ اور پروان چڑھا کر معراجِ کمال تک پہونچایا اور اسی نظام نے شاعروں اور ادیبوں کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر کے خدمتِ لوح و قلم کے مواقع فراہم کئے۔

دہلی و لکھنؤ کے مرکزی حیثیت رکھنے والے درباروں کے علاوہ ذوقِ سخن کی ترویج و تعمیم میں دیسی ریاستوں نے بھی نہایت اہم حصہ لیا۔ رام پور، بھوپال، ٹونک اور حیدرآباد ایک زمانے تک شعر و ادب کے مرکز بنے رہے۔ لیکن ادیبوں اور فن کاروں کی قدر شناسی میں جو کارنامہ رام پور نے انجام دیا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دوسری ریاستوں کی خدمات سے کہیں زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ دہلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ بسا تھا اور جب عروسِ ادب کے لئے لکھنؤ کا ماحول سازگار نہ رہا تو رام پور ہی نے اسے اپنے آغوشِ التفات میں جگہ دی اور اس طرح دہلی اور لکھنؤ کی سرزمینِ ادب پر ایک اسکول کی بنیاد پڑی جس کا

مطمحِ نظر سابقہ اسکولوں کے ادبی رجحانات میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنا تھا۔

اگرچہ رام پور اسکول کا عروج خاص طور پر نواب کلب علی خاں کے عہد میں ہوا لیکن اس سے پہلے بھی وہاں بساطِ شعر و ادب " دامانِ باغبان و کفِ گل فروش " کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم خود بھی ایک خوش فکر شاعر تھے اور شعراء کے قدر دان بھی۔ ان کے والد نواب محمد سعید خاں تو ڈپٹی کلکٹری کے زمانے ہی میں ارباب علم و ادب کی قدر شناسی میں وہ حیثیت حاصل کر چکے تھے جو مومن جیسے خود نگر شاعر کو دلی سے ان کے مستقر سہسوان تک کھینچ لائی تھی۔ رام پور کی نوابی حاصل ہو جانے کے بعد اس ذوقِ ادب نوازی کا رنگ اور بھی چمکا چنانچہ مختلف مقامی و غیر مقامی شعراء ان کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو کر مراحم خسروانہ سے مستفید ہوتے رہے۔ انھیں میں سے ایک شیخ علی بخش بیمار بھی ہیں۔

بیمار کی شخصیت اگرچہ محتاجِ تعارف نہیں لیکن تعارف تشنۂ تفصیل ضرور ہے۔ بعض تذکروں اور تاریخوں میں ان کا ذکر آ گیا ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ، پیش نظر مضمون اسی تشنگی کے ازالہ کی ایک کوشش ہے۔

ولادت و وفات

بیمار ۱۲۰۴ھ میں قصبہ آنولہ مضافات بریلی میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد کسبِ معاش کی خاطر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ کچھ عرصے تک وہاں قیام کر کے ۱۲۵۶ھ ہجری مطابق ۱۸۴۰ء میں رام پور پہونچے اور تقریباً پندرہ سال تک اس سرزمین پر شعر و ادب کی خدمت کر کے ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ ہجری (غالباً ۱۴ دسمبر ۱۸۵۴ء) کو سڑسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی[1]

وطن کے سلسلے میں اختلاف

بیمار کا آبائی وطن قصبہ آنولہ ضلع بریلی تھا۔ لیکن اکثر تذکرہ نگار اس کے خلاف بیان دیتے ہیں۔ کوئی سنبھل کو وطن قرار دیتا ہے کوئی رام پور کو اور کوئی بریلی کو۔ اختلاف بیانات کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ عبدالغفور خاں نساخ باشندۂ رام پور لکھتے ہیں[2]

۲۔ قادر بخش صابری سنبھل کا متوطن ٹھہراتے ہیں[3]

۳۔ جارج فانتون فرانسیسی نے لکھا ہے " متوطن قدیم بریلی مگر در رام پور وطن گزید "[4]

۴۔ امیر مینائی کے بیان کے مطابق بیمار کا وطن " شہر بانس بریلی " ہے[5]

۵۔ عبداللہ خاں ضیغم نے باشندگان رام پور و بریلی سے تصدیق کے بعد بریلی کی وطنیت کے حق

---

[1] انتخاب یادگار صفحہ ۸۲

[2] سخن شعراء

[3] گلستان سخن صفحہ ۱۶۰

[4] تذکرہ شعرائے رام پور مخطوطہ رضا لائبریری صفحہ ۱۳

[5] انتخاب یادگار صفحہ ۸۸

میں انہیں فیصلہ دیا ہے [5]

۶۔ لالہ سری رام غالباً امیر مینائی کے اتباع میں "شہر بالش بریلی" کو بیمار کا وطن قرار دیتے ہیں [6]

۷۔ نواب نورالحسن خاں کلیم رقمطراز ہیں کہ "بیمار از خاک پاک آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی است [7]

۸۔ نواب علی حسن خاں کا بیان ہے کہ "از مشاہیر سخنوران سنبھل ضلع مرادآباد بود [8]

۹۔ سید امتیاز احمد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "بیمار سنبھل مرادآباد کے رہنے والے تھے [9]

۱۰۔ راز یزدانی رام پوری کی تحریر کے مطابق "یہ خاندان سہسوان ضلع بدایوں کا رہنے والا تھا" [10]

ان تمام بیانات میں صرف نواب نورالحسن خاں کا یہ بیان کہ " از خاک پاک آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی است " بہ درجہ اولیٰ صحیح ہے ۔ جارج فانتوق، امیر مینائی، عبداللہ خاں ضیغم اور لالہ سری سری رام کی روایات بھی اس بنا پر کہ آنولہ ضلع بریلی ہی کا ایک حصہ ہے قرین صحت تسلیم کی جا سکتی ہیں ۔ نساخ نے غالباً رام پور میں پندرہ سالہ قیام اور وفات کی وجہ سے " باشندۂ رام پور" لکھ دیا ہے ۔ البتہ سنبھل کو وطن قرار دینے کے اسباب بعید از فہم ہیں ۔ کیونکہ نہ تو کسی تذکرے سے سنبھل میں بیمار کے کسی خاندانی تعلق کا پتہ چلتا ہے اور نہ کہیں وردود قیام ہی کا سراغ ملتا ہے ۔ اسی طرح راز صاحب کا قول بھی جیسا کہ ایک ملاقات کے دوران موصوف سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا محض غلط فہمی پر مبنی ہے نواب نورالحسن خاں اور نواب علی حسن خاں کے بیانات کا اختلاف ہو گیا ہے زیادہ تعجب انگیز ہے کیونکہ یہ دونوں تذکرہ نگار حقیقی بھائی بھی تھے اور دونوں کے تذکروں کا مقام و زمانۂ تصنیف بھی ایک ہی ہے

دربار رامپور تک رسائی

نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی شمسہ تاجدار وارث تخت و تاج قرار پائیں ۔ لیکن روہیلوں نے خاتون فرمانروا کی بالادستی قبول نہ کی لہذا حکومت وقت کی جانب سے مجبوراً ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو زمام سلطنت نواب صاحب مرحوم کے برادر عم نواب محمد سعید خاں کے سپرد کر دی گئی ۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں حکیم سعادت علی خاں آنولہ والے سے نواب صاحب کے خصوصی تعلقات ہو گئے تھے چنانچہ مسند نشینی کے فوراً بعد ہی انھیں افواج ریاست کا جنرل معتبر کر دیا ۔ حکیم صاحب نے غالباً ہم وطنی کی بنا پر بیمار کو رام پور بلا لیا اور انھیں کے توسط سے وہ متوسلین ریاست میں شامل ہوئے ۔

---

[5] تذکرہ یادگار ضیغم مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد صفحہ ۲

[6] خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۶۵

[7] طور کلیم صفحہ ۱۹

[8] بزم سخن صفحہ ۲۹

[9] ماہنامہ نگار

[10] رام پور کا ماحول شعر و سخن مشمولہ ماہنامہ نگار شمارہ ستمبر ۱۹۶۰ء

تلمذ کا مسئلہ

بیمارؔ کا عہدِ شباب لکھنؤ میں گذارا اور شاید وہیں وہ مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے مصحفی کا ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوگیا۔ لکھنؤ میں اس کے بعد انھوں نے کسی سے اصلاح کی، اس سلسلے میں کوئی معتبر تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ نیازؔ صاحب نے انتقادیات جلد اول[۱] میں آپ کو واضح طور پر مومنؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ سید امتیاز احمد "نگار" کے "مومن نمبر" میں تلامذۂ مومنؔ کے ذیل میں بیمارؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"طورِ کلیم، بزمِ سخن، خم خانۂ جاوید میں مصحفی اور غفلت کے شاگرد بتائے گئے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہیں۔ ایڈیٹر نگار نے "نظام شاہ" کے تذکرے میں انھیں مومنؔ کا شاگرد لکھا ہے"

رازؔ یزدانی غفلت کی شاگردی کے قائل تھے۔ وہ بیمارؔ کو مصحفی کے تلامذہ میں بھی شامل نہیں کرتے اور اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مصحفی نے اپنے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں کیا جب کہ بہت سے دوسرے شاگردوں کے حالات اور کلام کے نمونے قلم بند کئے ہیں[۲]

"اس اختلافی مسئلے میں جہاں تک مومنؔ کی شاگردی کا تعلق ہے، میرے ایک استفسار کے جواب میں نیازؔ صاحب کا یہ ارشاد کہ بیمارؔ کو میں نے مومنؔ کا شاگرد کیوں لکھا۔ اب یہ بالکل یاد نہیں، غالباً یہ بات غلط ہے[۳]" حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسرتؔ کی تحقیق کے مطابق شوقؔ کی شاگردی کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ کیونکہ نہ تو کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ اس روشنی میں کہ شوقؔ کا انتقال ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں ہوا ہے[۴] جب کہ بیمارؔ کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، یہ بات قابلِ یقین ہے۔ حسرتؔ کی اصل تحریر میری نظر سے نہیں گزری اس لئے کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں دیا جا سکتا تاہم اگر اس دعوے میں صداقت کا امکان بھی ہے تو صرف اس قدر کہ بیمارؔ نے ابتدائے مشق کا کچھ کلام انھیں دکھا لیا ہوگا۔ مصحفی سے تلمذ پر تقریباً تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ ایسی صورت میں رازؔ صاحب کے شبہات پر اعتبار کر لینا درست نہ ہوگا کیونکہ مصحفی کے تذکروں میں بیمارؔ کا نام نہ آنے کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان کا پہلا تذکرہ "عقدِ ثریا" تو بیمارؔ کی ولادت سے تقریباً پانچ سال قبل (۱۱۹۹ھ) کی تصنیف ہے اور صرف شعرائے فارسی کے حالات و کلام سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا تذکرہ (تذکرۂ ہندی گویان) بھی اس زمانے (۱۲۰۹ھ) تک ترتیب و تالیف کے آخری مراحل طے کر چکا تھا جبکہ بیمارؔ عمر کی پانچویں منزل سے گزر رہے تھے۔ البتہ "ریاض الفصحا" کی ابتدا از روئے تصریحِ دیباچہ ۱۲۲۱ھ میں اور اتمام حسبِ تحریرِ مصنف ۱۲۳۶ھ میں ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اس

۱۔ نگار شمارہ ستمبر ۱۹۵۰ء
۲۔ نگار شمارہ ستمبر ۱۹۵۸ء
۳۔ مکتوب بنام راقم الحروف
۴۔ دیباچہ دستور الفصاحت

وقت تک مصحفی اور بیمار کے درمیان استادی وشاگردی کا رشتہ ہی استوار نہ ہوا ہو یا بصورت دیگر بیمار کا کلام زبان و بیان کی پختگی کے اس معیار تک نہ پہونچا ہو جو مصحفی کے پیش نظر رہا ہے۔ اس تذکرے میں صرف ۴۴۶ مرحوم و موجود شعرار کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ اس وقت لکھنؤ اور مضافاتِ لکھنؤ ہی میں ایسے شعرار کی تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ اب رہا غفلت رام پوری سے مشورۂ سخن کا سوال تو اس سلسلے میں گمان غالب یہ ہے کہ یہ تعلق جذبۂ اکتساب سے زیادہ سیاسی مصالح کا رہین منت رہا ہوگا۔ بیمار جس وقت رام پور پہونچے ہیں تو وہاں غفلت کا طوطی بول رہا تھا اور عام شعرار کی ایک تعداد کثیر کے علاوہ خاندانِ شاہی کے کئی افراد ان کے دامنِ تلمذ سے وابستہ تھے۔ دربار سے اپنی وابستگی کو پائندہ تر بنانے کے لئے بیمار نے بھی ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا لیکن یہ ضرور ہے کہ کہنہ مشقی کے باوجود انھیں غفلت کی رہنمائی سے کافی فائدہ پہونچا۔ چنانچہ ایک قطعے میں ان کے فیضانِ اصلاح کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نہ اصلاحِ جنابِ غفلت اے بیمار اگر ہوتی
تو معنی ہی نہ رکھتا شعر کچھ تجھ ایسے ناداں کا

ایک دوسری غزل میں اس طرح استاد کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

جانتا ہے معجزہ بیمار غفلت کا سخن
کون ہے دنیا میں ایسا معتقد استاد کا

ادبی خدمات

بیمار جب رام پور پہونچے تو وہاں انھیں "بوستانِ خیال" کے نظم کرنے کی خدمت تفویض ہوئی۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے افسانۂ مذکور کی کوئی جلد نظم کی یا نہیں مگر وہ تقریباً پندرہ سال تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ اس لئے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ کچھ جلدیں ضرور نظم کی ہوں گی اس قیاس کو یوں بھی تقویت پہونچتی ہے کہ رضا لائبریری رام پور میں ان کے کلام کا جو مجموعہ محفوظ ہے وہ بہت مختصر اور نامکمل ہے۔ جابجا ردیفوں کے لئے سادہ ورق چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایسے دور میں جب کہ غزل ہمارے ادب پر چھائی ہوئی تھی اور روز و شب شاعروں کی محفلیں جمتی رہتی تھیں، ان اوراق کا سادہ رہ جانا اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ بیمار ضرور کسی دوسرے کام میں منہمک رہے ہوں گے جس کی وجہ سے وہ روش عام کے مطابق اپنے دیوان غزلیات کی ردیف وار تکمیل نہ کر سکے۔ یہ کام "بوستانِ خیال" کا نظم کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں قادر بخش صابری تو صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ :-

"کوئی جلد بوستانِ خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب، اردو میں نظم کرتا تھا۔ معلوم نہیں اختتام کو پہونچا یا نہیں" [1]

لیکن لالہ سری رام کا بیان ہے کہ

بوستان خیال کے کچھ حصّوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا" [2]

---

[1] گلستانِ سخن صفحہ ۱۶۰

[2] خم خانۂ جاوید جلد اول صفحہ [illegible]

بہرحال نہ تو اس ترجمے کی کوئی جلد شائع ہوئی اور نہ اب ان قلمی مسودات ہی کا کہیں پتہ چلتا ہے۔ اگر اس نظم کی]ہیں واشاعت ہو جاتی تو یہ بیمار کا ایک گراں قدر کارنامہ ہوتا۔ ان کے باقیات میں اس وقت صرف "طلسمِ بیضا"]کے نام سے ایک قدیم طرز کی داستان اور ایک مختصر سا دیوانِ غزلیات محفوظ ہے۔ اس بیاض سے پہلے کا کلام خود انھیں کے ہاتھوں]انستہ یا نادانستہ طور پر تباہ و برباد ہو گیا۔ جیسا کہ نواب علی حسن کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"چند دیوانِ غزلیات و قصائد فراہم آورد و پریشاں ساختہ" [۱]

لالہ سری رام کا بیان بھی یہی ہے کہ:۔

"کئی دیوان مرتب کئے مگر سب کے سب پریشان ہو گئے" [۲]

بزمِ سخن کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمار نے قصیدے بھی کافی تعداد میں کہے تھے لیکن موجودہ دیوان]یں صرف ایک قصیدہ ملتا ہے۔ غزلیات اور اس قصیدے کے علاوہ اس مجموعے میں ایک نعتیہ تضمین، دو ایک]خمسے اور چند رباعیاں شامل ہیں۔

رنگِ سخن

بیمار کے کلام کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداً لکھنوی رجحاناتِ شاعری کے دلدادہ تھے اور اس اسکول کے ممتاز شاعر ناسخ لکھنوی کی روش کو اپنانا چاہتے تھے لیکن شاید انھیں بہت جلد ہی اپنی غلط روی کا احساس ہو گیا اور آہستہ آہستہ اس رنگ کے نقوش مدھم ہوتے گئے۔ چنانچہ چند مخصوص غزلوں کے برعکس اکثر غزلیات میں داخلیت کا عنصر غالب ہے اور مضامین کی متانت و سنجیدگی زبان و بیان کی سادگی و سلاست سے ہم کنار نظر آتی ہے۔ خارجی کیفیات کی ترجمانی اور صنعتوں کے استعمال میں بھی اعتدال پسندی کا رجحان کارفرما ہے]سطورِ ذیل میں بیمار کے چند ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی رائیں نقل کی جاتی ہیں جن سے اس کے طرزِ کلام، انفرادی خصوصیات اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگانے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ امیر مینائی کا ارشاد ہے کہ:۔

"بیمار مرد خوش فکر و خوش مذاق حسنِ کلام سے مشہورِ آفاق تھے" [۳]

۲۔ قادر بخش صابری لکھتے ہیں کہ:۔

"ان کے کلام میں الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے باہر ہے" [۴]

۳۔ نواب نور الحسن خاں کی رائے ہے کہ:۔

"صاحبِ زبانِ مغز دار و اسنادِ قیامت کار است" [۵]

---

[۱] بزمِ سخن صفحہ ۲۶،۲۵
[۲] خمخانۂ جاوید جلد اول صفحہ ۱۰
[۳] انتخاب یادگار صفحہ
[۴] گلستانِ سخن صفحہ ۱۹۰
[۵] طورِ کلیم صفحہ ۱۹

۴۔ نواب علی حسن خاں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"پرواز طائر خیالش بالاقیاد از گمان است۔ قوتِ بیان ولطفِ زبان او اگر از میر و مصحفی بیش نیست، انہم نتواں گفت کمتر است۔ ان تقدم زمانی وتجدد زبانی چیزے دیگر است" ۱؎

۵۔ لالہ سری رام کا قول ہے کہ :-

"بیمار کی طبیعت مضمون خیز اور زبان نہایت صاف شیریں پائی تھی۔ سوز و درد کے معانی بالخصوص نہایت موثر و دلکش پیرائے میں نظم کرتے تھے" ۲؎

۶۔ نیاز فتحپوری ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ :-

"بیمار نہ صرف خوش گو اور پر سوز شاعر تھے بلکہ ان کے کلام میں ایک زور بھی تھا جو بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کا ایک مطلع ہے ؎

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

میرے نزدیک بیمار کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جو داد سے مستغنی ہیں۔ اور جن کی کیفیت کا بیان الفاظ سے باہر ہے" ۳؎

۷۔ محمد علی خاں اثر رام پوری کی نظر میں :-

"بیمار کا کلام پختہ اور استادانہ ہے۔ وہ مضمون آفرینی کے دلدادہ تھے۔ زبان شستہ اور صاف تھی۔ لیکن کلام کو جابجا صنائع و بدائع سے مرصع کیا ہے اور ایہام و تلمیح سے بہت کم شعر بچے ہیں، البتہ جہاں زبان کے صاف شعر لکھے ہیں وہ بلاشبہ بے حد دلآویز اور پسندیدہ ہیں، ان کے کلام کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر اشعار میں جو مضمون پیدا کیا ہے وہ مثالوں اور دلیلوں سے مستحکم ہے" ۴؎

۱؎ بزم سخن صفحہ ۲۵

۲؎ خمخانہ جاوید جلد اول صفحہ ۹۸۴

۳؎ انتقادیات جلد اول صفحہ ۲ مقالہ بعنوان - نظام رام پوری"

۴؎ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ۔

۸۔ کلب علی خاں فائق رام پوری "رام پور کا ادبی مرکز" کے عنوان سے ایک مقالے میں بیمار اور ان کے دو رام پوری شاگردوں (نظام و رسا) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"ان لوگوں نے پرانی راہوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ نکالا۔ زبان کی تراش خراش اور سلاست کو عملی جامہ پہنا کر واردات عشق و محبت میر نظام الدین ممنون اور جرأت کی لے میں ادا کئے۔ بیمار کا کلام مدوّن ہو کر سامنے نہ آسکا اور بیشتر تلف ہو گیا معاصرین ان کی سحر بیانی کے معترف تھے اور انھیں طرز نو کا بانی سمجھتے تھے۔ موجودہ کلام جو ہمارے سامنے ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ وہ غلط راستوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ تلاش کر رہے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے" [۱]

اربابِ فن کے ان تبصروں کو غور سے دیکھا جائے تو بیمار کا شاعرانہ مقام کافی بلند ہو جاتا ہے۔ اگر ایک کامیاب غزل گو کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے ممتاز اور نمایاں خصوصیات موقوف ہوں گے اس کے ذوق کی پاکیزگی، فکر کی توانائی، زبان و بیان کی قدرت، استادانہ موشگافی، معنی آفرینی، زور کلام، جدت پسندی ندرتِ اسلوب اور فطری سادگی پر جہاں تک بیمار کے قدیم ناقدین کا تعلق ہے انھوں نے ان کے کلام میں ان تمام اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کی ہے، بالخصوص صنف غزل میں اس وقت تک کسی شاعر کو کامیاب نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ اس کے یہاں جذبے اور تخئیل کا مناسب امتزاج نہ ہو۔ بیمار کے کلام میں ان دونوں عناصر کا ایسا تال میل نظر آتا ہے جس نے ان کے اشعار میں بیکراں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ ان کی فطرت میں ایک قسم کا سوز ہے جس سے تخئیل گرمی حاصل کرتا ہے اور شعر شدتِ اثر کا مکمل نمونہ بن جاتا ہے۔

تلامذہ

بیمار کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ رام پور اور دوسرے مقامات پر ان کے بے شمار شاگرد تھے مگر سید محمد ذکریا شاہ نظام رام پوری (متوفی ۱۲۸۹ھ) احمد علی رسا رامپوری (متوفی ۱۲۸۶ھ) اور منشی امیر احمد حسین تسلیم سہسوانی (متوفی ۱۳۲۱ھ) کے علاوہ کوئی درجۂ استادی کو نہ پہنچا۔ تذکرۂ انتخاب یادگار میں بیمار کے تقریباً تمام رامپوری تلامذہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر تذکروں میں صرف نظام رامپوری یا تسلیم سہسوانی کا نام نظر آتا ہے۔ لالہ سری رام کا قول ہے کہ:۔

"تلامذۂ بیمار میں تسلیم سہسوانی نے درجۂ امتیاز پایا" [۲]

محمد علی خاں اثر رام پوری اپنے تعارفی مضمون "علی بخش بیمار" میں لکھتے ہیں کہ:۔

---

[۱] ماہنامہ نگار لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۵۳ء

[۲] خم خانۂ جاوید جلد اوّل صفحہ ۶۵۲

٭تذکرہ خم خانۂ جاوید نے بیمار کے شاگردوں میں صرف
انوار حسین تسلیم سہسوانی کو ممتاز ظاہر کیا ہے۔ شاید انھیں
یہ معلوم نہ ہو کہ بیمار کے رام پوری شاگردوں میں ایک بلند پایہ
شاعر میر احمد علی رسا رام پوری بھی تھے جو استاد الاساتذہ تھے[1]

جناب اثر نے صاحب خم خانۂ جاوید کو جس فروگذاشت کا مرتکب قرار دیا تھا افسوس ہے کہ ان سے اس سے بڑی فروگذاشت ہوئی ہے۔ تسلیم سہسوانی کی شہرت اس زمانے میں رسا سے کہیں زیادہ تھی۔ نول کشور پریس کی مطبوعات میں شامل ان کے تاریخی قطعات اور تقریظات کی بنا پر ہندوستان کا تمام ذی علم طبقہ ان سے واقف تھا جبکہ رسا کی شہرت صرف رام پور اور اس کے قرب وجوار تک محدود تھی۔ اسی باعث لالہ سری رام نے انھیں دوسرے تلامذہ پر ترجیح دی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اثر صاحب نے رام پوری ہونے کے باوجود نظام کو بالکل نظر انداز کر دیا اور بیمار کے شاگردوں میں ان کا نام تک درج نہیں کیا، حالانکہ نظام کا مرتبہ بحیثیت غزل گو رسا اور تسلیم دونوں سے بلند تر ہے۔ ان کی غزل گوئی نیاز صاحب سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں راز یزدانی صاحب ان کے فن کے مختلف گوشوں پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ تسلیم سہسوانی کی شخصیت اور کارناموں کے سلسلے میں راقم الحروف کا ایک مضمون "آج کل" کے نومبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔

انتخابِ کلام

تحسینِ سخن اور پسندیدگیٔ کلام کا انحصار تمام تر ذوقِ سلیم، افتادِ طبع، قوتِ احساس وادراک اور اندازِ فکر و نظر پر ہوتا ہے اور چونکہ مذاق اور طبیعتیں مختلف ہوا کرتی ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ جو شعر ایک شخص کے جذبات واحساسات کو متاثر کرتا ہے، دوسرے شخص کی شعوری و وجدانی قوتوں کو بھی اپنی جانب ملتفت کر سکے۔ علاوہ ازیں کسی فنکار کے ادب پاروں کی نوعیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ اس کی فن کاری کا ہر پہلو اور اس کی تخلیقات کا ہر زاویہ بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئے۔ اسی کلیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے سطور ذیل میں بیمار کے کلام کا ایک ملا جلا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ان اشعار میں آپ کو سادگیِ ادا۔ لطافتِ بیان، نزاکتِ خیال اور بلندیِ فکر کے نمونے بھی ملیں گے اور رعایتِ لفظی والتزامِ صنائع، سطحیت و عمومیت اور محض مظاہرۂ فن کی مثالیں بھی۔ ممکن ہے بعض حضرات اس طرزِ انتخاب سے متفق نہ ہوں۔ لیکن میری نظر میں انتخاب کلام کے لئے یہی طریقہ زیادہ موزوں ہے ورنہ قارئین کو زیر بحث شاعر کی کوتاہیوں سے بے خبر رکھ کر محض محاسن کی نشان دہی اس کی تصویر کو ادھورا چھوڑ دینے کے مترادف ہوگی۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی روشنی میں ملاحظہ کئے جائیں۔

ملا نصیب ہمیں سنگِ رہ گزر کا سا
کہ ٹھوکروں میں رہا سر تمام عمر کا سا

---

[1] سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ

وہ بارہا مرے رونے پہ ہنستے آئے ہیں
معاملہ ہے بہم برق و ابرِ تر کا سا
نہ سر اٹھائیں گے ہم شوق سے رگا پتھر
کہ ہے خواص یہاں نخلِ بارور کا سا

جو لکھا اللہ نے تقدیر میں اچھا لکھا
اس کے گھر انصاف ہے مذکور کیا بیداد کا
گل کھلے، سبزہ اُگا، صرصر گئی، آئی بہار
چارسو گلزار میں غل ہے مبارک باد کا
سخت جانی پر مری کیا کیا جنوں کو ناز ہیں
ٹوٹ کر شہ رگ میں نشتر رہ گیا فصاد کا

جس کسی نے دل دیا ان کو چھپے چوری دیا
ایک میں کم بخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا
ہائے رے شوخی کہ آ پہونچا جو وہ گھر تک مرے
پھر گیا دربان سے یہ کہہ کر کہ دھوکا ہو گیا

بھولی جو ایک دم کو گریباں دری ہمیں!
وحشت نے یاد دامنِ صحرا دلا دیا
قربان جائیے ترے شوقِ ظہور کے
دے کر فریب خاک میں ہم کو ملا دیا

اس وقت رکھ لیا جو دل اس نے تو کیا ہوا
کافر نہ پھیر دے کہیں ایماں لیا ہوا
کہہ دو خیالِ نرگسِ مخمورِ یار سے
دل خانۂ خدا نہ ہوا مے کدہ ہوا

نہ بناتا جو دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

یار نے دیر تک گلے مِل کر
داغ دل پر دیا جدائی کا
کل تھے رندی کے مجتہد بیمار
آج دعوےٰ ہے پارسائی کا

غبار ہوتا اگر مرا تر تو لے نہ جاتی اڑا کے صرصر
نہ جم کے برسا درِ صنم پر بُرا ہو اس ابرِ آزری کا
ہزار سینے میں سُرخ چھالے، جگر میں کتنے ہیں داغ کالے
رواں کئے آنسوؤں نے نالے، یہ حال یارب نہ ہو کسی کا

کون پُرساں ہے حالِ بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
مُردنی چھا گئی مِرے مُنہ پر
رنگ بدلا نہ اُن کی محفل کا
سانس آہستہ لیجئے بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

قصد کس مقدور پر کیجے بُتوں کی چاہ کا
ہم وہ مفلس ہیں کہ گھر میں نام ہے اللہ کا

محتسب پُوچھے مے پرستوں سے
نام آمرزگار ہے کِس کا

اُبھر کے ہوا سے آئی اُبھر بیشتر کی چوٹ
لا ساقیا شراب کہ سینکیں جگر کی چوٹ

ہوگئی سجدوں سے بُتخانے کے، پیشانی سیاہ
کیا کہیں گے مجھ کو کعبے میں مسلماں دیکھ کر

کیوں نہ آلودہ ہوں صاف دل ہنرور خاک میں
آئینہ جوہر چھپا لیتا ہے مل کر خاک میں
طالع بیدار نے بخشا ہے عشقِ بُو تراب
سوئیں گے آرام سے تا روزِ محشر خاک میں
واہ رے تاثیر تیرے عشقِ عالم سوز کی
خاصہ اکسیر کا پیدا ہوا ہر خاک میں
مرگِ مجنوں میں جو لیلیٰ نے بچھایا بوریا
بن گیا تھا بید مجنوں نقش بستر خاک میں
روحِ بلبل کر گئی پرواز آتے ہی خزاں
کچھ ہوا میں اُڑتے ہیں، کچھ مل گئے، پَر خاک میں

طول سے لپٹی ہے ان کی زلفِ پیچاں پاؤں میں
بیڑیاں پہنے ہے گویا ماہِ کنعاں پاؤں میں
لالۂ احمر کھلا ہے بیخ سے شمشاد کی
بانکتا ہے سُرخ یا پہنے ہے جاناں پاؤں میں
کچھ بھی ہے سر پاؤں یارب ظالموں کے ظلم کا
ملتے ہیں جائے حنا خونِ شہیداں پاؤں میں
سرپرستی سے جنوں کی ہاتھ اٹھائیں گے نہ ہم
گر پڑیں چھالے چبھیں خارِ مغیلاں پاؤں میں
کوئے جاناں میں نہ جا برپا ہے ہنگامہ وہاں
مُفت پس جائے گا اے بیمارِ ناداں پاؤں میں

مسجد میں پی شراب، پڑھی دَیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں
آبِ رحمت سے ہمیں اشکِ ندامت ہے عزیز
یہ وہ پانی ہے کہ جس سے کشتِ ایماں سبز ہو

مے پیو شوق سے رحمت کے طلب گار رہو
مگر اتنی کہ نہ غافل ہو نہ ہشیار رہو

عقلِ کل مجھ کو سمجھتے تھے فرشتے کل تک
آج دیوانہ بتاتے ہیں پری رو مجھ کو

کیا سفر کا ارادہ جو بزمِ جاناں سے
کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے
کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

نہ دل میں لہو ہے نہ آنکھوں میں آنسو
کئے غم سے خالی مکاں کیسے کیسے
خدا میکشوں پر بہت مہرباں ہے
دیئے ابر کے سائباں کیسے کیسے

گر یہی رنگ ہے زمانے کا
باز آیا میں کفر و ایماں سے
بیٹھ جاتا ہے میرے پاس آ کر
جو نکلتا ہے کوئے جاناں سے

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے
کیا دردِ دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے
او بدگماں کہاں میں کہاں محفلِ نشاط
بزمِ عزا میں بھی نہیں ملتی ہے جا مجھے

موت سے بچ گئے گے بیمار
کیا اسے تم شکستہ پا سمجھے

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی
دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

"نیاز آخر الزماں"

چند یادیں، چند تاثرات

مولانا ابو الخیر مودودی

" مولانا ابو الخیر مودودی کی رائے نیاز کے بارے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ زندہ ادیبوں میں ملا واحدی، ارشد تھانوی، ضیا عباس ہاشمی، ل۔ احمد، مولانا ابو الخیر مودودی اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابو الاعلیٰ مودودی وغیرہ چند ایسی شخصیتیں ہیں جو نیاز کے اُس حلقۂ اثر سے تعلق رکھتی ہیں جو اجرائے نگار (۱۹۲۲ء) سے بہت پہلے بھوپال اور دہلی کے زمانۂ قیام میں بن چکا تھا۔ ان میں سے غالباً سبھی نیاز سے عمر میں چھوٹے ہیں تاہم انھیں حضرات کو نیاز کے حقیقی معاصرین میں شمار کرنا چاہیے جن کو نیاز کی شخصیت وفن کے مطالعہ و مشاہدہ کا بڑے قریب سے موقع ملا ہے۔

مولانا ابو الخیر مودودی بعض وجوہ سے نیاز کے اس حلقۂ خاص میں خاص الخاص کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ نیاز کی شخصیت و فکر کے بہت سے سربستہ راز کھول سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے مولانا کے اس مضمون سے ہو گیا تھا جو انھوں نے "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں "نیاز فتحپوری" کے عنوان سے کسی وقت لکھا تھا۔ نیاز سے ابو الخیر مودودی کے اسی تقرب و خصوصیت کے پیشِ نظر شروع سے میری خواہش اور کوشش رہی کہ "نیاز نمبر" میں موصوف کا مضمون ضرور شامل ہو۔ چنانچہ دوسروں کے ساتھ میں نے مولانا سے بھی "نیاز اور بھوپال" کے عنوان پر لکھنے کی گذارش کی۔ مولانا نے میری ہمت افزائی فرماتے ہوئے خط کے جواب میں لکھا:-

> "جی ہاں، نیاز اور بھوپال" پر لکھنے والا ایک یہی نافرجام رہ گیا ہے۔
> کاش .... ! قمر کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابو الاعلیٰ
> "بعد از خدائے بزرگ" ہو گئے اور یہ نافرجام
> "ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا"
> ایک وہ جس نے قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا جس
> نے ادبی درک نیاز صاحب کی صحبتوں میں حاصل کیا اور جس نے
> حضرت نیاز کو ادیبِ زیاں ایک اعلیٰ قسم کا انسان پایا یہ اس کی بدبختی ہوگی

اگروہ امتثالِ فرمان سے قاصر رہے۔ عملاً اب تک قاصر ہی لیکن
دل بحساب اندر" قاصر نہیں ہے۔ ذہن دسویں جنوری سے لکھ رہا
ہے، لکھے جارہا ہے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ذہنی ارتسامات کاغذ پر منعکس
ہوجاتے "

اس جواب کے چند دن بعد بطور یاددہانی میں نے مولانا کو پھر خط لکھا۔ جواب آیا: ــــــــــ

"بھائی "نیاز نمبر" ضرور شائع ہوگا۔ ضرور شائع ہوگا۔ سراپا سپاس نیاز
لکھے گا، ضرور لکھے گا جیسا کچھ بن آئے۔ ساری خرابی یہ ہے کہ جیسا
لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں سکتا اسی لئے لکھتا نہیں اور لکھوں تو پڑھتا
نہیں "

یہ وعدہ کچھ اتنا حتمی تھا کہ بار بار لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خاموشی سے مولانا کے مضمون کا منتظر رہا۔ بدقسمتی سے
مولانا اس اثنا میں بیمار پڑ گئے۔ انھیں لاہور سے باہر کچھ دنوں پنڈی میں قیام کرنا پڑا، مراسلت کا سلسلہ بھی
منقطع ہوگیا یہاں تک کہ "نیاز نمبر" کی پہلی جلد شائع ہوگئی اور مولانا کا مضمون نہ آیا۔

"نیاز نمبر" حصہ دوم کا کچھ حصہ چھپ رہا تھا اور کچھ کی کتابت ہو رہی تھی کہ مولانا خوش قسمتی سے یکایک
کراچی آگئے اور میرے گھر کے قریب اپنے بھتیجے ابو محمود صاحب کے ساتھ سعود آباد میں مقیم ہوئے۔ میری خوشی
کی انتہا نہ رہی۔ مولانا سے ملاقات ہوئی، بزرگانہ شفقت سے پیش آئے اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا فرمانے لگے
"میں ڈیڑھ دو ماہ ٹھہروں گا اور مضمون دو چار دن میں مکمل کرکے دے دوں گا" مجھے اطمینان ہوگیا لیکن
افسوس ہے کہ وہ اپنا مضمون پورا نہ کرسکے اور جب یہاں سے رخصت ہونے لگے تو میرے اصرار پر بولے "آپ یہ
ڈیڑھ صفحے رکھ لیجئے تاکہ آپ کو اطمینان رہے" اور یہ اطمینان دلاکر رخصت ہوگئے۔ دوسرے ہی دن مولانا کا خط
ملا۔ اس میں مضمون کا عنوان درج تھا، ڈیڑھ صفحوں کے علاوہ ابتدائی پیراگراف کا اضافہ تھا اور بقیہ مضمون
جلد بھیج دینے کا وعدہ ــــــ لیکن مولانا خدا جانے کن الجھنوں میں پھنس گئے کہ مضمون مکمل نہ کرسکے۔ "نیاز نمبر"
کا دوسرا حصہ بھی شائع ہوگیا اور مولانا کا مضمون نہ آنا تھا نہ آیا۔

مجھے نیاز نمبر میں اس مضمون کی کمی آج بھی محسوس ہو رہی ہے اور یہی احساس ہے جو اس نامکمل مضمون کو
شائع کرنے پر مجبور کر رہا ہے اس سے کچھ اور ہو یا نہ ہو لیکن نیاز کے متعلق قارئین نگار کو ایک ایسے شخص کی
رائے ضرور معلوم ہوجائے گی جو بہرطور محرم راز ہے۔ "

(فرمان فتح پوری)

نیاز آخر الزماں پر لکھنا آسان یا مشکل؟ جن نیاز صاحب کو میں جانتا ہوں وہ "چاہ ستارہ" اور جو نیاز صاحب عام طور پر
جانے پہچانے جاتے ہیں وہ سیمیائی نمود! معلوم ہے ان کی شخصیت واقع ہوگئی ہے یگانہ، وہ ہیں کچھ اور، اپنے آپ کو دکھاتے
ہیں کچھ اور، سمجھے جاتے ہیں کچھ اور! نہ جانے کیا کیا۔ لیکن مجھے لکھنا ہے اپنے دیکھے بھالے نیاز صاحب کے متعلق۔ دعا:

ِدر رنگ حضرت نیاز کو جھٹلاتا ہے اور نہ یک رنگ نیاز آخر الزماں کو۔

نیاز صاحب سے میری ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ میں اس زمانے میں اپنے بڑے بھائی (ابو محمد صاحب مرحوم) کے سایۂ عاطفت میں بھوپال میں مقیم تھا اور نیاز صاحب سررشتۂ اوقاف میں معاون مہتمم۔ اوقاف کا دفتر ہمارے گھر کے پاس ہی تھا، بہت سے بہت ایک فرلانگ پہلے سے کوئی سلسلہ تعارف نہ تھا، میں نے رقعہ بھیجا، سادہ تخاطب، تسلیم و کورنش سے معرا "نیاز صاحب! ملاقات کا اشتیاق ہے، مجھے وقت دیجیے یا آپ تشریف لائیے" نیاز صاحب تشریف لے آئے۔

کھلتا شیام رنگ عفت کردار سے شاداب و روشن۔ آنکھوں میں گھنیری ذہانت و ذکاوت اور چنچل پن بھی، ننی ڈاڑھی کی خوش نما سنجاف، اک کیفِ استغنا۔

اور معنویت میں تفرد، میں کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ شاید معارف یا نقاد، نیاز صاحب نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے "چونکایا": "یہ کیا پڑھ رہے ہو! "ساقی نامہ" پڑھو، "ابر گہربار" پڑھو" اور بات فارسی کلاسک میں چل نکلی۔ پھر اس قرینے سے عام ادبی مساحت جیسے شفیق مربی مدت کے بعد اپنے دست گرفتہ سے ملے اور نہ یہ نہ باتوں سے سمجھانے کہ تربیت رائیگاں تو نہیں گئی، اور وضع داری سے یہ ایما بھی کہ درسی کلاسک کو ایک بار پڑھ لینا کافی نہیں، ذہن میں ادبی رچاؤ کے لئے مزاولت ضروری ہے۔

"یہ کیا پڑھ رہے ہو!" "کیا پڑھا؟" سب تحلیل ہو گیا۔ کتابوں کے بغیر کتابوں کی سیاحت، ادبی بات چیت میں لاہوت سے ناسوت تک سبھی کچھ، اور یہ سب کچھ اسی حسنِ مراعات کے ساتھ جس کے اقتضا سے مجاز کو حقیقت میں ملفوف کیا گیا تھا اور یوں ملاقات کے ساتھ ہی راہ و رسم خسروانہ نیاز مندی اور بزرگانہ شفقت میں ڈھل گئی۔ بزرگی میں دوستی کا دل کش امتزاج، بے تکلفی میں اک تکلف، تکلف میں اک بے تکلفی، چھوٹا سا غیر مبہم ایک خط؛ حدِ فاصل بھی اور حدِ اشتراک بھی۔

یہ خصوصیت کچھ میرے ہی ساتھ نہیں تھی، قمر الحسن (مرحوم) سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی یہی حسن تادیب تھا، ابوالاعلیٰ سے ملاقات ہوئی تو ان کے ساتھ بھی، قمر، قدیم داستانی ادب کے رسیلے تھے، پورب دیس کے لوک گیت کہانیاں ان کو بہت یاد تھیں۔ ان کی آمد سے ادبی سیاحت میں ایک اور افق پیدا ہوا، ابوالاعلیٰ کو کلامیات سے شغف تھا، مساحت کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ ہماری شامیں نیاز صاحب کی خواجہ تاشی میں گزرتی رہیں۔ پھر نیاز صاحب نے ہمیں لکھنے پر ابھارا: "صرف باتیں ہی نہیں کچھ کام بھی ہونا چاہیئے، تم لوگ لکھو اور پڑھ کے سنایا کرو، ہر مہینے کم سے کم ایک مضمون۔" ہم تینوں کے لئے حسبِ ذوق مستقل موضوع بھی مقرر کئے۔ لکھنا اور سنانا اٹل تھا۔ مجھے نیاز صاحب ملک الموت نظر آنے لگے، لیکن زجرِ مشفقانہ سے مفر بھی نہ تھا۔ گھاس کاٹنی ہی پڑتی۔ مستعدی سے ہر مہینے صرف ابوالاعلیٰ ہی لکھتے سناتے۔ یہ لکھنا سنانا ان میں ایسا رچا کہ لکھ کے سنانے کی طرح پڑھنا ان کی عادتِ تحریر بن گیا ——"

———— ————

(میر عبدالکریم ۔ جالنہ)

میر جعفر زٹلی ایک مشہور بدنام شاعر ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون تھا، کیا تھا اور کس زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کو زٹلی کیوں کہنے لگے اور زٹلی کس زبان کا لفظ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ اردو کا شاعر تھا اور بعض اسے فارسی گو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے کلام کا مجموعہ کہیں پایا جاتا ہے یا نہیں اور وہ کس نوعیت کا ہے میں ممنون ہوں گا اگر آپ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔

(نگار) میر جعفر زٹلی کے نام سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن اس کے حالاتِ زندگی یقیناً پردہ تاریکی میں ہیں بعض کتابوں سے کچھ کچھ روشنی ضرور اس کے سوانح پر پڑتی ہے لیکن اتنی اور ایسی نہیں کہ ہم اسے تاریخی صداقت سے تعبیر کر سکیں۔ مثلاً سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے تخلص زٹلی خود اختیار کیا تھا یا دوسروں نے اس تخلص سے اسے مشہور کر دیا نیز یہ کہ لفظ زٹلی کی اصلیت کیا ہے اور یہ اردو میں کہاں سے آیا۔

اردو میں زژ، زٹل، زیٹ اور زٹلی چاروں لفظ مستعمل ہیں۔ زژ۔ زٹل اور زیٹ کا ایک ہی مفہوم ہے جسے فارسی میں ہرزہ گوئی یا یاوہ گوئی کہتے ہیں یعنی لغو و بے اصل باتیں کرنا۔ اسی میں یائے نسبتی بڑھا کر زٹلی کر دیا۔ یعنی وہ شخص جو بے تکی باتیں کرنے کا عادی ہے اور زژ میں یائے نسبتی بڑھائی تو وہ زژی کی جگہ سڑی ہو گیا (ہو سکتا ہے سڑی یا سڑا بمعنی دیوانہ براہ راست سڑ سے لیا گیا ہو)

اس لفظ کا ماخذ کیا ہے اور اردو میں کہاں سے آیا اس کے بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر منشی محمد الدین مصنف "حیاتِ زیب النساء" کا یہ بیان صحیح ہے کہ یہ لقب یا خطاب زیب النساء (دختر عالمگیر) کا دیا ہوا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لفظ زٹل عہد عالمگیر میں رائج تھا اور وہ سنسکرت، ترکی، فارسی یا عربی سے لیا گیا ہوگا لیکن چونکہ ترکی و فارسی میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کو زٹل کا ماخذ قرار دیا جائے اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ لفظ عربی "جدل" سے

لیا گیا ہو جس کے معنی خصومت یا رستی بٹنے کے ہیں یا پھر کسی سنسکرت لفظ سے جس کا ہمیں علم نہیں بہر حال یہ محض قیاس ہی قیاس ہے اور اس کے تخلص کے ماخذ کے بابت کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

محمد کامل نے اپنی کتاب "زرجعفری" (مطبوعہ لاہور ۱۸۷۰ء) میں میر جعفر کے جو حالات درج کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

> "میر جعفر کے بابت کہا جاتا ہے کہ وہ نارنول میں پیدا ہوا لیکن اس کے اسلاف ایران نژاد تھے۔ عہد ہمایوں میں ہندوستان آئے اور فوجی خدمات کے سلسلہ میں جاگیر بھی پائی۔ لیکن عہد شاہجہاں میں سید عباس (میر جعفر کے باپ) سے یہ جاگیر لے لی گئی۔ اس کے بعد اس کی مالی حالت بہت سقیم ہو گئی اور بیوی کی کمائی پر (جو خیاطی کا کام کرتی تھی) گزر بسر ہونے لگی۔ کچھ دن بعد اس نے ایک دکان کھول دی اور اپنے کسی عزیز کی مدد سے جو دکن میں مقیم تھا کاروبار کو اتنی وسعت دی کہ وہ خوشحال ہو گیا۔"

میر جعفر، اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت ۱۶۵۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کی دو بہنیں بھی تھیں اور ایک چھوٹا بھائی جس کا نام صفدر تھا۔ جب سید عباس کا انتقال ہوا تو جعفر بہت کمسن تھا اسلئے اس کی تعلیم و تربیت اس کے چچا سید سرور نے کی اور اپنے بیٹے اکبر کی شادی جعفر کی بڑی بہن سے کر دی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ عالمگیر کے بیٹے اعظم شاہ سے وابستہ ہو گیا۔

تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر نے ایک ہجویہ نظم پر برافروختہ ہو کر اسے ۱۱۲۹ھ میں قتل کرا دیا۔

یہ مرزا بیدل کا ہمعصر تھا اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ریختہ میں شاہنامہ بھی لکھا تھا۔

علاوہ غزلیات، مثنویات و رباعیات کے اس نے عالمگیر ثانی اور شاہ عالم کی تعریف میں قصائد بھی لکھے۔ اس کی ہجویات کا ذخیرہ کافی ہے جن میں سے بعض فارسی کی اور بعض ملی جلی فارسی و ریختہ میں،

(۲)

علاؤالدین اور پدماوتی

(عبدالرحمان خان - پشاور)

ملک محمد جائسی کی پدماوت میں جو قصہ علاؤالدین اور پدماوتی کا نظم

کیا گیا ہے اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور علاوہ جائسی کے دوسرے
کن کن شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔

(نگار) یہ قصہ سب سے پہلے فارسی میں حسین غزنوی نے نظم کیا۔ پھر ملک محمد جائسی نے دسویں صدی ہجری میں بہ عہد شیر شاہ ہندی میں منتقل کیا۔ اس کے بعد ۱۰۶۲ھ میں رائے گوبند منشی نے "تحفۃ القلوب" کے نام سے اس کو فارسی نثر میں تحریر کیا اور ۱۲۱۱ھ میں اس کا پہلا حصہ اردو میں ضیاء الدین عبرت نے نظم کیا اور دوسرا حصہ غلام علی عشرت نے۔
یہ قصہ بالکل فرضی ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ خود جائسی نے بھی اس کا اظہار کر دیا ہے کہ یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔

قصہ جو بیان کیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بہت مختصر ہے۔ یعنی یہ کہ علاؤ الدین، پدماوتی کا نادیدہ عاشق تھا اور اس نے چتوڑ پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ وہ راجہ رتن سین کو مغلوب کر کے پدماوتی کو لے آئے لیکن جب چتوڑ فتح ہوا تو پدماوتی ستی ہو گئی ـــ اس قصہ کی لغویت سب سے پہلے تو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ پدماوت کو کوئی رتن سین کی بیوی ظاہر کرتا ہے اور کوئی بیٹی۔ حالانکہ پدماوت دراصل راجہ لنکا کی لڑکی تھی جسے رتن سین راجہ چتوڑ، بہ جبر لے آیا تھا۔
اب اصل واقعات ملاحظہ کیجئے :۔

۱۳۰۰ء تک علاؤ الدین اپنی سلطنت بڑی حد تک مستحکم کر چکا تھا۔ اور بڑے بڑے قلعے جن پر ہندو راجپوت قابض تھے مسخر ہو چکے تھے۔ البتہ صرف ایک چتوڑ کا قلعہ باقی رہ گیا تھا جس پر اس نے ۱۳۰۳ء میں حملہ کیا اور راجہ رتن سین کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا۔ پدماوتی حملہ کے وقت ہی قلعہ سے باہر نکل کر کہیں چھپ گئی تھی اس لئے وہ ہاتھ نہ آئی لیکن رتن سین کا بھانجا البتہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور علاؤ الدین نے اسے اپنا مصاحب بنا لیا۔

علاؤ الدین نے چلتے وقت خضر خاں اپنے ولی عہد کو یہاں کا گورنر مقرر کیا اور تاکید کر دی کہ جو باغی فرار ہو گئے ہیں ان کا تعاقب کر کے گرفتار کیا جائے لیکن خضر خاں عیش پسند انسان تھا اس لئے اس نے پروا نہ کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مفرور راجپوتوں نے پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنا مرکز قائم کر کے رانی پدماوتی کو اپنا فرماں روا تسلیم کر لیا۔
جب علاؤ الدین کو اس کا علم ہوا تو اس نے رتن سین کے بھانجے سے جو اس کا مصاحب تھا اس کا ذکر کیا اس نے کہا کہ رتن سین آپ کا قیدی ہے اس کو حکم دیجئے کہ وہ رانی کو اپنے پاس بلالے اور شورش و بغاوت ختم کر دے۔ سلطان نے اس رائے کو پسند کیا اور ایک خط اس مضمون کا رتن سین سے لکھوا کر پدماوتی کو بھجوا دیا۔ پدماوتی نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے میں آتی ہوں لیکن کیا یہ کہ پالکیوں میں مسلح راجپوتوں کو بٹھا کر فہمایش کی کہ دہلی میں داخل ہونے سے پہلے رتن سین کو استقبال کے لئے طلب کرنا اور جب وہ آجائے تو اسے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں لے آنا اور شاہی محافظوں کو قتل کر دینا پدماوتی کی یہ چال کامیاب ہوئی اور رتن سین پھر چتوڑ میں پہنچ کر سلطان کے خلاف سازشیں کرنے اور قرب و جوار میں ڈاکے ڈالنے لگا۔

سلطان کو جب اس کا علم ہوا تو بہت برافروختہ ہوا۔ لیکن چونکہ اس وقت وہ مغلوں سے برسرِ پیکار تھا
اس لئے خود نہ جا سکا اور خضر خاں کو گورنری چتوڑ سے ہٹا کر رتن سین کے بھانجہ کو وہاں کا عامل مقرر کیا جس نے ترکیبوں
سے راجپوتوں کو اپنی طرف مائل کر لیا چنانچہ فرشتہ کا بیان ہے کہ

"بادشاہ قلعہ را از خضر خاں گرفتہ بخواہرزادہ رائے عنایت فرمود۔ واو
در اندک زمانے اقتدار بہم رسانید وجمیع راجپوتان بحکومت او راضی شدند"

اس قصہ کے سلسلہ میں دو باتیں اور بھی ظاہر کی جاتی ہیں ایک یہ کہ جب دوبارہ سلطان نے چتوڑ پر حملہ کیا اور
وہیں داخل ہوا تو رانی چتائیں بیٹھ کر ستی ہو چکی تھی۔ دوسرے یہ کہ راجپوتوں نے خود قید خانہ میں پہونچکر رتن سین کی
بیڑیاں کاٹیں۔ یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔ پہلی تو اس لئے کہ سلطان نے دوبارہ چتوڑ پر حملہ کیا ہی نہیں اور دوسری
اس لئے کہ خود ایک ہندو مورخ سجان سنگھ بھنڈاری بالکل وہی تفصیل بیان کرتا ہے جو ابھی ہم ظاہر کر چکے ہیں اس کے
الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"القصہ لشکر باڈولہ بلحظہ منازل نمودہ درحوالی دہلی رسید وسرداران لشکر بموجب تلقین آں بانوے
پُر فراست از زبان آں عصمت مآب سلطان را پیغام کردند .... سلطان بے توقف رائے را
خلاص دادہ ہمراہ کسان خود روانہ ساخت وبمجرد آنکہ رائے بہ لشکر خود ملحق گردید جوانان شجاعت نشان
یکسان سلطان بہ جنگ پیش آمدہ اکثرے را بہ قتل در آوردند"

اب رہا یہ امر کہ بعد کو رتن سین اور پدماوتی پر کیا گزری اور وہ دونوں کہاں چلے گئے اس کا ذکر کسی تاریخ
میں نہیں ملتا۔

(۳)

تصانیف عرفی - دیوانِ فارسی میر تقی میر

(جناب رحمت اللہ۔ باندی کوئی)

(۱) اس وقت تک عرفی کی تصانیف میں زیادہ تر اس کے قصائد ہی ہکر
سامنے آئے ہیں اور کبھی کبھی غزلوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ
اس کی کسی اور تصنیف نثر یا نظم کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ کیا یہ صحیح ہے
کہ اس نے قصائد وغزلیات کے علاوہ کسی اور صنف سخن پر توجہ نہیں
کی؟ ممکن ہو تو یہ بھی بتائیے کہ ان کے قصائد کے شارحین کون کون
تھے؟

(۲) میر تقی میر ریختہ کا شاعر ہونے کے لحاظ سے تو بہت مشہور ہیں لیکن ان
کا فارسی کلام کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ اگر آپ کی نگاہ سے انکا فارسی
کلام گزرا ہو تو اس کے بابت اپنی رائے سے مطلع فرمائیں

نگار : یہ بالکل درست ہے کہ عرفی کا نام لیتے ہی صرف اس کے قصائد ہمارے سامنے آتے ہیں اور اس کی غزل گوئی کی طرف خیال بہت کم منتقل ہوتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ اس کی شہرت کا تعلق دربار سے تھا اور دربار میں رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ قصائد ہی ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کہ قصائد کے علاوہ اس نے کچھ اور لکھا ہی نہیں۔ اس نے قصائد کے علاوہ غزل، قطعہ، رباعی، ترجیع بند وغیرہ سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس وقت تو کلیات عرفی کیا، اس کا مجموعہ قصائد بھی میسر نہیں لیکن بعض کتب خانوں میں اس کی تمام تصانیف اب بھی محفوظ ہیں گو ان کے مخطوطات میں کچھ اختلاف ترتیب کا ضرور پایا جاتا ہے جس کی تفصیل اس جگہ نامناسب نہ ہوگی اسپرنگر نے جو کٹلاگ اَوَدھ کتب خانہ کا مرتب کیا ہے اس میں دو نسخوں کا ذکر پایا جاتا ہے ایک مجموعہ ہے ۲۰۰ قصائد اور ۴۰۰ غزلوں کا۔ پہلے قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے :-

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشترِ لا و نعم را

اور پہلی غزل کا پہلا شعر یہ :-

اے نہ فلک زخوشۂ صنع تو دانۂ
در قصر کبریائے تو عرش آشیانۂ

دوسرا نسخہ ۲۶ قصائد، ۲۷۰ غزل، ۲۲۰ قطعات، ۳۸۰ رباعیات اور دو مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ میں غزل کا پہلا شعر یہ ہے :-

تحفۂ مرہم نگیرد سینۂ افگارِ ما
سایۂ گل بر نتابد گوشۂ دستارِ ما

مثنوی مجمع الابکار (جو مخزنِ اسرار کے جواب میں لکھی گئی ہے) ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
موجِ نخست است زبحرِ قدیم

دوسری مثنوی (۲۹ صفحات) فرہاد و شیریں ہے جو نظامی کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے

خدا وندا دلم بے نور تنگ است
دلِ من تنگ و کوہ طور سنگ است

اور پہلی رباعی یہ :-

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی	چوں گشت مکمل برقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت	اوّل دیوانِ عرفی شیرازی

برٹش میوزیم کے کٹلاگ میں جس کلیات کا ذکر کیا گیا ہے اس میں پہلی غزل کا پہلا شعر تو وہی ہے جو اودھ کٹلاگ میں پایا جاتا ہے یعنی :۔

اے نُہ فلک ز خوشۂ صنع تو دانۂ
در قصرِ کبریائے تو عرش آشیانۂ

لیکن پہلا قصیدہ یہ ہے :۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ.....

اس کے بعد دو مثنویاں نظر آتی ہیں ایک مثنوی "مجمع الابکار" جس کا پہلا شعر وہی ہے جو پہلے درج کیا گیا۔ دوسری مثنوی "فرہاد وشیریں" بجواب خسرو شیریں نظامی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

حمد و ندا دلم بے نور تنگ است

ترجیع بند ابوالفتح کا پہلا مصرع یہ ہے :۔

آیدم چوں دوا شفیق و نفنیص

پہلے قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے :۔

اے دلِ راہ زن کہ از عرشم
بحضیضِ ثرا فرستادی

اس کے بعد رباعیاں ہیں اور پھر ایک تحریر نثر ابوالفتح کے نام۔ اس کے علاوہ ایک دیباچہ فالنامہ ہے جو اکبر کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔

بانکی پور لائبریری کے نسخہ میں علاوہ قصائد وغزلیات وغیرہ کے ایک رسالۂ نثر "نفسیہ" کا ذکر بھی پایا جاتا ہے جس کا تمہیدی فقرہ یہ ہے

"حمدے کہ از شائستگی منزہ از شائبۂ تعین و
تشخص آمدہ"

اور اخیر میں ایک خط ہے جس کا عنوان ہے :۔

"رقعۂ کہ در ہنگامِ نزع تحریر فرمودہ"

دو مثنویاں "مجمع الابکار" اور "فرہاد وشیریں" بھی اس میں شامل ہیں۔ دیوان کا پہلا شعر وہی ہے جو دوسرے نسخوں میں پایا جاتا ہے، پہلی رباعی البتہ مختلف ہے :۔

اے زلفِ عروس شادمانی شب تو
آرائش بزم بے غمی مشرب تو

اخیر میں ایک ساقی نامہ بھی ہے جو یوں شروع ہوتا ہے۔

بیا ساقی آں تشنگی را بسنج
پس از آرزوئے دل ما مرنج

کہ وہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ اگر آپ کی نگاہ سے انکا فارسی
کلام گزرا ہو تو اس کے بابت اپنی رائے سے مطلع فرمائیں

نگار (۱) یہ بالکل درست ہے کہ عرفی کا نام لیتے ہی صرف اس کے قصائد ہمارے سامنے آتے ہیں اور اس کی غزل گوئی کی طرف خیال بہت کم منتقل ہوتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ اس کی شہرت کا تعلق دربار سے تھا اور دربار میں رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ قصائد ہی ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں کہ قصائد کے علاوہ اس نے کچھ اور لکھا ہی نہیں۔ اس نے قصائد کے علاوہ غزل، قطعہ، رباعی، ترجیع بند وغیرہ سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس وقت تو کلیاتِ عرفی کیا، اس کا مجموعہ قصائد بھی میسر نہیں لیکن بعض کتب خانوں میں اس کی تمام تصانیف اب بھی محفوظ ہیں گو ان کے مخطوطات میں کچھ اختلاف ترتیب کا ضرور پایا جاتا ہے جس کی تفصیل اس جگہ نامناسب نہ ہوگی اسپرنگر نے جو کیٹلاگ اودھ کتب خانہ کا مرتب کیا ہے اس میں دو نسخوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ایک مجموعہ ہے ۲۰۰ قصائد اور ۲۰۰ غزلوں کا۔ پہلے قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے:-

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشترِ لا و نعم را

اور پہلی غزل کا پہلا شعر یہ:-

اے نہ فلک زخوشۂ منع تو دانۂ
در قصر کبریائے تو عرشش آشیانۂ

دوسرا نسخہ ۲۶ قصائد، ۲۰۰ غزل، ۲۲۰ قطعات، ۲۸۰ رباعیات اور دو مثنویوں پر مشتمل ہے۔ اس نسخہ میں غزل کا پہلا شعر یہ ہے:-

تحفۂ مرہم نگیرد سینۂ افگار ما
سایۂ گل بر نتابد گوشۂ دستار ما

مثنوی مجمع الابکار جو مخزنِ اسرار کے جواب میں لکھی گئی ہے، ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
موج نخست است ز بحر قدیم

دوسری مثنوی (۲۹ صفحات) "فرہاد و شیریں" ہے جو نظامی کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے

خدا وندا دلم بے نور تنگ است
دلِ من تنگ و کوہ طور سنگ است

اور پہلی رباعی یہ:-

ایں طرفہ نکات سحری واعجازی	چوں گشت مکمل برقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت	اول دیوانِ عرفی شیرازی

برٹش میوزیم کے کٹلاگ میں جس کلیات کا ذکر کیا گیا ہے اس میں پہلی غزل کا پہلا شعر تو وہی ہے جو اودھ کٹلاگ میں پایا جاتا ہے یعنی :-

اے نُہ فلک ز خوشۂ صنع تو دانۂ
در قصرِ کبریائے تو عرش آشیانۂ

لیکن پہلا قصیدہ یہ ہے :-

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ ....

اس کے بعد دو مثنویاں نظر آتی ہیں ایک مثنوی "مجمع الابکار" جس کا پہلا شعر وہی ہے جو پہلے درج کیا گیا۔ دوسری مثنوی "فرہاد و شیریں" بجواب خسرو شیریں نظامی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

حمد و ثنا دلم بے نور تنگ است

ترجیع بند ابوالفتح کا پہلا مصرع یہ ہے :-

آمدم چوں دوا شفیق و نفیض

پہلے قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے :-

اے دلِ راہ زن کہ از عرشم
بحفیفِ ثرا فرستادی

اس کے بعد رباعیاں ہیں اور پھر ایک تحریر نثر ابوالفتح کے نام۔ اس کے علاوہ ایک دیباچہ فال نامہ ہے جو اکبر کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔

بانکی پور لائبریری کے نسخہ میں علاوہ قصائد وغزلیات وغیرہ کے ایک رسالۂ نثر "نفسیہ" کا ذکر بھی پایا جاتا ہے جس کا تمہیدی فقرہ یہ ہے

"حمدے کہ از شائستگی منزہ از شائبۂ تعین تشخص آمدہ۔

اور آخیر میں ایک خط ہے جس کا عنوان ہے :-

"رقعۂ کہ در ہنگام نزع تحریر فرمودہ"

دو مثنویاں "مجمع الابکار" اور "فرہاد و شیریں" بھی اس میں شامل ہیں۔ دیوان کا پہلا شعر وہی ہے جو دوسرے نسخوں میں پایا جاتا ہے، پہلی رباعی البتہ مختلف ہے :-

اے زلف عروس شادمانی شب تو
آرائش بزم بے غمی مشرب تو

اخیر میں ایک ساقی نامہ بھی ہے جو یوں شروع ہوتا ہے۔

بیا ساقی آں تشنگی را بسنج
پس از آرزوئے دل ما مرنج

انڈیا آفس لائبریری میں دو نسخے ہیں۔ ایک نسخہ میں قصائد کی ترتیب تو وہی ہے جو دوسرے نسخوں میں پائی جاتی ہے لیکن ایک میں پہلی غزل وہ ہے جو "تحفۂ مریم نگیرز" سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے کا یہ شعر ہے

کوئے عشق است وہا داشودام است اینجا
حلق مردم آزادہ حرام است اینجا

قطعات میں پہلا قطعہ اس مصرع سے شروع ہوتا ہے

اے کہ در آئینہ ام خود را سیہ رو دیدئی

اور رباعی اس شعر سے :-

یارب نفس دہ کہ ثنا پردازم
دیں نغمہ بہ آہنگ سزا پردازم

ان نسخوں میں مثنوی "مجمع الابکار" بھی ہے اور "فرہاد و شیریں" بھی ہے۔ اور رسالہ نثر "نفیسہ" بھی جس کا اس میں "نفس نفیس" درج ہے۔

رہا سوال قصائد عرفی کی شرحوں کا سو اس کی ایک مشہور شرح تو وہ ہے جو منیر لاہوری نے لکھی ہے۔ دوسری احمد بن عبدالرحیم صفی پوری کی ہے۔ تیسری کا نام "نگار نامۂ فیض" ہے جسے محمد شفیع بن شاہ محمد درویش نے مرتب کیا۔ چوتھی شرح مولوی محمد وجیہہ کی ہے پانچویں ملا اسعد اللہ کی۔

---

(۲) میر کا فارسی دیوان میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن میں عرصہ سے اس کے مطالعہ کا متمنی ہوں تاکہ اس کی اردو فارسی شاعری کے فرق کو معلوم کرسکوں۔

اودھ کتب خانہ میں میر کے فارسی دیوان کے دو مخطوطے تھے۔ ایک کے قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوا تھا اس میں ۲۱۰ صفحات غزلوں کے ہیں اور ۴۰ صفحات رباعیات و فردیات۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے :-

اے ز انعامِ تو واشد غنچۂ امکانِ ما
آب درجو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما

دوسرا دیوان جو ۱۲۱۱ھ میں نقل کیا گیا اس میں غزلیات ۲۸۰ صفحات کو محیط ہیں اور پہلا شعر یہ

الٰہی جوششِ طوفاں بخش چشمِ اشکبارم را
سحابِ دجلہ افشاں کن رگِ ابرِ بہارم را

ان کے علاوہ ایک قصیدہ مدح عنایت اللہ میں ہے اور چند مخمس، رباعیات و حکایات شاعرانہ بھی ہیں اس میں ایک مثنوی "گنجینۂ راز" بھی شامل ہے (۴۸ صفحات کی) جس کا پہلا شعر یہ ہے

رئیسے بہ پرسید از برہمن کہ اے واقفِ حادثاتِ کہن

سُنا ہے میر کے فارسی کلیات کا ایک مکمل نسخہ علیگڑھ یونیورسٹی میں محفوظ ہے ممکن ہے رامپور کے کتب خانہ میں بھی ہو لیکن یہ سب میری دسترس سے باہر ہیں

منظومات

مولانا جمیل مظہری

برادرم فرمان صاحب!

سلام دعا۔

"نگار" کا "نیاز نمبر" مجھے بھیج کر جو آپ نے احسان فرمایا ہے کہ اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ نمبر کا کیا کہنا، اس قسم کے جتنے نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں ان میں سے سب سے بہتر ہے لیکن نیاز کا قرض صرف ایک نمبر نکال کر ادا نہیں ہو سکتا اس سلسلہ کو جاری رکھیئے اور اب کے ایک اور نمبر نکالیئے جس میں ان تمام ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ ہو جن کا ادبی ذوق نیاز صاحب کا تربیت یافتہ ہے اور جنھیں "نگار" نے ادبی دنیا میں روشناس کرایا۔ وہ تمام ستارے جو "نگار" کے افق سے طلوع ہوئے اُن کا شمار میں نیاز صاحب کی تصنیفات میں کرتا ہوں ان تمام ستاروں کا ایک باتصویر نمبر "کہکشانِ نگار" کے نام سے شائع کیجئے تو شاید ادبی دنیا "نگار" اور نیاز کی ادبی خدمات کا صحیح اندازہ کر سکے۔

نیاز صاحب کی خدمت میں میرا سلامِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان سے پوچھئے کہ مجھ سے وہ کس قصور پر خفا ہو گئے ان کے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے میں نے کئی خطوط ان کی مزاج پرسی اور عیادت کے سلسلہ میں لکھے لیکن خلاف معمول ایک کا بھی جواب نہ ملا۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ کوئی خطا ضرور مجھ سے سرزد ہوئی۔ بہرحال مجرم کو سزا سے پہلے اس کے جرم سے آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ وہ آئندہ محتاط رہے۔

ایک گذارش اور! نیاز صاحب نے اپنے قلم سے جو اپنے حالات لکھے ہیں وہ حالات کیا ہیں ہم لوگوں کو بالکل ٹھگ دیا ہے، ان سے اصرار نہیں

ضد کیجئے کہ وہ بالتفصیل اپنی ایک خود نوشت سوانح عمری لکھیں اور روسو کی طرح سے تمام واقعات کو بغیر کسی تکلف کے بیان کر دیں یہ ایک بڑا تہذیبی اور ادبی سرمایہ ہوگا جو وہ آیندہ نسلوں کی رہنمائی کے لئے چھوڑ جائیں گے۔ خدا ان کا سایہ "تا دیر ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔

نیاز نمبر کہیں سے قابل اعتراض نہیں صرف ایک کمی مدحیہ نظموں کی ہے۔ شعراء نے نیاز صاحب کا خراج انھیں ادا نہیں کیا۔ فراق نے ایک قصیدہ لکھنا بھی چاہا تو تشبیب سے آگے نہ بڑھ سکے۔ میں دوسروں کو کیا الزام دوں جب میں خود اس سلسلہ میں ایک مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہوں۔ بہرحال عذر گناہ کے طور پر چند اشعار کی ایک نظم بھیج رہا ہوں جو ممدوح کے شایانِ شان تو نہیں ہے لیکن مداح کے سچے جذبات کی ترجمان ضرور ہے۔ اگر جلد دوم بالکل مرتب نہ ہو چکی ہو تو اسے کسی گوشے میں جگہ دے دیجئے ورنہ "مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید برکلہ خود باید زد" کے اصول پر میرے منہ پر پھینک مارنے کی جگہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیجئے — "

ایک سجدۂ عقیدت

نیاز! پیکرِ معنی میں تجھ سے جانِ سخن
نیاز! روحِ ادب کا مزاج داں تُو ہے

جمیل سے تری عظمت کا اعتراف ہو گیا
کہ گردِ راہ ہے وہ میرِ کارواں تُو ہے

بلندیوں کا تصور ابھی سفر میں رہے
کہ وہ مقام ابھی دُور ہے جہاں تُو ہے

شرارے جس کے ستارے وہ آگ ہے تجھ میں
ستارے جیسے ہیں سورج وہ کہکشاں تُو ہے

یہ کرہ ہائے درخشاں یہ مہر و ماہ و نجوم
ہیں پارہ ہائے جگر تیرے آسماں تُو ہے

یہ پھول جن کے تبسم پہ ہے چمن نازاں
ترے ہی دل کے ہیں ٹکڑے کہ باغباں تُو ہے

رگِ چمن میں عرق تیری جانفشانی کا
بہار کیا ہے؟ ثمر تیری باغبانی کا

ترا ادب پہ نہیں زندگی پہ احساں ہے
کہ زندگی کو نیا اک مزاج تو نے دیا

اگر زجاج کو دی پتھروں کی سنگینی
تو پتھروں کو بھی قلبِ زجاج تو نے دیا

فنون و فکر میں اک ارتباط تجھ سے ہُوا
جنون و عقل کو اک امتزاج تو نے دیا

مزاجِ عشق کا بے اعتدال تھا جس سے
اس اضطراب کو اک ابتہاج تو نے دیا

چمن کی روحِ نمو نے جو اپنا حق مانگا — تو اپنے خونِ جگر سے خراج تو نے دیا
خرد نے پھونک دیئے وہم کے گھنے جنگل — وہ شعلۂ تپشِ احتجاج تو نے دیا

سوادِ ذہن کو تاریکیوں نے گھیرا تھا
چراغ تو نہ جلاتا تو گھپ اندھیرا تھا

شارقؔ میرٹھی

اُٹھانے کو تو اُٹھا رہا ہوں نہ اُٹھے جو بارِ غم کسی سے — نزاکتِ دل کا ہے یہ عالم کہ چوٹ لگ جاتی ہے ہنسی سے
کوئی یہ سوچے وہ کیا کرے گا تباہ ہوں کا گلہ کسی سے — جو اُن کو ہر ظلمِ ناروا کو عزیز رکھتا ہے زندگی سے
جو مجھ سے میرا سکون لے لے، سکون لے کر عذاب دے دے — وہ آگہی کوئی آگہی ہے میں باز آیا اس آگہی سے
ہزار چاہے زمانہ لیکن یہ دردو آلام کے اندھیرے — اگر ہوئے دُور تو یہ ہوں گے فقط محبت کی روشنی سے
کسی کی محفل سے اُٹھ تو آئے مگر یہ ہے اپنا حال شارقؔ — کسی اندھیرے میں آگئے ہوں گذر کے ہم جیسے روشنی سے

منزلیں اسی کی ہیں جو قدم بڑھاتا ہے — تھک کے گرنے والا تو گردِ راہ پاتا ہے
اس کو کیا ہو اندیشہ بجلیوں کی یورش کا — جو خود اپنے ہاتھوں سے آشیاں جلاتا ہے
گُل ہوں یا شگوفے ہوں حق اسی کا ہے اِن پر — جو لہو کی چھینٹوں سے گلستاں سجاتا ہے
اس کے عزم و ہمت کو دیکھئے جو گلشن میں — بجلیوں کے سایہ میں آشیاں بناتا ہے

فضاؔ جالندھری

یارب نہ ہمکنارِ اثر ہو مری دعا — کم ہو نہ جائے کیف کہیں انتظار کا

بہت تلاش کی لیکن نشاں نہیں ملتا — چمن ملا ہے مگر آشیاں نہیں ملتا

صیّاد دیکھ لینے دے جی بھر کے آشیاں — اس باغ میں دوبارہ تو آیا نہ جائے گا

زمانے میں ہزاروں انقلاب آئے مگر اب تک — نہ رندوں کی روش بدلی نہ واعظ کا بیاں بدلا

تقدیر سے مایل بہ کرم ہیں وہ نگاہیں — بلّٰہ ذرا گردشِ ایّام ٹھہر بھی

حکیم مومن خاں مومن

سعادت نظیر

وہ پھول تھے کہ مہکتا تھا گلستاں جن سے وہ تارے تھے کہ چمکتا تھا آسماں جن سے
وہ خوش نظر تھے کہ رنگین تھا جہاں جن سے

یہ رنگِ یاد جو عنوان ہے فسانے کا وہ عکس ہے کسی گزرے ہوئے زمانے کا

غزل میں میر کا سوز و گداز کیا کہنا سرآج و درد کا راز و نیاز کیا کہنا
خیالِ غالبِ معنی طراز کیا کہنا
بلند پھر بھی ہے تیرا مقام اے مومن کچھ اور ہے ترا رنگِ کلام اے مومن

بطرزِ نو ترے اسلوب میں لطافت ہے بہ پاسِ وضع ترے طنز میں حلاوت ہے
بلا کی تیرے لب و لہجہ میں نزاکت ہے
لطیف اشاروں کی صورت گری نظر آئی سخن میں شوق کی شائستگی نظر آئی

فروغِ فن سے تری شاعری عبارت ہے ترا بیان فسانہ نہیں، حقیقت ہے
کہیں ہے شوخی کہیں دل رُبا متانت ہے
تری غزل میں ترا بانکپن نظر آیا غضب کا نکھرا ہوا حُسنِ فن نظر آیا

زمانے والے ترا مرتبہ گھٹا نہ سکے　　کبھی ترے غمِ پردہ نشیں کو پا نہ سکے
تری نشاطِ تغزّل سے لُطف اُٹھا نہ سکے
سخن شناس تجھے خوش کلام کہتے ہیں　　غزل نگاروں کا تجھ کو امام کہتے ہیں

نہ اور کوئی تمنا، نہ کوئی ارماں ہے　　اِک آرزوئے بتاں ہے کہ تیرا ایماں ہے
تری نگاہ کا مقصود حُسنِ انساں ہے
خرد فروز صداقت ہے تیری محفل میں　　وہی زباں پہ ہے جو بات ہے ترے دل میں

نہ تیرے لب پہ ہے رودادِ شمع و پروانہ　　نہ ذکرِ ساقی و مطرب، نہ "ہُوئے مستانہ"
نہ طوطی و گل و بُلبُل کا کوئی افسانہ
کہی ہیں تو نے انوکھی کہانیاں اپنی　　سُنائی ہے مزے لے لے کے داستاں اپنی

سرور و کیفِ بہاراں ہے تیرے نغموں میں　　نشاطِ بزم نگاراں ہے تیرے نغموں میں
نوازشِ غمِ جاناں ہے تیرے نغموں میں
شعورِ عشق ہے رنگینیٔ خیال کے ساتھ　　مذاقِ شعر ہے رعنائیٔ کمال کے ساتھ

بہ رنگِ شعلہ ترا جذبۂ رقابت ہے　　بہ قدرِ سوزِ دروں تیرا حالِ وحشت ہے
بہ شکلِ سیل ترے دل میں جوشِ الفت ہے
تری غزل میں ہے تہذیب عاشقی تیری　　تری حیات کا پرتو ہے شاعری تیری

بہارِ رنگِ طرب تیری زندگانی ہے　　شباب جذبے کا، احساس کی جوانی ہے
وفورِ شوق سے پُر تیری ہر کہانی ہے
صنم تراشے ہیں تو نے کس احتیاط کے ساتھ!　　سجائے بت کدے کس جوشِ انبساط کے ساتھ!

محیّرات

ایک عصبی مزاج فرمانروا
انگلینڈ کا بادشاہ ہنری دوم
(۱۱۳۳ —— ۱۱۸۹)
بڑا عصبی مزاج انسان تھا،
یہاں تک کہ وہ کھانا
بھی ہمیشہ کھڑے
کھڑے کھاتا
تھا
بونا سپہ سالار
جافری ہڈسن
(۱۶۱۹ —— ۱۶۸۲)
انگریزی فوج کا سپہ سالار
تھا —— حالانکہ اس کا
قد صرف ۱۸ انچ تھا

کرشمۂ تقدیر

مشرقی لیبو میں ایک بار انتخابِ فرمانروا کا عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا ــــــ یعنی یہ کہ جو شخص "آدابِ مجلس" کا سب سے اچھا مظاہرہ کریگا، اسے وہاں کی سلطنت سونپ دی جائے گی ــــــ

مقابلہ میں حصہ لینے والوں کو برہنہ پا فرش پر بٹھا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اشارہ پاتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے جوتے پہن کر کورنش بجا لائیں۔

اس شرط کو تانونامی ایک معمولی عورت نے بہترین طریقے سے انجام دیا اور ملکہ کی حیثیت سے لیبو پر ۲۵ سال تک حکمراں رہی۔

اسے کیا کہیئے

ملکہ این (۱۶۹۳ ــــ ۱۷۴۰) نے روس پر ۱۱ سال تک حکومت کی (۱۷۳۰ ــــ ۱۷۴۰) لیکن اپنی زندگی میں نہ اس نے کبھی غسل کیا اور نہ ہاتھ منہ دھویا۔ کبھی کبھی وہ مکھن پگھلا کر اپنے چہرے اور ہاتھوں پر ضرور مل لیا کرتی تھی

(اقتباس از ریپلیز سیریز)

"نگارِ پاکستان" کا
خصوصی شمارہ

عنقریب
شائع کیا جا رہا ہے

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخِ حرم بھی ہے اور رندِ شاہد باز بھی،

اس لئے

اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے
یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کے لئے لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ
"مومن نمبر" کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں

○ مومن کی سوانح ○ حیات معاشقہ ○ اس کی غزل گوئی ○ قصیدہ نگاری
○ مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام

کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے

قیمت :- تین روپے ——— خریداران نگار کے لئے رعایتی قیمت :- دو روپے

رات کے راہی
بنجارن کے بعد
اقبال شہزاد کی ایک اور عظیم پیشکش
شرارت
ستارے:
محمد علی
بہار
لیلیٰ۔ جعفری۔ سکندر۔ آزاد
تقسیم کار برائے: کراچی • سندھ • بلوچستان
امپیریل فلمس پیلس سینما بلڈنگ
سول لائنس کراچی

مضبوطی اور پائیداری کا نشان زیل پاک اور میپل لیف سیمنٹ

واقعی عمارتوں کی مضبوطی اور پائیداری کا خیال رکھنے والے تمام لوگ مغربی پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے بنائے ہوئے سیمنٹ زیل پاک اور میپل لیف ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔ زیل پاک عموماً مغربی علاقوں اور میپل لیف شمالی علاقوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔
یہی وہ دو سیمنٹ ہیں جن سے بیشتر ملک کی بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔

میپل لیف

MAPLE LEAF

ان عمارتوں کے لئے
جو وقت کی ہر آزمائش پر
پوری اتری ہیں

زیل پاک

مینیجنگ ایجنٹس:-
مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

PRESTIGE

انٹر نشنل پریس محمود روڈ کراچی۔

سالانہ چندہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

خدا نمبر

خدا کیا ہے؟ خدا کا تصور کب اور کیسے پیدا ہوا؟ مختلف مذاہب میں اس تصور نے کس طرح جنم لیا؟ اس کی ارتقائی صورتوں نے تمدن انسانی پر کیا اثر ڈالا؟ مذہب اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ اس تعلق کی بحث کس کس انداز میں کی گئی ہے۔ انبیاء کرام، مصلحین اور مجددین کے ارشادات اس کے متعلق کیا ہیں؟ ان ارشادات کو اقوام عالم نے کس طرح اپنایا ہے؟ اسلام کا موقف اس باب میں کیا رہا ہے اور اس موقف کو مذاہب عالم سے کیوں برتری حاصل ہے؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے اہم سوالات ہیں جو خدا اور مذہب کا نام آتے ہی ہر باشعور انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن افسوس کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہے جو اہل فکر و دانش کی پیاس اس سلسلے میں بجھا سکے۔ نگار کا "خدا نمبر" اس نوع کا پہلا صحیفہ ہے جس میں مذکورہ سوالات کا نہایت مدلل و مصرح جواب دیا گیا ہے۔

★

قیمت: تین روپے

طبیعت میں گرانی محسوس ہو
تو صبح اٹھتے ہی فرحت بخش گریپ سالٹ کی ایک خوراک
لے لیجئے اور دن بھر چاق و چوبند رہیے

گریپ سالٹ
کی ایک بوتل ہمیشہ ساتھ رکھئے
GRAPE
SALT

ڈیو
ٹائلٹ صابن
لطیف اور معطر
ڈیو ٹائلٹ صابن کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو نے بیشمار خواتین و حضرات کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اسکے لطیف اور چکنے جھاگ جلد کو ریشم کی طرح ملائم اور صاف ستھرا رکھنے کے علاوہ دیرپا تازگی و فرحت بخشتے ہیں۔ آپ بھی ڈیو ٹائلٹ صابن آزمائیے۔
DEW
TOILET SOAP
قیمت ۶۰ پیسے
ڈیو صابن کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے اسے چمکدار ریپر میں بند کیا جاتا ہے!
فیروز سنز
لیبارٹریز لمیٹڈ
نوشہرہ۔ مغربی پاکستان

صحت اور دانت

صحت کا دارومدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے' دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو اسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش:۔ ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے نکوٹین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ:۔ ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار:۔ ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں سچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

کراچی۔ لاہور۔ ڈھاکہ۔ چٹاگانگ

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

لیکٹوجن کی بدولت ...
تندرست بچے
مطمئن مائیں

شاہی

صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے، صحت کا قائم رکھنا اہم ہے

شاہی تندرستی قائم رکھتے ہوئے قوتِ مدافعت کو بڑھاتی ہے اور

امراض سے محفوظ رکھتے ہوئے حوصلہ و اُمنگ اور تر و تازگی بخشتی ہے۔

شاہی

دماغ

ضُعفِ دماغ کے مریض عموماً نسیان میں مُبتلا ہوتے ہیں

شاہی بہترین مقوی دماغ ہے۔ دماغ کا بوجھ، خیالات کی پراگندگی،

چڑچڑاپن، کام کی طرف عدم رغبت وغیرہ کیفیات کو دفع کرتی ہے

شاہی

اعصاب

ضُعفِ اعصاب کے مریض عجیب کیفیات کے شکار ہوتے ہیں

شاہی ضعفِ اعصاب کیلئے بہترین ٹانک ہے۔ اعصابی کمزوری، فاسد اور

حوصلہ شکن خیالات، اپنے پر عدم اعتماد، کسل و ماندگی کی دافع ہے۔

شاہی

طیبی دواخانہ کی مایۂ ناز ایجاد

حیاتین (وٹامنس) اور کیلشیم سے بھرپور

افزائشِ خون کے لئے بہترین، عمدہ مقوی دل و دماغ، معدہ و جگر

کی مقوی اور ہاضم طعام ہے

تیار کردہ

نیپیر روڈ، کراچی

شاہی ہر بڑے اسٹور پر دستیاب ہو سکتی ہے

فون نمبر ۳۱۹۲۱

فہرست دواخانہ

مفت طلب فرمائیں

اقبال شہزاد

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲
ٹیلی فون نمبر ۳۴۶۹۳ ۷۴

نومبر ۱۹۶۳ء

مدیر اعلےٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری ——— عارف نیازی

زر سالانہ
دس روپے

قیمت فی کاپی
۷۵ پیسے

نگار پاکستان ۔ ۳۷ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی نمبر ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی ر الیف ۔ یو ۔ پی ——— بی ۳۶۶۹ ۔ ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

[illegible]

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو گیا

فہرست

۴۲ واں سال	فہرست مضامین نومبر ۱۹۶۳ء	شمارہ ۱۱

ملاحظات

یادِ رفتگاں

(نیاز فتحپوری)

عنفوانِ شباب میں، میری زندگی جس ماحول میں گزری، وہ بڑا پُرسکون و پُر رونق ماحول تھا، گھر کے اندر بھی اور گھر سے باہر بھی۔ شام کو جس وقت زمین پر چاندنی بچھا کر دسترخوان چُنا جاتا تھا اور بچے، جوان، بوڑھے چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گھر میں کوئی بارات اُتری ہے۔ اور قریب قریب یہی منظر اس وقت بھی سامنے ہوتا تھا جب مردوں کے بعد عورتوں کی باری آتی تھی۔ گھر سے باہر متعدد احباب سچی محبت کرنے والے اور وقت پڑے تو جان پر کھیل جانے والے۔ سادہ زندگی، سادہ معاشرت، کھلی فضا، صاف ہوا، الغرض کچھ ایسی تھی بے خلل زندگی جو کامل اٹھارہ سال تک گزاری۔ لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ زندگی میں جو پے در پے انقلاب آنا شروع ہوئے تو چند سال میں یہ سارا طلسم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور ایک ایک کرکے یہ سارے چراغ گُل ہو گئے۔ بھرا پُرا گھر اجڑ گیا۔ احباب ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور پھر وہ وقت آیا کہ میں سب سے بڑا تھا۔ یہ بات آج کی نہیں، اب سے ۴۰ سال پہلے کی ہے۔ اس وقت کا کیا ذکر کہ جب خود میں بھی میں نہیں رہا۔ دوسروں کا کیا ذکر ہے۔ اور وطن سے وطنیت کا تعلق صرف اتنا رہ گیا ہے کہ وہاں اپنے اعزہ و احباب تودۂ خاک ہیں اور انکے خیال سے اب بھی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معنی میں وطن بار بار نہیں بنتا اور نہیں بنا، لیکن سفر زندگی میں مختلف "کارواں سرایوں" سے گزرنا پڑا جن میں آخری کارواں سرائے لکھنؤ تھی لیکن آخر کار اسے بھی چھوڑ کر کراچی میں ڈیرہ ڈالا۔ دیکھئے اب کس وقت یہاں سے رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ اطمینان ضرور ہے کہ یہ سفر عارضی نہ ہوگا۔ کوچ ہوگا اس آخری منزل کی طرف جس کے بعد پھر منزل و نشانِ منزل سب محو ہو جاتے ہیں۔

یہ ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں یا یہ کہ اب میں تھک کر معطل زندگی کا سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا احساسِ سکون صرف عدمِ سکون ہی کے احساس سے وابستہ ہے اور ایک سپاہی کی طرح گھوڑے کی پیٹھ ہی پر جان دینا پسند کرتا ہوں۔ البتہ اس دوران میں بعض ایسی ہستیاں ضرور اُٹھ گئیں جن کی جُدائی کا مجھے بڑا قلق ہے۔ اس مہینے کے ملاحظات انھیں کی یاد کے لئے وقف ہیں۔

علامہ مشرقی

قریب قریب میرے ہی ہم عمر تھے۔ اور ان سے میری ارادت کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی تصنیف تذکرہ میری نگاہ سے گزری۔ جسوقت انہوں نے اپنی یہ تصنیف مجھے بھیجی تو اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ کتاب دیکھنے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرکے انھیں بھیجدوں۔ چنانچہ میں نے ان کے اس ارشاد کی تعمیل میں صرف یہ مصرع لکھ کر ان کو بھیجدیا۔

صبح می ریزد گل خورشید در دامانِ ما

یہ زمانہ وہ تھا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا اور مشکل ہی سے کوئی دوسرا مذہبی لٹریچر اس کی جگہ لے سکتا تھا، لیکن تذکرہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ گوشۂ زنداں میں ایک یوسف اور بھی ہے۔ وہی خطیبانہ انداز، وہی الفاظ کا

تجمل، وہی لب ولہجہ کی شوکت اور وہی حکیمانہ بصیرت۔ الغرض ادب و مذہب کا اتنا دلکش و ساحرانہ امتزاج اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ بہرحال میں نے سب سے پہلے مشرقی کو ان کے تذکرہ میں پڑھا۔ اس کے بعد ان کی خاکسار تحریک کے سلسلہ میں ان کا مطالعہ کیا اور قطع نظر اس سے کہ ان کا نصب العین کیا تھا، خدمت اسلام کے لئے ان کے اقدام کی نوعیت کیا تھی، ان کی اجتماعی تنظیم میں فکر و عمل کا توازن کیا تھا، الغرض ان تمام انتقادانہ پہلوؤں سے ہٹ کر، مجھے اس کا یقین ضرور تھا کہ وہ اپنی ذات سے بڑے مخلص انسان تھے۔ گو یہ ضروری نہیں کہ ہر مخلصانہ قدم کامرانہ بھی ہو۔

مجھے بالکل علم نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد ان کی جماعت و تحریک پر کیا گزری اور نہ مجھے اس کے جاننے کی ضرورت، کیونکہ اب بھی میرے ذہن پر ان کی وہی شخصیت چھائی ہوئی ہے جو تذکرہ دیکھ کر میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی وہ بدستور اسی طرح قائم ہے۔

مردان خدا خدا نہ باشند
لیکن ز خدا جدا نہ باشند

سید صدیق حسن

کون تھے، کیا تھے اور وہ سرزمین بھارت اور دنیائے انسانیت کا کتنا بڑا حصہ ویران کر گئے، اس کا علم اہل پاکستان کو نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں میں وہ حکومت بھارت کے سب سے سینئر آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ یو۔ پی کے ریونیو بورڈ کے ایگزیکٹو صدر، صوبہ بھر کے تمام ریونیو افسران کی قسمت ۔ کے مالک، اور گورنر کے بعد سب سے بڑے سرکاری افسر۔ لیکن مرحوم کی ان خصوصیات کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ دنیاوی حیثیت سے وہ کسی ایسے مرتبہ پر فائز تھے۔ جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ان عظیم مراتب دنیاوی کے ساتھ، وہ اخلاق کی جس بلندی و پاکیزگی کے حامل تھے۔ وہ میں نے نہ کسی خانقاہ میں پائی نہ کسی درسگاہ مذہب میں، ایوان حکومت کا کیا ذکر۔

وہ کڑا (الہ آباد) کے ایک قدیم سید گھرانے کے فرزند تھے۔ جو نسبی عزت و شرافت تو ضرور رکھتا تھا، لیکن جاہ و ثروت یا دولت امارت سے یکسر محروم تھا۔ مرحوم بیسویں صدی کے آغاز میں اسی ویران قصبہ اور اسی غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ غربت کے عالم میں تعلیم و تربیت پائی۔ اور خدا جانے کن مشکل راہوں اور کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں انھوں نے کامیابی حاصل کی، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ اس مرتبہ پر پہنچ گئے جو دنیاوی حیثیت سے بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات نہ تھی کہ تنہا انھیں کے لئے مخصوص ہو، خدا جانے کتنے افراد اس منصب تک پہنچے لیکن ان سب میں انسان کتنے تھے، اس کی جستجو اگر آپ کریں گے تو صرف ایک ہی شخص آپ کو نظر آئے گا جس کا نام "صدیق حسن" تھا۔ وہ جہاں بھی رہے، حاکم کی حیثیت سے نہیں بلکہ خادم عوام کی حیثیت سے رہے اور بلا تفریق مذہب و ملت وہ ہر شخص کے دردِ دکھ میں شریک ہوئے۔ ان کی اخلاقی بلندی، پختگی کردار اور ایثار و قربانی کا ثبوت ان کی زندگی کا وہ عجیب و غریب کارنامہ ہے جو ان کے ایک ہندو رفیق سے تعلق رکھتا ہے جو الزام قتل میں گرفتار ہوا اور لفٹیننٹ گورنر کی مخالفت کے باوجود انھوں نے اس کی ضمانت کی، مقدمہ کی پیروی پر بیدریغ روپیہ صرف کیا اور جب وہ غریب مر گیا تو اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی۔ مرنے والا کوئی معمولی عہدہ دار نہ تھا۔ حکومت کے ایک محکمہ کا سکریٹری تھا۔ اور خدا جانے کتنے ہندو اس کے دوست و رفیق تھے، لیکن جب اس غریب پر مصیبت نازل ہوئی تو سب نے منہ موڑ لیا۔ اور صرف ایک مسلمان صدیق حسن نے اس کا آخر دم تک ساتھ دیا اور وہ بھی ان حالات میں کہ گورنر سے لیکر چپراسی تک سب اس کے مخالف تھے۔ اور مرحوم کی وضعداری کا یہ عالم

تھا کہ خود جیل میں اس کو کھانا پہنچایا کرتے تھے اور کبھی انہوں نے اس کی پروا نہیں کی کہ اس کا نتیجہ خود ان کے حق میں کیا ہوگا۔ مذہبی حیثیت سے پابند صوم و صلوٰۃ ہوتا تو کوئی بات نہیں، لیکن شعائر اسلامی کی پابندی محض تہذیب نفس و اخلاق کی غرض سے، بڑی بلند بات ہے اور مرحوم کی اسی خصوصیت کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے مسلمان، یعنی ایک بڑے انسان تھے ان کے مکان پر ہر ہفتہ علمی و مذہبی مذاکرے منعقد ہوا کرتے تھے، جن میں میں بھی کبھی کبھی شریک ہوا ہوں اور میں نے ہمیشہ یہ دیکھ کر حیرت کی کہ یہ غیر مولویانہ وضع و صورت رکھنے والا شخص کتنا بڑا مولوی اور مولوی سے زیادہ کتنا بڑا انسان ہے۔

مرحوم کا گھر، غریبوں، اور حاجتمندوں کا ماوی و ملجیٰ تھا۔ اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمت خلق کے لئے وقف تھا۔ وہ بڑے وسیع المطالعہ انسان تھے اور علم و ادب سے خاص شیفتگی رکھتے تھے، یہاں تک کہ شرکت مشاعرہ کے جواز کے لئے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا اور اپنی فطری صلاحیت و اہلیت کی بنا پر وہ بہت جلد بہترین شعراء کی صف میں شامل ہوگئے [1]

وہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ایک تقریب تعزیت میں لکھنؤ سے ملتان آ رہے تھے کہ امرتسر اسٹیشن پر دفعتاً ان کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ اسی وقت ختم ہوگئے۔ ان کی بیگم اور بعض عزیز خواتین اور بھی ساتھ تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ امرتسر کے ذمہ دار افسران نے بروقت ان کی کوئی مدد نہیں کی اور بڑی مشکل سے ان کی لاش کو لکھنؤ پہنچایا گیا۔ جہاں ہزاروں ہندو مسلمان ماتمداروں کے حلقہ میں انھیں عیش باغ میں سپرد خاک کر دیا۔

زمیں کھا گئی۔ آسماں کیسے کیسے

مانی جائسی

جس وقت ڈاکٹر صفدر حسین نے فون پر جناب مانی جائسی کی وفات کی خبر مجھے سنائی مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس خبر کے یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا وہ تقریباً میرے ہمعصر تھے اور ۱۹۱۴ء میں

---

[1] چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تیرگی حد سے گزرتی ہے جب اندھیاروں کی — تب کہیں مہر درخشاں کا پیام آتا ہے
دم بدم گردشِ دوراں کا سلام آتا ہے — کبھی اس طرح بھی جینے کا پیام آتا ہے
جب کہیں تذکرۂ جور تمام آتا ہے — کیا کہیں آپ سے کیوں آپ کا نام آتا ہے

محبت ننگ دامن بن گئی ہے — یہ دنیا سنگ و آہن بن گئی ہے
کیے دیتی ہے بزمِ دل کو تاراج — نگاہِ دوست دشمن بن گئی ہے
جو موج آغوشِ ساحل میں پلی تھی — نئے طوفاں کا مسکن بن گئی ہے

مرتے ہیں ہم عشق کی بیگانہ وشی پر — جیتے ہیں محبت کے اشارات خفی پر

اہل کشتی خوش نہ ہوں طوفاں اگر کوئی نہیں — بارہا بیڑے ڈبو دیتی ہے موج تہ نشیں
بے سہارا ہو چلا تھا کاروانِ زندگی — آگئے ڈھارس دے گئی اس کی نگاہ خشمگیں
یہ بھی نقشے میری آنکھوں نے دیکھے بارہا — آفتاب ابھرا کئے اور ظلمتیں بڑھتی گئیں

میرے ان کے دوستانہ تعلقات قائم تھے جب وہ اور میں دونوں بھوپال میں یکجا ہو گئے تھے، یہ خبر سن کر پچھلے ۵۰ سال کی وہ تمام صحبتیں یاد آ گئیں جو جناب مانی کی ذات ان کی شاعری و خوشدلی سے قائم تھیں۔

وہ جس دور کے شاعر تھے، وہ دور تھا صرف کارآگہانہ شاعری کا اور اس میں بھی وہ خاص امتیاز کے مالک تھے۔ مانی کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کے لئے ایک دفتر درکار ہے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کر دینا غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ ان سے زیادہ سمجھ کر شعر کہنے والا کوئی دوسرا مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔

شاعری ان کی فطرت تھی۔ اور ان کا ریاض بھی اور ان دونوں کے اجتماع سے جو اسلوب شاعری پیدا ہو سکتا ہے، وہی مانی کی شاعری کی جان تھی۔ شاعری سے ہٹ کر انسان ہونے کی حیثیت سے وہ "سام دنیاں" کے قسم کے آدمی تھے جنھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ غیر معمولی پامردی سے کیا۔ اور دنیا کی کوئی یاس و ناامیدی ان کو کبھی شکست نہ دے سکی۔ ان کے دواوین غزل و قصائد شائع ہو چکے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ان کے اعزہ ان کا غیر مطبوعہ کلام بھی جلد شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔

جناب محمد زکریا مائل کا قطعہ تاریخ شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

از وفات مانی یکسر	حیف ملک شاعری ویراں بشد
چوں بہ تنگ آمد ازیں دار ملال	در حضور ایزد سبحاں بشد
گفت با مائل سن رحلت سروش	حضرت مانی سوئے یزداں بشد

۶ ۱ ۹ ۶ ۳

شوکت تھانوی

تیسرا سخت حادثہ جس سے میں حد درجہ متاثر ہوا شوکت کی موت تھی۔
یوں تو بظاہر میری اور شوکت کی یکجائی کبھی نہیں ہوئی، لیکن وہ میرے دل میں ہمیشہ جاگزیں رہے۔ وہ بھی لکھنؤ میں تھے اور میں بھی، لیکن چند دن مل بیٹھ کر زندگی بسر کرنے کی توفیق نہ مجھے کبھی نصیب ہوئی نہ انھیں۔ یوں دید و وادید کے مواقع تو اکثر میسر آئے لیکن اس خیال سے کہ میں عمر میں ان سے بڑا تھا، از راہ اخلاق وہ کبھی "داشگاف" ہو کر مجھ سے نہیں ملے۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ مجھے کیا اور کیسا سمجھتے تھے لیکن مجھے ضرور ان سے تعلق خاطر تھا۔ اور ہمیشہ تو نہیں لیکن کبھی کبھی میں ان صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع نکال لیتا تھا جہاں وہ سرگرم تماشہ ہوتے تھے اور میں صرف تماشائی۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس قسم کی تفریحی صحبتوں کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو گیا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شوکت کی یہ بذلہ سنجیاں ان کے کسی سخت تلخی احساس کا نتیجہ ہیں، اور میں یہ سوچ کر ذرا سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا یہ وہم دور ہونے لگا اور یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی زندگی کی راہ متعین کرنے میں فطرت سے جنگ نہیں کی بلکہ سوچے سمجھے یا اپنے پر و بال نکالے اور ادب کی ایک مخصوص صنف میں "شاہین" کی سی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کے زمانہ میں چند دوسرے "مزاحیہ نگار" اور بھی موجود تھے، جن میں سے بعض متقدم العہد بھی تھے۔ لیکن شوکت کی راہ سب سے علیحدہ تھی۔ اور یہ وہ راہ تھی جسے شوکت ہی اختیار کر سکتے تھے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ سب اپنی اپنی جگہ خاص رنگ کے مالک تھے، کسی میں فلسفہ کی جھلک نظر آتی تھی، کسی میں علم و تنقید کی، اور کسی میں صرف پلاٹ و تکنیک کی۔ لیکن شوکت کی مزاح نگاری ان سب سے الگ شگفتگی بیان و پاکیزگی زبان کی تھی اور اس خصوصیت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ اور شوکت کی یہ خصوصیت کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں اپنے آپ سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ تو خیر کسی کو حاصل

تھی ہی نہیں۔

شوکت نے کتابوں بہا ذخیرہ "طنز و مزاح" کا اپنے بعد چھوڑا، اس کے تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے اور ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پُر کرنے والا دوسرا نظر نہیں آتا۔

ادیب سہارنپوری

پانچواں حادثہ جس سے میں تا دیر متاثر رہا۔ ادیب سہارنپوری کی موت تھی۔ اول اول ان کا قیام اندور میں تھا اور کانگرس کے پُرجوش حامی تھے، لیکن تقسیم ہند کے بعد انھیں خود اپنے رفقاء کی طرف سے ایسے صدمے پہنچے کہ وہ بلبلا اٹھے اور مجھے ایک طویل خط لکھکر مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس سے پہلے وہ ایک بار لکھنؤ آکر مجھ سے مل بھی چکے تھے اور میں ان کے ذوق تغزل کو بہت پسند کرتا تھا۔ میں نے انھیں رائے دی کہ وہ اندور چھوڑ دیں اور بے تکلف پاکستان چلے جائیں جیسا کہ خود انہوں نے بھی ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ وہ تقسیم ہند کے کچھ دن بعد کراچی چلے آئے اور یہاں ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی جگہ الگ بنالی۔ ان کی شاعری خالص جذبات کی شاعری تھی، اور اپنے مخصوص انداز بیان کی بنا پر "نشتر ہی نشتر"۔ غالباً اس لئے کہ وہ شاعر سے زیادہ "انسان" تھے اور ان کا حسن فطرت ہی ان کے کلام میں بھی منتقل ہوگیا۔ --- اس سے قبل جب کبھی میں عارضی طور پر کراچی آیا تو وہ ہمیشہ مجھ سے آکر ملے۔ لیکن جب میں مستقل قیام کے ارادے سے یہاں آیا تو وہ خود رخصت ہو گئے۔ اور اپنی سوگوار زندگی کا صرف یہ نقش چھوڑ گئے کہ

تا بمانیم زندہ بر دوزیم — جامۂ کز فراق چاک شدہ
ور بمیریم عذر رہا داریم — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

نظر حیدرآبادی

آخری حادثہ جس نے مجھے کئی دن تک افسردہ و مضمحل رکھا نظر کا انتقال تھا جو نے سے شاید دو ہفتہ قبل آکر مجھ سے ملے تھے اور یہ وعدہ کر گئے تھے کہ اپنے والد مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام آئندہ جمعہ کو لیکر آئیں گے لیکن وہ "آئندہ جمعہ" انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

نظر کے والد جناب علی اختر مرحوم میرے ان چند مخلص احباب میں سے تھے جن کے خلوص و صداقت پر مجھے ہمیشہ ناز رہیگا اول اول سنہ ۳۲ء میں ان سے حیدرآباد میں ملاقات ہوئی اور شاعر و انسان دونوں حیثیتوں سے وہ مجھ پر چھا گئے۔ یہ موقع ان کی ذات یا ان کے فن پر اظہار خیال کا نہیں کیونکہ اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ وہ تو اس وقت صرف اس لئے یاد آگئے کہ وہ نظر کے والد تھے اور سب سے پہلے میں نے نظر کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ بالکل صاحبزادے تھے اور شاعر بھی نہ تھے۔ اس کے بعد جب ان کا خاندان پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد سے کراچی آگیا تو نظر کی شاعری میں جگمگاہٹ پیدا ہوئی۔ اور یہ روشنی تیز تر ہوگئی حتیٰ کہ ان کا شمار یہاں کے صف اول کے شعراء میں ہونے لگا۔ افسوس کہ وہ کراچی آنے کے بعد بھی زندگی کی مشکلات سے دوچار رہے لیکن آخیر وقت تک انہوں نے اپنے شاعرانہ وقار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور اپنے مداحوں کی ایک بڑی جماعت اپنے بعد چھوڑ گئے۔

میرا نظریۂ شعر اور میری شاعری

گذشتہ سے پیوستہ

جمیل مظہری

مبالغہ بھی شاعری کے لئے ایک سنگار ہے لیکن اس کے لئے بھی ایک سلیقہ چاہیئے۔ دنیا کے شاعروں میں عرفی سے زیادہ کسی نے مبالغہ نہیں کیا ہوگا لیکن اس کا کوئی مبالغہ بھی شاید حسن سے خالی نہیں۔ اور الفاظ و اذکار کا حسن ہی شاعری کی جان ہے۔ آمدم بر سر مطلب۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ زندگی کے مسلمہ اور پیش پا افتادہ حقائق شاعر کی زبان پر پہونچ کر کس طرح سحر انگیز بن جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت سے اس بحث پر خود بخود روشنی پڑ رہی ہے۔ بات کتنی ہی خشک اور بے مزہ کیوں نہ ہو شاعری اس میں اپنی حسن آفرینی سے کچھ اس طرح شیرینی اور رس گھول دیتی ہے کہ سامعہ لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر کا یہی سلیقہ اس کی شاعری کو پیغمبری بناتا ہے اور اس پیغمبری کا راز اس کی قوت متخیلہ کی اکتشافی اور انکشافی جد وجہد سے زیادہ اس کی قوت ناطقہ کی حسن آفرینی میں ہے۔ حسن کیا ہے ایک لمبی بحث ہے۔ حسن جو کچھ ہو لیکن اس کا مظاہرہ جسموں اور صورتوں ہی میں نہیں فکر و عمل میں بھی ہوتا ہے۔ نقوش و خطوط میں بھی اور صوت و آہنگ میں بھی۔ چنانچہ ہمارے تمام فنون لطیفہ اسی تخلیق حسن کی کوشش کی ایک تاریخ ہیں۔ مصور جس طرح نقوش و خطوط میں حسن کی تخلیق کرتا ہے اسی طرح عمل میں بھی ایک حسن ہوتا ہے جسے مذہب اور فلسفۂ اخلاق کی زبان حسنِ عمل کہتی ہے۔ شاعری حسنِ خیال ہے صرف حقیقت نگاری شاعری نہیں کہی جا سکتی۔

دندان تو جملہ در دہان اند
چشمان تو زیر ابر وانند

اس سے زیادہ حقیقت نگاری اور کیا ہو سکتی ہے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت نگاری ہے جو حسنِ بیان سے خالی ہے۔

بعض سطح پرست ذہن حسن اور رنگینی کو لازم و ملزوم سمجھتے ہیں لیکن حسن آفرینی کے لئے رنگینی لازمی نہیں بعض اوقات سادگی سے بھی حسن پیدا کیا جا سکتا ہے کیونکہ بقول آتش ؎

"تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی"

ہماری شاعری میں اس کی بہترین مثال اسماعیل میرٹھی کا آرٹ ہے۔ لیکن سادگی کے ساتھ رنگ آمیزی

بھی اعتدال کے ساتھ شاعری کے لوازم میں سے ہے مگر موقع و محل کے لحاظ سے رنگ کا انتخاب بھی ایک بڑا سلیقہ چاہتا ہے جس کی طرف انیس یوں اشارہ کرتے ہیں

تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے

اور اپنے اس قول کی مرشدِ شیراز سے اس طرح تصدیق کراتے ہیں :-

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

کلام میں حسن اعتدال پسندی اور موقع شناسی سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر کو اس کا سب سے زیادہ لحاظ عبارت کے بندوبست اور لفظوں کی معنوی بندش میں رکھنا چاہیئے۔ آتش اس سعی کو نگینہ سازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ گو خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ شاعری ہی میں کیا جملہ فنون میں یہی موقع شناسی کا شعور ایک فنکار کو عظیم سے عظیم تر بناتا ہے ؎

"یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی"

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت اپنی جگہ بے رنگ اور بے آہنگ ہے۔ اس کا اظہار کرنے والی زبانیں اپنے مزاج کے مطابق اس میں رنگ اور آہنگ پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ایک حقیقت کے اظہار کے لئے فلسفی کا انداز بیان کچھ اور ہوتا ہے اور واعظ کا کچھ اور، اور شاعر کا سب سے جداگانہ۔ شاعر اگر فلسفی کا اسلوب اٹھا لیتا ہے تو اسکے بیان کی شعریت وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جرم ہمارے سب سے بڑے شاعر غالب سے اکثر سرزد ہوا ہے۔ میر کو اس نسبت خاص میں غالب پر اسی لئے فوقیت ہے کہ ایک خشک حقیقت کے اظہار میں بھی وہ اپنی زبان اور اپنے بیان میں فلسفہ کی خشکی پیدا نہیں ہونے دیتے۔ حیات کی بے بقائی اور حسن کی بے ثباتی ایک خشک بے مزہ اور ناگوار موضوع ہے۔ واعظ کا لب و لہجہ اس کو اور ناگوار بنا دیتا ہے لیکن شاعر کی زبان سے وہ کیونکر گوارا ہو جاتا ہے یہ میر سے پوچھیے :-

کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

اسی تبسم کی ایک حسین تشریح جوش کی زبان سے بھی سُن لیجئے :-

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
تو ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

ہمارے موجودہ شعراء میں جوش کو لفظوں کی طلسم بندی اور بندش کی تکلفات کے اعتبار سے عہد حاضر کا ناسخ کہا جاتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ عہد حاضر کے اس ناسخ نے زبان و بیان میں حسن کی تخلیق بھی سب سے زیادہ کی ہے ان کی ایک اور رباعی ہے جو موضوع کی خشکی میں شعریت کی رنگ آمیزی کی ایک بہترین

مثال ہے۔ یہ رباعی آپ کو اس لئے سناتا ہوں کہ اس سے ہمارے موضوعِ گفتگو پر مزید روشنی پڑ رہی ہے۔

دے جام کہ ہوتا ہے سویرا ساقی
مشہور ہے اعتدال میرا ساقی
وہ غیبت نور ہو کہ طغیانیٔ نور
دونوں کا نتیجہ ہے اندھیرا ساقی

مذکورہ بالا مباحث میں سحر آفرینی کی جو مثالیں گنوائی گئی ہیں انھیں میں شاعری کی جان سمجھتا ہوں اور یہی وہ روحِ سخن ہے جس کی کمی میں اپنے اشعار میں پاتا ہوں اور جس کا سراغ آپ کو جوش و جگر کے بعد میرے ہمعصروں میں سب سے زیادہ آلِ احمد سرور اور پرویز شاہدی کے یہاں ملے گا۔ گو پردے کے اس پار کی باتیں ہم پرویز سے زیادہ اجتبیٰ رضوی سے سنتے ہیں لیکن اجتبیٰ موضوع کی عظمت اور زبان کی لطافت میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتے جو شاعر اور فلسفی میں امتیاز پیدا کرتا ہے بہر حال مقامِ شکر ہے کہ اجتبیٰ اور پرویز کے نقوشِ قلم کی رہنمائی میں ہمارے صوبے کی نئی ادبی پود کے اندر فکر و فن کا شعور بڑی تیزی سے بالیدہ ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کاروان اور آگے بڑھے اور ہم لوگ گردِ کارواں بنکر زبانِ حال سے یہ کہتے رہیں کہ

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم ساخت
منت برقدم راہ روانست مرا

اب رہا یہ فریضہ کہ میں نے جس نظریۂ شاعری کی اتنی لمبی چوڑی وضاحت کی اس کے ماتحت اپنے کلام کا خود جائزہ لوں تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ قرآن حکیم نے شاعروں پر یہ تعریض کی ہے کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ میری شاعری میرے نظریۂ شاعری کی روشنی میں حرف بحرف اس تعریض کی مستحق ہے نہ میں نے جذبات کی دنیا میں کسی نئے جذبے کا سراغ لگایا اور نہ کسی معلوم جذبے کی کامیاب ترجمانی کی۔ میرے شعور نے نہ کبھی فطرت کے دل کی دھڑکنیں سنیں نہ اپنے افکارِ پریشاں میں حسن کی تخلیق کا حق ادا کیا۔ زیادہ سے زیادہ میرا سرمایۂ فن یہ ہے کہ جب مجھے شعورِ ذہنی حاصل ہوا تو میں نے غزل کے معنوی حدود سے حسن و عشق کے فرسودہ تصورات کو خارج کرنے کی کوشش کی لیکن ایامِ شباب میں ایک دور ایسا بھی مجھ پر گزرا ہے جب میں نے مومن کے فطری متوازن تغزل کی تقلید کرنی چاہی اور چند غزلیں بھی لکھیں مثلاً

ہے تیرے ناوکِ تشنہ سے مجھ کو ہمدردی
کہ اب کوئی دلِ نا مبتلا نہیں ملتا
جمیل کے لئے بے چین ہے نظر ان کی
مگر آج بزم میں وہ بے وفا نہیں ملتا

لیکن چونکہ زندگی میں جنسی معاشقہ کا کوئی ذاتی تجربہ مجھے حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے مومن کی تقلید کا جذبہ بار آور نہ ہو سکا غزل گوئی میں میری ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے عشق کے جذبہ کو شاعروں اور صوفیوں کی طرح کبھی کوئی محترم جذبہ نہیں سمجھا میری اجتماعیت پسندی نے جب اپنے نقطۂ نظر سے اس جذبے کی تحلیل نفسی کی تو مجھے یہ جذبہ بھی انفرادیت پسندی کا ایک بےلاگ مظہر نظر آیا جو اپنی غرض کی دھن میں کبھی کبھی اس غرض

بھی انکار کر جاتا ہے جو اس کے وجود کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ اس جذبہ کی توہین و تضحیک آپ کو میری غزلوں میں جگہ جگہ ملے گی۔

کچھ سوچ تو دل لگانے والے
خواہش کو مرض بتانے والے

ستم ہے یہ ذوق پُرفشانی کہیں نہ بجھ جائے شمع محفل
کوئی پتنگوں سے آ کے کہدے کہ یہ ہوس ہے وفا نہیں ہے
اسی کا ہے نام اگر محبت تو کس کو کہتے ہیں خود پرستی
اک ایسی دنیا بنا رہا ہوں جہاں کوئی تیسرا نہیں ہے

ایمان وفا جس کا عشقیہ شاعری میں صدیوں سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے میری نظر میں اس کی وقعت اس سے زیادہ نہیں کہ ۔

" حُسن پر عشق کا اک جبر وفا جس کو کہیں "

تجھ سے عاشق کی خودی مانگ رہی ہے تجھ کو
عشق کا حُسن تقاضا ہے وفا کچھ بھی نہیں

یہی وفا کبھی کبھی مجھے جذبۂ جنسی کی ایک تھکن سی نظر آئی اور میں نے بڑے سہمے ہوئے انداز میں اعلان بھی کیا ۔

" شوق کی اک خستہ حالی کو وفا سمجھا تھا میں "

عشق ہی پر کچھ منحصر نہیں غالب کے دبستانِ فکر و فن میں مدتوں طالب علمی کر کے میں نے ہر جذبے کی تحلیل اور ہر کیفیت کے تجزیے کا شعور حاصل کیا۔ اس شعور کا پتہ بھی آپ کو کہیں کہیں میری شاعری میں ملے گا۔

اک اضطراب کو شوخی سمجھنے والی آنکھ
ادا شناس حجاباتِ دلبری نہ سہی

اضطراب خود نمائی کو حیا سمجھا تھا میں
وہ نگاہِ ناز کیا کہتی تھی کیا سمجھا تھا میں

اخلاق ہے کیا خدا کے بندوں سے فریب
دینداری ہے کیا خدا سے دنیا داری

میرے تغزل میں جو سوز و گداز کی کمی ہے میری شاعری میں جو رنگ اور رس کا فقدان شاید اس کی ذمہ دار میری یہی عادت ہے جو مجھ سے ہر غم اور ہر خوشی کا بخیہ ادھیڑواتی رہتی ہے خصوصیت کے ساتھ غمِ عشق کا جو اپنی تمام

بے پناہیوں کے ساتھ کبھی مستقلاً مجھ پر مسلط نہیں ہوا۔ اور ظاہر ہے کسی جذبہ کا غلبہ ہی شاعر کے ذہن میں وہ انفعالی کیفیت پیدا کرتا ہے جس نے میرؔ کی شاعری کو نشتر زار بنا دیا۔ غالب کی غزلیت باوجود کوشش کے اس کیفیت سے کیوں خالی رہی اس کا سبب آپ کو غالب خود بتا رہے ہیں ؎

"عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ"

ابتدائے شباب میں میری طبیعت نے بھی وحشت کا یہ رنگ عارضی طور پر پکڑا تھا یہ وہی دور ہے جب میں نے حضرت وحشتؔ کی شاگردی اختیار کی مگر استاد کی ہمت افزائی کے باوجود یہ رنگ پوری طرح میری طبیعت میں رچ نہ سکا۔ تقریباً اسی زمانے میں جب مجھ میں قومی احساس پیدا ہو رہا تھا تو میں نے فارسی قوام اور ہندی رس کی آمیزش سے تغزل کا ایک مرکب تیار کیا اور اس کا نام رکھا پریم گیتا۔ یہ رنگ ابھی پوری طرح نکھرا نہ تھا کہ طبیعت کا تلوّن دوسری سمتوں بہک گیا۔ بہرحال چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ندھی ہوئی ہیں نشیلی آنکھیں گلابی چہرہ ستا ہوا ہے
پپیہا بولا، ڈھل آئے آنسو کنواری رادھا کو کیا ہوا ہے

کل رات نبض فطرت کچھ تیز چل رہی تھی
دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں

جب گاؤں کی چنچل رادھائیں پنگھٹ کی اور کو جاتی ہیں
تب سائے دھانی ہوتے ہیں تب دھوپ گلابی ہوتی ہے

فارسی تغزل کو ہندی تغزل کے سانچے میں اتارنے کا یہ تجربہ بھی ملاحظہ ہو۔ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

ساربان آہستہ رو کآرام جاں در محمل است
اشتراں را بار بر پشت است و مارا بر دل است

میں نے اس کا ٹھیٹ ترجمہ ہندوستانی تغزل میں یوں کیا۔

جو بوجھ کہ میرے دل پر ہے وہ بوجھ کہاں ہے بیلوں پر
اے بہلی والے تیز نہ چل اس میں رادھا بھی میری ہے

لیکن افسوس کہ میرے احساس کمتری نے ان پیاری پنکھڑیوں کو بھی چوم کر چھوڑا۔ میں نے بہت جلد یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اس رنگ میں جس حد تک تخلیق حسن کی ضرورت ہے اس کا شعور مجھے ودیعت نہیں کیا گیا۔ اپنے کلام میں رعنائی اور رس پیدا کرنے کے سلسلہ میں میری اس بے بسی کی نفسیاتی وجہ شاید یہ ہو کہ حسن کو قریب سے دیکھنے اور اس کے خد و خال کے جائزہ لینے کا موقع زندگی نے مجھے کبھی نہیں دیا۔ میں سراب کے پیچھے دوڑا اور بہت جلد اپنی تشنگی پر قانع ہو گیا۔ قناعت نے جو زاہدانہ یبوست میرے دماغ میں پیدا کی اس کا اثر میرے سارے فن میں بھی جابجا نمایاں ہو کر رہا۔ شاید یہی حادثات تھے جن کی بنا پر میری شاعری واردات قلبیہ کی نگارش سے بھی قاصر رہی۔ میری غزلوں کا سرمایہ میرے چند الجھے ہوئے افکار رہے جنہیں آپ نواب امداد صاحب اثر کی زبان میں

۳)۔ میرا ایک مطلع جو تنہا میری شہرت کا ذمہ دار ہے

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

تغزل کی لطافت اس شعر کے دوسرے مصرع کا تحمل تو کرے گی لیکن "بقدرِ پیمانۂ تخیل" نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کا اسلوب۔ یہ غزل ۱۹۳۰ء کی کہی ہوئی ہے اب آپ ملاحظہ کریں کہ اس تیس تینتیس سال کے عرصہ میں بھی میں اپنی زبان کو غزل کے مزاج کے مطابق نہ بنا سکا۔ اب تو یہ حال ہے کہ میں کسی خوش ذوق آدمی کو اپنی غزل سناتے شرمندہ ہوں۔ میری تازہ ترین غزل کے دو اشعار ہیں۔

ہر حال میں صنم ہے جس دائرہ میں رکھو
یا عرش پر بٹھاؤ یا بت کدہ میں رکھو
تعبیر ہی غلط ہے جس زاویے سے دیکھو
تصویر ہی غلط ہے جس چوکھٹے میں رکھو

آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ان اشعار میں کہیں سے تغزل کا رس موجود ہے اس غزل کا ایک شعر بھی ہے جو بجائے خود میری غزلیت پر طنز ہے:

واعظ کی ذہنیت کا سانچہ یہی رہے گا
یا بت کدہ میں لاؤ یا کُل کدے میں رکھو

ہر شاعر کے لئے اپنا کلام حسنِ طبیعت ہوتا ہے لیکن اگر یہ بھی خودستائی نہ ہو تو میں یہ عرض کر دوں شاعری میں خودستائی اور خودپسندی کا مجرم میں کبھی نہیں رہا مجھ میں یہ نفسیاتی کمزوری ایک لمحہ کے لئے بھی پیدا ہوئی اور میں نے ہمیشہ کھلے دل سے یہ اعتراف کیا کہ

جمیلؔ اس غزلیت کا فائدہ کیا ہے
جو فلسفہ نہ بنی اور شاعری نہ بنی

اس طرح نظموں میں میری قدامت پرستانہ روش نے نئے اسالیب کی ندرتوں کو قبول نہیں کیا زیادہ سے زیادہ اقبال کی تقلید کی۔ لیکن میری ذہنیت کا سانچہ علامہ موصوف کے سانچے سے جدا گانہ تھا اس لئے اس تقلید کا حق بھی پوری طرح ادا نہ ہو سکا اور کلام کا یہ رنگ ہو گیا

فسانہ چاہیئے اس چشمِ سحر فن کے لئے
غرورِ خودگری نازِ خود شکن کے لئے
کرے جو خوں سے فراہم نمو چمن کے لئے
دلوں میں سوز بھرے گرمیٔ سخن کے لئے
ہزار شمع جلائے اک انجمن کے لئے

اٹھی جو سینۂ فطرت سے موجِ وجدانی
[illegible]

ظہور حسن نے کی ہر طرف درخشانی
نظر جو آئی اجالے میں اپنی عریانی
حقیقتیں ہوئیں بیتاب پیرہن کے لئے

ایک فن کار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے فن کے سلسلہ میں اپنے نقادوں کی صحیح رہنمائی کرے اس لئے
عرض کر دیتا ہوں کہ علاوہ نظموں اور غزلوں کے میں نے مراثی، قصائد اور مثنوی میں بھی اپنی طبیعت کا حتی الوسع
ان لیا اور بہت جلد اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ ان اصناف میں جس فنکارانہ صلاحیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں
موجود نہیں۔ اپنی شاعری کے سلسلہ میں میرے اندر جو ایک احساس کمتری ہے شاید وہ میرے معیار کی بلندی کا
ہر۔ اپنے معیار کی بلندی سے جب میں اپنے کلام کو دیکھا تو مجھے اس کی پستی کا ایماندارانہ احساس ہوا جینے کے
تھوڑے سے غرور کی بہرحال ضرورت ہوتی ہے اس لئے مجھے یہ سمجھنے دیجئے کہ ارتقا کی راہ میں میرا ذوق اس تیزی سے
بڑھا کہ میری ذہنی صلاحیت اس کا ساتھ نہ دے سکی اور پیچھے رہ گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر شعبۂ فن
اپنی ناکامی کے باوجود میں شعر کہتا کیوں ہوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ میرا ایک نفسیاتی مرض ہے جس
دورے مجھ پر کبھی کبھی پڑتے ہیں اور مجھے خود معلوم نہیں کہ کیوں پڑتے ہیں۔ میرے مہربان نقادوں نے اپنے قلم
نشتر سے میرے ذہن کے اس مادۂ فاسد کو نکالنے کی ہر چند کوشش کی لیکن ع

مریض عشق پر رحمت خدا کی

نے بھی اپنی جگہ اس مرض سے شفایابی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن فائدہ خاطر خواہ نہ ہوا اگر آپ کے پاس
بیماری کے دفعیہ کا کوئی تیر بہدف نسخہ ہو تو میں بڑے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کروں گا۔

چائے کا رواج

کہا جاتا ہے کہ تیمور لنگ (۱۳۳۶ - ۱۴۰۵) کے عہد سے چائے کا رواج ہوا ورنہ اس سے پہلے بہت کم لوگ اس کے استعمال سے واقف تھے۔ وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ اس کی فوج میں وبا پھیلی اور اس کے تدارک کے لئے اس نے سختی سے حکم دیا کہ پانی ابال کر پیا جائے۔ چونکہ ابلا ہوا پانی بد ذائقہ ہوتا ہے اور فوجی اس کو پینے میں پس و پیش کرتے تھے اس لئے اس کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے تیمور لنگ نے چائے دریافت کی اور اس کی پتی کو پانی میں ملا کر استعمال کیا جانے لگا۔

پنگھٹ پر
(شعر منثور)

نیاز فتحپوری

وہ شبنم سے بھیگی ہوئی، برگ پوش گلاب کی کلی، جس کی سرخ لکیر پتیوں کے خط انفصال پر ایسی نظر آرہی ہے، جیسے کسی کا محرم مسک جائے ——— تم نے دیکھی؟

وہ قوس قزح جس کی رنگینیاں، ایک والہانہ پاکیزگی، ایک سماوی لحن کے ساتھ، بہار کی دیوی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے ——— تم نے دیکھی؟

سمندر کا وہ جوش، جیسے کسی کا سینہ انتہائی ہیجان کے عالم میں تنفس کی شدت سے بے قابو ہو کر سمٹ سمٹ کر پھیل رہا ہو ——— تم نے دیکھا؟

ماہ کامل کا وہ عروج نیم شبی، جو دنیائے شباب کو اپنی آبشار سیمیں کے لطیف نغموں سے مست و سرشار بنا کر باغ کے کنجوں میں دعوت سرگوشی سے بیتاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

شہاب ثاقب کی وہ روشن لکیر، جو سرعت برق کے ساتھ فضا میں بلند ہو کر، ایک طرۂ زر کا رہاتی ہوئی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے ——— تم نے دیکھی؟

صبح کے وقت افق کی وہ زر اندود کیفیت، جیسے کسی نے سونا پگھلا کر چاروں طرف پھیلا دیا ہو ——— تم نے دیکھی؟

اپریل میں کوہستان کشمیر کی وہ گل پوشیاں، جو برف پگھلنے کے بعد زمین کے اندر کی تمام مخفی رنگینیاں اور عطر بیزیاں لئے ہوئے چاروں طرف ایک افسوں سا پھونک دیتی ہیں ——— تم نے دیکھیں؟

تاتار کا وہ غزال رعنا جو اپنے مشک نافہ کی نکہت سے مست ہو کر، صحرا کی پریوں کو سپردگی کی کیفیت سے بے تاب بنا دیتا ہے ——— تم نے دیکھا؟

تم نے باغ کی کسی فصیل پر طاؤس کو اپنی مستانہ آواز دلوں میں پیوست کرتے دیکھا ہے — ؟

تم نے کبھی اس پُر شور آبشار کو دیکھا ہے جو پہاڑ کی بلندی سے گرتے ہوئے صحرا کو ایک ہنگامۂ لطیف سے لبریز کر دیتی ہے ؟

یقیناً تم نے یہ سب مناظر دیکھے ہوں گے، لیکن کیا تم نے ان تمام کیفیات کو ایک جگہ، کسی ہستی میں مجتمع دیکھا ہے —

اگر نہیں تو تم اس شکستہ حال، غریب الدیار، آوارہ گرد شاعر کے حال سے تعرض نہ کرو، جس نے سب سے پہلی بار ان سب کا اجتماع پنگھٹ پر، گھڑا بھرنے والی دہقانی لڑکی کے اندر دیکھا اور ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔

ادب اور اخلاق

ڈاکٹر سید محمد یوسف

پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ "ادب کس کو کہتے ہیں؟" اجنبی ناقدوں سے استشہاد میرے لئے چنداں دشوار نہیں لیکن میری کوشش یہی ہوگی کہ اس بارے میں اپنی مشرقی روایت پیش کروں۔ ہماری اپنی روایت یہ ہے کہ شعرو ادب دونوں "جزوے است از پیغمبری" ادب وہ ہے جو بہتر زندگی کے طور طریق سکھائے جو حسن وجمال کی قدر بڑھائے اور اس کا احترام سکھائے نہ وہ جو چیرہ دستیوں سے حسن وجمال کی رسوائی کرے۔ ہمارے یہاں جذبات کے اظہار میں بے اعتدالی کا نام "بوالہوسی" ہے۔ ہماری طبع جذبات کی روک تھام سے رواں ہوتی ہے۔ ادب کا اولین مقصد ضبط نفس اور جذبات کی تہذیب وتطہیر ہے اسی لئے مادی عروج کے دور میں صالح ادب کی ضرورت شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ دولت مند اور طاقت ور کی بے ادبی خاص طور پر بدنما ہوتی ہے اور بشریت کے لئے نہ صرف باعثِ ننگ بلکہ باعثِ آزار بھی ہوتی ہے۔ پیغمبری زمانہ ستیزی ہے زمانہ سازی نہیں، ادب محض ایک تصویر نہیں جو واقع ومعروض بے ادبی اور عریانی کی عکاسی کرے بلکہ وہ ایک طنزیہ تصویر (کیریکچر) ہے جس کا ہر خط تحسین وتقبیح کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے اور یہی تحسین وتقبیح ادیب کے آئیڈیل اور اس کے مقاصد کی گہرائی وسعت اور بلندی کا پتہ دیتی ہے آئیڈیل کے ابعاد ثلثہ ہی سے ادیب کا قد وقامت اور اس کا رتبہ ومقام متعین ہوتا ہے ادیب اپنی فنکاری کے لئے جن معروضات، مشاہدات اور تجربات کا انتخاب کرتا ہے ان کی بھی اہمیت یہی ہے کہ یہ انتخاب اس کے دل کا معاملہ کھولتا ہے۔ فن کار جیتی جاگتی بولتی تصویریں تخلیق کرتا ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ تصویریں اپنی بابت کچھ نہیں بولتیں وہ جو کچھ بولتی ہیں اس کا تعلق سراسر فن کار کے فکر ونظر سے ہوتا ہے۔ ایک فنکار کے ہاتھ میں حیوانات، جمادات پتھر، پہاڑ، دریا سب بولتے سنائی دیتے ہیں لیکن ان کے بول ہر حال میں فن کار ہی کے بول ہوتے ہیں۔ قرآن میں شہد کی مکھی وحی کے اسرار وانکشاف کرتی ہے "لطف" کی بات اور ہے، اس کا دار ومدار پڑھنے سننے والے کے مذاق کی صحت اور ورزش پر ہے البتہ ادب کی قلب ماہیت نیا وہ خرچہ نہیں چل سکتی مشرقی روایت میں الف لیلیٰ کو کبھی ادب کے دائرہ کے اندر نہیں آنے دیا گیا۔ یہ ادب کے محیط کے گرد ہی چکر لگاتی رہی۔ کسی مدرسہ میں نہیں پڑھی پڑھائی گئی۔ یہ نامعلوم نصف تعلیم یافتہ قصہ خوانوں کے دماغ کی پیداوار ہے جس میں غیر متعلم جماہیر کے لطف وتفریح کی رعایت کی گئی ہے وہی حال جو آج ہماری صنعت فلم سازی کا ہے۔ یہ سراسر فسانہ ہے جس پر

رنگین خطوط کو بالقصد رنگین تر بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس دور کی اجتماعی حالت کا آئینہ دار سمجھنا بھی غلط ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے مثال موجود ہے کہ پاکستانی معاشرہ کہیں ارفع و اعلیٰ ہے ان تصویروں سے جو ہماری بنائی ہوئی فلمیں پیش کرتی ہیں اس کو ادب میں جگہ دینا بجز اس کے نہیں کہ مغربی مستشرقین کا ایک جھوٹا احسان ہے جس کو ہم اپنی غلامانہ ذہنیت کے مطابق قبول کئے جا رہے ہیں۔

تحسین و تقبیح کا معیار جس کا اوپر ذکر ہوا نقدِ ادب کی قدیم عربی روایت کا اصل اصول ہے ایک موٹی مثال ہے کہ اگر کسی شاعر نے اپنے سیاہ فام معشوق کو حسین کر دکھایا تو کہا جائے گا کہ اس نے فن کا حق ادا کر دیا۔ جمالیات کی حد تک تو اس کی بڑی گنجائش ہے اور فن کار اپنے اس عمل میں سچا اور مخلص بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس کا تعلق تمام تر ذوق سے ہے جو کسی ناپ تول کے پیمانہ کا پابند نہیں آپ دیکھئے لباس، سنگھار اور سجاوٹ کے طریقے ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف ہوتے ہیں کسی طرح لازم نہیں آتا کہ ہم میں سے ہر ایک "خال ہندو" پر سمرقند و بخارا بخش دے۔ ہر مجنوں کی لیلےٰ ایک ہی سانچے کی ڈھلی ہوئی نہیں ہوتی۔ آج جب دوشیزہ عالم کی کمر اور سینہ کے ابھار کو فیتے کی گرفت میں کسا جاتا ہے اور انچ اور ملی میٹر میں ناپا جاتا ہے تو مجھے بے ذوقی بھی معلوم ہوتی ہے اور بے عقلی بھی۔ کاہے کو کبھی حسن نے اقلیم دل میں داخل ہونے کے لئے اس قسم کا پاسپورٹ حاصل کرنے کی ذلت و رسوائی قبول کی ہوگی۔ کیا کہا جائے اس معاشرہ کو اس کلچر اور اس علم و فن کو جو جان و دل کے معاملہ کو ایک ریاضی اور مساحت کا مسئلہ بنا کر دماغ میں ٹھونسے کہتے ہیں ہر چیز انتہا کو پہونچ کر اپنی ضد میں بدل جاتی ہے۔ بیسویں صدی میں شاید عقل اور عقلیت پسندی کا یہی حال ہے۔ الغرض جمالیات میں تو یہ سب کچھ روا ہے لیکن اخلاقیات کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی فنکار سیاہ اعمال کو اپنی تحسین کا موضوع بنائے تو اس فن کو، خواہ اس میں کتنی ہی نفیست کیوں نہ پائی جائے اعزاز نہیں بخشا جا سکتا۔ ایسی تحسین بذاتِ خود تقبیح ہوگی اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی چوری اور دیگر جرائم کی تدبیر میں سائنسی مہارت کا مظاہرہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی قدریں اٹل اور عالمگیر ہوتی ہیں ان کے حسن و قبح میں افراد کی پسند اور شخصی مزاج کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کی تائید دین سے بھی ہوتی ہے اور عقل سے بھی۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ زاہد پر پھبتی ہمارے ادب کی ایک قدیم روایت ہے پھر آج دین کی تضحیک پر کیوں ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے؟ شوخیٔ طبع اور رنگینیٔ تشبیہات و استعارات کا حق نکالنے کے بعد بات کچھ ایسی ہی رہ جاتی ہے جیسے ہمارے ذکی الحس طالب علم اپنے بعض اساتذہ کے بناوٹی انداز اور ادعاءِ علم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تربیت اور ڈسپلن میں حکمت اور موعظت حسنہ کی کمی سے نالاں رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نالہ اور وہ بھی نوجوانوں کا نالہ، پابند نے نہیں ہوتا لیکن اس میں علم کی بے قدری اور بے عزتی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف حال مست صوفی تھے جنھوں نے دین کی ضرورت اور دین کے نظام کو اپنی تعلیوں کا نشانہ بنایا چنانچہ ان کے شطحات وہ آخری قطرہ ثابت ہوئے جس سے معاشرہ کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور قصہ دار و رسن سے کان آشنا ہوئے اور یہاں یہ بھی کوئی زبردستی نہیں بلکہ نہایت معقول بات ہے کہ اس بارے میں کہنے والے کی نیت اور اس کی سیرت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ اپنے اوپر قیاس کیجئے جن دوستوں کے خلوص پر اعتماد ہوتا ہے ان کی چوٹیں کھا کر لطف حاصل

ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر نیت میں شبہ ہو تو ذرا سی بات بھی بُری لگتی ہے۔ باحضوری کی شوخیوں کو بے حضوری کی ڈینگوں سے تمیز دینا معمولی سمجھ اور ادبی ذوق کی بات ہے۔

تحسین و تقبیح ایک ایسا عمل ہے جس کا دار و مدار تخییل پر ہے، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تمثیل سب میں تخییل ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے یہ ایک مانا ہوا طریقہ اور تکنیک ہے صداقت کو دوسرے کے ذہن اور وجدان میں اتارنے کا۔ سادہ ہو یا رنگین اندازِ بیان میں نوک دھار اسی سے رکھی جاتی ہے لیکن صداقت سے اس کا مضبوط رشتہ قائم رہنا ضروری ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے یا اعتدال سے تجاوز ہو تو کذب، اور دور از کار مبالغہ کی صورت رونما ہوتی ہے اسلامی ادب میں قصہ کو مجرد تصورات و حقائق اور علمی اور اخلاقی مسلمات اور نظریات کی تمثیل کی غرض سے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ابو العلاء المعری کے رسالۃ الغفران اور ابن طفیل کے حی بن یقظان کا حال ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ محض افسانہ و افسوں، اس کی حقیقت ایک مداری کے تماشہ کی ہے۔ دورِ انحطاط میں طفلانہ مذاق عام ہوتا ہے اسلئے کذب، مبالغہ اور افسانہ و افسوں کا رواج بڑھ جاتا ہے۔ عربی نقد کے ابتدائی دور میں صدق اور کذب کی جو بحث آتی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے بعض ناقدوں کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے تخییل کو کذب کا نام دے دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ معنی و مطلب کی نسبت سے تخییل کی نوعیت غازہ اور ملمع کاری کی نہیں بلکہ چشم و ابرو کی عشوہ گری اور رنگ کی غارتگری کی ہے تخییل ادب کی جان ہے۔ خاص طور پر جبکہ عقل و وجدان دونوں سے بیک وقت خطاب کیا جائے۔ مشرق میں ابو العلاء المعری کی شاعری کبھی پروان نہ چڑھی اس لئے نہیں کہ وہ آزاد خیال تھا بلکہ اس لئے کہ اس کے یہاں تخییل کی کمی ہے۔ آج مغرب میں اس کو محض اس لئے نوازا جاتا ہے کہ وہ آزاد خیال تھا۔ اقبال کے یہاں منظم فلسفہ کے ساتھ ساتھ تخییل کی فراوانی ہے اسی لئے ان کی شاعری زندہ جاوید ہے۔ عربی میں جب اخلاقی شاعری کی ابتدا ہوتی تو بہت سے تجربے ناکامیاب رہے یہاں تک کہ بعض ناقدوں نے یہ فیصلہ دیدیا کہ "دین" شاعری کا موضوع نہیں بن سکتا۔ یہ اس لئے کہ حقیقت اور تخییل کا امتزاج بایں طور کہ سادہ حقیقت تخییل کی رنگینی میں گم نہ ہو بلکہ تخییل کے رنگوں سے اور چمک اٹھے۔ ایک بڑی دشوار بات ہے۔ دشوار ہو تو ہو ادب اور فن کا کمال یہی ہے۔

نظامِ اخلاق کی جستجو انسان کی فطرت میں ہے۔ اخلاق کی جستجو بالکل ویسی ہی ہے جیسی قوانین قدرت اور سائنس کی جستجو۔ دونوں ہی انسان کی پُرامن اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ جو قوانین قدرت کے علم سے ممتاز ہوا اسے سائنٹسٹ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جو انسانی سیرت اور کردار کی باریکیوں پر نظر رکھے اور بہتر زندگی کے طریقے سکھائے اسے ادیب کہیں گے جو قوانین قدرت کا علم رکھے بغیر "فن کاری" کا مظاہرہ کرے اسے شعبدہ باز کہیں گے اسی طرح جو سیرت و اخلاق کا خصوصی علم رکھے بغیر "فن کاری" کا دعویٰ کرے وہ ادیب نہیں بلکہ الفاظ کا شعبدہ باز کہلائے گا۔

ادیب معاشرہ کا جزو ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے رہبر قافلہ کا جزو ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ رہبر اور قافلہ دونوں منزل کے تعین کی حد تک متفق ہوں۔ البتہ رہبر منزل تک پہونچانے والے راستوں کا بہتر علم اور پختہ تر شعور رکھتا ہو۔ اور اس کی تقریر میں وہ لذت ہو کہ سننے والا یہ جانے کہ جو اس نے کہا گویا وہ اس کے دل میں ہے۔

استفادہ یا سرقہ؟

فرمان فتحپوری

"انتخاب دواوین" جس میں شعراء کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ امام بخش صہبائی نے دلی کالج کے پرنسپل کے ایما پر ۱۸۴۲ء میں مرتب کیا اور ۱۸۴۴ء میں شائع کر دیا اس کا ایک ناقص الآخر مطبوعہ نسخہ لیاقت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے اور یہی میرے سامنے ہے اس میں ولی سے لیکر ۱۸۴۲ء تک کے ممتاز ترین اردو شعراء کا انتخاب مختصر سوانح حیات کے ساتھ دیا گیا ہے۔

قدیم تذکروں کے انداز کا یہ انتخاب، اردو ادب کی تاریخ میں یوں اہمیت رکھتا ہے کہ یہ رطب و یابس سے پاک ہے اور اس میں صرف اُن شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جو صف اول کے شعراء کہے جا سکتے ہیں حالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن کلام کے انتخابات خاصے طویل ہیں۔ انتخاب میں انھوں نے جملہ اصناف سخن کو ملحوظ رکھا ہے اور کم از کم دس بارہ صفحات میں ہر شاعر کے اشعار نقل کئے ہیں۔ میر حسن اور منشی مول چند کے سلسلے میں "سحر البیان" اور "خسروانِ عجم" کے طویل اقتباسات بھی دیئے ہیں۔

انتخاب کلام سے قطع نظر "انتخابِ دواوین" کا دیباچہ بھی نہایت اہم ہے۔ اس سے قبل کے تذکروں میں اس انداز کے دیباچے نہیں ملتے۔ صہبائی نے دیباچہ میں شعر کی تعریف، ایجاد، تاریخ، وزن، قافیہ، ردیف اور اصناف سخن سب پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور ہر صنفِ سخن کے نمونے بھی مع اوزان نقل کئے ہیں۔ انتخاب کلام میں اشعار اتنی کثیر تعداد میں دیئے گئے ہیں کہ ہر شاعر کے طرز فکر اور مذاق سخن گوئی کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے اور دیوان یا کلیات کے مطالعہ کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

صہبائی کے اس انتخاب سے بعد کے تذکرہ نویسوں اور بیاض نگاروں نے استفادہ کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے تاریخ ادب ہندوستانی میں اس سے اکثر اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن کریم الدین نے صہبائی کے اس تذکرہ سے کچھ اس طرح استفادہ کیا ہے کہ ان کا تذکرہ "گلدستۂ نازنیناں" صہبائی کے "انتخاب دواوین" کا چربہ بنکر رہ گیا ہے دونوں تذکروں کو ساتھ رکھ کر دیکھئے تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کریم الدین نے "گلدستۂ نازنیناں" کے نام سے صہبائی کے "انتخاب دواوین" کو اپنا بنا لینے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ صریح سرقہ کی حدود میں آتی ہے۔

کریم الدین جنھوں نے فیلن صاحب کی مدد سے ۱۸۴۷ء میں گارساں کی تاریخ ادب ہندوستانی جلد اول کا آزاد ترجمہ بھی "طبقات شعرائے ہند" کے نام سے کیا تھا، نے لکھا ہے کہ ان کا تذکرہ "گلدستہ نازنیناں" ماہ ذی حجہ ۱۲۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۸۴۴ء میں تمام ہوا اور ماہ صفر ۱۲۶۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۸۴۵ء میں چھپنا شروع ہو گیا[1] اسکا مفہوم یہ ہے کہ کریم الدین کا تذکرہ بلحاظ تاریخ تالیف صہبائی کے تذکرہ کے دو سال بعد لکھا گیا اور بہ اعتبار سن طباعت ایک سال بعد منظر عام پر آیا۔ اس تذکرے میں کریم الدین نے دیباچہ سے لیکر شعراء کے حالات زندگی تک " انتخاب دواوین " سے کلی استفادہ کیا ہے لیکن کہیں ایک جگہ بھی صہبائی کے تذکرہ کا نام نہیں لیا بلکہ اپنے تذکرے کو اپنے انداز کا پہلا تذکرہ بتایا ہے۔

" انتخاب دواوین " اور "گلدستہ نازنیناں" میں کس درجہ مشابہت ہے اور کریم الدین نے صہبائی سے کس نوعیت کا استفادہ کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دونوں تذکروں کی چند سطریں بطور مثال ایک دوسرے کے مقابل نقل کی جاتی ہیں:۔

" انتخاب دواوین "	" گلدستۂ نازنیناں "
."شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعرائے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالمگیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والاجاہ نے اس کی قدر دانی کرکے پرورش فرمائی، یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہی مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔	"شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعرائے دکن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالمگیر اورنگ زیب میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والاجاہ نے اس کی قدر دانی کرکے پرورش فرمائی، یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھن میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا یہی مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔
صفحہ ۲۱	صفحہ ۲۸۹
"درد تخلص خواجہ میر صاحب .... فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے۔ مذہب اُن کا حنفی .... علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی	"درد تخلص خواجہ میر صاحب .... فرزند لئیق خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص کے تھے۔ مذہب ان کا حنفی .... علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی

[1] ملاحظہ ہو "گلدستہ نازنیناں" مطبع رفاہ عام ۱۲۶۱ھ۔ مملوکہ لیاقت نیشنل لائبریری۔

"انتخاب دواوین"

دست قدرت رکھتے تھے اور ....
ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے
یہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے
خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ
میاں ناصر احمد ہر مہینہ کی ۲۴ تاریخ کو بین
بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں۔
.... غرض خواجہ علیہ الرحمتہ نے
گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں
سے رحلت فرمائی اشعار ان کے دیوان
سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔"
صفحہ ۴۰

"گلدستۂ نازنیناں"

دست قدرت رکھتے تھے اور ....
ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے
یہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے
خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ
میاں ناصر احمد ہر مہینہ کی ۲۴ تاریخ کو بین
بجاتے ہیں اور کچھ گاتے ہیں۔
.... غرض خواجہ علیہ الرحمتہ نے
گیارہ سو ننانوے ہجری میں اس دنیائے دوں
سے رحلت فرمائی اشعار ان کے دیوان
سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔"
صفحہ ۱۵

یہی نوعیت اوروں کے حالات کی ہے لیکن عبارتیں نقل کرکے مضمون کو بے سبب طول دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا اس لئے شاعر کے نام کے ساتھ تذکروں کے ایسے صفحات کے حوالے درج کئے جاتے ہیں جن کے مضامین لفظاً و معناً ہر طرح یکساں ہیں۔

انتخاب دواوین		گلدستۂ نازنیناں
سودا	صفحہ ۶۶	صفحہ ۶۵
جرأت	صفحہ ۱۲۵	صفحہ ۱۴۶
شاہ نصیر	صفحہ ۱۶۵	صفحہ ۲۸
ممنون	صفحہ ۲۶۶	صفحہ ۱۶۸
ناسخ	صفحہ ۱۹۶	صفحہ ۲۵۲
ذوق	صفحہ ۱۳۲	صفحہ ۱۱

دیباچہ کی عبارت بھی صریحاً انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے البتہ ایک فرق یہ ہے کہ گلدستۂ نازنیناں میں شعرا کی تعداد انتخاب دواوین کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے اور اس میں شعرا کے ساتھ آخر میں چند شاعرات کا ذکر بھی خصوصاً کیا گیا ہے لیکن کیا عجب ہے کہ کریم الدین نے ان کے حالات کے سلسلے میں بھی کسی تذکرے سے استفادہ کیا ہو اور ہم ابھی اس سے بے خبر ہوں۔

مومن کی معشوق فریبیاں

عندلیب مہر

ریخ ادب اس امر کی شاہد ہے کہ ہر عظیم المرتبت شاعر کا اندازِ فکر اپنے پیش رووں اور معاصرین دونوں سے
دجاتا ہے۔ نگاہ کا یہی امتیازی انداز فکر، اسلوب نگارش اور طرز بیان کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے بلکہ شاید
ل کے لئے نئے پیرایوں کی تلاش پر اُسے اُکساتا ہے اور اسی وجہ سے ایک ہی موضوع سے بحث کرنے کے باوجود شاعر
تلف اور انداز بیان جدا ہوتا ہے۔

الب، مومن، ذوق تینوں بزرگ اپنے زمانہ کے نہایت جلیل القدر شعراء تھے لیکن ہم عصر ہونے اور قریب
ماں ماحول میں نشو و نما پانے کے باوصف ہر ایک کے خیالات میں بعد المشرقین ہے اور مضمون میں بھی ایک کو
سے کوئی نسبت نہیں۔ اور اگرچہ ان تینوں حضرات کا موضوع شاعری زیادہ تر بیان حسن و عشق ہے۔ انداز بیان
ا اپنا اور خیال جدا ہے۔ پھر زندگی عشق و محبت کے تجربات بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ اس سے پتہ
کہ ہر شاعر کا کلام اس کی افتادِ طبیعت، قوتِ مشاہدہ، ابداعِ تفکر اور ذہنِ رسا کا آئینہ ہوتا ہے۔ بنا بریں
ت ایک شاعر کے کلام میں نمایاں ہوتی ہیں دوسروں کے یہاں نظر نہیں آتیں۔

مومن کے مطالعۂ کلام سے جہاں خود ان کے اپنے مزاج و سیرت کا اندازہ ہوتا ہے ان کے محبوب کا تصور بھی ذہن نشین ہو جا
م شعراء کی طرح ان کا محبوب خیالی اور فرضی نہیں ہے، بلکہ بقول جناب نیاز فتحپوری گوشت پوست کا انسان ہے اور جملہ
صائص اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف شوخ و طرار ہے، بلا کا ذہین و فطین بھی ہے۔ کسی کے فریب میں آنا درکنار،
لی ہر بات کو بہ نظر اشتباہ دیکھتا ہے اور غور کرتا ہے کہ فلاں حرکت کس مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ چنانچہ حسب موقع
اب بھی دیتا ہے۔ لیکن مومن بات بنانے میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ کچھ ایسی تاویلات پیش کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے
لو اُن کی بات کا یقین آ ہی جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مفاد کو محبوب کے سامنے اس طرح رکھتے ہیں کہ
لذکر کو الٹا ہر اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے اور وہ ان کی بات سننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

ہر چند کہ غالب نے بھی ایک مرتبہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ ع

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام!

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مومن اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اور اُن کے یہاں اس قسم کے خیالات اتنی کثرت سے
ئے ہیں کہ ان کے کلام کی یہ ایک مستقل خصوصیت بن گئی ہے لیکن باوجود اعادہ و تواتر یہ مضامین ہر جگہ پُرلطف
زہ ہیں۔ ذیل کی چند مثالوں سے غالباً ارباب ذوق خود اندازہ لگا سکیں گے کہ یہ بیان کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔
غیر کے مرنے کے بعد ایک دفعہ محبوب کو اس کی یاد آئی اور کہنے لگا وہ میرا بڑا سچا عاشق تھا مجھے دیکھ کر وفورِ اضطراب

میں اکثر کلیجہ پکڑ لیا کرتا تھا اور دل بیقرار ہو جاتا تھا۔ مومن یہ سن کر کہاں تاب لا سکتے تھے۔ معاً خیال گزرا کہ غیر اگرچہ مرتا ہے اس کی محبت کا نقش محبوب کے دل میں یوں ہی جاگزیں ہوتا رہا تو اپنا رنگ کبھی نہ جم سکے گا۔ لہٰذا یہ خیال مٹانے کے لئے محبوب سے کہا آپ خواہ مخواہ غیر کی الفت میں گرفتار رہیں۔ اُسے ہرگز آپ سے کوئی عشق نہیں تھا۔ نہ آپ کی شیفتگی کے باعث وہ کلیجہ پکڑ لیتا تھا۔ وہ تو مجھے آپ کے ساتھ دیکھ کر آتش حسد سے بیقرار ہو جاتا تھا اور کلیجہ تھام لیتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عبث تم کو ہوئی الفت وہ کب دیتا تھا دم تم پر یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا!

محبوب ایذا رسانی پر کمربستہ ہے اور صبح و شام عاشق پر نت نئے ستم توڑتا رہتا ہے۔ وصل کا کیا ذکر وہ عاشق کی صورت سے بیزار ہے۔ لیکن مومن محبوب سے ملاقات کی نئی شکل نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں میں تمہاری فرقت کے صدمات سہتے سہتے اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ ان کا برداشت کرنا میری عادت ثانیہ میں داخل ہو گیا ہے۔ پس ہجر میرے لئے اب ہرگز باعث آزار نہیں رہا۔ لہٰذا اگر تم واقعی مجھ پر ستم کرنا چاہتے ہو تو اُس کی ایک یہی تدبیر ہے کہ مجھ سے ملاقات کرو۔ کیونکہ جب کوئی بات خلافِ معمول ہو گی تو مجھے ضرور تکلیف پہنچے گی۔ اس خیال کو حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ؎

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

بظاہر شعر میں محبوب کا مفاد پیشِ نظر ہے کہ اس کو ظلم کی ایک نئی ترکیب سجھائی ہے لیکن اس میں شاعر کا اپنا جو فائدہ متصور ہے اربابِ نظر سے مخفی نہیں۔

محبوب نے اپنے دروازہ پر پاسبان بٹھا دیا ہے کہ ہر کس و ناکس بلا اجازت گھر میں بار نہ پا سکے۔ مومن کسی طرح اندر داخل پانے کے لئے اس کو آمادہ کر لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ واقعی اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اب محبوب پاسبان کی یہ حرکت قبیح دیکھ کر چراغ پا ہے اور آن کی آن میں اس کی گردن اڑا دینا چاہتا ہے۔ مومن پاسبان کے ممنونِ احسان ہونے کے باعث اُس کی حمایت میں محبوب سے کہتے ہیں۔ نہیں نہیں خدارا ایسا نہ کیجئے گا۔ یہ غریب اگر قتل ہو گیا تو آپ کے گھر کی حرمت جاتی رہے گی اور جو لوگ آپ کی گلی کو ہمیشہ سے "کوچۂ حرم" کا درجہ دیتے رہے ہیں اس کی عظمت سے منکر ہو جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجیے قتل ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

محبوب محفل میں اغیار کو ناز و غمزہ دکھاتا ہے لیکن عاشق کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔ مومن چاہتے ہیں کہ اس کی نظر التفات بیشتر مجھ پر رہے۔ لہٰذا بظاہر محبوب کے فائدہ کی خاطر مگر درحقیقت اپنی مقصد برآری کے لئے اس سے کہتے ہیں دیکھئے اگر آپ رسوائی سے مصئون و مامون رہنا چاہتے ہیں تو مجھے بھی اپنا غمزہ دکھلاتے رہا کیجئے ورنہ میری طرف نہ دیکھنا ہی آپ کا سارا بھرم کھول دے گا اور اہل محفل سمجھ جائیں گے کہ میں چونکہ اصلی عاشق ہوں اس لئے آپ مجھے دیکھتے ہوئے شرماتے ہیں۔ شاعر نے یہ مضمون کس عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ ؎

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا!

یہی خیال تھوڑے سے فرق کے ساتھ حسب ذیل اشعار میں بیان ہوا ہے ؎

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

رقیب کی محبت محبوب کی نگاہ میں ہمیشہ سے معتبر تھی لیکن یکایک کسی بات سے خیال ہوا کہ اب اگلا سا وفور شوق باقی نہیں رہا۔ مومن گویا موقع کے منتظر تھے۔ سمجھ گئے کہ یہی وقت دشمن کے خلاف محبوب کو بھڑکانے اور اس کی بدگمانی کو یقین کے درجہ تک پہنچا دینے کا ہے۔ کہنے لگے آپ کو تو ناحق یہ وہم ہے کہ رقیب کی محبت میں اب کمی واقع ہو گئی ہے۔ وہ تو آپ سے حقیقی محبت کبھی کرتا ہی نہ تھا اور میں اسی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ کا اس سے بگڑ جانا یقیناً بے جا اور بے معنی ہے! اب یہ خیال لباسِ شعر میں یوں جلوہ فرما ہے ؎

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں — سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

عاشق آتش ہجر سے پھنک رہا ہے۔ کوئی صورت ملاقاتِ یار کی نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ معشوق کا مزاج شناس ہے۔ جانتا ہے کہ اُسے نازِ یکتائی ہے اور کسی کو اپنا حریف دیکھنا گوارا نہیں۔ بس کہتا ہے آپ نے میرے دل میں جو آگ لگائی تھی اس کے شعلے اب اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ آپ کی برقِ تجلی کا مقابلہ کرنے کے دعویدار ہیں۔ خدارا آئیے اور اپنا جلوہ دکھا کر یہ دعویٰ غلط ثابت کر دیجئے۔ کیا عمدہ طریقہ محبوب سے ملاقات کا نکالا ہے۔ اب شعر ملاحظہ کیجئے ؎

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

تھوڑے سے فرق سے یہی مضمون ذیل کے شعر میں نظم کیا ہے ؎

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں — میں نے دعویٰ کیا تحمل کا

آزار رسانی میں محبوب کو لطف آتا ہے۔ چاہتا ہے عاشق کو کسی نہ کسی طرح ایذا پہنچتی رہے۔ لہذا ستمگری کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے۔ عاشق کہتا ہے مجھ پر آپ کا ظلم تو نرا فعلِ عبث ہے۔ کیونکہ میں ایک سخت جان انسان ہوں، ہرگز آپ کے مظالم سے گھبرا جانے یا مر جانے کا امکان نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو آسمان سے میری سخت جانی کا حال دریافت کر لیجئے۔ میں ایک مدت سے اس کے جور و ستم سہہ رہا ہوں لیکن نہ آج تک کبھی گھبرایا نہ جان دی۔ دراصل یہ بھی ایک طریقہ محبوب کو ستم رانی سے باز رکھنے کا ہے۔ جو نہایت خوبی سے بیان ہوا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو — تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث

مومن محبوب کے تمام تر التفات کے طالب ہیں۔ نہیں چاہتے کہ وہ دشمن کی طرف ذرا بھی نظر اٹھا کر دیکھے چنانچہ یہی بات گھڑی جس میں بظاہر رقیب کا فائدہ ہے لیکن حقیقتاً اپنا ہے۔ محبوب سے کہا دیکھئے! آپ کی آنکھ میں جادو بھرا ہوا ہے۔ ہرگز غیر کو نہ دیکھئے ورنہ اس پر جادو ہو جائے گا۔ یہ بات کیسے پیارے انداز میں کہی ہے ؎

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

معشوق کو خیال ہے کہ رقیب سچا عاشق ہے اور اس کے واسطے ہر قربانی کرنے کو تیار ہے، حتیٰ کہ جان تک دے سکتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ اے محبوب! اگر تو واقعی اسے ایسا سمجھتا ہے تو ذرا اس کو قتل کرکے تو دیکھ، پھر تجھے ہماری اور اس کی محبت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ یعنی اگر تو نے رقیب کو قتل کر دیا تو ہم محض اس رشک سے کہ وہ تیرے ہاتھوں قتل ہوا خود اپنی جان آپ دے دیں گے۔ اور اس طرح ہماری آزمائش خود بخود ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی معشوق کو زیر دینے کی ایک کوشش ہے، کیونکہ جب رقیب اُن کے راستہ سے ہٹ گیا تو مومن کی مخالفت کون کرے گا اور جب مخالفت جاتی رہی تو ظاہر ہے مومن معشوق پر اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ شعر حسب ذیل ہے ؎

گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغ رشک سے اپنا عدو کو قتل کیجیے، پھر ہمارا امتحاں کیجیے

عاشق اپنی وفاؤں کا ذکر کر رہا ہے۔ محبوب بگڑ بیٹھتا ہے کہ تمہیں اس قصہ کے چھیڑنے کے سوا اور کچھ کام ہے۔ جا نیے میں نہیں سنتا۔ محبوب کا غصہ فرو کرنے کے لئے مومن کہتے ہیں اچھا صاحب! جانے دیجئے، اگر آپ کو ذکر سے ایسی ہی چڑ ہے تو قسم لے لیجئے ہم باوفا ہونے کے باوجود آئندہ کبھی آپ کو اپنا وعدۂ قتل تک یاد نہ دلائیں گے مقصد یہ کہ آپ کو قتل کا وعدہ پورا نہ کرنے دینے سے خود کو زندہ و سلامت رکھ سکیں گے۔ شعر ہے ؎

گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے گو قتل کا وعدہ ہو، تقاضا نہ کریں گے

رقیب محبوب کی مہربانیوں پر نازاں و شاداں ہے۔ کم بخت میں اتنا ظرف کہاں کہ جو بات راز کی تھی اسے اپنے سینہ میں محفوظ رکھتا۔ اب محل بے محل ہر جگہ یہی ذکر کرتا پھرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر محبوب کو رسوا کر رہا ہے۔ مومن محبوب کے دل سے غیر کا نقشِ محبت مٹانے اور اسے سبک کرنے کے لئے لیکن فی الواقع اپنی شخصیت کو بھاری بنا ظاہر کرنے اور اپنے عشق کا اثر جتانے کیلئے کہتے ہیں آپ نے رقیب سے محبت کیا کی اس کے حق میں دشمنی کی، کیونکہ اس چاہ کی بدولت نہ صرف آپ رسوا ہو رہے ہیں وہ خود بھی بدنام ہو گیا ہے۔ لہذا لکھتے ہیں ؎

تاب کم ظرف کو کہاں؟ تم نے دشمنی کی عدو سے، چاہ نہ کی!

ظلم کرنا معشوق کی عادت ہے۔ لیکن عاشق اس کی ہر ادا پر فریفتہ ہے، اُسے آزار میں بھی لذت محسوس ہوتی ہے۔ معشوق سے کہتا ہے تم مجھے اس لئے ایذا دیتے ہو کہ تکلیف ہو لیکن جب بجائے تکلیف کے راحت ملے تو ظاہر ہے تمہاری جفا گری بیکار ہے۔ صاف الفاظ میں کہتے نہیں لیکن مومن کا مقصد یہی ہے کہ معشوق ستم سے باز رہے۔ لہذا ایسے انداز میں بات کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے فعل کو خلاف عقل سمجھ کر خود ہی چھوڑ دے ؎

جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو بیوفا پھر حاصل بیداد کیا؟

محبوب نے مومن کو اپنی محفل سے اٹھا دیا۔ رقیب کو ہنسی کا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے فوراً بات بنائی۔ ہنسنے کیا ہو محبوب اس قدر نازک مزاج انسان ہے کہ ہر وہ شخص جو اس کی طبیعت پر گراں نہ گزرے سمجھ لو انتہائی سبک یعنی ذلیل ٹچھورا آدمی ہے لہذا تمہارے خوش ہونے کا یہ محل ہرگز نہیں ردئے سخن اگرچہ رقیب کی طرف ہے لیکن مومن اسی جواب کے ذریعہ محبوب کو بھی متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے مجھے محفل سے نکال دینے میں غلطی کی۔ دراصل اس سزا کا مستحق تو رقیب تھا کیونکہ وہ سبک آدمی ہے۔ گویا فریب میں مبتلا کرکے محبوب کی نظر میں خود کو محترم و معتبر رکھنا چاہتے ہیں۔ لفظ "سبک" سے اس شعر میں بڑا فائدہ اٹھایا گیا ہے جس سے بیان مضمون میں خاص لطف پیدا ہوا ہے

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر — سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

ایک بال کی قیمت

ڈومینوک پاسن فرانس کا ایک متمول شہری تھا ایک مکان کی خریداری کے سلسلہ میں وہاں کے رواج کے مطابق اس نے مالک مکان کو اپنا ایک بال بطور بیعانہ دیا جو اس بات کی ضمانت تھا کہ مکان کا سودا ہو چکا ہے۔

بعد کو مالک مکان اپنے وعدے سے پھر گیا اور پاسن کا بیعانہ (بال) واپس کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ پاسن نے مالک مکان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جو ۲۳ برس تک چلتا رہا اور اس کے بعد عدالت کے فیصلہ کی رو سے پاسن کو اپنا بال واپس مل گیا۔

مقدمہ کے اخراجات کا جب جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ بال کی واپسی میں پاسن کے پچاس ہزار روپے خرچ ہوئے۔

ریاض گورکھپوری

خیر بہوروی

ذرا ٹھہریئے "رند پاک باز ریاض" پر فاتحہ پڑھ لیجئے۔ وہ بھی رندانِ پاک باز کو ثواب پہونچایا کرتے تھے ؂

رندانِ پاک باز کو پہونچائیں گے ثواب
کورے گھڑے میں شیر رہے، انگبیں رہے

ریاض گورکھپوری سے میری مراد وقت کے حافظ و خیام رند پارسا سید ریاض احمد ریاض خیرآبادی سے ہے جن کو گورکھپور کے ذرے ذرے سے والہانہ محبت تھی اور جو گورکھپور کو اپنا وطن ثانی کہا کرتے تھے مجھے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں خیرآبادی آپ سراپا خیر، عجیب نسبت ہے۔ میں
تو گورکھپوری تھا خیرآبادی کیونکر ہوگیا۔ خیر گورکھپور
میں۔ کاش میں بھی گورکھپور میں ہوتا۔
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ "

ریاض۔ خیرآباد۔ ۱۰ رجون ۱۹۳۱ء

ریاض ۱۰ برس کی عمر میں گورکھپور آئے تھے اور چالیس سال سے زیادہ یہاں مقیم رہے اور جوانی کا زیادہ حصہ یہیں کی فضا میں گذارا۔

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور
لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور

گورکھپور کی خاک سے ان کی شیفتگی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ یہاں کی موت کو اپنے لئے زندگانیٔ جاوید سمجھتے تھے ؂

یہاں کی موت بھی ہے زندگانیٔ جاوید
ہوائے باغِ جناں ہے ہوائے گورکھپور

اور اہل وفائے گورکھپور کی پرستش تو ان کا دین و ایمان تھا ؎

پرستش ان کی ہمارا تو دین و ایماں ہے
عجیب چیز ہیں اہلِ وفائے گورکھ پور

"ادائے گورکھپور" ان کے لئے دنیا سے الگ ایک ادا تھی اور وہ یہاں کی صبح وشام پر "بنارس کی صبح اور اودھ کی شام" صدقے کرتے تھے ؎

اودھ کی شام بنارس کی صبح صدقے ہو
کہ اک جہاں سے جدا ہے ادائے گورکھ پور

علی حزیں نے تو بنارس آنے کے بعد یہاں سے قدم اس لئے نہیں نکالا کہ بنارس معبد عام ہے اور ہر برہمن لڑکا رام دلچھمن کی صفات کا حامل ہے۔

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

مگر ریاض نے گورکھپور اور جنت کی دلفریبیوں میں کوئی فرق باقی نہیں رکھا اور گورکھپور آنا جنت کے برابر ثابت کر دیا

چمن بھی، حور بھی، حسن وشباب بھی، مے بھی
جسے بہشت میں جانا ہو آئے گورکھ پور

اللہ رے خوش عقیدگی :-

پکارتی ہیں یہی دلفریبیاں اس کی
نہ آ کے ہو جسے جانا وہ آئے گورکھ پور

پوری غزل میں گورکھپور سے اپنے تعلق خاص کی جو تصویر ریاض نے کھینچی ہے وہ جذبات کی بے اختیاری: رجوش وگرمی کے لحاظ سے عجیب وغریب چیز ہے غزل پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ گورکھپور میں ریاض پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جو نہایت تند وسخت تھا۔

فضائے گورکھپور، خوش نوائے گورکھ پور اور مہمان سرائے گورکھ پور کے ساتھ ریاض نے حنائے گورکھ پور کی بھی تعریف کی ہے ؎

ہم اپنے خون تمنا سے سینچ آئے ہیں حسیں لگائیں منگا کر حنائے گورکھ پور

فرید آباد کی مہندی لاکھ مشہور سہی مگر حنائے گورکھپور سے اس کو کیا نسبت ہو سکتی ہے جس کو ریاض نے اپنے خون تمنا سے سینچا ہے۔

ریاض تم نے لکھی ہے اسی لئے یہ غزل برا کہیں نہ تمہیں دلربائے گورکھ پور

دلربائے گورکھپور ریاض کو جو چاہیں کہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جائے گا کہ ریاض نے گورکھپور اور دلربائے گورکھپور دونوں کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

ریاض کے استاد خدائے سخن منشی امیر احمد امیر مینائی مرحوم نے بھی لکھنؤ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

اور مرزا غالب نے بھی صنم کدۂ بنارس کے مناظرِ حسن وجمال کی تصویر کھینچی ہے اور یہاں کے "قیامت قامتان مژگان درازان" پری وشوں کی تعریف کی ہے

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور بہشت خرم و فردوس معمور
قیامت قامتان مژگان درازان ز مژگاں بر صف دل نیزہ بازاں
بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور سراپا نور ایزد چشم بد دور

اور کلکتے کے نازنین بتان خود آرا کو بھی بڑے درد و کرب کے ساتھ یاد کیا ہے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

مگر ریاض نے گورکھپور کا ذکر جس ذوق و شوق کے ساتھ کیا ہے وہ ریاض کے حدیثِ شوق و شباب کی ایسی تفسیر ہے جس کو سوس لوکیا بات تا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

گورکھپور سے ریاض کی محبت کا اثر دیکھئے کہ ان کا دیوان بھی یہیں مرتب ہوا اور ایک گورکھپوری ہی نے اس کو اپنے زیر اہتمام حیدرآباد میں طبع بھی کرایا۔ ریاض نے کہا تھا۔

تھا ودیعت وہ شہر گورکھپور
چھپ کے نکلے گا دس مہینے میں

دیوان گورکھپور ہی میں چھپنے والا تھا مگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے یہاں دو چار جزء سے زیادہ نہ چھپ سکا۔

دیوان کا انتساب بھی گورکھپور ہی کی جنت ریاض رضواں کے نام ہے اور یہ نام بھی ریاض ہی کا عطیہ ہے

نامِ دیواں ریاض رضواں ہے
آئے گی کھل کے اب تو چھپنے میں

دیوان کے حصہ اوّل کا تاریخی نام "آتشِ گلِ تر" اور حصہ دوم کا "آتشِ تر" ہے۔

اس کی تاریخ آتش گلِ تر
آتش تر پلانے پینے میں

گورکھپور سے ریاض کی شیفتگی بے وجہ نہیں تھی۔ اسی شہر کی شعر آفریں فضا میں ان کی شاعری کی نشو و نما ہوئی تھی اور ان کی انشاپردازی کا جوہر اصلی کھلا تھا۔ "فتنہ" اور "عطرِ فتنہ" ریاض نے گورکھپور ہی سے نکالا تھا جو نیم مزاحیہ اور شریفانہ طنز و مزاح کا مرقع تھا

فتنے کو پوچھتا تھا کوئی کس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

عطرِ فتنہ میں اس دور کے مشاہیر شعراء کے طرحی کلام کا انتخاب شائع ہوتا تھا اور یہ شعر اسی کی

لوح پیشانی کا طغرا تھا:-

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

یہ دونوں ننھے منّے پرچے ریاض کی خوش مذاقی بذلہ سنجی اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ گورکھپور سے ریاض الاخبار" اور "گلِ صلح کل" ریاض ہی کے قلم کے سائے میں شائع ہوتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ریاض کی شہرت شاعر کی حیثیت سے ہوئی حالانکہ وہ شاعر کم ادیب و نثر نگار زیادہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے ایک مضمون "ریاض بحیثیت ادیب و نثار" لاہور کے مشہور رسالہ "عالمگیر" میں لکھا تھا لیکن وہ سرسری تھا اور یہ عنوان تفصیل چاہتا ہے۔ ریاض اپنے دور کے ممتاز ادیب، صاحب طرز انشا پرداز اور مانے ہوئے صحیفہ نگار تھے جس زمانے میں "اودھ پنچ" لکھنؤ کے ایڈیٹر سجاد حسین اور "طوطی ہند" میرٹھ کے ایڈیٹر سید مرتضیٰ حسین بیان یزدانی کی قلمی معرکہ آرائی ہوتی تھی تو ان کی انشا پردازی اور قوت تحریر کا ایسا رعب دلوں پر چھا گیا تھا کہ بہتوں کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ ریاض کی انشا پردازی کی خصوصیت ان کی شرافت تحریر تھی جس کا اعتراف ان کے حریفوں کو بھی ہے کہ ریاض کے قلم کی زبان سے کبھی کوئی فقرہ یا جملہ ایسا نہیں نکلا جو تہذیب سے گرا ہوا ہو۔ اور جس پر شرافت تحریر کو شرم آئے بازاری اور عامیانہ زبان تو گویا ان کو آتی ہی نہیں تھی۔ ریاض کی نثر کے نمونے ان کے ناول "حرم سرا" "نظارہ در تصویر" میں ملتے ہیں اور ان کے خطوط میں بھی ان کے قلم کی گلکاریاں نظر آتی ہیں۔

ایڈیٹر شباب کو لکھتے ہیں:-

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے
اے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

شباب" جام شراب بنکر آیا کہ بڑھاپے میں کام دے یہی وہ چیز ہے جو بڑھاپے میں بھی کام آتی ہے جوانی میں بھی۔ ٹائیٹل پیج تو پنجاب کے پرچوں کو بھی شرمانے والا ہے۔

- اللہ کرے حسن شباب اور زیادہ"

شباب اپنے ساتھ اک پارہ جگر بھی لایا نئی لذت دل کا کارڈ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ مرحوم کی یاد نے تڑپایا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بیٹا باپ کو نہیں پہچانتا۔ بھتیجے کی سعادتمندی ہے کہ اس کو چچی بزرگی کا خیال ہے۔ اللہ ترقیاں نصیب کرے۔ اس میں نسیم بہبود اور امین سلونوی برابر کے شریک ہیں۔ انتخاب اور شباب دونوں ساتھ ساتھ لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ انتخاب کے سب نمبرٹ یا مر تقاضائے سن سے تھا اب عوارض نے اور جی کا دکانہ دکھادے پر پڑی بدمعیب۔ مگر برائی بڑا عیب تھی۔ اس لئے یہ غنیمت ہے

مگر کیا غنیمت ہے یہ کہنے کے دن گئے یا کہنے کے لائق نہیں رہے

یہ کالی کالی بوتلیں ہیں جو شراب کی
راتیں ہیں اس میں بند ہمارے شباب کی

میں کسی حال میں بھی ہوں کوشش کروں گا کہ کارڈ کی تعمیل کروں۔

دعاگو

ریاض خیرآبادی

ایک خط میں راقم الحروف کو لکھتے ہیں:-

"مکرمی مشرق کے لئے آپ اس کے مصداق ہیں "مردے از غیب برون آید و کارے بکند" نیز قاضی مقبول حسین صاحب۔ جبتک قاضی صاحب ادارت اپنے ہاتھ میں نہ لیں آپ ایک ہفتے کیلئے بھی مشرق سے جدا نہ ہوں آپ میں بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کی تحریر برہم مرحوم سے بہت ملتی جلتی ہے یہ بات اچھے اچھوں کو نصیب نہیں۔

نمائشی مشاعرے کا انتخاب اچھا ہے ایک شعر غلطی کی وجہ سے بہت برا چھپا۔ فوراً دوسرے پرچے میں تصحیح شائع کر دیجئے کہ سہو کاتب سے منتخب شعر کے سوا گبر کا ایک شعر غلط چھپ گیا ہے جسکی تصحیح گبر صاحب یوں کرتے ہیں

کٹے ہیں رات دن مرے یاد شباب میں
میں توبہ کرکے اور گنہگار ہو گیا

توبہ کیا چھپا ہے توبہ کی چاہئے اسی طرح مصرعۂ اول میں "غرق" کا غلط یاد میں "غرق" خلاف زبان ہے۔

والسلام

ریاض۔ خیرآباد۔ اودھ

۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء

یہ پہلا خط ہے جو ریاض نے مجھے تحریر فرمایا تھا جب میں نے ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور کے ایڈیٹر حکیم برہم کے انتقال کے بعد اس کا اداریہ لکھا تھا۔ ریاض کی انشائے عالیہ کا ایک سلسلہ ریاض آپ اپنے آئینے میں یادش بخیر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے رسالہ نگار لکھنؤ میں شروع کیا تھا جو زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور ہمارا ادبی سرمایہ بوڑھے ریاض کی جوان تحریروں سے محروم رہ گیا۔

ریاض کے ادب و انشا کے قدر شناسوں میں میرزا محمد علی دہلوی افادی جیسے انشاپرداز شامل تھے اور

تاش بھائی پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر تو ریاض کی شاعری سے زیادہ ریاض کی نگاری، شوخیٔ تحریر اور شریفانہ طنز و مزاح کے قائل تھے۔
ریاض نے ۱۹۱۰ء میں گورکھ پور کو خیر آباد کہا تھا اور راجہ محمد علی خاں ساحر والیٔ ریاست محمود آباد کے اصرار گئے تھے اور کہا تھا

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشتِ شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

لیکن لکھنؤ کے دوران قیام میں بھی گورکھپور کے احباب کی یاد سے غافل نہیں ہوئے۔

ریاض احبابِ گورکھ پور اکثر یاد کرتے ہیں
زباں پر میری اکثر ذکرِ گورکھ پور رہتا ہے

بس ریاض نے کبھی یہ کہا تھا:-

ریاض اس شہر سے اب کیا کریں ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاکِ گورکھ پور ہو جانا

وہ گورکھ پور کو کیسے بھول سکتا تھا گورکھ پور آنے جانے کا سلسلہ ریاض نے آخر وقت تک باقی رکھا اور بیتے ہوئے یاد کے ساتھ داغ کہنہ تازہ کرنے کے لئے اکثر گورکھ پور آتے جاتے رہے:-

ریاض اب اس طرح آجاتا ہے دو دن کو شباب
داغِ کہنہ تازہ کر لاتے ہیں گورکھ پور سے

لکھنؤ کا سفر ریاض کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا تھا اسی نامبارک سفر میں ان کا ایک بکس چوری گیا تھا جس میں ی کاغذات اور ریاض الاخبار کی فائلوں کے ساتھ ان کا غیر مطبوعہ دیوان بھی تھا جس کا غم ان کو تاحیات تڑپاتا رہا پور کے میرے زمانۂ قیام میں اس دیوان کی کئی غزلیں مرحوم کی زبان سے سننے کا موقع ملا تھا۔ ذیل کی غزل بھی ان ان سے سنی تھی جو انہیں کے دستِ خاص کی لکھی ہوئی میرے قلمی ذخیرے میں محفوظ ہے اور ان کے مطبوعہ دیوان میں سے۔

کیوں کہا شربتِ دیدار میں کیا رکھا ہے
ہو نہ ہو آپ نے کچھ زہر ملا رکھا ہے

پیچھے اجڑے ہوئے دل میں مرے کیا رکھا ہے
ہائے جینوں نے پری خانہ بنا رکھا ہے

تیغ قاتل نے ہے جس ہاتھ لہو میں ناحق
خونِ بسمل میں کہیں رنگ حنا رکھا ہے

میں جدھر جاؤں ادھر ساتھ ہیں جوبن اُنکے
ان حسینوں نے تماشا سا بنا رکھا ہے

دیکھئے سب وہی سرحد کے نظارہ اپنا
آپ ہی نے انہیں انگلی پہ نچا رکھا ہے

مجھوٹے چھوٹے ترے ہاتھوں سے نہیں کیونکر آئے
جور پنہاں کو کوئی گردن پہ اٹھا رکھا ہے

ہم دکھا دیں گے ہزاروں میں تماشا اپنا
حشر تو آئے کہیں وعدہ وفا رکھا ہے

داغِ دل تک دکھانے کو ہوئے ہیں بے چین
میں نے انگاروں پہ ان کو بھی اٹھا رکھا ہے

وقت کی بات ہے کیا وصل میں افتاد پڑے ساتھ شوخی کے حیا کو بھی لگا رکھا ہے۔

ہم بھی کیا شخص ہیں اللہ سلامت رکھے کہ جفا پیشہ حسینوں کو ستا رکھا ہے

ہم بہشت کو نہ گئے در پہ بڑی خیر ہوئی تم نے اچھا سگ درباں کو لگا رکھا ہے

دے نہ دے جو دربان کام ہماری آواز وقت بے وقت کو ناقوس لگا رکھا ہے

اس طرح سے کبھی ہم نہ شب [illegible] اٹھتے تھے شرارت شمع کو کچھ تم نے سنا رکھا ہے

چوم لیتے ہیں مرا منہ جو بھی چہرہ ریاض
کون ایسا مری باتوں میں مزا رکھا ہے

ایک بار ریاض نے اپنے ایک اور دیوان کا بھی ذکر فرمایا تھا جو انھوں نے مرزا غالب کے دیوان کے جواب میں مرتب کیا تھا۔ ریاض کی زبان سے سنے ہوئے بہت سے اشعار بھی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہیں اور بہت سے شعروں کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔

ایک غزل جو دیوان کے صفحہ ۲۹۲ پر ردیف ک کے ساتھ درج ہے کہ یہ نامکمل غزل خیرآباد کے ایک قوال سے دستیاب ہوئی۔ اس کا مطلع ریاض نے اس ترتیب کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا۔

میکدے میں شور تھا مینا اٹھا ساغر اٹھے اتنی ساقی نے پلائی رند توبہ کر اٹھے

لیکن دیوان میں اس کی ترتیب اس طرح ہے:۔

شور تھا بوتل اٹھے مینا اٹھے ساغر آ گئے
اتنی ساقی نے پلا دی رند توبہ کر اٹھے

تم [illegible] رہے ہو تم زاہد [illegible] دور آخر ہے یہ ساغر کا ابھی پی کر اٹھے

یہ شعر بھی ریاض نے اسی طرح پڑھا تھا مگر دیوان میں پہلے مصرعہ کی ترکیب اس طرح ہے۔

اٹھ تھے [illegible] طوف حرم کو ہم بھی اے زاہد ٹھہر

سپیوا برسے جب [illegible] داماں ہوا تیر اگر زور ہم سے دیوانے جدھر گزرے ادھر پتھر اٹھے

یہ شعر غزل میں موجود نہیں ہے۔ شعر پڑھنے کے بعد ریاض نے فرمایا تھا کہ سپیوان شراب کی ایک قسم ہے

اب تو ریاض سپیواں اڑاتے ہیں رات دن جو بن یہ لوٹتے ہیں عروس بہار کا

پھول کے مول خزاں میں اڑے ساقی تلچھٹ
ان دنوں ہے مئے سرجوش سے اونچی تلچھٹ

ریاض کی بہت سی غزلیں اس وقت کے اخبارات و رسائل میں بھی ملتی ہیں جو دیوان میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ میں نے گورکھپور کی ادبی خدمات میں ایک مضمون میں ریاض کی گل افشانی گفتار اور ان کی صحبتوں کے ذکر کے ساتھ اس وقت کے مشاہیر اہل قلم احسان اللہ عباسی، حکیم برہم، عبداللہ حسرتی، مہدی افادی، اثہری، مولوی سبحان، منظم، قاضی تلمذ حسین اور کئی ایسے شعراء کا بھی ذکر کیا ہے جو ریاض کے ہم عصر تھے اور ان میں سے بعض ریاض سے شاعرانہ چشمک بھی رکھتے تھے۔ ایک صاحب جن کا نام محمد حسین تھا اور تخلص عجیب، ہمیں کہتے تھے اور ہولی میں اپنے کھیٹر۔

کے ساتھ سوانگ اٹھایا کرتے تھے ذات کے معمار تھے ان کے لئے ریاض نے ایک طرحی مشاعرے میں غزل کہی تھی:

آج معماروں کا سردار خفا ہے مجھ سے
ٹوٹی مسجد کی طرح ہو نہ مرمت میری

ریاض کی شاعری کا موضوع اصلی خمریات اور رندانہ شوخی ہے جو ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔ شراب اور متعلقات شراب پر انھوں نے ہزار سے زیادہ اشعار لکھے ہیں اور ہر شعر اپنی ایک جداگانہ نوعیت رکھتا ہے

جس دن سے حرام ہوگئی ہے — مئے خلد مقام ہوگئی ہے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی — جب ٹوٹی ہے جام ہوگئی ہے
قسمت میں ہماری اب پینا ہے نہ کھانا ہے — انگور کا پانی ہے انگور کا دانا ہے
اچھی پی لی، خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی
اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زم زم نکلتا ہے

رات کعبہ میں گئی قلقلِ مینا بن کر — نہ تو چھپتی ہے نہ دبتی ہے خرابات کی بات

حیرت ہوتی ہے کہ شراب کے اتنے پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے والے ریاض نے شراب کی ایک بوند بھی اپنے دامن تک نہیں آنے دی۔ اور یہی ریاض کی پاکیزہ سیرت کی وہ خصوصیت ہے جو ان کو عام انسانوں سے الگ کرتی رہیگی جس لطف اور مزے کے ساتھ ریاض نے شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر کیا ہے اسی لطف اور مزے کے ساتھ انھوں نے واعظ، ناصح، شیخ، زاہد اور پیر مغاں سے بھی چھیڑ چھاڑ کی باتیں کی ہیں۔

رندانہ شوخی اور بذلہ سنجی کی حد یہ ہے کہ ریاض نے اپنے آپ کو اور اپنی ڈاڑھی کو بھی معاف نہیں کیا ہے۔

سنا ہے ریاض اپنی ڈاڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

کہتی ہے اے ریاض درازی یہ ریش کی — ٹٹی کی آڑ سے ہے مزا کچھ شکار کا

پیری میں ریاض اب توجوانی کے مزے ہیں
یہ ریش سفید اور مئے ہوش ربا سرخ

ریاض کی زندگی میں میں نے ایک مضمون "ریاض کی ڈاڑھی" کے عنوان سے لکھا تھا اس وقت تک میں نے ریاض کو دیکھا نہیں تھا جب وہ گورکھپور کے عام دوست رئیس مولوی سبحان اللہ مرحوم کے یہاں سید جالب دہلوی کے ساتھ تشریف لائے تو وصل بلگرامی مرحوم نے جو ان دنوں مولوی صاحب کی ریاست کے منیجر کی حیثیت سے مستقلاً گورکھپور آگئے تھے ریاض سے میرا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ انھوں نے آپ کی ڈاڑھی پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس کو جالب صاحب شائع کریں۔

سید جالب صاحب اس وقت روزنامہ ہمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر تھے اور میں گورکھپور سے اس کا نامہ نگار تھا۔ بلگرا

کے مزاج سے جو لوگ واقف ہیں انھیں اس پر تعجب نہ ہوگا انھوں نے ریاض صاحب سے لے کیا کہ آپ مٹھائی کھلائیں تو آپ کی ڈاڑھی رسوا ہونے سے بچائی جا سکتی ہے۔ ہائے کیسے معصوم لوگ تھے۔ حضرت ریاض نے شرط منظور کر لی اور پانچ روپے وصل مرحوم کی جیب میں آ گئے اور مضمون چھپ نہ سکا۔ اسی دن شہنشاہ خمریات لسان العصر ریاض نے مجھے حکم دیا کہ " مٹھائی لاؤ اور شاگرد ہو جاؤ "

دوسرے دن سپہر کو مٹھائی لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاگردی میں داخل کیا گیا۔ سامنے خلافت اخبار پڑا ہوا تھا جس میں ان کی غزل شائع ہوئی تھی۔ ارشاد ہوا کہ اسی طرح میں قافیئے کے التزام کے ساتھ غزل کہو۔ بہ مشکل غزل کہی اور خدمت میں پیش کی جو کئی مہینے کے بعد خیر آباد سے اس خط کے ساتھ واپس آئی۔

" عزیزمن دعا۔ میں نے آپ کی غزل جیب میں رکھ لی تھی۔
ماہ مبارک میں بھولا رہا۔ اب وہ غزل اتفاق سے مل گئی اصلاح کیا
ہے۔ آپ نے ضد فرمائی اس لئے تعمیل کی گئی۔ میں ہرگز اس قابل نہیں
ہوں کہ کسی کے کلام پر اصلاح دے سکوں اپنے کلام کو خود اصلاح
کے قابل سمجھتا ہوں۔

" من آنم کہ من دانم "

ریاض۔ خیر آباد
مارچ ۱۹۳۰ء

ریاض اصلاح دینے سے بہت گھبراتے تھے فرماتے تھے کہ " اصلاح دینے سے اچھا یہ سمجھتا ہوں کہ غزل لکھ کر دے دوں۔ اور ان کے شاگرد ایسے ہی تھے جن کو وہ غزلیں لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ اصلاح دینے کا کام انھوں نے آقائے سخن حضرت تسنیم مرحوم کو سپرد کر دیا تھا۔ " تحفۂ خوشتر " انھیں کی سرپرستی اور نگرانی میں گورکھپور سے شائع ہوتا تھا۔

ریاض کا طریقِ اصلاح معلوم کرنے کے لئے ان کی اصلاح کی ہوئی ایک غزل لکھتا ہوں غزل میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ریاض کی غزل کا رنگ باقی رہے۔

ریاض	نہ منہ دیکھا اوچشم سوزن کسی کا	رفو کرنے بیٹھے ہیں دامن کسی کا
راقم	اسے اڑ کے لیتا ہے دامن کسی کا	کہے خاک ادب، خاک مدفن کسی کا
ریاض	مزا ہو کہ جھک جھک کے رہ جائے بجلی	گلوں سے چھپا ہو نشیمن کسی کا
راقم	نہیں بے سبب برق کی بے قراری	مگر ڈھونڈتی ہے نشیمن کسی کا
اصلاح	بڑی ہے بہت برق کی بے قراری	ہے مدنظر کیا نشیمن کسی کا
ریاض	یہ شوخی کہ اڑتی ہے ٹھوکرسے انکی	ادب بھی کچھ اور خاک مدفن کسی کا
راقم	دریچوں کو بھی بند رکھتا ہے ظالم	وہ کوچہ ہو اجب سے مدفن کسی کا
اصلاح	قیامت اٹھاتے ہیں وہ آتے جاتے	بنا پیشِ در جب سے مدفن کسی کا

ریاض	زمانے میں ڈسنے کی چیز آک آہیں ہیں	ہمیں لوٹ لیتے ہیں جوبن کسی کا
راقم	برستا ہے کیا جوبن اس سادگی پر	ذرا دیکھئے تو یہ جوبن کسی کا
اصلاح	رہے گا نہ یہ دبے آنچل سے دب کر	بُری طرح اُبھرا ہے جوبن کسی کا
راقم	ہوا بار ور اب وہ نخل جوانی	ذرا بڑھ کے دیکھو تو جوبن کسی کا
اصلاح	....	وہ بوٹے سے قد پر وہ جوبن کسی کا
راقم	خدا کی قسم دیکھنے کی ہیں چیزیں	یہ جوشِ شباب اور یہ جوبن کسی کا
اصلاح	....	یہ جوش جوانی وہ جوبن کسی کا
	اٹھا کرتے ہیں فتنے دن رات جس سے	اسی راستے میں ہے مدفن کسی کا

اس شعر کا پہلا مصرعہ ریاض کا عطیہ ہے میں نے صرف دوسرا مصرعہ کہا تھا۔

راقم	شباب آکے کیا حشر برپا کرے گا	کہ ہے آفت جاں لڑکپن کسی کا
اصلاح	شباب آکے برپا کرے گا قیامت	....
راقم	انھیں چین سے شب کو سونے نہ دیگا	یہ نالہ کسی کا یہ شیون کسی کا

اس شعر کا مصرعہ اول استاد کا عطیہ ہے۔

راقم	اٹھاتا ہے خیر ان تڑپتے دلوں کو	نہ کیوں خاک پر لوٹے دامن کسی کا
اصلاح	اٹھا ئیگا محشر میں شر خیر کیا کیا	جو ہاتھ آگیا اس کے دامن کسی کا

بات ریاض کے قیام گورکھپور سے شروع ہوئی تھی جہاں کی گلیوں میں انھوں نے اپنی جوانی کھولی۔

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

ور بڑھتے بڑھتے کہاں سے کہاں پہونچ گئی اس میں قصور میرے قلم کا نہیں ریاض کی خوش اوصافی کا ہے جن کے بارے میں مولانا نیاز نے لکھا ہے۔

> ریاض کیا چیز تھے اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اس کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اسکے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسف کی خصوصیات سے معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا۔
>
> اِنَّ ھٰذا اِلّا مَلَکٌ کَرِیم
>
> ور اس کے بعد بھی عرفی کا یہ مصرعہ پڑھوں گا۔
>
> تمرطِ اوصاف تو از اوج بیاں انداختہ

مولانا آزاد اپنے خطوط کے آئینہ میں

نیاز فتحپوری

(ایک ریڈیائی تقریر)

انسان کا مطالعہ اور اشیاء کا مطالعہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ہم ایک پھول کی تصویر دیکھ کر صرف اس کی ظاہری ساخت اس کی پتیوں کی ترتیب کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور اگر وہ تصویر رنگین ہے تو اس کے رنگ کا بھی۔ لیکن ایک انسان کی تصویر میں صرف اس کے اعضاء اس کے خدوخال ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتے بلکہ بہ حیثیت مجموعی کچھ اور چیز بھی سامنے ہوتی ہے۔ جو ہماری نگاہوں کو مجبور کرتی ہے کہ کاغذ کی سطح کے اندر نفوذ کر کے صاحب تصویر کی ذہنیت تک پہونچنے کی بھی کوشش کرے۔ بالکل یہی حال انسانی تحریروں کا بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تصویر میں ایک شخص کا صرف مادی وجود ہمارے سامنے ہوتا ہے اور تحریروں میں اس کا ذہن۔ یعنی وہ زیادہ تر دعوت نگاہ ہے اور یہ دعوتِ فکر و نظر۔

پھر جس طرح ہم تصویر کے مختلف POSES سے چہرہ کی ساخت کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم ایک شخص کی مختلف تحریروں سے اس کے مختلف ذہنی میلانات کو پہچان سکتے ہیں۔ لیکن اگر سوال ذاتی مطالعہ کا ہو تو اس صورت میں ہم کو اس کے نجی خطوط ہی سے مدد مل سکتی ہے جن میں وہ سب سے زیادہ بے تکلف و بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر غالب کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم نہ کبھی اس کی شخصیت کو پہچان سکتے اور نہ یہ سمجھ سکتے کہ اس کی شاعری پر اس کے صحیح میلانات کے نقوش کتنے اور کیسے ہیں ــــ اسی طرح اگر مولانا آزاد کے خطوط ہمارے سامنے نہ ہوتے تو شاید ہم کبھی نہ پہچان سکتے کہ محراب و منبر کے آزاد اور خلوت آرمیدگی کے آزاد میں کتنا فرق ہے۔

مولانا آزاد کے جتنے خطوط اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں انہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق محض ادبی مسائل سے ہے، دوسرے وہ جو علمی و مذہبی مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے وہ جن کو مخاطط قسم کی خود کلامی یا Soliloquy کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ غلام رسول مہر کو جو خطوط انہوں نے لکھے ان کا تعلق زیادہ تر غالب و غالبیات سے ہے۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا شبلی سے ان کی مراسلت زیادہ تر تاریخی و علمی یا تصنیفی و تالیفی حیثیت رکھتی ہے جن کو شذرات علم و ادب کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ لیکن وہ خطوط جو غبار خاطر کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، ایک حد تک ضرور ایسے ہیں جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب سے تمثالی کے لباس میں باتیں کر رہے ہیں یا پھر ملا الصباح اس وقت جب

جنبد کلید میکدہ در دستِ برہمن

تاہم چونکہ مولانا کو یقین تھا کہ یہ خطوط مکتوب الیہ تک نہیں پہونچ سکتے اس لئے میرے نزدیک ان کی حیثیت "خود کلامی" کی سی رہ جاتی ہے یا Essays کی سی۔

ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں بعض ان باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے جنہیں شاید ہم کبھی نہ جان سکتے اگر مولانا خود نہ ظاہر کر دیتے ۔ مثلاً خاندانی ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت، فطری میلانات، ذہنی کشمکش، آزادیٔ فکر و احساس، ذاتی مشاغل وغیرہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ غیر معمولی طور پر Precocious پیدا ہوئے تھے اور فہم و عقل کی دنیا میں وہ گھٹنوں چل کر نہیں پہونچے ۔

ان کے بعض خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی و ادبی زندگی کے انوکھے پن کا راز کیا تھا۔ اس کو وہ اپنی زبان میں اہلِ قلم کی انانیت Egotism کہتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایک فطری جوش، ایک طبعی اُبال جسے دبایا نہیں جا سکتا اور یہی وہ ناقابل ضبط ولولہ تھا جس نے ان کی علمی و عملی زندگی میں ہر جگہ ان کو ایک خاص مقام عطا کیا، کیوں کہ ایسے افراد جیسا کہ انہوں نے خود ظاہر کیا ہے، عام ترازو میں نہیں تولے جا سکتے اور ان کے فکر و نظر کی دنیا سب سے علیحدہ ہوتی ہے ۔

مولانا آزاد کا زمین پر رہ کر ستاروں کو چھو لینا اور انسانوں میں رہتے ہوئے، ایک ملکوتی حصار اپنے چاروں طرف قائم کر لینا اسی فکری انانیت کا نتیجہ تھا جس کا ثبوت ان کی تحریروں اور ان کے خطوط سے ہر جگہ مل سکتا ہے ۔

غبارِ خاطر کا ایک خط ہے جس میں انہوں نے اپنے موروثی ماحول، اپنی ابتدائی تعلیم اور اپنے میلانات کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی اسی فطری انانیت کی وجہ سے اپنے موروثی عقاید پر قانع نہ رہ سکے، پرانی راہوں کو چھوڑ کر نئی راہیں انہوں نے پیدا کیں، حقیقت کی جستجو میں نہ معلوم کن کن خارزاروں سے گزرے، تقلید و روایت کی دنیا سے نکلنے کے لئے کس سعی و جہد سے کام لیا یہاں تک کہ وہ تمام ان [illegible] منزلوں سے گزر کر آخر کار تسکین ضمیر اور نفس مطمئنہ کی اس منزل تک پہونچ ہی گئے جس کے لئے ان کی روح اوائلِ عمر ہی سے بیتاب و مضطرب تھی۔

پھر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں جب کہ وہ تلاشِ حقیقت کی پیچیدہ راہوں سے گزر رہے تھے ملک کے سیاسی حالات نے بھی ان کا دامن اپنی طرف کھینچا اور آخر کار کامل غور و فکر کے بعد اپنے ذہن و عمل کے [illegible] دونوں کو ایک نقطہ پر مل جانے دیا اور پھر وہیں عزم راسخ کا ایک آہنی مجسمہ بن کر ٹھہر گئے۔

ان خطوط سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے غیور انسان تھے اور دنیا کے ہر معاملہ کو وہ کس فلسفیانہ نگاہ اور حکیمانہ استغنا سے دیکھتے تھے ۔ بعض خطوط میں انہوں نے اپنی [illegible] گرفتاری اور حالات قید و بند لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فلسفیانہ صبر و ضبط کا کیا عالم تھا۔ ان کو کلکتہ سے [illegible] جو اجازت دی جاتی ہے جس کی ان کو انتہائی آرزو تھی لیکن وہ اسے گوارا نہیں کرتے۔ مولانا کی رفیقۂ حیات بستر علالت پر ان کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہیں اور مولانا کو اس کی اجازت بھی مل سکتی ہے کہ وہ جا کر ان کو دیکھ آئیں لیکن حکومت سے وہ اس کی درخواست کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو جاتا ہے اور مولانا نہایت صبر و شکر کے ساتھ یہ خبر سنتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں کیسی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ لیکن مولانا کی زندگی میں اور بہت سی باتیں ہمیں ایسی ہی نظر آتی ہیں جن کو سمجھے بغیر ہی ماننا پڑتا ہے ۔

مولانا کے خطوط دوسرے اکابر کے خطوط سے بالکل مختلف ہیں۔ ذاتی خطوط کو عموماً اس لئے دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے کہ ہم کو ان سے لکھنے والوں کی بے تکلف زندگی کے حالات بڑی حد تک معلوم ہو جاتے ہیں لیکن مولانا کے جو خطوط اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں وہ زیادہ تر پند نامۂ عطار کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ان کی خلوت پر روشنی نہیں پڑتی۔ یہاں تک کہ حکایات زاغ و بلبل اور چڑے چڑیا کی کہانی قسم کی ہلکی چیزوں میں بھی وہ اپنی [illegible] سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جب اپنے ذوق چائے نوشی کا ذکر کرتے ہیں تو گفتگو اس کے آئین و آداب تک پہونچ جاتی ہے۔ اسی طرح جب سلسلۂ بیان میں کسی خاص

شخص یا مقام کا ذکر آجاتا ہے تو وہ تاریخ کے صفحے الٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ الغرض مولانا کے ان خطوط سے ان کی خلوت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور جنہوں نے مولانا کا مطالعہ زیادہ قریب سے کیا ہے ان کو بھی خلوت ہائے راز بننے کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ مولانا کی فطرت اس صدف کی سی فطرت تھی جو اپنے ہی اندر قطرۂ نیساں کو موتی بنایا کرتی ہے اور کسی کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ ان خطوط سے ان کے جن ذاتی معمولات پر روشنی پڑتی ہے وہ صرف ان کی صبح خیزی ہے یا چار سگریٹ سے غیر معمولی دلچسپی اور اس سے آگے ہمیں ان کی دنیائے خلوت کا حال بالکل معلوم نہیں ہوتا۔

افسوس ہے کہ ان کا کوئی خط ایسا ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ان پر کبھی عہد طفلی و شباب بھی آیا تھا یا نہیں اور اگر آیا تھا تو اسے کس طرح انہوں نے بسر کیا۔

(پھر اگر انھوں نے اس قسم کے خطوط لکھے تھے اور ضائع ہو گئے تو یقیناً بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اگر قصداً شائع نہیں کئے گئے تو پھر یہ بات ظلم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔)

کاش کہ ان کی زندگی کا کوئی ایک ہی واقعہ ہم کو ایسا مل جاتا کہ باوجود پختگی عقل و ہوش و آگاہی دین و تقویٰ کسی وقت بے اختیارانہ ان کی زبان سے یہ بھی نکل گیا تھا کہ

الفراق اے ہوش و تقویٰ، الوداع اے عقل و دیں!

منیر شکوہ آبادی

پر

ایک نظر

ضیا احمد بدایونی

منیر اور کلام منیر سے میری دلچسپی کو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا۔ جب ہوش سنبھالا تو نہ صرف محلے (قاضی ٹولہ) اور شہر بدایوں میں بلکہ اپنے گھر میں شعر و ادب کے چرچے سنتے۔ والد مرحوم تو منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد تھے لیکن میرے تایا صاحب (بڑے چچا) نے اول منیر کا تلمذ اختیار کیا اور منیر کے انتقال کے بعد امیر مینائی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے ان کے تلمذ کا قصہ جو مجھ تک روایتاً پہونچا بہت دلچسپ ہے یہ واقعہ جس کو تقریباً نوے برس گزر رہے ہوں گے میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔ اس وقت بدایوں میں جج نہ تھی اور لوگوں کو مقدمات کے سلسلے میں شاہجہاں پور جانا پڑتا تھا۔ تایا صاحب بھی (جن کا تخلص محو تھا) کسی ضرورت سے شاہجہاں پور گئے اور اپنے ایک عزیز کے یہاں جو وہاں کے سربرآوردہ وکیل تھے قیام کیا معلوم ہوا کہ آج شام کو کسی شعر دوست رئیس کے یہاں شاندار بزم مشاعرہ ہے جس میں داغ، امیر، منیر، جلال، تسلیم بھی شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ سنا تھا کہ طبیعت بے چین ہو گئی آخر ذوق شعر نے اکسایا اور کشش دل نے وقت پر جلسہ گاہ میں پہونچا دیا بڑا اجتماع تھا۔ شعراء باری باری سے غزل سناتے اور مناسب داد پاتے تھے۔ بات ہے، رات ہے قافیہ و ردیف تھا۔ رات زیادہ آ چکی تھی۔ کئی اساتذہ غزل پڑھ کر داد سخن پا چکے تھے کہ تین بجے کے قریب منیر کے سامنے شمع آئی اور انہوں نے مطلع پڑھا

ان دو روزوں لطفِ حسن ہے آؤ تو بات ہے
دو دن کی چاندنی ہے پھر اندھیاری رات ہے

تو تمام مشاعرہ تعریفوں سے گونج گیا۔ ہر ہر شعر پر دل کھول کر داد دی گئی اور صبح ہوتے مشاعرہ ختم ہوا دوسرے روز حضرت محو نے جناب منیر کی خدمت میں حاضر ہو کر تلمذ کی استدعا کی جس کو منظور کیا گیا۔

غرض اس قسم کے چرچے لڑکپن ہی سے کان میں پڑتے رہے۔ اور جن شعراء سے رفتہ رفتہ وابستگی ہو گئی ان میں ایک منیر بھی تھے۔ شعر کے حسن و قبح کا تو اس وقت کیا شعور ہوتا البتہ طبیعت کو لگاؤ ضرور پیدا ہو گیا۔ مطالعہ اور تجربہ بڑھا تو کچھ نہ کچھ تنقیدی شعور بھی آیا اور منیر میں محاسن کے علاوہ کچھ نقائص بھی نظر آئے۔ آج کی صحبت میں اسی مسئلے پر مختصراً

ل؎ مولوی رفیع احمد عالی وکیل بدایوں صاحب دیوان و دیگر تصانیف

۲؎ مولوی شفیع احمد محو وکیل۔ دو یا تین دیوان مرتب کئے جو تلف ہو گئے۔

اظہار خیال کرتا ہے۔ مگر اس سے پہلے بہتر ہو گا کہ ان کے اجمالی سوانح پیش کر دیے جائیں۔

سید اسمٰعیل حسین نام۔ منیر تخلص۔ شکوہ آباد ضلع مین پوری وطن۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سید احمد حسین سے درسی اور چچا سید فدا حسین سے علومِ دین کی تکمیل کی۔ اسی زمانے میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا اور کچھ دنوں کے بعد لکھنؤ پہونچ کر شیخ ناسخ کے شاگرد ہو گئے۔ ناسخ کے بعد رشک شاگردِ ناسخ سے اصلاح لیتے رہے۔ مرثیہ میں مرزا دبیر سے تلمذ تھا۔ ان کو اپنے اساتذہ پر فخر تھا جیسا کہ اکثر اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ درباری شاعر کی حیثیت سے ان کا مختلف رئیسوں سے تعلق رہا۔ مثلاً رؤسائے لکھنؤ، فرخ آباد، باندہ و رامپور۔ وہ نواب یوسف علی خاں ناظم کی دعوت پر رامپور گئے۔ مگر پہونچنے سے پہلے نواب صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کے علم دوست اور فیاض جانشین نواب کلب علی خاں نے ان کو از راہِ قدردانی شعرائے دربار میں شامل کر کے سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائی۔ بالآخر ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں منیر نے سفرِ آخرت کیا۔ "انتقال منیر عالی قدر" (۱۲۹۸ھ) سے تاریخِ وفات برآمد ہوتی ہے۔

ان کی زندگی کا ایک واقعہ کالے پانی میں قید ہونا ہے۔ ان پر ایک طوائف نواب جان کے قتل کے جھوٹے الزام میں مقدمہ قائم ہوا جس میں ۱۲۷۵ھ میں سزائے حبسِ دوام بعبور دریائے شور ہوئی۔ خدا خدا کر کے پانچ برس کے بعد رہائی کی صورت ہوئی۔ انھوں نے کئی قصیدوں اور قطعوں میں راہ کے مصائب اور جزیرہ انڈمان کے شدائد بڑے پر درد اور مؤثر انداز میں بیان کیے ہیں۔

منیر کی تصانیف میں چند مذہبی رسائل کے علاوہ تین دیوان ہیں جن کے تاریخی نام منتخب العالم (۱۲۶۴ھ) تنویرالاشعار (۱۲۷۰ھ) اور نظم منیر (۱۲۹۰ھ) ہیں۔ دو مثنویاں بھی ان سے یادگار ہیں۔ حجابِ زناں اور معراج المضامین۔ ان کا کلام تمام اصنافِ شعر پر حاوی ہے۔ اشعار کی تعداد تیس ہزار تک پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں متعدد غزلیں، خطوط اور تقریظیں بھی لکھی ہیں جن سے ان کا استادانہ کمال ظاہر ہے۔

ان کی شاعری پر اظہار رائے کرتے وقت ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی کلیات ایک پُر بہار باغ ہے جس میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں اور پھولوں کی خاطر ہمیں کانٹوں سے بھی تعرض کرنا ہوگا۔ "بہر یک گل زحمت صد خار می باید کشید" پھولوں سے ہماری مراد وہ کلام ہے جس میں خیال کی لطافت انداز کی بداعت سے ہم دوش ہے اور کانٹوں سے مقصود ایسی شاعری ہے جو صنعت گری اور لفاظی کی حامل ہے۔ ڈاکٹر ابو اللیث نے بالکل درست کہا ہے کہ "ناسخ کے سلسلے میں یہ پہلے شخص ہیں جن کے کلام میں اپنے استاد کے علاوہ اپنا ایک خاص رنگ بھی موجود ہے"۔ یہ خاص رنگ کیا ہے ہم آئندہ عرض کریں گے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ وہ ناسخ کی طرح خیالی مضامین، خارجی لوازم، ابتذال اور صنائع کے کتنے دلدادہ ہیں۔ طویل غزلیں جن میں قافیہ پیمائی کا اہتمام اور مشکل قوافی و ردیف کا التزام ہے، ان کے یہاں کثرت سے ہیں۔ لیکن جب منیر تصنع سے قطع نظر کر کے اپنے خاص رنگ میں کہتے ہیں تو شعر لطف دے جاتا ہے۔ اس رنگ کی خصوصیات ہیں ندرتِ اسلوب، تشبیہ و استعارہ، نازک خیالی جو کبھی کبھی حقیقت کی حدود کو چھو لیتی ہے۔ مثلاً

پیری ہے صبح شمعِ جوانی کے واسطے　　مہمان شمعِ حسن بتاں رات بھر کی ہے

۱؎ تاریخ ادب اردو۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری وغیرہ۔

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں — یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

طفلی کی جوانی میں بھی راحت نہیں ملتی — جو کھیل میں کھوئی ہے وہ دولت نہیں ملتی
کیا ہاتھ مرے پہونچیں گے داماں تباں تک — اپنے ہی گریباں سے فرصت نہیں ملتی
اللہ رے زورِ قلمِ صانع قدرت — تصویر سے تصویر کی صورت نہیں ملتی

واقعہ یہ ہے کہ یہ نازک تشبیہات و استعارات کی فراوانی، یہ لطفِ کلام اور یہ زورِ بیان دوسروں کے یہاں مشکل سے ملے گا۔
ی وار دو غزل پر عدم تسلسل کا الزام لگایا جاتا ہے مگر منیرؔ کی متعدد غزلیں اول سے آخر تک مسلسل ہیں۔ مثلاً

جس بزم جاں فزا میں ابھی کل کی بات ہے — خالی سرور سے دلِ پیر و جواں نہ تھا (۲۳ شعر)
دل تو شہِ مردہ ہے داغ غم محبت ہوں گیا — آنکھیں روتی ہیں ہاں زخم خنداں ہوں تو کیا (۴۹ شعر)

جن میں نہایت واضح اور موثر انداز میں انقلابِ روزگار کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اسی طرح

کیوں اشارے کرتے ہیں ابرو کماں برسات میں — تیروں کی بوچھار ہوتی ہے کہاں برسات میں (۶۸ شعر)

اور

اے فلک مانگی تھیں کس نے تجھ سے بھاری بیڑیاں — گیسوے جاناں کی پہنا پیاری پیاری بیڑیاں (۲۱ شعر)

طویل غزلیں ہیں۔ ایک میں برسات کے مناظر اور دوسری میں قید کے شدائد بیان کئے ہیں۔
مضمون آفرینی اور قافیہ پیمائی منیرؔ کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے چنانچہ ایک طویل غزل میں گریباں کا قافیہ عطف و اضافت کے ساتھ صرف ۳، جگہ باندھا ہے۔ اس پُرگوئی سے یقیناً کوفت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ کوئی لطیف استعارہ لاتے یا تجسیم (Personification) سے کام لیتے ہیں تو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔
منیرؔ نے بزرگانِ دین اور روساے وقت کی مدح میں کافی قصیدے لکھے ہیں اور قصیدے کے جو لوازم مانے گئے ہیں وہ ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ تشبیب میں تخیل کا جوش اور علمیت کا زور۔ گریز میں بداعت و ندرت۔ مدح میں مبالغہ اور بلند پروازی جو اس عہد تک سرمایۂ کمال سمجھی جاتی تھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ان سے پہلے سوداؔ اور ذوقؔ مدحیہ قصیدے کے استاد تسلیم کئے جاتے تھے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ذوقؔ کے قصائد میں وہ زورِ تخیل اور شکوہ بیان نہیں۔ سوداؔ کے یہاں تخیل کی فراوانی ضرور ہے مگر ناہمواری اور بندش کی سستی گراں گزرتی ہے اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ دونوں کے زمانوں میں سو برس کا فصل ہے۔
سوداؔ کی زمین میں منیرؔ کا ایک معرکہ آرا قصیدہ ہے جو مصائبِ قید کے بیان میں ہے۔ یہ خیالات کی تلاش، اسلوب کی متانت اور بیان کی صفائی میں بہت بلند پایہ ہے۔ افسوس کہ طوالت کے خیال سے اشعار نقل کرنا ممکن نہیں، صرف حوالے پر اکتفا کیا جاتا ہے مطلع یہ ہے:

رُخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض نہانی — صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

ایک اور قصیدہ جس کا آغاز ہے

نورِ خورشید جو ہو صاعقۂ طورِ جبل — موسیٰ روز کرے مصر دل شب میں عمل

یہ اساتذۂ فارسی و اردو و نیز سوداؔ کی زمین میں ہے اور خوب ہے۔ آخر میں کہتے ہیں

اس زمانے میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے — کہ مصیبت میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل

روز ہوتا ہوں نئے قفس کے گھر میں ذبح   آؤ پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل

یہ قصیدہ ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔

سب سے عجیب وہ قصیدہ ہے جو جزیرہ انڈمان میں مولانا فضل حق خیرآبادی اسیر قید فرنگ کے ایما پر نظم کیا گیا تھا۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ استعارات وکنایات عجم شعرائے ہند کے بس کی چیز نہیں جس پر منیر نے یہ قصیدہ قلم بند کیا۔ مگر اس کے ختم ہونے سے پہلے مولانا نے مرحوم کی زندگی ہی انڈمان میں ختم ہو گئی۔

ایک الزام جو اردو شاعری پر اکثر لگایا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں مقامی رنگ نہیں ملتا۔ شاعر رہتا تو ہے دوآبہ میں، مگر جب روتا ہے تو اس کی آنکھوں سے جیحوں و سیحوں بہتے ہیں۔ منیر کے ایک قصیدہ کے چند شعر دیکھئے جن کو پڑھ کر معترض کو یہ الزام واپس لینا پڑے گا۔ یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں والی رام پور کی تعریف میں ہے اور اس میں رام پور کے دربار کے مختلف اہل کمال کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔ تمہید کے اشعار یہ ہیں۔

رُت ہے برسات کی بہت پیاری   موج زن جھیلیں، ندیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر   زرد اودی سنہری زنگاری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے   سبز مخمل سے بھی سوا پیاری
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں پُروائی   لہریں لیتی ہیں ندیاں ساری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں   روح پرور ہوئی ہے خوش گواری
کھیت دھانوں کے لہلہا شاداب   کر رہے ہیں نظر کی دلداری
سوندھی سوندھی زمیں کی مٹی   بھینی بھینی چمن کی بو پیاری
ہنستی پھرتی ہیں باغ میں پریاں   نہریا جیسے شیر ہے جاری
مہندیوں سے ہتھیلیاں گلنار   ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں پیاری
پہنے ہیں رنگ رنگ کے جوڑے   دست نازک میں پانچے بھاری
کھمبے چاندی کے، ریشمی جھولے   ساز عشرت کی گرم بازاری
طبلے سارنگیاں ہیں ہم آواز   گونجتا ہے سپہر زنگاری
گا چکی ہیں منیر کی غزلیں   اب ہے ساون ملار کی باری
پکتی جاتی ہیں پوریاں پکوان   تحفہ تحفہ مٹھائیاں ساری

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر زور تخیل کے ساتھ محاکات پر، مضمون آفرینی کے ساتھ فطرت نگاری پر اور مشکل گوئی کے ساتھ سادہ نویسی پر بھی یکساں قدرت رکھتا ہے۔

منیر نے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) دو مثنویاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ حجاب زناں اور معراج المضامین۔ حجاب زناں اصلاحی مثنوی ہے جو لڑکیوں کی تربیت کے مسئلے سے متعلق ہے۔ اول تو اس میں کوئی ادبی حسن نہیں ہے دوسرے اس کتاب میں کافی کہا جا چکا ہے اس لئے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔ خود منیر نے بھی اس کو دل لگا کر نہیں لکھا تھا۔

پھر گر بہشتوں کی تھی یہ فرمائش   ہوئی صفحے کی اس سے آرائش

حال جو کچھ سنا کیا موزوں	نہیں اس میں لطافت مضموں
اپنے لہجے میں یہ کلام نہیں	جب تو اس میں وہ التزام نہیں
سیدھی سیدھی زباں ہے اس میں؛	سادہ سادہ بیان ہے اس میں

البتہ ان کی مثنوی معراج المضامین ایک بے نظیر اور ساکھری گام نظم ہے جس کا مختصر تعارف یہاں ضروری ہے۔ منیر کو اس مثنوی پر بجا ناز تھا۔ اکثر امراء کو خطوط میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

بہت خونِ جگر کھایا ہے میں نے	تب اس کو نظم کرپایا ہے میں نے
کمالِ رزم و بزم ایسا ہے موزوں	کہ جس میں نظم ہیں بے مثل مضموں

اس کا موضوع مذہبی ہے اور حضرت رسولِ خدا اور آپ کی آلِ اطہار کے معجزات پر مشتمل تخیل کی ندرت، تشبیہات و استعارات کی جدت فارسی تراکیب کا لطف اور بیان کا شکوہ دیکھ کر منیر کی استادی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ چند اشعار سے مثنوی کا پورا پورا اندازہ ہونا دشوار ہے تاہم یہاں اس کے بغیر چارہ نہیں۔ یوں تو پوری نظم رفعت مضامین اور ندرت بیان کی شاہکار اور طرزِ میر کی آئینہ دار ہے۔ لیکن بعض حصے تو لاجواب ہیں۔ مثلاً حمد، نعت، معراج، مناجات، رزم، بزم، بہار، خزاں، کوہ، دریا۔ مناجات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

خداوندا ترا عبد اقل ہوں	اسیرِ حلقۂ طولِ امل ہوں
سبق خوانِ کتابِ بے زبانی	زمیں گیرِ بساطِ ناتوانی
غبارِ خاطرِ تازی و فرسی	متاعِ کاروانِ کس مپرسی
سخن سنجِ زبانِ ناسپاسی	فسادِ عالمِ ناحق شناسی
سرِ سرکش نہیں سجدے سے واقف	گر ابھی ہوں تو قبلے سے مخالف
وظیفہ ہے مرا شعر و معمّا	نماز و روزہ اسم بے مسمّا
صبوحی صبحدم اپنا وظیفہ	بیاضِ گردنِ مینا صحیفہ
مری مسجد ہے ہر محراب ابرو	تلاوت میں ہمیشہ مصحفِ رو
نمازِ صبحِ رُخ کس دن قضا کی	تراویحِ شبِ گیسو ادا کی
گلابی ہے مرے تقویٰ کا جامہ	ردائے دخترِ رز ہے عمامہ
رہِ عصیاں میں آوارہ ہوں یارب	غلامِ نفسِ امارہ ہوں یارب
خرابی کی جو بستی ہے تو مجھ سے	عروجِ بختِ پستی ہے تو مجھ سے
میں ہوں مفلس کہ وہ بے خواب کی شب	سحر پروانے کی، سرخاب کی شب
مکانِ بندگی کے در پہ اڑا ہوں	دکانِ فقر میں گردی پڑا ہوں
نشانہ تیرِ آفت کا جگر ہے	ٹھکانا مرگِ نو کا میرے گھر ہے
نحوست سے جو سن پایا ہم آغوش	سعادت ہوگئی شرما کے روپوش
بنایا شوربختی کا نمک خوار	رہے آباد بے کاری کی سرکار

اداسی کی جگہ دیا رو رو میں — خزانہ مفلسی کا میرے گھر میں
نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی — پسند آتی ہے صحبت بے کسی کی
ٹھکانا بے دیاری کا ہے مجھ سے — بھرم بے اعتباری کا ہے مجھ سے
پڑا ہے طالع ناکام سے کام — وثیقہ بے زری کا ہے مرے نام
نہیں ہے آبرو کچھ میری بھلا — مگر اتنی کہ اشکِ چشمِ عنقا
نہ عزت ہی نے مو ریلنگ سمجھا — مجھے تو عار نے بھی ننگ سمجھا

ممکن ہے کہ آپ اس طوالت سے اکتا گئے ہوں۔ اس لئے منہ کا مزا بدلنے کے لئے دریا کے گھاٹ کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ مقامی رنگ، مشاہدۂ فطرت، بیان کی صفائی اور روانی کی ایسی مثالیں اردو میں کمیاب ہیں۔ منیر کے معاصرین میں تسلیم تو ایک بڑی حد تک ان کے قریب پہونچتے ہیں اور بس

کنارِ آب انبوہِ حسیناں — ہر اک جانب ہجوم مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چمک سے روشن — بتاسے دوب تلسی دھوپ چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول — گلوری کالے تل سیندور گگل
چڑھاتی ہیں نہانے میں لبِ آب — جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
فلک پر ڈوبتے دیکھے ستارے — لبِ دریا چمکتے چاند تارے
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے — کہیں جمنا کہیں گنگا جلی ہے
نہانے دھونے میں بھی چلبلا پن — ٹپکتا تھا میانِ آب جوبن
بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل — گلابی مد بھری آنکھوں میں کاجل
گندھی زلفیں بندھے جوڑے کھلے بال — کہیں سمٹا کہیں پھیلا ہوا جال
نشیلی انکھڑیاں نیچی نگاہیں — پھنسا لینے کی بہکانے کی راہیں
بھنویں چتون بھری آنکھیں بھرے بال — یہ ریشم کے لچھے سنبلیں بال
نگہ سے سحر سا دل میں ڈالیں — بتا دیں جنس کو چلنا یہ چالیں
ادا سے بولی ٹھولی کا پھڑکنا — بگڑنا خود بخود رکنا جھجکنا
ہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا — پھر آپ ہی شرم سے گردن جھکانا
دمِ صبح اس غضب کا رنگ و روغن — نہ دیکھا باسی پھولوں پر یہ جوبن
طراوت تھی پسینے سے بدن کی — چلی آتی تھی خوشبو بھیگے پن کی
اداسی جاگنے کی چتونیں مست — کبھی سینہ کبھی چہرہ تہِ دست
زبانیں خشک نیندیں جا رہی تھیں — لبوں کی سرخیاں پپڑا رہی تھیں
جماہی لینے میں منہ کا یہ معمول — کبھی کچی کلی تھی گہ کھلا پھول
کوئی انگڑائی لے کر ٹالتی تھی — کوئی سستی کسی پہ ڈالتی تھی

دوسرا منظر

مہنت اک سمت کو دھونی رمائے　　　　کہیں جوگی جٹا سر پر بڑھائے
ملے منہ پر بھبھوت آنکھیں کئے لال　　　　بچھائے ہیں ہرن کی اشیر کی کھال
کوئی بیٹھا ہوا آتش کے اندر　　　　کسی کا دستِ خشکیدہ ہوا پر
کوئی تو بنا اٹھائے کوئی مالا　　　　بچھائے کوئی اپنا مرگ چھالا

ان کے علاوہ کلیات میں باقی اصناف شعر بھی موجود ہیں۔ قطعات کچھ حسب حال ہیں جیسے

فرخ آباد اور یارانِ شفیق ؎　　　　چھٹ گئے سب گردشِ تقدیر سے
آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم　　　　سو طرح کی ذلت و تحقیر سے

۴۴ اشعار میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس زمانے کی قید اور قید خانے کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ دیگر قطعات اپنے معاصرین کی تاریخ ہائے وفات وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

رباعیات میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ عموماً روایات یا خاص الفاظ سے فائدہ لیا ہے۔ مثلاً

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا　　　　زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر　　　　کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

ایضاً

کیا قحط میں آگئی تباہی امسال　　　　پیاسے مرتے ہیں مرغ و ماہی امسال
شبنم سے بھی ہے باغ جوانی محروم　　　　کیونکر بھیگیں مسیں الٰہی امسال

یہ تھا مختصر تعارف منیر شکوہ آبادی کا جنہوں نے غزل میں رنگ ناسخ کی کوتاہیوں کے باوجود اپنی طباعی سے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی اور قصیدہ و مثنوی میں تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے اس لئے انھوں نے اپنے اسلوب کی نسبت یہ کہا تھا کہ

عاشق ہوں منیر اپنے ہی اندازِ سخن کا　　　　وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانہ کسی کا

تو اس کو تعلّی نہیں بلکہ خود شناسی پر محمول کرنا چاہیئے۔

صرف ۴۴ انسانوں کا گاؤں

تیجبو جاوا کا مقدس ترین گاؤں مانا جاتا ہے جس کی آبادی ۴۴ نفوس سے کبھی زیادہ بڑھنے نہیں دی جاتی۔ کسی باہر کے آدمی کو اس گاؤں میں قدم نہیں رکھنے دیا جاتا نہ ہی حکام اس گاؤں میں آسکتے ہیں۔ ۸۰۰ سال سے اس عقیدہ کی تقلید کی جارہی ہے۔ گاؤں کے مکھیا کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر گاؤں کی آبادی کسی طرح ۴۴ نفوس سے زیادہ بڑھے تو وہ نومولود کو موت کے گھاٹ اتار دے یا اس کے والدین کو۔۔۔

تصانیف مولانا نیاز فتح پوری
انتقادیات
مولانا نیاز فتح پوری کے معرکۃ الآرا ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اردو زبان اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر درجے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے۔ قیمت:۔ چار روپے ۵۰ پیسے۔
مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ
مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں مذاہب عالم کی ابتدا، مذہب کا فلسفہ و ارتقا، مذہب کی حقیقت، مذہب کا مستقبل، مذہب سے بغاوت کے اسباب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مذہب کو علم و تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ قیمت:۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے
مشکلات غالب
غالب کے تمام مشکل اشعار اردو کا نہایت صاف و صحیح حل جو وضاحت بیان کے لحاظ سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت:۔ دو روپے
عرض نغمہ
ٹیگور کی گیتانجلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جو نایاب ہو گیا تھا۔ وہ اب دوبارہ طبع ہوا ہے۔ مع ایک بسیط مقدمہ کے۔ قیمت:۔ ایک روپیہ
ترغیبات جنسی
مولانا نیاز فتحپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات، ان کی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی۔ قیمت پانچ روپے ۵۰ پیسے
تاریخ کے گمشدہ اوراق
حضرت نیاز کے ان بیس افسانوں کا مجموعہ جو تاریخ اور انشائے لطیف کے امتزاج کا بلند ترین معیار قائم کرتے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دل کش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت:۔ دو روپے
جذبات بھاشا
مولانا نیاز فتحپوری نے ایک دلچسپ اور عالمانہ تمہید کے ساتھ ہندی شاعری کے بہترین نمونے پیش کر کے انکی تشریح ایسے تخلیقی انداز میں کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے جس میں ہندی کلام کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ ۲۵
ایک شاعر کا انجام
حضرت نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا طویل افسانہ جس سے افسانہ نویسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اس کا ایک ایک لفظ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قیمت ایک روپیہ
نقاب اٹھ جانے کے بعد
حضرت نیاز کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بعض ارباب طریقت اور علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ زبان، پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
شبنستان کا قطرہ گوہریں
مولانا نیاز فتحپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی کے بہترین شاہکار پیش کئے گئے ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت:۔ ایک روپیہ پچیس پیسے
مینیجر نگار پاکستان۔ ۳۷ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

درگاوتی

عہدِ اکبری کی ایک رانی

فراز نیازی

درگاوتی مہوبا کے گونڈ راجہ کی بیٹی تھی اور اپنے غیر معمولی حسن و جمال کے لحاظ سے بڑی شہرت رکھتی تھی۔ سنگل گڑھ کا
ہ دلپت سنگھ اس کا نادیدہ عاشق تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوہستانی ریاست تھی جو گڑوا اور سنگر کے درمیان واقع تھی
یکن اس کا پیام اس لئے رد کر دیا گیا کہ وہ چندیلا راجپوت تھا اور درگاوتی زیادہ اونچے راجپوت خاندان کی لڑکی تھی،
اد، اس کے وہ کسی دوسرے راجہ سے منسوب بھی ہو چکی تھی۔ دلپت سنگھ بہت خوبصورت انسان تھا اور درگاوتی
سکی طرف مائل تھی لیکن خاندانی فرق و امتیاز اور نسبت سابقہ کی دیوار ایسی حائل تھی کہ اس کا توڑنا آسان نہ تھا۔
آخر کار درگاوتی نے دلپت سنگھ کو کہلا بھیجا کہ "یا تو تم شادی کا خیال ترک کر دو یا پھر فوج کشی کر کے مجھے
حاصل کر دو"

یہ پیام پہونچتے ہی دلپت سنگھ نے راجپوتوں کی ایک اچھی فوج آراستہ کر کے مہوبا پر حملہ کر دیا اور درگاوتی
کے باپ اور منگیتر دونوں کو شکست دیکر اپنی محبوبہ کو سنگل گڑھ لے آیا۔

چار سال بعد دلپت سنگھ مر گیا۔ اور چونکہ اس کا بیٹا بیر نرائن صرف تین سال کا تھا۔ اس لئے ریجنٹ کی حیثیت
سے درگاوتی نے ریاست کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کامل چودہ پندرہ سال تک بڑے سکون سے حکومت
کرتی رہی۔

جب آصف خاں کڑہ مانک پور کا گورنر ہو کر آیا اور اس نے سنگل گڑھ کی دولت کے حالات سنے تو اس نے
فوج کشی کر دی (۱۵۶۴ء)

رانی درگاوتی نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا گئی۔ اس کی آنکھ ایک تیر کا نشانہ بن چکی تھی اور اس کا
کلوتا بیٹا جس کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی۔ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا اور اسے فوج کے عقب میں کر دیا گیا تھا
تنا میں ایک دوسرا تیر رانی کی گردن میں آ کر پیوستہ ہو گیا۔ اپنے سپاہیوں کو فرار ہوتے اور دشمن کو اپنے قریب تر
ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنے فیلبان کا خنجر چھین کر اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔ اس کا بیٹا رزمگاہ سے باہر لیجایا گیا اور
دشمن کی نظریں بچاتے ہوئے چوراگڑھ کے محل میں بھیجدیا گیا۔ آصف خاں نے اپنی کامرانی کے فوراً ہی بعد وہاں پہنچ کر
قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ نوجوان شہزادہ قتل ہو گیا اور عورتوں نے محل میں آگ لگا دی۔ اس خیال کے پیش نظر کہ مبادا

دشمنوں کے ہاتھ میں آکر انھیں رسوائی و ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

دو عورتوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی جان بچالی تھی ایک تو رانی کی بہن اور دوسری ایک نوخیز شہزادی جو نومر شہزادہ بیر نرائن سے منسوب ہو چکی تھی ان دونوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کے حضور میں بھیج دی گئیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ درگاوتی نے ایک عمارت مدن محل کے نام سے تعمیر کرائی تھی جس کے آثار اب بھی جبل پور میں موجود ہیں۔

جب یہ سارا علاقہ حکومت برطانیہ کی تحویل میں آگیا تو کسی پنڈت نے محل کے صدر دروازہ پر مندرجہ ذیل سطور لکھ دیں:۔

"مدن محل کی چھائیں میں
دو ٹانگوں کے بیچ
گڑا نو لکھ روپے
اور سونے کی دو اینٹ"

دروازے پر اس تحریر کے نمایاں ہوتے ہی تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور [illegible] نے جو اس وقت جبل پور میں پولیٹکل اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور تھا کھدائی کا کام شروع کرا دیا۔ اس امید پر کہ یہاں کوئی خزانہ دفن کیا گیا ہے۔

یہ قطعۂ زمین جس پر عمارت قائم ہے گاؤں کی ایک عورت کی ملکیت تھی وہ گھبرائی ہوئی گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس آئی اور شکایت کی کہ اس کا خزانہ کیپٹن ہوٹلے کے ہاتھوں لٹ گیا۔ سر ولیم سلیمان [illegible] نے ہنس کر جواب دیا کہ

" پگلی، وہ بھی ایسا ہی پاگل ہے جیسی کہ تو، اگر واقعی کوئی ایسی بات ہوتی تو پنڈت اس راز کا انکشاف کبھی نہ کرتا "

مدت گزر گئی بہت سے دوسرے لوگ بھی پنڈت کے جال میں پھنسے، اور عمارت کے قرب و جوار میں متعدد بار کھدائی ہوئی لیکن ملا کچھ بھی نہیں۔

فارسی مثنوی نگاری اور داستان وامق عذرا

نیاز فتحپوری

کل ایک صاحب تشریف لائے اور تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھار مجھ پر شروع کر دی۔
(۱) یہ دو مصرعے کس کے ہیں۔ (۲) نان خطائی کی اصلیت کیا ہے۔ (۳) ملا دو پیازے کے جھگڑے بیربل کے ساتھ کس حد تک صحیح ہیں۔ (۴) فارسی میں مثنوی کا آغاز کب سے ہوا اور "وامق و عذرا" کی داستان کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تو میں نے بتا دیا کہ ایک مصرع قتیل کا ہے اور دوسرا وحشی کا۔ دوسرے سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ جب آپ نان خطائی میرے سامنے لائیں گے اس وقت غور کروں گا۔ تیسرے سوال کے جواب میں، میں نے انھیں بتایا کہ ملا دو پیازہ کے زمانہ کو بیربل یا اکبر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظام الملک آصف جاہ کا مصاحب تھا اور سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ عبدالمومن نام تھا اور وطن دہلی باپ کا نام عبدالولی تھا۔ ایک بار جب نظام الملک بھوپال سے قریب دریائے نربدا کو عبور کر رہا تھا تو ایک گاؤں ہنڈیاں میں قیام کا اتفاق ہوا۔ ملا دو پیازہ کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور اپنے آقا سے کہا ملا دو پیازہ کو تو اب ہنڈیاں ہی میں رہنے دیجئے۔ نظام الملک نے اس کی بات مان لی اور اسے وہیں چھوڑ کر چل دیا لیکن یہ گاؤں اس کی جاگیر میں دے دیا۔ ملا اور اس کی بیوی دونوں نے یہیں انتقال کیا اور ان کا حجرہ جس میں یہ مدفون ہیں مدفون ہیں اب تک موجود عہد اکبری کے ملا دو پیازہ کا نام عبدالقادر تھا اور اس کا ہنڈیاں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

چوتھے سوال کا جواب تفصیل طلب تھا اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ اس کے لئے ۲۹ اکتوبر کے "جنگ" کا انتظار کیجئے۔

وامق و عذرا

لیلیٰ مجنوں۔ خسرو شیریں۔ یوسف زلیخا۔ فارسی کی بہت مشہور مثنویاں ہیں اور متعدد شعراء نے ان فسانہائے عشق کو منظوم کیا ہے انھیں مثنویوں کے ساتھ وامق و عذرا کا نام بھی کبھی سننے میں آجاتا ہے۔ گو اس نام کی مثنوی میری نگاہ سے کبھی نہیں گزری۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ مثنوی لکھی ہی نہیں گئی۔ اور بات ہے کہ اب وہ نایاب ہو جائے۔

آپ نے عنصری کا نام تو سنا ہو گا جو فردوسی کا ہمعصر اور محمود غزنوی کا درباری شاعر تھا۔ غالباً سب سے پہلے اس نے مثنوی "وامق و عذرا" تصنیف کی اور اس کے بعد بہشتی اور لامعی نے جو نزکی شاعر تھا۔ اس مثنوی کا جو پلاٹ لامعی کی مثنوی میں پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ کا تعلق یکسر زمین ایران سے ہے۔

وامق کسی آتشکدہ کا مُغ تھا اور عذرا ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے آتشکدہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ محبت مذہباً ممنوع تھی۔ اس لئے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ عذرا شمال کے پہاڑستان میں بھیجدی گئی اور وامق کو افریقہ کے کسی نہایت گرم حصہ کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ آخر یہ دونوں گھل گھل کر مر گئے اور مرنے کے بعد عذرا نے ستارہ سنبلہ کی صورت اختیار کر لی اور وامق کی روح نے سماک رامح لی۔

لیکن ڈاکٹر ہیورٹ (HUART) نے بحوالہ عوفی، دولت شاہ وبراؤن اس کا پلاٹ بالکل مختلف ظاہر کیا ہے۔

دشمنوں کے ہاتھ میں آکر انھیں رسوائی و ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

دو عورتوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی جان بچالی تھی ایک تو رانی کی بہن اور دوسری ایک نوخیز شہزادی جو نو عمر شہزادہ بیر نرائن سے منسوب ہو چکی تھی ان دونوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر کے حضور میں بھیج دی گئیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے وہ یہ کہ درگاوتی نے ایک عمارت مدن محل کے نام سے تعمیر کرائی تھی جس کے آثار اب بھی جبل پور میں موجود ہیں۔

جب یہ سارا علاقہ حکومت برطانیہ کی تحویل میں آگیا تو کسی پنڈت نے محل کے صدر دروازہ پر مندرجہ ذیل سطور لکھ دیں:۔

"مدن محل کی چھائیں میں
دو ٹانگوں کے بیچ
گڑا نو لکھ روپیا
اور سونے کی دو اینٹ"

دروازے پر اس تحریر کے نمایاں ہوتے ہی تھوڑے ہی عرصے میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور (Captaine Wheatley) نے جو اس وقت جبلپور میں پولیٹکل اسسٹنٹ کے عہدے پر مامور تھا کھدائی کا کام شروع کرا دیا۔ اس امید پر کہ یہاں کوئی خزانہ دفن کیا گیا ہے۔

یہ قطعۂ زمین جس پر عمارت قائم ہے گاؤں کی ایک عورت کی ملکیت تھی وہ گھبرائی ہوئی گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس آئی اور شکایت کی کہ اس کا خزانہ کیپٹن ہوٹلے کے ہاتھوں لٹ گیا۔ سر ولیم سلیمان (Sir Wm. Sleeman) نے ہنس کر جواب دیا کہ

" پگلی ، وہ بھی ایسا ہی پاگل ہے جیسی کہ تو، اگر واقعی کوئی ایسی بات ہوتی تو پنڈت اس راز کا انکشاف کبھی نہ کرتا"

مدت گزر گئی بہت سے دوسرے لوگ بھی پنڈت کے جال میں پھنسے، اور عمارت کے قرب وجوار میں متعدد بار کھدائی ہوئی لیکن ملا کچھ بھی نہیں۔

فارسی مثنوی نگاری اور داستان وامق عذرا

نیاز فتحپوری

کل ایک صاحب تشریف لائے اور تابڑ توڑ سوالوں کی بوچھار مجھ پر شروع کر دی۔ (۱) یہ دو مصرعے کس کے ہیں۔ (۲) نان خطائی کی اصلیت کیا ہے۔ (۳) ملا دو پیازے کے جھگڑے بیربل کے ساتھ کس حد تک صحیح ہیں۔ (۴) فارسی میں مثنوی کا آغاز کب سے ہوا اور "وامق و عذرا" کی داستان کیا ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں تو میں نے بتا دیا کہ ایک مصرع قتیل کا ہے اور دوسرا وحشی کا۔ دوسرے سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ جب آپ نان خطائی میرے سامنے لائیں گے اس وقت غور کروں گا۔ تیسرے سوال کے جواب میں میں نے انھیں بتایا کہ ملا دو پیازہ کے زمانہ کو بیربل یا اکبر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظام الملک آصف جاہ کا مصاحب تھا اور سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ عبدالمومن نام تھا اور وطن دہلی باپ کا نام عبدالولی تھا۔ ایک بار جب نظام الملک بھوپال سے قریب دریائے نربدا کو عبور کر رہا تھا تو ایک گاؤں ہنڈیاں میں قیام کا اتفاق ہوا۔ ملا دو پیازہ کو یہ جگہ بہت پسند آئی اور اپنے آقا سے کہا ملا دو پیازہ کو تو اب ہنڈیاں ہی میں رہنے دیجئے۔ نظام الملک نے اس کی بات مان لی اور اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا لیکن یہ گاؤں اسکی جاگیر میں دے دیا۔ ملا اور اس کی بیوی دونوں نے یہیں انتقال کیا اور ان کا مقبرہ جس میں یہ دونوں مدفون ہیں اب تک موجود ہے۔ عہد اکبری کے ملا دو پیازہ کا نام عبدالقادر تھا اور اس کا ہنڈیاں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

چوتھے سوال کا جواب تفصیل طلب تھا اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ اس کے لئے ۲۹ اکتوبر کے "جنگ" کا انتظار کیجئے۔

وامق و عذرا

لیلیٰ مجنوں۔ خسرو شیریں۔ یوسف زلیخا۔ فارسی کی بہت مشہور مثنویاں ہیں اور متعدد شعراء نے ان فسانہائے عشق کو منظوم کیا ہے انھیں مثنویوں کے ساتھ وامق و عذرا کا نام بھی کبھی سننے میں آجاتا ہے۔ گو اس نام کی مثنوی میری نگاہ سے کبھی نہیں گزری۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ مثنوی لکھی ہی نہیں گئی یہ اور بات ہے کہ اب وہ نایاب ہو جائے۔

آپ نے عنصری کا نام تو سنا ہو گا جو فردوسی کا ہمعصر اور محمود غزنوی کا درباری شاعر تھا۔ غالباً سب سے پہلے اس نے مثنوی وامق و عذرا تصنیف کی اور اس کے بعد بہشتی اور لامعی نے جو ترکی شاعر تھا۔ اس مثنوی کا جو پلاٹ لامعی کی مثنوی میں پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فسانہ کا تعلق یکسر زمین ایران سے ہے۔

وامق کسی آتشکدہ کا مُغ تھا اور عذرا ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے آتشکدہ کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ان دونوں میں محبت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ محبت مذہباً ممنوع تھی۔ اس لئے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ عذرا شمال کے برفستان میں بھیج دی گئی اور وامق کو افریقہ کے کسی نہایت گرم حصہ کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ آخر یہ دونوں گھل گھل کر مر گئے اور مرنے کے بعد عذرا نے ستارہ سنبلہ کی صورت اختیار کر لی اور وامق کی روح نے سماک رامح کی۔

لیکن ڈاکٹر ہیوارٹ (HUART) نے بحوالہ عوفی، دولت شاہ و براؤن اس کا پلاٹ بالکل مختلف ظاہر کیا ہے۔

[illegible] کا بیٹا کسن وہ سکر باد شاہ کی بیٹی منا پر عاشق ہو گیا ہے اور بڑی دشواریوں کے بعد [illegible]
طے کر کے بعد [illegible] اسے پالیتا ہے۔ لیکن اسی وقت کوئی اور رقیب عاشق کو پکڑ کر ہندوستان لے آتا ہے
اور چتا روشن کر کے اسے جلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن آگ اس پر اثر نہیں کرتی اور ہندو اسے دیوتا
سمجھ کر اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں اور یہ موقع پا کر بھاگ جاتا ہے۔"

ان دونوں بیانوں میں کافی اختلاف ہے لیکن آگ کا عنصر دونوں میں شامل ہے۔ اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ یہ قصہ
سب سے پہلے پہلوی زبان میں لکھا گیا تھا اس کے بعد عنصری نے اسے فارسی میں نظم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ جب اس کا پہلوی نسخہ عبداللہ بن طاہر امیر نیشاپور کی نگاہ سے گزرا تو اس نے اس کو جلوا دیا۔ کیونکہ وہ زرتشتی
کا لکھا ہوا تھا لیکن یہ روایت زیادہ قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہ امر بالکل یقینی ہے کہ اسے نہ صرف عنصری بلکہ اس کے بعد فصیحی نے
بھی نظم کیا۔ اور حسب تحقیق مسٹر بیل فرخاری نے بھی اس کے بعد حسب بیان مسٹر ہوارٹ چھ مثنویاں اور اسی نام سے لکھی گئیں
لطف علی بیگ مؤلف تذکرہ آتشکدہ نے مرزا محمد صادق نامی کو بھی اسی نام کی ایک مثنوی کا مصنف ظاہر کیا ہے۔ بہر حال مثنوی
"وامق و عذرا" کا کوئی غیر معروف مصنف نہیں ہے اور عنصری، لامعی، فرخاری یا نامی کی مثنویوں میں سے کوئی مثنوی مل جائے
تو البتہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا پلاٹ واقعی کیا ہے اور ہندوستان کا ذکر اس میں کوئی الحاق و اضافہ تو نہیں۔

فارسی میں عشقیہ مثنوی نگاری کا آغاز

فارسی میں مثنوی کا سب سے پہلا نمونہ حسب بیان دولت شاہ قدیم پہلوی زبان کی وہ بیت ہے
جو قصر شیریں کے [illegible] پر کندہ تھی [illegible] جس کے دونوں مصرعے برابر کا قافیہ رکھتے تھے یہ کتبہ
عضد الدولہ دیلمی کے زمانہ (۳۷۲ھ) تک موجود تھا اس کے علاوہ وہ پہلوی زبان کی کوئی نظم ایسی دستیاب نہیں ہوئی ہے جسے مثنوی کہہ سکیں۔
فارسی میں مثنوی نگاری کا آغاز دراصل عہد اسلام سے ہوتا ہے۔ جب سب سے پہلے ناصر خسرو نے دو اخلاقی مثنویاں روشنائی نامہ اور
سعادت نامہ نظم کیں۔ اس کے بعد حسب بیان عوفی فخر الدین گورگانی نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی جس میں ایک موبد کی لڑکی کی داستان
محبت بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ بالکل ابتدائی کوشش تھی لیکن اس کے بعد صحیح معنی میں اولین مثنوی نظامی نے مخزن اسرار کے نام سے
لکھی جو اخلاقی نصائح سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے بعد پانچ عشقیہ مثنویاں لکھیں جو پنج گنج کے نام سے مشہور ہیں۔ خسرو شیریں۔
لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر۔ یوسف زلیخا اور سکندر نامہ۔ یوسف زلیخا کے نام سے فردوسی بھی ایک مثنوی چھوڑ گیا تھا اور جس حد تک
مثنوی کی تکنیک کا تعلق ہے نظامی نے فردوسی ہی کا تتبع کیا ہے۔

نظامی کے بعد مثنوی نگاری میں جامی نے بڑا نام پیدا کیا اس کے بعد یہ ذوق اتنا عام ہو گیا کہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے کوئی نہ کوئی
مثنوی نہ لکھی ہو یہاں تک کہ پوری تحقیق کے بعد بھی ان کا احصار دشوار ہے۔ عطار و رومی بھی مثنوی نگاری کے ائمہ میں شامل ہیں لیکن ان کا میدان
اخلاق و تصوف تھا جس کی پیروی بعد کو دوسرے شعرا نے بھی کی۔

ایران سے ہندوستان آنے والے شعرا میں مثنوی نگار کم تھے۔ ان کا فن غزل گوئی تھا اور قصیدہ نگاری بھی۔ ہندوستانی
شعرا میں فیضی نے نل دمن لکھی۔ لیکن مقبول نہ ہوئی۔ البتہ امیر خسرو نے اس فن میں اپنا ڈنکا بجا دیا۔ رزمیہ مثنویوں کو چھوڑ کر
پانچ مثنویاں صرف عشق و محبت کے موضوع پر لکھیں۔ شیریں و خسرو۔ مجنوں و لیلیٰ۔ ہشت بہشت، قران السعدین ——
دولرانی خضر خاں۔ اور جس طرح جامی کی مثنوی یوسف زلیخا اس موضوع پر بہترین مثنوی سمجھی جاتی ہے۔ اسی
طرح خسرو مجنوں و لیلیٰ اپنے موضوع کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ جب لیلیٰ مر جاتی ہے اور اس کے اعزا اسے
دفن کرتے ہیں تو اس منظر کا ذکر اس وقت کے تمام تاثرات کو لئے ہوئے اس شعر پر ختم کر دیتے ہیں۔

باب الاستفسار

(۱)

کس کے اشعار ہیں

عبدالسلام خاں۔ فرید کوٹ

ایک زمانے سے یہ دو مصرعے ذہن میں محفوظ ہیں۔ لیکن اب بالکل یاد نہیں کہ کس شاعر کے ہیں اور کس غزل یا قطعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مطلع فرمائیے۔

غزل کا مصرعہ یہ ہے۔

مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت

اور قطعہ کا شعر یہ ہے۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام ازان من

یہ قطعہ کسی شاعر نے مزاحیہ انداز میں تقسیم ہند کے سلسلے میں لکھا تھا۔

نگار) پہلا مصرعہ قتیل کی ایک مشہور غزل کا ہے۔ جس کے صرف چار شعر مجھے یاد ہیں۔ اس کی ردیف "رابہانہ ساخت" ہے اور قافیہ حیا، ادا وغیرہ۔

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساخت — خود سوئے ما ندید و حیا را بہانہ ساخت

دستے بدوش غیر نہاد از سر کرم — مارا چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت

رفتم بہ مسجدے کہ ببینم جمال دوست — دستش برخ کشید و دعا را بہانہ ساخت

عاشق کشی چو کرد شدہ است دامنش سرخ — دیں طرفہ مکر بیں کہ حنا را بہانہ ساخت

واضح رہے کہ قتیل نے یہ غزل میلی کے تتبع میں کہی تھی جس کے بعض اشعار ایک ہی قافیہ کے یہ ہیں۔

غافل بمن رسید و وفا را بہانہ ساخت — افگندہ سر بہ پیش و حیا را بہانہ ساخت

تا از جفائے او نہ رہم خون من نہ ریخت — بے رحم بیں کہ ترس خدا را بہانہ ساخت

از بزم ناز مست من بروں رود — برخاست گرم و داد من جا را بہانہ ساخت

دونوں غزلیں بہ ہم ہیں فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ قتیل کی غزل اگر مقبول ہے تو میلی کی نغوتر۔

وہ قطعہ جس کا آپ نے ایک مصرع تحریر کیا ہے۔ وحشی کا ہے یہ قطعہ بہت مشہور ہے۔

نبیا ترا نچہ ماندہ زپا بازان تو | بہانے براد راز من دا عنی ازان تو
این طاس خالی باز من وان کوزہ کہ بود | پارینہ بہذ شہد مصفا ازان تو
یا بو سئہ لسان گسل و میخ کہنہ از من | مہیتر کلہ تیز و مطلا ازان تو
آن نیک لب شکستہ صابون بیزی از من | آن جمجۂ ہریسۂ و حلوا ازان تو
آن قوچ شاخ کج کہ زند شاخ ازان من | غوغائے جنگ قوچ و تماشا ازان تو
این اشتر جہش کہ زن وزان من | این گربۂ مصاحب بابا ازان تو

از صحن خانہ تا بہ لب بام ازان من
از بام خانہ تا بہ لب بام ازان تو

اسی نظم کے تتبع میں میلی اور رفیعی کاشانی نے بھی قطعات لکھے ہیں لیکن وہ اس پایہ کے نہیں۔

(۲)

شیریں فرہاد و خسرو

(مرزا مراد بیگ صاحب اجین)

فرہاد، شیریں اور خسرو، ان تینوں کا نام ساتھ ساتھ آتا ہے۔ مثنویوں میں زیادہ تر خسرو و شیریں کی محبت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس افسانہ میں ان تینوں کا اصلی کردار کیا ہے اور ایک کا دوسرے سے کیا تعلق ہے۔ نیز یہ کہ خسرو تاریخ ایران کے کس عہد سے تعلق رکھتا ہے اور شیریں کون اور کیا تھی۔

(**نگار**) جس حد تک خسرو و شیریں کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی خاص بات ایسی نہیں کہ وہ کسی عشقیہ مثنوی یا رومان کی بنیاد ہو سکے۔ خسرو ایران کا بادشاہ۔ شیریں اس کی بیوی۔ چلئے قصہ ختم ہوا۔ اگر تسلیم بھی کر لیں کہ شیریں غیر معمولی حسن و جمال کی مالک تھی اور خسرو اس پر جان چھڑکتا تھا تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ خدا جانے کتنے فرمانروا ایسے ہوئے ہیں جو اپنی بیویوں سے محبت کرتے تھے۔ لیکن مثنوی کے ہیرو کی حیثیت سے تو انھیں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی واقعہ مثنوی کے حدود میں اسی وقت آ سکتا ہے جب اس میں کسی المیہ کا عنصر شامل ہو اور خسرو و شیریں کے افسانہ میں یہ عنصر پیدا کیا فرہاد نے۔

خسرو و شیریں یا فرہاد و شیریں کا جو قصہ بیان کیا جاتا ہے اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس کے اظہار سے قبل تاریخی حیثیت سے بھی ان پر نظر ڈال لی جائے۔

سب سے پہلے خسرو پرویز کو لیجئے۔ ایران میں ہرمز نام کے تین فرمانروا ہوئے ہیں۔ پہلے دو ہرمز کا تعلق موضوع زیر بحث سے نہیں اس لئے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔ تیسرے اور چوتھے ہرمز البتہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتے ہیں اگلے قسلسا

[illegible] آن قوچ یعنی مینڈھا — استر یعنی خچر — جہش یعنی اڑیل

بیان کے لئے مختصراً ان کا ذکر ضروری ہے۔

ہرمزد ثالث ۔ آٹھواں ساسانی فرمانروا تھا جو ۴۵۷ء میں تخت نشین ہوا لیکن وہ ایک سال بھی حکومت کر چکا تھا کہ اس کے بھائی فیروز نے اسے قتل کر دیا (۴۵۹ء) اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اسی بادشاہ کے سلسلے میں بعض مورخین نے ظاہر کیا ہے کہ بہرام چوبیں اسی کا فوجی جرنل تھا جو ہرمزد ثالث کو معزول کر کے خود تخت نشین ہو گیا تھا۔ لیکن یہ درست نہیں، کیوں کہ بہرام چوبیں کا تعلق ہرمزد ثالث سے نہیں بلکہ ہرمزد رابع کے عہد سے تھا۔

ہرمزد رابع ۔ یہ ساسانی فرمانروا وہی ہے جسے یونانی مورخین Hermisdas III کہتے ہیں یہ نوشیرواں کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ اسی کے زمانے میں بہرام چوبیں نے بغاوت کی اور ہرمزد رابع کو (۵۹۰ء) میں قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد اس کے بیٹے خسرو پرویز (جو مثنوی خسرو شیریں کا ہیرو ہے) قیصر روم "Maurice" کی مدد سے، بہرام چوبیں کو شکست دے کر خود تخت نشین ہو گیا (۵۹۱ء) چونکہ یہ قیصر روم (Maurice) کا بہت ممنون تھا اس لئے وہ اسے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا۔ اس لئے جب تک وہ زندہ رہا یہ خاموش رہا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد ہی اس نے روم پر حملہ کر دیا اور شام کو فتح کر لیا۔ یروشلم تک پہنچ گیا اور وہاں کے کلیسہ کی تمام دولت لوٹ کر ایران لے آیا۔ اس کے بعد جب قیصر روم ہراکلیس نے ایران پر حملہ کیا اور رعایا میں اضطراب پھیلا تو خسرو کی طرف سے ملک میں عام بدظنی پیدا ہو گئی اور شیرویہ اس کے بڑے بیٹے نے اسے ۶۲۸ء (۷ھ) میں قتل کر کے عنان حکومت خود ہاتھ میں لے لی۔

یہی وہ خسرو پرویز تھا۔ جس کو (حسب بیان مورخین اسلام) رسول اللہ نے دعوت اسلام کا خط لکھا تھا اور جب اس نے اس خط کو چاک کر دیا تو رسول اللہ نے حکومت اکاسرہ کی تباہی کی پیش گوئی کی تھی (جو پوری ہوئی) اس خط کے بھیجنے کی تاریخ ۷ھ ہجری بتائی جاتی ہے جس کا آغاز ۱۱ مئی ۶۲۸ء سے ہوا تھا، لیکن گبن کی تحقیق یہ ہے کہ خسرو کا انتقال فروری ۶۲۸ء میں ہو چکا تھا اس لئے خط بھیجنے کا واقعہ ۶ھ کا ہونا چاہیئے لیکن خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔

اب کچھ ذکر شیریں کا بھی سن لیجئے کہ وہ کون تھی۔ بعض کا بیان ہے کہ اس کا نام میری (Mary) تھا اور بعض آیرین (Irene) بتاتے ہیں (ہو سکتا ہے کہ آیرین کو ایران والوں نے شیریں کر دیا ہو) یونانی مصنفین اسے مسیحی ظاہر کرتے ہیں۔ اور ایران و ترکی کے فسانہ نگار اسے قیصر روم (Maurice) کی لڑکی ظاہر کرتے ہیں جس پر خسرو اسی وقت عاشق ہو گیا تھا جب ماریس نے بہرام چوبیں کے نکالنے میں خسرو کی مدد کی تھی۔

اب اس اختلاف کو بھی سن لیجئے جو اس قصہ کی روایتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ۔ جب خسرو کو اس کے بیٹے نے قتل کر کے ایران پر قبضہ کر لیا تو اس نے شیریں کو بھی اپنے تصرف میں لانا چاہا۔ شیریں نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ کسی طرح اپنے سوتیلے بیٹے کی بیوی بننے پر راضی نہ ہوئی لیکن جب اصرار نے زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی تو اس نے کہا کہ۔ بہتر ہے میں اس تعلق پر راضی ہوں بشرط آنکہ ایک بار اور مجھے خسرو کی لاش دیکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ چنانچہ اس کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور جب وہ اپنے شوہر و عاشق کی لاش کے پاس پہنچی تو خنجر مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔

اس روایت میں فرہاد کا نام کہیں نہیں آتا، لیکن دوسری روایت میں ہے۔ اور وہ روایت یہ ہے کہ فرہاد ایران کا ایک نوجوان سنگ تراش تھا۔ اور شیریں کا دیوانہ۔ جب یہ خبر عام ہوئی تو خسرو نے اسے قتل کر دینا چاہا لیکہ

و اندیشہ بنا کی وہاں ... بھی خود فرہاد سے محبت کرتی تھی اور وہ قتل فرہاد پر راضی نہ تھی۔ خسرو نے یہ تدبیر اختیار کی کہ فرہاد کو بلا کر ... تم کوہ بیستون کو کاٹ کر چشمہ کے بہاؤ کا رُخ بدل دو، تو شیریں تم کو مل جائے گی۔ (شعراء نے چشمہ آب کو نہر شیر ... کر دیا) اس نے یہ شرط منظور کر لی اور پہاڑ کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ جب فرہاد کی سالہا سال کی کاوش کے بعد یہ کام تکمیل کی حد تک پہنچ گیا اور خسرو کو یہ اندیشہ پیدا ہوا مبادا شیریں سے ہاتھ دھونا پڑے، اس نے ایک بڑھیا کے ذریعے سے فرہاد کو شیریں کے مر جانے کی خبر پہنچا دی اور اس نے چٹان سے نیچے گر کر یا تیشہ مار کر خود بھی اپنی جان دے دی۔ بعض کا بیان ہے کہ جب شیریں کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ "روایت اولیٰ" کا واقعہ اس روایت میں شامل کر دیا گیا ہو۔

خسرو و شیریں کے عنوان سے فارسی میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور فارسی کا شاید ہی کوئی مشہور شاعر ایسا ہو جس نے اس قصہ کو نظم نہ کیا ہو۔

(۳)

ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے

سید حیدر علی صاحب (ایبٹ آباد)

ملتان، ٹھٹھہ، بھکر وغیرہ سندھ کے بڑے مشہور تاریخی مقامات ہیں اور خدا جانے کس کس زمانہ میں کن کن ہندو و مسلم خاندانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ لیکن صحیح طور سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت دہلی سے اس کا تعلق سب سے پہلے کب اور کیونکر ہوا۔

(نگار) ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں ہوا ہے۔ تواریخ سندھ کے مطالعے سے یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہو گی کہ نویں صدی ہجری میں ملتان لنگا کے مسلم خاندانوں کے قبضہ میں تھا (اس جگہ اس خاندان کے حالات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں) جب سنہ [illegible]ء میں محمود خاں لنگا فرمانروائے ملتان کا انتقال ہو گیا تو اس کا لڑکا حسین لنگا اول تخت نشین ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں سکندر لودی حکمراں تھا اور ان دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اس کے ۵۰ سال بعد حسین لنگا ثانی تخت نشین ہوا (سنہ ۱۵۲۴ء) جو نابالغ تھا، اور سلسلۂ نظم و نسق اس کے بہنوئی شجاع الملک کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ٹھٹھہ میں شاہ حسین ارغون حکمراں تھا جس کے تعلقات ملتان سے اچھے نہ تھے۔ اس نے بابر کے اشارہ سے ملتان پر حملہ کر دیا۔ اور پندرہ ماہ کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا (سنہ ۱۵۲۸ء) لیکن وہ خود یہاں نہیں رہا، لشکر خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے ٹھٹھہ چلا گیا۔ اس کے بعد جب بابر نے اپنے زمانہ علالت میں ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تو ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو لاہور جاگیر میں دے دیا۔ کامران نے اس خیال سے کہ لاہور کے حدود ملتان سے ملتے ہیں۔ لشکر خاں کو طلب کیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کابل لے لے جس سے کامران کو اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی اور اس کے عوض ملتان دیدے۔ سرکار دہلی سے ملتان کے

ہونے کی یہ ہے تاریخ ۔

(۴)

غالب تخلص رکھنے والے شاعر

رم صاحب (لودہیانہ)

کیا مرزا اسد اللہ خاں کا تخلص غالب کوئی نیا تخلص تھا جو اس نے اختیار کیا۔ اگر نیا نہیں تھا اور اس سے پہلے بھی بعض شاعروں نے یہ تخلص اختیار کیا تو حیرت ہے کہ غالب ایسے خوددار شاعر نے دوسرا تخلص کیوں اختیار نہیں کیا ؟

نگار) غالب کوئی نیا تخلص نہ تھا۔ میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ غالب سے پہلے کن کن شعراء نے یہ تخلص اختیار کیا تذکروں کے مطالعے سے اس کا پورا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم چار شاعروں کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے جو غالب سے پہلے اس تخلص کے حامل تھے ۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے لیکن اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شاعر محمد سعید کا بھی یہی تخلص تھا جس نے اپنا دیوان ۱۶۹۹ء میں مرتب کیا۔ اس کے بعد میر فخرالدین عہد محمد شاہ کے قصہ گو کا نام آتا ہے جو ۱۷۳۳ء میں زندہ تھا اس کے بعد شیخ اسد اللہ (شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بھانجے نے یہ تخلص اختیار کیا جن کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔

علاوہ ان کے مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ فرزند نواب نیاز بیگ خاں کا بھی یہی تخلص تھا جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں انتقال کیا۔ یہ فارسی ریختی دونوں زبان کے شاعر تھے۔

اب رہا یہ امر کہ غالب نے کیوں یہ تخلص اختیار کیا۔ اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ مرزا اسد اللہ خاں اپنے تمام پچھلے غالبوں پر غالب آگئے اور وہ پیشرو شعراء جنھوں نے پہلے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تو ماننا پڑتا ہے کہ اصل غالب وہی تھا جسے اس وقت بھی ساری دنیا جانتی ہے اور آئندہ بھی فراموش نہ کر سکے گی ۔

نوٹ :- افسوس ہے کہ غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر تمام استفسارات کا جواب تحریر نہ کر سکا۔ کوشش کروں گا کہ ان میں سے بعض کا جواب آئندہ اشاعت میں درج ہو سکے۔ نیاز

یہ اندیشہ بنا ہی [illegible] ہیما خود فرہاد سے محبت کرتی تھی اور وہ قتل فرہاد پر راضی نہ تھی۔ خسرو نے یہ تدبیر اختیار کی کہ فرہاد کو ہلاکر [illegible] کہ تم کوہ بیستون کو کاٹ کر چشمہ کے پہاڑ کا رُخ بدل دو، تو شیریں تم کو مل جائے گی۔ (شعراء نے چشمہ آب کو نہر شیر کردیا) اس نے یہ شرط منظور کرلی اور پہاڑ کاٹنے میں معروف ہو گیا۔ جب فرہاد کا سالہا سال کی کاوش کے بعد یہ کام تکمیل کی حد تک پہنچ گیا اور خسرو کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اب دا شیریں سے ہاتھ دھونا پڑے اس نے ایک بڑھیا کے ذریعہ سے فرہاد کو شیریں کے مرجانے کی خبر پہنچا دی اور اس نے چٹان سے نیچے گر کر یا تیشہ مار کر خود بھی اپنی جان دے دی۔ بعض کا بیان ہے کہ جب شیریں کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کردیا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ روایت اول کا واقعہ اس روایت میں شامل کردیا گیا ہو۔

خسرو و شیریں کے عنوان سے فارسی میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور فارسی کا شاید ہی کوئی مشہور شاعر ایسا ہو جس نے اس قصہ کو نظم نہ کیا ہو۔

(۳)

ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے

سید حیدر علی صاحب (ایبٹ آباد)

ملتان، ٹھٹھہ، بھکر وغیرہ سندھ کے بڑے مشہور تاریخی مقامات ہیں اور خدا جانے کس کس زمانہ میں کن کن ہندو مسلم خاندانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ لیکن صحیح طور سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت دہلی سے اس کا تعلق سب سے پہلے کب اور کیونکر ہوا۔

(نگار) ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) میں ہوا ہے۔ تواریخ سندھ کے مطالعے سے یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہوگی کہ نویں صدی ہجری میں ملتان لنگا کے مسلم خاندانوں کے قبضہ میں تھا (اس جگہ اس خاندان کے حالات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں) جب سنہ ۱۵۱۰ء میں محمود خاں لنگا فرمانروائے ملتان کا انتقال ہوگیا تو اس کا لڑکا حسین لنگا اول تخت نشین ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں سکندر لودی حکمراں تھا اور ان دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ اس کے ۵ سال بعد حسین لنگا ثانی تخت نشین ہوا (سنہ ۱۵۲۴ء) جو نابالغ تھا، اور سلسلہ نظم و نسق اس کے بہنوئی شجاع الملک کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ٹھٹھہ میں شاہ حسین ارغون حکمراں تھا جس کے تعلقات ملتان سے اچھے نہ تھے۔ اس نے بابر کے اشارہ سے ملتان پر حملہ کردیا۔ اور پندرہ ماہ کے محاصرہ کے بعد فتح کرلیا (سنہ ۱۵۲۸ء) لیکن وہ خود یہاں نہیں رہا لشکر خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے ٹھٹھہ چلا گیا۔ اس کے بعد جب بابر نے اپنے زمانہ علالت میں ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کردیا تو ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو لاہور جاگیر میں دے دیا۔ کامران نے اس خیال سے کہ لاہور کے حدود ملتان سے ملتے ہیں۔ لشکر خاں کو طلب کیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کابل لے لے جس سے کامراں کو اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی اور اس کے عوض ملتان دیدے۔ سرکار دہلی سے ملتان کے

متعلق ہونے کی یہ ہے تاریخ ۔

---

(۴)
غالب تخلص رکھنے والے شاعر

عمر اکرم صاحب (لودھیانہ)

کیا مرزا اسد اللہ خاں کا تخلص غالب کوئی نیا تخلص تھا جو اس نے اختیار کیا۔ اگر نیا نہیں تھا اور اس سے پہلے بھی بعض شاعروں نے یہ تخلص اختیار کیا تو حیرت ہے کہ غالب ایسے خود دار شاعر نے دوسرا تخلص کیوں اختیار نہیں کیا ؟

(نگار) غالب کوئی نیا تخلص نہ تھا۔ میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ غالب سے پہلے کن کن شعراء نے یہ تخلص اختیار کیا تذکروں کے مطالعے سے اس کا پورا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم چار شاعروں کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے جو غالب سے پہلے اس تخلص کے حامل تھے۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے لیکن اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شاعر محمد سعید کا بھی یہی تخلص تھا جس نے اپنا دیوان ۱۷۱۹ء میں مرتب کیا۔ اس کے بعد میر فخر الدین عہد محمد شاہ کے قصہ گو کا نام آتا ہے جو ۱۷۳۳ء میں زندہ تھا اس کے بعد شیخ اسد اللہ (شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بھانجے نے یہ تخلص اختیار کیا جن کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔

علاوہ ان کے مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ فرزند نواب نیاز بیگ خاں کا بھی یہی تخلص تھا جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں انتقال کیا۔ یہ فارسی ریختی دونوں زبان کے شاعر تھے۔

اب رہا یہ امر کہ غالب نے کیوں یہ تخلص اختیار کیا۔ اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ مرزا اسد اللہ خاں اپنے تمام پچھلے غالبوں پر غالب آ گئے اور وہ پیشرو شعراء جنھوں نے پہلے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تو ماننا پڑتا ہے کہ اصلی غالب وہی تھا جسے اس وقت بھی ساری دنیا جانتی ہے اور آئندہ بھی فراموش نہ کر سکے گی۔

نوٹ: افسوس ہے کہ غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر تمام استفسارات کا جواب تحریر نہ کر سکا کوشش کروں گا کہ ان میں سے بعض کا جواب آئندہ اشاعت میں درج ہو سکے۔   نیاز

یہ اندیشہ بنامی [illegible] اس [illegible] پہلا خود فرہاد سے محبت کرنی تھی اور وہ قتل فرہاد پر راضی نہ تھی۔ خسرو نے یہ تدبیر اختیار کی کہ فرہاد کو بلا کر کہا کہ تم کوہ بیستون کو کاٹ کر چشمہ کے بہاؤ کا رُخ بدل دو، تو شیریں تم کو مل جائے گی۔ (شعراء نے چشمہ کی جگہ نہر فیر۔ کردیا) اس نے یہ شرط منظور کرلی اور پہاڑ کاٹنے میں معروف ہوگیا۔ جب فرہاد کی سالہا سال کی کاوش کے بعد یہ کام تکمیل کی حد تک پہنچ گیا اور خسرو کو یہ اندیشہ پیدا ہوا مبادا شیریں سے ہاتھ دھونا پڑے اس نے ایک بڑھیا کے ذریعہ سے فرہاد کو شیریں کے مرجانے کی خبر پہنچادی اور اس نے چٹان سے نیچے گر کر یا تیشہ مار کر خود بھی اپنی جان دے دی۔ بعض کا بیان ہے کہ جب شیریں کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو اس نے بھی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کردیا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ۔ روایت اولی ۔ کا واقعہ اس روایت میں شامل کردیا گیا ہو۔

۔ خسرو و شیریں کے عنوان سے فارسی میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں اور فارسی کا شاید ہی کوئی مشہور شاعر ایسا ہو جس نے اس قصہ کو نظم نہ کیا ہو۔

(۳)

ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے

سید حیدر علی صاحب (ایبٹ آباد)

ملتان، ٹھٹھہ، بھکر وغیرہ سندھ کے بڑے مشہور تاریخی مقامات ہیں اور خدا جانے کس کس زمانہ میں کن کن ہندو مسلم خاندانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ لیکن صحیح طور سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حکومت دہلی سے اس کا تعلق سب سے پہلے کب اور کیونکر ہوا۔

(نگار) ملتان کا تعلق حکومت دہلی سے دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) میں ہوا ہے۔ تواریخ سندھ کے مطالعہ سے یہ بات تو آپ کو معلوم ہو ہی گئی ہوگی کہ نویں صدی ہجری میں ملتان لنگا کے مسلم خاندانوں کے قبضہ میں تھا (اس جگہ اس خاندان کے حالات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں) جب سنہ ۱۴۶۹ء میں محمود خاں لنگا فرمانروائے ملتان کا انتقال ہوگیا تو اس کا لڑکا حسین لنگا اول تخت نشین ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب دہلی میں سکندر لودی حکمراں تھا اور ان دونوں کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ اس کے ۵۰ سال بعد حسین لنگا ثانی تخت نشین ہوا (سنہ ۱۵۲۴ء) جو نابالغ تھا، اور سلطنت دلستی اس کے بہنوی شجاع الملک کے اختیار میں تھا۔ اس وقت ٹھٹھہ میں شاہ حسین ارغون حکمراں تھا جس کے تعلقات ملتان سے اچھے نہ تھے۔ اس نے بابر کے اشارہ سے ملتان پر حملہ کردیا۔ اور پندرہ ماہ کے محاصرہ کے بعد فتح کرلیا (سنہ ۱۵۲۸ء) لیکن وہ خود یہاں نہیں رہا۔ لشکر خاں کو اپنا نائب مقرر کرکے ٹھٹھہ چلا گیا۔ اس کے بعد جب بابر نے اپنے زمانہ علالت میں ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کردیا تو ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کو لاہور جاگیر میں دے دیا۔ کامران نے اس خیال سے کہ لاہور کے حدود ملتان سے ملتے ہیں۔ لشکر خاں کو طلب کیا اور اسے اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ کابل لیلے جس سے کامراں کو اب کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی اور اس کے عوض ملتان دیدے۔ سرکار دہلی سے ملتان کے

متعلق ہونے کی یہ ہے تاریخ۔

---

(۴)

غالبؔ تخلص رکھنے والے شاعر

محمد اکرم صاحب (لودہیانہ)

کیا مرزا اسد اللہ خاں کا تخلص غالبؔ کوئی نیا تخلص تھا جو اس نے اختیار کیا۔ اگر نیا نہیں تھا اور اس سے پہلے بھی بعض شاعروں نے یہ تخلص اختیار کیا تو حیرت ہے کہ غالب ایسے خود دار شاعر نے دوسرا تخلص کیوں اختیار نہیں کیا؟

(نگار) غالب کوئی نیا تخلص نہ تھا۔ میں صحت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ غالب سے پہلے کن کن شعراء نے یہ تخلص اختیار کیا تذکروں کے مطالعے سے اس کا پورا علم ہو سکتا ہے۔ لیکن کم از کم چار شاعروں کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے جو غالبؔ سے پہلے اس تخلص کے حامل تھے۔

غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے لیکن اس سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شاعر محمد سعید کا بھی یہی تخلص تھا جس نے اپنا دیوان ۱۶۹۰ء میں مرتب کیا۔ اس کے بعد میر فخرالدین عہد محمد شاہ کے قصہ گو کا نام آتا ہے جو ۱۷۳۲ء میں زندہ تھا اس کے بعد شیخ اسد اللہ (شیخ محمد افضل الہ آبادی کے بھانجے نے یہ تخلص اختیار کیا جن کا انتقال ۱۷۵۰ء میں ہوا۔
علاوہ ان کے مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں غالب جنگ فرزند نواب نیاز بیگ خاں کا بھی یہی تخلص تھا جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں انتقال کیا۔ یہ فارسی ریختی دونوں زبان کے شاعر تھے۔

اب رہا یہ امر کہ غالب نے کیوں یہ تخلص اختیار کیا۔ اس پر مجھے بھی تعجب ہے۔ لیکن جب یہ دیکھتا ہوں کہ مرزا اسد اللہ خاں اپنے تمام پچھلے غالبوں پر غالبؔ آ گئے اور وہ پیشرو شعراء جنھوں نے پہلے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تو ماننا پڑتا ہے کہ اصل غالبؔ وہی تھا جسے اس وقت بھی ساری دنیا جانتی ہے اور آئندہ بھی فراموش نہ کر سکے گی۔

نوٹ:- افسوس ہے کہ غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر تمام استفسارات کا جواب تحریر نہ کر سکا۔ کوشش کروں گا کہ ان میں سے بعض کا جواب آئندہ اشاعت میں درج ہو سکے۔ نیازؔ

منظومات

دلؔ شاہجہانپوری

وہ جلوہ نمائی کا منظر وہ فرطِ تحیر کا عالم
ہم پر تو غشی سی طاری تھی تم جنبشِ داماں بھول گئے

کیا ذکر شبابِ رفتہ کا اب تو یہی سمجھو تم اے دلؔ!
اک خواب پریشاں دیکھا تھا وہ خواب پریشاں بھول گئے

مرا مدعا یہی تھا مری زندگی یہی ہے
کہ سمجھ رہی ہے دنیا مجھے ڈوبتا ستارا

یہ ہے سرگزشتِ گلشن یہ ہے نذرِ برقِ سوزاں
کبھی بال و پر ہمارے کبھی آشیاں ہمارا

وہ خموشیٔ محبت وہ نظر کی ترجمانی
جو زباں تک نہ آیا وہی راز آشکارا

یہ ہے جذبۂ محبت وہ کرشمۂ محبت
جسے پی گئے وہ آنسو جو ٹپک پڑا وہ تارا

یونہی دن گزر رہے ہیں یہی زندگی ہے اے دلؔ
کبھی ہر نفس مصیبت کبھی ہر نظر سہارا

پھولوں کے عوض جنت کی طلب جنت میں تمنا کوثر کی
میکش کی نظر میں اے واعظ یہ سلسلۂ اوہام نہیں

یہ زلفِ مسلسل رخ کے قریں یہ حلقۂ کاکل کیا معنی
پابندِ سلاسل عشق ہی کیا حسن اسیرِ دام نہیں

راتیں بھی کٹیں دن بھی دیکھے ہر صبح تھی صبحِ ناکامی
پُر نور جو کر دے نظروں کو قسمت میں وہی اک شام نہیں

جو کچھ بھی کہوں جب تک بھی کہوں اے اہلِ نظر سنتے رہیے
یہ عشق و وفا کا ماتم ہے رودادِ دلِ ناکام نہیں

بالیں سے مریضِ فرقت کی کہتا ہوا کوئی گزرا ہے
یہ چند نفس کا مہماں ہے یا صبح نہیں یا شام نہیں

مے خانۂ عالم کا اے دل افسانۂ ماضی کیا کہیے
وہ جوش نہیں مے نوش نہیں وہ دور نہیں وہ جام نہیں

مٹ گیا شیوۂ تسلیم و رضا میرے بعد
کوئی مفہوم محبت نہ رہا میرے بعد

اے پشیمانِ جفا اب تو نہ کر ذکرِ وفا
تو نے کیوں قصۂ دل چھیڑ دیا میرے بعد

خونِ مظلوم ہے خونِ دل ناکام نہیں
رنگ لائے گا یہ ہم رنگ حنا میرے بعد

اب کہیں تذکرۂ نعرۂ منصور نہیں
قصۂ دار و رسن ختم ہوا میرے بعد

دل دھڑکتا ہوا پہلوئے غزل خواں میں نہیں
سرد ہے گرمئ بزمِ شعرا میرے بعد

ناکام محبت پر ہمدم یہ جفا کب تک
تسکین کے چھینٹوں نے ادراک کو بھڑکایا

سمجھے تو یہی سمجھے دنیائے محبت میں
تو جانِ تمنا ہے دل کھو کے تجھے پایا

سوزِ جگر و دل کی روداد یہ ہے اے دل
اک داغ چمک اٹھا اک زخم ابھر آیا

نذرِ غالب

منظور حسین شور

فردا بسرِ حشر بغالب بکنم عرض
تابش بہ قمر، موج بہ عمان چہ فروشم

اما تو بگو بر سرِ ایں بزمِ سفیہان
قرآنِ غم و مصحفِ عرفان چہ فروشم

در انجمن خیرہ سراں شعر چہ خوانم
ایں جنس گراں این قدر ارزان چہ فروشم

صحبت چہ کنم آہ بہر عای خود خواہ
خورشید بہ شمع تہِ دامان چہ فروشم

پردہ چہ کشایم ز رخِ معنئ ادراک
با تیرہ شباں نیرِ تابان چہ فروشم

آئینہ کجا در کف زنگی بگذارم   داغ جگر و دل بہ یہودان چہ فروشم
خفاش چہ داند تب و تابانی خورشید   کالائے ہنر را بہ حسودان چہ فروشم
نغمہ چہ سرایم بحریفان گران گوش   نور مہ و خورشید بکوران چہ فروشم
با تیرہ نہادان چہ کنم وا لب گفتار   باریک روان گوہر غلطان چہ فروشم
با کم نظران بر ہنر خویش چہ نازم   این معجزہ با شعبدہ بازان چہ فروشم
ہر غنچہ گلستان بکنار ست ولیکن   با سبزۂ صحرا گل و ریحان چہ فروشم
ان بہ کہ بہر غنچہ زنم آتش در قصم   اسرار گلستان بہ بیابان چہ فروشم
با ساحلیان راز دل بحر چہ گویم   با قطرۂ نیسان یم و طوفان چہ فروشم
با بوریا بافان چہ زنم حرف زکمخواب   ابریشم و اکسون بگدایان چہ فروشم
با ذرہ چہ گویم سخن از وسعت صحرا   سنگینیٔ کہسار بہ موران چہ فروشم
ہر مرغ ہوا در خور پرواز فلک نیست   با کرمک شب عرصۂ کیہان چہ فروشم
با جہل چہ نسبت ادب و شعر و سخن را   با مور و ملخ اوج سلیمان چہ فروشم
این شپرہ چشمان چہ بدانند سحر چیست   این نکتہ باین شپرہ چشمان چہ فروشم
تا چند زنم غازہ بہ رخسار سیاہان   با شیشہ گران شاخۂ مرجان چہ فروشم
رنگ حبشی با چہ رود چند بشوییم   اخلاص حسینان بہ یزیدان چہ فروشم
برگ گل تر سینۂ خارا چہ شگافد   با اہل ریا دولت ایقان چہ فروشم
سجادہ چہ در معبد گبران بکشایم   توحید باصنام پرستان چہ فروشم
دل دولت دارین بود با کہ کنم عرض   این کعبہ بہر تاجر قرآن چہ فروشم
نافہم چہ داند کہ سخن چیست و فن چیست   با برہمنان حرمت یزدان چہ فروشم
مرغان قفس بال بگردون چہ کشایند   افکار اماماں بہ غلامان چہ فروشم
با تودۂ یخ آتش سوزاں چہ دہم شرح   با مرغ سحر شہپر بازان چہ فروشم
در شہر خموشان چہ زنم زخمہ بہ سازے   با مردم کر نغمہ و الحان چہ فروشم
من بیخرد ہشیارم و بدمست خود آگاہ   یاران ہمہ مستند بہ مستان چہ فروشم
این جا چہ مقام است و کجایم کہ داند   با بے خبران عالم وجدان چہ فروشم
بے تابم و بے خواب، و بے باکہ بگویم   با سنگدلان رقص رگ جان چہ فروشم
کو محرم رازی کہ بداند تپش جان   در کوئی لئیمان تپش جان چہ فروشم

با گریہ ہمی خندم و با خندہ بنالیم
ترسم کہ بہ تنقید نگاران چہ فروشم!

نیاز فتحپوری

شورش کاشمیری

ادیب العصر لکھوں صاحبِ فہم و ذکا لکھوں
قلم کارانِ عصرِ حاضرہ کا رہنما لکھوں

ادب میں بوالکلام آزاد کی تصویر ٹھہراؤں
زباندانی میں میرؔ و میرزاؔ کا ہمنوا لکھوں

مری طبع رسا نے غائبانہ فیض پایا ہے
عزیزانِ گرامی اور کیا اس کے سوا لکھوں

حدیث دردِ دل کہہ لوں نیاز و ناز کی لے میں
غزل کے ردیف میں افسانۂ مہر و وفا لکھوں

قلم کی نوک پہ دہلی کے افسانے بھی آتے ہیں
کبھی یہ سوچتا ہوں لکھنؤ کا ماجرا لکھوں

جو کچھ ان سے کیا بھوپال کی زہرہ جبینوں نے
لطیف الدین احمد کی زباں میں "ابتلا" لکھوں

تشکر کی زباں پہ حرف صادق آیا جاتا ہے
بحکمِ حضرتِ احسان دانش اور کیا لکھوں

ادب کی مملکت میں اس صدی کا یہ مجدد ہے
کھلے لفظوں میں لکھوں صاف لکھوں برملا لکھوں

اب اپنی نظم سے شورش مجھے اندازہ ہوتا ہے
لکھوں تو اس طرح جذباتِ دل کی انتہا لکھوں

('چٹان'، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

دورِ کمِ آگہی

فضا ابن فیضی

یہ صیدگاہِ فکر و نظر، مقتلِ سخن
زخموں سے چور چور ہے پندارِ فکر و فن

چبھتے ہوئے حواس میں ناقدریوں کے تیر
یہ چیختے ہوئے ادب و شعر کے ضمیر

جذبوں کے رو سمٹے ہوئے زندگی کے غم
اپنی ہی موجِ خوں میں یہ ڈوبے ہوئے قلم

تیرِ جنوں، خرد کی کماں پر چڑھا ہوا
احساس و آگہی کا گریباں پھٹا ہوا

کانٹوں میں قید تازگیِ فکر کے گلاب
ظلمت میں ڈوبتا ہوا ماتھے کا ماہتاب

یہ بے چراغ علم و بصیرت کی انجمن
یہ شب گزیدہ روشنیِ طبع کی کرن

بجھتے ہوئے سے دیدہ وری کے یہ خد و خال
تلتے ہوئے غبار میں شہ پارۂ خیال

یہ سرنگوں لطافتِ وجدان کے صنم
ڈوبی ہوئی فضاں میں یہ محرابِ کیف و کم

غلطیدہ خاک میں نگہہ و فکر کا وقار
سائے میں شاخِ گل کے سلگتی ہوئی بہار

یہ رات کے گلے میں حسیں چاندنی کا ہار
یہ پیتلوں کے دیس میں سونے کا بیوپار

یہ شہر شہر عام یہ "زیاں کاریِ ادب"
بڑھتی ہوئی یہ "پستیٔ معیار" کی طلب

رشتہ بہ پایہ فکر کی قدروں کا ارتقا
یہ طوق در گلو ادب و فن کے دیوتا

یہ آگہی کا قحط یا ذوقِ نظر کا کال
ملتا ہے وقت جہل کے رخسار پر گلال

حالات ذہن و فکر کا رد کئے ہوئے بہاؤ
ہیرے کی یہ دکان یہ کنکر کا مول بھاؤ

یہ سر اٹھا کے چلتے ہوئے جہل کے امام
بکتی ہوئی متاعِ نظر کوڑیوں کے دام

نشّے میں ہیں جیشِ کم نگہی کے سبو سبو
سچائیاں ہیں خاک بسر، جھوٹ سرخرو

حسنِ صلاحیت پہ نہ خوبیٔ ذات پر
نظریں ہیں آدمی کے طلائی صفات پر

رکھتے نہیں ہیں ظرف، حریفانِ انجمن
لے لے کہیں نہ جان یہ ماحول کی گھٹن

رگ رگ سے آج پھوٹ پڑی ہے لہو کی لو
یہ کارگاہِ زیست ہے دانشوروں کی موت

فانوسِ گل، شعور کے آئینے پاش پاش
آنکھوں سے جھانکتی ہوئی احساس کی خراش

زخمی بصیرتیں یہ سسکتے ہوئے یقیں
ڈوبے ہوئے لہو میں خدایانِ انگبیں

پابندیاں ہیں سوچ پہ، پہرے شعور پر
بیٹھی ہے گردِ آئنۂ رنگ و نور پر

پوچھو نہ ہم سے ہمنفسو! راہ و رسمِ شہر
تحسینِ ناشناس کا پینا پڑا ہے زہر

فن کی ریاضتوں کا یہاں کچھ صلا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

یہ راستوں کی دھوپ یہ جلتے ہوئے قدم
اب سوچنا پڑا ہے یہ اے شوخیٔ قلم

عشووں میں آگہی کے گرفتار کیوں ہوئے
ہم لوگ ایسے دور میں فنکار کیوں ہوئے

بولتے زخم

ساقی جاوید ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

کون سمجھے کہ اسی دہر میں کتنے مہتاب
اپنی آغوش میں رکھتے ہیں لہو کے سیلاب
کتنے زم زم کے سبو زہر کے پیمانے ہیں
معبد و دیر عقائد کے "مے خانے" ہیں
کتنے ہیروں سے ٹپکتا ہے ہلاہل اب تک
کتنے شعلے ہیں دل و جاں کے مقابل اب تک
کتنے پھولوں کی تباہی ہے نظر کے آگے
کتنی صبحوں کی سیاہی ہے نظر کے آگے
موسمِ گل کے ستم سہتی ہیں کلیاں کتنی
ڈوب جاتی ہیں اسی سوچ میں گلیاں کتنی
خون پانی سے بھی سستا ہے زمیں پر اب تک
آتشیں قہر برستا ہے زمیں پر اب تک
وقت کی زلف کو ہر گام پہ بل دیتے ہیں
لوگ ہر پھول کو چٹکی سے مسل دیتے ہیں
کتنے خورشید ہیں ظلمت کے لبادوں میں ابھی
پیچ ہی پیچ ہیں تہذیب کے جادوں میں ابھی
سیل در سیل بہاروں کا لہو بہتا ہے
نقش کیا جانئے نقاش سے کیا کہتا ہے
شمع جلتی ہے تو اشکوں کا صلہ پاتی ہے
زندگی دیکھئے کس طرح جِلا پاتی ہے
کوئی سقراط جو اٹھتا ہے تو دنیا والے
سمِ قاتل کے لگا دیتے ہیں منہ سے پیالے
کوئی مریم جو مسیحا کو جنم دیتی ہے
شہر کی رسم اسے دیدۂ نم دیتی ہے
کوئی سرمد جو سوئے شہر نکل آتا ہے
اژدہا غارِ سیاست کا نگل جاتا ہے
دل کا خوں نوکِ قلم سے جو ٹپک جاتا ہے
وقت کی آنکھ میں کانٹا سا کھٹک جاتا ہے

اب تو کچھ تم ہی کہو، تم ہی بتاؤ ہم کو
لوگ کس طرح تبسم میں چھپائیں غم کو

فرعون، فرشتۂ غیبی اور ابلیس

طالب جے پوری

(دربار فرعون — ایک فرشتۂ غیبی نووارد کے بھیس میں داخل ہوتا ہے)

(آداب بجا لا کر فرعون سے مخاطب ہوتا ہے)

نووارد۔

اے جہاں کے حکمراں، اے ہم غریبوں کے خدا — سرنگوں ہیں اک اشارے پر ترے ارض و سما
ثبت ہے دُنیا کی ہر شے پر تری مہرِ جلال — کر نہیں سکتا ترے آگے کوئی چون و چرا
اک تذبذب سا ہے مجھ کو پھر بھی گستاخی معاف — چاہتا ہے راستہ دل کوئی اطمینان کا
ساتھ اپنے خوشۂ انگور اک لایا ہوں میں — اپنی قدرت سے اِسے سونے کا تو کر دے ذرا
تاکہ ہو تیری خدائی پر مجھے کامل یقیں — اور دل بھی ہو سکے میری زباں کا ہم نوا

فرعون۔ (اپنے دل میں)

اہل دنیا گو سمجھتے ہیں مجھے ذی اختیار — کہتے ہیں اکسیر سے بڑھ کر ہے میری خاک پا
ہیں یقیناً مختلف چیزیں نباتات و جماد — خوشۂ انگور ہو سونے کا یہ ممکن ہے کیا
کس طرح سونے کا کردوں خوشۂ انگور کو — سخت ہے یہ امتحاں، دشوار ہے یہ مرحلا
کِس بہانے سے اسے رخصت کروں حیراں ہوں — کس طرح ٹالوں میں اپنے سر سے آخر یہ بلا

(کچھ سوچ کر نووارد سے)

آج تو مصروف ہوں میں سلطنت کے کام میں — خوشۂ انگور کل سونے کا یہ ہو جائے گا

(نووارد جاتا ہے — ابلیس داخل ہو کر فرعون سے کہتا ہے)

ابلیس۔ کیا اسی برتے پہ تجھ کو خدائی کا غرور — تیرے دعووں کا بھرم اک آن ہی میں کھل گیا

بات کیا تھی جس نے تیرے کھو دیئے ہوش و حواس — کام لیتا عقل سے تو امر یہ مشکل نہ تھا

سرخرو ہوتا اگر تو یاد کر لیتا مجھے — اور رہ جاتا خدائی پر تری پردہ پڑا

بے خرد کیسی خدائی، بندگی ممکن نہیں — اتنی دعوے میں تعلّی، عقل ایسی نارسا

(پھر کچھ سوچ کر فرعون کو غور سے دیکھتے ہوئے)

ابلیس۔ تو نے اے فرعون! آخر یہ بھی سوچا ہے کبھی — تیرے ان دعووں کا ہوگا ایک دن انجام کیا

تجھ کو آیا ہے کبھی فرعونِ ثانی کا خیال — اور آیا تو دماغ و دل کا کیا عالم ہوا

جب ترا یہ حال ہے تو غیرتِ ربِّ جلیل — کیسے کر لے گی گوارا تیرا جھوٹا اِدّعا

فرعون۔ (خفت سے سر جھکا لیتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر فاتحانہ انداز میں)

کیوں مجھے اب مورد الزام ٹھہراتے ہیں آپ — آپ کی تعلیم کا فیضان تھا جو کچھ بھی تھا

میری اس تضحیک میں خود آپ کی توہین ہے — کیا نہیں کچھ واسطہ شاگرد سے استاد کا

کون دنیا پر کرے گا اب کسی پر اعتبار — آپ سا مشفق کرے جب طعن مجھ پر برملا

آپ کے آگے ہے کیا میری فراست کی بساط — آپ اتنا تو بتا دیجے مگر مجھ کو ذرا

آپ تو عالم بھی تھے، دانا بھی تھے، عابد بھی تھے — آپ نے آدم کے آگے کیوں نہ پھر سجدہ کیا

ابلیس۔ (حقارت سے مسکراتے ہوئے)

سن مرا انکارِ سجدہ اصل میں اک راز ہے — تو نے پوچھا ہے تو آخر رازِ دل کہنا پڑا

مجھ پہ ظاہر تھا شرف آدم کا۔ خالق نے جسے — علم اسما بخش کر منصب خلافت کا دیا

جرأت انکار کر سکتا تھا میری کیا مجال — میرا منصب حکمِ ربانی سے سرتابی نہ تھا

اس لئے سرخم کیا میں نے نہ آدم کے حضور

جانتا تھا نسل میں اس کی ہے تجھ سا بے حیا

شارق ایم۔اے

ہم رہروانِ شوق کو اس کی خبر کہاں | ہوتی ہے اپنی شام کہاں اور سحر کہاں
اے دل تجھے سکون کی دولت نصیب ہو | رہتا ہے بے قرار کوئی عمر بھر کہاں
آرائشِ جمال سے فرصت نہیں جنھیں | ان کو ہمارے حال کی شارقؔ خبر کہاں

آنکھوں آنکھوں میں دل کی کہہ جانا | وہ مرا اشک لا کے رہ جانا

عاصمؔ جے پوری

کیوں پریشاں ہوں غمِ ہستی کا قصہ چھیڑ کر | کیوں نہ گیسوئے بُتِ طنّاز کی باتیں کریں
کیوں نمودِ خارِ غم ہو مانعِ سیرِ چمن | کیوں نہ گلہائے بہارِ ناز کی باتیں کریں
طبعِ ناساز کو ہونا پڑے گا سازگار | آئیے کچھ دیر سوز و ساز کی باتیں کریں

دوش نگارِ من زمن شوخیِ چند دام کرد | رفت و بردئے من چو من یک دو قدم خرام کرد
نام مرا گرفت و گفت عاصمِ خستہ تن منم | شعر مرا سرود و هم همچو خودم کلام کرد
در دلِ بادۂ کہن کیف سر دیہ نو نہاد | نرگسِ غمزہ مست را خوگرِ ابتسام کرد
جانم ازاں نظر کہ بود حاصلِ سوز آرزو | ننگِ نشاط لبت و ہم سازِ غم دوام کرد

منظرؔ ایوبی

اُس طرف چوم چکے لوگ ستاروں کی جبیں | ہم ادھر نغمہ گرِ گیسوئے جاناں ہی رہے
اور ہوں گے کہ جنھیں موسمِ گل راس آیا | ہم تو اس زلف کی مانند پریشاں ہی رہے
ہم نے کھلنے نہ دیا تیری محبت کا بھرم | دردِ غم سہتے رہے اور غزل خواں ہی رہے

سعادت نظیر

منزلِ شوق کی بڑھ نہ جائیں کہیں اور گھٹتی ہوئی دوریاں دوستو! | رُک نہ جائیں قدم ورنہ ہو جائیں گے ہم غبارِ رہِ کارواں دوستو
میں وہی طائرِ پرشکستہ ہوں، جو تھا کبھی ایک عرش آشیاں دوستو | دیکھنا طے کروں گا کبھی ایک ہی جست میں عرصۂ دو جہاں، دوستو
مثلِ شبنم بفیضِ نگاہِ کرم ہے کم و بیش ہر سمت میرا بھرم | ہے نشیمن مرا غنچۂ گل کبھی اور مسکن کبھی آسماں دوستو
دشتِ پُرخار سے کون آشفتہ سر آبلہ پا گیا ہے کہ یہ گل کھلے | تا بہ حدِ نظر اب ہے پھولوں کا بن یا چمن در چمن گلستاں دوستو
ہر تمنا سعادت کی جب کٹ گئی، زندگی ایک احساسِ غم ہو گئی | خوں نہ رونا پڑے تم کو سن کر کہیں اس کی حسرت بھری داستاں دوستو

مطبوعات موصولہ

ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم

از۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
پبلشرز۔ ڈائریکٹو پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی۔
قیمت:۔ ایک روپیہ پچیس پیسے۔

یہ کتاب برصغیر کے ممتاز تعلیمی مفکر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ان تین لکچروں پر مشتمل ہے جو ۱۹۵۸ء میں "پٹیل میموریل" کی سالانہ تقریب کے موقع پر انگریزی میں دیئے گئے تھے اور جنھیں بعد میں ڈاکٹر عابد حسین نے اردو میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین تہذیبی و تعلیمی مسائل کے حل میں غیر معمولی درک و انہماک رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے برصغیر کی شاید ہی کوئی ملی و سماجی تحریک ہو جو اُن کے خیالات و افکار سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ آزادی کے بعد قومی نظام تعلیم کو نئی شکل دینے اور اس میں ایک فعال روح دوڑانے میں ان کے ان تعلیمی خطبات کو بڑا دخل ہے جو جامعہ تعلیم ملی کے ذریعے بہت پہلے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے خطبات میں تعلیم کے نظری مسائل پر ایسی فلسفیانہ بحث کہیں نہیں ملتی جس کا سرا ہمارے ہاتھ نہ آسکے۔ وہ ہمیشہ اس کے لائحہ عمل اور حصول مقاصد کے ذرائع کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے ہیں وہ تعلیم کی اصل غایت، اشاعت اور مدارج پر حکیمانہ نظر ڈالتے ہیں لیکن اس کی عملی صورتوں کو کسی جگہ بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر خصوصاً "ہندوستان" کے تعلیمی ڈھانچے میں جتنا حصہ اُن کی تجویزوں اور تحریکوں کا ہے کسی اور کا نہیں ہے۔

آج جو لوگ قومی نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو کے نام سے محض تعلیمی اوقات و نصاب کی تبدیلی و ترمیم ہی پر سارا زور صرف کر رہے ہیں انھیں ذاکر حسین کا یہ قول نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ:۔

> "تعلیم کی از سرِ نو تعمیر کا عظیم الشان مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ رفع الوقتی کے لئے جزوی انتظامات میں کچھ الٹ پھیر کر دی کسی منزل میں ایک سال بڑھا دیا کسی میں گھٹا دیا۔ کہیں ایک آدھ مضمون کا اضافہ کر دیا۔ بری درسی کتابوں کو نکال کر اگر مل سکیں تو ان سے بہتر نصاب میں رکھ دیں۔ اسکول وہی رہے نام بدل دیا۔ اور نہ وہ اسکی حل ہو سکتا ہے کہ تعلیم کے دائرے کو بڑھاتے چلے گئے۔ بغیر اس کے اغراض و مقاصد کو اچھی طرح سمجھے اور بغیر اس کا لحاظ رکھے کہ وسائل اور مقاصد میں پوری طرح مطابقت ہو۔"

غرض کہ ذاکر حسین کے تعلیمی خطبات برصغیر کی تعلیمی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور چونکہ ان کا انداز بیان مدلل ہونے کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور دل کشی کا بھی حامل ہے اس لئے ادبی حیثیت سے بھی انھیں امتیازی مقام حاصل ہو گیا ہے۔

برگِ نوخیز | عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ ہے۔ سانٹ فنی اور معنوی حیثیت سے مغرب کی ایسی صنف سخن ہے جو مصرعوں کی معین تعداد اور وزن و قافیہ کے مخصوص نظام کی بنا پر مشرقی مذاقِ سخن سے گہری مناسبت رکھتی ہے۔ سانٹ کا فنی نظام بڑی حد تک اردو فارسی رباعی سے مماثل ہے۔ رباعی کی طرح سانٹ کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس میں وزن قافیہ اور مصرعوں کی معین تعداد سے انحراف نہ کیا جائے۔ فرق یہ ہے کہ سانٹ میں چودہ مصرعوں کی قید ہے اور رباعی میں چار کی۔ ورنہ دونوں میں پوری بات ایک خاص اہتمام سے کہی جاتی ہے اس طرح کہ ابتدائی مصرعوں میں خیال کو روشناس کرایا جائے آگے چلکر موضوع کے خدوخال کچھ اور نمایاں کئے جائیں اور آخری مصرعوں میں مکمل خیال کو ایسی برجستگی اور شدت سے سامنے لایا جائے کہ سننے والا ایک خاص سرور کیف کے ساتھ نفس مضمون کو ذہن میں محفوظ کر سکے۔ سانٹ کی یہ پابندیاں اسے خاصا مشکل بنا دیتی ہیں اور جب تک کوئی شاعر کسی وسیع خیال کو مجملاً بیان کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو وہ سانٹ نگاری کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔

ہر چند کہ اردو سانٹ کی ابتدا کرنے والے احمد میاں اختر جونا گڑھی اور ن م راشد ہیں اور اس پر طبع آزمائی کرنے والوں میں اکثر نئے شعرا شامل ہیں لیکن اسے کامیابی اور خصوصیت سے برتنے والے چند ایک سے زیادہ نہیں ہیں، ان میں عزیز تمنائی اور عابد رضوی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ عابد رضوی کے سانٹ مختلف رسائل میں نظر آتے ہیں۔ عزیز تمنائی کے سانٹوں کا مجموعہ "برگ نوخیز" اردو سانٹ کے اولین مجموعہ کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس مجموعے میں ۱۰۹ سانٹ شامل ہیں اور چونکہ ان میں موضوع کی رنگارنگی کے ساتھ وہ محاسن بھی نظر آتے ہیں جو سانٹ کے انداز بیان اور فنی نظام کے لئے مخصوص ہیں اس لئے یقیناً یہ مجموعہ قبول عام حاصل کرے گا اور عزیز تمنائی کے نام کو اردو سانٹ نگاری کی تاریخ میں سرفہرست رکھے گا۔

کتاب سفید کاغذ پر ٹائپ میں خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ سرورق خوبصورت ہے اور کتاب دو روپے بچاس پیسے میں دارالتصنیف مدراس ۲ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

آفتابِ ہجویر | از پیام شاہجہاں پوری
ناشر ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور
قیمت دو روپیہ

"آفتاب ہجویر" برصغیر کے مشہور روحانی پیشوا سید ابوالحسن علی ہجویری کی سیرت و سوانح کا مرقع ہے۔ حضرت علی ہجویری عہد غزنوی کے ان باکمال صوفیا میں سے ہیں جن کا حلقۂ اثر پاک و ہند سے لیکر افغانستان و ایران تک پھیلا ہوا تھا۔ تصوف کی مشہور ترین کتاب "کشف المحجوب" جو برصغیر کے نظام روحانی کے قیام و استحکام میں

تھی۔ پیام شاہجہان پوری نے " آفتابِ ہجویرؒ " کے ذریعہ اس کمی کو پورا کر دیا۔

اس کتاب میں مؤلف نے صرف حضرت علی ہجویری کے حالات و سوانح جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے افکار و نظریات پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ ان کے اوصاف و کمالات، اذکار و اشغال اور تصانیف و پیغامات سب پر ایسی مشرح بحث کی گئی ہے کہ ایک طرف یہ کتاب حضرت ہجویری کی زندگی و شخصیت سے روشناس کراتی ہے تو دوسری طرف تصوف کے رموز و علائم کو علمی طور پر سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ نہ صرف حلقۂ صوفیا میں، علمی و ادبی حلقے میں بھی اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

راز — راز یزدانی " جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے دل دکھتا ہے، رام پور کے علمی و ادبی حلقے کے ان بزرگوں میں تھے جو سخن گوئی کے ساتھ ادبی تحقیق و تنقید کا بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ اُردو کے تقریباً سارے معتبر ناقدین سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت اُردو ادب کے عام قارئین تک ابھی نہیں پہنچی۔ حامد رضا بیدار صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ان کی وفات کے فوراً بعد ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب " راز " کے نام سے مرتب کر کے نیا خواب رامپور کے زیر اہتمام شائع کر دیا۔ یہ انتخاب راز یزدانی کے نام کو حلقۂ خاص سے باہر دربارِ عام تک لے جائے گا۔ اور ان کے کلام کو قبولیت بخشے گا۔

یہ انتخاب ۵۰ پیسے میں نیا خواب رامپور سے مل سکتا ہے۔

انتظام کتب خانہ — شیخ محبوب قریشی کی تالیف ہے۔ اس میں مؤلف نے کتب خانے کی ترتیب و تنظیم اور کتابوں کی فنی تقسیم پر گفتگو کی ہے۔ انگریزی میں تو اس موضوع پر بے شمار کتابیں ہیں لیکن اردو میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس کتابچے سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ انگریزی سے ناواقفیت کی بنا پر ترتیب کتب خانہ کے جدید اصول سے آشنا نہیں ہو سکتے وہ اس کتاب کی مدد سے کتب خانوں کو ایک خاص قرینہ سے مرتب کر سکیں گے۔

کتاب محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدر آباد کالونی کراچی ۵ سے ایک روپیہ پچاس پیسے میں مل سکتی ہے۔

نادرات — حضرت جگر کے شاگردِ خاص جناب بشیر درانی کا مجموعۂ کلام ہے۔ آغازِ کلام سے پہلے مولوی امیر الدین خاں رامپوری، رئیس امروہوی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی تقریظیں ہیں جن میں شبیر درانی کی شخصیت اور شاعری کا تعارف کرایا گیا ہے۔ شبیر درانی جیسا کہ اس مجموعہ کے سرورق پر درج ہے حضرت جگر کے جانشین ہیں۔ اُن کا رنگِ سخن بھی اُستاد کے رنگ سے بہت ملتا ہے۔ اس لئے اس کا عام و خاص دونوں میں پسند کیا جانا لازمی ہے۔

یہ مجموعۂ کلام جو ایک کتابچہ کی صورت میں ہے دو روپیہ میں مغربی پاکستان کے ہر شہر سے مل سکتا ہے۔

محبت — شبیر الحسن ایم۔ اے (علیگ) کی تالیف ہے جسمیں انھوں نے " محبت کیا ہے؟ " کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ کوشش حکیمانہ نہیں شاعرانہ ہے۔ انھوں نے منطقی موشگافیوں کے ساتھ اس بحث کو نہیں چھیڑا بلکہ صرف شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس کے پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی کی ہے خصوصاً اردو و فارسی کے شعراء نے محبت کے باب میں جو کچھ کہا ہے اسے نہ صرف یہ کہ یکجا کر دیا گیا ہے بلکہ حسب مقدور اس کی توضیح و تشریح بھی کی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب محبت سے متعلق اشعار کی شرح یا " لغاتِ محبت " کی دلآویز فرہنگ ہے جسے مؤلف نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ کتاب کا موضوع چونکہ عام و خاص دونوں کی

دلچسپی کا سامان رکھتا ہے اس لئے ضرور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔
کتاب دو روپیہ میں مقبول پبلشنگ ہاؤس نورانی مارکیٹ پی ای سی ایچ ایس یا لیاقت آباد کراچی سے مل سکتی ہے۔

حیات امام ابن القیم

مصنف عبدالعزیز شرف الدین۔
مترجم سید رشید احمد ارشد استاد شعبۂ عربی کراچی یونیورسٹی

مصنف نے اصل کتاب میں آٹھویں صدی ہجری کے روشن خیال اسلامی مفکر امام ابن قیم کی نجی زندگی۔ تعلیم و تربیت افکار و خیالات، معتقدات و تجددات اور تالیفات و تصنیفات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس طور پر کہ امام ابن القیم کی زندگی و فکر کا کوئی پہلو تشنۂ تحقیق نہیں رہا۔ رشید احمد ارشد نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔
ترجمہ کا کام بظاہر جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کسی مصنف کے افکار و خیالات کو جبکہ ان کا تعلق علم و فن کی فلسفیانہ موشگافی اور باریک بینی سے ہو۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا اور پوری معنویت و تاثیر کے ساتھ منتقل کرنا آسان نہیں بلکہ غالب کے اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی کہ دشوار بھی نہیں

اگر افکار و خیالات کو کسی طور پر منتقل بھی کر دیا جائے تو اصل زبان اور مصنف کا وہ لب و لہجہ اور اسلوب جو اصل کا حسن و اثر کا ضامن ہے۔ ترجمہ کی گرفت میں نہیں آتا۔ اور جب تک اصل کتاب کا یہ داخلی پہلو ترجمہ میں حتی الوسع نمایاں نہ ہو ترجمہ بے معنی رہتا ہے۔ اس میں کامیابی کے لئے مترجم کو بڑے غور و فکر اور محنت سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایک لفظ کی تلاش اور جملوں کی ساخت کے لئے وہ گھنٹوں سر کھپاتا ہے۔ محاورات و استعارات کے بامعنی اور شگفتہ ترجمہ کے لئے کئی کئی دن جستجو کرتا رہتا ہے۔ جب کہیں کوئی ترجمہ اصل کو منہ دکھانے کے لائق ہوتا ہے۔ رشید احمد ارشد نے ترجمے سے ان کی تلاش اور محنت دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ پانچسو سے زاید صفحات پر مشتمل عربی کتاب کو انھوں نے نہایت آسان، بامحاورہ اور موثر انداز میں اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مقدمہ میں مصنف اور کتاب کے موضوع دونوں کا تعارف کرایا ہے۔ یہ تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے۔
کتاب مجلد ہے اور بارہ روپیہ میں نفیس اکیڈمی بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱ سے مل سکتی ہے۔

جامعہ دہلی

(جائزہ نمبر)

اُردو کے ماہناموں میں "جائزہ دہلی" جسے ان دنوں عبداللطیف اعظمی مرتب کرتے ہیں۔ علم و ادب کی گراں قدر روایات کا حامل ہے اور زیر نظر شمارہ اسی روایت کا ایک نشان ہے جس میں ۱۹۶۲ء کی اردو مطبوعات، اداروں، رجحانات اور علمی و ادبی کام کی رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں سب سے اہم اور طویل مقالہ جو تقریباً نصف شمارہ پر مشتمل ہے انیس خورشید صدر شعبہ لائبریری سائنس کراچی یونیورسٹی کا ہے جس میں پاکستان میں شائع ہونے والی تین سو کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے اس جائزہ میں ظاہر ہے تفصیل کی گنجائش نہ تھی پھر بھی ہر کتاب کی نوعیت و خصوصیت پر اجمالاً جو کچھ لکھا گیا صرف یہی نہیں کہ اس سے صاحب مضمون کی وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، محنت اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ کتابوں کی اشاعتی رفتار اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ رسالہ کے باقی نصف میں زیادہ تحریریں عبداللطیف اعظمی کی ہیں۔ اعظمی صاحب نے "تحقیق ادب" ہندوستان کے تصنیفی ادارے اور ۱۹۶۲ء کی مطبوعات پر سرسری نظر

عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ صد درجہ افادی ہے ۔ "وفیات" کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں وفات پانے والے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کر کے انھوں نے اس پرچے کو اور بھی تاریخی بنا دیا ہے ۔ چند صفحوں میں دو تین مختصر مضامین اور بھی ہیں لیکن وہ چنداں اہم نہیں ہیں ۔

رسالہ ایک روپیہ میں جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

گنجینۂ گوہر

شاہد احمد دہلوی کے ادبی خاکوں کا مجموعہ ہے ۔ اردو میں خاکہ نگاری کا فن بہت پرانا نہیں ہے ۔ اس کی قدامت کو زیادہ سے زیادہ حالی اور شبلی کے آخری دور تک لے جاسکتے ہیں اس کی صنفی صورت کا احساس ہمیں دراصل مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے بعد ہوا ہے ۔ خاکہ نگاری کو بعض شعری اصناف کی طرح کسی منضبط اصول یا ہیئت کے گھیرے میں لا کر دیکھنا دکھانا تو سردست بہت مشکل ہے ۔ پھر بھی بعض اچھے خاکوں کی مدد سے کہہ سکتے ہیں کہ موضوع سے گہری اور ذاتی واقفیت ، زندگی کے جزئیاتی مشاہدہ تیز حافظہ ، حقیقی سوانحی مواد اور بے تکلف انداز بیان کے بغیر خاکہ وجود میں نہیں آتا ۔ ان رنگوں میں سوانحی صداقت اور دلکش اسلوب کو خاکہ پر ہر جگہ حاوی رہنا ضروری ہے ورنہ خاکہ بھی عموماً سوانح یا تاریخ نگاری کا خشک مضمون بن کر رہ جاتا ہے شاہد احمد دہلوی چونکہ فنِ خاکہ نگاری کی نزاکتوں کے احساس کے ساتھ سادہ و پرکار نثر نگار بھی ہیں اس لئے ان کے اکثر خاکے کامیاب اور جاندار ہیں ۔ زیرِ نظر کتاب میں ڈپٹی نذیر احمد اور میر ناصر علی سے لیکر استاد بندو خاں اور شاہد احمد دہلوی تک کوئی اٹھارہ خاکے ہیں . . . . جو سوانح ، تاریخ اور ادب تینوں کے مطالعہ کا لطف دیتے ہیں ۔

قیمت :- چھ روپے ۔ ملنے کا پتہ :- مشتاق بکڈپو ۔ شکاڈن روڈ کراچی ۱

بنگلہ اردو ٹیچر معہ گرامر

از مولانا قاضی شہاب الدین ۔

ناشر باب الاشاعت رابسن روڈ ۔ کراچی ۔ قیمت دو روپیہ پچاس پیسہ

اردو اور بنگلہ دونوں پاکستان کی قومی زبانیں ہیں اور ان دونوں سے واقفیت کے بغیر پاکستانی شہریوں ہم خیالی اور فکری یگانگت پیدا نہیں ہوسکتی جو پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لئے ضروری ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک کوئی ایسا عملی قدم کسی طرف سے نہیں اٹھایا گیا جس سے مشرقی پاکستان میں اردو اور مغربی پاکستان میں بنگلہ کو رواج دیا جاسکے نتیجۃً ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں سے دور اور یکجہتی سے محروم ہوتے جارہے ہیں ۔ حکومت اور عوام دونوں کو اسطرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ حکومت کی سطح پر نہ سہی ، نجی طور پر تو ہم اردو اور بنگلہ سے بہر طور واقف ہوسکتے ہیں لیکن اس کے لئے بنگلہ اور اردو کی ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں درکار ہیں جو دونوں زبانوں کے مماثل و مشابہ پہلوؤں اور تدریس زبان کے نئے اصولوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہوں ۔ قاضی شہاب الدین کی کتاب اسی نوع کی ہے ۔ انھوں نے اردو خواں طبقہ کے لئے بنگلہ تک رسائی کی راہ دکھادی ہے اور یہ راہ کچھ ایسی آسان ، سیدھی اور دلچسپ ہے کہ جو اس پر چلے گا منزل تک بہر صورت پہنچے گا ۔

...ردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ نے اس سلسلے کے زیر عنوان اردو کے ممتاز و مشہور شعرا کا انتخاب شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس وقت ...مارے پیش نظر تین انتخابات ہیں۔

۱ - اصغر گونڈوی
۲ - الم مظفر نگری
۳ - کیفی چریاکوٹی

ہر انتخاب ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور کتابچہ کی صورت میں سفید کاغذ پر عمدہ کتابت کے ساتھ شائع ...یا گیا ہے۔ امید کہ یہ انتخاب شعرا کو عام و خاص سے متعارف کرانے اور اردو کو مقبول عام بنانے میں مدد ...ے گا۔ ہر انتخاب کی قیمت ۵۰ پیسے ہے۔

...بچوں کے ادب کی خصوصیات

از مشیر فاطمہ
ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ۔ قیمت ایک روپیہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ۸۰ صفحات کی یہ کتاب بچوں کے ادب کی نوعیت اور اس کی کیفیت و کمیت ...سے بحث کرتی ہے۔ ادیب یا شاعر یقیناً قدرت کی طرف سے جوہر خاص لے کر آتا ہے لیکن اس جوہر کو بروئے کار ...لانے کے لئے اکتساب، رہنمائی اور تربیت کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ آج جبکہ مادی زندگی سے ...ہم زیادہ سے زیادہ قریب اور جمالیاتی یا ادبی قدروں سے زیادہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بات ...کی شدید ضرورت ہے کہ ادبی ذہن و ذوق کی تہذیب و تربیت پر سائنٹفک طور پر غور کیا جائے۔ مشیر فاطمہ نے ...یہی کیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کے تعلیمی و تدریسی مسائل کو ذہن میں رکھ کر بتایا ہے کہ بچوں کے نصاب ...میں ادب کے معیار و مقدار کا تعین کس طرح کرنا چاہئے۔

میٹھی اور کھاری جھیل

سانبھر جھیل (جے پور) ۹۰ مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے جو سال کے آٹھ مہینوں میں (اکتوبر تا مئی) اس درجہ کھاری رہتی ہے کہ اس سے دو لاکھ ٹن نمک تیار کیا جاسکتا ہے لیکن برسات شروع ہوتے ہی اس کا کھاری پن غائب ہو جاتا ہے اور وہ یکسر شیریں ہو جاتی ہے۔
اس کی وجہ معلوم نہ ہوسکی کہ اس کا پانی کھاری سے شیریں کیسے ہو جاتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ۲۳۴۲

نگار پاکستان کا خاص شمارہ

مصحفی نمبر

جس میں اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش و جائے ولادت کی تحقیق، انکی ابتدائی تعلیم و تربیت، انکی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقار انکی تالیف و تصانیف، انکی غزل گوئی و مثنوی نگاری۔ ان کے معاصر شعراء و ادباء اور انکے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اسمیں مولانا نیاز فتحپوری کے متعدد مقالوں کے علاوہ دوسرے معروف نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ غرض مصحفی کی تذکرہ نگاری شخصیت اور شاعری کے متعلق سارے مباحث اس خاص نمبر میں اس قدر حسن و ترتیب و مورخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ مصحفی کو سمجھنے کیلئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قیمت تین روپے 3/-

ادارۂ ادب عالیہ۔ کراچی۔ ۱۸

ONE RUPEE

دسمبر ۱۹۶۳ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

جس کی دُنیا بھر میں سُنی جانے والی آواز ....
۱۲۸ ممالک میں لاکھوں کے لئے وجہ طرب وانبساط ہے
گرنڈگ
آل ٹرانسسٹر ریڈیو ماڈل ٹرانسونیٹ (۷۹)
سیّد بھائیز لمیٹڈ

لیکٹوجن کی بدولت...

تندرست بچے
مطمئن مائیں

لیکٹوجن دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ پوری بالائی والے دودھ سے بنائی ہوئی بچوں کی غذا ہے۔ جس میں فولاد اور کئی ضروری وٹامن شامل کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لیکٹوجن کے استعمال سے ننھے منے بچے ہنسی خوشی پروان چڑھتے ہیں اور مائیں مطمئن رہتی ہیں۔

ماں کا دودھ چھوٹ جانے پر لیکٹوجن ہی دیجئے۔ یہ بچے کی تندرستی کی ضمانت ہے۔

(وٹامن اے، بی ۱، بی ۲، پی پی، بی ۶، کیلشیم پنٹوتھینیٹ، بی ۱۲، سی، ڈی اور فولاد)

جب ماں کا دودھ کارگر نہ ہو تو لیکٹوجن پر بھروسہ کیجئے

'The Lactogen Mother Book' ۸۸ صفحات کی یہ باتصویر کتاب مفت حاصل کرنے کے لئے اس کوپن کو پُر کیجئے اور ڈاک خرچ کے لئے پچیس پیسے کے ٹکٹوں کے ہمراہ اس پتہ پر روانہ کیجئے۔

نام ....

پتہ ....

....

نیسلز پروڈکٹس پوسٹ بکس ۴۹۶۴ ۱۵۔ ویسٹ وارف روڈ۔ کراچی

LACJ 63

رجسٹرڈ نمبر [illegible]

ٹیلیفون نمبر ۲۳۶۹۳

دسمبر ۱۹۶۳ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ

نیاز فتحپوری

نائب مدیران

فرمان فتحپوری

عارف نیازی

چندہ سالانہ

دس روپے

قیمت فی پرچہ

پچھتر پیسے

نگار پاکستان - ۳۲ گارڈن مارکیٹ - کراچی

منظور شدہ برائے مدارس کراچی - بموجب سرکلر نمبر ڈی/ایف یو ۱ - بی ۳۶۶۹ - ۶۸ محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر و پبلشر ایم عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا۔ کتابت عالم علی خاں

ماہنامہ نگار پاکستان

فہرست

۴۲واں سال | فہرست مضامین دسمبر ۱۹۶۲ء | شمارہ ۱۲

نگارِ پاکستان ۶۴ء کا سالنامہ

تذکروں کا تذکرہ

(نمبر ہوگا)

اور اردو زبان وادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کرے گا کہ:-

(۱) تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے ؟
(۲) اس کی امتیازی روایات وخصوصیات کیا رہی ہیں ؟
(۳) تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ؟
(۴) اُردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ؟
(۵) ان تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے ؟
(۶) ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ؟
(۷) ان سے کسی خاص عہد کی ادبی وسماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے ؟
(۸) ان تذکروں میں اردو فارسی زبان وادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے ؟
(۹) یہ خزانہ ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے ؟

ضخامت ـــــــ تقریباً ۵۰۲ صفحات

قیمت ـــــــ [illegible] روپے

ماہنامہ نگار پاکستان

فہرست

۴۴واں سال | فہرست مضامین دسمبر ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۲

ملاحظات

(ادارۂ فکر و نظر سے خطاب)

نیاز فتحپوری

کل ۵ دسمبر کو فرمان صاحب نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ آرٹس کونسل میں مجھے کوئی تقریر کرنا ہے۔ میں نے پوچھا یہ خبر مہمل آپ نے کہاں سنی، تو انھوں نے "مارننگ نیوز" کا حوالہ دیا۔ میں نے کہا یہ خبر بالکل غلط ہے۔ لیکن چونکہ میں نے اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا تھا۔ اس لئے وہ واقعی صحیح ہو کر رہ گئی اور شام کو عالیہ امام کا ایک مطبوعہ کارڈ میرے پاس سے کر آئیں جس میں درج تھا کہ "آج یعنی ۲۳ نومبر کو شاعر انقلاب جوش صاحب کی صدارت میں نیاز فتحپوری اپنی زندگی اور فن پر روشنی ڈالیں گے" چونکہ ڈاکٹر عالیہ امام کے نام کے ساتھ "معتمد ادارۂ فکر و نظر" بھی درج تھا۔ اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس تقریب کا ذمہ دار یہ ادارہ بلکہ خود ڈاکٹر عالیہ کی ذات ہے، کیونکہ دنیا میں اس طرح کے (STUNTS) یا نمائی حوادث ہمیشہ عورت ہی کی طرف سے ظہور میں آتے ہیں اور اپنے عورت ہونے کی حیثیت سے اسے اعتماد ہوتا ہے کہ گیارہ بجے گھنٹے نہیں اگر بارہ بجے اس گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی وہ یہ دعوے کر بیٹھے کہ آفتاب اب طلوع ہوا ہے تو لوگوں کو ان کے صحیح باور کر لینے کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہ ہوگا۔ وقت مرد پر گزرتا ہے عورت پر نہیں وہ خود وقت سے گزرتی ہے اور اسے کبھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے کبھی اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجھے اس جلسے کی انعقاد کا علم کل شام کو ہوا اور اگر اس سے قبل وہ عالیہ کے ذہن میں تھا تو انھوں نے مجھے بے خبر رکھا۔ غالباً اس لئے کہ معاملہ محض حسن و حسن ظن کا تھا مجھ کسی اور کو آزمانے کا نہ تھا۔

بہر حال اس تمہید سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس تقریب کے سلسلے میں انھوں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے اس کا تعلق صرف ڈاکٹر عالیہ کی ذات سے ہے۔ کیونکہ وہ اس ادارے کی خلاق ہیں یا پھر حضرت جوش سے کہ اگر آپ نہیں یا عالیہ کوئی بھی نہ ہو تو وہ اپنی ذات سے ایک مستقل انجمن ہیں۔

اس مکار ذکر فقرہ کو جس میں اپنے فن اور اپنی زندگی پر روشنی ڈالوں گا اسے تو آپ بالکل نظر انداز کر دیجئے کیونکہ ادارۂ فکر و نظر کی کسی تقریب میں اس کا کوئی موقع نہیں کہ میں اپنی زندگی پر روشنی ڈالوں جو یکسر قاطع فکر و نظر ہے اور اگر ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ میں اس کا اظہار کروں۔ کوئی ایک چیز تو میری شہرت میں رہنے دیجئے۔ اقرار نہیں تو انکار ہی سہی۔ اب رہا میرا فن سو فن تو یہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے مجھ سا بے فن آدمی کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر ہو بھی تو یہ کیا ضرور ہے کہ ایک "مئے بیزار شیوہ" اپنی رسوائیوں کا اعتراف بھی کرے یا اگر وہ معذرت کرے تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

• ایک صنم بسجدہ وہ ناصیہ مشترک نخواست۔

[illegible] ۔ میری زندگی، زندگی کیا۔ اہتمام زندگی بھی ہمیشہ ہی شکوہ و شکایت میں گزر گئی کہ "ہم کار کشت ماما" لیکن دہقان ازل سے تو بیشک مجھے اس کا معقول جواب ملا لیکن جو اس کے شکی کاشتکار یا مستاجر ہیں انھوں نے تو خیر قسم ہی کھائی ہے کہ وہ کوئی بات خدا لگتی نہ کہیں گے۔
بہر حال وہ میری زندگی ہو یا میرا فن ۔ یہ دونوں ایک ہی چیز اور دونوں غارت و برباد۔ سعدی کا شعر ہے ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بہ میرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

باور کیجئے میں بھی اسی مرض کا مریض ہوں اور یہ آپ جانتے ہیں کہ یہ مرض جاتا نہیں ۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ بات کچھ تصوف کی طرف چلی گئی اور میرا یہ کہنا غالباً بالکل ویسا ہی ہے جیسے خسرو نے کہا ہے ؎

غمزۂ تو بردل سلطاں زند
ور نہ رگیِ بردل درویش ہم

لیکن کیا کروں میرے دل کو اگر تسکین ہوتی ہے تو ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے ۔ مسلمانوں کی غالب جماعت مجھے کافر و ملحد سمجھتی ہے ۔ مرتد و بے دین خیال کرتی ہے اور اس کا بہترین جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ؎

گفتہ بودی ہمہ زرقند و فریب رند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

یعنی میں ایسا تو نہیں ہوں لیکن اگر آپ ایسا فرماتے ہیں تو خیر میں ایسا ہی ہوں گا ۔ یہ تو ہوئی صلح و آشتی کی بات لیکن اگر میں معارضانہ گفتگو میں آجاؤں تو بہت کچھ کہہ سکتا ہوں ۔ معلوم نہیں غلط یا صحیح ۔ لیکن میں یہی سمجھتا ہوں کہ خدا نے دو قسم کے آدمی پیدا کئے ہیں ایک احمق اور دوسرے ذی عقل اور ان کی پہچان کے لئے اس نے مذہب پیدا کر دیا "تاکہ ان دونوں جماعتوں کی پہچان ہو سکے ۔ اسی حقیقت کو زردشت نے اہرمن و یزداں سے تعبیر کیا اور اسلام نے روایت و درایت سے ۔ پھر اس کو میری بد قسمتی کہئے یا خوش قسمتی کہ میری تعلیم کا آغاز ہی اس ماحول میں ہوا جو اہرمن و روایت کا متبع تھا اور میرا یزداں کبھی اس سے متفق نہ ہو سکا ۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اصل چیز روایت ہے ۔ یہانتک کہ مادئین کی جس کتاب کے جاننے سے سب سے زیادہ خاک اڑ جائے وہ سب سے زیادہ قابل قبول ہے اور اس کے خلاف درایت سے کام لینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ۔ گویا عقل کا وہ ذخیرہ جو خدا نے ازل میں پیدا کیا تھا وہ زیادہ سے زیادہ آٹھویں دسویں ہجری تک بٹ بٹا کر ختم ہو گیا اور اب کسی کو مدعی عقل ہونے کا حق حاصل نہیں ہے ۔ اگر ان کا یہ خیال صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ روایت صرف ڈھکوسلا تھا اور خدا نے جنت صرف انھیں کے لئے پیدا کی ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اہل الجنت بلہ۔ بلہ کے معنی احمق و بیوقوف کے ہیں ۔ یعنی اس شخص کے جو زیادہ مین میکھ نہیں نکالتا ، روایات پر آمنا و صدقنا کہہ دیتا ہے خواہ وہ درایتاً کتنی ہی لغو کیوں نہ ہو ۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ میں پیدا تو ہوا اسی ماحول میں جو یکسر روایتی تھا ۔ لیکن میری فطرت تھی یکسر درایت پسند ۔ اس لئے میں اپنے اساتذہ کے لئے عذاب جان بن کر رہ گیا ۔ وقت تو ضائع ہو گا لیکن روایت [illegible] ضرور سن لیجئے ۔

جب عقاب (چیل) ضعیف و سالخوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں اتنی بلندی تک

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور پھر جوان ہو جاتی ہے :

یہ طلسم ہوشربا کا کوئی ٹکڑا ہے، دیوانہ و فاتر کی گپ بلکہ بیان ہے علامہ قزوینی کا کہ قزوینی ؟ جوالات عربی کے نقادوں سے تھے اور جو خلیفہ المستعصم باللہ کے عہد میں واسط اور حلّہ کے قاضی تھے۔ ایسی ہی ایک تحقیق اور ملاحظہ ہو۔

ملا • جب چیل ضعیف و کمزور ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اپنی پیٹھ پر لاد کر ہندوستان کے ایک چشمہ تک لے جاتے ہیں اس میں غوطہ لگاتے ہیں اور چیل پھر جوان ہو جاتی ہے۔

ملا • گدھ چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل گدھ کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہوتی ہیں۔ وہ دوسری چڑیوں کے نر سے مل کر انڈے دیتی ہیں۔ لیکن صرف تین۔ دو انڈے وہ خود سیتی ہیں۔ تیسرا انڈا پھینک دیتی ہیں جسے ایک اور طائر "کاسر العظام" (ہڈی توڑ) اٹھا لاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے —— چیل ہندوستان سے ایک پتھر اپنے گھونسلے میں لاکر رکھ دیتی ہے تاکہ انڈا دینے میں آسانی ہو۔ یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے۔ (جسے سنگ پارس بھی کہتے ہیں)

یہ بھی نہ کسی دیوانہ کی بڑ ہے۔ نہ خواب پریشاں بلکہ تحقیق ہے علامہ دمیری کی۔ کون دمیری ؟ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مفسر، محدث، فقیہ اور جامع ازہر قاہرہ میں ادب و فلسفہ کے استاد ! "کارطفلاں تمام کرنے والے پروفیسر!! یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء سلف کے جن میں صرف دو کا میں نے ذکر کیا ہے، ورنہ یوں تو وہ بیشمار ہیں۔ خیر یہ باتیں تو صرف طبیعیات حیوانی سے متعلق ہیں۔ جن کے انکار سے ایک شخص کافر نہیں ہوتا اور ممکن ہے ہمارے علماء عہد حاضر بھی اس کو صحیح نہ سمجھیں۔ لیکن جب اس سے آگے سوال، کرامات، خرق عادات و معجزات کا آتا ہے تو پھر "سوچ سمجھ کر" کی شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہیں سے دو راستے پیدا ہو جاتے ہیں، ایک بقول کسی شاعر کے مکہ کا اور دوسرا ترکستان کا ! یعنی جس وقت یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ فلاں بزرگ نے کنوئیں میں گر جانے والی بھینس کو صرف ہاتھ کے اشارے سے دفعتاً باہر نکال لیا۔ یا یہ کہ ایک ولی اللہ کوئی غرق شدہ بارات پوری کی پوری دریا سے زندہ باہر نکال لائے یا یہ کہ کسی بزرگ کا جسم، کثرت ریاضت سے اتنا لطیف ہو گیا تھا کہ پٹکا ان کی کمر سے آر پار ہو جاتا تھا "یعنی ہے کیا جو کس کے باندھئے" تو پھر انکار ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بیان تذکرۃ الاولیاء "سیر الاولیاء" کرامات غوثیہ کا ہے اور ان کی تکذیب ذرا خطرناک بات ہے۔ اس کے بعد تیسری منزل "مذہبی مابعد الطبیعیات" کی آتی ہے۔ اور یہ اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ پھر کسی کو یقین آئے یا نہ آئے۔ لیکن چونکہ بیان مفسر "بحر الدرر" کا ہے اس لئے ماننا ہی پڑتا ہے کہ حضرت اسرافیل کا سر اگر ایک طرف آسمان کو چھوتا ہے تو دوسری طرف پاؤں زمین کے اندر تحت الثریٰ پر قائم ہیں اور حسب تحقیق حدائق الحقائق اس کو بھی حقیقت ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر جناب اسرافیل کے سر پر تمام دریاؤں اور سمندروں کا پانی انڈیل دیا جائے تو ایک قطرہ زمین پر نہ گرے۔ اسی طرح حسب بیان "شفاء النصائح" یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ بعض فرشتوں کی جسامت اتنی بڑی ہے کہ اگر ان کے ایک بازو سے دوسرے بازو تک پہنچنا چاہیں تو یہ مسافت تین سو سال سے کم میں طے نہیں ہو سکتی اور گردن سے کان تک کا فاصلہ ۷۰۰ میل

[illegible] آنی کی منزل پر جب
[illegible] کو انھیں عجائب سے گزرنا پڑے گا۔ یہ تو آپ نے قرآن مجید میں پڑھا ہی ہوگا کہ جب حضرت
سلیمان وادی نمل سے گزرنے تو وہاں ان کی دعوت ہوئی۔ لیکن دعوت کس نے کی؟ ثعلبی "کشف الاسرار" میں فرماتے
ہیں کہ یہ دعوت چیونٹیوں نے کی (کیونکہ عربی میں چیونٹی کو نمل کہتے ہیں) اور ان کی نمائندہ چیونٹی جس نے حضرت سلیمان
سے بات کی تھی اس کا نام طاحیہ تھا۔ اور اس کا قد بقول صاحب بیان تفسیر احقاف بھیڑیئے کے برابر تھا۔ پھر اگر میں
یہ کہوں کہ یہ دعوت چیونٹیوں نے نہیں، بلکہ وہاں کے ایک قبیلہ نے کی جس کا نام قبیلۂ نمل تھا۔ تو مجھے منکر قرآن اور
کافر کہہ دیا جائے گا۔

یہی صورت معجزات کی بھی ہے کہ یہاں میرا کیا ذکر ہے مولانا شاہ ولی اللہ کو بھی ایسا ہی ویسا مسلمان سمجھا
جاتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی کرامات و معجزات کو امور اسبابی میں شامل کیا ہے اور شق القمر کو بھی معجزہ قرار نہیں دیتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکایت باوجود لذیذ نہ ہونے کے دراز تر ہو گئی۔ لیکن مختصراً اس طرف اشارہ کرنا
ضروری تھا تاکہ آپ کو میرے کفر و اسلام کے متعلق فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جائے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کا
یہی فیصلہ ہو کہ اسلام نام صرف روایت کا ہے اور درایت کا نہیں۔ اور مذہب کا علاقہ عقل سے بالکل نہیں تو پھر
میرے حال سے تعرض نہ کیجئے۔ کیونکہ میں بہشت کا سودا عقل سے نہیں کرنا چاہتا اور اس فردوس سے باز آیا جہاں
حسب بیان زہر الریاض ہر جنتی کو پانسو حوریں ملیں گی۔ گو اس لالچ میں کبھی کبھی میرا جی بھی چاہنے لگتا ہے
کہ احمق بن جاؤں!

بہر حال ان ہفوات کے ذکر سے میرا مقصود صرف یہ تھا کہ تھوڑی سی روشنی یا تاریکی میری اس زندگی پر بھی پڑ جائے
جو بدنامی سے شروع ہوئی اور غالباً اسی پر اسے ختم ہونا ہے۔

اخیر میں چند باتیں مجھے ادارۂ فکر و نظر کے متعلق بھی عرض کرنا ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ اس کی کامیابی کی ذمہ داری
جناب جوش کو اپنے سر لینا چاہیے کیونکہ انھیں کے کالم "فکر و نظر" کو سامنے رکھ کر اس کا نام "ادارۂ فکر و نظر"
رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس ادارہ کی بنیاد ایسی خاتون کے ہاتھوں پڑی ہے جن کی تعلیم و تربیت فضائے لکھنؤ
میں ہوئی ہے جو حضرت جوش کا بھی وطن ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عالیہ امام ڈاکٹرنی نہیں بلکہ ڈاکٹر ہیں اردو ادبیات کی اور ان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر
اس شخص سے خراج عقیدت حاصل کریں جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتا ہے، جن میں ایک حقیر سی ذات میری بھی ہے،
ڈاکٹر عالیہ، میرے ایک نہایت عزیز دوست کی بیٹی ہیں اور چونکہ باپ کا دوست، باپ سے زیادہ باپ ہوتا ہے
اس لئے وہ میری بیٹی سے زیادہ بیٹی ہیں اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ اس سے
عہدہ برآ ہو سکوں یا نہ ہو سکوں۔

جس حد تک خود عالیہ کی اہلیت کا تعلق ہے۔ وہ صرف ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری تک محدود نہیں ہے، بلکہ یوں بھی ان کا
مطالعہ علم و فن کافی وسیع ہے اور ایک اچھے مقرر ہونے کی حیثیت سے تو ان کا رشتہ بارگاہ امامت سے بڑھ کر روح القدس
تک پہنچتا ہے خواہ وہ عالیہ کے ہم زبان ہوں یا نہ ہوں ——!

ہماری ادبیات مستقبل میں[1]

فراقؔ گورکھپوری

اگر مستقبل کے آنے والی صورتوں پر نظر رکھی جائے تو خیالات کی بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ کہنے کے لئے کہ ساٹھ برس کی دنیا آج سے بالکل مختلف ہوگی پیشین گوئی کی کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہندوستان آزاد فارغ البال اور منظم ہو چکا ہوگا۔ حکومت کا انتظام نہایت عمدہ ہوگا۔ اور ثانوی تعلیم عام ہو چکی ہوگی۔ ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ اس وقت ہمارا سماج اور حکومت اشتراکیت پسند ہوگی۔ ان باتوں کے تصور کے لئے اور آنے والی روشن و خوشگوار صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ آپ ایک زبردست انقلابی ہی ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی ادب کا اس وقت کیا عالم ہوگا؟ وہ امور جو چالیس کروڑ انسانوں کو پیش آ چکے ہوں گے اور وہ تمام واقعات جو ان کے سامنے رونما ہوں گے، زبان و ادب کو بھی وہی واقعات و امور پیش آئیں گے اور ان پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ آیئے ہم ان کے تصور کی کوشش کریں۔ جب ملک کا ہر باشندہ آزاد۔ فارغ البال۔ اور ترقی یافتہ ہو چکا ہوگا تو ہمارے ادبی مشغلے بے انتہا وسیع ہو جائیں گے اور ادبی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ شخصی اور عام کتب خانے۔ کتابیں اور اخبار و رسائل کئی ہزار گنا بڑھ جائیں گے۔ اور یہ اندازہ محض خیال آرائی یا غلو پر مبنی نہیں۔ کیونکہ چالیس کروڑ مشتاق پڑھنے والوں کا تصور کیجئے تو آپ کو خود اس امر کا یقین ہو جائے گا۔

یہ ادبی پیداوار اور مشغلے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل۔ تیلیگو۔ کناری۔ ملایالم اور غالباً ہندوستان کی دو ایک دوسری خاص زبانوں میں نہ ہوں گے اور زیادہ تر ہر زبان کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہوں گے۔ زبان کے اس ارتقائی دور میں جبکہ رفتہ رفتہ معیار کا تعین ہو رہا ہوگا۔ دو طرح کے اثرات پیدا ہو رہے ہوں گے۔ عوام کا دباؤ اور ان گنت انسانوں کا نیچے سے اور ہر چہار جانب سے اثر اس قدر حاوی ہو جائے گا کہ ہر ہندوستانی زبان کی فرہنگ میں ان کے الفاظ، محاورات۔ فقرے اور بول چال اور عام طرز گفتگو کا جواب تک ہمارے ادبی حدود سے خارج رہے ہیں ایک سیلاب سا آ جائے گا۔ اور اسی کے مقابل دماغی۔ علمی۔ جمالیاتی اور حسن کار طبقے اور شخصیتیں اس خارجی اور اندرونی سیلاب کے ساتھ آنے والے الفاظ و محاوروں کو ایسے سانچے میں ڈھالیں گی اور ایسی شکل و صورت عطا کر دیں گی جو ان کو ادبی حیثیت و استقلال بخشے گی۔ ہر زبان کی ارتقا سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر زبان کی تاریخ اس کے الفاظ میں وسعت، قوت جذب۔ انضمام اور روانی پیدا کرنے اور ان کے باہمی گھلنے سے نئی شکلوں۔ نئے معنی اور نئے مشتقات مرتب ہونے کی ایک داستان ہوا کرتی ہے۔ جس طرح معاشیات میں جمہوری نظام کی خصوصیت ہے کہ نئی صورتیں بنتی ہیں پھر بگڑ جاتی ہیں

---

[1] [illegible] ترجمہ احمد [illegible] نے کیا ہے۔

[illegible] اثر سے بیرونی حصّیں جلدی آتی ہیں۔ اسی طرح زبان [illegible]

[illegible] زبان۔ [illegible] سے [illegible] اور بھدی ہو گئی ہے۔ [illegible] اب [illegible]

[illegible] تحریری زبان [illegible] بلکہ [illegible] عام اور [illegible] ہے۔ لیکن ایک [illegible] معیار کے اندر [illegible]

[illegible] زبان اپنے اعضاء رگوں اور نسوں میں ایک تنگی سی محسوس کرنے لگتی ہے۔ الغرض گویا ہر زبان [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] معیار پر کامل برابر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی خاص زبانوں میں نئی سادگیاں۔ نئی [illegible]۔ نئے [illegible]

[illegible] نئے معنوی اختلافات نئی آزادیاں اور نئی پابندیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دو ہزار برس سے زیادہ ہوا کہ یہ ہندوستانی زبانیں عوام کی عام بولی کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھل پھول رہی تھیں۔ ان میں نہ تو ستھرا پن آیا تھا اور نہ انھوں نے معیاری حیثیت حاصل کی تھی۔ ان میں سے ہر ایک زبان کی بیسیوں مختلف قسمیں تھیں۔ ان زبانوں کا کوئی ادب نہ تھا۔ سارے ہندوستان میں ادب کی زبان صرف سنسکرت تھی۔ لیکن سنسکرت میں سختی پیدا ہو چکی تھی۔ اور اب وہ ہندوستانی باشندوں کے کسی گروہ کی بھی بول چال کی زبان نہ رہی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت میں دفعتاً تنزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور مہاتما بودھ کے عروج کے ساتھ پالی اور پراکرت ادب پیدا ہونا شروع ہوا اسی سلسلے میں اس موقع پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ پالی اور پراکرت۔ بولیاں کا وجود مہاتما بودھ کا رہین منت نہیں۔ یہ بولیاں سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کی حیثیت سے پہلے ہی رائج تھیں۔ بودھ مت کی وجہ سے صرف زبانوں کا ادب پیدا ہوا۔ یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یورپ میں بھی اسی طرح یورپ کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جو لاطینی زبان سے نکلی ہوئی مقامی بولیاں رائج تھیں۔ ان میں سے ایک معاشرتی ادب پیدا ہونے لگا تھا۔ الغرض اس وقت کی خاص خاص ہندوستانی زبانوں کی پیدائش پراکرت۔ پالی اور سنسکرت سے نکلی ہوئی دوسری بولی جانے والی زبانوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا تھا کہ جب یہ زبانیں وسیع ہوں گی اور نہ صرف اپنی عام بول چال بلکہ دوسری زبانوں کے [illegible] کو اپنے اندر جذب کریں گی تو کیا ہر زبان کے حدود مستقل طریقے سے متعین کئے جا سکیں گے۔ ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سائنس [illegible] برس کے بعد عام ثانوی تعلیم استقلال اور مضبوطی سے رائج ہو چکی ہوگی۔ لیکن (BACON) نے کہا تھا کہ تصنیف وغیرہ آدمی میں درستی و صحت کا مادہ پیدا کر دیتی ہیں۔ تحریر سے زبان میں بھی درستی و صحت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں جس قدر جدت اور سائنٹفک ترقی بڑھے گی اتنا ہی زندگی اور زبان کا ایک معیار پیدا ہوتا جائے گا۔ لیکن زندہ اور [illegible] کے بغیر اس وسعت پذیری کا تصور نہیں کیا جا سکتا گویا اسطرح ہر ایک زبان کا ایک معیار [illegible] انداز ہوگا لیکن اسکی شکل اور زبان کا کوئی مقامی عنصر ادبی حدود سے خارج نہ ہوگا ہمیشہ [illegible] کی بول چال۔ مقامی بول چال۔ یہ سب کم و بیش ادبی حدود میں داخل ہوں گے۔

ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ ترقی اور جرات کے ساتھ اپنے اندر لچک اور وسعت پیدا کریں گی۔ تاکہ ہر طرز گفتگو کو شامل کر کے ان کو مضبوط تر بنا دیں۔ کئی وجوہ سے آج کل کی تحریری زبان زیادہ [illegible] اور [illegible] کی جان رہی ہے۔

آجکل عالمانہ۔ [illegible]۔ جو دقیق و پیچیدہ الفاظ کی طرف مائل ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اس تحریک سے کافی پریشان اور متاثر ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو عوام کی سمجھ، عادات اور ان کے تخیل اور جذباتی گفتگو کے [illegible] زیادہ قریب لانا چاہئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ زبان و ادب کو مخصوص [illegible] پسند۔ نہیں ہونا چاہئے اور اس [illegible]

[illegible] بلکہ دلی نہیں پیدا کی جاسکتی کیونکہ اس سے ادب [illegible]
[illegible] کے دور سے وکٹوریہ کے وسطی عہد کو لے لیجئے۔ اس عہد کے اسالیب بیان میں حیرت انگیز حد تک تنوع
[illegible] کی جہالت۔ کارلائل کی آتش فشاں طرز نگارش۔ میکالے کے پرجوش جملے۔ رسکن کی رنگین و پرشوکت نثر
[illegible] کے پاک و لطیف محاسن۔ میتھو آرنلڈ کا مجتہدانہ اسلوب۔ تھیکرے کا ہیجان انگیز مکالماتی انداز۔ اسٹیونسن کا جذباتی
رند۔ والٹر پیٹر کی تجزیہ نگاری۔ یہ سب کچھ آپ کو ملے گا۔ خود شکسپیر کے یہاں اگر ایک طرف جاہلوں کو خوش کرنے والی زبان
پائی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کے غلو کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گویا اس دنیا کی چیز ہی نہیں۔

میں نے اب تک ان تبدیلیوں کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی زندہ و مربوط ترقی کے دور میں ہندوستان
کی خاص زبانوں میں واقع ہوں گی۔ اور جن کی ہمیں آنے والے عہد میں امید رکھنی چاہیئے۔ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں
بحری۔ برہا۔ دیہاتی گیت۔ عوام کی کہانیاں۔ تک بندیاں پیدائش موت کے گانے۔ مزدوروں کے گانے۔ سپیروں کے گانے
جادوگروں کے گانے اور منتر موجود ہیں۔ لیکن ان کا صرف ایک غیر محسوس سا وجود ہے۔ ان کو بہت جلد جمع کر کے نشر کرنا ہوگا
یہی حال عوام کی کہاوتوں ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ہوگا۔ اس کے بعد ان چیزوں کا ادبیات کے اندر دخل و
جذب کا عمل شروع ہوگا۔ اور اسی کے ساتھ ان زبانوں کے غیر متعین حدود متعین ہونا شروع ہوں گے۔ اس کے
ساتھ ساتھ مختلف سماجی حدود ختم ہو کر عام سماجی مساوات کے قیام کا عمل بھی جاری ہوگا جس سے نئے سماجی پہلو نمودار ہوں گے۔ ہندوستانی
عوام کے صبر و اطمینان سے پہلے ہی سے حرکت پیدا ہو چلی ہے۔ اور اب یہ تحریک تیز و شدید ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے عام
ثانوی تعلیم کی وجہ سے ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ مضبوط و مستقل ہو جائیں گی۔

زبانوں کی وسعت کا ایک دلچسپ اور اہم نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ان میں ان علمی اور اصطلاحی الفاظ کا سیلاب آجائے گا.
جو مختلف آلوں یا مشینوں سے متعلق ہوں گے۔ یہ الفاظ اکثر موقعوں پر بالکل بدیسی ہوں گے اور بعض اوقات انھیں ہندوستانی
شکل بھی دی جائے گی۔ البتہ کبھی کبھی خالص ہندوستانی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ عوام و خواص دونوں ان الفاظ کی تشکیل
و رواج میں حصہ لیں گے۔ آج ہماری تصنیفات کے بیانی واقعاتی اور تخیلی حصوں میں ریل۔ فن۔ ہوابازی۔ جہاز رانی۔ فیکٹریوں
دواؤں۔ جراحی۔ انجینیری وغیرہ کے مختلف الفاظ بالکل مفقود ہیں۔ پروفیسر سینٹسبری (Saintsbury) نے لکھا ہے
کہ لائف آف نلسن لکھتے وقت ساؤدی کو بحری زندگی سے متعلق ایسے فقروں سے سابقہ پڑا اور اتنی ہوشیاری کی ضرورت
پڑی جیسے کوئی بیل چینی کے برتنوں سے گزرے۔ ساؤدی کی "لائف آف نلسن" اور کونارڈ کے ناولوں کے پڑھنے والے اس کا
اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان میں کتنی کثرت سے علمی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ ہارڈی نے نجومی حقیقتوں اور شکلوں سے جتنے
تنکے کردیے ہیں اور مزدوروں یا کسانوں کی زندگی کے جیسے مانوس نقشے پیش کئے ہیں وہ قارئین کے لئے بیک وقت دلچسپ
[illegible] ہیں اس میں شک نہیں کہ فرنگی زبانوں کے اثر سے ہماری زبان اس رنگ کو قبول کر رہی ہے۔ لیکن ابھی تک
صرف ذہنی اور تخیلی ادب میں اس کا اثر ہو رہا ہے اور عوام کی متنوع زندگی سے متعلق ہونے والے الفاظ کی بہت کمی ہے۔
[illegible] نے امریکہ کے باشندوں پر فخر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہر چند وہاں کی ابتدائی کتابیں بلی اور کتے سے
شروع ہوتی ہیں۔ اور ہماری کتابیں ہمیشہ خدا سے شروع ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ کیا اسی وجہ سے

لہ (NELSON) مشہور انگریز امیر البحر کا نام ہے جس نے نپولین کے مشہور فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دی اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ انگریز [illegible]
[illegible] ساؤدی نے اس کے سوانح حیات لکھے ہیں۔

فطرت اور حقیقت پر ہماری گرفت [illegible] ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟ [illegible] حقیقت پر زیادہ مضبوط گرفت حاصل کرنی ہے۔ [illegible] کی باہمی بیگانگی کا دور کافی طویل ہو چکا ہے۔ ہتھوڑے اور ہنسیا کو بھی ہمارے ادب میں مناسب جگہ ملنا چاہئے اور حقائق زندگی کو ہندوستان کے ادبیات میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونا چاہئے۔ اس جگہ شیکسپیر مجھے یاد آتا ہے جس کے ادبیات کے تنوع کو دیکھ کر کارلائل نے کہا ہے کہ اگر وہ کوئی بڑا شاعر نہ ہوتا تو ایک بڑا سپاہی ہوتا یا بڑا کسان یا بڑا دستکار۔ بہر حال زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی حیثیت ممتاز ہی رہتی۔

اب یہاں بعض اصولی مسائل سامنے آتے ہیں تہذیب نے ادب کی طاقت اور امکانی قوتوں کا بہت دھندلا سا اندازہ لیا ہے۔ ابھی عام اور موثر طریقے کی ثانوی تعلیم کا نفاذ تو نہیں ہوا لیکن ہم اس عہد سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وہ منزل دور نہیں کہ ہم اپنے اس خواب کی عملی تعبیر دیکھ سکیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ اہم سوال اور ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے زیادہ نازک مسئلہ " بچے اور ان کا ادب " ہے۔ سن رسیدہ آبادی بڑھ کر ویسی ہی ہوگی جیسے ہمارے بچے ہوں گے۔ ہم کو بہت جلد بچوں کے لئے لاکھوں کتابوں کی ضرورت پڑنے والی ہے۔ علم ہجا اور شروع کی پرائمروں سے لے کر احمقانہ و عقلمندانہ نثر و نظم۔ سبق آموز کہانیوں، تمثیلوں جن و پری کی کہانیوں، سیاحتوں، ہمت افزا داستانوں۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ سوانح حیات مضامین۔ ناول۔ ڈرامے۔ روزمرہ سائنس کی کتابوں۔ قاموس و لغات۔ میگزین و تصویروں کے البم اور نقشوں تک ہر چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے ہم کو بہت جلد اس کی فکر کرنی چاہئے کہ مصنفوں۔ مؤلفوں مترجموں اور اڈیٹروں کی ایک پوری فوج اس کام میں منہمک ہو جائے۔ اور موجودہ صدی کے ختم ہوتے ہوئے اس مقصد میں کافی کامیابی حاصل ہو جائے۔ یہ اتنا مفید کام ہے کہ ہماری صوبجاتی حکومتوں لیڈروں اور ماہرین تعلیمات سب کو مل کر اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ شیر خواری سے چودہ برس کی عمر تک یہ نہایت اہم اور ضروری امر ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کی اپنی ضرورتوں کے مطابق بہترین ادب تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں بالغوں کے ادب کا بھی اچھا خاصہ حصہ بچوں کے مذاق کے مطابق کاٹ چھانٹ کر شامل کرنا ہوگا۔

ہر چند مطالعہ کی عادت سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا دار و مدار زیادہ تر شخصی رجحان پر ہے لیکن اگر ہم چاہیں تو اس میں مسلسل ترقی پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کو بے لطف خشک اور مشکل کتابوں تک محدود رکھنے سے یہ تو ممکن ہے کہ آپ سو فیصدی میٹرک اور لاکھوں گریجویٹ پیدا کر لیں لیکن آپ مطالعہ کو ایک قومی عادت بنانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قوم دلچسپی لے کر پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ کلرکوں کی قوم ہوگی۔ مطالعے کی عادت یا سوچنے اور رائے قائم کرنے کی عادت ابتدائی عمر ہی میں پڑ جانی چاہئے۔ بعد کے سالوں میں اس میں صرف پختگی پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس اہم نفسیاتی حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ بچے کتابوں اور مطالعے کو پسند کرتے ہیں اور ہم یہ کرتے ہیں کہ یا تو ان کی اس ذہنی اشتہا کو ختم کر دیتے ہیں یا پھر غیر مناسب اور تھکا دینے والی کتابیں دے کر ان کے دل سے مطالعہ کی تمام محبت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس افسوس ناک صورت حال کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ ایسی نظموں۔ کہانیوں یا کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کیجئے جن کی یاد اب بھی آپ میں غیر معمولی جوش و حسرت پیدا کر دیتی ہو اور جنھوں نے آپ کے عہد طفلی کو روشن کر رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مشکل ہی سے دو ایک ایسی مثال یاد کر سکیں یا ممکن ہے کوئی یاد نہ آئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے گریجویٹ نوے فیصدی (جہاں تک مطالعہ کی قومی عادت کا تعلق ہے) اَن پڑھ زندگی بسر کرتے

ہیں۔ اخبارات بھی سطحی طور سے، معمولی دلچسپی کے ساتھ نظر ڈال لینے کے علاوہ جس میں غور و فکر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہوتا وہ شاید اور کچھ نہیں پڑھتے۔ یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پر میکالے کی مشہور رپورٹ کی دوسری توضیح۔ شاید میکالے کی متجسس نگاہوں کیلئے یہ مسئلہ اس قدر واضح تھا کہ وہ اس کو نہ پا سکے۔ سال بہ سال ہم لوگوں کو یونیورسٹی میں سیکڑوں انڈر گریجویٹوں سے سابقہ پڑنے کا صبر آزما اور تکلیف دہ تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ قابل افسوس امر یہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ الجھا ہوا ہوتا ہے قابل افسوس امر یہ ہے کہ ان کا دماغ بالعموم خالی رہتا ہے اور حقیقتوں سے انکو کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ اپنے ذہنی خلا کے باعث وہ بالکل مردہ دیوار کے مانند ہو جاتے ہیں ان کو ذہنی اخذ سے ایک فطری مخالفت سی ہو جاتی ہے اور کسی چیز پر بحث کرنے یا غور کرنے یا کسی سوال کے پوچھنے یا اس کا جواب دینے سے قطعاً گریز کرنے لگتے ہیں ان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ محض طلبار کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ بے چارے تو ایک ایسے بے رحم نظام کا شکار ہوتے ہیں جو بے ضرورت دباؤ۔ غلامی مفلسی۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور تمدنی ترقی کو شروع ہی سے الجھاووں میں پھنسا کر بالکل خاتمہ کر دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی طفلی اور شروع جوانی کے درمیان میں لڑکے اور لڑکیوں کی انگلیاں اور نگاہیں ایسے لاکھوں صفحوں سے گزرتی ہیں جو نوخیز عمر والوں کے استعمال کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں اور جوان کی مناسب ذہنی غذا کا کام دے سکتے ہیں۔ بچوں کے کثیر اور تندرست ادب کے بغیر قوم کی ذہنی بھوک شروع ہی میں مر جاتی ہے۔ بچوں کی مناسب کتابوں کا کال ان کے جوشیلے ذوق کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ان کے دل ریگستان میں پیدا ہونے والے پھولوں کی طرح خاموشی سے کمھلا جاتے ہیں۔ اپنی قومی زندگی کے گہوارہ اور بنیاد سے بیگانہ رہنے میں ہمارے لئے زبردست خطرے ہیں اور پھر اب تو اس بے نیازی کی بھی انتہا ہو گئی۔

اس لئے اگر آئندہ صدی تک ہمیں کچھ کرنا دھرنا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ابھی سے نوخیزوں کے لئے مناسب متنوع اور مندارج ادب کی کافی پیداوار پیدا کریں اور عام استعمال کے لئے نہایت وسیع اور ہمہ گیر طریقۂ عمل ہوشیاری سے مرتب کریں۔ مناسب ہوگا کہ ایک دو الفاظ میں اس کا بھی تذکرہ کرتا چلوں کہ یہ کتابیں کس طریقہ کی اور کن خصوصیات کی حامل ہوں گی۔ میری رائے سوامی رام تیرتھ کے اعتراض کے باوجود یہی ہے کہ بچوں کی کتابوں میں خدا نہیں بلکہ کتے اور بلّی کا عنصر زیادہ ہونا چاہیئے۔ بچوں کا وجود بالکل فطری وجود ہوتا ہے۔ ان کو نہ مذہب سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ اخلاقیات سے۔ اب وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ جبکہ بچوں کی کتابوں کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی کلیات پر رکھی جاتی تھی۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امر میں ان کی مدد کریں کہ پرانے وراثتی تعصبات اور نفسیاتی کمزوریوں سے آزاد ہو کر سوچیں اور سمجھیں۔ مذہبی اور اخلاقی تربیت کی بجائے ذہنی اور فراستی تعلیم کو لے لینی چاہیئے تاکہ دل و دماغ اور ہاتھوں کے تعاون سے ایک نیا اور معقول تمدن پیدا کیا جا سکے۔ احترام کا جذبہ خدا کے ماننے پر مبنی نہیں ہے نہ کسی مخصوص مذہب یا عقیدے کا ٹھیکہ ہے لہٰذا بچوں کے ادب میں مذہب اور اخلاقیات کا نہیں بلکہ ٹھوس مادی چیزوں کا پلہ بھاری ہونا چاہیئے۔ بچوں کا ادب بناتے وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والوں میں فطری اور سماجی اصولوں سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بچے بے حقیقت ہوائی باتوں سے تھک جاتے ہیں اور عام اخلاقی بکواس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ فرینکلن کی (My Autobiography) سے لے کر سیموئیل اسمائیلس کی (Self help) تک اس قسم کا تمام ادب ایک ناقابلِ فہم دور سے آنے والی چیز معلوم ہوتا ہے دوسرے قصہ میں سرمایہ کی طرف سے ہمکو خوفزدہ

بناسکتے ہیں۔ بچوں اور نوخیزوں کے لئے جو ادب ہے۔ اس میں ہمیشہ ایک مخصوص سماجی مقصد کی جھلک ملنی چاہئے اسلئے بچے
کو اس سلسلے میں [illegible] سماجی نظام کی مخالفت کرنا پڑے گی اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بچوں کا ادب نہ صرف تعمیری بلکہ
تخریبی بھی ہوتا ہے۔ سورماؤں کی کہانیاں۔ کنگسلے کے افسانے۔ یا پلوٹارچ کی تاریخی کہانیاں فائدہ مند بھی ہیں اور مضر بھی
کیونکہ نوخیزوں میں وہ ذاتیات کے جذبات بھی ابھارتی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ ایسی کہانیاں اور خصوصیت سے پلوٹارچ بچوں
کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن نوخیزوں کی زندگی کے تشکیلی اثرات میں ان کی تقابلی اہمیت بہت بدل جائے گی
وہ سورما نہیں جو اپنے علاوہ اور کسی کے لئے سورما نہ تھے۔ بلکہ سورما وہ تھے جو بڑی بڑی تعمیری مہمات کے سرگردہ تھے۔
اس لئے ان کے سوانح حیات ایسے صاف اور مانوس انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ نوعمروں کے نوخیز ترقی پسند احساس کو بھلا
معلوم ہو۔ لیکن ان کو ایک رخی تعریف پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ ان کی زندگی کی محدود حیثیتیں۔ ان کے مانے ہوئے مہلک اصول اور
مسلمات بھی صاف صاف بتادینا چاہیے۔ ہمارے سورما اچھے ہوں یا بُرے لیکن بچوں میں سورما پرستی کے جراثیم نہ پیدا کرنا
چاہئیں۔ تاہم طرز نگارش کچھ ایسا ہونا چاہیے جو نوخیز قارئین کے دلوں میں احترام کے جذبہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنادے۔
ان اہم امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سوانح عمریوں کی ایک قومی بلکہ بین الاقوامی قاموس کا کام فوراً شروع ہوجانا چاہیے
بچے صرف بچے ہی نہیں ہوتے اور نہ سب لوگ ایک سے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔ کھیل کا
فطری مادہ اور ذہنی رجحان جو اپنی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا ہے، یہ دونوں تہہ میں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں، بربری
اقوام بھی فلسفہ دان۔ سائنس دان۔ موجد۔ حسن کار سیاح۔ تجار ناظم اور رہنما ہوتے ہیں۔ خارجی اور داخلی اسباب نفسیاتی
وجوہ اور تمدنی: تاریخی ماحول کی وجہ سے ہمارے ہندوستانی بچے مغربی بچوں سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ بچوں کا
ادب بنانے والوں کو ارزاں حب الوطنی اور ناقابل برداشت طفلانہ پن سے احتیاط لازم ہے۔ بچوں کی کتابوں کو وسیع حدود
اور متنوع اقسام کا ہونا چاہیے جس میں ایسی لطیف اشارہ انگیزی پائی جاتی ہو کہ بیک وقت روشن دماغی۔ اضافۂ معلومات
اور تجسس ذہنی پیدا کرے۔ کیوں نہ ہم دور جدید کی ایک نئی (Hitopadesh) ایک نئی (Aesop's)
اور ایک نئی جنگل کی کتاب پیدا کریں جو عصر جدید کے ترقی یافتہ اور اضافہ شدہ علم پر مبنی ہو۔ ڈارون، ولیس،
میٹرلنک، اور کروپوٹکن ایسے مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات اور سائنس کے عجائبات کے تذکرے جب کروڑوں لڑکوں
کے سامنے پیش ہوں گے تو ملک کے اس نوخیز طبقے میں ایک ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی لہر دوڑ جائے گی۔ جنسیات
کے مشکل مسائل کو بھی کافی ہوشیاری اور توجہ کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ ایک ایسا سماجی احساس پیدا کرنے کے لئے جو پوری
دنیا پر محیط ہو۔ ایک تشدد آمیز قومیت یا فرقہ پرستی کے جذبات کو روکنے کے لئے رجعت پسندانہ ذہنیت کو کچلنے کے
لئے (Martyrdom of man)(انسان کی شہادت) ایسی کتابوں کو کافی ہردلعزیز
بنانے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ نہ صرف ان کے دماغوں بلکہ ارادوں کو بھی مناسب تربیت و ترقی ہوسکے۔ شہنشاہیت
سرمایہ داری اور مذہب اس عمل کو مدتوں سے روکتے رہے ہیں۔ اس لئے بغیر کسی رعایت کے ان کا بھرم کھونا
چاہیے۔ مافوق الانسانی طاقتوں کی عقیدتمندی کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لئے شاعری اور روحانیت
کا خاتمہ ضروری نہیں۔ سائنٹفک خیالات کا انداز بھی کوئی بھدا اور غیر لطیف انداز نہیں ہے۔ آغاز کائنات کا مسئلہ —
جغرافیہ۔ باغبانی۔ علم حیوانات۔ علم النباتات۔ علم النسل اور معاشیات یہ سب ضمیر کی پوری پابندی کے ساتھ بچوں کو

اصل کرانے چاہئیں۔ بچوں کی کتاب کو کند سے بے لطف اور پھیکا بنا دینا سب سے بڑی خرابی ہے اور یہ پھیکا پن عموماً علمی
یا محدود علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماجی احساس۔ سماجی ارادہ و مقصد اور سماجی خیالات کو بچوں کی ذہنی زندگی کا ضروری جزو
بنا دینا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ محسوس کرکے شدید تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے مشاہیر میں بھی سماجی احساس کا
فقدان ہے۔ آج متوسط طبقہ کی رسمی نیکیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہم کو صرف مفید چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایسی
کتابیں چاہئیے جن میں تصویریں ہوں، گانے ہوں، نظمیں ہوں، کہانیاں ہوں، مکالمے ہوں۔ ظرافت ہو، سائنٹفک
معلومات ہوں، ایجادات کی کہانیاں ہوں۔ لطیفے ہوں۔ نقشے ہوں، معمے اور پہیلیاں ہوں اور مذہبیات و اخلاقیات
سے ان کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ سماج کو بھی زندہ صفت اور زندگی بخش ادب کی پیداوار مہیا کرنے کا فن سیکھنا اور اس پر
عمل کرنا ہے۔ تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم کو فوراً اس اسکیم پر کاربند ہونا چاہئیے اور قابل آدمیوں کی ایک جماعت تلاش
کرکے ایک مرکزی ادارہ تعمیر نصاب کا قائم کرنا چاہئیے۔

نگارِ پاکستان

کا

خصوصی شمارہ

مومن اُردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے

جو شیخِ حرم بھی ہے اور رندِ شاہد باز بھی

اِس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں غیر معمولی کشش کی جاذبیت ہے

یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہلِ ذوق کے لئے

لذتِ کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

"مومن نمبر"

کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں مومن کی سوانح ـ حیاتِ معاشقہ ـ اس کی غزل گوئی ـ قصیدہ نگاری مثنویات و رباعیات اور خصوصیاتِ کلام کی قدر وقیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہوگیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کرکے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے۔

قیمت :- تین روپے ـــــ خریدارانِ نگار کے لئے رعایتی قیمت :- دو روپے

چند تاریخی و ادبی لطائف

نیاز فتحپوری

(۱)

ایک شعر ہے :-

سبزوارست ایں جہانِ بے مداد　　ہمچو بوبکریم دروے خوار و زار

حضرت ابوبکر! اور خوار و زار!! کتنا کھلا ہوا تبرہ ہے کیسی سخت توہین ہے رسول اللہ کے خلیفہ اوّل کی۔ یقیناً یہ شعر کسی غالی شیعہ ہی کا ہو سکتا ہے ۔۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی یہ سن کر کہ یہ ارشاد ہے مولانا جلال الدین رومی کا جن کی مثنوی کو ؎ ہست قرآں در زبان پہلوی

کہا جاتا ہے۔

سبزوار۔ ایران کا ایک مشہور مقام ہے جہاں کسی وقت خالص شیعوں کی آبادی تھی اور اپنے تعصب کے لحاظ سے کافی نیک نام یا بدنام۔ جب سلطان محمد خوارزم شاہ نے ایران فتح کیا اور سبزوار پہنچا تو اس شہر کی خصوصیت کا علم اسے بھی ہوا یہ بڑا سخت گیر سُنّی تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں کے باشندوں کو سخت سزا دینا چاہیئے اس نے یہاں کے اکابر کو بلایا اور پوچھا کہ تم لوگ شیعہ ہو یا سنی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم سب سنی ہیں۔ خوارزم شاہ نے کہا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو اپنی جماعت میں سے کوئی ایسا شخص پیش کرو جس کا نام ابوبکر ہو۔ یہ لوگ گئے اور بڑی مشکل سے ایک نہایت ہی ضعیف اور خستہ و خوار شیعہ کو بہت کچھ دے دلا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنا نام ابوبکر بتائے۔ چنانچہ یہ اسے لیکر خوارزم شاہ کے پاس گئے۔

بادشاہ نے پوچھا "یہ کون ہے جو نہ مردہ ہے نہ زندہ"

سبزوار والوں نے جواب دیا کہ "جہاں پناہ، ہمارے شہر میں اس سے بہتر ابوبکر اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہے ابوبکر ہی"

بادشاہ یہ سن کر ہنس پڑا اور عتاب کا خیال ترک کر دیا ۔۔۔"

مولانا رومی نے اس شعر میں اس تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہماری حالت اس دنیا میں اسی ابوبکر کی طرح ہے جسے سبزوار کے لوگوں نے سلطان خوارزم شاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

مولانا رومی کا ایک اور شعر اسی قسم کا ہے۔

کور کورانہ مرو در کربلا　　　تا نیفتی چوں حسین اندر بلا

بظاہر اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۔ کربلا میں اندھوں کی طرح داخل نہ ہو ورنہ حسین کی طرح مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اور یہ سخت حملہ ہے جانب حسین پر۔ لیکن غلطی دوسرے مصرع کے لفظ تا سے پیدا ہوتی ہے ۔ اگر اس کے معنی تا کہ قرار دیا جائے تو مفہوم یقیناً وہی پیدا ہوگا جو ابھی ظاہر کیا گیا ۔ لیکن شاعر نے اسے جب تک کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اور اس صورت میں شعر کے معنی یہ ہو جائیں گے کہ جب تک تم حسین کی طرح بالکل مجبور نہ ہو اس وقت تک بے سمجھے بوجھے اپنے کو مصیبت میں مبتلا نہ کرو

(۲)

جب، المنصور، دوسرا عباسی خلیفہ، مسند خلافت پر بیٹھا تو دمشق کے تمام اکابر و امراء، مبارکباد کے لئے حاضر ہوئے ان میں ایک شاعر ابن ہرمہ بھی تھا، جو مدینہ میں رہتا تھا اور شراب کا سخت عادی تھا۔

منصور نے منجملہ اور لوگوں کے اس سے بھی پوچھا کہ ۔ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟

اس نے کہا ۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے عامل مدینہ کو ہدایت کر دیجئے کہ اگر وہ کبھی مجھے عالم سکر میں پائے تو مجھ پر حد جاری نہ کرے ۔ اور درے نہ لگائے ۔

منصور نے کہا کہ ۔ یہ ممکن نہیں۔ خدا کے حکم میں دخل دینے کی جرأت میں کبھی نہیں کر سکتا ۔ اس کے علاوہ اور کچھ چاہتے ہو تو کہو

ابن ہرمہ نے کہا ۔ آپ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے عامل مدینہ کو یہ ہدایت کر دیجئے کہ اگر ابن ہرمہ نشہ کے عالم میں سامنے لایا جائے تو بے شک اس پر حد جاری کرو اور ۸۰ درے لگاؤ، لیکن اس کے ساتھ وہ شخص جو اسے پکڑ کر لایا ہے سو درے اس کے بھی لگائے جائیں ۔

(۳)

ایک بار تبریز کے شیخ الاسلام نے ملا محمد عصار کو جو اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا ۔ از راہ لطف و کرم اپنا ایک چغہ مرحمت فرمایا جو حد درجہ بوسیدہ اور تار تار تھا ۔ شیخ الاسلام کا عطیہ تھا، انکار کیسے کرتا، شکریہ ادا کیا، سر آنکھوں پر رکھا اور بغل میں دبا کر گھر لے گیا ۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ بر بنائے رسم و تہذیب یہ چغہ پہن کر اسے عرض تہنیت کے لئے پھر جانا بھی چاہئے تھا ۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اسے پہن کر شیخ الاسلام کے پاس جائے اور یہ رسم ادا کر دے ۔ لیکن چغہ میں جان ہی نہ تھی کیا پہنتا اور کیا جاتا ۔ اس لئے وہ خود تو شیخ الاسلام کے پاس گیا نہیں البتہ یہ چند اشعار معذرت کے طور پر لکھ کر بھجوا دیئے ۔

جامۂ بخشید شیخ اسلام اعظم بندہ را
دہ مبارک جامۂ سال فراواں یافتہ

رشتہ سوزا از برائے آدمش در بدر و حال
زیش در کارگہ از بہر عیسیٰ بافتہ

وانگہ از مقتول پشم ناقۂ پیغمبرش
فاطمہ گشتہ رفوگر ہر کجا بشگافتہ

من چہ حد دارم کہ پوشم جامۂ را کاندرو　　　آفتاب طلعت چندیں پیمبر تافتہ

(شیخ الاسلام نے مجھے ایک حلہ مرحمت فرمایا جس کے تقدس ندامت کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ اول اول حوا نے اپنے آدم
بیٹے اس کا تانا بنا۔ پھر مریم نے اس سے عیسیٰ کی پوشاک تیار کی۔ اس کے بعد رسول اللہ کے اونٹ کے بال بٹ کر رفو کیا۔
نے میری کیا مجال کہ میں اس لباس کو زیب تن کروں جس کو ایسی ایسی مقدس ہستیوں کی جلوہ گری کی سعادت نصیب ہوچکی ہے)

(۴)

خلیفہ مہدی کے زمانے میں ایک شخص نے دعوائے نبوت کیا۔ خلیفہ نے اسکو طلب کیا اور پوچھا کہ "تم اپنے ساتھ
ئی معجزہ بھی لائے ہو" اس نے جواب دیا کہ "بیشک میں معجزہ بھی لایا ہوں۔ اور جو چیز تم چاہو میں اسے مہیا کرسکتا ہوں"
خلیفہ نے کہا کہ "تم ایک تربوز مجھے دو۔ گو موسم اس کا نہیں ہے، لیکن نبی تو موسم کا پابند نہیں ہوسکتا"
اس نے تھوڑی دیر تامل کیا اور کہا کہ "مجھے تین دن کی مہلت دیجئے۔ اس کے بعد پیش کردوں گا"
خلیفہ نے کہا "یہ بات غلط ہے، میں تمھیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہیں دے سکتا"
اس نے کہا "کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا قادر مطلق ہونے کے باوجود تین مہینے سے پہلے تربوز پیدا نہیں کرسکتا
ر تم اس کے پیغمبر کو تین دن کی مہلت بھی نہیں دیتے!"

(۵)

ایک بار نصر الدین، سردار قبیلۂ "کبود جامہ" سے سلطان تکش کسی بات پر اتنا برہم ہوگیا کہ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ
ابھی جاکر نصر الدین کا سر کاٹ لاؤ۔ جلاد اس کے پاس گیا اور سلطان کا حکم سنا کر کہا کہ "جھکائیے گردن"
نصر الدین نے کہا کہ "فرمان سلطان سے مجھے مجال سرتابی نہیں، لیکن کیا حرج ہے اگر تم مجھے زندہ لے چلو اور پیش سلطان
لے جاکے میرا سر قلم کردو" جلاد اس پر راضی نہ تھا، لیکن بہت منت و سماجت کے بعد اس نے نصر الدین کی یہ التجا مان لی اور
سے اپنے ساتھ دربار لے گیا۔ سلطان یہ دیکھ کر کہ جلاد نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی بہت برہم ہوا اور اس سے عدم تعمیل حکم کا سبب دریافت کیا لیکن قبل
س کے کہ وہ کچھ کہتا۔ نصر الدین دست بستہ آگے بڑھا اور یہ رباعی سنائی۔

من خاک تو در چشم خرد می آرم
عذرت نہ یکے نہ دہ کہ صد می آرم
سر خواستۂ بدست کس نتواں داد
می آیم و برگردن خود می آرم

(آپ نے سر طلب کیا تھا سو میں خود اسے اپنی گردن پر لایا ہوں اور خود ہی پیش کرسکتا ہوں)

(۶)

ایک بار حضرت علی نے کسی بدوی عرب کو بہت جلدی جلدی ارکان نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ فارغ ہو
تو آپ نے اس کو ڈانٹا اور کہا کہ نماز پھر ادا کرو اور عجلت سے کام نہ لو۔ جب وہ دوبارہ نماز پڑھ چکا تو آپ نے پوچھا
ا۔ بتا تیری پہلی نماز بہتر تھی یا یہ"
اس نے جواب دیا کہ "پہلی کیونکہ وہ میں نے خدا کے ڈر سے پڑھی تھی اور یہ تمھارے ڈر سے۔!"
(جنگ کراچی)

سیفو یونانی شاعرہ

(برہم ناتھ دت)

یونانی دیومالا میں مرقوم ہے کہ دیوتا زیوس کے ہاں نی موسائنی کے بطن سے نو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ابتدا میں اُن کے دائرہ عمل وسعت کردار اور پالاعت میں بڑی یکسانی اور یک جہتی پائی جاتی تھی۔ وہ عیش و عشرت کی دلدادہ تھیں۔ وہ فکر واندیشے سے نا آشنا تھیں۔ اُن کے خطوط رہنے دائمی مسرت و شادمانی سے ہمکنار سمجھتے تھے۔ غم دیدہ و غم زدہ ان کی پناہ میں آکر غموں سے چھٹکارا پاتے تھے۔ مگر بعد کو ان میں سے ہر ایک کا دائرہ عمل الگ الگ اور محدود ہو گیا۔ کالوپی رزمیہ شاعری کی دیوی بن گئی۔ کلی او تاریخ کی، یوٹرپی نغموں کی، ملپومینیہ المیہ کی، ٹرپ سی کور، ملک رنگ کی، پولیہائمنیا بزرگ شاعری اور فصیح البیانی کی، یورانیا علم ہیئت کی، تھالیا قصیدہ مکلف کی۔ اور اس کے ساتھ ہی محولہ بالا برکات اُن کے حد اختیار سے باہر ہو گئیں مگر پھر بھی ان کی پرستش و پرسش بدستور جاری رہی۔ فنون لطیفہ کی ان دیویوں کو "نو دیویوں" کے نام سے منسوب کیا جانے لگا۔ ۶۰۰ قبل مسیح یونان میں موسٹی ڈورنیس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نابغۂ روزگار اور نجم الثاقب جس کے پرتو سے سارا یونان جگمگا اٹھا اور جس کی ضو پاشیوں سے اطراف نور ہی نور ہو گئے۔ والدین نے اس کا نام "سیفو" رکھا۔ زمانے نے بقائے دوام اور شاہ پرسٹراٹس (۵۰۰ ق م) نے ملک الشعراء کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ اور لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اسے سر پر اٹھا لیا۔ افلاطون (۴۳۰ ق م) نے اس کی صلاحیتوں کے پیش نظر اسے "دسویں دیوی" کا نام دے دیا۔ ارسطو (۴۰۰ ق م) نے اسے بہترین قطار میں مسند نشین کر دیا۔ کانونس (۴۰ ق م) اور ہوریس (۴۶ ق م) نے اسے اپنا معیار الفکر بنا دیا۔ لونگی نس (۲۱۳ء) نے اس کے "قصیدۂ الفنسیا" کو الہام قرار دے دیا۔ اور کاٹولس نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے قصیدے کو لاطینی میں منتقل کر کے اس ترجمہ کو ایک مستقل اور اہم چیز بھی جاتی ہے۔ مگر اہل بینش کی نظر میں یہ ایک مبتدی کی ناکام مشق سخن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ دنیا نے تسلیم کر لیا کہ ہومر اگر شاعر ہے تو سیفو لاریب شاعرہ ہے، یگانہ، بے مثل، لاثانی۔ نو کی نو دیویاں ماند پڑ گئیں اور فنون لطیفہ کے میدان میں سیفو نے ان کی جگہ لے لی۔ ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود اس عقیدت اور عبودیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مور (۱۹۲۰ء) نے اپنی کتاب یونان کی شاعری میں اس کی شاعری پر اظہار خیالات کرتے ہوئے اسے بے مثل شاعر رشاعرہ نہیں) کہا ہے۔ لارڈ بائرن (۱۸۲۰ء) نے اپنی شہرہ آفاق نظم چائلڈ ہیرلڈ (جس سے متعلق وہ خود فخریہ کہتا ہے کہ میں خواب استراحت سے اٹھا تو دیکھا کہ میرے نام کے ڈنکے بج رہے تھے) کے پہلے بند کے پہلے شعر میں سیفو کی فضیلت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

The Isles of greece: The Isles of greece
Where burning Soffho loved & sung

یعنی "جزائر یونان! جزائر یونان! جہاں شعلہ نوا سیفو نے محبت کی اور محبت کے گیت گائے" عجیب بات کہی ہے مور شاعر، عالی نسب و عالی مرتبت نواب کہ یونان کی عظمت کے اظہار میں وزیر و مقتدر نظر آیا نہ سکندر، نہ وہ ایتھنی کلیمی نہ ارسطو، نہ افلاطون نہ اقلیدس، نہ تھیوکریٹس نہ ہومر اور نہ پیتھاگورس بلکہ اس کی نظر انتخاب سیفو کی دہلیز پر جا کر رک گئی اور یونان بھر میں اس سے زیادہ جلیل القدر شخصیت اسے کوئی اور نظر نہ آئی۔ کہ یونان کے

نیز ۱) عالمانہ تنقید کی تحقیقات (۲) سوائح حیات اور کلک (۶۰) اہل سیفو نے بحر میں طبع آزمائی کر کے اس شاعرہ کی عظمت کا مرتبہ بڑھا دیا اور بتائے کہ سیفو کی نظموں کا اتنا شہرہ تھا کہ اس کے الفاظ کو موتیوں کا ہار بنا دیا جاتا ہے۔

سیفو کے منہ سے الفاظ گر تو لینے دو
انہیں کہیں پھینک دو، پرندے اٹھا لیں گے، رنگینیوں میں ڈھال لیں گے۔
کہیں ویرانہ و اجاڑ میں پھول کھلے گا
اور فضاؤں کو معطر و معنبر کر دے گا

وہ متی لینی کے ایک معزز اور ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اس کی ماں کا نام کلیسی تھا اور اس کے دو تین بھائی بھی تھے۔ وہ کرکولس ایک رئیس سے بیاہی گئی مگر خاوند یا تو مرگیا یا اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ اس کا نام اپنی ماں کے نام پر اس نے کلیسی ہی رکھا۔ وہ پلوٹوکش اور الکائس دونوں شاعروں کی ہم عصر تھی۔ ٹولس یوں لکھتا ہے "کہ اس نے نظموں کے نو دیوان، مجموعۂ لطائف، مرثیے وغیرہ اپنے پیچھے چھوڑے اور رقص میں وہ بہت مصنف بھی جاتی تھی"۔

یونان ایک عظیم الشان ملک تھا۔ تہذیب و تمدن کے نقوش یہیں سے ابھرے، تحریک و ترقی کے سوتے یہیں سے پھوٹے۔ روشنی اور اجالے کی شعاعیں یہیں سے اٹھیں مگر جب یونان و مصر و روما سب مٹ گئے تو بلندیاں پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ حشمت مٹی میں مل گئی علم و ادب بھی اس کی دستبرد سے بچ نہ سکا۔ سیفو کا کلام بھی لٹ گیا اور برباد ہو گیا اور آج جو ہمارے سامنے ہے وہ ہے جو یا تو دوسرے شعراء کی بیاضوں سے اخذ کیا گیا ہے یا ان دستاویزات سے لیا گیا ہے جو برلن، آکسفورڈ، لندن کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

اس کی وفات کے دو سو سال بعد اس کی شاعری و ساحری، حسن و زیبائی، پاکیزگی اور دلربائی کے ساتھ ساتھ ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہو گئی جس نے اس کے مفروضہ تعشق کے چرچے کو اچھالنا شروع کر دیا اور اپنے ڈراموں کو مقبول بنانے کے لیے مبالغہ اور جھوٹ کی انتہا کر دی یہاں تک کہ اس کو معمولی رنگ میں پیش کرنے لگے۔ چھ ابتدائی ڈرامے سیفو کے نام سے اور دو المیہ ڈرامے فعون کے نام سے منظر عام پر آئے۔ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ایک انگریز مصنف بل نے تو وہ گندگی اچھالی کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر جھوٹ کا پردہ فاش ہو کر رہا۔ ۱۷۹۰ء میں پروفیسر شیو برشن نے تحقیق کے بعد ان بہتان تراشیوں کو جھٹلا دیا اور اصل واقعات دنیا کے سامنے رکھ دیے۔ اور بعد کو ویلکر نے ۱۸۱۶ء میں دلائل قاطعہ سے ثابت کر دیا کہ سیفو پاکیزگی اخلاق کا نمونہ تھی اور اس کا لڑکیوں کے مدرسۂ شاعری کا مدرس اعلیٰ ہونا ہی اس امر کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس کا چلن شک و شبہے سے بالاتر تھا۔ اس کا ہم عصر اور اس کے باپ کا قریبی دوست الکائس بھی اس سے شادی کا تمنائی تھا اور اس نے دلسوز الفاظ میں ایک نامۂ شوق بھی لکھا جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

اس شعلۂ جبیں کا نے میرے سینے تک کو جلا دیا
اور وقت، زمانہ، سمندر اس آگ کو نہ بجھا سکے
میں نے تاروں کی سمت جھانکا تو تمہاری آنکھوں سے دوچار ہوا۔
پھولوں پر نظر ڈالی تو تمہاری مسکراہٹ نے گرویدہ بنا لیا
تم تک آنکھوں سے دل کے اندر نظر ڈالی
تو اس مندر میں تم کو جلوہ گر پایا
اے جلیل القدر سیفو! لاثانی رحمانی دیوی

عقد و نکاح سے مجھے شادماں اور بامراد کر

سیفو کا جواب عشق و محبت کی داستان کا حرف آخر سمجھا جانا چاہئے کتنا پاکیزہ، کتنا موثر اور دلآویز جذبہ ہے کہتی ہے

الکائس محبت کے معنی سے ناآشنا ہے۔
اُن معنوں سے جو میرے دل میں پنہاں ہیں
ایک خوبصورت چہرہ، خوش نما سحر کن آنکھیں
نرم و نازک ہاتھ اُسے گم راہ کر دیتے ہیں
اور پھر اُس کے ذہن پر باسی پھولوں کی باس کی طرح چھائے رہتے ہیں
لیکن میں، دائمی اور لازوال محبت کی متلاشی ہوں۔
جو میری پیٹھ کے کوز کو بھی نگاہ میں نہ لاسکے
چاہے وہ کرۂ ارض جتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، ایسی محبت جو اپنی نگاہوں ہی سے
چاہے میں پیرزال کی طرح کتنی ہی کریہ المنظر کیوں نہ ہوں
مجھ میں حسن کی دیوی کی سی ادائیں پیدا کرے
ایسی محبت جس کے شعلے کوہ آتش فشاں کی طرح ہر وقت اٹھتے رہیں
ایسی محبت جس کی روشنی اور حدت سورج کی طرح گرمائی اور سرمائی رہے
ایسی محبت جس کی دلسوزی میرے مجبور دل کا لنگر بن جائے۔

مگر ایسی پائدار محبت اس جہان فانی میں ناپید ہے۔ وہ کہاں سے آتی؟ وہ بھی اس سے محروم رہی اور بالآخر اُس نے ایک نوجوان ملاح فاؤن سے شادی کرلی۔ وہ بے وفا نکلا، اس کی لونڈی کو اغوا کر کے فرار ہو گیا۔ وہ پیچھے بیچاری مگن نامراد رہی اور آخر دل برداشتہ ہو کر جزیرہ لیوکیڈیا کی غاروں میں چھلانگ لگا کر جان دیدی۔
اُس کی شاعری سے متعلق اُس کے دوستوں اور دشمنوں میں کوئی اختلاف نہیں سب یک زبان متفق الرائے ہیں کہ وہ اس فن میں کامل تھی۔ اس کی بحر جسے سیفک سٹینزا کہتے ہیں، تمام مغربی زبانوں میں مروج ہے مگر اس میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا وہ روانی اور خوبی نہ پیدا کرسکا جو اسے ودیعت ہوئی تھی۔ وہ دنیائے شاعری کی ایک ساحرہ ہے شعر اس کے گلہائے بے خزاں ہیں، جو رشک بہار ہیں مگر وہ ماسوا چند (?) باقیات اور کف گلفروش ہو گئے۔ وہ مقلد نہیں موجد ہے، وہ راہ رو نہیں راہ نما ہے۔

اس کا کلام پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضرور مناسب ہے کہ سیفو کی جادو بیانیاں، معنی آفرینیاں اور نازک خیالیاں سے عہدہ برآ ہونا مترجم کے بس کا روگ نہیں اور مشکل اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ترجمہ بھی ترجمہ در ترجمہ ہو یعنی یونانی سے انگریزی اور پھر انگریزی سے اردو۔ ان حالات میں کلام کی اصل روح کو قائم رکھنا معلوم۔ بہرکیف جو ہو سکا حاضر ہے۔

نارسائی

میٹھے سیب کی مانند جو پیڑ کی بلند ترین شاخ پر نظر آرہا ہے۔
— انتہائی بلند مقام پر۔ جس کو مالی توڑنا بھول گیا!
بھول گیا؟ نہیں! اُسے اس تک رسائی ہی کہاں تھی!

دعا

محبت کی لازوال دیوی! آسمان کی طرح جھلمل جھلمل کرنے والے تخت کی مالک!
دیوتاؤں کی منظورِ نظر! بہلانے پھسلانے (?) والی! تیری منت کرتی ہوں!

میرے دل کو مضطرب نہ کر۔ اذیت نہ پہنچا، پاؤں تلے نہ روند !

چلو مادر !

گھر

یہ نادرست ہے کہ گھر جو شعر و شاعری کا مسکن ہو،
گریہ و زاری وہاں قدم رکھے ! تمہیں یہ زیب نہیں دیتا

پھول

اُن پہاڑوں پہ رگذر یا جن کا عاشق ہے، لہرائی سنبل
زینت شباب ! پاؤں تلے روندی گئی اسرنگوں !
ہائے وہ خوش نما پھول !

دوست

اے دوست سر تو اٹھاؤ ! آنکھیں تو ملاؤ !
اس راہ سے دل میں اتر آؤ اور میرے
تن بدن کو حسین بنا دو !

تمنا

ہماری فنا کے بعد ایسی سہانی رت بھی آئے
کہ ایک صدائے بازگشت بلند ہو اور دنیا پھر ہمارے گیتوں کو سنے

عشق

یہ ڈالی ڈالی چہچہانے والا ایک پرند ہے۔
جو اپنی رمز آمیز راگنیوں سے دنیا کو نغمتوں کے "جھولے" ہے۔
یہ ایک ہاتھ ہے کہ دل کی تار دل کو چھیڑے جا رہا ہے۔
کہیں محبت کے سُر لگاتا ہے اور کہیں دہشت ناک نفرت کے
یہ سانپ ہے جو دشمن کے تیر چلاتا ہے۔ افعی ہے جو
مار ڈالتا ہے اپنے زہر آلود نیش سے۔ برفانی کیڑا ہے۔
جو چھپ جاتا ہے۔ شیریں ترین پھل اور نفیس ترین پھول کے قلب میں
شعلہ ہے کہ ایک ہی لپک میں فنا کر دیتا ہے
آگ ہے کہ دہلنے سے اور بھڑکتی ہے۔
اور اپنے خونخوار دانتوں سے چبا کر برزخ میں ڈھکیل دیتی ہے۔
عشق امن و چین ہے، جنگ و جدل ہے، بقا و حیات ہے، فنا و موت ہے
بہشت و شادمانی ہے۔ دوزخ و کرب ہے۔
تو نے دیکھا، آن واحد میں، اس نے میری سانسیں اکھیڑ دیں۔
ٹھہرو اور دیکھو! کہ وہ کس طرح دھکیل کر مجھے موت سے ہم آغوش کر دیگا

شام

پچھلے پہر کی گود میں آ بیٹھتے ہیں، بعض گذر رہے کی پناہ میں
عرش تک پہنچنے والا باز پرواز ہلکی کر کے بستیوں کی طرف مڑ گیا ہے
سب چیزوں جیسیں سورج نے اپنی سنہری انگلی سے بکھیر دیا تھا۔

اے شام! تُو [illegible] ہے !

ایفائے عشق ۲

ابدی دیوتاؤں کی طرح وہ جوان مبارک ہے
جو تیرے قدموں میں شوق اور اشتیاق سے بیٹھتا
ہر لحظہ تیری باتیں سنتا اور تجھے اپنی آنکھوں دیکھتا ہے
میٹھی میٹھی باتیں کرتا اور مسکراہٹوں کے پھول برساتا ہے
اتنی سی بات نے میری روح کو راحت و آرام سے محروم کر دیا
اور میرے سینے میں ایک ناقابلِ بیان شورش پیدا کر دی
جب میں نے ایک نظر ڈالی تو اس کی نگاہ کے طلسم نے
میری سانسیں اکھیڑ دیں اور میری قوتِ گویائی جاتی رہی
میرا سینہ دھکنے لگا. ایک نازک مگر لطیف شعلہ
بجلی کی طرح میری نس نس میں دوڑ گیا
میری بے نور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا
میرے کانوں میں سنسناہٹ آ گئی
اوس میں بھیگی ہوئی رطوبت سے میرا بند بند تھرتھرا اٹھا
میرا جسم مدہوش رہا وحشت سے کانپ اٹھا
میری نبض کی کمزور ضربیں بالکل ساکت ہو گئیں
مجھے غش آ گیا. گر پڑی اور پھر نہ اٹھ سکی.

[illegible]

موسم بہار میں یہ بھی ہوتا ہے کہ شفاف پانی کی تہہ میں
ریت چاندی کی طرح سفید نظر آتی ہے.
بہار ایسی بھی آتی ہے کہ اس کے صیقل سے
کنول گلزار کے خوبصورت شگوفہ کی طرح کھلتا ہے
جب میں رو رہی تھی تو ایک شبیہ پانی سے اٹھی
میرے سامنے آئی اور گویا ہوئی.
سیفو محبت کی دیوانی، غم تیرا دیوانہ ہے.
سیفو، اپنے جزیرہ لیوکیڈیہ کے کنارے
ایک چٹان ہے. اس کی غاروں میں
(جن کی گونج اپالو کے مندر اور نیلے سمندر کی
بڑھتی ہوئی موجوں تک جا پہنچتی ہے)
عشاق کو خواب استراحت نصیب ہو جاتا ہے اور محبت کے دیوانوں کو تسکین مل جاتی ہے.

ڈیو کیلین کی فلس . فوبس کو محبت کے درد کا درمان یہیں میسر آیا ۔
سیفو! اٹھ! جس جگہ پہاڑوں کی بلندیاں ڈھلوان میں آتی ہیں ۔
تو اپنا وجود کاش کر پیدا ہی نہ ہوتا وہاں سے
لہروں کے حوالے کر دے ان نیلی نیلی لہروں کے جو تیرے انتظار میں ہیں"
میں اٹھتی ہوں تعمیل ارشاد ہے ، ادھر چلی پڑتی ہوں
ڈرتی ہوں مگر ڈر سے زیادہ ڈراؤنی محبت ہے
اس محبت سے تو ویرانی اور خوف کہیں بہتر!
آہ نعوذ سے تو نیلی لہریں بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہیں!
اے موافق ہواؤ! میری رکھوالی کرنا!
اے عشق کے دیوتا کیوپڈ! اپنے پر مستعار دے ڈال کر میں سمندر کو پار کر لوں
اور اے سورج دیوتا تیرے مندر میں
اس نظم کے ساتھ! میں اپنا رباب بھی پھینک دوں گی
سیفو اپنا رباب سورج دیوتا کی نذر کرتی ہے!
یہ تحفہ دیوتا کے لئے! مال عرب پیش عرب

—— ۲ ——

تف ہے تجھ پر!
کیا سورج دیوتا کے آستانہ پر مجھے جانا واجب ہے"
لعنت! یہ دیوتا میری نگاہوں میں کیا وقعت رکھتا ہے ۔
کیا تو مجھے اس چاہِ ذلت میں گرنے دے گا؟
یہ ٹوٹی پھوٹی ناتراشیدہ چٹانیں میرے سینے کی دھجیاں بکھیر دیں گی
اس تباہ و برباد سینے کی جس نے تجھے پیار کیا!
آہ وہ نغمہ جس کو موسیقی نے خود جنم دیا تھا
میرا ساتھ چھوڑ رہا ہے ۔ میرا سرود اب ٹوٹ چکا ہے ۔
میرا کوئی یار و مددگار نہیں رہا ۔
اس تاریکی میں تاروں کی چمک بھی پھیکی پڑ گئی ہے
الوداع ایونان کی لڑکیو! الوداع
جب میری زبان بند ہو جائے گی تو یہ کنج میرے نغموں سے کیونکر گونجیں گے!
اور یہ ہاتھ حیات آور عشق کے دل کش سُر چھیڑنے کے لئے کس طرح اٹھیں گے!

۳

آہ! وہ فرار ہوگیا!
آسودگی اور شادمانی واپس آجا!
ایک بار میری روح کو پہلی سی اُلاپ لینے دے۔
ایک بار اسی جان بخش نور سے میرے سینے کو منور کردے
دیوتاؤ! میری کوئی دعا قبول نہ ہوگی!
کیا میرا کوئی گیت بھی واپس نہیں لاسکتا اس گم گشتہ کو؟
کیا میری کوئی آہ، میری کوئی التجا نہیں بلا سکتی، اُس گم راہ کو؟
میری جان! میری روح! میری کائنات
آجا! آجا!
اپنے بادبان ہوا میں بلند کردے!
وقت کے پاٹ کو سمیٹ دے۔ میرے لئے اُسے واپس لے آ۔
اے وس دحبت کی دیوی، ہواؤں کو تیرے لئے سازگار کردے گی
ایفروڈائٹ (محبت کی دیوی کا دوسرا نام) کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے
آسمان جس جگہ نفاق ڈالنے والے بادلوں کو تتر بتر کردیتا ہے
اُسی افق سے اپنا سفید بادبان بلند کر
اگر تیرا بادبان بلند نہ ہوا تو ان نیلی نیلی گہرائیوں پہ
(جنہیں ڈیوکیلین نے پناہ گاہ بنایا تھا) اسی طرح تاریکیاں چھائی رہیں گی
اگر تیرا سفید بادبان بلند نہ ہوا تو یہ خوفناک موجیں
مجھے موت سے ہم آغوش کردیں گی یا خود فراموشی ہی میرا انجام ہوگا

یہ کچھ لکھ چکنے کے بعد صرف شیکسپیئر کا ایک شعر جس کا اطلاق سیفو پر پورا پورا ہوتا ہے پیش کرنا باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے

میں نور و نسیم ہوں۔ اپنے دوسرے عناصر
سونپ دیتی ہوں۔ فطرتِ ادنیٰ کو۔

حافظ کا معشوق

اشعار حافظ کا ایک نئے زاویے سے مطالعہ

پروفیسر سید حسن

خواجہ حافظ شیرازی کی شہرت کا سبب ان کا وہ کلام ہے جو سراسر عشق و محبت کے والہانہ جذبات و احساسات سے لبریز اور شیفتگی و وارفتگی کے مطالب سے مملو ہے۔ لوگ ان کی محبت کو عشق حقیقی سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے اشعار کو حقیقت و عرفان کا آئینہ سمجھتے ہیں لیکن جذبات عشق اور معاملات محبت جس وضاحت و صداقت سے حافظ کے اشعار میں بیان ہوئے ہیں اُس سے گمان غالب ہوتا ہے کہ یہ عشق حقیقی محبت مجازی کی منزل سے ضرور گزری ہے۔

صوفیہ نے جوانی میں ماہرویوں سے محبت کی ہے اور اس محبت کو اپنی پاکبازی و روحانیت، سرمستی و سرشاری اور صدق و صفا کے ذریعے عشق حقیقی کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ جوانی میں کون ایسا دل ہے جو محبت کی لذت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے خواجہ حافظ کا کسی پری رو سے دل لگانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ پھر حافظ کا مولد و موطن ایک ایسا شہر تھا جس کا حسن شہرہ آفاق رہا ہے۔ خود حافظ نے اپنے شہر کی خصوصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

شیراز معدن لب لعلست و کان حسن
من جوہری مفلسم ازاں مشوشم
شہریست پر کرشمۂ خوباں ز شش جہت
چیزیم نیست ورنہ خریدار ہر ششم

ترکان شیرازی، لولیان شوخ و شیریں کا اور شاہدان طناز کے کمند گیسو میں حافظ ایسے حسن پرست کا دل کیونکر نہ گرفتار ہوتا۔ انھوں نے اپنی دلبازی و رندی کا کھلم کھلا اعلان کیا ہے۔

من دوستدار روی خوش و موی دلکشم
مدہوش چشم مست و می صاف بیغشم

حافظ کے اشعار شاہد ہیں کہ انھوں نے شیراز کے غزالان زیبا سے محبت کی ہے۔ اور انھیں اپنی غزلوں کا مخاطب تمناؤں کا کعبہ اور ارمانوں کا مرجع بنایا تھا۔ ان کے معشوق دنیا بھر کے معشوقوں کی طرح شوخ و شنگ، کرشمہ ساز، غمزہ طراز، عربدہ جو، تغافل کیش، بے وفا، سنگ دل عہد شکن، عاشق کش اور ناز آفریں تھے۔ جس کی وجہ سے حافظ کو چشم نمناک،

اشک خونیں، آہ آتشبار، سینہ بریاں، قلب سوزاں، گریۂ سحری، نیاز نیم شبی، اضطراب پیہم، درد فراق، حسرت وصل اذیت رقیب، ملامت ناصح، غرض عشق بازی کی تمام حالتوں اور کیفیتوں سے واسطہ پڑا۔ انھوں نے اپنے غم عشق کا مداوا مے نوشی میں ڈھونڈا اور درد کا درماں سرمستی کو بنایا۔

حافظ کے معاشقہ کے بارے میں مختلف داستانیں مشہور ہیں، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ "دردانہ" نامی ایک چاردہ سالہ دوشیزہ پر عاشق تھے اور اس کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

عشق دردانہ است و من غواص و دریا میکدہ
سر فرو بردم در آنجا تا کجا سر برکنم

وہ کہ دردانۂ چنیں نازک در شب تار سفتنم ہوس است

جان بشکرانہ کنم صرف گر آں ۔ دانۂ در
صدف دیدۂ حافظ شود آرامگہش

حافظ کی ایک غزل ہے جس کی ردیف "فرخ" ہے روایت مشہور ہے کہ فرخ، حافظ کی ایک محبوبہ کا نام تھا اور یہ غزل اسی کے نام پر لکھی گئی ہے۔

دل من در ہوای روی فرخ بود آشفتہ ہمچوں موی فرخ
شود چوں بید لرزاں سرو آزاد اگر بیند قد دلجوی فرخ
بدہ ساقی شراب ارغوانی بیاد نرگس جادوی فرخ
اگر میل دل ہر کس بجای است بود میل دل من سوی فرخ

غلام ہمت آنم کہ باشد
چو حافظ بندہ و ہندوی فرخ

لیکن جس قصے کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ شاخ نبات کا افسانہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاخ نبات ایک نوجوان عورت تھی جو حافظ کی منظور نظر بن گئی تھی۔ چونکہ حافظ فقیر درویش تھے۔ وصل کی کوئی صورت میسر نہ آتی تھی۔ انھوں نے منت مانی اور مزار بابا کوہی پر جاکر چلہ کشی کی۔ چوتھی رات کو نماز و نیاز کے بعد نیند آئی تھی کہ خواب میں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے دیدار سے مشرف ہوئے جنھوں نے خزائن غیب کے دروازے ان کے قلب پر کھول دیئے اور علم و عرفان کی دولت عطا کی۔ جب حافظ خواب سے بیدار ہوئے تو اپنے کو شاعر و عارف پایا۔ اور وہ مشہور غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

دردانہ۔ فرخ یا شاخ نبات کا کوئی وجود تھا یا نہیں وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ حافظ کے کسی ہمعصر مورخ یا سوانح نگار نے ان معشوقوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ بعد کے شارحین کلام حافظ اور تذکرہ نویسوں نے ان کے اشعار سے یہ نام اخذ کرکے داستانیں ایجاد کرلی ہیں۔ درحقیقت حافظ کے کلام میں بہت سے ایسے اشارے اور کنائے ملتے ہیں جن کی بنا پر اس قسم کی خیال آرائی کی خاصی گنجائش ہے۔ بلکہ حافظ کے معشوقوں کی فہرست ان ہی تین ناموں تک محدود نہیں ہے۔

ں میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور ممتاز نام شیراز کے شہزادہ شاہ شجاع کا ہے جس سے
حافظ نے زور و شور کے ساتھ محبت کی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ بات شاید بے بنیاد اور غیر متوقع معلوم ہو لیکن اگر ہم حافظ کے
اشعار کا ان کے عہد کی تاریخ کی روشنی میں غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں تو اس قیاس آرائی کے لئے نہایت واضح اور
قابل تردید اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔

شاہ شجاع یزد کے حاکم امیر مبارز الدین کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ولادت یزد میں ۷۳۳ھ میں ہوئی تھی۔ وہ نہایت
حسین و جمیل تھا۔ اس کے حسن و جمال کا تذکرہ اس عہد کی سب تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔ اس زمانے کے علمائے یزد میں
مولانا معین الدین یزدی بھی تھے جو اپنے شہر میں علوم عقلی و نقلی کی تدریس و تعلیم میں اپنے اوقات عزیز صرف کرتے تھے۔ ان
کے حلقۂ درس و افاضت میں شہزادہ شجاع بچپن ہی سے بڑی عقیدت و اخلاص کے ساتھ شریک ہو کر علوم دینیہ اور
کمالات انسانیہ حاصل کرتا تھا۔ شاہ شجاع کی فرمائش و استدعا پر مولانا معلم یزدی نے خاندان مظفری کی ایک مستند تاریخ لکھی
جس کا نام مواہب الٰہی ہے جو تقریباً ۷۶۷ھ میں مکمل ہوئی اس کتاب میں امیر مبارز الدین اور شاہ شجاع کے حالات زندگی اور
کارنامے شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ شاہ شجاع کی ولادت کا حال لکھتے ہوئے معلم یزدی نے شہزادہ کے حسن و جمال کا تذکرہ ان
الفاظ میں کیا ہے۔

"آفتابی بود کہ چوں برآمد در ہر زاویہ تحفۂ نور فرستاد ماہی بود کہ چوں از مطلع سر بر زد
ظلمت اندوہ منقشع گشت" (مواہب الٰہی ص۴۳ چاپ تہران)

دوسری جگہ شہزادہ کو "ماہ نو سپہر بادشاہی" کہا ہے۔ ایک اور موقع پر جب امیر مبارز الدین مظفر نے اوغانی اور جرمائی قبیلوں
کا قلع قمع کرنے کے لئے فوج کشی کی تو شہزادہ شجاع ہمرکاب ہو گیا۔ اس وقت شہزادہ کا سن سولہ سال تھا۔ معلم یزدی نے شاہزادہ
کی شجاعت اور حسن کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

"سرولیست در چمن دلاوری بالا کشیدہ سرسبزی آب تیغ و ہوائی معرکہ داند۔ آفتابیست
کہ از مطلع بسالت سر بر دلی آمدہ بلندی از تیغ آزمائی و جہانگیری شناسد۔"
(مواہب الٰہی ص۲۰۰)

نامور مورخ عبدالرزاق سمرقندی نے بھی اپنی کتاب مطلع السعدین میں شہزادہ شجاع کی خوبصورتی کا حال لکھا ہے۔ اس
کے الفاظ یہ ہیں:-

"شاہ شجاع روی خوب و منظری محبوب و شمائل مرغوب داشت و فضلائی زمان از انوار
او اقتباس می نمودند و در میدان شجاعت رستم دستان و اسفندیار دوران بود"

۷۵۴ھ میں امیر مبارز الدین مظفر نے شیراز کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ حافظ نے
غالباً پہلی بار شہزادہ کو یہیں دیکھا۔ حسن پرست اور عشق پیشہ حافظ حسین و خوبصورت شہزادے کو دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار
ہو گئے۔ اس وقت خواجہ حافظ کا سن تقریباً ۳۰ برس تھا اور شاہزادہ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ حافظ نے اسے اپنی غزلوں کا موضوع
بنا لیا اور رمز و کنایہ میں اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ اس وقت تک خواجہ حافظ دربار سلطانی سے متوسل نہیں
ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ شروع میں شاہ شیخ ابو اسحٰق اینجو فرمانروائے شیراز کے دربار سے وابستہ تھے اور شاہ اسحٰق امیر مبارز الدین

مظفر کے دشمنوں میں تھا۔ اس کے علاوہ امیر مظفر بہت تند خو اور درشت گو بادشاہ تھا۔ شیراز پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی سلطنت میں تمام شراب خانوں کو بند کرا دیا اور سخت احتساب جاری کر رکھا تھا۔ حافظ کی آزاد طبیعت اس کی تند خوئی اور سخت گیری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے دربار شاہی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ حافظ نے کئی غزلوں میں امیر مبارز الدین کی سخت گیری پر تنقید کی ہے۔

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند — پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر می کنند
گویند رمز عشق مگویید و مشنوید — مشکل حکایتی است کہ تقریر می کنند

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است
بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است
بہ آب دیدہ بشوئیم خرقہ ہا از می
کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

بود آیا کہ در میکدہ ہا بگشایند — گرہ از کار فروبستۂ ما بگشایند

تاریخ کی کتابوں میں ایک اور واقعہ مرقوم ہے جس سے شاہ شجاع کی خوبصورتی کی تصدیق ہوتی ہے۔ امیر مبارز الدین کو منجموں نے یہ خبر دی تھی کہ اسے ایک بلند قامت نوجوان ترک سے ملال و صدمہ پہنچے گا۔ وہ ہمیشہ سلطان اویس جلائر بن امیر شیخ حسن بزرگ ایلکانی فرمانروائے عراق سے خائف رہتا تھا کیونکہ اس کی نگاہ میں یہ نوجوان بادشاہ منجموں کے بتلائے ہوئے اوصاف کا حامل تھا لیکن امیر مظفر کو اپنے بڑے بیٹے شاہ شجاع کا خیال نہ آیا حالانکہ یہی شہزادہ بقول مؤلف "حبیب السیر" بدکمال ترایں صفات را واجد بود یعنی جوانی بود ترک نژاد و بلند و بالا و خوش سیما۔ امیر مبارز الدین کے آخر عمر میں منجموں کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ اس نے اپنے دو بیٹوں شاہ شجاع اور شاہ محمود سے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کو اندھا کر دینے کی دھمکی دی۔ خوفزدہ ہو کر دونوں شہزادوں نے سازش کی اور باپ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔

شیراز کی زمام حکومت اب شاہ شجاع نے سنبھال لی۔ وہ آزاد منش اور خوش مشرب شخص تھا۔ اس نے میکدوں کے سے پابندیاں اٹھا دیں اور غیر متعصبانہ رویہ اختیار کیا۔ خود صاحب ذوق شاعر تھا، شاعروں اور ادیبوں کی پرورش اور قدر افزائی کرتا تھا۔ خواجہ حافظ نے بھی دربار میں رسائی حاصل کر لی اور شاہ شجاع سے دوستی اور تقرب پیدا کیا۔ شاہ شجاع ۷۵۹ھ میں تخت نشین ہوا اور اس کی وفات ۷۸۶ھ میں ہوئی اس طرح خواجہ حافظ اور شاہ شجاع کی دوستی و آشنائی تقریباً ۲۷ برس تک قائم رہی۔ اس مدت میں حافظ نے بیسیوں غزلیں لکھیں جن کا مخاطب شاہ شجاع ہے۔ ایسی غزلیں تین طرح کی ہیں ایک تو وہ جن میں صراحتہً شجاع کا نام یا اس کا لقب "ابوالفوارس" استعمال کیا ہے۔ دوسری وہ جن میں اس کو صرف بادشاہ، سلطان، خسرو، شہنشہ، پادشہ، شہریار، شاہ، شاہ عالم، ملک فرمان دہ، جمشید کامگار، دادگر کے خطابات سے یاد کیا ہے۔ ان دونوں قسموں کی مدحیہ غزلوں میں حافظ شجاع کے لئے وہ تمام آداب احترام ملحوظ رکھتے ہیں جو ایک درباری شاعر کے لئے لازمی ہیں نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش

محل نور تجلی است رای انور شاہ چو قرب او طلبی در صفائی نیت کوش

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد
دل رمیدہ مارا انیس و مونس شد
خیال آب خضر بست و جام کیخسرو
بجرعہ نوشی سلطان ابو الفوارس شد
در عہد پادشاہ خطا بخش و جرم پوش
حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش
ای پادشاہ صورت و معنی کہ مثل تو
نادیدہ ہیچ دیدہ و نشنیدہ ہیچ گوش

تیسری قسم کی غزلیں وہ ہیں جو سرتاسر عاشقانہ ہیں اور جن میں حافظ نے شاہ شجاع کو ایسے القاب سے یاد کیا ہے جو صرف معشوق کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ القاب بھی چار قسم کے ہیں۔

اول وہ جو عشقیہ شاعری میں عام طور پر مستعمل ہیں۔ دلبر دلآرام یار۔ ماہ۔ صنم۔ جان۔ نگار دلدار۔ آفتاب خوباں۔ زہرہ جبین زبین۔ دوست۔ بت وغیرہ۔

دوم معشوق کے بادشاہ ہونے کے لحاظ سے۔ شاہ خوباں۔ شاہ حسن۔ شاہ ترکاں، شاہ وش۔ مہ صاحبقراں۔ سلطان خوباں۔

سوم معشوق کے ترک نژاد ہونے کے اعتبار سے۔ ترک۔ ترک شیرازی۔ شاہ ترکان ترک عاشق کش۔ ترک پریچہرہ۔

چہارم معشوق کے سرو قامت ہونے کے لحاظ سے (تاریخ کی کتابوں میں جہاں شاہ شجاع کے حسن کی توصیف کی گئی ہے۔ اس کے سرو قد ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے) سرو بلند۔ سرو سہی۔ سرو چمان، سرو خراماں۔ سرو قامت۔ بالا بلند۔

بعض شعروں میں حافظ اپنے ممدوح اور محبوب کا تذکرہ ایک ساتھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہ لوگ بھی جو ان کے راز عشق سے واقف نہیں ہیں سمجھ جائیں کہ دونوں ایک ہیں۔

اگرچہ حسن فروشان بجلوہ آمدہ اند
کسی بحسن و ملاحت بیار ما نرسد
ای مہ صاحبقراں از بندہ حافظ یاد کن
تا دعای دولت آں حسن روز افزوں کنم

حافظ کو شاہ شجاع سے اس قدر قلبی لگاؤ تھا کہ وہ اپنے محبوب و ممدوح کی جدائی ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ وہ خود اس حالت کو ذیل کے شعر میں بیان کرتے ہیں۔

آندم کہ با تو باشم یک سال ہست روزے
آندم کہ بی تو باشم یک لحظہ ہست سالے

۷۶۵ھ میں بادشاہ اور اس کے بھائی شاہ محمود کے درمیان سلطنت موروثی کی تقسیم کے لئے جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں شاہ شجاع کے بعض ساتھی اور رشتہ دار اس کو دغا دے کر شاہ محمود سے مل گئے۔ مہینوں تک لڑائی ہوتی رہی،

آخر میں شاہ شجاع کو شکست ہوئی اور اسے مجبوراً شیراز چھوڑ کر کرمان میں پناہ لینا پڑی۔ شیراز پر شاہ محمود کا تسلط ہو گیا۔ شاہ شجاع تقریباً دو سال تک شیراز سے باہر رہا۔ شاہ محمود کا دور حکومت یوں تو عام شیرازیوں کے لئے سخت گذرا کیونکہ شاہ محمود نالائق اور ظالم بادشاہ تھا لیکن حافظ کے لئے اپنے محبوب سے جدائی کا یہ زمانہ بڑا صبر آزما اور حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ اس زمانے میں حافظ نے بڑی پر تاثیر غزلیں لکھی ہیں جن میں انھوں نے غم فرقت کی تمام کیفیتوں کو بڑے دردناک لہجے میں بیان کیا ہے۔ ذیل کے اشعار ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

غم محبوب سے جدائی کا ملال۔

آں ترک پری چہرہ کہ دوش از بر ما رفت — آیا چہ خطا دید کہ از راہ خطا رفت
تا رفت مرا از نظر آں چشم جہاں بین — کس واقف ما نیست کہ از دیدہ چہا رفت
دور از رخ تو دمبدم از گوشۂ چشم — سیلاب سرشک آمد و طوفان بلا رفت
شربتی از لب لعلش نہ چشیدم و برفت — روی مہ پیکر او سیر ندیدم و برفت
شد چناں در چمن حسن و لطافت لیکن — در گلستان وصالش نہ چمیدم و برفت

ہمچو حافظ ہمہ شب نالہ و زاری کردیم
کای دریغا بوداعش نرسیدیم و برفت

محبوب کو پیغام محبت اور دعا و ثنا کے نذرانے بھیجتے ہیں۔

ہدہد صبا بسبا می فرستمت — بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت
ای غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل — می گویمت دعا و ثنا می فرستمت
تا مطرباں ز شوق منت آگہی دہند — قول و غزل بساز و نوا می فرستمت

لیکن شاہ شجاع کو سیاسی جوڑ توڑ اور جنگ و جدل سے اتنی مہلت کہاں ملتی تھی کہ وہ حافظ کے پیغام محبت کا جواب دے۔ حافظ دل شکستہ ہو کر اپنی محرومی کا گلہ کرتے ہیں۔

دیر ست کہ دلدار پیامی نفرستاد — ننوشت سلامی و کلامی نفرستاد
صد نامہ فرستادم و آں شاہ سواران — پیکی ندوانید و سلامی نفرستاد
حافظ بہ ادب باش کہ واخواست نباشد — گر شاہ پیامی بغلامی نفرستاد

مایوسی اور بیچارگی کے عالم میں حافظ باربار صبا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ دوست کی خبر لائے اور ان کا حال جا کر دلدار کو سنائے۔

صبا اگر گذری افتدت بہ کشور دوست
بیار نفحہ از گیسوی معنبر دوست
بجان او کہ بشکرانہ جاں بر افشانم
اگر بسوی من آری پیامی از بر دوست
من گدا و تمنای وصل او ہیہات
مگر بخواب ببینم خیال منظر دوست

مرحبا ای پیک مشتاقاں بدہ پیغام دوست
تا کنم جاں از سر رغبت فدای نام دوست

ای صبا نکہتی از کوی فلانی بمن آر
زار و بیمار غمم راحت جانی بمن آر

ای صبا نکہتی از خاک رہ یار بیار
ببر اندوہ دل و مژدۂ دلدار بیار

روزگاریست کہ دل چہرۂ مقصود ندید
ساقیا آں قدح آئینہ کردار بیار

ای پیک راستاں خبر یار ما بگو	احوال گل بہ بلبل دستاں سرا بگو
گر دیگرت بر آں در دولت گذر بود	بعد از ادای خدمت عرض دعا بگو
برایں فقیر نامہ آں محتشم بخواں	با ایں گدا حکایت آں پادشا بگو

محبوب کی جدائی میں آہ و نالہ اور فریاد و گلہ کے ساتھ حافظ اس کی صحت و سلامتی اور اس کے حسن کی ترقی کی دعائیں بھی کرتے تھے۔

تنت بناز طبیباں نیازمند مباد	وجود نازکت آزردہ گزند مباد
جمالت آفتاب ہر نظر باد	ز خوبی روی خوبت خوبتر باد
بہاں مشتاق روی تست حافظ	ترا در حال مشتاقاں نظر باد

حافظ بادشاہ کے واپس آنے کی تمنا کرتے اور دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

زہی خجستہ زمانی کہ یار باز آید	بکام غمزدگاں غمگسار باز آید
مقیم بر سر راہش نشستہ ام چوں گرد	بداں ہوس کہ بدیں رہگذار باز آید
یا رب آں آہوی مشکیں بختن باز رساں	واں سرو خراماں بچمن باز رساں
دل آزردۂ مارا بہ نسیمی بنواز	یعنی آں جان ز تن رفتہ بتن باز رساں
سخن اینست کہ بی تو نخواہیم حیات	بشنو ای پیک خبر گیر و سخن باز رساں
آنکہ بودی وطنش دیدۂ حافظ یا رب	بمرادش ز غریبی بوطن باز رساں

حافظ کی تمناؤں اور پر خلوص دعاؤں کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے ایک رات خواب دیکھا کہ

دیدم بخواب دوش کہ ماہی برآمدی	کز عکس روی او شب ہجراں سرآمدی
تعبیر رفت کہ یار سفر کردہ می رسد	ای کاش ہر چہ زود ترا ز در درآمدی
ذکرش بخیر ساقی فرخندہ فال من	کز در مدام با قدح و ساغر آمدی

حافظ فطرۃً خوش بین و متفاول ہیں وہ پر امید ہیں کہ ان کا محبوب جلد اپنے وطن کو لوٹ آئے گا۔ ایام ہجر میں وہ اسی امید پر زندگی گذارتے ہیں کہ

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد	عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

ایں لطافت کہ کشید از غم ہجراں بلبل
تا سراپردۂ گل نعرۂ زناں خواہد شد

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

حافظ مکن اندیشہ کہ آں یوسف مصری باز آید و از کلبۂ احزاں بدر آئی

آخر مہینوں کی آہ وزاری، نالہ و فریاد، پیام و سلام، تنہائی و گوشہ گیری، دعا و تمنا اور بے قراری و امیدواری کے بعد غم ہجراں کا دور ختم ہوا اور وصل کی ساعت آپہنچی۔ دو سال کی ناکامی و آوارہ گردی کے بعد شاہ شجاع نے یزد پر چڑھائی کر کے ۷۶۷ ہجری میں اسے فتح کرلیا اور تخت شاہی پر دوبارہ متمکن ہوا۔ اس موقع پر عام شہریوں کو خوشی لیکن حافظ کی مسرت و شادمانی کی کوئی حد نہ تھی۔ انھوں نے اپنے محبوب بادشاہ کی کامیابی و بازگشت کے متعلق ولولہ انگیز غزلیں لکھی ہیں جو کہ جوش مسرت اور مژدہ تہنیت سے لبریز ہیں۔

روز ہجراں و شب فرقت یار آخر شد زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد
آں ہمہ ناز و تنعم کہ خزاں می فرمود عاقبت در قدم باد بہار آخر شد
شکر ایزد کہ باقبال کلاہ گوشۂ گل نخوت باد دی و شوکت خار آخر شد
آں پریشانی شبہای دراز و غم دل ہمہ در سایۂ گیسوی نگار آخر شد
سحرم دولت بیدار بہ بالیں آمد گفت برخیز کہ آں خسرو شیریں آمد
قدحی درکش و سرخوش بتماشا بخرام تا بہ بینی کہ نگارت بچہ آئین آمد

ایک اور موقع پر حافظ بادشاہ کی جدائی سے اسی قسم کی حالت و کیفیت میں مبتلا ہوئے تھے۔ ۷۷۰ — ۷۶۹ھ میں شاہ اپنی بیٹی کی ملاقات کو یزد گیا جہاں اس کا داماد اور بھتیجا شاہ یحیٰی اس کی طرف سے حاکم تھا۔ شاہ شجاع وہاں چند دنوں تک اقامت پذیر رہا۔ اس موقع پر بھی حافظ اس کی فرقت میں بہت بیقرار ہوئے۔ ان کے اشعار سے ان کی بیقراری کا پتا چلتا ہے۔ وہ بادشاہ کو بار بار "یار سفر کردہ" کے لقب سے یاد کر کے اپنے اندوہ و فراق اور غم جدائی کو بیان کرتے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

بادشاہ صرف ایک ہفتہ یزد میں رہا لیکن یہ قلیل مدت بھی حافظ کو بڑی شاق گذری۔

ماہم ایں ہفتہ برون رفت و بچشمم سالیست
حال ہجراں تو چہ دانی کہ چہ مشکل حالیست
کوہ اندوہ فراقت بچہ حالت بکشد
حافظ خستہ کہ از نالہ تنش چوں نالیست

حافظ کو اس بات کا ملال ہے کہ بادشاہ نے سفر کرتے وقت اس کو خبر نہ دی۔

دلبر برفت و دلشدگاں را خبر نہ کرد یاد حریف شہر و رفیق سفر نہ کرد

بادشاہ کی جدائی میں حافظ کا حال۔

دوش آگہی زیار سفر کردہ داد باد من نیز باد دہم ہرچہ بادا باد

خوش شد دلم بیاد تو ہر گہ کہ در چمن بندِ قبای غنچۂ گل میکشاد باد

بادشاہ کی سلامتی کے لئے دعائیں۔

ای غائب از نظر بخدا می سپارمت جانم بسوختی و بدل دوست دارمت

تا دامن کفن نکشم زیر پائی خاک باور مکن کہ دست ز دامن بدارمت

آن سفر کردہ کہ صد قافلۂ دل ہمرہ اوست

ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

یار سفر کردہ کی واپسی کی دعا۔

یارب سببی ساز کہ یارم بسلامت بازآید و برہاندم از بند ملامت

بیقراری جب حد سے گذر جاتی ہے اور رنج و فراق ناقابل تحمل ہو جاتا ہے تو حافظ یزد جانے کا قصد کرتے اور غربت

بت برداشت کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔

چو باد عزم سر کوی یار خواہم کرد

نفس ببوی خوشش مشکبار خواہم کرد

حال آنکہ انھوں نے اس سے پہلے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا لیکن بادشاہ کی کشش نے شیراز چھوڑنے پر مجبور کیا۔

من کز وطن سفر نگزیدم بعمر خویش

در عشق دیدن تو ہوا خواہ غربتم

حافظ کا عزم مصمم تھا۔ وہ دریا کو طے کر کے یزد پہنچ ہی گئے۔ حافظ کے بعض سوانح نگار نے یہ بتایا ہے کہ حافظ نے ...

ر کا سفر کیا تھا اس سفر کا مقصد شاہ یحییٰ کی آستان بوسی اور مدح گذاری تھا چنانچہ وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

ای فروغِ ماہِ حسن از روی رخشان شما

آبروی خوبی از چاہ زنخدان شما

شاہ یحییٰ کو مخاطب کر کے لکھی گئی لیکن سوانح نگاروں نے یہ واقعہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اسی زمانہ میں شاہ شجاع بھی یزد کو گیا تھا

سطور کا خیال ہے کہ حافظ کے سفر کا اصلی مقصد یہ تھا کہ شاہ شجاع کا دیدار حاصل کریں۔ چنانچہ اس مقصد کی طرف صاف

، مندرجہ ذیل شعر میں موجود ہے۔

دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن

در کوی او گدائی بر خسروی گزیدن

از جاں طمع بریدن آساں بود ولیکن

از دوستانِ جانی مشکل تواں بریدن

یزد میں چند روز ٹھیر کر شاہ شجاع شیراز کو واپس چلا گیا۔ لیکن حافظ اس کے ہمراہ نہ جا سکے۔ ان کے پاس سفر کا توشہ

ٹرد نہ تھا۔ شاہ یحییٰ سے جو انعام و اکرام کی امید تھی وہ پوری نہ ہوئی اس کی مدح سرائی کا صلہ نہ ملا۔

شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

مجبوراً حافظ کو یزد میں چند روز رک جانا پڑا یہ زمانہ ان کے لئے بڑی پریشانی کا تھا۔ ایک طرف تو شاہ شجاع سے دوری دوسری طرف شاہ یحییٰ کی عدم التفاتی، غریبی اور مفلسی سے پریشان ہو کر حافظ نے یزد کی تلخ زندگی اور اس شہر کی مذمت میں کئی اشعار لکھے ہیں جن میں یزد کو منزل ویران کہا ہے اور شیراز کو مراجعت کی تمنا ظاہر کی ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم — راحت جاں طلبم وز پی جاناں بروم

دلم از وحشتِ زنداں سکندر بگرفت — رخت بربندم و تا ملک سلیماں بروم

چوں صبا باتن بیمار و دل بی طاقت — بہواداری آں سرد خراماں بروم

اتفاقاً ان ہی دنوں خواجہ جلال الدین توران شاہ وزیر شاہ شجاع یزد میں موجود تھا اور شیراز کو واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا حافظ نے موقع کو غنیمت جان کر اس کے ہمراہ جانے کی خواہش ظاہر کی اور ایک قصیدے میں اپنی پریشانی کو بیان کرتے ہوئے اس سے اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی۔

مرادلیست پریشاں بدست غم پامال — چنانکہ ہیچ کسم نیست واقف احوال

شکستہ خاطرم و تنگدل چو حلقہ میم — خمیدہ پشت جفا دیدہ گاہ غصہ چو دال

ز ملک خویش بغربت فتادہ الم زنیساں — کز نیستم بجہاں یکدرم زمال و منال

عزیمتِ وطن خود نمی توانم داشت — بماندہ عاجز و مسکیں چو مرغ بی پر و بال

غریب و مفلس و محتاج و چنیں شہری

ہیچ نوع ندارم زخلق روی سوال

توران شاہ نے حافظ کی درخواست منظور کر لی اور حافظ پھر اپنے وطن واپس آئے وزیر کے اس احسان کے بدلے میں حافظ نے متعدد غزلوں میں اسکی مدح سرائی کی ہے۔

اسی زمانے میں جزیرۂ ہرموز کے حاکم تہمتن بن توران شاہ نے بھی حافظ کو گرانبہا ہدایا و تحائف بھیج کر ان کو اپنے دربار میں بلوانا چاہا لیکن سفر یزد کے تلخ تجربے کے بعد حافظ نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ اور درحقیقت یزد سے واپس آکر وہ عزلت نشین ہو گئے تھے وہ شاہ شجاع اور شیراز کو چھوڑ کر باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ حافظ کے کئی اشعار اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دل جدا ای جان من بر وعدۂ شاہ و وزیر

کسی نمی داند کہ کارش از کجا خواہد گشاد

رو توکل کن نمیدانی کہ از کلک من

نقش ہر صورت کہ زد رنگی دگر بیروں فتاد

بی نوای سر دردان گل و گلشن چہ کنم

زلف سنبل چہ کشم عارض سوسن چہ کنم

شاہ ترکاں چو پسندید و بچاہم انداخت

دستگیر ار نہ شود لطف تہمتن چہ کنم

اندریں منزل ویرانہ نشیمن چہ کنم

۷۷۶ھ میں شاہ شجاع نے سلطان حسین جلایر فرماں روائے عراق کی کم سنی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر تبریز پر چڑھائی کر دی سلطان حسین کو شکست ہوگئی اور شاہ شجاع تبریز پر قابض ہوگیا کچھ سیاسی مصالح اور کچھ عیش و خوش گذرانی کی خاطر شاہ شجاع تبریز میں چار مہینے ٹھہر گیا۔ خواجہ حافظ کو اس موقع پر بھی بادشاہ کی جدائی کا غم ہوا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل غزل میں بادشاہ کی عدم توجہی کی شکایت کی ہے۔

یاد باد آنکہ ز ما وقت سفر یاد نہ کرد بوداعی دل غم دیدۂ ما شاد نہ کرد

اسی حالت ذوق اور کیف فراق میں حافظ نے یہ غزل لکھ کر بادشاہ کو بھیجی۔

ای صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس بوسہ زن بر خاک آں وادی و مشکیں کن نفس؟

نام حافظ گر برآید بر زبان کلک دوست

از جناب حضرت شاہم بس است ایں ملتمس

مذکورہ بالا بیانات اور اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کے دل میں شاہ شجاع کی بے انتہا محبت تھی۔ شاہ شجاع حافظ کا صرف مربی و ممدوح نہ تھا بلکہ وہ ان کا محبوب و معشوق بھی تھا۔ حافظ کی یہ محبت ایسے زمانے میں ہوئی جب شاہ شجاع نوجوان تھا اور حافظ عہد پیری میں داخل ہو چکے تھے۔ خود حافظ نے اس حقیقت کی طرف بھی بار بار اشارہ کیا ہے۔

پیرانہ سرم عشق جوانی بسر افتاد واں راز کہ در دل بہ نہفتم بدر افتاد

چنگ خمیدہ قامت میخواندت بعشرت بشنو کہ پند پیراں ہیچت زیاں ندارد

دریں باغ از خدا خواہد دگر پیرانہ سر حافظ

نشیند بر لب جوی و سروی در کنار آید

ای دل شباب رفت و نچیدی گلی ز عیش

پیرانہ سر مکن ہنری ننگ و نام را

قدح پر کن کہ من در دولت عشق جواں بخت جہانم گرچہ پیرم

شاید بعض حضرات جو حافظ کے تقوی و تقدس کو اعلیٰ درجے کا قرار دیتے ہیں شاہ شجاع سے ان کی غیر فطری محبت کو محض بہتان تصور کریں گے۔ لیکن خود حافظ نے اپنے معشوق کی جو توصیف اشعار میں کی ہے اس معاملے میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں ہے۔

ای نازنیں پسر تو چہ مذہب گرفتہ ای

کت خون ما حلال تر از شیر مادر است

گر آں شیریں پسر خونم بریزد دلا چوں شیر مادر کن حلالش

بتی دارم کہ گرد گل ز سنبل سایباں دارد

بہار عارضش خطی بہ خون ارغواں دارد

غبار خط بپوشانید خورشید رخش یارب
حیات جاودانش دہ کہ حسن جاوداں دارد

تاریخ کے اوراق اور صوفیوں کے سوانح شاہد ہیں کہ عہد حافظ میں لپسرانِ خوبرو سے محبت کرنا اور انھیں معشوق بنانا
عام طبیعتوں کا عام انداز تھا۔ خود شاہ شجاع نے عراق کے نوجوان حسین شہزادہ حسین جلائری سے اپنے عشق کا اظہار
کیا تھا۔ جب شاہ شجاع نے تبریز پر حملہ کرنے کا قصد کیا تو شاہزادہ نے شاہ شجاع کو خط کے ذریعے اس اقدام سے باز
رکھنے کی کوشش کی۔ اس خط کا جواب شاہ شجاع نے دیا۔ اسکی عبارت تاریخ حبیب السیر کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔
۔ چوں سلطان حسین در کمال حسن و جمال بود و با مردم عاشق پیشہ در طریق التفات سلوک می نمود شاہ شجاع مکتوب را
بدیں اسلوب نوشت۔

بجنگ عاشقاں داری دلیری
مکن جاناکہ عاشق ہم شجاع است

نگارِ پاکستان کا خاص شمارہ

جس میں اردو غزل کے مسلم الثبوت استاد شیخ غلام ہمدانی "مصحفی" کی تاریخ پیدائش
وجائے ولادت کی تحقیق، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، ان کی شاعری کے آغاز و تدریجی ارتقاء
ان کی تالیف و تصانیف۔ ان کی غزل گوئی و مثنوی نگاری۔ ان کے معاصر شعراء و ادباء اور
ان کے اپنے دور کے مخصوص علمی و ادبی رجحانات پر محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اس میں
مولانا نیاز فتحپوری کے متعدد مقالوں کے علاوہ دوسرے معروف نقادوں کے مضامین
بھی شامل ہیں۔ غرض مصحفی کی تذکرہ نگاری شخصیت اور شاعری کے متعلق سارے مباحث
اس خاص نمبر میں اس قدر حسن و ترتیب و مورخانہ کاوش و استدلال کے ساتھ پیش کئے
گئے ہیں کہ مصحفی کو سمجھنے کے لئے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قیمت:۔ تین روپے

دفتر نگارِ پاکستان ۔ ۳۷ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

شیطان سے ملاقات

ت۔ا۔ن

(التباسِ بصری کا ایک سچا واقعہ)

(چونکہ اس واقعہ کے کردار ہنوز زندہ ہیں اس لئے ان کے نام لکھنے سے قصداً گریز کیا گیا)

---

(۱)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ یادش بخیر .... علی گڑھ کی یاد آتے ہی جذبات دفورِ شوق سے اُمنڈ آئے۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے۔ ان دنوں ہاسٹلوں میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہر کمرہ میں چار چار طالب علموں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ جس کمرہ میں میری رہائش تھی اس کے ساتھ والے کمرے میں ایک طالب علم مدراس سے آئے تھے وہ موپلا قوم کے ممبر تھے۔ ان کو اردو آتی نہ تھی اس لئے وہ ہر وقت انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور یونیورسٹی کے تالاب میں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گھنٹوں پانی کی سطح پر اس طرح سے تیرتے جیسے لکڑی کا تختہ۔ تیراکی میں وہ یونیورسٹی میں اول آیا کرتے تھے۔ نہایت خوش طبع اور آزاد خیال کے آدمی تھے۔ بستر میں لیٹ جاتے اور سرہانے پڑی ہوئی میز سے کتابیں اٹھا کر لیٹے لیٹے پڑھ کر واپس میز پر رکھ دیتے اور اسی طرح سے میز پر قرآن شریف اٹھا کر سوتے ہوئے پڑھ کر میز پر رکھ دیتے۔ دوسرے طالب علم بمبئی کے ایک بہت بڑے افسر کے صاحبزادے تھے۔ خاموش طبیعت کے سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کو آرٹ سے خاص دلچسپی تھی۔ دنیا بھر کی تصاویر البم میں جمع کر رکھی تھیں۔ جب منڈولین بجاتے تو گویا مُردہ تاروں سے زندہ نغمات پیدا کر دیتے۔ اس لئے ہم ان کو "مسٹر آرٹ" کے نام سے پکارتے تھے۔

تیسرے صاحب مشرقی پنجاب کے کسی ضلع کے رہنے والے اور ایم۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ ہر وقت سائنس کی عینک سے دیکھتے۔ ان کو ہم "مسٹر سائنس" کہا کرتے تھے۔ چوتھے طالب علم یو۔ پی کے کسی ضلع کے کسی بڑے افسر کے لڑکے تھے۔ ان کی عام گفتگو بھی بلند معیار اردو میں ہوتی تھی۔ ان میں احساس برتری کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ہر معاملہ پر وہ اپنی رائے کو حرف آخر سمجھا کرتے تھے۔ دیوانِ غالب تقریباً سارا یاد تھا۔ ان کو اس لئے ہم "مسٹر غالب" کہا کرتے تھے۔ علیگڑھ کے دستور کے مطابق وہاں "مولانا" کہہ کر ایک دوسرے کو پکارا جاتا تھا۔ مگر ہم نے خود آپس میں ایک دوسرے کو "مسٹر" کے لفظ سے پکارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرے لئے اس کمرے میں کشش کا باعث مسٹر آرٹ اور مسٹر سائنس تھے۔ بہر حال مختلف مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا اور مسٹر آرٹ سے منڈولین سننے کی کشش مجھے ان کے کمرے میں روکے رکھتی۔

(۲)

ایک دفعہ مسٹر آرٹ کسی کام سے دہلی گئے اور وہاں سے ایک ۔ پلانشے ۔ (Planchette) خریدا
اس وقت ہندوستان میں یہ آلہ نیا نیا آیا تھا اور اس کا ہر جگہ چرچا تھا۔ چنانچہ مجھے میرے کمرے سے بلا یا گیا اور میز
ارد گرد بیٹھ کر ہم نے نہایت احترام سے پیکٹ کھولا اور اس آلہ کو نہایت حیرت سے دیکھا۔ مسٹر آرٹ نے ہم کو بتایا کہ
پر سفید کاغذ کے اوپر اس آلہ کو رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے سوراخ میں ایک پنسل لگا دی جاتی ہے۔ ایک دو یا تین آدمی تک
اس پر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے سروں کو اس طرح سے رکھ دیتے ہیں کہ پلانشے پر بار نہ پڑے صرف اس کی سطح کو انگلیوں
کے سرے چھو سکیں۔ اور سب ایک ہی روح کو طلب کرنے کا خیال دل میں جمائے رہیں۔ جب پلانشے میں حرکت پیدا ہو
ایک ہی سوال دل میں رکھیں۔ طلب شدہ روح اس سوال کا جواب پلانشہ کی مدد سے دے گی۔ یعنی پلانشے میں حرکت
پیدا ہوگی اور کاغذ پر جواب پنسل سے لکھتا چلا جائے گا۔

چنانچہ فرصت کے وقت کا ایک عمدہ مشغلہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ پہلے دو تین دن تک تو پلانشے میں جو حرکت
ہوتی تو کاغذ پر ٹیڑھی بیڑھی لکیریں بنتی چلی جاتیں۔ کچھ دنوں کے بعد کسی نا معلوم زبان کے حروف و الفاظ کاغذ پر نمایاں
ہونے لگے۔ کئی دن کی مشق کے بعد انگریزی اور پھر اردو میں تحریریں نمایاں ہونے لگیں۔ مگر حیرت یہ تھی کہ ہمارا سوال
کچھ ہوتا اور روح جواب کچھ دیتی۔ چنانچہ ہم نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ واقعی ارواح پلانشہ پر آکر جواب لکھواتی ہیں یا یہ کوئی
سائنس کی دھوکا بازی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد مسٹر سائنس نے کہا کہ چونکہ شیطان تاحال زندہ ہے اس لئے اس کو طلب کر کے اس سے سوالات
کے جوابات طلب کئے جائیں۔

چنانچہ ہم نے شیطان کو بلانا شروع کیا۔ دو تین دن تک تو کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن چوتھے دن ان کاغذ پر یہ تحریر ظاہر ہوئی
"تم مجھے کیوں بلاتے ہو؟ تم سوال کرو گے اور پلانشہ کے ذریعے جواب دوں گا۔" ہم نے اصرار کیا کہ ہم آپ کے روبرو گفتگو کرنا
چاہتے ہیں۔ چنانچہ کاغذ پر یہ جواب ظاہر ہوا۔ "اگر تمھاری ایسی ہی خواہش ہے تو پھر علی گڑھ کے پرانے قلعہ کے مشرقی جانب
والے حصہ میں اسی اتوار کو غروب آفتاب کے وقت میرا انتظار کرو۔ میں وہاں تم سے ملوں گا۔ مگر چونکہ میں بہت مصروف
ہوں اس لئے وقت کا خاص خیال رکھو۔ اگر تم ذرا لیٹ ہوئے تو میں انتظار نہ کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ ہاں یہ بھی
سن لو کہ ملاقات کے وقت سے پہلے پھر مجھے پلانشہ پر نہ بلانا۔ مجھے فرصت نہیں۔"

یہ سن کر پہلے تو ہم بہت خوش ہوئے کہ ہم شیطان کو اصلی صورت شکل میں دیکھیں گے اور اس سے سوال و جواب
کریں گے۔ مگر دوسرے ہی دن ہمارے دلوں میں یکایک کچھ خوف سا پیدا ہونے لگا۔

ہم پانچوں میں بہت خفیہ طور پر اس قسم کے خطرات کے متعلق بات چیت شروع ہوگئی۔ کسی نے کہا ہم پابند
تھوڑے ہیں۔ ہم نہ جائیں گے۔ مگر مسٹر سائنس نے کہا یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ شیطان کیا کہے گا کہ خود بلایا ہے اور
خود ہی اتنے ڈر گئے کہ آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یا پھر وہ سمجھے گا کہ انسان وعدہ فراموش ہے۔ آخر ہمارے ڈرنے کی
ہی کیا ہے۔ انسان ہمیشہ شیطان پر غالب آیا ہے۔

پھر بھی ہمیں خیال آتا کہ قلعہ بہت پرانا ہے اور غیر آباد و ویران پڑا ہے۔ دن کے وقت بھی وہاں جاتے ہوئے لگ ڈرتے ہیں۔ سر شام اس کے غاروں سے گیدڑ نکل کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے بڑے بڑے گھنے درختوں سے اُلّوؤں کی خوفناک چیخیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی مشہور رہے کہ وہاں جن بھوت رہتے ہیں۔ شام کے وقت اندھیری رات میں وہاں جانا ویسے بھی خطرناک ہے۔ چنانچہ ہر دفعہ اس موضوع پر سنجیدگی سے بحث کی جاتی اور کئی دفعہ یہ طے پایا کہ وہاں نہ جائیں گے۔ مگر پھر خیال آتا کہ شیطان ہم پر ہنسے گا۔ لہٰذا جانا ضروری ہے۔ مگر جوں جوں اتوار نزدیک آتا گیا ہمارے دلوں میں خوف و ہراس کا غلبہ ہوتا گیا۔ اور ہم بہت سنجیدہ ہوتے گئے۔ ہمارا زیادہ وقت خاموشی میں گذرنے لگا یہاں تک کہ میرے کمرے والے ساتھیوں نے میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن مجھ سے دریافت کیا کہ کیوں مولانا...... چند دنوں سے آپ بہت خائف نظر آ رہے ہیں اور اکثر رات کو نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟ مگر میں ہنسی میں ان کی بات ٹال گیا۔ اور کہا کہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ یہی حالت ہمارے دوسرے کمرے والے ساتھیوں کی تھی۔ اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سخت گھبرائے ہوئے اور خوفزدہ ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے دحشت اور خوف نمایاں تھا۔ پہروں ہم سوچتے کہ شیطان کی صورت کیسی ہوگی؟ کیا اس ہیئت کا مقابلہ ہم کر سکیں گے۔ کیا وہ ہمیں وہاں بُلا کر ہماری اس جرات کی کوئی سزا دے گا؟ یا اس کے آنے سے پہلے ہی قلعہ کے بھوت اور جن یا وحشی درندے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔

بالآخر اتوار آہی گیا ــــ صبح سے ہماری حالت خراب تھی۔ ہم سب نے چھٹی کی۔ درخواستیں بھیج دیں اور تمام دن بستروں میں لیٹے رہے خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ کبھی تو ہم پاگلوں کی طرح باتیں کرنے لگ جاتے۔ کبھی حواس باختہ خاموش پڑے رہتے۔ آخر ملاقات کا وقت قریب آگیا۔ ہم ایک ایک چاقو جیب میں ڈال کر سیر کے بہانے ہوسٹل سے باہر نکلے۔ کسی طرح قلعہ پہنچے۔ اور مشرقی جانب غروب آفتاب سے چند منٹ پہلے حسب ہدایت زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے نزدیک سمٹ کر آ گئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ خوب مضبوطی سے پکڑ لئے۔ دہشت اور انتہائی خوف سے ہمارے حلق خشک ہو گئے۔ ہم ایک دوسرے سے بھی نہ بول سکتے تھے۔ ہمارے جسم بے جان اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ اس وقت اگر کوئی چھپ کر مذاق سے بھی کوئی ڈراونی چیخ نکالتا تو شاید ہماری روح بدن سے جدا ہو جاتی۔ ایک ایک منٹ پہاڑ ہو گیا۔

ہمارے جسم کا تمام خون سمٹ کر دل کے اندر آگیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں یہاں آنے پر سخت پشیمان تھا اور چاہتا تھا کہ اب بھی بھاگ جاؤں۔ لیکن ہمارے پاؤں میں طاقت نہ تھی۔ یا خدا ہماری مدد کر۔ میرے دل میں یہ خیال آیا۔ اب ہماری آنکھیں قلعہ کی شرقی دیوار کی طرف لگ گئیں اور ہم کسی سخت حملے کے انتظار میں ہمہ تن ہو گئے کہ یکایک ایک درخت سے ایک اُلو نے کرخت آواز میں چیخ ماری اور پھڑ پھڑا کر تیزی سے اڑا اور فوراً ہمارے سامنے چند گز کے فاصلہ پر ایک دُبلا پتلا دراز قد سفید رنگ کا آدمی انگریزی سیاہ سوٹ میں کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ نہ تھی۔ ہم حیران ہو گئے کہ آسمان سے ٹپک پڑا ہے یا زمین نے اُسے اُگل دیا ہے کیونکہ کسی سمت سے اسکو آتے ہوئے ہم نے نہ دیکھا تھا۔ اس کے چہرہ سے مایوسی حسرت و ارمان تھکاوٹ ناامیدی اور پشیمانی کے جذبات صاف ہویدا تھے مگر اس کی آنکھیں! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ہزار ہزار کینڈل پاور کے بلب لگے ہوئے ہیں اور ان سے

نئی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں کہ ہمارے جسم کے آر پار نکل جا رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تیز روشنی میں ہمارے دل کی کھلی کتابوں کو بغور پڑھ رہا ہے۔ حیرت و ہیبت کے جذبات ہم پر طاری تھے۔ اور ہماری زبانیں بند تھیں۔ چند منٹ کے بعد اس اجنبی نے خود سکوت کو توڑا اور گرجدار آواز میں یوں گویا ہوا۔ "آخر انسان ہو نا کہ مجھے اتنے اصرار سے بلایا ہے اور جب میں یہاں آیا ہوں تو خوش آمدید تک نہیں کیا۔ اب چپ کیوں ہو۔؟ بولو کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟" کچھ دیر تک تو ہم خاموش رہے پھر مسٹر سائنس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے رک رک کر کہا۔ "اچھا تو آپ...... مسٹر شیطان...... ہیں...... کیا...... یہی آپ کی...... اصلی صورت ہے؟" شیطان نے کہا کہ "اگر میں اپنی اصلی صورت میں یہاں آتا تو آپ اوّل تو مجھ کو دیکھ ہی نہ سکتے۔ اور پھر اگر میں کوئی اور مادی شکل اختیار کرتا تو شاید برداشت نہ کر سکتے۔ اس لئے میں آپ کی خاطر انسانی شکل میں ظاہر ہوا اگرچہ مجھے اس شکل سے سخت نفرت ہے۔" پھر مسٹر سائنس نے اسی طرح ڈرتے ہوئے رک رک کر کہا۔ "آخر تم..... ہم..... بنی نوع انسان..... کے دشمن..... کیوں بن گئے ہو؟" شیطان نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں مقرب الملائک تھا۔ بہشت میرا ٹھکانہ تھا۔ تمھارے جدامجد بہشت سے میرے اخراج کے باعث بنے۔ گو میں نے بھی فوراً ان سے بدلا لے لیا اور انھیں بھی بہشت سے نکلوا کر ہی دم لیا۔ مگر مجھے فکر ہے کہ پھر اولاد آدم نیکی کے دروازے سے بہشت میں نہ گھس جائے۔" اب مجھ میں کچھ ہمت ہوئی اور ڈرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے آدم کو سجدہ کر لیا ہوتا۔" اس پر شیطان نے پھر گرجدار آواز میں کہا کہ "میں خدا کو چھوڑ کر انسان کا سجدہ کرتا اور اس طرح سے شرک کے گناہ عظیم میں مبتلا ہو جاتا حالانکہ اس گناہ کی کوئی معافی ہی نہیں۔" اس پر مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "دنیا میں آخر اور قومیں بھی تو ہیں۔ ہم مسلمانوں کو تم نے کیوں دھر لیا ہے؟" اس پر شیطان نے کہا کہ "نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اب میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ وہ اب میری گرفت سے کبھی نہیں نکل سکتے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر قرآن سے ہے کیونکہ جو اس کے نزدیک پہنچ جاتا ہے اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مگر میں نے اب قرآن کے اردگرد بہت مضبوط اور بلند حصار قائم کر دیا ہے اب کوئی مسلمان ان دیواروں سے چھلانگ لگا کر قرآن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے علاوہ میں نے مسلم ممالک میں چپہ چپہ پر دیوتا قائم کر دئیے ہیں اور اب اکثر مسلمان اللہ کے بجائے ان دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شرک ہی ایک ایسا مرض ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ اس لئے اب مجھے مسلمانوں کی طرف سے بے فکری حاصل ہو چکی ہے۔ مگر دیگر اقوام میں تاحال بہت سے لوگ شرک سے قطعاً پاک ہیں اور نیکی بھی کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے ان کی فکر ہر وقت بے تاب رکھتی ہے۔" مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "آخر آپ کو اب اس سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟" شیطان نے کہا۔ "فائدہ کا سوال نہیں، میرا فرض ہے کہ کسی انسان کو بہشت میں گھسنے نہ دوں۔ بلکہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالوں کیوں کہ بہشت اتنی سستی نہیں جتنی تمھارے علماء نے بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے ان کا ماحول مادی ہو گا یعنی ان کے لئے جسمانی لذائذ کے لئے ہر طرح کے مادی اسباب۔ لذیذ کھانے۔ شراب۔ عیش و عشرت اور دیگر جسمانی راحتیں فراہم کی جائیں گی کہ وہ ہر وقت انہی جسمانی لذائذ ہی میں محو رہ کر سہ جہتی سطح دماغ سے نزول کر کے دو جہتی احساس والی سطح دماغ پر آ جائیں گے اور پھر یک جہتی احساس والی سطح سے گزر کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں گے جس طرح حیوانات و حشرات الارض کا انجام ہوتا ہے۔ مگر مقابلتہً بہشت میں داخل ہونے والے

انسانوں کو تمام مادی لذائذ سے دور رکھ کر اُن کی زندگی بہت منظم منضبط بنا دی جائے گی۔ ان کو بہت زیادہ ریاضت کرنی پڑے گی اور اپنے کردار کو بہت زیادہ بلند سطح پر لانا پڑے گا۔ اس لئے بہت جلد ہی وہ چہار جہتی احساس والی دماغی سطح سے پانچ اور پھر شش جہت احساس والی سطح دماغ پر ترقی کرتے جائیں گے۔ اس وقت وہ زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کر چکے ہوں گے۔ ماضی اور مستقبل مٹ جائیں گے اور ان کو ایسی ایسی روحانی مسرتیں حاصل ہوں گی جن کا ذکر کرنا بھی اس وقت مناسب نہیں کیوں کہ تم ان کیفیات کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہو۔ اس پر مسٹر آرٹ نے کہا۔ مگر آپ تو ہمارے سامنے کبھی نہیں آتے پھر ہم سے گناہ کس طرح سرزد کراتے ہیں" شیطان نے کہا کہ۔ اول تو انسانی شکل و شباہت میں میرے ایجنٹ موجود ہیں۔ مگر یہ گناہوں کے ارتکاب کرانے کے خارجی اسباب ہیں۔ داخلی اسباب دانہ گندم ہے۔ تمہارے سائنس دانوں نے تاحال گندم کا تجزیہ ہی درست نہیں کیا۔ اس میں گناہوں کے اجزاء شامل ہیں۔ انسان اس کو آگ پر پکا کر کھاتا ہے۔ میں نے انسان کو اس لئے آگ کا استعمال سکھایا ہے کہ وہ کھانے پکا کر کھانے کا عادی ہو جائے تاکہ میرے وجود والی آگ اس طرح اس کے جسم میں داخل ہو کر گناہ کے ارتکاب میں سرعت اور آسانی پیدا کر دے۔ پھر میں نے انسان کو گوشت خوری کی عادت سکھائی تاکہ اس کے اندر درندگی اور وحشت کے اجزا پیدا ہو سکیں۔ سمجھے؟"

اب پھر میں نے پوچھا "کیا آپ ہمیں "روح" کی حقیقت بتا سکتے ہیں؟" شیطان نے کہا۔ "میں صرف اتنا اشارہ کر سکتا ہوں کہ روح کی حقیقت ہرگز وہ نہیں جو تمہارے علماء نے تم کو بتائی ہے۔ مگر یہ مغالطہ بھی میں نے انسان کو دلایا ہے کیونکہ روح کے اس غلط تصور سے انسان شرک کی وبا میں آسانی سے مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور یہی میرا مقصد تھا۔" اب مسٹر غالب نے کہا۔ "ہم بہشت میں تو ضرور جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم نماز روزہ کے پابند ہیں" شیطان نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا اور کہا۔ "ضرور۔ ضرور۔ آپ نماز روزہ کے پابند ہیں۔ مگر میں نے ہی تو صوم" و "صلواۃ" کو "نماز" "روزہ" میں بدل دیا ہے۔ اگر مسلمان قوم صوم و صلواۃ کی پابند ہوتی تو تمام دنیا میں سب لوگ مسلمان بن چکے ہوتے۔ اسی طرح سے میں نے "الٰہ" کو "خدا" میں بدل دیا۔ چنانچہ تمہارے لئے اللہ اب خدا بن کر ایک بہت بڑا انسان بن چکا ہے جس کو تم نماز روزہ کی رشوت دے کر خوش کر لیتے ہو۔ الفاظ دراصل ذہنی تصورات کے علامتی اشارے (Symbols) ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے الفاظ کے بدلتے ہی تصورات بھی بدل جاتے ہیں چونکہ عوام کو الٰہ اور صوم و صلواۃ سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے ان تینوں تصورات کو بدلنے کے لئے الفاظ ہی بدل دئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تمہارے نماز روزے بیکار ہو گئے ہیں اور تمہاری سیرت کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب الٰہ سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا صرف خدا سے ہے جو محض خوشامد سے خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا اب تمہاری عبادات برائے حصول و تقویٰ نہیں ہوتیں بلکہ محض شاعرانہ قصیدہ خوانی۔ اس لئے تمہارے عمل بے نتیجہ ہیں۔ تم میں نفاق۔ اختلاف تفرقہ بازی۔ انتشار۔ بغض و کینہ۔ کذب گوئی۔ حُبِ زر۔ شہوت وغیرہ وغیرہ میں نے انتہائی شدت کے ساتھ پیدا کر دئیے ہیں۔ تمہارے بعض مذہبی رہنماؤں کا میں شکر گذار ہوں کہ وہ اس کارِ عظیم میں میرے ممد و معاون ہیں۔۔ بولئے کیا میں ہر قدم پر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں؟" اس پر مسٹر آرٹ کے منہ سے بیساختہ نکلا "خدا تمہیں سخت سزا دے گا" شیطان نے اس پر ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہا کہ۔ "خدا مجھ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ میں اگر ڈرتا ہوں تو

———

تنی تیز شعاعیں نکل رہی تھیں کہ ہمارے جسم کے آر پار نکل جا رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس تیز روشنی میں ہمارے دل کی کھلی کتابوں کو بغور پڑھ رہا ہے۔ حیرت و ہیبت کے جذبات ہم پر طاری تھے۔ اور ہماری زبانیں بند تھیں۔ چند منٹ کے بعد اس اجنبی نے خود سکوت کو توڑا اور گرجدار آواز میں یوں گویا ہوا۔ "آخر انسان ہو نا کہ مجھے اتنے اصرار سے بلایا ہے اور جب میں یہاں آیا ہوں تو خوش آمدید تک نہیں کیا۔ اب چپ کیوں ہو۔؟ بولو کیا دریافت کرنا چاہتے ہو؟" کچھ دیر تک تو ہم خاموش رہے پھر مسٹر سائنس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں ڈرتے ڈرتے رُک رُک کر کہا۔ "اچھا! تو آپ ...... مسٹر شیطان ...... ہیں ...... کیا ...... یہی آپ کی ...... اصلی صورت ہے؟" شیطان نے کہا کہ۔ "اگر میں اپنی اصلی صورت میں یہاں آتا تو آپ اوّل تو مجھ کو دیکھ ہی نہ سکتے۔ اور پھر اگر میں کوئی اور مادی شکل اختیار کرتا تو شاید برداشت نہ کر سکتے۔ اس لئے میں آپ کی خاطر انسانی شکل میں ظاہر ہوا اگرچہ مجھے اس شکل سے سخت نفرت ہے۔" پھر مسٹر سائنس نے اسی طرح ڈرتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ "آخر تم ...... ہم ...... بنی نوع انسان .. کے دشمن ...... کیوں بن گئے ہو؟" شیطان نے کہا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں مقرب الملائک تھا۔ بہشت میرا ٹھکانہ تھا۔ تمہارے جد امجد بہشت سے میرے اخراج کے باعث بنے۔ گو میں نے بھی فوراً ان سے بدلا لے لیا اور انھیں بھی بہشت سے نکلوا کر ہی دم لیا۔ مگر مجھے فکر ہے کہ پھر اولاد آدم نیکی کے دروازے سے بہشت میں نہ گھس جائے۔" اب مجھ میں کچھ ہمت ہوئی اور ڈرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے آدم کو سجدہ کر لیا ہوتا۔" اس پر شیطان نے پھر گرجدار آواز میں کہا کہ۔ "میں خدا کو چھوڑ کر انسان کا سجدہ کرتا اور اس طرح سے شرک کے گناہ عظیم میں مبتلا ہو جاتا حالانکہ اس گناہ کی کوئی معافی ہی نہیں۔" اس پر مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "دنیا میں آخر اور قومیں بھی تو ہیں۔ ہم مسلمانوں کو تم نے کیوں دھر لیا ہے؟" اس پر شیطان نے کہا کہ۔ "نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے اب میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ وہ اب میری گرفت سے کبھی نہیں نکل سکتے۔ مجھے سب سے زیادہ ڈر قرآن سے ہے کیونکہ جو اس کے نزدیک پہنچ جاتا ہے اس کے لئے بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مگر میں نے اب قرآن کے ارد گرد بہت مضبوط اور بلند حصار قائم کر دیا ہے اب کوئی مسلمان ان دیواروں سے چھلانگ لگا کر قرآن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے علاوہ میں نے مسلم ممالک میں چپہ چپہ پر دیوتا قائم کر دئیے ہیں اور اب اکثر مسلمان اللہ کے بجائے ان دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شرک ہی ایک ایسا مرض ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ اس لئے اب مجھے مسلمانوں کی طرف سے بے فکری حاصل ہو چکی ہے۔ مگر دیگر اقوام میں تاحال بہت سے لوگ شرک سے قطعاً پاک ہیں اور نیکی بھی کرتے ہیں۔ اس لئے مجھے ان کی فکر ہر وقت بے تاب رکھتی ہے۔" مسٹر سائنس نے پھر کہا۔ "آخر آپ کو اب اس سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟" شیطان نے کہا۔ "فائدہ کا سوال نہیں، میرا فرض ہے کہ کسی انسان کو بہشت میں گھسنے نہ دوں۔ بلکہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالوں کیونکہ بہشت اتنی سستی نہیں جتنی تمہارے علماء نے بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے ان کا ماحول مادی ہو گا یعنی ان کے لئے جسمانی لذائذ کے لئے ہر طرح کے مادی اسباب۔ لذیذ کھانے۔ شراب۔ عیش و عشرت اور دیگر جسمانی راحتیں فراہم کی جائیں گی کہ وہ ہر وقت اپنی جسمانی لذائذ ہی میں محو رہ کر سہ جہتی سطح دماغ سے نزول کر کے دو جہتی احساس والی سطح دماغ پر آ جائیں گے اور پھر یک جہتی احساس والی سطح سے گذر کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں گے جس طرح حیوانات و حشرات الارض کا انجام ہوتا ہے۔ مگر مقابلتہً بہشت میں داخل ہونے والے

انسانوں کو تمام مادی لذائذ سے دُور رکھ کر اُن کی زندگی بہت منظم منضبط بنا دی جائے گی۔ ان کو بہت زیادہ ریاضت کرنی پڑے گی اور اپنے کردار کو بہت زیادہ بلند سطح پر لانا پڑے گا۔ اس لئے بہت جلد ہی وہ چار جہتی احساس والی دماغی سطح سے پانچ اور پھر شش جہت احساس والی سطح دماغ پر ترقی کرتے جائیں گے۔ اس وقت وہ زمان و مکان کی سرحدوں کو عبور کر چکے ہوں گے۔ ماضی اور مستقبل مٹ جائیں گے اور ان کو ایسی ایسی روحانی مسرتیں حاصل ہوں گی جن کا ذکر کرنا بھی اس وقت مناسب نہیں کیوں کہ تم ان کیفیات کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہو۔ اس پر مسٹر آرٹ نے کہا "مگر آپ تو ہمارے سامنے کبھی نہیں آتے پھر ہم سے گناہ کس طرح سرزد کراتے ہیں" شیطان نے کہا کہ "اول تو انسانی شکل و شباہت میں میرے ایجنٹ موجود ہیں۔ مگر یہ گناہوں کے ارتکاب کرانے کے خارجی اسباب ہیں۔ داخلی اسباب دانہ گندم ہے۔ تمہارے سائنس دانوں نے تاحال گندم کا تجزیہ ہی درست نہیں کیا۔ اس میں گناہوں کے اجزاء شامل ہیں۔ انسان اس کو آگ پر پکا کر کھاتا ہے۔ میں نے انسان کو اس لئے آگ کا استعمال سکھایا ہے کہ وہ کھانے پکا کر کھانے کا عادی ہو جائے تاکہ میرے وجود والی آگ اس طرح اس کے جسم میں داخل ہو کر گناہ کے ارتکاب میں سرعت اور آسانی پیدا کر دے۔ پھر میں نے انسان کو گوشت خوری کی عادت سکھائی تاکہ اس کے اندر درندگی اور وحشت کے اجزا پیدا ہو سکیں۔ سمجھے ؟"

اب پھر میں نے پوچھا: "کیا آپ ہمیں "روح" کی حقیقت بتا سکتے ہیں ؟" شیطان نے کہا: "میں صرف اتنا اشارہ کر سکتا ہوں کہ روح کی حقیقت ہرگز وہ نہیں جو تمہارے علماء نے تم کو بتائی ہے۔ مگر یہ مغالطہ بھی میں نے انسان کو دلایا ہے کیونکہ روح کے اس غلط تصور سے انسان شرک کی وبا میں آسانی سے مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور یہی میرا مقصد تھا۔" اب مسٹر غالب نے کہا: "ہم بہشت میں تو ضرور جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم نماز روزہ کے پابند ہیں" شیطان نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا اور کہا "ضرور۔ ضرور۔ آپ نماز روزہ کے پابند ہیں۔ مگر میں نے ہی تو "صوم" و "صلواۃ" کو "نماز" "روزہ" میں بدل دیا ہے۔ اگر مسلمان قوم صوم و صلواۃ کی پابند ہوتی تو تمام دنیا میں سب لوگ مسلمان بن چکے ہوتے۔ اسی طرح سے میں نے "الہ" کو "خدا" میں بدل دیا۔ چنانچہ تمہارے لئے اللہ اب خدا بن کر ایک بہت بڑا انسان بن چکا ہے جس کو تم نماز روزہ کی رشوت دے کر خوش کر لیتے ہو۔ الفاظ دراصل ذہنی تصورات کے علامتی اشارے (Symbols) ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے الفاظ کے بدلتے ہی تصورات بھی بدل جاتے ہیں چونکہ عوام کو الہ اور صوم و صلاۃ سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے ان تینوں تصورات کو بدلنے کے لئے الفاظ ہی بدل دئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تمہارے نماز روزے بیکار ہو گئے ہیں اور تمہاری سیرت کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب الہ سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں رہا صرف خدا سے ہے جو محض خوشامد سے خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا اب تمہاری عبادات برائے حصول و تقویٰ نہیں ہوتیں بلکہ محض شاعرانہ قصیدہ خوانی۔ اس لئے تمہارے عمل بے نتیجہ ہیں۔ تم میں نفاق۔ اختلاف تفرقہ بازی۔ انتشار۔ بغض و کینہ۔ کذب گوئی۔ حُب زر۔ شہوت وغیرہ وغیرہ میں نے انتہائی شدت کے ساتھ پیدا کر دئے ہیں۔ تمہارے بعض مذہبی رہنماؤں کا میں شکر گذار ہوں کہ وہ اس کار عظیم میں میرے ممد و معاون ہیں۔۔ بتلائیے کیا میں ہر قدم پر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ؟" اس پر مسٹر آرٹ کے منہ سے بیساختہ نکلا "خدا تمہیں سخت سزا دے گا" شیطان نے اس پر ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور کہا کہ "خدا مجھ سے باز پرس نہیں کرے گا۔ میں اگر ڈرتا ہوں تو

اب مسٹر [illegible] نے دریافت کیا: "اس دنیا میں "صحیح یا غلط" کا معیار کیا ہے؟" شیطان نے جواب دیا۔ "تمہارے اس سوال کا جواب دینے کے لئے میں پابند نہیں اور نہ ہی مجھے جواب دینا چاہئے۔ مگر چونکہ تم طالب علم ہو اور میں تمہارے ذوق و شوق اور جستجو علم کی قدر کرتا ہوں اس لئے مختصراً بتاتا ہوں کہ سچ اور غلط دراصل کوئی مطلق اور مستقل حقیقت نہیں۔ ہر زمانہ میں جسے تم حقیقت اور صداقت سمجھتے ہو۔ وہ دراصل اضافی (Relative) ہی ہوا کرتی ہیں۔ تمہاری عقل اور نظریں محدود ہیں تم "مستقبل" کو نہیں دیکھ سکتے بلکہ "حال" کے بھی صرف ایک جزو کو بیک وقت دیکھ سکتے ہو۔ مگر کوتاہ نظری کے باعث تم اُس "جزو" کو "کل" سمجھ لیتے ہو۔ انسان جس وقت پیدا ہوا تھا اُسکا ذہن صرف دو جہت کا احساس کر سکتا تھا۔ اور اسی نسبت سے اس کا دماغ محدود تھا۔ پھر لاکھوں سال کے ارتقائی ترقی کے بعد اُس کے دماغ میں سہ جہت کا احساس پیدا ہوا اور ٹھیک اس وقت سے اللہ تعالےٰ نے پیغمبر بھیجے شروع کئے جو درجہ بدرجہ انسانی دماغ کو ترقی دے کر مختلف مدارج طے کراتے رہے تاکہ انسانی ذہن میں چہار جہت کا احساس پیدا ہو اور وہ ایک بہت بلند سطح پر آگیا۔ ٹھیک اس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اور مسلمانوں کے ذمہ یہ کام ہوا کہ باقی ماندہ دنیا کے انسانوں کو وہ اس ارتقائی بلند و بالا سطح پر کھینچ کر لائیں اور وہ دن میرے لئے سخت غم و ماتم کا تھا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور بہت جلد ہی پھر مسلمانوں کو کھینچ کر سہ جہتی مذاہب کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور مسلمان اسلام کو چھوڑ کر ماضی کی سہ جہتی والی سطح دماغ کی طرف لوٹ گئے اور باقی ماندہ سہ جہتی سطح والے دماغی مذاہب کی بھی مسخ شدہ شکل کی کورانہ تقلید میں مصروف ہوگئے۔ مگر باقی اقوام نے اپنے اپنے مذاہب چھوڑ کر سائنس و فلسفہ کی مدد سے خوب ترقی کرنی شروع کی اور پھر مجھے فکرمند ہونا پڑا۔ مگر میں نے ان میں بین الاقوامی جھگڑے اور جنگوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کرا دیا جو ایک عرصہ تک ان کو آگے بڑھنے نہ دے گا۔"

اس پر مسٹر غالب نے کہا "اب ہمارا کیا بنے گا؟" شیطان نے کہا۔ "چونکہ تم میرے پروگرام پر عمل کرتے ہو لہٰذا تمہارا انجام جہنم ہی ہے۔" اس پر مسٹر آرٹ کے منہ سے بیساختہ نکلا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" اس کے منہ سے اس کلمہ کا نکلنا تھا کہ ہمارے سامنے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، شیطان غائب تھا۔

ہمیں مسٹر آرٹ پر غصہ آیا کہ لاحول پڑھ کر اسے یکدم بھگا دیا حالانکہ ابھی ہمیں کئی سوالات اس سے کرنے تھے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چند منٹ تک تو ہم جمود کی حالت میں بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھنے کی کوشش کی — اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے قلعہ کے باہر نکلے اور ہاسٹل پہنچے —

جونہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بیس میل کی بہت تیز دوڑ کر کے آرہا ہوں کہ جسم تکان سے چور چور تھا۔ چنانچہ میں بستر پر لیٹتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

صبح جب میری آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے والے ساتھی میرے ارد گرد سخت متفکر کھڑے ہیں اور ساتھ ہی کرسی پر یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں اور میری نبض ان کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی سوال کیا جس کا مطلب میں نہ سمجھ سکا اور یونہی کچھ جواب میں بڑبڑا دیا۔

دو تین دن کے بعد کچھ ہوش و حواس درست ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ دوسرے کمرے والے چاروں طلبا بھی میری
ح سخت بیمار ہیں اور ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس قسم کا بخار میرے تجربہ میں کبھی نہیں آیا۔ حیرت ہے کہ پانچوں
سے ہی طرح کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سخت قسم کا دماغی صدمہ ان کو ہوا ہے جس سے ان
جسم سے تمام طاقت سلب ہو چکی ہے۔

تقریباً پندرہ سولہ دن بیمار رہ کر ہم صحت یاب ہو گئے۔ اب ڈاکٹر نے بہت کوشش کی کہ ہم سے اس یک دم
ار ہو جانے کے وجوہات معلوم کریں مگر ہم نے بہانہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ شام کو فٹ بال کھیل کر آیا تھا۔ کسی نے ہاکی کسی نے
س کھیل کا بہانہ لیا۔ مگر ڈاکٹر کو یقین نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ تم قصداً اصلی وجہ کو چھپا رہے ہو۔

مسٹر سائینس نے بستر سے اٹھنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پلانشہ پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور میں
فوراً شیطان سے جو سوال جواب ہوئے تھے قلمبند کر لئے کہ بھول نہ جاؤں۔ ہم بہت عرصہ تک خاموش رہے اور
ی زندگی میں ایک بڑا انقلاب محسوس کرتے رہے۔

کوئی چھ سات ماہ بعد ایک دن میں نے اپنے سائیکالوجی کے پروفیسر سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ وہ یہ سن کر سخت
ران ہوئے اور کہا کہ۔ اس وقت مجھ سے مشورہ کیوں نہیں لیا کہ میں تم کو اس حماقت کے ارتکاب سے روک دیتا۔ تم نے
نے اور ہمارے لئے ایک بہت بڑی مصیبت خریدنی چاہی تھی کیونکہ آپ کے والدین کے روبرو تو ہم ذمہ دار
ہرتے اور ہمیں تمہاری اس حرکت کا علم تک نہ تھا۔ ایسے ماحول میں دماغی توازن کے متزلزل حالت اور خوف
جذبے کی انتہائی شدید حالت میں بہت ممکن تھا کہ تم سب فوراً دہل کر مر جاتے۔ دگرنہ اس بات کا بھی سخت امکان
ا کہ سخت گھبراہٹ۔ شدید خوف اور بھیانک ماحول اور وقت کے لحاظ سے تمہارے دماغ کا نروس سسٹم ہی
ل جاتا اور تم تمام عمر بھر کے لئے مفلوج یا پھر ہمیشہ کے لئے پاگل ہو جاتے۔ باقی رہا شیطان کا معاملہ تو دراصل
شیطان نہ تھا بلکہ وہ تمہارا اپنا ہی داخلی انعکاس یعنی التباس بصری تھا۔ (Hallucination)

سکتے اور [illegible] ہیں۔ یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی یہ اعلان کر سکتے تھے کہ ملکی حکومت میں مذہب کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے۔ اس کا تعلق صرف انسان کی زندگی سے ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے متعلق یہ غلط بیانی کی جاتی ہے کہ اس نے ہندوؤں کو اسٹیٹ کی سروس سے نکال دیئے جانے کا حکم جاری کیا۔ یہ محض غلط ہے۔ اس نے محض یہ حکم دیا تھا کہ ماتحت اسامیوں میں جو تقرریاں ہوں۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں لئے جائیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب کی حکومت میں ہندو کثیر تعداد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور صرف امراء اور منصب داروں کی فہرست کا شمار دو سو سے زیادہ تک پہنچتا ہے۔ شیواجی کے داماد اچاجی اور راؤ دلپت، راجہ رام سنگھ اور راجہ جسونت سنگھ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار کے امراء اور سپہ سالاروں میں تھے انہوں نے پچاس برس تک بے مثال وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت کی۔ رگھوناتھ رائے ایک معمولی حیثیت کا ہندو تھا جو نواب سعداللہ خان کی ملازمت میں تھا اپنی خداداد ذہانت اور محنت و قابلیت کی بدولت اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ پر پہنچا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا وزیر اعظم ہوا اور رگھوناتھ نے اپنی حیات ۱۰۷۴ھ تک اس عہدہ جلیلہ پر رہا۔ اورنگ زیب نے اپنے نجی خطوط میں بجز راجہ رگھوناتھ رائے اور نواب سعداللہ کے کسی وزیر کی تعریف نہیں کی۔ رگھوناتھ رائے کی موت کا اورنگ زیب کو بہت صدمہ ہوا۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا پیشکار یعنی چیف سیکریٹری ایک ہندو ولی رام نامی تھا۔ دیوان ولی رام کا ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے جسے یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ جون کی گرمیوں میں ایک دن شہنشاہ اورنگ زیب نے ولی رام کو کسی خاص ضرورت سے طلب کیا۔ ولی رام چاندنی چوک دہلی میں رہتے تھے چونکہ سخت گرمی تھی اس لئے جاتے ہی طبیعت مکدر سی ہو گئی لیکن اس دوران میں شہنشاہ کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو گئے اور دیوان ولی رام کی موجودگی کا احساس شہنشاہ کے دماغ سے جاتا رہا۔ ولی رام ایک گھنٹہ تک دروازے کے پاس انتظار میں بیٹھے رہے کہ اجازت ملے تو داخل ہوں۔ لیکن اورنگ زیب نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اس پر ولی رام کے دل کو ٹھیس لگی اور وہ قلعہ سے باہر چلے گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے اپنا مال و متاع فقراء میں تقسیم کر دیا اور خود جوگی کا بستر دھارن کر کے جنگل کی راہ لی۔ چند گھنٹوں کے بعد جب اورنگ زیب کو ولی رام کا خیال آیا اور ان کے متعلق دریافت کیا تو یہ کہا گیا کہ گھنٹہ بھر انتظار کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ دوسرے دن ولی رام دربار میں نظر نہ آئے۔ جب اورنگ زیب نے خاص طور پر ولی رام کے متعلق دریافت کیا تو ان سے ولی رام کا یہ دلچسپ قصہ کہا گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ بغیر اجازت ملازمت کا چھوڑ دینے پر شہنشاہ فوراً ولی رام کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کرتے۔ لیکن اس کے خلاف شہنشاہ خود اپنے محبوب چیف سیکریٹری سے ملنے کے لئے پیادہ روانہ ہو گئے انہوں نے اپنے ہمراہ شاہی طبیب کو اور ایک پالکی بھی لے لی۔ تاکہ اگر ولی رام کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا ہو تو اس کا علاج کیا جائے جنگل کی راہ پہنچ کر اورنگ زیب نے ولی رام کو گہرے مراقبے میں پایا اور کھڑے ہو کر ان کی مخاطبت کا انتظار کرنے لگے۔ جب ولی رام نے آنکھیں کھولیں تو شہنشاہ ہند نے انہیں ان الفاظ کے ساتھ مخاطب کیا:

"تم نے بیس سال تک نہایت دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ میری خدمت کی ہے میری دلی خواہش ہے کہ تم اس اسٹیٹ کی خدمت انجام دیتے رہو اگر تمہیں میری بات کا صدمہ پہنچا ہے کہ تم ایک گھنٹہ تک دھوپ میں میرا انتظار کرتے رہے اور میں نے تمہاری طرف توجہ نہ کی تو براہ کرم معاف کر دو۔ بادشاہ بعض اوقات غیر ارادی طور پر بھی بھول جاتے ہیں۔ بادشاہ اور رعایا کی مثال باپ اور بیٹے کی ہے اس لئے تمہیں ان غلطیوں کا خیال نہ کرنا چاہئے اور اگر تم بیمار ہو تو میرا طبیب حاضر ہے اور یہ پالکی بھی ہے جس میں تمہیں آرام سے گھر پہنچا دیا جائے گا"۔

ولی رام مسکرایا اور جواب دیا۔ شہنشاہ عالم جب میں آپ کی ملازمت میں تھا تو میں ایک گھنٹہ آپ کی خدمت میں کھڑا رہا اور آپ مخاطب نہ ہوئے۔ لیکن اب جبکہ میں نے اپنے حقیقی مالک کی خدمت شروع کر دی تو حضور خود میرے پاس پاپیادہ تشریف لائے ہیں۔ یہ جواب پا کر اورنگ زیب ہکا بکا رہ گیا۔ اور ولی رام کو خدا کی عبادت کے لئے وہیں چھوڑ کر آہستہ سے واپس ہوئے۔

ایک بار شہنشاہ اورنگ زیب سے چند درباریوں نے عرض کی کہ وہ دو غیر مسلموں کو ان کے عہدوں سے موقوف کر دے۔ صرف اس لئے کہ یہ دونوں غیر مسلم تھے۔ اس بات کی دلیل میں انہوں نے قرآن شریف کی ایک آیت بھی پیش کی: "اے مومنو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ سمجھو" اس

شہنشاہ [illegible] مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ دینا چاہیے تھا اور اس قسم کے معاملات میں کسی مذہبی تعصب کو راہ [illegible]
[illegible] تمہارا مسئلہ تمہارا دین اور ہمارا مسئلہ ہمارا دین [illegible]
[illegible] اگر اس پر ہم حرف بحرف عمل [illegible] تمام [illegible] انسان کی [illegible]
[illegible] کسی [illegible] خیال کا دخل نہ ہونا چاہیے؟

اس مقالہ سے اندازہ ہوگا [illegible] ہندوستان میں مسلمانوں [illegible] کس طرح [illegible] رہا ہے۔

"نگار پاکستان" ۱۹۶۴ء کا سالنامہ

"تذکروں کا تذکرہ"

نمبر ہوگا

اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں پہلی بار انکشاف کرے گا کہ :-

۱ ۔ تذکرہ نگاری کا فن کیا ہے ؟
۲ ۔ اس کی امتیازی روایات و خصوصیات کیا رہی ہیں ؟
۳ ۔ تذکرہ نگاری کا رواج کب اور کن حالات میں ہوا ہے ؟
۴ ۔ اردو فارسی میں آج تک کتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ؟
۵ ۔ تذکروں اور ان کے مصنفین کی کیا نوعیت ہے ؟
۶ ۔ ان میں کتنے اور کن کن شاعروں کا ذکر آیا ہے ؟
۷ ۔ ان تذکروں سے خاص عہد کی ادبی و سماجی فضا کو سمجھنے میں کیا مدد ملتی ہے ؟
۸ ۔ ان میں اردو فارسی زبان و ادب کا کتنا بیش بہا خزانہ محفوظ ہے ؟
۹ ۔ یہ خزانہ، ادب کے تاریخی، تحقیقی، سوانحی اور تنقیدی شعبوں کے لئے کس درجہ مفید اور کتنا اہم ہے

ضخامت : تقریباً ۵۰۰ صفحات

قیمت :- چار روپے

"انیسویں صدی کی ایک صحافتی و ادبی دستاویز"

"عطرِ فتنہ"

عقیل احمد جعفری

۱۸۸۴ء میں لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی نے عطرِ فتنہ کے نام سے اپنی جدتِ طبع سے پاکٹ سائز کا ایک ننھا منا، رنگ برنگی، چھوٹے چھوٹے ورقوں پر رسالہ نکالا تھا۔ جس کی لطافت و ظرافت کی دھوم اس وقت کی پوری ادبی دنیا میں تھی۔ اب امتدادِ زمانہ سے نہ وہ لوگ رہے نہ وہ مذاق! تاہم پاکیزہ ادبی ذوق اور رندانہ مذہبی جوش کے کچھ نمونے کہیں کہیں سے پیش کرتا ہوں

یادگار واقعات

۱۔ سرسید

اپنے وقت میں معاصرین کو سرسید سے مذہبی، سیاسی، ادبی سبھی طرح کے اختلاف تھے۔ دیکھیے اس اختلاف کا اظہار کس لطف سے ہوتا ہے یہ اختلاف، اختلافِ امتی رحمتی تھا، جو ذاتیات پر مبنی نہیں بلکہ اصول پر مبنی تھا۔

ہمارے جلے تن سرسید نے ایک مضمون میں لکھا ہے:-

سن لو اے دور و نزدیک کے دوستو سن لو!
اے دکن اور اتر کے دوستو سن لو!
اے پورب اور پچھم کے دوستو سن لو!
اے آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو سن لو! وغیرہ وغیرہ

یہ تہذیب الاخلاق والے ریفارمر کی تحریر ہے یا کوئی عمل پڑھا جا رہا ہے۔ پورب باندھوں، پچھم باندھوں، اتر باندھوں دکھن باندھوں۔ زمین آسمان باندھوں۔ پورا پانی باندھوں —— اگر کسر ہے تو صرف لونا چماری کی دہائی کی —— اس کے بعد آپ (سرسید) مخالفوں کو فرانس چلنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں۔ جیسے بازاری کالم گلوچ

ین کبھی اکھتے ہیں کہ چلو طرک ہے !

ہمارے سر سید کو عاقبت کی فکر ہو نہ ہو اپنے گوڑ گڑھے کی بھی فکر ہے ۔ اگر نہیں ہے تو ہم ان مرفاکر
یں تسلیم نہ کریں گے ۔ اور اگر ہے تو ہمیں بتائیں ، ہم ان کے خیر اندیش ہیں ۔ چاہتے ہیں کہ جس طرح مدرستہ العلوم
ں بابت ان کی محنت ٹھکانے لگی ان کی مٹی بھی ٹھکانے لگے ــــ

ــــ بیوقوف ایسے الفاظ کو فال بد سمجھیں تو سمجھیں ۔ گوڑ گڑھے کی فکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدانخواستہ
سید کو ج کا قصد کریں یا ہماری طرف سے تقاضا سمجھیں ۔ خدا ان کی عمر میں اسی قدر برکت عطا فرمائے ۔
تنی اپنے فرشتۂ خاص کو عطا کر چکا ہے ۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ علی گڑھ کی سرزمین نے اس کے لئے بے طرح کشش دکھائی ہے ۔ ورنہ لندن
اکر ان کا واپس آنا یعنی چہ ــــ جیتے جی اس نے ان کو بزور کھینچا خدانخواستہ مرنے پر واگزاشت کی کیوں
ہرلائے گی مگر یہ پتہ نہیں چلتا علی گڑھ میں کس جگہ کی زمین !

یہ کچھ ہم لوگ تو نہیں جن کے لئے کہنا پڑے ؎

ہم میکشوں کی لاش کو ملتی نہیں جگہ ــــ حسرت پکارتی ہے کہ مٹی کہاں کی ہے

ان کی مبارک لاش کے لئے تو ہر طرف سے زمین دوڑے گی ۔ خصوصاً جب پہلے تصفیہ نہ ہوا ہو ــــ
زین قیاس تو یہ بھی ہے کہ یہ حضرت والد و شیدائے مدرستہ العلوم میں جب پسند کریں گے تو وہیں کی مین
۔ جس سے ایک فائدہ یہ بھی رہے گا کہ مقبرہ کے لئے بہت کچھ عمارت متعلقہ مقبرہ کی ضرورت نہ پڑے گی
سی کمرہ میں اگر زمین دوز قبر پسند کرلی تو چار دیواری اور گنبد کا بھی جھگڑا گیا ۔ اور اگر علیحدہ جگہ لی تو مقبرہ
ی عمارت سے مدرستہ العلوم کی نمود اور بھی بڑھ جائے گی ۔ خیر وہ بیرونی زمین کو پسند کریں یا اندرونی
زمین کو ۔ چھوٹے سے احاطہ میں سر دنما کچھ نشان نظر آئے یا زمین دوز قبر پر سبزی لہرائے ۔ یہ ہوگا جبھی کہ
پہلے سے تجویز قانون کی کسی دفعہ سے متعلق کر دی جائے تاکہ اس اکھاڑے کے پیچھے پہلوان مولوی سمیع اللہ
خان صاحب کو وقت پر اڑنگا لگانے کا موقع نہ ملے ــــ وہ جانشینی کے اکھاڑ دینے کو تو چوکے نہیں ۔
بعد کو گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا دریغ کریں گے ۔

انہیں کب تاب آئے گی کہ مرنے کے بعد سر سید مدرستہ العلوم پر دائمی قبضہ کریں ۔ لائف سکریٹری
ہونے کے لئے تو موت نے وقت محدود کر دیا تھا اس کے لئے تو یہ اعتقاد سر سید قیامت بھی نہیں !

بھلا کجا نیچرستان علی گڑھ اور کجا شاعری مگر کیا کہیں اور کس سے کہیں لوگوں نے شاعری کی مٹی
اپنے ہاتھوں خراب کرائی ۔ تعریف میں بڑے بڑے قصیدے لکھ لکھ کے ۔ داد لے لے کے اور لغات پر
ریویو لکھوا لکھوا کے پیر نیچر کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ۔ وہی مثل ہوئی ۔

پیراں نمی پرند مریداں می پرانند

بھلا پوچھئے جس شخص کو خدا کے کلام میں تاویلات و توجیہات لاطائل نکالنے میں باک نہ ہو اسے اپنی مادری
زبان بگاڑنے میں کیا تکلف ہو سکتا ہے ہم کو تو اسی دن خیر نظر نہ آئی تھی ۔ جب ہم نے جسٹس محمود کو الہ آباد

کانفرنس میں شاعری کی ٹانگ توڑتے دیکھا تھا۔

اب سید صاحب اُردو شاعروں پر منہ آنے لگے ہیں اور دھمکیاں سنانے لگے ہیں۔ آپ اپنے "علی گڈھ گزٹ" میں ایک مضمون تحریر فرماتے ہیں۔

"کیا اردو اشعاروں ۔۔۔۔

یا علی؟ دیکھئے وہ ٹھوکر کھائی نا۔ ماشا اللہ چشم بد دور کیا جمع منتہی الجموع ارشاد فرمائی ہے کہ واہی وا ـــــ حضرت اشعاراتوں فرمایا ہوتا تو ٹھیک بنتا۔ سچ ہے ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

دشمنوں کے کان بہرے سننے میں آیا ہے۔ سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سرسید پر داغنے والے ہیں ارے بھئی کیا شاید فرانس میں جا کر ڈول ہو گی۔ نہیں نہیں صاحب کیا بندوق پستول سمجھے ـــ بھائی جان نالش داغنے والے ہیں۔ دعویٰ یہ ہوگا کہ سرسید نے ٹرسٹیز بل کا جو قانون بے ضابطہ منظور کرالیا ہے خارج کیا جائے۔

اچھا۔ یہی سبب ہے کہ شاید مولوی سمیع اللہ خاں صاحب خاموش ہو رہے اور اس کے ساتھ ہی مع ذرا ہماری نظر سے کچھ اتر سے گئے تھے۔ کیا معنی جب اس طرح چپ ہو رہنے کا ارادہ تھا تو شائیں شائیں کیوں کی تھی۔ مگر نہیں۔ معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بھی دھن کے پکے ہیں اور دھن کیا انصاف کی یہی ہے۔

ارے بھائی سید محمود ہزار بار سیکریٹری مقرر ہوں عمر بھر کے لئے نہیں قیامت تک کے لئے اچنانچہ خود مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سب سے پہلے سید محمود کی نسبت رائے دینے والا میں ہی ہوں گا ـــــ مگر گفتگو تو یہ ہے کہ جو کچھ تصفیہ ہو وہ باضابطہ ہو ہاں اس کا خیال رہے کہ جھگڑے کا اثر سید کی ذات یا مدرستہ العلوم پر نہ پڑنے پائے۔

تنقید ادب

۱۔ حالی

ہمارے مولانا حالی صاحب ایک تو فصاحت سے خالی دوسرے آپ کی نیچرلٹی بھی الوکھی نرالی ـــ فرماتے ہیں۔

فصلِ خزاں ہے تس پہ پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا

تس پر کی وضاحت قابل داد ہے۔

۲۔ "ثمرۂ دیانت"

از قاضی عزیز الدین احمد

فقتہ ؎ لے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم

۳- خمخانۂ جاوید

پہلی جلد میں لالہ سری رام نے الف ب ختم کی ـــــ تذکرے کے اعتبار سے یہ شاعروں کی صرف ایک فہرست ہے۔
لالہ سری رام فرماتے ہیں مولانا حالی کو پہلے شاعری کا شوق چچا (پیارے لال آشوب) کی صحبت میں ہوا ـــ تعجب ہے
چچا کی صحبت کا اثر بھتیجے پر کچھ بھی نہ ہوا ـــــ تذکرہ کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا نہیں، کوئی پانی پتی یا جھجر کا
رہنے والا اس کا مصنف ہے۔

جلال لکھنوی

آپ نے ایک مرتبہ رامپور کے مشاعرہ میں ایک شعر پڑھا ـــــ مولانا عبدالحق منطقی خیرآبادی کو وجد آگیا۔ جھوم
اٹھے رونے لگے ؎

حشر میں چھپ نہ سکا حسرت دیدار کا راز　　آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

دو تین شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

نجات ہو گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے　　اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے

...

یہ کہہ کر کروٹیں شب کو ترے ناکام لیتے تھے　　وہ دل کیا ہو گیا رہ رہ کے جس کو تھام لیتے تھے

...

دفن کرنا اپنے کوچہ میں جہاں تک ہو سکے!　　اور وقت مرگ ہم تم سے وصیت کیا کریں

...

لو امتحان تم مرے نالوں کا شوق سے　　کیوں ڈر کے آسمان کے نیچے سے ہٹ گئے

ـــ

ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں کے سامنے کسی لفظ پر آپ نے شک ظاہر کیا۔ نواب صاحب نے ـــــ مولوی غیاث
(صاحبِ غیاث اللغات) کو طلبی کا حکم دیا۔ جلال نے کہا وہ کیا جانیں انہیں بس لونڈے پڑھانا آتا ہے۔ نواب صاحب
کو یہ بات ناگوار گزری اسی وقت دربار سے اٹھ کر چلے گئے ـــــ

● نواب کلب علی خان کی یہ عادت تھی کہ جب مصاحبین کی کوئی بات خلاف مزاج ہوتی تو دربار برخاست کر دیتے۔

تبرکات

۱- چندا ماہ لقا (چاند بی بی)

عہد عالمگیر میں ان کی جاگیر حیدرآباد دکن میں بہت کچھ شہرت رکھتی تھی۔ اور یہ ہمیشہ سیکڑوں سپاہیوں

کے باڈی گارڈ کے آگے اسلحہ لگائے گھوڑے پر سوار سیر و تفریح کو نکلا کرتی تھیں ۔۔۔ یہ بات بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آپ شاعرہ بھی تھیں۔ اور عمدہ شعر کہتی تھیں۔ یہ شعر اگر یہ کہتیں تو بہت موزوں ہوتا۔

میں فوج میں ہوں پیشہ ہے میرا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہ واقعات ایک علم دوست یورپین سے معلوم ہوئے جس کو چندا نے اپنا دیوان ۱۷۹۹ء میں دیا تھا اور اس علم دوست انگریز نے یہ دیوان لندن کے کتب خانہ میں دے دیا اگر لندن کا کتب خانہ نہ ہوتا چندا کا نام اس قدر روشن نہ ہوتا ۔۔۔ نمونہ کے طور پر دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہاں رہے گا ۔ پر آپ کو غلط کچھ سب پر گماں رہے گا

...

اک لخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینے کو ۔ پر کیا کروں کہ تیرا منہ درمیاں رہے گا

شعر مضطر

پڑ گئے زلفوں کے پھندے اور بھی ۔ دل کو یہ الجھن ہے چندے اور بھی

...

اے خدا باقی ہیں بندے اور بھی ! ۔ ان کو تھوڑا بانکپن دے اور بھی

...

تاریخِ وفات سید طفیل احمد کرمانی خیر آبادی

سید طفیل احمد چوں شد رواں زگیتی ۔ در خول طپید دلہا اندوہ و رنج بے حد
منشی ریاض احمد شد بے پدر دریغا ۔ اندر ریاض معنی ناگہ خزاں چہ سرزد
رفت از جہانِ ہستی شد آنجہاں بہشتی ۔ بادا طفیل احمدؐ با رحمتِ محمدؐ
معذورم از زودری تاریخ خود ضروری ۔ ورتیتم اشکم با تعزیت بر آمد

سال وفات ہجری اے ہاشمی چہ پرسی
شد در جناں زگیتی سید طفیل احمد
۱۳۱۵ھ

از ہاشمی صفی پوری

امیر مینائی

۱۸۵۸ء میں خدائے سخن حضرت امیر کسی خاص ضرورت سے لکھنؤ تشریف لائے۔ حضرت حکیم لکھنوی

خلف حضرت امیر مینائی نے ایک صحبت مشاعرہ قرار دی۔ جسکی علت غائی حضرت امیر کا کلام سننا تھا۔ اس میں شائقین نزدیک و دور سے محظوظ ہونے کے واسطے آئے تھے۔ کمترین بھی حاضر تھا۔ رات کے دو بجنے لگے تھے۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھ رہا تھا آخر حضرت امیر نے اپنی غزل شروع کی۔ اس زمین میں قریباً کل اساتذہ کی غزلیں ہیں۔ خود حضرت امیر کے تارکی دیوان مراۃ الغیب میں سہ غزلہ موجود ہے۔ لیکن حضرت نے قریب ستو اشعر کے اس موقعہ پر ایک غزل تازہ کہی جسکا ایک مصرع بھی پرانی غزلوں سے نہیں ملتا۔ جس وقت یہ غزل شروع ہوئی ہے سامعین فرطِ شوقِ استماع میں یوں ٹوٹے پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے۔

اندھیر کر رہی ہے یہ چشمِ سیاہ میں — شوخی کو قید کیجئے نیچی نگاہ میں
اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — شعلے دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں
توبہ بھی کچھ بھروسہ کے قابل ہے زاہدو — پہنچی ہے ہم سے لوٹ کے اب خانقاہ میں
وہ ڈھونڈتے ہیں دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں! — ہم شاد ہیں کہ ہیں تو کسی کی نگاہ میں
قالب میں دل ہے جلوہ نما قید داں میں دل — یوسف گرا ہے کہ زلیخا کو چاہ میں
دل میں صنم صنم ہے زباں پر صنم صنم — حسنِ عمل کی بھی ہو جھلک کچھ گناہ میں
آنسو ہمارے دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں وہ — پازیب موتیوں کی ہے پائے نگاہ میں
دے تیغِ ناز اب جو تو نے اٹھا لیا — لیتا نہیں مجھے کوئی اپنی پناہ میں

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

...

مہاراجہ چندو لال شاداں

مہاراجہ چندو لال مدار المہام دکن، شعر و سخن کا بہت شوق رکھتے تھے اور انکا کلام، کلام الملوک سمجھا جاتا تھا۔ بلا ناغہ شب کو ایک طبعزاد غزل سنا کر حاضرین، خوشامدین، ملازمین سے داد لیا کرتے تھے۔ ایک دن لالہ صاحب کی طبیعت کچھ فکر نہ کر سکی۔ شوقین شام ہی سے مرح کی آتشبازی لے کر آ دھمکتے تھے۔ راجہ صاحب نے حسب معمول دربار کیا۔ دیر تک جب سکوت سے لوگ اکتانے لگے تو لالہ صاحب تاڑ گئے۔ لالہ صاحب نے فرمایا حاضرین آج بسبب ناچاقی ... یہاں تک فرما چکے تھے کہ باہر کے کمرہ سے واہ واہ سبحان اللہ ماشاء اللہ، شعر اس کو کہتے ہیں، کیا ذہن رسا پایا ہے، کے نعرے بلند ہونے لگے۔ لالہ صاحب خفیف ہوئے کہ آج کم سخن کو مضمون کو ہی کلام سنانا رہا۔ اسی دن سے عہد کیا کہ اب ان بدمعاشوں کو کچھ نہ سناؤں گا بلکہ شاعری کا مشغلہ بھی ترک کر دیا۔

تخلیق آدم

(ہنڈرک وان لون کے نقطۂ نظر سے)

سرفراز نیازی

ہم ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کے سایہ میں جی رہے ہیں۔

ہم کون ہیں۔ ؟

ہم کہاں سے آئے ہیں۔ ؟

ہم کہاں جارہے ہیں ۔ ؟

اب آہستہ آہستہ اس سوالیہ نشان کو پیچھے کی طرف ہٹاتے جائیے۔ یہانتک کہ آپ اس افق تک پہنچ جائیں جہاں سر ان سے وزمین ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں یہاں پہنچکر آپ کو معلوم ہوگا کہ ماضی بعید میں اب سے اربوں سال اور پہلے کائنات کا کیا رنگ تھا۔ اور ہم کیونکر وجود میں آئے۔

یہ کرۂ زمین جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا آتشین کرہ تھا مشتعل دھویں کا ایک عظیم الشان کرہ۔ تھ جو باوجود اپنی عظمت کے بھی فضائے عالم میں ایک نہایت حقیر چھوٹے سے نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو ہر وقت گردش میں رہتا تھا اور اربوں سال تک وہ اسی چکر میں مبتلا رہا۔

آخرکار ایک وقت آیا (کب اور کیونکر ہمیں نہیں معلوم) کہ رفتہ رفتہ اس کے اشتعال میں کمی پیدا ہونے لگی اور اس میں کچھ جھریاں سی پڑنے لگیں جنھیں ہم پہاڑ یا چٹانیں کہتے ہیں اس کے بعد جب قدرت آگ کے سلسلے سے کچھ تھک گئی تو اس نے یہ آگ بجھانے کے لئے پانی برسانا شروع کیا۔ لیکن جس طرح وہ آگ بے پناہ تھی۔ اس طرح پانی کے ان ابلتے ہوئے دھاروں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پہلے ساری دنیا آگ ہی آگ تھی اور اب وہ پانی ہی پانی ہوگئی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ آگ کے بعد پانی کا یہ کھیل قدرت نے کب تک کھیلا۔ لیکن اس کھیل کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ پہاڑوں اور چٹانوں کے ذرات پانی کے ساتھ ساتھ بہہ نکلے اور بلند پہاڑوں کی وادیوں میں ایک بستر کی طرح وہ چاروں طرف پھیل گئے اس کے بعد بھی جب ایک طویل، بڑا طویل زمانہ گزر گیا۔ اور اس اسٹیج کا تیسرا پردہ اٹھا۔ تو سورج نے بادلوں کا پردہ ہٹاکر افق سے دنیا پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ دنیا اب دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ بڑا حصہ پانی کا اور چھوٹا حصہ خشکی کا تو اس نے سوچا کہ اب عمل تخلیق کو زیادہ التوا میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے آغاز کے لئے اس نے پانی کے حصہ کا انتخاب کیا ـــــ اور آخرکار دفعتاً ایک متحرک سا نقطہ اس میں تیرتا ہوا نظر آیا جو تخلیق انسانی کا سب سے پہلا بنیادی نشان تھا

ہے کبھی بعض نے پانی کے اندر رہنے
ایں سانس لینے کے لئے انھوں
مثال مینڈک ہے کہ اس

با ناپسند نہیں کیا۔ سو یہ دو
تھ اور جب ان کے پاؤں
زمین کا بڑا حصہ ان سے
ک رینگ رینگ کر
س کے پہلو میں دونوں
بڑے بڑے جانور
تو تھے نہ تیز دوڑ
وہ نہ مچھلیوں
مادہ کو لفرتو

تخلیق آدم

(ہنڈرک وان لون کے نقطۂ نظر سے)

سرفراز نیازی

ہم ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کے سایہ میں جی رہے ہیں ۔
ہم کون ہیں ۔ ؟
ہم کہاں سے آئے ہیں ۔ ؟
ہم کہاں جا رہے ہیں ۔ ؟

اب آہستہ آہستہ اس سوالیہ نشان کو پیچھے کی طرف ہٹاتے جایئے ۔ یہاں تک کہ آپ اس افق تک پہنچ جائیں جہاں آسمان و زمین ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں یہاں پہنچکر آپ کو معلوم ہوگا کہ ماضی بعید میں اب سے اربوں سال پہلے کائنات کا کیا رنگ تھا ۔ اور ہم کیونکر وجود میں آئے ۔

یہ کرۂ زمین جس میں ہم سانس لے رہے ہیں ۔ ایک بہت بڑا آتشین کرہ تھا مشتعل دھویں کا ایک عظیم الشان کرہ ۔ جو باوجود اپنی عظمت کے بھی فضائے عالم میں ایک نہایت حقیر چھوٹے سے نقطہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ جو ہر وقت گردش میں رہتا تھا اور اربوں سال تک وہ اسی چکر میں مبتلا رہا ۔

آخر کار ایک وقت آیا (کب اور کیونکر ہمیں نہیں معلوم) کہ رفتہ رفتہ اس کے اشتعال میں کمی پیدا ہونے لگی اور اس میں کچھ جھریاں سی پڑنے لگیں جنھیں ہم پہاڑ یا چٹانیں کہتے ہیں اس کے بعد جب قدرت آگ کے سلگانے سے کچھ تھک گئی تو اس نے یہ آگ بجھانے کے لئے پانی برسانا شروع کیا ۔ لیکن جس طرح وہ آگ بے پناہ تھی ۔ اس طرح پانی کے ان اُبلتے ہوئے دھاروں کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ پہلے ساری دنیا آگ ہی آگ تھی اور اب وہ پانی ہی پانی ہو گئی ۔

کون کہہ سکتا ہے کہ آگ کے بعد پانی کا یہ کھیل قدرت نے کب تک کھیلا ۔ لیکن اس کھیل کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ پہاڑوں اور چٹانوں کے ذرات پانی کے ساتھ ساتھ بہہ نکلے اور بلند پہاڑوں کی وادیوں میں ایک بستر کی طرح وہ چاروں طرف پھیل گئے اس کے بعد بھی جب ایک طویل ، بڑا طویل زمانہ گزر گیا ۔ اور اس اسٹیج کا تیسرا پردہ اٹھا ۔ تو سورج نے بادلوں کا پردہ ہٹا کر افق سے دنیا پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر کہ دنیا اب دو حصوں میں بٹ گئی ہے ۔ بڑا حصہ پانی کا اور چھوٹا حصہ خشکی کا تو اس نے سوچا کہ اب عمل تخلیق کو زیادہ التوا میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ۔ اس کام کے آغاز کے لئے اس نے پانی کے حصہ کا انتخاب کیا ـــــ اور آخر کار دفعتاً ایک متحرک سا نقطہ اس میں تیرتا ہوا نظر آیا جو تخلیق انسانی کا سب سے پہلا بنیادی نشان تھا

جسے علمی زبان میں خلیہ (Cell) کہتے ہیں۔ یہ تھا پہلا بنیادی نقطہ یا تخم [illegible] حیات [illegible] حرکت
وجنبش کیونکر پیدا ہوئی۔ خود اپنے آپ رینگنے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک منتقل ہونے کی اہلیت اس میں کہاں سے آئی۔ اس کا
جواب کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان آج تک نہیں دے سکا۔ سوا اس قیاس کے کہ آفتاب کی گرمی کی وجہ سے پانی کے قطروں کے
اجزا میں کسی کیمیاوی عمل سے کچھ خمیر سا پیدا ہوا۔ اور اس خمیر میں جان سی پیدا ہو گئی۔ بہر حال یہ معمہ کہ حیات یا جان کیونکر پیدا
ہوئی، وہ کون تھا جس نے زندگی کا یہ پہلا بیج پانی میں بو یا۔ آج تک حل نہیں ہو سکا اور نہ غالباً آئندہ حل ہو سکے گا۔ بہر حال یہ
بات کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے تسلیم شدہ امر ہے جس کی تصدیق قرآن کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ (کل شئ حیّ
من الماء (یعنی ہر شے کی زندگی کی بنیاد پانی ہے) لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ زندگی کا جو یہ حقیر سا بیج بو یا گیا تھا وہ دفعتاً
نشو و نما پا کر تناور درخت بن گیا اور دنیا آناً فاناً آباد ہو گئی۔ اس قطرہ کی گہر ہونے تک۔ کی داستان اس سے زیادہ عجیب
وغریب ہے۔ آپ نے اس خلیہ (Cell) کے پیدا ہونے کا حال تو جان لیا۔ لیکن بعد کو اس غریب پر کیا کیا گزری۔ یہ بڑی
طویل کہانی ہے۔ کروڑوں سال کا قصہ ہے اور نہایت عجیب وغریب! چاہیے تو یہ تھا کہ یہ خلیہ جلد جلد بڑھتا اور نشو و نما پا کر
کوئی دوسری صورت اختیار کر لیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ خلیے ایک طویل زمانۂ نامعلوم تک بے اختیارانہ بغیر قصد و ارادہ
کے پانی کے دھاروں اور موجوں کے نشیب و فراز میں ہچکولے کھاتے رہے اور جب وہ اپنی اس زندگی سے تنگ آ گئے تو انھوں
نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا چاہیے اور اس جستجو میں وہ پانی کی سطح سے بہت نیچے سمندروں کی گہرائی میں
پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ اور اپنے آپ کو ڈانواڈول زندگی سے محفوظ رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں
نکالے۔ لیکن یہ ہاتھ پاؤں ہمارے جیسے نہ تھے بلکہ نہایت باریک ریشوں کی طرح تھے جو سمندر کی تہہ میں زمین کے اندر
پھیلنے لگے اور ان کے سہارے ایک جگہ ٹک کر انھوں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ اور اس طرح سب سے پہلے پانی کے اندر کی
جھاڑیوں یا سمندر کے پودے وجود میں آئے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ تمام خلیوں نے یہی عمل اختیار کیا۔ درست نہیں کیونکہ ان میں
لاتعداد خلیے ایسے بھی تھے جنھوں نے آبی پودوں کی سی غیر متحرک زندگی کو پسند نہیں کیا اور ان کے ریشوں نے ننھے ننھے پاؤں
کی صورت اختیار کر لی۔ جن کی مدد سے وہ آبی پودوں کے اردگرد حرکت کرنے لگے اور کیڑے مکوڑے کہلائے۔ ان میں
سے بعض ایسے خلیے بھی تھے۔ جن کے ریشوں نے پاؤں کی جگہ بازوؤں کی صورت اختیار کر لی اور ان کی مدد سے وہ پانی
میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔ یہی تھے وہ خلیے جو بعد کو ترقی کرتے کرتے مچھلیاں بن گئے۔ الغرض اس طرح سمندر کی
آبادی بڑھنے لگی اور کروڑوں سال تک اس طرح بڑھتی رہی۔

اس کے بعد ارتقاء کی دوسری منزل شروع ہوئی۔ یعنی پانی کے پودوں اور درختوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ
وہ سمندر کی آبی فضا سے نکل کر ذرا باہر کی بھی سیر کریں اور اس طرح وہ بڑھتے بڑھتے ساحل تک ان دلدلوں تک پہنچ گئے جو
سمندروں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ لیکن اب ایک سب سے بڑی مشکل ان کے سامنے آئی اس سے پہلے تو انھیں صرف
پانی کے اندر ہی زندہ رہنے اور نشو و نما پانے کا سلیقہ حاصل تھا اور پانی ہی کے اندر اپنی غذا حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن دلدلوں
اور ساحلوں پر پانی کہاں۔ اس لئے انھوں نے رفتہ رفتہ ہوا سے اپنی غذا حاصل کرنا شروع کی اور سیکڑوں صدیاں گزرنے
کے بعد وہ اس نئی زندگی سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ اپنی ایک نئی دنیا بسا لی۔ وہ رفتہ رفتہ پھول پیدا کرنے لگے اور ان
پھولوں کے زیرے جڑوں کے ذریعے سے اتنے پھیل گئے کہ کوہ دامن ہر جگہ پیڑ ہی پیڑ نظر آنے لگے۔

اب اسی کے ساتھ پانی کی اس دوسری مخلوق کو بھی لیجئے جسے ہم مچھلی کہتے ہیں کہ ان میں سے بھی بعض نے پانی کے اندر رہنے پر قناعت نہیں کی۔ اور خشکی کی سیر کرنے کی بھی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا میں سانس لینے کے لئے انھوں نے پھیپھڑے بھی پیدا کرلئے تاکہ وہ پانی اور خشکی دونوں جگہ زندگی بسر کرسکیں۔ جسکی سب سے پہلی مثال مینڈک ہے کہ اس کا مسکن پانی بھی ہے اور خشکی بھی۔

اس آبی مخلوق میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے ایک بار خشکی پر آنے کے بعد پانی میں واپس جانا پسند نہیں کیا۔ سو یہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ نے رینگنے والے جانوروں کی شکل اختیار کرلی جو ریڑھ کی ہڈی رکھتے تھے اور جب ان کے پاؤں لگ گئے تو رفتہ رفتہ انھوں نے عجیب وغریب ہیبت اور عظیم الشان صورتیں اختیار کرلیں۔ یہاں تک کہ زمین کا بڑا حصہ ان سے بھر گیا۔ دوسرا حصہ کیڑے مکوڑوں کی صورت میں درختوں پر چڑھ گیا اور ایک شاخ سے دوسری شاخ تک رینگ رینگ کر پہنچنے لگا، لیکن پھر اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ شاخوں سے الگ ہوکر فضا کی بھی سیر کرے تو اس کے پہلو میں دونوں طرف دو پر پیدا ہوگئے اور وہ ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کے بعد عالم مخلوقات میں تیسرا انقلاب آیا۔ یعنی تمام بڑے بڑے جانور ہلاک ہونے لگے شاید اس لئے کہ انھیں دنیا کی ہوا راس نہیں آئی، یا اس لئے کہ وہ نہ تیر سکتے تھے، نہ اڑ سکتے تھے نہ تیز دوڑ کر اپنی غذا حاصل کرسکتے تھے۔ بہرحال وہ رفتہ رفتہ ختم ہوگئے اور ان کی جگہ ایک بالکل نئی مخلوق نے لے لی۔ جو نہ مچھلیوں کے سے بازو رکھتی تھی۔ نہ چڑیوں کی طرح پر یعنی تھی تو وہ انھیں رینگنے والی مخلوق کی نسل سے جس میں نر و مادہ کو تفریق ہوچکی تھی۔ لیکن اب قدرت نے اس کی زندگی کا اسلوب بدل دیا تھا۔ پہلے تو یہ مخلوق صرف انڈے دیتی تھی اور ان سے بچے پیدا ہوکر از خود اپنی غذا تلاش کرلیتے تھے۔ لیکن اب بچوں کی پیدائش انڈوں کی جگہ مادہ کے پیٹ سے ہونے لگی اور بچوں کی پرورش کیلئے ان کو تھن دیدئے جس سے دودھ پیدا ہوتا تھا اور اسی دودھ سے بچوں کا نشو ونما ہوتا تھا۔

قدرت کی یہ تخلیق کب ہوئی اس کا حال کسی کو معلوم نہیں لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس تفریق کے بھی دو پہلو تھے۔ یعنی ایک وہ مخلوق یا حیوانات جو دماغ تو رکھتے تھے لیکن تعقل سے بیگانہ تھے اور وہ صرف اس حد تک سمجھ سکتے تھے کہ اپنی حفاظت اور فراہمی غذا کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ یعنی اپنی بقا کے لئے ایک فطری احساس ان میں ضرور موجود تھا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس کی دوسری قسم اس مخلوق کی وہ تھی جو تعقل بھی رکھتی تھی اور جو اس بات کے سمجھنے کی بھی قطعی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے خارجی تدابیر بھی اختیار کرے اور یہی تھی وہ مخلوق جسے ہم آدم کہتے ہیں اور جس نے اپنی عقل منطقی سے کام لے کر ترقی شروع کی اور رفتہ رفتہ تمام روئے زمین پر چھا گئی۔

باب المراسلہ والمناظرہ

(بعض آیات قرآنی)

(مولانا عرشی دارالقرآن۔ لاہور)

مخدومی مولانا! اسلام و رحمت

آپ نے مجلہ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں میرا عریضہ شائع کرکے اور اس پر اپنے قلم سے چند سطور لکھ کر مجھے مطمئن کر دیا اور اسکے ساتھ ہی اپنی عظمت میں بہترین اضافہ کیا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

حدیث "الحرب خدعۃ" پر جو کچھ آپ لکھ چکے ہیں میرا خیال ہے وہ کافی وشافی ہے۔ آیات ذیل سے متعلق آپ کی تحقیق کا مشتاق و منتظر ہوں۔

۱۔ ان المنافقین یخادعون اللہ وھو خادعھم (نساء ع ۲۱)
۲۔ واللہ خیر الماکرین (آل عمران ع ۵ وانفال ع ۴)
۳۔ انھم یکیدون کیدا واکید کیدا (طارق ع ۱)
۴۔ املی لھم ان کیدی متین (اعراف ع ۲۳ وقلم ع ۲)
۵۔ کذلک کدنا لیوسف (یوسف ع ۹)
۶۔ اللہ یستھزئ بھم (بقرہ ع ۲)

اور بھی کئی ایسے مقامات ہیں لیکن ان مختصر آیات کی شرح سے آپ کا نہج فکر معلوم ہو جائے گا جس سے مجھ ایسے طلبہ قرآن کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔

(انکار)

آپ ان آیات کی تحقیق مجھ سے چاہتے ہیں! کس قدر عجیب بات ہے۔ میں کیا اور میری تحقیق کیا۔ آپ اپنی ساری زندگی مطالعہ قرآن کے لئے وقف کر چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت دارالقرآن کا قیام ہو جانا ہے اور پہلی ربع صدی میں آپ نے قرآن کی جتنی عظیم خدمت انجام دی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اس لئے مناسب تو یہی تھا کہ۔ خدعۃ کی بحث میں بھی اس موضوع پر مزید گفتگو فرماتے اور اسی سلسلہ میں اس کے قریب قریب ہم معنی دوسرے الفاظ۔ کید، استہزاء اور مکر وغیرہ

پر اپنی تحقیق سے سب کو مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ لیکن یہ بار گراں آپ نے میرے سر ڈال دیا۔ غالباً اس لئے کہ اس باب میں اگر میں کسی غلطی میں مبتلا ہوں تو آپ اس کو دور کردیں۔ مناسب ہے۔ بہرحال از رہ تمثال امر میں یہ چند سطور لکھنے کی جراُت کر رہا ہوں۔

آپ نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے۔ ان سب پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کرنا شاید ضروری نہیں۔ مجموعی طور پر ان سب کے مفہوم کو سامنے رکھ کر اظہار خیال غالباً زیادہ مناسب ہوگا۔

وہ آیات قرآنی جن میں خدع، مکر یا کید کو خدا نے اپنی ذات سے منسوب کیا ہے، اس لحاظ سے یقیناً قابل توجہ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد ایک شخص اعتراض کرسکتا ہے (اور مسیحی جماعتوں نے کیا ہی ہے) کہ مسلمانوں کا خدا خادع بھی ہے، مکار بھی ہے اور کیاد بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس غلطی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ معترضین نہ الفاظ کی لغوی تحقیق کرتے ہیں نہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق (محل استعمال) کو سامنے رکھتے ہیں اور نہ عربی ادب کی خصوصیات بیان پر ان کو وقوف ہے۔ اس لئے میری رائے میں معترضین کے شبہات دور کرنے کے لئے زیادہ بحث و مباحثہ میں پڑنے کے بجائے مناسب یہی ہے کہ انھیں ان الفاظ کے مختلف مفاہیم و معانی سے آگاہ کردیا جائے۔

مثلاً سورۂ نسار کی اسی آیت کو لیجئے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے کہ اس کا ترجمہ اردو میں بظاہر یہی ہوسکتا ہے کہ "منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور اللہ انھیں دھوکا دیتا ہے" اور اس ترجمہ یا مفہوم کی بنا پر ایک شخص بہ آسانی کہہ سکتا ہے کہ خدا (نعوذ باللہ) خود بھی دھوکا باز ہے۔ لیکن اگر لغوی حیثیت سے اس کے تمام معانی ظاہر کردئے جائیں تو وہ ترجمہ صحیح نہ رہے گا جو میں نے ابھی کیا اور مفہوم بالکل دوسرا ہو جائے گا۔

لفظ "خدع" فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی صرف "فاسد" ہوجانے کے ہیں اور جب کسی شے میں کوئی تغیر پیدا ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں "خدع الشیئ" یعنی "وہ کچھ سے کچھ ہوگئی" (یہ معنی بھی میں نے بہت ڈرتے ڈرتے کئے ہیں ورنہ خود لفظ "فساد" اتنے متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے کہ ان کا اظہار بھی بڑی تفصیل چاہتا ہے لیکن خیر بات کو مختصر کرنے کے لئے میں نے اسی معنی پر اکتفا کیا) خدع کا مفہوم فعل متعدی ہونے کی حیثیت سے اور زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً اس کا ایک مفہوم ہے "کسی کو دھوکا دینا یا نقصان پہنچانا ایسے ذرایع سے جن کا علم دھوکا دئے جانے والے کو بالکل نہ ہو"۔ "خدع" کا ایک مفہوم ترک کردینا اور چھوڑ دینا بھی ہے جیسے "کان فلاناً کریماً ثم خدع" (یعنی وہ پہلے بخشش کیا کرتا تھا لیکن پھر یہ عادت ترک کردی)

اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے "دل کی بات چھپا کر اس کے خلاف باور کرانے کی کوشش کرنا" اور یہی مفہوم مکر و کید کا بھی ہے۔ اسی مفہوم کے قریب قریب جو اور تفریعی معانی اس لفظ کے پیدا ہوتے ہیں وہ عربی زبان کے مختلف محاوروں کے مطالعہ سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ مثلاً جب بازار کا بھاؤ گھٹتا بڑھتا ہے تو کہتے ہیں "سوق خادعۃ" یا جب آنکھ پوری طرح کسی چیز کو نہ دیکھ سکے تو کہتے ہیں "خادع العین" (آنکھ کو دھوکے میں مبتلا کردیا) جب ریگستان میں راستہ بن بن کر بگڑ جاتا ہے تو اسے "طریق خادع" یا "طریق خدوع" کہتے ہیں۔ اسی طرح کھوٹے سکے کو "دینار خادع" کہنا دھوکا یا مکر و فریب کے مفہوم سے متفرع ہے۔

اس لفظ کے مفہوم کا ایک پہلو اور ہے جو غالباً زیر بحث گفتگو سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور وہ ہے دھوکے کی

کامیابی یا ناکامی کا ۔ سو اہل عرب نے اس کی تفریق بھی کردی ہے اور وہ یہ کہ اگر دھوکا دینے والا کامیاب ہوجائے تو کہیں گے ۔ ھو خذع ۔ یعنی وہ دھوکا دینے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن وہ اگر کامیاب نہ ہوگا اور اقدام ناکام ہوگا ۔ (جس کا اشارہ کلام مجید کی اس آیت میں بھی موجود ہے:۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم) تو کہیں گے ۔ ھو خادع ۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کلام مجید میں جہاں جہاں دوسروں کے لئے ۔ یخادعون اللہ ۔ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم یہی ناکام مکر و فریب ہے ۔ اور جہاں جہاں خدا نے اس لفظ کا انتساب اپنی ذات سے کیا ہے وہاں اس کا مفہوم ہوگا دھوکے کو ناکام بنادینا اور مخالف تدبیروں سے پلٹ دینا۔"

اس طرح اس قسم کی تمام آیات کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ " مخالفین دھوکا دینے ، مکر و فریب سے کام لینے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں لیکن خدا ان کی ہر سعی و کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے ۔" اور یہ وہ مفہوم ہے جو لغت ، محاورہ سیاق و سباق ہر لحاظ سے صحیح ہے اور جس کے پیش نظر یہ اعتراض بالکل دور ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا خود اپنے آپ کو خادع ۔ مکار ۔ یا کیاد ظاہر کرتا ہے ۔

بسلسلۂ لفظ مکر، آل عمران کی جس آیت کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ یہودیوں سے متعلق ہے کہ انھوں نے مسیح کو ہلاک کرنے کی تدابیر اختیار کیں اور اللہ نے مسیح کو بچانے کے لئے زیادہ بہتر تدبیر اختیار کی کیونکہ مکر کے معنی تدبیر کے بھی ہیں ۔

سورۂ انفال میں مکر کا ذکر واقعۂ ہجرت کے سلسلے میں کیا گیا ہے اور اس میں یمکرون کا مفہوم ہے سازش ۔ اور مکر کا مفہوم ہے دفع سازش ۔

اسی طرح سورۂ طارق اور سورۂ یوسف کی جن آیات کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں لفظ کید چارہ و تدبیر کے مفہوم میں مستعمل ہوا ہے ۔ چنانچہ کاد الشئ کے معنی ۔ عالجہ ۔ کئے جاتے ہیں ۔

استہزا ۔ اللہ یستھزی بھم ۔ سو اس کی صورت بھی بالکل یہی ہے ۔ منافقین کہتے ہیں ۔ انما نحن مستھزؤن ۔ (یعنی ہم تو مسلمانوں کا تمسخر اڑاتے ہیں، ان کی توہین کرتے ہیں) اور خدا اس کے جواب میں کہتا ہے ۔ اللہ یستھزی بھم ۔ یعنی خدا انھیں اس کی سزا دے گا کیونکہ ۔ استہزاء ۔ کا مادہ ۔ ہزا ۔ ہے اور اس کے معنی ہلاک کرنے کے بھی ہیں ۔ چنانچہ سردی کی شدت سے کوئی شخص ہلاک ہوجاتا ہے تو اہل عرب کہتے ہیں ۔ اھزاہ البرد (سردی نے اسے مار ڈالا)

میں نے لغوی تحقیق کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا ہے ۔ وہ آپ کے لئے نہیں ہے کیونکہ یہ سب کچھ یقیناً پہلے ہی سے آپکے ذہن میں ہوگا بلکہ ان حضرات کے لئے ہے جنھیں ان مسائل پر غور کرنے کی فرصت نہیں ۔

آخر میں خدا کے اسماء صفاتی کے سلسلہ میں (جس کا اشارہ آپ نے اکتوبر کے نگار میں کیا تھا اور خادع کو خدا کا اسم صفت قرار دیا تھا) صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اگر قرآن کے ہر لفظ کو سامنے رکھ کر خدا کا اسم صفاتی قائم کرنے کی اجازت آپ نے دیدی تو ایک شخص کو یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہوجائے گا کہ آیات زیر بحث کے پیش نظر وہ اسماء حسنیٰ میں المکار ۔ الکیاد اور المستہزی کا بھی اضافہ کردے ۔

خود میرا ذاتی خیال اس باب میں کچھ اور ہے یعنی یہ کہ خدا کے اسماء صفاتی متعین کرکے اس کی ذات کو محدود کر دینا ہے ۔ خدا بے نام ہے اور اسے بے نام ہی رہنا چاہئے ۔ لفظ اللہ بھی میرے نزدیک خدا کا نام نہیں بلکہ وہ محض ایک Symbol

یا رمز یہ اشارہ ہے جو ہمارے ذہن کو مخصوص تصور کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

عام طور پر جو اسمائے حسنیٰ بتائے جاتے ہیں وہ بھی دراصل محض ناقص تعبیرات ہیں خود اپنے ہی تصور و خیال کی جن سے حقیقت خداوندی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تاہم ان میں ایک تعبیر ایسی ہے جسے فلسفۂ الٰہیات میں جگہ دی جا سکتی ہے اور وہ ہے۔ "ہو الکل"۔ بعض حضرات۔ "ہو الاول"۔ "ہو الآخر"، "ہو الظاہر"، "ہو الباطن" کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس میں بھی اول و آخر، ظاہر و باطن کہہ کر تحدید کر دی گئی ہے۔ اللہ کو "ہو الغالب" کہنا بھی قابلِ قبول ہے۔ لیکن جبار۔ قہار وغیرہ میرے حلق سے نیچے نہیں اترتے۔ بہر حال اس باب میں کوئی کچھ بھی کہے اور وجود خداوندی کی حقیقت سمجھانے کے لئے کتنے ہی الفاظ کیوں نہ وضع کرے لیکن آخر کار بیدل کی طرح اس اعتراف کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ:

بیدل آں گوہر نایاب سراغ　　بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش　　گل تواں گفت و لے چیدن نیست
نسخہا در بغل و فہم محال　　جلوہا در نظر و دیدن نیست

اور ہزاراں ہزار صلوات بروح پاکِ عرفی، جو بیدل سے بھی آگے بڑھ کر اپنے جذبۂ نارسائی کو اس طرح ظاہر کرتا ہے

کُنہِ ذاتِ تو بہ ادراک کسی شاید دانست
واین سخن نیز باندازۂ ادراک من ست

یعنی میں جانتا ہوں کہ تجھے ہم اپنے ادراک سے نہیں جان سکتے لیکن میرا یہ کہنا بھی اپنے ہی اندازۂ ادراک کے لحاظ سے ہے۔ اور ہمارا اعتراف نارسائی بھی حد درجہ نارسا ہے۔

---

(۲)

(ڈاکٹر سید محمد یوسف (صدر شعبۂ عربی۔ کراچی یونیورسٹی)

اگست کے شمارے میں میرے فاضل دوست ڈاکٹر سبزواری کا مقالہ بعنوان "کچھ (ایسا) کے بارے میں" پیش نظر ہے۔ موصوف کی علمی تحقیق کے ذیل میں ایک عام لسانی دلچسپی رکھنے والے کی حیثیت سے "ایسا"۔ "جیسا" کے اجزاء اصلیہ کی بابت عرض ہے۔

ملاحظہ ہو۔　یوں (ی / وں) = ایسا (ا۔ ی / سا)
جوں (ج / وں) = جیسا (ج۔ ی / سا)
توں (ت / وں) = تیسا (ت ی / سا)
کیوں (ک۔ ی / وں) = کیسا (ک۔ ی / سا)
ویسا (و۔ ی / سا)

دوسرے جزو "سا" کی بابت ڈاکٹر سبزواری بہتر بتا سکیں گے کہ "تا" ، "وا" ، "یت" ، سے یا قدیم سے ہندی جنسیت کا حامل ہے۔ پہلے جزو کی بابت کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

ا ۔ دیکھئے ۔ اب ، ادھر (قدیم ، ایدھر) ؛ اس ؛ ان ۔ [یہاں]

ج ۔ " ۔ جب ، جدھر ؛ جس ؛ جن ۔ جہاں ۔

ت ۔ " ۔ تک ، "ت" بجائے جواب و مشاکلت ۔

[قب (مخفف مقابلہ کیجئے) ۔ جوں کا توں ؛ جیسا کا تیسا ؛

ایسی کی تیسی ۔ ایضاً ، جوں توں ؛ جیسے تیسے ۔]

ک ۔ دیکھئے ۔ کب ؛ کدھر ؛ کس ، کن ۔ کیا (ک ۔ ی / ا) ۔ کہاں ۔

و ۔ " ۔ اُدھر ، اُس ؛ اُن وہاں ۔

مندرجہ بالا شواہد میں حرکت کی تبدیلی اور واؤ اور یا کا ظاہر یا مستتر ہونا نطق و صورت کے اصول کے عین مطابق ہے۔

مذ ربیان کا نازک فرق جس کی طرف مدیر نگار نے اپنی تعقیب میں اشارہ کیا ہے اس سے "لیس کمثلہ شئ" ۔ کا نکتہ تازہ ہو گیا۔

---

(۲) خاتمہ میں سخن گسترانہ ایک بات اور۔ اسی شمارہ میں نیاز صاحب نے نگار کا آئندہ لائحہ عمل پیش کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ ۔

" ادبیات کے سلسلے میں دو چیزوں کا اضافہ اور بھی میرے پیش نظر ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں میں فارسی عربی ذوق پیدا کیا جائے ۔ نہ صرف اس لئے کہ ان کے جانے بغیر کوئی شخص صحیح اردو نہیں لکھ سکتا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ یہ دونوں زبانیں ان مسلم ممالک کی ہیں جن کے جذبات کا مطالعہ ہر مسلمان کا اجتماعی فرض ہے۔ دوسرے یہ کہ شعراء کو فن کی آگاہی کی طرف مائل کرنے کے لئے ۔ مسائل عروض ۔ پر بھی گاہ گاہ مضامین شائع کرنا ضروری ہے .... "

یہ بہت اہم ہے ۔ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت ہے ۔ اگر نیاز صاحب نے اس طرف خصوصی توجہ کی تو وہ سب سے بڑی خدمت انجام دیں گے۔

اردو ادیبوں کی وہ نسل جو عربی فارسی کو اپنا سرمایہ سمجھتی تھی اب ختم ہونے کو ہے انگریزی داں اردو ادیبوں کا دور دورہ شروع ہو گیا ہے ۔ یہی وقت اردو کو سنبھالنے کا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ اسلام اور اسلامی علوم بھی عربی سے آزاد ہو چکے ہیں ۔ یہ اس پاک سرزمین کا بیک وقت دینی اور ادبی کارنامہ ہے ۔

بیاضِ نیاز

(انتخاب وحید الہ آبادی)

(وحید الدین احمد متخلص بہ وحید ابن مولوی امیر الدین عرف مولوی امر اللہ متوطن قصبہ کڑہ ضلع الہ آباد)

(سال پیدائش ۱۸۲۹ء سن وفات ۱۸۹۲ء)

واشد دل نہ ہوئی غنچۂ خاطر نہ کھلا! کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اب کہوں حالِ گریہ و زاری ہنس چکے آپ مسکرا بھی چکے

نہ دیا بزم میں ساقی نے جو ساغر نہ دیا خیر صحبت تو میسر ہوئی مے خواروں کی

ہوائے چمن یاں نہ آئے قفس تک جو آئی ہے تو بال و پر لے کے آئے

آ گئے آپ! میں کہتا تھا کوئی آتا ہے آج کچھ دل کو مرے صبح سے بے تابی تھی

نہ تھے جب اس قدر بے خود تو کیا کچھ کہتے سنتے تھے

اب اشک آنکھوں میں بھر لانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا

اپنے ہی دم سے ہے بہار و خزاں جب نہیں ہم تو باغ و صحرا کیا

عجب بہار کا عالم نظر سے گزرا ہے ہمیشہ تازہ رہے بوستان خیالوں کا

میں جس کی یاد میں جاتا ہوں جان سے اپنی کبھی خیال بھی اس کا ادھر نہیں آتا!

تا زیست جسے کہتے تھے سب عیب محبت ہم بے ہنروں کا تھا تو وہی ایک ہنر تھا

آج تک عالم یہ ہے بے تاب ہو جاتا ہے دل کیا کہوں مذکور ہوتا ہے جہاں اک شخص کا

تک رہے ہیں کس نگاہِ یاس سے ہر سمت ہم ہو گئی کیا حالتِ دل آپ کے جانے کے بعد

مطبوعات موصولہ

تاریخ صحافت اردو (حصہ دوم)
از امداد صابری

۱۸۵۸ء تا ۱۸۷۵ء کے درمیانی عہد کی صحافتی تاریخ ہے۔ جس میں اس زمانے کے اردو روزناموں، ہفتہ وار اخباروں، پندرہ روزہ رسالوں اور ماہناموں کا تحقیقی و تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ سرسری نہیں بلکہ ہر طرح جامع ہے اور مؤلف کی تحقیقی لگن، تدریجی صلاحیت اور تنقیدی شعور کا سراغ دیتا ہے۔

کتاب کا دائرہ کسی پرچہ کی تاریخ اجرا، اس کی نوعیت، پالیسی اور میعاد رجائے اشاعت تک کی اطلاعات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مختلف پرچوں کے مدیروں، ناشروں اور اہم مضمون نگاروں کے حالات زندگی بھی محنت و تحقیق سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ ایسے مضامین و مباحث کے چیدہ چیدہ واقعات و اقتباسات بھی اس میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو آج سے پورے سو سال پہلے کی صحافت کا اہم موضوع اور قارئین کی دلچسپی کا مرکز بن گئے تھے۔ اسی کے ساتھ بعض مشاہیر کے سلسلے میں کچھ ایسے اشعار، تاریخی قطعات، تاریخ ہائے وفات و پیدائش تصاویر اور سوانحی واقعات اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔ جو تحقیقی کام کرنے کے لئے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

گویا اخبار و رسائل یا صحافت کے نام پر اس کتاب میں برصغیر کی زندگی کے بعض ایسے اہم مسائل پر بیش بہا مواد جمع ہو گیا ہے جو نہ صرف صحافت، بلکہ تاریخ و ادب اور ثقافت و سوانح پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بھی بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب ۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور دس روپیہ پچاس پیسے میں شمع بک ڈپو دہلی اور اسرا اکاڈمی راولپنڈی سے مل سکتی ہے

سیر افلاک
از حکیم احمد

ناشر انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ ۔ قیمت ۔ پانچ روپے ۔

حکیم احمد اردو کے ان خاموش اور سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں جو وسعت علم کے ساتھ "ہمت دشوار پسند" بھی رکھتے ہیں اور مشکل سے مشکل کام آسان بنا لیتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "سیر افلاک" جس میں "ثوابت و سیارہ" اور "شہاب ثاقب و عالم کہکشاں" کے ساتھ "نظام کائنات" اور "فضائی سفر" کے دقیق مسائل و مباحث پر عالمانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی ان صفات پر خصوصیت سے دلالت کرتی ہے۔

انجمن ترقی اُردو ہند نے اپنے پنج سالہ پروگرام کے تحت علمی و فنی موضوعات پر کتابیں لکھوانے اور شائع کرانے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم اور مفید کڑی ہے۔ اسمیں "نظام فلکی" کے اوق موضوع کو جس دلنشین

اور محققانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ یہی نہیں کہ زبان و موضوع پر مصنف کی قدرت و دسترس
ٹی ہے بلکہ علمی موضوع پر لکھنے والے اس کتاب کے اسلوب سادہ سے اگر چاہیں تو رہنمائی بھی حاصل کر سکتے
مصنف کا یہ دعویٰ۔ کہ اس کتاب میں اس بات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ مطالب کو سادہ زبان میں بیان کیا جائے
طلبہ مضمون آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ یونہی نہیں ہے۔ اسے مصنف نے شروع سے آخر تک نبھایا ہے۔

طلوع فردا از جمیل ملک

طلوع فردا جمیل ملک کا مجموعہ کلام ہے جسے۔ گوشہ ادب۔ انارکلی لاہور نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔

جمیل ملک کی شعر گوئی کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے آپ نے چند سال پہلے ان کا نام سننے میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ حیثیت سے اس درجہ سامنے آگئے کہ تقسیم کے بعد کی جدید اردو شاعری کا کوئی جائزہ اُن کے ذکر کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔
طلوع فردا میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی اور دونوں فکر و جذبہ کے مشترک رشتہ میں گندھی ہوئی ہیں انکی نظموں میں اکثر غزل کا لہجہ
اور غزلوں میں عموماً نظم کا آہنگ ملتا ہے۔
ہرچند کہ جمیل ملک عصری میلانات پر نظر رکھتے ہیں، وقت کے اہم تقاضوں سے بھی وہ بے خبر نہیں ہیں لیکن جب تک
شاعر میں اور۔ نظر۔ دل۔ میں تبدیلی نہ ہو جائے وہ محض خارجی حقائق کو شعر کا موضوع بنانا پسند نہیں کرتے یہی
ہے کہ دوسروں کی طرح ان کی شاعری میں جدید و قدیم یا غم جاناں و غم روزگار کے الگ الگ خانے نظر نہیں آتے
شاعری زندگی کی طرح ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ ایسی اکائی جو صد رنگ بھی اور یک رنگ بھی۔
طباعت و کتابت بھی اچھی ہے۔ کتاب چار روپیہ میں گوشہ ادب لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

نور خود خوشتر پوری کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ہرچند کہ غزل کے میدان میں کوئی نمایاں جگہ بنالینا اور چونکا دینے والے اشعار نکال لینا اب آسان نہیں رہا۔ پھر بھی ایک شاعر فطرت جس کی گرہ میں کچھ ہوتا ہے وہ اس
شعر کی دل نشیں معصومیت پیدا کر لیتا ہے۔ خود خوشتر پوری کچھ اسی قسم کے نوجوان غزل گو ہیں۔ انھیں نئی بات کو پرانے
اور پرانی باتوں کو نئے ڈھب سے

مری حق پسندی مری حق نوائی — مجھے تختۂ دار تک کھینچ لائی
کوئی کتنی ہی زلفیں سنوارے — وقت کی برہمی کم نہ ہوگی
صبح کا ذکر کرنے سے ہمدم — شام کی تیرگی کم نہ ہوگی
سوچتا ہوں کبھی ایسا ہوگا — ان کو احساس تمنا ہوگا

ہوا پائمال وہ گل جو نکل گیا چمن سے
اسے لوٹ لے گی غربت جو نہ رہ سکا وطن میں

اشعار خود کے روشن مستقبل کا سراغ دیتے ہیں۔
کتاب دو روپے پچاس پیسے میں مکتبہ گلستان ادب کاشی پورہ روڈ کلکتہ ۱۲ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات
۱۸۴۸ــــــ۱۸۵۳

از محمد عتیق صدیقی
ناشر:- انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ
قیمت :- نو روپے۔

محمد عتیق صدیقی کی " نظر تحقیق " اب کسی تعارف و تبصرہ کی محتاج نہیں رہی۔ وہ صحافت و ادب کے تحقیقی شعبے میں اپنی مستقل جگہ بنا چکے ہیں۔ ان کے تحقیقی کاموں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک بے کیف حقائق کو محض بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتے کہ بلکہ اس میں تحقیق اور تنقید کے ذریعہ تخلیق کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسا رنگ جو کسی تحریر کو صحافت کے دائرے سے نکال کر ادب کے حدود میں لے آتی ہے۔

" صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات " بھی اسی نوع کی ایک نہایت مفید اور دلچسپ چیز ہے۔ یہ دراصل ترجمہ ہے۔ اردو اخبارات کی ان رپورٹوں کا جو صوبہ شمالی و مغربی کے گورنر کے حکم سے سال بہ سال تیار کی جاتی تھیں ــــ یہ رپورٹیں جنھیں مؤلف نے بڑی جستجو کے بعد اردو میں منتقل کیا ہے، صرف یہی نہیں کہ اس وقت کے صحافی مزاج و رفتار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں بلکہ ان کے ذریعہ ہماری رسائی سیاست و ادب کے ان میلانات و رجحانات تک ہوتی ہے جو اپنے اصل روپ میں کسی اور جگہ نظر نہیں آتے۔

فاضل مصنف نے رپورٹوں کے شگفتہ ترجمہ و تلخیص کے ساتھ ایک جامع پیش لفظ بھی اس کتاب میں شامل کر دیا ہے اور اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام کس درجہ افادی اور کس درجہ مشکل تھا جس سے مصنف اپنی کہنہ مشقی اور تحقیقی لگن کی بدولت کامیاب و آسان گزر گیا ہے۔

کلک موج
ورق ناخواندہ
سلومی

از عبدالعزیز خالد

عبدالعزیز کے شعری کے مجموعے ہیں جنھیں خاص اہتمام سے عمدہ کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے۔

- کلک موج " غزلوں کا مجموعہ ہے۔ " ورق ناخواندہ " پانچ تمثیلوں پر مشتمل ہے۔
- سلومی " منظوم ڈرامہ ہے۔ یہ تینوں مجموعے علم و فضل سے گراں بار ہیں اور شاعرانہ صلاحیت سے کہیں زیادہ شاعر کی وسعت مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان شعری مجموعوں پر نظر ڈالتے ہی ہمارے ذہن میں انشاءاللہ خاں ابھر آتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد کے یہاں انشاءاللہ خاں کا پھکڑ پن تو خیر کہیں نہیں ہے اور یہ ہونا بھی نہ چاہیے تھا۔ اس لئے کہ یہاں کسی نواب کی صحبت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن حکمت و دانش سے ان کی دلچسپی و تبحر علمی اور شاعری میں اس کے نمود کی کوشش۔ انھیں انشاءاللہ خاں سے بہت قریب لے آتی ہے۔ اور اسی لئے یہ خطرہ بہر حال باقی رہتا ہے کہ ان کا علم و فضل کہیں ان کی شاعری کو نہ لے ڈوبے۔

شاعری میں علم و فن کا اظہار کوئی عیب نہیں ہے۔ علم و فن سے گہری واقفیت ہی سے کلام میں عظمت۔ افادیت اور ابدیت کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن شاعری میں فضل و کمال کو اس طور پر برتنا چاہیے کہ جس طرح کہ درد۔ میر۔ مصحفی آتش۔ میر حسن۔ غالب۔ مومن، نواب مرزا شوق۔ اور فیض وغیرہ نے برتا ہے نہ کہ اس طرح جس کی مثالیں۔ سودا انشا۔ ناسخ۔ شاہ نصیر۔ ذوق۔ دبیر اور امیر کے یہاں ملتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے۔ یہ نصف حقیقت ہے۔ پوری حقیقت غیر شعوری طور پر کچھ لوگ یوں کہہ جاتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا نام ہی نام ہے۔ دائیں سے بائیں تک نظر دوڑا جائیے اس نام سے کام نکالنے میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں۔ عام فضا کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اسلام کا مفکر بھی یہاں آکر غلاف کعبہ۔ بلکہ غلاف برائے کعبہ۔ کا مجاور بن جاتا ہے۔ ایک زمانہ میں یاروں کو عربی کی بھی سوجھی تھی۔ اس غریب کے نام سے بھی کتنوں کے کام نکلے۔ کانفرنسیں ہوئیں کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا جائے۔ اخباروں کے ذریعہ شور مچایا گیا کہ پاکستان کے وزرا بڑے ذوق و شوق سے عربی سیکھ رہے ہیں۔ میں ان دنوں قاہرہ میں تھا۔ پاکستانی سفارت والے (جن میں سے کسی نے عربی سیکھنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ہندوستانی سفارت کے عملہ مرد و زن سب نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے انہماک سے اچھی خاصی عربی بول چال کی مہارت پیدا کر لی تھی) ان خبروں کو بڑے اہتمام کے ساتھ انگریزی میں مصری دوستوں اور اخباری نمائندوں کو سناتے۔ اگر کبھی ان میں سے کوئی مصری میری طرف متوجہ ہو کر تصدیق چاہتا اور میں جھوٹ بولنے سے اعتراض کرتا تو پاکستانی دوست برہم ہوتے اور میرے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

اسلام کے بعد دوسرا نمبر اردو کا ہے۔ ابھی تک تو یہ تھا کہ چند فرزانے دیوانے اپنی دھن میں لگے رہتے۔ کام کرتے اور کبھی کبھی اہمال کا ماتم کر لیتے۔ اب ہر بوالہوس اردو پرستی شعار کر رہا ہے۔ یہ اردو پرستی ویسی ہی ہے جیسے قوالی۔ نہ اس سے دین کی خدمت ہو سکتی ہے نہ اس سے زبان و ادب کی اور پھر وہی سوال کہ کیا فارسی کے علمی ذوق کے بغیر اردو کی کوئی قابل قدر ادبی خدمت ممکن ہے ؟

(نگار) مکتوب گرامی کے حصہ اول کی داد تو جناب ڈاکٹر سبزواری دیں گے۔ لیکن دوسرے حصہ کا شکریہ بیشک میرے ذمہ ہے جس کا اظہار ایک التجا کی صورت میں صرف اس طرح مناسب ہوگا کہ :-

مشاطہ را بگو کہ براسباب حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشہ بما رسد

باب الاستفسار

جبر و اختیار

محمد یامین خاں۔ بجنور

کچھ دنوں سے جبر و اختیار کا موضوع زیر فکر ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے ذہن کچھ مندرجہ ذیل خطوط پر کام کرتا ہے۔

(۱) ذہن کے بنیادی نقوش بچہ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے جو اختیاری چیز نہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے حوادث و حالات کی نوعیت اور ترتیب بھی اس کے اختیار میں نہیں۔ لہٰذا ذہن پر حوادث و حالات کا ردعمل بھی غیر اختیاری چیز ہوئی اور اسی ردعمل کا نام فعل ہے۔ اس لئے انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں۔

مثال کے طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ انسان ایک دھات کے گھنٹہ کی طرح ہے۔ جس کو بنانے والے نے ایک خاص قسم کی دھات سے بنا دیا ہے۔ اس پر مختلف ہتوڑیوں سے ضرب لگنے پر جو آوازیں نکلتی ہیں ان کا ذمہ دار وہ گھنٹہ نہیں بلکہ وہ دھات جس سے وہ بنایا گیا ہے یا ہتوڑی اور ہتوڑی کی ضربوں کی قسم۔ ترتیب۔ مقام اور شدت ہوں گے۔

(۲) اگر انسان بااختیار ہے تو تقدیر کوئی چیز نہیں۔ مستقبل کے کسی فعل کی پیش گوئی کرنا ناممکن ہے بجز اس کے کہ
(ا) فاعل کی باگ ڈور خود پیش گوئی کرنے والے کے ہاتھ میں ہو۔ یا
(ب) کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ جس کے بارے میں مکمل اور یقینی علم پیش گوئی کرنے والے کو ہو جیسے گھڑی۔ اگرچہ میں نے نہیں بنائی لیکن مجھے یقینی علم ہے کہ بنانے والے نے ایک خاص میکنزم اس کا رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کی ہر ہر حرکت متعین ہے اس لئے میں پیش گوئی کرسکتا ہوں کہ یہ نو کے بعد دس ہی بجائے گی۔ آٹھ نہیں۔

میری طالب علمانہ آرزو ہے کہ اس موضوع پر میری فہم کے مطابق جناب والا کچھ اظہار خیال فرمائیں۔

(نگار) یہ سوال اس سے قبل بھی بارہا مجھ سے کیا گیا ہے اور میں اس کا جواب بھی مفصل دے چکا ہوں۔ اس کا اعادہ پھر کرتا ہوں یہ نزاع کہ انسان مجبور ہے یا مختار نہایت قدیم ہے اور دفتر کے دفتر اس مسئلہ پر سیاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ اس باب میں ایک لمحہ کے لئے بھی کسی غیر معمولی پیچیدگی کا خیال میرے دل میں نہیں آیا اور یہ مسئلہ مجھے نہایت صاف و روشن نظر آتا ہے۔

یقیناً قرآن حکیم میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں باہم تناقض و تضاد نظر آتا ہے۔ یعنی بعض آیات سے انسان کا مجبور ہونا ہے اور بعض سے مختار ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ تضاد باقی نہیں رہتا اور حقیقت وا شگاف ہو جاتی ہے۔

مجبوری کے ثبوت میں متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں مثلاً۔

(۱) ولا تتحرك ذرة الا باذن الله

(۲) یفعل ما یشاء

(۳) یضل الله من یشاء ویهدی من یشاء

(۴) وما کان لنفس ان تومن الا باذن الله

(۵) ولو شاء الله ما اشرکو

(۶) من یهدی الله فهو المهتد ومن یضلله فلن تجد له ولیا مرشدا

(۷) فمنهم من هدی الله و منهم من حقت علیه الضلالة وغیرہ وغیرہ۔۔

لیکن اس کے ساتھ قرآن حکیم میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ

لا یرضی لعباده الکفر اور ذا تبعوا ما اسخط الله و کرهوا رضوانه فاحبط اعمالهم

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ جب وقت فطرت انسانی پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان جمادات کی طرح بے حس نہیں پیدا کیا گیا بلکہ وہ ارادہ کرتا ہے۔ ارادہ کے ماتحت اپنے جوارح سے کام لیتا ہے جس کام کو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نہیں کرتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قوت ارادی کس نے عطا کی؟ ظاہر ہے کہ خدا نے اس کی فطرت و پیدائش میں یہ صلاحیت یا قوت رکھدی ہے اور اسی قوت سے کام لے کر ایک ارادہ کرتا ہے اور اس سے باز رہ سکتا ہے۔ اسی طرح انسان میں دو متضاد خواہشوں کے پیدا ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ اور انھیں خواہشوں کے مطابق وہ کبھی اچھے کام کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی برے کام کی طرف۔ چنانچہ خود خدا ارشاد فرماتا ہے۔

قد افلح من زکاها وقد خاب من دساها۔

(یعنی کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو پاک کیا اور خسارہ میں رہا وہ جس نے اسے آلودہ کیا)

پھر چونکہ ان قوتوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے اس لئے اگر وہ تمام درمیانی واسطوں اور اسباب کو قطع نظر کر کے یوں کہے کہ جو کچھ چاہتا ہوں میں ہی کرتا ہوں یا بغیر میرے ارادہ و اذن کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو غلط نہیں کیونکہ اگر وہ ہمارے اندر کسی کام کی قوت پیدا نہ کرتا تو ہم سے وہ کام کسی طرح نہ ہو سکتا تھا۔

اس مسئلہ میں سب سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ تقدیر کے مفہوم پر صحیح غور نہیں کیا جاتا۔ عام طور سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہر کام

ہر واقعہ اور ہر حادثہ اور ہر بات کے لئے جداگانہ مشیت ہوا کرتی ہے۔ یعنی اگر اس وقت ہم اٹھ کر جاتے ہیں تو اس وقت خدا کی مشیت ایسی ہوئی ہے یا یہ کہ خدا نے پہلے سے معین کر دیا ہے کہ فلاں فلاں بات فلاں وقت فلاں انسان سے سرزد ہوگی۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔ مشیت ایزدی کا ظہور حقیقتاً اس فطرت میں ہوتا ہے جس پر انسان یا دیگر موجودات عالم پیدا کئے گئے ہیں۔ جس طرح پتھر کا بھاری ہونا۔ آگ کا جلانا۔ مقناطیس کا جذب۔ لوہے کا انجذاب یہ سب مقدرات الٰہیہ ہیں۔ اسی طرح ارادۂ انسانی بھی ایک مقدر ہے جس کی بنا پر ہم ایک کام کو کرتے ہیں اور دوسرے سے بچتے ہیں۔ ہاں اللہ کو اس کا علم ضرور ہے کہ اس کے بندوں سے یہ حرکت سرزد ہوگی لیکن اس کا علم مجبور کرنے والا نہیں۔ اس باب میں جناب عبداللہ بن عمر کا قول قابل غور ہے۔ ملل ونحل میں لکھا ہے کہ:۔

"ایک شخص عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن، بعض لوگ زنا کرتے ہیں شراب پیتے ہیں چوری کرتے ہیں۔ قتل کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے علم میں تھا ہم اس پر مجبور تھے"

آپ یہ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا۔ "سبحان اللہ العظیم قد کان ذلک فی علمہ انہم یفعلونہا ولم یحملہم علم اللہ علیٰ فعلہا"

(یعنی بیشک خدا کے علم میں تھا کہ وہ ایسا کام کریں گے لیکن خدا کے علم نے انھیں ان کاموں کے کرنے پر مجبور تو نہیں کیا)

اس کے بعد آپ نے بروایت حضرت عمر رسول اللہ کی یہ حدیث پڑھی کہ:۔

"مثل علم اللہ فیکم کمثل السماء التی اظلتکم والارض التی اقلتکم فکما لا تستطیعون الخروج من السماء والارض کذلک لا تستطیعون الخروج من علم اللہ وکما لا تحملکم الارض والسماء علی الذنوب کذلک لا یحملکم علم اللہ علیہا"

(یعنی علم الٰہی کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آسمان جس نے تم پر سایہ کر رکھا ہے اور زمین جس نے تمھیں اٹھا رکھا ہے۔ پس جس طرح تم آسمان و زمین سے نکل کر باہر نہیں جا سکتے اسی طرح علم الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے۔ لیکن جس طرح آسمان و زمین تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتے اسی طرح خدا کا علم بھی تمھیں گناہ پر مجبور نہیں کرتا)

غالباً اس سے بہتر مثال خدا کے علم کی اور کوئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ صاف بیان مسئلہ جبر و اختیار میں اور کوئی ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ خود رسول اللہ کا ارشاد ہے اس لئے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن ہم اس پر اکتفا نہیں کرتے اور بعض صحابۂ کرام اور اکابر امت کے اقوال بھی اس باب میں پیش کرتے ہیں جس سے اس کی اور زیادہ وضاحت ہو جائے گی۔

جب حضرت علی جنگ صفین سے لوٹے تو ایک شخص آپ کے پاس آیا اور بولا کہ "ہمارا شام کی طرف سفر کرنا کیا قضا و قدر کے موافق تھا" آپ نے جواب دیا کہ "قسم ہے دانہ کو پھوڑنے والے اور جان کے پیدا کرنے والے کی کہ نہیں اترے ہم کسی وادی میں اور نہیں چڑھے ہم کسی بلندی پر مگر موافق قضا و قدر کے۔" اس شخص نے کہا کہ "تو پھر ہمیں کوئی ثواب بھی نہیں ملا؟" حضرت علی نے یہ سن کر فرمایا کہ:۔

لعلک تظن قضاءً واجباً وقدراً حتماً ولو کان کذالک لبطل الثواب والعقاب ولسقط الوعد والوعید ولما کانت تاتی من اللہ لائمۃ اللذنب ولا محمدۃ لمحسن تلک مقالۃ اخوان الشیاطین وعبدۃ الاوثان وخصماء الرحمن وشہود الزور واہل العماء عن الصواب فی الامور، ہم قدریۃ ہذہ الامۃ ومجوسہا، ان اللہ تعالےٰ

امر تخییراً ونھی تحذیراً ولم یکلف بجبر ولا بعث الانبیاء عبثاً ذالک ظن الذین کفروا "

(یعنی شاید تو اس کو قضائے یقینی و قطعی خیال کرتا ہے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو عذاب و ثواب سب باطل ہو جاتے اور نہ خدا کی طرف سے گنہگار پر ملامت ہوتی اور نہ نیکوکار پر انعام۔ یہ قول ہے شیطان کے بھائیوں، بت پرستوں۔ خدا کے دشمنوں اور دھوکہ بازوں کا۔ خدا نے مجبور بنا کر مکلف نہیں کیا اور پیغمبروں کو بیکار نہیں بھیجا۔ یہ گمان ہے ان کا جو کافر ہیں [1])

ایک مرتبہ حجاج نے امام حسن بصری سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا۔

"خدا جس کام سے باز رکھنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ۔

" لا یرضی لعبادہ الکفر "

(اللہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں)

پس اگر کفر قضا و قدر ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا۔ جہلا کہتے ہیں کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نیک راہ دکھاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آیت کے ماقبل و مابعد پر غور کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا گناہ کرنے سے پہلے گمراہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا قول ہے کہ " لیضل اللہ الظالمین " (اللہ ظالموں کو گمراہ کرتا ہے یعنی ان کی گمراہی کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے۔

فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم و ما یضل بہ الا الفاسقین (جب وہ کجی اختیار کرتے ہیں۔ اللہ ان کے دلوں کو کج کر دیتا ہے۔ اور وہ گمراہ کرتا ہے مگر فاسقوں کو۔)

حضرت امام حسن نے جب اہل بصرہ کو خط لکھا تو اس میں صاف صاف تحریر کر دیا کہ۔

من حمل ذنبہ علی ربہ فقد فجر۔ ان اللہ لا یطاع استکراھا ولا یعصی بغلبۃ لانہ الملیک لما ملکھم والقادر علی ما اقدرھم علیہ فان عملوا بالطاعۃ لم یحل بینھم وبین ما فعلوا وان عملوا بالمعصیۃ فلیس ھو الذی اجبرھم علی ذالک فلو اجبر اللہ الخلق علی الطاعات لاسقط عنھم الثواب ولو اجبرھم علی المعاصی الاسقط عنھم العقاب ولو اھملھم لکان عجزا فی القدرۃ ولکن لہم فیھم المشیئۃ التی غیبھا عنھم فان عملوا بالطاعات کانت لہم المنۃ علیھم وان عملوا بالمعصیۃ کانت لہ الحجۃ علیھم۔

(یعنی جو اپنے گناہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے وہ فاجر ہے۔ خدا نہ اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور نہ نافرمانی سے کوئی شخص اس پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر خدا کی عبادت کریں تو خدا ان کے اور ان کے عمل کے درمیان حائل نہیں ہوتا اگر گناہ کریں تو خدا نے گناہ پر انھیں مجبور نہیں کیا۔ اگر خدا دنیا کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا تو ثواب اٹھا لیتا اور اگر گناہوں پر مجبور کرتا تو عذاب اٹھا لیتا پس اگر وہ اطاعت کریں گے تو خدا کا احسان ان پر ہوگا اور اگر گناہ کریں گے تو ان پر خدا کی حجت ہوگی"

اس قدر بیان سے غالباً یہ امر آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ اصل مفہوم قضا و قدر کا کیا ہے اور اسلام میں اس کے متعلق کیا ہدایات ہیں۔ آج کل عام طور پر جو عقیدہ مجبوری کا پایا جاتا ہے وہ صد درجہ مخرب امن و انتظام ہے اور وہی لوگ اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو ملل و نحل۔

…ان ہم جو دنیا میں موجود ہیں اور مکرد مذہب کے سہارے سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انسان نظام تمدن کی اصلاح کے
لئے بھیجا گیا ہے اور اسے [illegible] اسی لئے عطا ہوئے ہیں کہ وہ سوچ سمجھ کر کام کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارا نظام درہم
برہم ہو جاتا اور تعلیمات مذہب کا بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ خیر و شر کو اس کی طرف منسوب کرنا صرف اس بنا پر ہے کہ حقیقی فاعل
ارادہ و قوت کا وہی ہے اور اس کی عظمت کا خیال جس وقت دل میں جاگزیں ہوتا ہے تو ہم بھی کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ:۔
"یفعل مایشاء" لیکن اس سے یہ معنی تو نہیں کہ اس نے ہمیں بالکل مجبور کر دیا ہے اور ہم کو نیک و بد کی تمیز نہیں دی گئی۔

منظومات

(حضرت دل شاہجہانپوری مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام)

تری طلب کے سوا آرزو کوئی نہ رہی
بڑھے کچھ اور تو اپنی بھی آگہی نہ رہی

جو وقفِ ساغرِ صہبائے بیخودی نہ رہی
وہ زندگی کوئی پر کیف زندگی نہ رہی

خموش ادھر ہوئی اک منتظر کی شمعِ حیات
اُدھر سحر کے ستارے میں روشنی نہ رہی

نمودِ صبحِ قیامت ہے جس کی ہر ساعت
نگاہِ یاس میں وہ شام شام ہی نہ رہی

پھر ایک گردشِ ساغر بہ یادِ عہدِ شباب
کچھ اعتبار نہیں۔ زندگی رہی نہ رہی

وہ مسکراتے ہوئے اس ادا سے گزرے ہیں
چمن میں غیر شگفتہ کوئی کلی نہ رہی

رہا شعورِ نظر بیخودی کے عالم تک
حدودِ ہوش میں پہنچے تو آگہی نہ رہی

وہیں پہ ختم ہوئی داستانِ عشق و وفا
جہاں سے مشقِ ستم میں کوئی کمی نہ رہی

وہی ہیں گل، وہی غنچے وہی نسیم بہار
مگر ادائے تبسم میں دلکشی نہ رہی

غریقِ بحر ہی رہنا کمالِ عرفاں تھا
اُبھر کے پھر ہمیں ساحل سے آگہی نہ رہی

یہ زندگی ہے محبت میں زندگی اے دل
وفائے عشق کو پروائے زندگی نہ رہی

محبت رائگاں کیوں ہو محبت بے اثر کیوں ہو
جو تیرے دل میں گھر کر لے وہ رسوائے نظر کیوں ہو

ازل سے ہے جنوں آشفتگانِ عشق کی فطرت
ہمیں پھر انتظارِ موسمِ دیوانہ گر کیوں ہو

چلے میرے ہی دل پر اے قدر انداز یہ ناوک
نصیبِ دشمناں تیری نگاہِ عشوہ گر کیوں ہو

ازل ہی سے مقید ہو چکی ہے روح آزادی
قفس کی زندگی میں آرزوئے بال و پر کیوں ہو

پرستش ـــــ دوست کی ایمان سمجھتا ہوں — مرے جوش عمل پر پندِ ناصح کا اثر کیوں ہو
مثال شمع بزم دہر میں جلنا گوارا ہے — خوشی جس کی فطرت میں ہے شامل نوحہ گر کیوں ہو
وہی دل میں وہی پیش نگاہ شوق رہتے ہیں — مرے ذوق تصور کو تلاش بام و در کیوں ہو
نیاز شوق مسلک ہی سہی اہل محبت کا — جو دل نظروں میں رہتا ہے وہ خاک رہگزر کیوں ہو
محبت میں اگر ہر آرزوئے دل ہو بیگانہ — کسی کو انتظار وعدۂ شام و سحر کیوں ہو
ہزاروں حسرتیں نشترِ بہ دل۔ دل محو خاموشی — کوئی اس سرگزشتِ زندگی سے باخبر کیوں ہو
پرستار محبت میں ہوں تو منکر ہے اے ناصح — تری اس ذہنیت کا میری فطرت پر اثر کیوں ہو
تقاضائے وفا ضبط و تحمل گریہ لا حاصل — جو آنسو وجہ رسوائی ہوں دامن ان سے تر کیوں ہو
جو اے دل پرسشِ محشر سے پہلے ختم ہو جائے — کسی کی سرگزشت عشق اتنی مختصر کیوں ہو

اب تو اس مرحلہ کا ہے آغاز — نہ رہا اعتبار محرم راز
روح پر کیف ہو نظر کی طرح — مطرب مست تار چھیڑ وہ ساز
صبح پیری ہے رنگ بزم کو دیکھ — ختم کر داستان سوز و گداز
عشق کی آرزو ہے بے انجام — حسن کا ہر کرشمہ بے آغاز
گونجتی ہے ابھی صدائے الست — سن رہا ہوں فضا میں وہ آواز
نہ رہا فرق عابد و معبود — عشق کی بندگی بھی ہے اک راز
ان حدوں سے گذر چکا ہے دل — اب نہیں شکوۂ نشیب و فراز
گم ہوں اس بیخودی کی منزل میں — راز ہے کوئی اور نہ محرم راز
سرگزشت اس نظر کی کیا کہیے — جس نظر سے ہے عشق کا آغاز
نعلت عشق پر نظر اے دل — شمع کی زندگی ہے سوز و گداز
کاوش درد عشق راحت دل — فکر درماں عذاب روح گداز
وہ ہم آغوش ہیں تصور میں — اے شب ہجر تری عمر دراز

قطعہ

دل شکستہ تباہ حال ہوں میں — آپ ہیں خواجۂ غریب نواز
ہر قدم پر مرے نئے افتاد — آپ آگاہ ہر نشیب و فراز

(سید شفقت کاظمی)

کبھی زراہِ محبت اسے بھی پوچھا ہے
وہ بے نوا جو ترے آسرے پہ جیتا ہے

سُنا چکا ہے زمانہ ہزار بار مگر
مرا فسانہ ابھی تک نیا نیا سا ہے

ہم اہل درد سے رکھی ہے جو روا تو نے
وہ دوستی بھی تری دشمنی کا پردا ہے

سمٹ چلے ہیں جدائی کے فاصلے شاید
مرے قریب سے ہو کر وہ آج گذرا ہے

دل و نظر کو مناسب ہے فرشِ راہ کر دل
ابھی ابھی تیری آمد کا خواب دیکھا ہے

کچھ اور بھی ہیں مری زندگی کی تصویریں
میں وہ نہیں جو مجھے دوستوں نے سمجھا ہے

غمِ حیات سے کبھی ہم نبھائے جاتے ہیں
ترے خیال کا دامن بھی تھام رکھا ہے

نئی بہار کا مژدہ بجا سہی لیکن
ابھی تو اگلی بہاروں کا زخم تازا ہے

مری حیات ہے مجھ سے جو سرگراں شفقت
مری حیات میں یہ کون کار فرما ہے

(اکرم دھولیوی)

اظہار دردمندیٔ الفت نہ کر سکے
کھل کر کبھی ہم ان سے شکایت نہ کر سکے

وہ جوشِ دل ہے کیا وہ جنون حیات کیا
دنیائے رنج و غم کو جو غارت نہ کر سکے

کس رنگ سے یہ پھول کھلے اب کے اے بہار
محسوس ہم چمن کی لطافت نہ کر سکے

اکرم بہت قریب تھے محفل میں ان سے ہم
لیکن نظر اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکے

★

ان کو بھی اے جدائی کیا میری یاد آئی
پہلے سے کیوں زیادہ دل کا سکون کم ہے

اہل وفا کی خاطر تکلیف دلدہی کیا
خوئے نیازمندی بیگانۂ کرم ہے

راہِ وفا میں تم نے جس دن سے ساتھ چھوڑا
منزل کی سختیوں کا رونا قدم قدم ہے

ڈر ہے کہ درد دل پھر کروٹ نہ کوئی بدلے   پہلے سے آجکل کچھ تکلیف مجھ کو کم ہے

اب جس طرح بھی گزریں لمحات زندگی کے
تنہائیاں ہیں اکرم اور اک سکوت غم ہے

(سید حرمت الاکرام)

شکریہ تیرا بہرحال ہے لازم ورنہ   دل تسلی سے تو اب اور بھی گھبراتا ہے
کہہ دو یہ صبح کے تارے سے کہ ڈوبے نہ ابھی   کوئی بھولا ہوا قصہ مجھے یاد آتا ہے
مصلحت کون اس اندازِ جنوں کی سمجھے   تیرا دیوانہ تجھے بھول کے اِتراتا ہے

کیسے بتلاؤں کہ ویرانۂ دل میں حرمت
شمع سی کون سرِ شام جلا جاتا ہے

(ضیار شبنمی)

آج بھی یاد ہیں ماضی کے مہکتے لمحے!   وہ طلسمات میں ڈوبی ہوئی دنیائے شباب
وہ ترے مہندی رچے ہاتھ وہ نازک بانہیں   وہ تبسم کے گلاب اور وہ کلیوں کا حجاب

○

نکھرا نکھرا سا ترا حسن بہاروں کی سحر   مہکا مہکا سا ترا جسم گلابوں کی مہک
زندگی آج بھی ہے محوِ تماشا اے دوست   کاش مل جائے ترے حسن کی ہلکی سی جھلک

○

چھین کر لے گئی ان جاگتے لمحوں کا سہاگ   وہ بہاروں کے دل آویز اجالوں کی سحر
جس کو بخشی تھی ترے حسن و محبت نے جِلا   کھو گئی غم کے دھندلکوں میں بھٹک کر وہ نظر

○

اس طرح دل سے نکلتی ہے مرے آہ کہ بس   جیسے ترکش سے نکل کر کوئی تیر آتا ہے
کون ہے "وقت" کا صیاد نہیں کوئی نہیں   یہ وہ طائر ہے جو اُڑتا ہی چلا جاتا ہے

○

بہر حال عبدالعزیز خالد کی شاعری اس لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے کہ ہماری شاعری کو تخیل، جذبہ اور احساس کے مخصوص دائروں سے نکال کر علم و فکر کی وسعتوں میں لے جانا ہی چاہتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے دنیائے شاعری ان وسعتوں سے کیا کھوتی ہے اور کیا پاتی ہے۔

تینوں کتابیں چودہ روپیہ میں بک لینڈ بندر روڈ کراچی، اور دو آبہ کواپریٹو پبلشیر کراچی سے مل سکتی ہیں۔

روپ نگر

منظور ممتاز کے اس ناول میں زندگی کی بڑی تلخ لیکن سچی حقیقتوں کو ناول کے پیرائے میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول کا ہیرو، ایک پروفیسر اپنی جنم بھوم گروپ نگر کو چاند نگر بنا دینے کی فکر میں علم و فن اور مادی ترقی کی ہر منزل طے کرتا ہے لیکن افسوس کہ وہ اس روحانی مسرت سے محروم رہتا ہے جو ایک فرماں بردار بیٹا، ایک شفیق باپ۔ ایک اچھا شوہر اور خاندان کا ایک ہونہار فرد بننے کے بعد ایک آدمی محسوس کرتا ہے۔ دو مزاجوں کی عدم مطابقت خیالات کی یکسانیت، سماج کے غیر ضروری بندھن۔ والدین کا لاڈ پیار، جنسی لگاؤ کی بے اعتدالیاں۔ معاشی عدم مساوات اور عملی دنیا سے گریز کر کے نظری دنیا میں پناہ لینے کی کوشش انسان اور اس کے معاشرے سے زندگی کی خوشیوں کو کس طرح چھین لیتی ہے۔ اس کا اصل اندازہ اس ناول کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

۔۔ ۶ صفحات کا یہ ناول، بہ لحاظ فن اور زبان و بیان ایسے محاسن کا حامل ہے کہ ہم اسے ایک معیاری ناول کہہ سکتے ہیں۔

ناول آٹھ روپے میں ممتاز پبلیکیشنز لاہور سے مل سکتا ہے۔

صبح بنارس

مرتبہ۔ عشرت کرت پوری
قیمت۔ دو روپیہ پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔ جاوید پبلشرز۔ اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶

شیخ علی حزیں نے جس بنارس کے متعلق کہا تھا کہ:۔

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است ایں جا

اسی کے متعلق عشرت کرتپوری نے مشاہیر سخن کی نظمیں جمع کی ہیں اور بڑے سلیقہ سے ترتیب دے کر منظر عام پر لائے ہیں۔ "پہلی کرن" کے عنوان سے مرتب نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ اس کتاب کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔

اس میں بنارس کے تاریخی و تہذیبی پس منظر کو جس اختصار و خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے وہ مرتب کی محنت اور خوش ذوقی اور بنارس کی سرزمین سے شغف کا ثبوت ہے۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔

علی شیر خاں۔ محلہ کٹھرانہ کلاں رائے بریلی۔ یو۔ پی۔